سہ ماہی

ادب ساز

دہلی

•1857•

اٹھارہ سو ستاون

کبھی جا وہ ماتم تخت ہے کہوں کیسی گردشِ بخت ہے ۔ نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
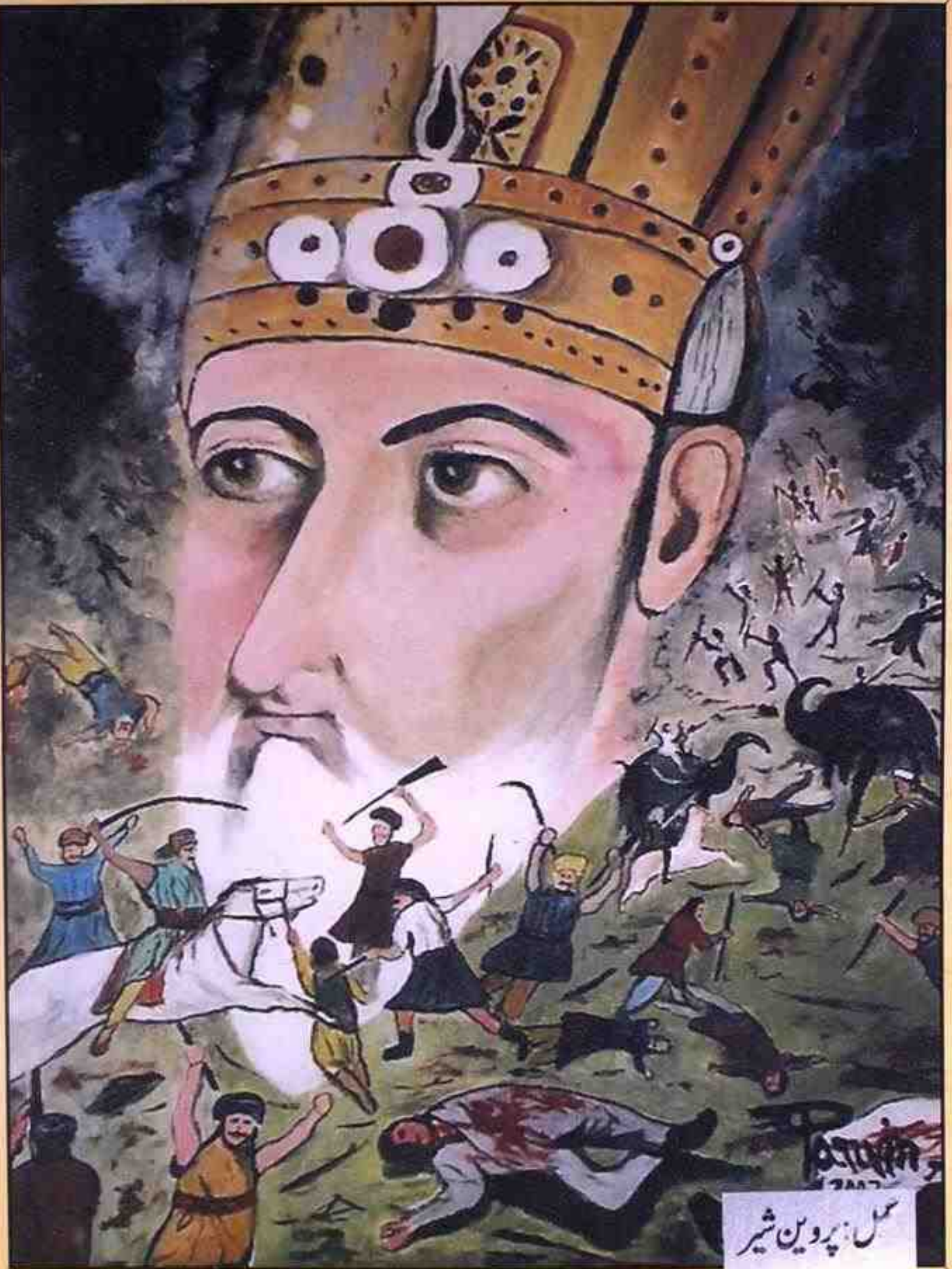
(ظفر)

ادب ساز

اردو ادب کا عالمی جریدہ

پہلا خاص نمبر

اعزازی مدیر

نصرت ظہیر

سہ ماہی **ادب ساز** دہلی

جلد 2: شمارہ 4-5، جولائی تا ستمبر، اکتوبر تا دسمبر 2007

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

انتظامی مدیر: مودود صدیقی

مدیر: ستارہ بانو

معاون مدیر: ثمینہ پروین، شبنم پروین

قانونی مشیر: عنبر قمر الدین، بی اے آنرز، ایل ایل۔ ایم، ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا

کمپوزنگ: شاہینہ عباسی، دریا گنج، دہلی۔2

مطبع: شوبی آفسیٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی۔2

قیمت فی شمارہ: ہندوستان: پیپر بیک:300 روپے، مجلد:350 روپے؛ پاکستان: پیپر بیک:400 روپے، مجلد:450

دیگر ممالک: بذریعہ ائرمیل: پیپر بیک:US$25 ڈالر/20 یورو/15 پاؤنڈ؛ مجلد:US$28 ڈالر/22 یورو/17 پاؤنڈ

ترسیل زر: چیک/ڈرافٹ بنام: ادب ساز پبلکیشن دہلی Adabsaaz Publication Delhi دہلی (انڈیا) میں قابل ادائیگی

ترسیل زر، خط وکتابت کا پتہ: T-37، ہڈکو پلیس، اینڈریوز گنج، نئی دہلی-110049 (انڈیا)

T-37, HUDCO Place Andrews Ganj New Delhi-110049 (INDIA)

ای میل: adabsaaz@gmail.com اور nusratzaheer@gmail.com تخلیقات ان پیج یا دوسرے فارمیٹ میں ای میل کی جاسکتی ہیں

بیرونی رابطے: برائے ترسیل زر و قلمی معاونت

پاکستان: جناب حسن علی خاں 547 / 3 / A-2, Township,Lahore - 54770 PAKISTAN

فون: 333-4077003 ای میل: hakmakali@yahoo.com

برطانیہ: جناب گلشن کھنہ 92, GROVE ROAD, HOUNSLOW, TW3 3PT (London UK)

موبائل: 07780772603

امریکہ: Adabsaaz c/o Urdustan.com PO Box 7790 Jupiter, FL 33468 USA

فون: 858-610-8738 (امریکہ میں منی آرڈر یا چیک urdustan.com کے نام قابل ادائیگی ہوں)

سیل فون: نئی دہلی: 9873540593

فون: دفتر: اینڈریوز گنج نئی دہلی: 26252715، 26253033

رنگون کی اس قبر کے نام
جسے آج کوئے یار میں ہونا چاہئے تھا

ترتیب

ترتیب

ڈراما

1857:نوائے امروز

منظومات

افسانے

ناول

1857:شخصیات

1857:اردو صحافت

1857:فنونِ لطیفہ

بابِ طنز و مزاح

تحریکِ آزادی کے پس منظر میں

متفرقات

گوشۂ اختلاف

تسلسل

کتب خانہ

☆ رَونقِ مَحفِل ☆

گلزار

1857

اک خیال تھا... انقلاب کا
اک جذبہ تھا...
سن اٹھارہ سوستاون!!

ایک گھٹن تھی، درد تھا وہ، انگارہ تھا جو پھوٹا تھا
ڈیڑھ سو سال ہوئے ہیں
اُس کی
چن چن کر چنگاریاں ہم نے روشنی کی ہے
کتنی بار اور کتنی جگہ بیجی ہیں وہ چنگاریاں ہم نے،
اور اگائے ہیں پودے اس روشنی کے!!
ہنسا اور اہنسا سے
کتنے سارے جلے الاؤ
کانپور، جھانسی، لکھنؤ، میرٹھ، رڑکی، پٹنہ

آزادی کی پہلی جنگ نے تیور دکھلائے تھے
پہلی بار لگا تھا کوئی سانجھا درد ہے بہتا ہے
ہاتھ نہیں ملتے پر کوئی انگلی پکڑے رہتا ہے
پہلی بار لگا تھا خوں کھولے تو روح بھی کھولتی ہے
بھورے جسم کی مٹی میں اس دیش کی مٹی بولتی ہے

پہلی بار ہوا تھا ایسا...
گاؤں گاؤں...
روکھی روٹیاں بٹتی تھیں
ٹھنڈے تندور بھڑک اٹھتے تھے!

چند اڑتی ہوئی چنگاریوں سے
سورج کا تھال بجا تھا جب،
وہ انقلاب کا پہلا گجر تھا!!

گرم ہوا چلتی تھی جب
اور بیا کے گھونسلوں جیسی
پیڑوں پر لاشیں جھولتی تھیں
بہت دنوں تک مہرولی میں
آگ دھوئیں میں لپٹی روحیں
دِلّی کا رستہ پوچھتی تھیں

اُس بار مگر کچھ ایسا ہوا...
کرانتی کا اَشوتو نکلا تھا
پر تھامنے والا کوئی نہ تھا
جاں بازوں کے لشکر پہونچے مگر
سالارنے والا کوئی نہ تھا

کچھ یوں بھی ہوا...
مسند سے اٹھتے دیر لگی
اور کوئی نہ آیا پاؤں کی جوتی سیدھی کرے
دیکھتے دیکھتے شامِ اودھ بھی راکھ ہوئی

چالاک تھا رہزن، رہبر کو
اس 'کوئے یار' سے دور کہیں برما میں جا کر باندھ دیا
اب تک وہ جلاوطنی میں ہے
کاش کوئی وہ مٹی لا کر اس کے وطن میں دفن کرے

آزاد ہیں اب...
اب تو وطن آزاد ہے اپنا
اب تو سب کچھ اپنا ہے
اِس دیش کی ساری ندیوں کا اب سارا پانی میرا ہے
لیکن پیاس نہیں بجھتی

نہ جانے مجھے کیوں لگتا ہے
آکاش مرا بھر جاتا ہے جب
کوئی میگھ چُرا لے جاتا ہے
ہر بار اُگاتا ہوں سورج
کھیتوں کو گرہن لگ جاتا ہے

اب تو وطن آزاد ہے میرا...
چنگاریاں دو... چنگاریاں دو...
میں پھر سے بیجوں اور اگاؤں دھوپ کے پودے
روشنی چھڑکوں جا کر اپنے لوگوں پر
مِل کے پھر آواز لگائیں...
انقلاب
انقلاب
انقلاب!!

قرۃ العین حیدر

پیدائش: 20 جنوری 1926 علی گڑھ، یوپی؛ وفات: 21 اگست 2007 نوئیڈا، یوپی

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

حافظ شیرازی

آداب

ڈیڑھ سو برس
ڈیڑھ سو کروڑ لوگ
ڈیڑھ ارب خواب
اور ان کا احوال بیان کرنے کے لئے بس ساڑھے چار سو صفحات...

خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے کس نے کتنا خون دیا، کس نے کتنے ظلم سہے، کتنی مانگوں کا سندور اجڑا، کتنی ماؤں کی گود سونی ہوئی آرزوؤں کو کچلنے کے لئے کیا کیا دام بچھائے گئے، کس کس طرح کی سازشیں رچی گئیں، کہاں کہاں زہر بویا گیا

پہاڑوں سے سمندروں تک اور ریگستانوں سے جنگلوں تک پھیلی ہوئی اس عظیم الشان دھرتی پر بسنے والے شاعروں، نغمہ گروں، موسیقاروں، فنکاروں، ہنرمندوں، کاریگروں، دستکاروں اور صدیوں سے دبی کچلی روحوں پر ان ڈیڑھ سو برسوں میں کیا گزری، اجداد نے کیا سہا اولاد نے کیا پایا، ماضی نے کیا سوچا تھا حال نے کیا دیا اور مستقبل کیا دینے والا ہے... یہ سب بیان سمندروں کی روشنائی، آسمانوں کی وسعت اور زمینوں کا پھیلاؤ چاہتا ہے۔ اور ہمارے پاس ہیں بالشت بھر چوڑائی کے مٹھی بھر کاغذ۔ کام بڑا، بازو چھوٹے اور ہاتھ بٹانے والے کم

ڈاکٹر ارجمند آرا کا بے لوث تعاون ملا تو دوسرے ملینیم کی سب سے اہم شخصیت کارل مارکس اور ان کے رفیق فریڈرک اینگلس نے ہزاروں میل کے فاصلے سے اس عظیم المرتبت بغاوت کو کس نظر سے دیکھا، یہ سامنے لایا جاسکا۔ ان دونوں شخصیتوں کی 1857 کے موضوع پر ہونے والی خط و کتابت اور متعدد اہم مضامین اردو میں پہلی مرتبہ ایک ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ گلزار کی دو نظمیں ڈیڑھ سو برس کا مکمل احاطہ کرتی ہیں لہٰذا ایک کو شروع میں اور دوسری کو 'صدائے امروز' کے اختتام پر اسی بات کو انڈر لائن کرنے کے لئے رکھا گیا ہے کہ ڈیڑھ سو برس پہلے کی بغاوت کا سلسلۂ عمل آج کہیں منظر سے عام آدمی، کامن مین کی گم شدگی میں تو تبدیل نہیں ہونے جا رہا ہے۔ ارمان نجمی اور ناصر عباس نیر کا قلم نو آبادیاتی شکنجے میں دوبارہ پھنستی جا رہی دنیا کا پرانا اور نیا منظر نامہ ہمارے روبرو رکھ رہا ہے۔ 'صدائے امروز' میں ہمارے شعرا اور افسانہ نگار آج کے افکار و خیالات ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔ ان میں سے کئی تخلیقات بظاہر 1857 سے قطعی غیر متعلق معلوم ہوں گی مگر اس ڈیڑھ صدی سے یقیناً جڑی ہوئی ہیں جو ابھی تک گزرتی چلی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد کی فضا، فرقہ وارانہ فسادات، آج کا کارپوریٹ ورلڈ یہ سب ان تخلیقات میں ہے۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی نے سلمان خورشید کے انگریزی پلے کا ترجمہ، جسے وہ ٹھہر ٹھہر کر مکمل کرتے ہماری درخواست پر وقت نکال کر دن رات کی محنت سے اس لئے مکمل کیا کہ یہ ڈرامہ 1857 کو آج سے جوڑ کر دکھانے کی ایک قابلِ تعریف کوشش ہے جس کی اس خاص شمارے کو سخت ضرورت تھی۔ عنقریب انگریزی اور اردو میں شائع ہونے والے اس پلے کے چند ابواب قبل از وقت شائع کرنے کی اجازت دینے کے لئے بھی ہم سلمان خورشید کے نہ صرف شکر گزار بلکہ ایک سیاست داں کی شخصیت کے اس تخلیقی ذہن کو دیکھ کر حیران بھی ہیں جو اس پلے کو پڑھ کر سامنے آتا ہے۔ اس خوش گوار حیرت کا تجربہ اب آپ بھی کیجئے۔ اس کے ساتھ کئی بہت ضروری مطبوعہ مضامین کی اشاعت کے لئے پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مشتاق اعظمی، فیاض رفعت اور ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کا شکریہ ادا کرنا بھی لازم ہے۔

تاخیر اس شمارے کی اشاعت میں کافی ہوئی ہے مگر 462 صفحوں کا باعثِ تاخیر بھی سامنے ہے۔ پڑھئے اور کھل کر بتائیے کہ کہاں ہم درست راہ پر ہیں، کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں، کہاں سنبھلے ہیں... اور جو بھی ہو، سفر میں ساتھ رہئے...

اٹھارہ سوستاون

• 1857 •

مارکس اور اینگلس

کی نظر سے

...جہاں تک دلی کے معاملات کا تعلق ہے، مجھے یہ لگتا ہے کہ برسات کے موسم میں شدت آنے سے پہلے انگریزوں کو پیچھے ہٹنا شروع کر دینا چاہیے۔ 'ٹریبیون' کے ملٹری نامہ نگار کے طور پر چونکہ تمھاری جگہ فی الحال میں نے مورچہ سنبھال رکھا ہے، اس لیے اس نکتے کو پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں...اس مفروضے کی بنیاد پر کہ آج تک کی رپورٹیں حقیقت پر مبنی ہیں....

دلی کی شکست کے بارے میں ہندوستان بھر میں افواہیں مسلسل گردش کر رہی ہیں۔ یہ افواہیں کوئی اور نہیں بلکہ کلکتہ سرکار خود پھیلا رہی ہے...

مارکس بنام اینگلس 15 اگست 1857

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کے دوران انیسویں صدی کے دو عظیم مفکروں کی تحریریں اور خط و کتابت

ترتیب، ترجمہ، پیش کش

ڈاکٹر ارجمند آرا

این قصۂ پارینہ

1857 پر مارکس اور اینگلس

ارجمند آرا

اس باب میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس کے چند ایسے مضامین اور خطوط کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو انھوں نے 1857 کی ہندستان کی پہلی جنگِ آزادی کے بارے میں تحریر کیے تھے۔ یہ دونوں دانشور جنگ آزادی کا پوری دل چسپی اور باریک بینی سے مشاہدہ کررہے تھے اور ہر طرح کی خبروں کا بھرپور تجزیہ کرکے نیویارک ڈیلی ٹربیون (New York Daily Tribune) میں اس موضوع پر مسلسل مضامین لکھ رہے تھے۔ اینگلس نے اس اخبار کے ملٹری ڈپارٹمنٹ کے انچارج کے طور پر کام کیا تھا، اور مارکس نے بھی یہ شعبہ عارضی طور پر سنبھالا تھا۔ یہ تمام مضامین جون 1857 سے ستمبر 1858 کے دوران لکھے گئے اور شائع ہوئے۔ 59-1957 میں ہندستان میں پہلی جنگِ آزادی کی سو سالہ برسی کے موقعے پر ان مضامین کو یک جا کرکے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف مارکسزم لینن ازم نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں مارکس اور اینگلس کی خط و کتابت کے وہ حصے بھی شامل کیے گئے تھے جن میں اس عظیم واقعے پر تبادلۂ خیال کیا گیا ہے۔ یہ کتابچہ ایسے وقت میں شائع ہوا تھا جب مارکس کے دوررس اور بصیرت افروز نتائج وقت کی کسوٹی پر کھرے اتر کر بیدار مغز لوگوں کا اعتبار حاصل کرچکے تھے۔ اور یہ ان فلسفیوں کے تجزیوں اور تبصروں پر مبنی تھا جن کے خیالات و نظریات نے بیسویں صدی کی دنیا کی نہ صرف تصویر بدل کر رکھ دی بلکہ ان سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے محرک بھی بنے جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

دراصل 1850 کے اوائل ہی سے یہ دونوں مفکرین سرمایہ دار ممالک کی نوآبادیاتی پالیسی اور محکوم قوموں کی تحریکات آزادی میں خصوصی دل چسپی لے رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ایشیائی ممالک، خصوصاً برِصغیر، انگریزوں کے سفاکانہ منصوبوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ ایسے میں مارکس اور اینگلس یہاں سے پہنچنے والی ہر طرح کی خبروں کا بصیرت افروز تجزیہ کررہے تھے۔ پرولتاری نقطۂ نظر سے مارکس کو ان تحریکات کے تاریخی انجام سے خصوصی دل چسپی تھی۔ انہوں نے ہندستان کی جنگ کے تمام اہم واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے بغاوت کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی ناکامی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی۔ ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں نوآبادیاتی پالیسیوں کے شدید مخالف اور برصغیر کی آزادی کے خواہاں تھے۔ نوآبادیات کے سوال پر لکھی گئی بہترین تحریروں میں ان مضامین کا شمار اس لیے ہوتا ہے کیونکہ ان میں ان اقتصادی اور سماجی وجوہ کو واضح کردیا گیا ہے جن کے سبب بغاوت ناگزیر ہوگئی تھی۔

مارکس نے ان واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انگریز جسے فوجی بغاوت کا نام دے رہے ہیں وہ فوجی بغاوت نہیں بلکہ ایک قومی بغاوت ہے۔ بغاوت کے ابتدائی دنوں میں جب انگریز قوم تک بھی اسی وہم کا شکار تھی کہ یہ محض ایک فوجی بغاوت ہے جس کا دائرہ اثر کلکتہ پریزیڈنسی سے باہر نہیں ہے، مارکس کی یہ تیزنگہی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ انہیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہ ایک قومی بغاوت ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں مارکس نے ہندستان کے اقتصادی اور سماجی حالات کا، اور انگریزوں کی متعارف کرائی ہوئی پالیسیوں کا مشاہدہ بھی کیا اور سرمایہ داری کے طریق واردات کے اصولوں کو ذہن میں رکھ کر نتائج اخذ کیے اور یہ اندازہ کرلیا کہ ہندستان میں عوام کس ذہنی، سماجی اور اقتصادی دور سے گزر رہے ہیں اور آئندہ زمانے میں حالات کون سا رخ اختیار کریں گے۔

مارکس لکھتے ہیں کہ ہندستان کی استعماری لوٹ کھسوٹ نے یہاں کے معاشی نظام کے تمام شعبوں کو بالکل تباہ کرکے رکھ دیا تھا اور اس عظیم اور ثروت مند قدیم ملک کے باشندوں کو بے انتہا مفلسی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے عوامی فلاح کے کاموں کو نظر انداز کیا اور

زرعی نظام اور مقامی صنعتوں، خصوصاً پارچہ بافی کو بالکل برباد کر دیا تھا۔ انھوں نے زمین کی اجتماعی ملکیت کے پدری ڈھانچے کو توڑا، لیکن ساتھ ہی جائداد پر محصول اور ملکیت کے دوطریقوں، زمینداری اور رعیت باڑی کے نظام کو کامیابی سے نافذ کر کے ہندستانی سماج کی جاگیردارانہ باقیات کو زندہ رکھا۔ اس سے ترقی کی رفتار دھیمی پڑی اور کاشتکاروں پر ناقابل برداشت محصولات کا بوجھ پڑ گیا۔ ہندستانی بغاوت سے متعلق اپنے مضامین میں مارکس لکھتے ہیں کہ کسانوں کو ٹیکس وصول کرنے والوں کے جبر وتشدد کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اور ان مظالم کو برطانیہ کی اقتصادی پالیسی کے تحت حکومت کی توثیق حاصل تھی۔ اس طرح جو ٹیکس وصول کیے جاتے تھے ان کا بہت معمولی سا حصہ ہی فلاحی کاموں کی شکل میں واپس عوام تک پہنچ پاتا تھا۔ مارکس آگے کہتے ہیں کہ برطانوی مداخلت کاروں کی ظالمانہ پالیسی اور استعماری استحصال کے سفاکانہ طریقوں نے ہی بغاوت کو جنم دیا۔

مارکس ان مضامین میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ سپاہی تو محض ایک وسیلہ تھے۔ بغاوت کے اصل روح رواں تو ہندستانی عوام تھے جو مجبور ہو کر استعماری جبر کے خلاف جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مارکس اور اینگلس نے اس بات پر خاص زور دیا تھا کہ اس بغاوت نے نہ صرف مختلف مذہبوں (ہندو، مسلمان) اور ذات برادریوں کے لوگوں کو (برہمن، راجپوت اور کہیں کہیں سکھ)، بلکہ مختلف سماجی طبقات کے لوگوں کو بھی متحد کر دیا تھا۔ مارکس نے ایک مضمون میں لکھا:

> ''ایسا پہلی بار ہوا ہے جب سپاہیوں کی ریجی منٹوں نے اپنے افسروں کو قتل کر ڈالا ہے؛ جب باہمی نفرتوں کو بھول کر مسلمان اور ہندو اپنے مشترکہ آقاؤں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں؛ جب ہندوؤں کی شروع کی ہوئی بغاوت نے دلّی کے راج سنگھاسن پر بالآخر ایک مسلمان بادشاہ کو بٹھا دیا ہے۔''

ہندستانی عوام کی تحریک آزادی کے ساتھ مارکس اور اینگلس کو پوری ہمدردی تھی۔ وہ بغاوت کی کامیابی کے متمنی تھے، لیکن جانتے تھے کہ جب تک ہندستانی عوام کے تمام حصے، خصوصاً جنوبی اور وسطی ہندستان سے، اس میں شریک نہیں ہوتے، کامیابی مشکل ہوگی۔ ایسا ہو نہیں سکا اور ہندستان کا جاگیرداری نظام، مذہب اور ذات پات پر مبنی معاشرہ اور اس کے تضادات اور بغاوت کی سربراہی کرنے والے جاگیرداروں کی غداری وغیرہ ایسے اسباب بن گئے جن سے یہ بغاوت ناکام ہو گئی۔ ان کے نزدیک مرکزی قیادت کا فقدان اور متحدہ فوجی کمان کا نہ ہونا اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب تھا۔

مذکورہ کتابچے کے ناشرین کی طرف سے جو تعارفی مضمون شائع ہوا تھا اس کا آخری پیراگراف ان عظیم مفکرین کے حاصل کلام کے طور پر پیش کریں تو بے جا نہ ہوگا:

> ...استعماریت کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنے والوں کی حیثیت سے مارکس اور اینگلس کو ہمیشہ یہ یقین رہا کہ ہندستانی عوام استعماری حکومت کے شکنجے سے خود کو آزاد کرا لیں گے۔ مارکس نے بتایا تھا کہ انگریزی حکومت کے نتیجے میں ہندستان کی پیداواری قوتیں ارتقا پذیر ہوں گی، لیکن اس سے ہندستانی عوام کے حالات میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جب تک کہ غیر ملکی استعماری ظلم وجبر کا وہ خاتمہ نہیں کر دیتے، اور خود اپنے ملک کے مالک نہیں بن جاتے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مارکس کو دو راستے نظر آتے تھے۔ یا تو برطانیہ میں پرولتاریہ انقلاب آجائے، یا پھر غیر ملکی نو آباد کاروں کی حکمرانی کے خلاف خود ہندستانی عوام کی تحریک آزادی کامیابی سے ہم کنار ہو جائے...

ژرف نگاہی کے ساتھ کیے گئے سائنسی تجزیے کے علاوہ موثر انداز بیان اور دل نشین اسلوب کے سبب بھی یہ مضامین اور خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس گوشے میں مارکس کے پانچ اور اینگلس کے دو بصیرت افروز مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی باہمی مراسلت میں شامل وہ اقتباسات بھی شامل کیے جا رہے ہیں جن پر 1857 کے حوالے سے غور وفکر کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ اس غرض سے پیش کیا جا رہا ہے کہ 1857 کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے موقعے پر، جب ہر جانب یہ عظیم واقعہ غور وفکر اور بحث کا موضوع بن گیا ہے، ہم ایک بار پھر تاریخ کے جھروکے سے اس وقت کے اہم مفکرین کے تاثرات، تجزیات اور ان سے ماخوذ نتائج کو یاد کر لیں اور ان کی صداقت سے روشناس ہوں جسے آج دنیا سلام کرتی ہے۔

ارجمند آرا

نوٹ: ان صفحات میں پیش ترجمے کے لیے مضامین کا متن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ذریعے اپریل 2007 میں شائع شدہ کتابچے Marx and Engels on 1857, the First Indian War of Independence پر مبنی ہے۔ خطوط کے متن کے لیے پروگریس پبلشرز، ماسکو کے ذریعے 1988 میں اسی عنوان سے شائع ہونے والے کتابچے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ماسکو سے شائع ہونے والے مضامین کی یہ چھٹی اشاعت تھی۔

OO

ہندستانی افواج میں بغاوت

کارل مارکس

30 جون 1857

پھوٹ ڈالو اور راج کرو (Divide et impera)، روم کی اس عظیم حکمتِ عملی کی بنیاد پر انگلستان تقریباً ڈیڑھ سو برس تک اپنے ہندستانی سامراج پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوا۔ جن مختلف نسلوں، قبیلوں، ذات برادریوں مذہبی فرقوں اور آزاد صوبوں کے امتزاج سے اُس جغرافیائی وحدت کی تشکیل ہوئی تھی جسے ہندستان کہا جاتا ہے، ان کے درمیان باہمی نفاق پھیلانا ہی برطانوی حکمرانی کا بنیادی اصول رہا۔ لیکن بعد کے دور میں اس حکمرانی کے طریقے میں تبدیلی آئی۔ سندھ اور پنجاب کی فتح کے بعد، اینگلو انڈین سامراج نہ صرف اپنی فطری انتہاؤں تک پہنچ گیا بلکہ ہندستان کے آزاد صوبوں کی آخری نشانیوں کو بھی اس نے اپنے پیروں تلے روند کر تباہ کر ڈالا۔ سارے جنگجو دیسی قبیلوں کو قابو میں کیا جا چکا تھا، تمام اہم اندرونی جھگڑے ختم ہو چکے تھے، اور بالآخر اودھ کے الحاق نے بڑی آسانی سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندستان کی نام نہاد آزاد ریاستوں کی باقیات محض انگریزوں کے رحم و کرم کی رہین ہیں۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت میں بھی ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ ہندستان کے ایک حصے کی مدد سے اس کے دوسرے حصے پر حملہ آور نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس نے خود کو اس کے سرتاج کی حیثیت سے متمکن کر لیا تھا، اور اب سارا ہندستان اس کے قدموں میں تھا۔ اب فتوحات اس کے پیشِ نظر نہیں تھیں، بلکہ وہ فاتح بن چکی تھی۔ اس کی ماتحت افواج کو اب اس کی حکمرانی کو وسعت پذیر کرنے کی نہیں، بلکہ صرف اس کی حفاظت کرنے کی ضرورت تھی۔ اب اس کی فوجیں سپاہیوں کے بجائے پولس والوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ بیس کروڑ دیسی لوگوں کو انگریز افسروں کی ماتحتی میں دو لاکھ آدمیوں پر مشتمل دیسی فوج کی مدد سے قابو میں کیا گیا تھا، اور اس دیسی فوج کی لگام بھی محض چالیس ہزار نفوس پر مشتمل انگریز فوجیوں کے ہاتھ میں تھی۔ پہلی ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندستانی عوام کی فرماں برداری اُس دیسی فوج کی نمک حلالی پر مبنی ہے جسے منظم کر کے برطانوی حکومت نے گویا ہندستانی عوام کی مزاحمت کے اولیں عام مرکز کو بھی منظم کر دیا ہے۔ اس دیسی فوج پر کتنا بھروسا کیا جا سکتا ہے، یہ اس کی اُن حالیہ بغاوتوں سے صاف ظاہر ہے جو فارس کے ساتھ جنگ چھڑنے کے سبب، بنگال پریزیڈنسی کے یوروپی سپاہیوں سے خالی ہوتے ہی، وہاں شروع ہو گئی تھیں۔ ہندستانی فوج میں اس سے پہلے بھی بغاوتیں ہوئی تھیں لیکن حالیہ بغاوت ان سب سے مختلف ہے۔ اس کی اپنی چند اہم اور فیصلہ کن خصوصیات ہیں۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے جب سپاہیوں کی رجمنٹوں نے اپنے افسروں کو قتل کر ڈالا ہے؛ جب باہمی نفرتوں کو بھول کر مسلمان اور ہندو اپنے مشترکہ آقاؤں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں؛ جب "ہندوؤں کی شروع کی ہوئی بغاوت نے دلی کے راج سنگھاسن پر بالآخر ایک مسلمان بادشاہ کو بٹھا دیا ہے"؛ جب بغاوت محض چند مقامات تک ہی محدود نہیں رہ گئی ہے؛ اور آخری بات یہ کہ، جب اینگلو انڈین فوج کی بغاوت انگریزوں کے اقتدار کے خلاف عظیم ایشیائی ممالک کی بے اطمینانی کے عام مظاہرے کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ اس میں رتی بھر بھی شبہ نہیں کہ بنگال کی فوج کی بغاوت فارس اور چین کی جنگوں کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رکھتی ہے۔

بنگال کی فوج میں چار مہینے پہلے جو بے اطمینانی پھیلنے لگی تھی، اس کا نام نہاد سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ دیسی فوجوں کو یہ خدشہ تھا کہ سرکار ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرے گی۔ کہا گیا ہے کہ سپاہیوں میں جو کارتوس بانٹے گئے تھے ان کے کاغذ میں گائے بیلوں اور سوروں کی چربی لگی ہوئی تھی، اور اس لیے ان کو دانت سے کاٹنے کے حکم کو دیسی فوجیوں نے اپنے مذہبی قوانین میں دخل اندازی مانا، اور یہی شے مقامی انتشار اور فسادات کے لیے ایک اشارہ بن گئی۔ 22 جنوری کو کلکتے سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع چھاؤنیوں میں بھیانک آگ لگ گئی۔ 25 فروری کو برہام پور میں انیسویں دیسی رجمنٹ نے بغاوت کر دی جس کے سپاہیوں کو ان کارتوسوں کے استعمال پر اعتراض تھا۔ 31 مارچ کو اس رجمنٹ کا لام توڑ دیا گیا۔ مارچ کے آخر میں بارک پور میں واقع چونتیسویں سپاہی رجمنٹ نے پریڈ گراؤنڈ

پر اپنے ایک سپاہی کو بھری ہوئی بندوق لے کر بالکل اگلی قطار تک آگے بڑھ جانے دیا؛ وہاں سے بغاوت کے لیے اپنے ساتھیوں کو للکارنے کے بعد اس نے اپنے معاون (adjutant) اور سارجنٹ میجر پر حملہ کر کے انھیں زخمی کرنے دیا۔ اس کے بعد جو زبردست ہاتھاپائی ہوئی، اس کے دوران سیکڑوں سپاہی کھڑے تماشا دیکھتے رہے اور کچھ دوسروں نے اس مار پیٹ میں شامل ہو کر اپنی بندوقوں کے کندوں سے افسروں کی مرمت کی۔ اس کے بعد اس ریجی منٹ کا بھی لام توڑ دیا گیا۔ اپریل کے مہینے کی شروعات الہ آباد، آگرہ، انبالہ وغیرہ کئی چھاونیوں میں بنگالی فوج کی آتش زنی سے، میرٹھ میں سبک سواروں کی تیسری ریجی منٹ کی بغاوت سے، نیز مدراس اور بمبئی کی فوجوں میں اسی قسم کے عدم اطاعت کے واقعات سے ہوئی۔ مئی کے شروع میں اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ میں بھی بغاوت کی تیاری ہو رہی تھی، لیکن سر ایچ لارنس کی مستعدی نے اسے روک دیا تھا۔ 9 مئی کو میرٹھ کی تیسری سبک گھڑ سوار فوج کے باغیوں کو جیل کی طرف بھیج دیا گیا تا کہ اس سلسلے میں سنائی گئی وہ اپنی اپنی سزا کاٹ سکیں۔ اگلے دن شام کو تیسری گھڑ سوار فوج کے سپاہی، گیارھویں اور بیسویں، دو دیسی ریجی منٹوں کے ساتھ پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہوئے، اور ان افسروں کو مار ڈالا جو ان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے چھاونیوں میں آگ لگا دی اور جتنے انگریز ان کے ہتھے چڑھے، سب کو کاٹ ڈالا۔ بریگیڈ کے انگریز سپاہیوں نے حالانکہ پیدل سپاہیوں اور گھڑ سوار فوج کی ایک ایک ریجی منٹ، نیز گھڑ سوار اور پیدل توپ خانے کی ایک بڑی طاقت جمع کر لی تھی لیکن رات ہونے سے پہلے وہ کوئی کارروائی نہیں کر سکے۔ باغیوں کو وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور انھیں وہاں سے، کھلے میدان میں، میرٹھ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر واقع دہلی پر دھاوا بولنے کے لیے بڑھ جانے دیا۔ وہاں اڑتیسویں، چوہنویں، اور چوہتّرویں پیدل فوج کی ریجی منٹوں کی دیسی گیریسن، اور دیسی توپ خانے کی ایک کمپنی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ برطانوی افسروں پر حملہ کر دیا گیا، جتنے بھی انگریز باغیوں کے ہاتھ لگے ان کو قتل کر دیا گیا، اور دلّی کے سابق مغل بادشاہ (اکبر) کے وارث (بہادر شاہ) کے ہندستان کا بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ میرٹھ، جہاں امن و امان بحال کر دیا گیا تھا، کی مدد کے لیے بھیجی گئی فوجوں میں سے سرنگیں بچھانے والی اور مورچے کھودنے والی چھ کمپنیوں نے، جو 15 مئی کو وہاں پہنچی تھیں، اپنے کمانڈنگ افسر، میجر فریزر کو مار ڈالا اور فوراً دیہات کی طرف چل پڑیں۔ ان کے پیچھے پیچھے گھڑ سوار توپ خانے کی فوجیں اور چھٹے ڈریگون گارڈز کی بہت سی ٹکڑیاں ان کو گرفتار کرنے کی غرض

> ...ایسا پہلی بار ہوا ہے جب... ہندوؤں کی شروع کی ہوئی بغاوت نے دلی کے راج سنگھاسن پر بالآخر ایک مسلمان بادشاہ کو بٹھا دیا ہے...
> مارکس

سے نکل پڑیں۔ پچاس یا ساٹھ باغیوں کو گولی مار دی گئی، لیکن بقیہ بھاگ کر دلی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پنجاب کے فیروز پور میں ستاونویں دیسی پیدل ریجی منٹوں نے بغاوت کر دی، لیکن ان کی بغاوت کو بزور کچل دیا گیا۔ لاہور سے آنے والے نجی خطوط بتاتے ہیں کہ تمام دیسی فوجیں کھلے عام بغاوت پر اتر آئی ہیں۔ 19 مئی کو کلکتہ میں تعینات سپاہیوں نے سینٹ ولیم کے قلعے پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بوشائر سے بمبئی آئی ہوئی تین ریجی منٹوں کو فوراً کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔

ان واقعات کا جائزہ لیتے وقت میرٹھ کے برطانوی کمانڈر (جنرل ہیوٹ) کے رویے پر حیرت ہوتی ہے، اور لڑائی کے میدان میں اس کا دیر سے آنا، اور ڈھیلے ڈھالے ڈھنگ سے باغیوں کا پیچھا کرنا، اس سے بھی کم سمجھ میں آتا ہے۔ دلی جمنا کے داہنے کنارے پر اور میرٹھ اس کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ دونوں کناروں کے درمیان دلی میں صرف ایک پل ہے۔ اس لیے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کا راستہ کاٹ دینے سے زیادہ آسان کوئی دوسری بات نہ ہوتی۔

اس درمیان، بغاوت کے اثر میں نہ آنے والے تمام ضلعوں میں مارشل لا لگا دیا گیا ہے۔ خصوصاً ہندستانی فوجی ٹکڑیاں شمال مشرق اور جنوب سے دلی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پڑوسی راجے رجواڑوں نے انگریزوں کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ لنکا چٹھیاں بھیج دی گئی ہیں کہ لارڈ ایلگن اور جنرل ایش برن ہیم کی فوجوں کو چین جانے سے روک لیا جائے۔ اس کے علاوہ، پندرہ دن کے اندر اندر چودہ ہزار انگریز سپاہی انگلینڈ سے ہندستان بھیجے جا رہے ہیں۔

ہندستان کے حالیہ موسم کی وجہ سے اور رسل و رسائل کے ذرائع نہ ہونے کے باعث برطانوی فوجوں کے آگے بڑھنے میں چاہے جو رکاوٹیں آئیں، لیکن امکان یہی ہے کہ دلی کے باغی بغیر کسی طویل مزاحمت کے شکست سے دوچار ہوں گے۔ لیکن، اس کے باوجود، یہ اس دہشت انگیز المیہ کھیل کی محض تمہید ہے جو وہاں ابھی کھیلا جانے والا ہے۔

لندن میں 30 جون 1857 کو تحریر کیا گیا اور 15 جولائی 1857 کو نیویارک ڈیلی ٹریبون کے شمارہ 5065 میں اداریے مضمون کی صورت میں شائع ہوا

ہندستان میں بغاوت

کارل مارکس

17 جولائی 1857

دلی پر باغی سپاہیوں کا قبضہ ہو جانے اور ان کے ذریعے مغل بادشاہ کی بادشاہت کے اعلان کو، 8 جون کو پورا ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ لیکن ایسے کسی خیال کو دل میں جگہ دینا کہ انگریز فوجوں کے مقابلے میں یہ باغی سپاہی ہندستان کے قدیم دارالسلطنت پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں گے، فضول بات ہوگی۔ دلّی کی حفاظت کے لیے محض ایک دیوار اور ایک معمولی سی خندق ہے، جب کہ اس کے چہار جانب، اور اس سے اونچی اونچی جگہوں پر، جہاں سے ان کی سرگرمیوں کو روکا جاسکتا ہے، انگریزوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ انگریز اس کی فصیلوں کو توڑے بغیر بھی، محض پانی کی سپلائی کاٹ کر، بہت ہی قلیل مدت میں انھیں ہتھیار ڈالنے کو مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ، باغی سپاہیوں کا ایک ایسا غیر منظم ہجوم... جس نے خود اپنے افسروں کو مار ڈالا ہے، نظم وضبط کی دھجیاں بکھیر دی ہیں، ابھی تک کوئی ایسا آدمی تلاش نہیں کر سکا ہے جس کو وہ اپنا سپہ سالار بنا سکے۔ یقیناً ان کے ساتھ کوئی ایسی قوت نہیں ہے جو کسی سنجیدہ اور طویل مدتی مزاحمت کی تنظیم کر سکے۔ اس افراتفری کے عالم میں گویا مزید انتشار پھیلانے کو، دلّی کی رنگ برنگی فوجیں، نئے نئے لوگوں کے آنے سے روزانہ بڑھتی جارہی ہیں۔ بنگال پریزیڈنسی کے کونے کونے سے باغیوں کے نئے نئے گروہ آکر ان میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے گویا کسی پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت وہ اس حرماں نصیب شہر میں خود کو جھونکتے جارہے ہیں۔ 30 اور 31 مئی کو قلعے کی فصیل کے باہر جو دو حملے باغیوں نے کیے تھے، ان کے پیچھے خود اعتمادی یا کسی قسم کی طاقت کے احساس کے بجائے مایوسی کا ہی جذبہ زیادہ کارفرما نظر آرہا تھا۔ ان دونوں ہی حملوں میں انھیں شدید نقصان پہنچا اور انھیں پیچھے دھکیل دیا گیا۔ حیران کن تو صرف برطانوی کارروائیوں کا تساہل ہے۔ ایک حد تک اس کی وجہ موسم کی خوفناکی اور رسل ورسائل کے ذرائع کی قلت ہو سکتی ہے۔ فرانسیسیوں کے اخبار بتاتے ہیں کہ کمانڈر ان چیف جنرل اینسن کے علاوہ تقریباً چار ہزار یوروپی سپاہی جان لیوا گرمی کا شکار ہو چکے ہیں اور اس بات کو تو انگریزی اخبار تک تسلیم کرتے ہیں کہ دلّی کے آس پاس کی لڑائیوں میں فوجیوں کو دشمن کی گولیوں کے مقابلے میں گرمی کے سبب نسبتاً زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ ان کے پاس ذرائع رسل ورسائل کی قلت کے سبب، انبالہ میں تعینات انگریزوں کی فوجوں کو دلّی پر دھاوا بولنے کی غرض سے وہاں تک پہنچنے میں تقریباً ستائیس دن لگ گئے۔ یعنی وہ اوسطاً محض ڈیڑھ گھنٹہ یومیہ ہی چلے۔ مزید تاخیر انبالہ میں بھاری توپوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوگئی۔ نتیجتاً، انبالہ کی فوجوں کو نزدیک ترین توپ خانے سے، جو ستلج کے دوسرے کنارے پر پھلور میں واقع ہے، حملے کے لیے ہتھیار بند گاڑیاں لانے کی ضرورت پڑی۔

اس صورت حال میں، سقوطِ دلّی کی خبر کسی بھی دن آسکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہندستانی سلطنت کے روایتی مرکز پر باغیوں کے ایک مہینے کے بلا مقابلہ قبضے نے بنگال کی فوج کو تتر بتر کر دینے میں، کلکتے سے لے کر شمال میں پنجاب تک اور مغرب میں راجپوتانے تک بغاوت اور فوج سے فرار کی آگ کو بھڑکانے میں، اور ہندستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برطانوی اقتدار کی جڑیں ہلا دینے کا کام کرنے میں اگر زبردست رول ادا کیا تھا تو اس بات کو مان لینے سے بڑی دوسری غلطی نہیں ہوگی کہ دلی کی شکست سے، جس کے سبب سپاہیوں کی قطاروں میں ہراس بھلے ہی پھیل جائے، بغاوت کی آگ فرو ہو جائے گی، یا اس کا پھیلنا رک جائے گا یا برطانوی راج پھر سے قائم ہو جائے گا۔ بنگال کی پوری دیسی فوج میں تقریباً اسی ہزار سپاہی تھے۔ ان میں لگ بھگ اٹھائیس ہزار راجپوت، 23 ہزار برہمن، 13 ہزار مسلمان، 5 ہزار نیچی ذاتوں کے ہندو اور بقیہ یوروپی تھے۔ بغاوت، فوج سے فرار یا برخاستگی کے سبب ان میں سے تیس ہزار غائب ہو گئے ہیں۔ جہاں تک بقیہ فوج کا سوال ہے تو اس کی کئی رجمنٹوں نے کھلے عام اعلان کر دیا ہے کہ وہ برطانوی اقتدار کے تئیں وفادار رہیں گی اور اس کی مدد کریں گی؛ البتہ جس مسئلے سے دیسی فوجیں دوچار ہیں، اس کے تعلق سے وہ باغیوں کی دیسی رجمنٹوں کے خلاف برطانوی حکمرانوں کا ساتھ نہیں دے

سکتیں، بلکہ اس کے برخلاف وہ اپنے 'بھائیوں' کی مدد کریں گی۔ کلکتہ سے لے کر آگے کے تقریباً ہر اسٹیشن پر اس بات کی سچائی ثابت ہو چکی ہے۔ دیسی رجمنٹیں کچھ عرصے تک غیر متحرک رہیں لیکن جیسے ہی انھیں یہ لگا کہ وہ کافی مضبوط ہو گئی ہیں، انھوں نے بغاوت کر دی۔ لندن ٹائمز کے ایک ہندستانی نامہ نگار کو ان رجمنٹوں کی 'وفاداری' پر کوئی شک نہیں جنھوں نے ابھی تک بغاوت کا کوئی اعلان نہیں کیا ہے، اور نہ ہی ان مقامی باشندوں کی وفاداری پر شک ہے جنھوں نے ابھی تک باغیوں کی حمایت نہیں کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اگر آپ پڑھیں کہ 'ہر طرف امن وامان ہے' تو اس کا مطلب یہ سمجھئے کہ مقامی فوجیوں نے ابھی کھلی بغاوت نہیں کی ہے، کہ مقامی باشندوں کا غیر مطمئن حصہ ابھی کھل کر آمادۂ بغاوت نہیں ہوا ہے، کہ یا تو وہ بہت کمزور ہیں یا خود کو کمزور سمجھتے ہیں، یا پھر وہ نسبتاً مناسب موقعے کی تلاش میں ہیں۔ جہاں آپ بنگال کی کسی گھڑ سوار پیدل دیسی رجمنٹ کے اندر 'وفاداری کے مظاہرے' کی بات پڑھیں تو سمجھ لیجیے کہ اس طرح سے جن رجمنٹوں کا مثبت ذکر کیا گیا ہے ان میں سے درحقیقت نصف ہی وفادار ہیں، بقیہ آدھی محض دکھاوا کر رہی ہیں تا کہ مناسب موقع آنے پر وہ یوروپی لوگوں کو مزید کم چوکنا پائیں، یا جس سے کہ شکوک وشبہات کو دور کر کے وہ اپنے باغی ساتھیوں کی اور بھی زیادہ مدد کرنے کی قوت کی حامل ہو جائیں۔''

پنجاب میں، دیسی فوجوں کا لام توڑ کر ہی کھلی بغاوت کو روکا جا سکتا ہے۔ اودھ میں صرف لکھنؤ ریزیڈنسی پر انگریزوں کا قبضہ کہا جا سکتا ہے، باقی سب جگہوں پر دیسی رجمنٹوں نے بغاوت کر دی ہے، وہ اپنے گولے بارود کے ساتھ بھاگ گئی ہیں، تمام بنگلوں کو جلا کر انھوں نے خاکستر کر دیا ہے، اور وہ جا کر ان باشندوں سے مل گئی ہیں جنھوں نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ انگریزی فوج کی حقیقی صورت حال اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ پنجاب اور راجپوتانہ، دونوں میں اس نے اب اڑن دستے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی بکھری ہوئی فوجوں کے درمیان رابطے کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے انگریز اب نہ تو سپاہیوں کی اپنی فوج پر بھروسا کر سکتے ہیں اور نہ مقامی لوگوں پر۔ جنگِ جزیرہ نما (آئبیریا) کے دنوں میں فرانسیسیوں کی طرح انگریزوں کا بھی صرف اتنے ہی قطعۂ زمین پر اور اس کے زیر غلبہ ہمسایہ علاقوں پر قبضہ ہے جہاں خود انگریزوں کی فوجیں قابض ہیں۔ اپنی فوج کے بقیہ بکھرے ہوئے لوگوں کے درمیان رابطے کے لیے انھیں اڑن دستوں پر ہی انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔ ان اڑن دستوں کا کام، جو بجائے خود بے حد پُر خطر ہے، جیسے جیسے وسیع طول و عرض میں پھیلتا جاتا

> اگر آپ پڑھیں کہ 'ہر طرف امن وامان ہے' تو اس کا مطلب یہ سمجھئے کہ مقامی فوجیوں نے ابھی کھلی بغاوت نہیں کی ہے... ہندوستانی نامہ نگار

ہے، فطری طور پر اس کا حلقۂ اثر اتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے۔ برطانوی فوجوں کی حقیقی قلت کا ثبوت اس بات سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ بغاوت سے غیر متاثرہ علاقوں سے خزانوں کو ہٹانے کے لیے وہ دیسی سپاہیوں کی مدد لینے کو مجبور ہو گئے تھے، جنھوں نے بغیر کسی استثنا کے، راستے میں ہی بغاوت کر دی، اور ان خزانوں کو لے کر بھاگ گئے جو ان کی محافظت میں دیے گئے تھے۔ انگلینڈ سے بھیجی ہوئی فوجیں، بہترین حالات میں بھی، نومبر سے پہلے نہیں پہنچ سکیں گی، اور چونکہ مدراس اور بمبئی پریزیڈنسیوں سے یوروپی فوجیوں کو ہٹانا مزید خطرناک ہوگا (مدراس کے سپاہیوں کی دسویں رجمنٹ میں بے اطمینانی کے آثار پہلے ہی ظاہر ہو چکے ہیں) اس لیے بنگال کی پوری پریزیڈنسی میں مستقل ٹیکسوں کی وصولیابی کا خیال چھوڑ دینا ہوگا اور انتشار کے عمل کو اسی طرح جاری رہنے دینا ہوگا۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ برمیوں کی حالت نہیں سدھرے گی، گوالیار کا مہاراجا (سندھیا) انگریزوں کی حمایت کرتا رہے گا، نیپال کا نریش (جنگ بہادر) جس کے پاس سب سے اچھی ہندستانی فوج ہے، خاموش رہے گا، ابھی تک بغاوت کے اثر سے بچا ہوا پیشاور غیر مطمئن پہاڑی قبیلوں کے ساتھ نہیں ملے گا، اور فارس کا شاہ (نصر الدین) ہرات خالی کر دینے کی حماقت نہیں کرے گا، تو بھی بنگال کی پوری پریزیڈنسی پر پھر سے فتح پانی ہوگی اور ساری اینگلو انڈین فوج کو از سر نو منظم کرنا ہوگا۔ اس زبردست کارروائی کے سارے اخراجات مکمل طور پر برطانوی عوام کو برداشت کرنے ہوں گے۔ جہاں تک ہاؤس آف لارڈس میں لارڈ گرینول کے پیش کیے ہوئے اس خیال کا تعلق ہے کہ اس کام کے لیے، ہندستانی قرضوں کی مدد سے، ایسٹ انڈیا کمپنی خود ہی وسائل فراہم کر لے گی، تو اس دلیل کی مضبوطی کا اندازہ شمال مغربی ریاستوں کے انتشار کے بمبئی کی منی مارکیٹ پر پڑنے والے اثرات سے لگایا جا سکتا ہے۔ مقامی سرمایہ داروں میں فوری طور پر گھبراہٹ پھیل گئی ہے، بنکوں سے بڑی بڑی رقوم نکال لی گئی ہیں، سرکاری ہنڈیوں کی فروخت تقریباً ناممکن ہو گئی ہے اور بڑے پیمانے پر نہ صرف بمبئی میں، بلکہ اس کے مضافات میں بھی ذخیرہ اندوزی شروع ہو گئی ہے۔

لندن میں 17 جولائی 1857 کو تحریر کیا گیا اور 4 اگست 1857 کو
نیویارک ڈیلی ٹریبیون کے شمارہ 5082 میں شائع ہوا

ہندستان سے آنے والی ڈاک

کارل مارکس

31 جولائی 1857

ہندستان سے آنے والی گذشتہ ڈاک، جس میں دلّی کی 17 جون تک کی خبریں، اور بمبئی کی یکم جولائی تک کی خبریں شامل ہیں، مستقبل کے بارے میں بہت ہی مایوس کن صورت حال کی پیش بینی کر رہی ہے۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر مسٹر ورنن اسمتھ نے جب ہندستان کی بغاوت کی اطلاع ابتداءً ہاؤس آف کامنز کو دی تھی تو انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ اگلی ڈاک یہ خبر لے کر آئے گی کہ دلّی کو زمیں بوس کر دیا گیا ہے۔ ڈاک تو آئی لیکن ابھی تک دلّی کو 'تاریخ کے صفحات سے مٹایا نہیں جا سکا ہے۔' اس وقت کہا گیا تھا کہ توپ خانے کی گاڑیاں 9 جون سے پہلے نہیں لائی جا سکیں گی، اور یہ کہ اجل رسیدہ شہر پر حملہ اس تاریخ تک کے لیے موخر ہو جائے گا۔ لیکن 9 جون کا دن بھی آیا اور کسی قابلِ ذکر واقعے کے بغیر گزر گیا۔ 12 جون اور 15 جون کو چند واقعات رونما ہوئے، لیکن الٹی سمت میں — دلّی پر انگریزوں نے حملہ نہیں کیا بلکہ انگریزوں پر باغیوں نے دھاوا بول دیا۔ البتہ ان کے متواتر حملوں کو پسپا کر دیا گیا ہے۔ اس طرح دلّی کی شکست ایک بار پھر ملتوی ہو گئی ہے، جس کا نام نہاد واحد سبب، محاصرے والے توپ خانے کا فقدان نہیں بلکہ جنرل برنارڈ کا یہ فیصلہ بتایا جا رہا ہے کہ فوجی کمک کا انتظار کیا جائے، کیونکہ اس قدیم پایۂ تخت پر قبضہ کرنے کے لیے تین ہزار کی فوجی قوت یکسر ناکافی ہے جس کی حفاظت تیس ہزار دیسی سپاہی کر رہے ہیں اور فوجی سازوسامان کے تمام گودام جس کے اندر موجود ہیں۔ باغیوں نے اجمیری دروازے کے باہر بھی ایک چھاؤنی ڈال لی تھی۔ اب تک فوجی معاملات پر لکھنے والے تمام ماہرین اس پر متفق تھے کہ تین ہزار فوجیوں پر مشتمل انگریز فوج تیس یا چالیس ہزار کی دیسی فوج کو کچلنے کے لیے کافی ہے۔ اور اگر بات یوں نہیں ہے تو پھر، لندن ٹائمز کے الفاظ کے مطابق، انگلینڈ ہندستان کو 'پھر سے فتح' کرنے میں کس طرح کامیاب ہو سکے گا؟

ہندستان کی برطانوی فوج میں درحقیقت تقریباً تیس ہزار فوجی ہیں۔ آئندہ نصف برس میں انگلینڈ زیادہ سے زیادہ بیس یا پچیس ہزار فوجی بھیج سکتا ہے، جن میں سے چھ ہزار فوجی وہ ہوں گے جو ہندستان میں یوروپیوں کی خالی شدہ آسامیوں پر کام کریں گے۔ بقیہ 18 یا 19 ہزار فوجیوں کی قوت بھی سفر کے مصائب کے سبب ہونے والے نقصان، موسم کی خرابی اور دوسرے سانحوں میں جانیں تلف ہونے کے سبب گھٹ گھٹا کر 14 ہزار رہ جائے گی، اور بس ان ہی کو جنگ کے رنگ منچ پر اترنا ہوگا۔ برطانوی فوج کو طے کرنا ہوگا کہ وہ یا تو اپنی غیر متناسب تعداد کے ساتھ باغیوں کا مقابلہ کرے یا پھر ان کا سامنا کرنے کا خیال ہی ترک کر دے۔ ہم اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ دلّی کے اردگرد فوجیں جمع کرنے میں وہ اس قدر تساہل سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ اگر اس بار کی گرمی بھی ایک ناقابلِ شکست رکاوٹ ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ سر چارلس نیپئر کے زمانے میں ہوئی تھی، تو یوروپ سے کمک پہنچنے کے باوجود کچھ ہی مہینوں میں ہونے والی برسات کے سبب اس تعطل کو جاری رکھنے کا اور بھی اچھا بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ بغاوت دراصل جنوری کے مہینے میں ہی شروع ہو گئی تھی، اور اس طرح برطانوی فوجوں کو اپنا اسلحہ اور اپنی قوت کو مجتمع رکھنے کی وارننگ پہلے ہی مل گئی تھی۔

انگریز فوجوں کے ذریعے دلّی کے محاصرے کے باوجود شہر پر اتنے دنوں تک باغیوں کا قبضہ رہنے کے بلاشبہ فطری اثرات پڑے ہیں۔ اب بغاوت کلکتے کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ بنگال کی پچاس رجمنٹیں نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ خود بنگال کا لشکر قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا ہے، اور یوروپی لوگ جو اس وسیع و عریض خطہ ارض پر کھو گئے ہیں یا الگ تھلگ مقامات پر پھنس چکے ہیں، یا تو باغیوں کے ہاتھوں قتل و غارت کا شکار ہو چکے ہیں یا پھر عالمِ مایوسی میں اپنے دفاع کے لیے مورچہ بندیاں کر رہے ہیں۔ اس بات کا پتا لگنے کے بعد کہ کلکتے میں حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش تیار کی گئی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنی تفصیلات میں یہ ایک باریک بینی سے تیار کی ہوئی سازش ہے، وہاں دیسی فوجی دستوں کا لام توڑ دیا گیا ہے اور

...اگر اس بار کی گرمی بھی ایک نا قابلِ شکست رکاوٹ ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ سر چارلس نیپئر کے زمانے میں ہوئی تھی، تو یوروپ سے کمک پہنچنے کے باوجود کچھ ہی مہینوں میں ہونے والی برسات کے سبب اس تعطل کو جاری رکھنے کا اور بھی اچھا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ بغاوت دراصل جنوری کے مہینے میں ہی شروع ہو گئی تھی، اور اس طرح برطانوی فوجوں کو اپنا اسلحہ اور اپنی قوت کو مجتمع رکھنے کی وارننگ پہلے ہی مل گئی تھی۔

انگریز فوجوں کے ذریعے دلّی کے محاصرے کے باوجود شہر پر اتنے دنوں تک باغیوں کا قبضہ رہنے کے بلاشبہ فطری اثرات پڑے ہیں۔ اب بغاوت کلکتے کے دروازے پر دستک دے رہی ہے...

وہاں کے عیسائی باشندوں نے اپنے رضا کار حفاظتی دستے کی بنیاد ڈال دی ہے۔ بنارس میں ایک دیسی ریجی منٹ سے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی گئی جس کے خلاف سکھوں کے ایک دستے اور تیرھویں بے قاعدہ گھڑ سوار دستے نے مزاحمت کی۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح سکھ بھی برہموں کے ساتھ مل کر مشترکہ محاذ بنا رہے ہیں، اور اس طرح برطانوی حکومت کے خلاف مختلف ذاتوں اور قبیلوں کے لوگ بڑی تیزی سے متحد ہو رہے ہیں۔ انگریزوں کا یہ اعتقادِ کامل رہا ہے کہ ہندستان میں ان کی مکمل طاقت دیسی سپاہیوں کے دم سے ہی ہے۔ اب، اچانک یہ جان کر وہ خاصے مطمئن بیٹھے ہیں کہ انھیں بس ان ہی افواج سے خطرہ درپیش ہے۔ ہندستان سے متعلق گذشتہ بحثوں کے دوران بورڈ آف کنٹرول کے صدر مسٹر ورنن اسمتھ نے پھر بھی یہ اعلان کیا تھا کہ "اس حقیقت پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ دیسی رجواڑوں اور بغاوت کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" دو دن بعد ہی ورنن اسمتھ صاحب کو ایک خبر شائع کرنی پڑی جس میں بدفالی کی پیش گوئی کرنے والا یہ اقتباس بھی شامل تھا:

14 جون کو اودھ کے سابق بادشاہ (واجد علی شاہ) کو، جس کے بارے میں پکڑے گئے کاغذات سے پتا چلا کہ وہ بھی سازش میں شریک تھا، فورٹ ولیم میں قید کر دیا گیا اور اس کے متلدین کے ہتھیار چھین لیے گئے۔

آہستہ آہستہ ایسے حقائق بھی سامنے آئیں گے جو خود جان بُل تک کو یہ یقین دلا دیں گے کہ جسے وہ محض ایک فوجی بغاوت سمجھتا ہے وہ دراصل ایک قومی بغاوت ہے۔

انگریزی اخبار اپنے اس اعتقاد سے بڑے مطمئن نظر آرہے ہیں کہ بغاوت ابھی بنگال پریزیڈنسی کی حدود سے باہر نہیں پھیلی ہے، اور بمبئی اور مدراس کی فوجوں کی وفاداری پر رتی بھر بھی شک نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن نظام (ریاست حیدرآباد کا خود مختار حاکم) کی گھڑ سوار افواج میں اورنگ آباد میں شروع ہونے والی بغاوت کے بارے میں گزشتہ ڈاک سے آنے والی خبریں اس دل خوش کن خیال کی بری طرح نفی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ بمبئی پریزیڈنسی کے ایک ضلع اورنگ آباد کی راجدھانی (صدر مقام) نے، جس کا نام بھی اورنگ آباد ہی ہے، درحقیقت بمبئی کی فوجوں میں بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ اطلاع پچھلی ڈاک سے ملی ہے۔ اورنگ آباد کی بغاوت کے بارے میں کہا تو یہ جا رہا ہے کہ جنرل ووڈبرن نے اس کو کچل دیا ہے لیکن کیا میرٹھ کی بغاوت کو بھی فوری طور پر کچل دینے کی بات نہیں کہی گئی تھی؟ سر ہنری لارنس کے ہاتھوں فرو کیے جانے کے باوجود کیا لکھنؤ کی بغاوت بھی دو ہفتوں کے بعد از سر نو زیادہ شدت کے ساتھ مستحکم ہو کر نہیں پھوٹ پڑی تھی؟ کیا یہ یاد نہیں کیا جائے گا کہ ہندستانی فوجوں میں بغاوت کے بارے میں دی گئی پہلی اطلاع کے ساتھ یہ بھی مطلع کیا گیا تھا کہ امن وامان بحال کر دیا گیا ہے؟ بمبئی اور مدراس کی افواج کا بیشتر حصہ حالانکہ نچلی ذاتوں کے لوگوں پر مشتمل ہے لیکن ہر ریجی منٹ میں اب بھی کئی سو راجپوت مل جائیں گے۔ بنگال کی فوج کے اعلیٰ طبقے کے باغیوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لیے یہ تعداد کافی ہے۔ پنجاب کے بارے میں اعلان کیا گیا ہے کہ وہاں امن وامان قائم ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی گئی کہ "13 جون کو فیروزپور میں فوجیوں کو پھانسیاں دی گئیں۔" اسی کے ساتھ واہن Vaughan کی فوج (پنجاب کی پانچویں پیدل فوج) کے ذریعے "55ویں دیسی فوج کا پیچھا کرنے کا قابلِ تعریف کارنامہ انجام دینے پر اس کی تعریف وتحسین کی گئی ہے۔" ماننا پڑتا ہے کہ یہ بڑا عجیب وغریب قسم کا امن ہے۔

لندن میں 31 جولائی 1857 کو تحریر کیا گیا اور نیویارک ڈیلی ٹریبیون کے شمارہ نمبر 5091 میں 14 اگست 1857 کو شائع ہوا

ہندستان میں بغاوت کی صورتِ حال

کارل مارکس

14 اگست 1857

ہندستان سے آنے والی گزشتہ ڈاک کے ساتھ جو ضخیم رپورٹیں لندن پہنچی تھیں، ان سے دلّی پر قبضہ کیے جانے کی افواہ اتنی تیزی سے پھیل رہی تھی اور اس پر لوگ اتنا زیادہ یقین کرنے لگے تھے کہ سٹہ بازار کے کاروبار پر بھی اس کا اثر پڑا تھا۔ ان خبروں کی ہلکی پھلکی اطلاع برقی تاروں کے ذریعے پہلے ہی مل چکی تھی۔ سیواستوپول پر قبضے کا جو جھانسا دیا گیا تھا، یہ ایک طرح سے چھوٹے پیمانے پر اسی کی تکرار تھی۔ اگر مدراس سے آنے والے ان اخباروں کی تاریخوں اور ان مضمونوں کی ذرا بھی جانچ کر لی جاتی جن میں موافقت کی خبروں کی اشاعت کی بات کہی گئی ہے، تو غلط فہمی دور ہو جاتی۔ کہا جا رہا ہے کہ مدراس سے متعلق اطلاع آگرہ سے 17 جون کو بھیجے ہوئے نجی خطوط پر مبنی ہے، لیکن 17 جون کو ہی لاہور سے جاری کی گئی ایک مستند پریس ریلیز بتاتی ہے کہ 16 جون کی سہ پہر چار بجے تک دلّی کے آس پاس ہر طرف امن تھا۔ یکم جولائی کی تاریخ کا بمبئی ٹائمز لکھتا ہے کہ "کئی حملوں کو روک دینے کے بعد 17 تاریخ کی صبح کو جنرل برنارڈ کمک کا انتظار کر رہے تھے۔" مدراس سے پہنچنے والی اطلاعات کی تاریخ کی سچائی کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے۔ جہاں تک اس کے مشمولات کا تعلق ہے، تو یہ واضح ہے کہ جنرل برنارڈ کے 8 جون کے اس بلیٹن پر جو دلّی کی پہاڑیوں پر بزور کیے گئے قبضے کے بارے میں ہے، اور ان نجی رپورٹوں پر مبنی ہیں جو محصورین پر 12 اور 14 جون کو کی گئی یورش سے متعلق ہیں۔

بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی کے غیر شائع شدہ منصوبوں سے مرتب کر کے کیپٹن لارنس نے دلّی اور اس کی چھاؤنیوں کا ملٹری منصوبہ ترتیب دے دیا ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ دلّی کی مورچہ بندی اتنی کمزور نہیں ہے جتنی وہ پہلے بتائی گئی تھی، اور نہ وہ اتنی مضبوط ہے جتنی اب بتائی جا رہی ہے۔ اس میں ایک قلعہ ہے جس میں رسائی کے لیے یا تو کمندوں کے ذریعے چڑھا جا سکتا ہے یا پھر اس کے عام راستوں کے ذریعے داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اس کی دیواریں جو سات میل سے بھی زیادہ لمبی ہیں، پکی اینٹ اور چونے سے بنی ہوئی ہیں، لیکن ان کی اونچائی بہت زیادہ نہیں ہے۔ خندق تنگ ہے اور زیادہ گہری نہیں ہے، اور بازوؤں میں بنے دفاعی مورچے اس کی سادہ دیوار سے اچھی طرح قاعدے کے ساتھ جڑے ہوئے نہیں ہیں کہ دشمن کی قطار پر بیک وقت باڑھ مار سکیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مدافعتی منارے ہیں۔ ہیئت میں یہ نیم مدوّر ہیں اور بندوقیں رکھنے کے لیے ان میں جگہ جگہ سوراخ ہیں۔ چکر دار سیڑھیاں فصیل کی بلندیوں سے اتر کر مناروں سے ہوتی ہوئی، کمروں تک اور پھر خندق کی سطح تک پہنچتی ہیں۔ ان سیڑھیوں میں پیدل سپاہیوں کے لیے گولی داغنے کے سوراخ بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سے داغے جانے والی گولیوں کی بوچھار، خندق کو پار کر کے فصیل پر چڑھنے والی جماعت کے لیے بڑی پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔ فصیل کی حفاظت کے لیے تعمیر کیے گئے برجوں کے اندر رائفل برداروں کے بیٹھنے کو محفوظ جگہیں بنی ہوئی ہیں، لیکن ان کے استعمال کو توپوں کے ذریعے روکا جا سکتا ہے۔ جس وقت بغاوت شروع ہوئی اس وقت شہر کے اندر کے اسلحہ خانے میں 9 لاکھ کارتوس، محاصرہ کرنے والی گاڑیاں، ایک بڑی تعداد میں توپیں اور 10 ہزار بندوقیں تھیں۔ یہاں کے بارود خانے کو، یہاں کے باشندوں کے حسب منشا، دلی شہر سے باہر کی چھاؤنیوں میں عرصہ پہلے منتقل کر دیا گیا تھا۔ ان میں بارود کے پیپوں کی تعداد 10 ہزار سے کم نہیں تھی۔ دلی کی وہ اہم پہاڑیاں جن پر جنرل برنارڈ نے 8 جون کو قبضہ کیا تھا، دلی کی شمال مغربی سمت میں واقع ہیں۔ یہاں دیواروں کے باہر کی جانب بھی چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں۔

مستند منصوبوں پر مبنی جو تفصیلات حاصل ہوئی ہیں ان سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جائے گی کہ آج جو برطانوی فوج دلّی کے سامنے پڑی ہوئی ہے اگر وہ 26 مئی کو وہاں ہوتی تو اس کے ایک ہی ہلّے میں بغاوت کا گڑھ زمیں بوس ہو جاتا، اور یہ فوج بروقت وہاں پہنچ سکتی تھی بشرطیکہ اسے رسل و رسائل کے معقول اسباب فراہم کیے جاتے۔ جون کے آخر تک بغاوت کرنے والی رجمنٹوں کی جو تعداد بمبئی ٹائمز میں شائع ہوئی اور بعد میں لندن کے اخباروں نے جسے وہاں سے نقل کیا، اس تعداد اور بغاوت کی تاریخوں کو دیکھنے سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ 26 مئی کو دلّی پر صرف چار سے پانچ ہزار کے درمیان فوجیوں کا قبضہ تھا۔ اتنی فوج سات میل لمبی فصیل کی حفاظت کرنے کی بات لمحے بھر کے لیے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ دلی سے میرٹھ صرف چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ 1853 کے آغاز سے ہی، اس نے ہمیشہ بنگال کے

توپ خانے کے صدر مقام کی طرح کام کیا ہے۔ اس لیے وہاں فوج کے سائنسی کاموں کی تجربہ گاہ موجود تھی اور مورچے پر لڑنے اور محصور کرنے کے پینتروں کی مشق کے لیے وہاں پریڈ کا بھی ایک میدان تھا۔ اس وجہ سے اس بات کو سمجھنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہاں کے برطانوی کمانڈر کے پاس ایسے اسباب کی کمی کیونکر ہو گئی جن کے ذریعے اچانک زوردار یورش کر کے شہر پر وہ قابض ہو جاتے۔ اسی طرح کا غیر متوقع بھرپور حملہ جس کے ذریعے ہندوستان میں انگریزی فوجیں دیسی لوگوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں ہمیشہ کامیاب ہوتی رہی ہیں۔ پہلے ہمیں اطلاع دی گئی تھی کہ محاصرہ کرنے والی گاڑیوں اور سازوسامان کا انتظار ہے، پھر کہا گیا کہ کمک کی ضرورت تھی، اور اب لندن کے اخباروں میں سب سے زیادہ باخبر اخبار "دی پریس" بتا رہا ہے کہ:

ہماری سرکار اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ جنرل برنارڈ کے پاس ذخیرے اور گولے بارود کی قلت ہے، اور اس کے پاس گولے بارود کی سپلائی محض 24 راؤنڈ فی سپاہی کے حساب سے ہے۔

دلی کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنے کے بعد جنرل برنارڈ نے 8 جون کو جو بلیٹن جاری کیا تھا اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ شروع میں خود اس کا ارادہ دلی پر اگلے دن حملہ کرنے کا تھا۔ اپنے اصل منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے بجائے وہ کسی نہ کسی وجہ سے محصور لوگوں کے خلاف صرف مدافعتی جنگ لڑتا رہا۔

دونوں جانب طاقت کے تناسب کا اندازہ لگانا ابھی انتہائی مشکل ہے۔ ہندستانی اخبار متضاد بیانوں سے بھرے پڑے ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے ہم 'بوناپارٹسٹ پیز' Bonapartist Pays کے ایک ہندستانی نمائندے کے بیان پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ یہ اخبار کلکتہ میں واقع فرانسیسی کونسل سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے اخباری نمائندے کے بیان کے مطابق 14 جون کو جنرل برنارڈ کی فوج تقریباً 5700 سپاہیوں پر مشتمل تھی، جس کی تعداد اسی مہینے کی بیس تاریخ کو متوقع کمک پہنچنے کے نتیجے میں دوگنی ہو جانے کی امید تھی۔ محاصرے کے سازوسامان میں اس کے پاس تیس بھاری توپیں تھیں، جبکہ ایک اندازے کے مطابق باغیوں کی تعداد چالیس ہزار تھی، جو منظم تو نہ تھے لیکن وہ حملہ اور مدافعت کرنے کے تمام سازوسامان سے لیس تھے۔

چلتے چلتے ہم یہ بھی بتا دیں کہ تین ہزار باغی جو اجمیری دروازے کے باہر، غالباً غازی خاں کے مقبرے میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے، وہ انگریزی فوج کے آمنے سامنے نہیں ہیں، جیسا کہ لندن کے کچھ اخبار تصور کیے ہوئے ہیں؛ بلکہ اس کے برخلاف دونوں کے درمیان دہلی کی پوری چوڑائی حائل ہے کیونکہ اجمیری دروازہ نئی دہلی کے جنوب مغربی حصے کے آخری سرے پر، قدیم دہلی کے کھنڈروں کے شمال میں واقع ہے۔ شہر کی اس سمت میں باغیوں کے ذریعے اس طرح کے مزید کیمپ قائم کرنے میں کوئی شے حارج نہیں ہو سکتی۔ شہر کے شمال مشرقی حصے میں، یامنی کی سمت میں کشتیوں کا پل ان کے قبضے میں ہے جس سے وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مستقل طور پر رابطے میں ہیں، جس کے سبب انھیں سپاہیوں اور رسد کی سپلائی بغیر کسی روک ٹوک کے مسلسل مل رہی ہے۔ دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ (سیوا ستوپول کی مانند) دلی بھی چھوٹے پیمانے پر ایک قلعے کی مانند ہے جس کا اپنے ملک کے اندرونی حصوں کے ساتھ رابطے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

انگریزی فوج کی کارروائیوں میں ہوئی تاخیر کے سبب نہ صرف محصور لوگوں کو اپنی حفاظت کے لیے بڑی تعداد میں سپاہی اکٹھا کرنے کا موقع مل گیا ہے بلکہ کئی ہفتوں تک دلی پر قبضہ کیے رہنے اور بار بار حملے کر کے یوروپی فوجوں کو پریشان کرتے رہنے کے احساس نے، اور اس کے علاوہ فوج میں نئی نئی بغاوتیں ہونے کی روزانہ آنے والی خبروں نے سپاہیوں کے حوصلے بلاشبہ بلند کیے ہیں۔ انگریز اپنی چھوٹی سی فوج کی مدد سے شہر کو گھیرنے کی بات ہرگز نہیں سوچ سکتے بلکہ صرف اچانک چھاپہ مار سکتے ہیں۔ البتہ اگر اگلی معمول کی ڈاک سے دلی پر قبضے کی خبر نہیں آتی تو ہمیں یہ بات طے شدہ مان لینی چاہیے کہ انگریزوں کی جانب سے کسی بھی قسم کی سنجیدہ کارروائی چند مہینوں کے لیے معطل رہے گی۔ برسات کا موسم زوروں پر ہوگا، اور جمنا کی گہری اور سبک موجیں' خندق کو پانی سے بھر دیں گی جس سے شہر کا شمال مشرقی حصہ محفوظ ہو جائے گا۔ دوسری جانب، درجۂ حرارت بڑھنے کے سبب 75 سے لے کر 102 ڈگری فارن ہائٹ تک گرمی پڑے گی، جس کے ساتھ اوسطاً نو انچ تک بارش ہوتی رہے گی۔ اس سے یوروپی لوگوں کو اصلی ایشیائی ہیضے کا شکار ہونا پڑے گا۔ ایسے میں لارڈ ایلن برو کے یہ الفاظ سچ ثابت ہوں گے:

"میری رائے یہ ہے کہ سر ایچ برنارڈ اسی جگہ نہیں رہ سکتے جہاں وہ ہیں۔ موسم ایسا ہونے نہیں دے گا۔ بارش جب زوروں سے شروع ہو جائے گی تو میرٹھ، انبالہ اور پنجاب سے ان کا رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ زمین کی ایک بہت ہی تنگ پٹی میں وہ قید ہو جائیں گے، اور خطرے کی بات تو میں نہیں کرتا لیکن وہ ایسے حالات میں گھر جائیں گے جن کا انجام صرف تباہی اور بربادی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بروقت وہاں سے ہٹ جائیں گے۔"

ایسے حالات میں جہاں تک دلی کا تعلق ہے، اس سوال پر ہر بات منحصر ہوگی کہ جنرل برنارڈ کے پاس اتنا گولہ بارود اور سپاہی جمع ہو جاتے ہیں کہ نہیں کہ جون کے آخری ہفتے میں وہ دلیر حملہ کر سکیں۔ دوسری جانب، اگر وہ پیچھے ہٹتے ہیں تو باغیوں کے حوصلے بہت بلند ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ اس سے بمبئی اور مدراس کی فوجیں بھی کھلے طور پر بغاوت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیں۔

لندن میں 14 اگست 1857 کو تحریر کیا گیا اور 18 اگست 1857 کو
'نیویارک ڈیلی ٹریبیون' کے شمارہ 5094 میں شائع ہوا

ہندستان میں جاری تشدد کی تفتیش

کارل مارکس

28 اگست 1857

لندن میں ہمارے اخباری نمائندے نے، جس کا ہندستانی بغاوت کے سلسلے میں لکھا ہوا خط ہم نے کل شائع کیا تھا، پہلے ہی ان چند واقعات کا بہت مناسب الفاظ میں ذکر کیا ہے جنھوں نے اس پُرتشدد جنگ کے لیے زمین ہموار کی۔ ہماری تجویز ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے ان واقعات پر از سرِ نو غور کریں اور یہ بتلا دیں کہ ہندستان کے برطانوی حکمراں ہندستانی عوام کے ایسے رحم دل اور بے عیب محسن نہیں ہیں جیسا کہ دنیا کو وہ اپنے بارے میں یقین دلانا چاہتے ہیں۔ اس کام میں ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم کے بارے میں ان سرکاری نیلی کتابوں کی مدد لیں گے جو 57-1856 کے اجلاسوں میں ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) میں پیش کی گئی تھیں۔ یہ شہادت ایسی ہے جس کی صداقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

ہمارے سامنے پہلی رپورٹ 'ٹارچر کمیشن آف مدراس' کی ہے جس کے بیان کے مطابق اسے 'مال گزاری کے مقاصد کے لیے تشدد کی عام روش پائے جانے کا یقین ہے۔' رپورٹ یہ خدشہ ظاہر کرتی ہے:

''مال گزاری ادا نہ کرنے کے لیے جتنے لوگوں کے خلاف ہر سال مقدمات درج کیے جاتے ہیں کم از کم اتنے ہی لوگوں کو تشدد کا بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔''

پھر وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے:

''کمیشن کے نزدیک مظالم ڈھائے جانے کے یقین سے بھی زیادہ باعثِ تکلیف بات یہ ہے کہ مظلوم لوگوں کے پاس اپنے اوپر کیے گئے مظالم کی دادرسی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔''

اس مشکل صورتِ حال کے اسباب کمشنروں نے یہ بیان کیے ہیں: (1) جو لوگ کلکٹر سے خود مل کر شکایت کرنا چاہتے ہیں ان کو اس کے دفتر تک رسائی میں سفر میں پیسا اور وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ (2) یہ خدشہ رہتا ہے کہ اگر مظلوم اس قسم کی درخواست خط کی صورت میں بھیجے گا تو اس پر کارروائی کے لیے 'دیکھ لیں' کے محض توثیقی دستخط کے ساتھ واپس تحصیل دار، ضلع پولس اور افسر محصولات کے پاس بھیج دیا جائے گا جس کا مطلب ہے کہ اسی شخص کے پاس جس نے دراصل خود یا اپنے کسی ماتحت پولس والے کی مدد سے اس پر ظلم ڈھایا ہے۔ (3) ان مظالم کے لیے باقاعدہ ملزم اور مجرم ثابت ہو جانے کے باوجود سرکاری افسروں کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کے خلاف اقدام کرنے اور سزا دینے کا قانون ناکافی و نارسا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا الزام مجسٹریٹ کے سامنے ثابت ہو جانے پر بھی مجرم کو محض پچاس روپے جرمانہ اور ایک مہینے قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس کا ایک اور متبادل یہ ہے کہ ملزم کو ''سزا دینے کے لیے فوجداری عدالت کو سونپ دیا جائے، یا سرکٹ کورٹ کے سامنے مقدمہ سماعت کے لیے بھیج دیا جائے۔''

رپورٹ آگے کہتی ہے:

''یہ کارروائی بڑی اکتانے والی معلوم ہوتی ہے، جس کی تطبیق صرف ایک ہی قسم کے جرائم پر ہوتی ہے، یعنی پولیس کے ہاتھوں اپنے اختیارات کے غلط استعمال پر۔ اور کیس کی ضروریات کے اعتبار سے تو یہ بالکل ہی ناکافی ہے۔''

جب کسی پولس والے یا افسر محصولات پر (یہ ایک ہی شخص ہوتا ہے کیونکہ مال گزاری کا کام پولس ہی کرتی ہے) روپے اینٹھنے کی فردِ جرم عائد کی جاتی ہے تو اس کے مقدمے کی سماعت سب سے پہلے ایک معاون کلکٹر کی عدالت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ کلکٹر کے ہاں اپیل کر سکتا ہے، اور پھر ریوینیو بورڈ میں۔ ریوینیو بورڈ معاملے کو سرکار کے پاس، یا دیوانی عدالت میں بھیج سکتا ہے۔

''اس قانونی صورتِ حال میں غریبی کی ماری کوئی رعیت کسی بھی امیر ریوینیو افسر کے خلاف نہیں لڑ سکتی، اور ہمیں ایسی ایک بھی شکایت کا علم نہیں ہے جو عوام کی جانب سے ان دو قوانین (1822 اور 1828) کے تحت درج کرائی گئی ہو۔''

اس کے علاوہ، روپے کی اس جبری وصولی کا اطلاق عوامی سرمایے کو چھیننے، یا افسروں کے ذریعے اپنی جیبیں بھرنے کے لیے رعیت سے مزید پیسا وصول کرنے کی بابت ہوتا ہے۔ اس لیے محصولات کے سلسلے میں طاقت کے استعمال پر سزا دینے کا کوئی قانونی طریقہ نہیں ہے۔

جس رپورٹ سے یہ اقتباسات لیے گئے ہیں، اس کا اطلاق صرف مدراس پریزیڈنسی پر ہوتا ہے، لیکن ستمبر 1885 میں لکھے گئے ڈائرکٹروں کے نام (ایسٹ انڈیا کمپنی کا کورٹ آف ڈائرکٹرز) اپنے خط میں لارڈ ڈلہوزی لکھتا ہے:

''اس میں قطعی کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ ہر ایک برطانوی ریاست میں نچلے درجے کے ماتحتوں کے ہاتھوں کسی نہ کسی صورت میں لوگوں پر تشدد کیا جاتا ہے۔''

اس طرح، اس بات کو سرکاری سطح پر بھی قبول کیا گیا ہے کہ ہندستان کی برطانوی حکومت میں تشدد ہر جگہ ایک مالیاتی ادارے کی شکل اختیار کر چکا ہے، لیکن یہ بات کچھ اس طرح سے تسلیم کی گئی ہے کہ خود برطانوی حکومت پر کسی طرح کا حرف نہ آئے۔ درحقیقت مدراس کمیشن جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ تشدد کرنے کی پوری ذمے داری ماتحت ہندستانی افسروں پر ہے، سرکار کے یوروپی افسروں نے تو اسے روکنے کی، ناکام ہی سہی، ہمیشہ ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس بیان کے جواب میں مدراس کی مقامی لوگوں کی انجمن (Madras Native Association) نے جنوری 1856 میں پارلیمنٹ میں ایک عرضی پیش کی تھی جس میں تشدد کی تفتیش کی درج ذیل بنیادوں پر شکایت کی گئی تھی: (1) درحقیقت تفتیش کی ہی نہیں گئی۔ کمیشن صرف مدراس شہر میں، اور وہ بھی محض تین مہینوں کے لیے بیٹھا تھا۔ جو مقامی لوگ شکایتیں کرنا چاہتے تھے ان میں سے بہ استثنائے چند، اکثر لوگوں کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر جائیں۔ (2) کمیشن نے خرابی کی جڑ کا پتا لگانے کی کوشش نہیں کی؛ اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ خرابی مال گزاری کے طریق کار کے اندر ہی موجود ہے۔ (3) جن دیسی افسروں پر الزام عائد کیے گئے ان سے اس بارے میں کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی گئی کہ ان کے اعلا افسران اس رواج (پر تشدد جبری وصولی) سے کتنے باخبر تھے۔

عرضی گزاروں کا کہنا ہے کہ ''اس معاملے کی شروعات ان لوگوں سے نہیں ہوتی جو اس پر عمل کرتے ہیں بلکہ وہ دراصل ان کے افسروں سے ہو کر ان تک پہنچتی ہے۔ یہ افسر بھی تخمینی روپے کی وصولیابی کے سلسلے میں اپنے یوروپی افسروں کو جواب دہ ہوتے ہیں، اور پھر یہ یوروپی افسر بھی اس حوالے سے حکومت کے اعلیٰ ترین ارباب اختیار کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔''

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ رپورٹ جن شواہد پر مبنی بتائی جاتی ہے، خود اس کے چند اقتباسات اس دعوے کے استرداد کے لیے کافی ہوں گے کہ ''انگریزوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' مثلاً، ایک تاجر مسٹر ڈبلیو. ڈی. کول ہوف کہتا ہے:

''تشدد برتنے کے طریقے مختلف النوع ہیں، اور تحصیل دار کی سوچ یا اس کے ماتحت اہلکاروں کی مرضی پر منحصر کرتے ہیں۔ لیکن میرے لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ اعلیٰ افسران کی جانب سے کیا کسی قسم کی راحت (مظلوموں کو) مل پاتی ہے، کیونکہ شکایت کی عرضیاں عموماً تحصیل دار ہی کے پاس بغرض تفتیش یا اطلاع بہم کرانے کی غرض سے بھیج دی جاتی ہیں۔''

مقامی لوگوں نے جو شکایتیں درج کرائیں ان میں درج ذیل باتیں بھی ملتی ہیں:

پچھلے برس بارش کی کمی کے سبب ہماری دھان کی فصل تباہ ہو گئی، حسب دستور ہم محصولات ادا نہیں کر سکے۔ جب جمع بندی کی گئی تو مسٹر ایڈین کی کلکٹری کے عہد میں کیے گئے ہمارے سمجھوتے میں شامل شرائط کے مطابق ہم نے مطالبہ کیا کہ نقصان کے باعث مال گزاری میں رعایت کی جائے۔ جب رعایت نہیں دی گئی تو ہم نے اپنے پٹے لینے سے انکار کر دیا۔ تب جبراً محصول وصول کرنے کے لیے جون کے مہینے سے اگست تک تحصیل دار نے ہم پر بہت سختی کی کہ ہم محصول ادا کریں۔ مجھے اور دوسرے لوگوں کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں سونپ دیا گیا جو ہمیں دھوپ میں لے جاتے تھے۔ وہاں ہمیں جھکا کر کھڑا کیا جاتا اور ہماری پیٹھوں پر پتھر رکھ دیے جاتے تھے، اور ہمیں جلتی ہوئی ریت پر کھڑا رکھا جاتا تھا۔ آٹھ بجے کے بعد ہمیں اپنے چاولوں کے پاس جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی بدسلوکی تین مہینے تک روا رکھی گئی۔ اس درمیان کبھی کبھار ہم اپنی عرضیاں لے کر کلکٹر کے پاس گئے، جس نے انھیں لینے سے انکار کر دیا۔ ان عرضیوں کو لے کر ہم سیشن عدالت میں گئے اور وہاں اپیل کی۔ اس نے انھیں کلکٹر کے پاس بھیج دیا۔ پھر بھی ہمیں انصاف نہیں ملا۔ ستمبر کے مہینے میں نوٹس دیا گیا اور پچیس دن کے بعد ہماری جائداد قرق کر لی گئی اور اس کے بعد اسے بیچ دیا گیا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا، اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ ہماری عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی۔ ان کی چھاتیوں پر چٹکیاں لگائی گئیں۔

کمشنر کے سوالوں کے جواب میں ایک دیسی عیسائی نے بتایا:

جب کوئی یوروپی یا دیسی رجیمنٹ ادھر سے گزرتی ہے تو رعیت کو غذائی اشیا مفت فراہم کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے سامان کی قیمت مانگ لیتا ہے تو اس پر سخت تشدد کیا جاتا ہے۔

پھر ایک برہمن کی روداد بیان کی گئی ہے۔ اس کے گاؤں والوں اور ہمسایہ دیہات کے لوگوں کے علاوہ اس سے بھی تحصیل دار نے کہا تھا کہ اگر وہ کولیرون پل کی تعمیر کا کام جاری رکھوانا چاہتے ہیں تو پھر تختے، تار کول،

جلانے کی لکڑی وغیرہ فراہم کرائیں۔ انکار کرنے پر برہمن کو بارہ لوگوں نے پکڑ لیا اور مختلف طریقوں سے اسے زدوکوب کیا۔ اس نے آگے بتایا:

میں نے نائب کلکٹر، مسٹر ڈبلیو کیڈل کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی لیکن انھوں نے کوئی تفتیش نہیں کی اور میری شکایت کی درخواست کو پھاڑ ڈالا۔ چونکہ وہ چاہتے ہیں کہ کولیرون کے پُل کی تعمیر غریبوں کے بوتے پر کم خرچ میں پوری کر کے سرکار کی خوشنودی حاصل کر لیں۔ اس لیے تحصیل دار کے ذریعے کیے گئے مظالم کی نوعیت جو بھی ہو، وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

ان غیر قانونی کارروائیوں کی طرف، جن میں جبری وصولی اور ظلم و تشدد اپنی انتہاؤں پر نظر آتے ہیں، اعلیٰ افسروں کا رخ کس طرح کا ہوتا تھا، اس کی ایک مثال مسٹر بریریٹن کے کیس سے فراہم ہوتی ہے۔ یہ 1855 میں پنجاب کے لدھیانہ ضلع کے کمشنر تھے۔ پنجاب کے چیف کمشنر (جان لارنس) کی رپورٹ کے مطابق یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ:

ڈپٹی کمشنر، یعنی خود مسٹر بریریٹن کی جانکاری میں، یا ان کے حکم سے، امیر شہریوں کے گھروں کی بلاوجہ تلاشی لی گئی تھی۔ ایسے موقعوں پر جن لوگوں کی جائدادوں کو قبضے میں لیا جاتا تھا انھیں طویل عرصے تک لوٹایا نہیں جاتا تھا، اور ان کے خلاف کوئی فردِ جرم عائد کیے بغیر انھیں ہفتوں تک جیل میں پڑے رہنے دیا جاتا تھا۔ اور یہ کہ غنڈوں لفنگوں سے مچلکے بھروانے کے قانون کا استعمال بے دریغ اور من مانے طریقے سے بڑی سختی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اور یہ کہ ڈپٹی کمشنر جب مختلف اضلاع کے دوروں پر نکلتا تھا تو مخصوص پولس افسران اور جاسوس اس کے ساتھ جایا کرتے تھے، اور جہاں ضرورت پڑتی وہ ان سے کام لیتا تھا، اور یہ کہ یہ آدمی جبر و تشدد کے اہم کارگزار تھے۔

اسی معاملے سے متعلق اپنے تبصرے Minutes میں لارڈ ڈلہوزی نے لکھا ہے:

ہمارے پاس اس کے ناقابلِ تردید ثبوت ہیں، جن سے مسٹر بریریٹن خود بھی انکار نہیں کر سکتے، کہ بدعنوانیوں اور غیر قانونی کارروائیوں کا الزام لگاتے ہوئے ان کے خلاف چیف کمشنر نے جو طویل فہرست پیش کی ہے اس میں سے ہر الزام کا یہ افسر مجرم ہے۔ اس کی وجہ سے برطانوی انتظامیہ کا دامن داغدار ہوا ہے اور برطانوی رعایا کے بہت سے لوگوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے، انھیں من چاہے ڈھنگ سے جیلوں میں بھرا گیا اور سفاکانہ اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔

لارڈ ڈلہوزی عوام کے سامنے ایک بری مثال پیش کرنا چاہتے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ یہ رائے پیش کرتے ہیں:

فی الحال مسٹر بریریٹن کو ڈپٹی کمشنر کے عہدے کی ذمے داریاں نہیں سونپی جا سکتیں، انھیں موجودہ عہدے سے ہٹا کر فرسٹ کلاس اسسٹنٹ کے درجے والے عہدے پر بھیج دینا چاہیے۔

نیلی کتابوں (سرکاری رپورٹوں) سے لیے گئے ان اقتباسات میں سے آخری مثال مالابار کنارا تعلقے کے ساکنوں کی درخواست کی دی جا سکتی ہے۔ اس درخواست میں یہ بتانے کے بعد کہ سرکار کو کئی عرضیاں دینے کے بعد بھی ان کی سماعت نہیں ہو رہی ہے، اپنی گزشتہ اور موجودہ حالت کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لوگ کہتے ہیں:

رانی کے راج میں گیلی اور سوکھی زمینوں، پہاڑی علاقوں، میدانی علاقوں اور جنگلوں میں ہم لوگ کھیتی کرتے تھے۔ ہمارے اوپر ہلکے پھلکے جو محصولات عائد کیے جاتے تھے وہ ہم ادا کرتے تھے، اور اس طرح ہم امن و امان کی پُرمسرت زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس وقت سرکار کے دو نوکروں، بہادر اور ٹیپو نے ہم پر مزید ٹیکس لگا دیے تھے، لیکن یہ ٹیکس ہم نے کبھی ادا نہیں کیے۔ محصولات کی وصولی میں اس وقت ہم پر تشدد نہیں کیا جاتا تھا، ہم پر جبر نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی ہمارے ساتھ بدسلوکی برتی جاتی تھی۔ اس ملک کا انتظام و انصرام عزت مآب کمپنی کی ماتحتی میں آنے کے بعد انھوں نے ہر قسم کے حربے اور منصوبے ہمارا سرمایہ نچوڑ لینے کے لیے ایجاد کر لیے ہیں۔ اس قابلِ نفریں مقصد کو سامنے رکھ کر ہی انھوں نے قاعدے قانون بنائے اور اپنے کلکٹروں اور دیوانی کے ججوں کو ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم جاری کیا۔ لیکن اُس دور کے کلکٹر اور ان کے ماتحت دیسی افسران کچھ عرصے تک تو ہماری شکایتوں پر مناسب توجہ دیتے رہے اور انھوں نے ہماری خواہشوں کا لحاظ کیا۔ اس کے برخلاف موجودہ دور کے کلکٹر اور اس کے ماتحت لوگ، جو ہر حال میں ترقی پانے کے خواہش مند ہیں، عموماً عوام کی فلاح اور ان کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ہماری شکایتوں پر وہ ذرا بھی کان نہیں دھرتے اور ہم پر ہر طرح کا ظلم کرتے ہیں۔

ہندستان میں برطانوی راج کی ایک سچی تاریخ کا صرف ایک مختصر اور معمولی سا باب میں نے یہاں پیش کیا ہے۔ ان حقائق کے تناظر میں ایمان دار اور غور کرنے والے لوگ شاید یہ پوچھیں کہ کیا اس قوم کے لوگ ان غیر ملکی فاتحین کو اپنے ملک سے نکالنے کی کوششوں میں حق بہ جانب نہیں ہیں، جنھوں نے اپنی رعایا پر اس قدر مظالم کیے ہیں؟ اگر انگریز اس قدر سفاکی کے ساتھ یہ سب کر سکتے ہیں تو پھر بغاوت اور جدوجہد کے سبب شدید غصے کے عالم میں باغی ہندستانیوں کو ان کے تئیں بے رحمانہ سلوک اور ظلم کا مجرم کیوں قرار دیا جائے؟

لندن میں 28 اگست 1857 کو تحریر کیا گیا اور نیویارک ڈیلی ٹریبیون کے شمارہ نمبر 5120 میں 17 ستمبر 1857 کو خصوصی مضمون کے طور پر شائع ہوا

دلّی پر قبضہ

فریڈرک اینگلس

16 نومبر 1857

فوجوں کے ذریعے دلی پر یورش کر کے قبضہ کر لینے کے بعد، اُن کی شجاعت کی تعریف میں جس شور وغل کی گونج آج برطانیہ میں آسمان تک سنائی دے رہی ہے، ہماری آواز اس کورس میں شامل نہیں ہوگی۔ خود ستائی کے معاملے میں دنیا کی کوئی بھی قوم انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہاں تک کہ فرانسیسی بھی نہیں، خصوصاً ایسے معاملے میں جب سوال بہادری کا ہو۔ جیسے ہی حقائق کا تجزیہ کیا جاتا ہے، سو میں سے ننانوے بار اُن کی جواں مردی کی پُرشکوہ داستان ایک نہایت معمولی واقعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ صاحب خانہ انگریز، جو اپنے گھروں میں آسائش کی زندگی گزارتے ہیں، ویسے تو دوسروں کی شجاعت کا کاروبار کرتے ہیں لیکن خود ایسے تمام موقعوں سے دامن بچا جاتے ہیں جہاں فوجی خدمت کے ذریعے نام وری پانے کا ذرا سا بھی امکان ہو۔ وہ آج یہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دلّی پر حملے میں جس غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا، جو بلاشبہ بہادری ضرور تھی لیکن غیر معمولی نہیں تھی، اس میں وہ خود بھی شریک رہے ہیں۔

اگر ہم دلّی کا موازنہ سیواستوپول (یوکرین کا ساحلی شہر) سے کریں تو یقیناً اتفاق کریں گے کہ یہ سپاہی (ہندستانی) روسیوں جیسے نہیں تھے، یہ کہ برطانوی چھاؤنی پر ان کا ایک بھی حملہ انکرمین (کریمیائی جنگ کا ایک مورچہ) کے حملوں کی طرح نہیں تھا، یہ کہ دلی میں توتلے بین (سیواستوپول میں کارہائے نمایاں انجام دینے والا روسی فوجی افسر اور انجینئر ایدوارد وایوانووچ توتلے بین) جیسا کوئی نہیں تھا، اور یہ بھی کہ ہندستانی سپاہیوں کو، جو انفرادی طور پر اور کمپنیوں کی سطح پر بھی بیشتر موقعوں پر بہادری سے لڑے، کسی طرح کی قیادت حاصل نہ تھی۔ نہ صرف بریگیڈ اور ڈویژن کی سطح پر، بلکہ تقریباً تمام بٹالینوں تک میں ان کا کوئی لیڈر نہیں تھا؛ اور یہ کہ ان کا اتحاد کمپنیوں سے آگے نہیں بڑھ پاتا تھا؛ یہ کہ ان میں سائنسی عنصر کا یکسر فقدان تھا جس کے بغیر کوئی بھی فوج آج کے دور میں مجبور محض ہوتی ہے اور شہر کی حفاظت کرنا اس کے لیے کلیتاً مایوس کن کام بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر بھی، تعداد اور جنگ کے وسائل میں جو فرق تھا، یوروپی لوگوں کی بہ نسبت مقامی سپاہیوں میں موسم کا مقابلہ کرنے کی جو استعداد تھی، دلّی کے سامنے پڑی ہوئی (انگریز) فوجیں کبھی کبھی جس طرح بے حد کمزور حالت کا شکار ہو جاتی تھیں، ان سب کی وجہ سے ان کے باہمی فرق کی بھر پائی ہو گئی تھی، اور اسی وجہ سے ان دونوں محاصروں (سیواستوپول اور دلی کے، مترجم) کے درمیان (ان مہمات کو محاصرہ اگر کہیں تو) مماثلتیں تلاش کرنا ممکن ہو سکا ہے۔ پھر سے واضح رہے کہ دلی پر یورش کو ہم کوئی غیر معمولی، یا شجاعت کا نادر مظاہرہ نہیں مانتے، حالانکہ یہ بات درست ہے کہ ہر معرکے کی طرح یہاں بھی شخصی بہادری کے مظاہرے کے مواقع بلاشبہ دونوں ہی جانب دیکھنے کو ملے۔ البتہ اس بات کو ہم مانتے ہیں کہ سیواستوپول اور بلاکلاوا کے درمیان آزمائش کے مقابلے میں انگریز فوجوں نے دلی کی اس مہم میں کہیں زیادہ محنت شاقہ، جرأت و حوصلہ، قوتِ فیصلہ اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا ہے۔ انکرمین کے وقوعے کے بعد، روس گئی ہوئی انگریز فوجیں جہازوں پر بیٹھ کر واپس لوٹنے کو تیار ہو گئی تھیں، اور اس درمیان اگر فرانسیسی نہ آ گئے ہوتے تو بلاشبہ وہ واپس آ بھی گئی ہوتیں۔ لیکن ہندستان کے موسم میں، اس سے پیدا ہونے والی مہلک بیماریاں، رسل ورسائل کے ذرائع میں خلل، جلدی کمک پہنچنے کے امکانات کی عدم موجودگی اور تمام شمالی ہند کی صورتِ حال، یہ تمام باتیں تو یہ کہتی تھیں کہ واپس لوٹ جاؤ، اور انگریز فوجوں نے اس اقدام کی درستگی پر غور بھی کیا، لیکن اس سب کے باوجود وہ اپنے مورچے پر ڈٹی بھی رہیں۔

بغاوت جب اپنے عروج پر تھی، تب جس شے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ شمالی ہند میں ان کے پاس ایک سبک رفتار فوج ہو۔ صرف دو ہی فوجیں تھیں جن کا استعمال اس مقصد کے لیے ہو سکتا تھا: ہیولاک کی وہ چھوٹی سی فوج جو جلد ہی ناکافی ثابت ہوگئی، اور دوسری وہ فوج جو دہلی کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ ان حالات میں، اس پر کوئی اختلاف رائے نہیں کہ دلّی کے سامنے پڑے رہنا اور ناقبل تسخیر دشمن کے سامنے بے فائدہ زور

> ...جدید پیمانوں کے مطابق دلّی کو ہم بمشکل ہی کسی قلعے کا نام دے سکتے ہیں۔ اسے تو بس ایک ایسے مقام کا نام دیا جا سکتا ہے جو محض کسی متحرک فوج کے حملے کا ہی مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس کی پتھر کی فصیل سولہ فٹ اونچی اور بارہ فٹ چوڑی ہے، اور اس کے اوپر تین فٹ موٹی اور آٹھ فٹ اونچی منڈیر ہے۔ اس منڈیر کے اطراف میں چھ فٹ فصیل کھلی ہوئی ہے جس کے نیچے ڈھلان بھی نہیں ہے کہ اس کے سبب قلعے کی حفاظت ہو سکے۔ اس پر براہِ راست گولہ باری کی جا سکتی ہے۔ اس پکی فصیل کے تنگ ہونے کے سبب اس کے برجوں اور دفاعی مناروں کے علاوہ کہیں اور توپیں رکھنا ناممکن ہے۔ یہ برج اور منارے فصیل کے ساتھ ساتھ مخصوص فاصلے پر واقع ہیں، لیکن تحفظ کے اعتبار سے اس میں کئی خامیاں ہیں۔ اس تین فٹ موٹی پکی منڈیر کو محاصرہ ڈالنے والی توپوں کے ذریعے بہ آسانی توڑا جا سکتا ہے..
>
> اینگلس

آزمائی کر کے اپنی قوت گنوانا ایک فوجی غلطی تھی۔ ایک ہی مقام پر پڑے رہنے کی بجائے اگر وہ فوج نقل و حرکت میں رہتی تو چار گنا زیادہ مفید ہوتی۔ اگر وہ متحرک رہتی تو دلّی کے سوا، باقی تمام شمالی ہند کی مزاحمت ختم کی جا سکتی تھی، رسل و رسائل کے راستے پھر سے بنائے جا سکتے تھے، باغیوں کی اپنی قوت کو مجتمع کرنے کی ہر کوشش کو ناکام کرنے میں کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی، اور اس طور ایک فطری اور آسان طریقے سے دلّی پر قبضہ عمل میں آجاتا، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن سیاسی اسباب سے یہ ضروری تھا کہ دلّی کے سامنے جو فوجی چھاونی ڈالی گئی تھی، اسے نہ اٹھایا جائے۔ الزام ہیڈ کوارٹر کے ان عقل کے پتلوں کے سر جانا چاہیے جنھوں نے فوج کو دلّی بھیجا تھا، نہ کہ اس استقلال کے سر جس کا مظاہرہ وہاں پہنچ جانے کے بعد فوج نے کیا تھا۔ ساتھ ہی، ہمیں یہ بتانا بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ برسات کے موسم کا اس فوج پر جو اثر پڑنے کا خدشہ تھا، وہ اس سے کہیں کم متاثر ہوئی تھی۔ ایسے موسم میں، متحرک رہ کر فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں عام طور سے جیسی بیماریاں پھیلتی ہیں، اگر اس کی قریبی تعداد میں بھی وہاں پھیل جاتیں تو فوج کو ہٹانا یا اس کو ختم کر دینا لازمی ہو جاتا۔ فوج اس خطرناک صورتِ حال سے اگست کے آخر تک دوچار رہی۔ پھر ایک تو کمک پہنچنے لگی اور دوسرے باغیوں کی اندرونی نا چاقیاں ان کو کمزور کرتی رہیں۔ ستمبر کے شروع میں محاصرے کی گاڑیاں آ پہنچیں اور اس طرح دفاعی حیثیت، جارحانہ اقدام میں بدل گئی۔ 7 ستمبر کو پہلی بیٹری نے گولہ باری شروع کی اور 13 تاریخ کی شام کو، قابلِ استعمال دو دراریں فصیل میں پڑ گئیں۔ آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ اس درمیان کیا کیا وقوع پذیر ہوا تھا۔

اس مقصد سے اگر ہم جنرل ولسن کی بھیجی ہوئی سرکاری رپورٹ پر بھروسا کریں گے تو یقیناً زبردست غلطی کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ رپورٹ تقریباً اسی طرح سے گمراہ کن ہے جس طرح کریمیا کے انگریزوں کے صدر دفتر سے جاری کی جانے والی دستاویزات ہمیشہ ہی گمراہ کن ہوا کرتی تھیں۔ اس رپورٹ سے کوئی بھی شخص یہ پتا نہیں لگا سکتا کہ وہ دونوں دراریں کہاں پڑی ہیں، نہ کوئی یہ جان سکتا ہے کہ حملہ آور افواج کی صفوں کی ترتیب اور ان کی نقل و حرکت کی صورتِ حال کیا ہے۔ جہاں تک لوگوں کی نجی رپورٹوں کی بات ہے تو بلاشبہ وہ اور بھی زیادہ گمراہ کن ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسے ماہر سائنسی افسروں میں سے جن کے سر تقریباً ساری کامیابی کا سہرا بندھنا چاہیے، ایک افسر انجینئروں اور توپ خانے کی بنگال ٹکڑی کا رکن تھا، اس نے بمبئی گزٹ میں تمام پیش آمدہ حالات کی روداد لکھی ہے۔ یہ رپورٹ اتنی ہی واضح اور پیشہ ورانہ بھی ہے جتنی کہ سادہ اور بے لاگ ہے۔ کریمیا کی جنگ کے دوران تمام عرصے میں ایک بھی ایسا انگریز افسر نہیں مل سکا تھا جو اتنی معقول رپورٹ لکھ سکتا ہو۔ شومیِ قسمت کہ یہ افسر حملے کے پہلے ہی دن زخمی ہو گیا، اور یہیں مراسلات کے اس سلسلے کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس لیے اس کے بعد کے واقعات کے بارے میں ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔

انگریزوں نے دلّی کی حفاظت کا ایسا مضبوط انتظام کر لیا تھا کہ اگر کوئی ایشیائی فوج بھی اس کا محاصرہ کرتی تو وہ اس کا مقابلہ کر لیتے۔ ہمارے جدید پیمانوں کے مطابق دلّی کو ہم بمشکل ہی کسی قلعے کا نام دے سکتے ہیں۔ اسے تو بس ایک ایسے مقام کا نام دیا جا سکتا ہے جو محض کسی متحرک فوج کے حملے کا ہی مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس کی پتھر کی فصیل سولہ فٹ اونچی اور بارہ فٹ چوڑی ہے، اور اس کے اوپر تین فٹ موٹی اور آٹھ فٹ اونچی منڈیر ہے۔ اس منڈیر کے اطراف میں چھ فٹ فصیل کھلی ہوئی ہے جس کے نیچے ڈھلان بھی نہیں

ہے کہ اس کے سبب قلعے کی حفاظت ہو سکے۔ اس پر براہ راست گولہ باری کی جا سکتی ہے۔ اس پکی فصیل کے تنگ ہونے کے سبب اس کے برجوں اور دفاعی مناروں کے علاوہ کہیں اور توپیں رکھنا ناممکن ہے۔ یہ برج اور منارے فصیل کے ساتھ ساتھ مخصوص فاصلے پر واقع ہیں، لیکن تحفظ کے اعتبار سے اس میں کئی خامیاں ہیں۔ اس تین فٹ موٹی پکی منڈیر کو محاصرہ ڈالنے والی توپوں کے ذریعے بہ آسانی توڑا جا سکتا ہے (فیلڈ کی توپوں سے بھی ایسا کیا جا سکتا ہے)۔ اس طرح دفاع کرنے والوں کی توپوں کو، خصوصاً خندق کے پاکھوں میں لگی ہوئی توپوں کو خاموش کرانا بہت آسان ہے۔ فصیل اور خندق کے درمیان آگے نکلا ہوا ایک چوڑا حصہ یا میدانی راستہ ہے جس میں بہ آسانی ایک قابل استعمال درار پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس صورتِ حال میں، اس میں پھنس جانے والی فوج کے لیے وادیِ موت بننے کے بجائے یہ خندق فوجی دستوں کے لیے ایسی قیام گاہ بن گئی تھی جہاں وہ اپنی ان صفوں کو پھر سے ترتیب دے سکیں جو ڈھلواں کنارے پر چڑھتے وقت منتشر ہو جاتی ہیں۔

محاصرے کے اصول کے مطابق، ایک ایسے مقام پر جس کے اطراف میں خندقیں ہوں، پیش قدمی کرنا احمقانہ بات ہوتی۔ اس وقت بھی یہ بے وقوفی ہی کہلاتی جب کہ محاصرے کی پہلی شرط بھی پوری ہو گئی ہوتی، یعنی محاصرے کے لیے ضروری فوجیں بھی ان کے پاس ہوتیں۔ دفاعی تیاریوں کا جو حال تھا، دفاع کرنے والوں کا جو انتشار تھا اور جو پست ہمتی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے حملے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اگر اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ اپنایا جاتا تو یہ ایک ناقابل معافی جرم ہوتا۔ بھرپور حملے (Attaque de vive force) کے نام سے معروف یہ طریقہ فوجی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ دفاعی مورچہ بندی جب اس طرح کی ہو کہ بھاری توپوں کے بغیر اس پر حملہ کرنا ناممکن ہو جائے، تب توپ خانے کی مدد سے اس سے فوری طور پر نمٹ لیا جاتا ہے، قلعے کے اندرونی حصے پر مسلسل گولہ باری کی جاتی ہے، اور جیسے ہی دراریں اتنی کشادہ ہو جاتی ہیں کہ انھیں استعمال کیا جا سکے تو فوجیں حملے کے لیے پیش قدمی کرتی ہیں۔

جس مورچے پر حملہ کیا جا رہا تھا وہ شمال میں، یعنی انگریزوں کے کیمپ کے بالکل سامنے تھا۔ اس مورچے پر دو چہار دیواریاں اور تین برج ہیں۔ درمیان کے (کشمیری گیٹ کے) برج سے وہ ذرا ترچھے زاویے پر پڑتے ہیں۔ اس کا مشرقی حصہ، یعنی کشمیری دروازے کے برج سے پانی کے برج تک کا حصہ نسبتاً چھوٹا ہے، اور کشمیری گیٹ اور موری گیٹ کے برجوں کے درمیان کے مغربی حصے کا سامنا تھوڑا سا آگے بڑھا ہوا ہے۔ کشمیری گیٹ کے برج اور پانی کے برج کے سامنے کا میدان چھوٹے موٹے جنگلوں، باغ باغیچوں اور مکانوں وغیرہ سے گھرا ہوا تھا۔ سپاہیوں نے اس کا صفایا نہیں کیا تھا، اور اس سبب سے حملہ آوروں کو اس سے مدد ملتی تھی۔ (اسی سے اس بات کا جواب مل جاتا ہے کہ ان کی توپوں کے عین سامنے بھی انگریز کس طرح سے اکثر مقامی سپاہیوں کا پیچھا کرتے ہوئے اتنی دور چلے گئے تھے۔ اُن دنوں اس کام کو بہت بہادری کا سمجھا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک ان کو یہ آڑ ملی ہوئی تھی، تب تک اس میں بہ مشکل ہی کوئی خطرہ تھا)۔ اس کے علاوہ، اس مورچے سے تقریباً 400 یا 500 گز کی دوری پر، فصیل ہی کے سامنے ایک گہرا نالا تھا۔ سامنے سے حملہ کرنے میں اس سے فطری طور پر مدد ملتی تھی۔ ندی سے انگریزوں کے بائیں بازو کو تو زبردست سہارا ملا ہی تھا، اس کے علاوہ کشمیری گیٹ اور پانی والے برجوں کے درمیان تھوڑے آگے نکلے ہوئے حصے کا حملے کے مرکزی نشانے کے طور پر انتخاب بھی بالکل درست تھا۔ ساتھ ہی مغرب کی فصیل اور برجوں پر ایک مصنوعی حملہ بھی کیا گیا۔ یہ چال اس قدر کامیاب رہی کہ سپاہیوں کی بیشتر قوت اسی سمت پر متوجہ ہو گئی۔ کابلی دروازے کے باہر کے مضافات میں، انگریزوں کے داہنے حصے پر حملہ کرنے کے لیے انھوں نے ایک طاقت ور فوج اکٹھی کر لی۔ موری گیٹ اور کشمیری گیٹ کے برجوں کے بیچ کی مغربی فصیل کو اگر سب سے زیادہ خطرہ ہوتا تب تو یہ چال بالکل درست اور کارگر ثابت ہوتی۔ متحرک دفاع کے ایک وسیلے کے روپ میں پہلوؤں کی جانب سے گھیرنے والی سپاہیوں کی یہ چال بہت اچھی رہی ہوتی؛ ایسی حالت میں، آگے بڑھ کر حملہ کرنے والی ہر ایک فوجی ٹکڑی کو یہ فوج پہلے ہی ایک بازو کی طرف سے دبا لیتی۔ لیکن اس مورچے کی رسائی مشرق کی جانب، کشمیری گیٹ اور پانی کے برجوں کے درمیان تک نہیں ہو سکی، اور اس طرح اس پر قبضہ ہونے سے، دفاعی فوجوں کا سب سے بہتر حصہ میدانِ جنگ کے فیصلہ کن مقام سے دور ہٹ گیا۔

توپیں نصب کرنے کے لیے ٹھکانوں کا انتخاب، ان کی تعمیر اور ہتھیاروں سے ان کو لیس کرنے کا کام جس طرح سے کیا گیا تھا اور جس طرح سے ان کا استعمال کیا گیا، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انگریزوں کے پاس پچاس توپیں اور مورٹار تھے۔ جو مضبوط، ٹھوس حفاظتی دیواروں کے پیچھے مستحکم چبوتروں پر لگے ہوئے تھے۔ سرکاری بیانات کے مطابق جس مورچے پر حملہ کیا جا رہا تھا اس کے پاس 55 توپیں تھیں، لیکن وہ چھوٹے چھوٹے برجوں اور دفاعی مناروں میں مختلف جگہوں پر نصب تھیں۔ یہ کسی ایک مرکزی جگہ سے ایک ساتھ استعمال میں نہیں لائی جا سکتی تھیں، اور تین

فٹ کی جو فرسودہ سی منڈیر تھی، اس سے ان کا بمشکل ہی تحفظ ہو سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دفاعی توپوں کو خاموش کرنے کے لیے چند ہی گھنٹے درکار تھے، اور اس کے بعد کرنے کو بہت ہی کم کام رہ گیا تھا۔

آٹھ تاریخ کو فصیل سے سات سو گز کی دوری سے بیٹری یا توپ خانہ نمبر ایک کی دس توپوں نے گولہ باری شروع کی۔ جب رات آئی تو اس نالے کو، جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، ایک قسم کی خندق میں بدل دیا گیا۔ نو تاریخ کو بغیر کسی مزاحمت کے اس نالے کے سامنے کے ٹوٹے پھوٹے میدان اور مکانوں پر قبضہ کر لیا گیا اور دس تاریخ کو بیٹری نمبر دو کی آٹھ توپوں کے دہانے کھول دیے گئے۔ بیٹری نمبر تین نے، جسے کسی مخدوش سی جگہ میں پانی کے برج سے دو سو گز کی دوری پر بہت ہمت اور ہوشیاری کے ساتھ کھڑا کیا گیا تھا، اپنی چھ توپوں کے گولے برسانے شروع کیے، اور دس بھاری مورٹاروں نے شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ تیرہ تاریخ کی شام کو رپورٹ ملی کہ دراریں پڑ گئی ہیں، ایک کشمیری برج کے دائیں بازو کی فصیل میں اور دوسری پانی کے برج کے بائیں بازو میں سامنے کی طرف۔ سیڑھیاں لگا کر ان دراروں سے اوپر چڑھا جا سکتا تھا۔ فوری حملے کا حکم دے دیا گیا۔ گیارہ تاریخ کو مصیبت کے مارے دونوں برجوں کے درمیان ڈھال پر سپاہیوں نے حملہ کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کی بیٹریوں کے سامنے تقریباً 350 گز پر جنگ کے لیے خندق تیار کر لی۔ اسی مورچے سے کابلی دروازے کے باہر دونوں جانب سے حملہ کرنے کے لیے بھی وہ آگے بڑھے، لیکن نقل و حرکت میں رہ کر مدافعت کی یہ کوشش، بغیر کسی تنظیم، منصوبے اور جوش و خروش کے کی گئی تھی۔ ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

چودہ تاریخ کی صبح کو انگریزوں کی پانچ فوجی ٹکڑیاں حملے کے لیے آگے بڑھیں۔ ایک دائیں طرف، کابلی دروازے کے مورچے پر قبضہ کرنے کے لیے، اور اس میں کامیاب ہونے کے بعد لاہوری دروازے پر قبضہ کرنے کے لیے۔ ایک ایک ٹکڑی ہر ایک درار کی جانب گئی۔ ایک کشمیری دروازے کی جانب اسے اڑانے کی غرض سے آگے بڑھی، اور ایک ٹکڑی بطور ریزرو بھیجی گئی۔ پہلی کو چھوڑ کر، یہ تمام ٹکڑیاں اپنی مہمات میں کامیاب ہوئیں۔ دراروں کی تو برائے نام ہی حفاظت کی جا سکتی تھی، لیکن فصیل کے پاس واقع مکانوں سے کی جانے والی مزاحمت بہت شدید تھی۔ انجینئروں کی ٹکڑی کے ایک افسر اور تین سارجنٹوں کی بہادری کے سبب (کیونکہ یہاں واقعی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا تھا) کشمیری دروازے کو کھولنے میں کامیابی حاصل کر لی گئی اور اس طرح ایک فوجی ٹکڑی بھی اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ شام تک پورا

...کابلی دروازے کے پاس، پہلو سے گھیرنے کی مساعی، جوابی گھاتیں، رائفل چلانے کی خندقیں، یہ سب اقدامات بتلاتے ہیں کہ جنگی تنظیم کے کچھ سائنٹفک طریقے سپاہیوں نے بھی سیکھ لیے تھے، لیکن ان پر کسی موثر ڈھنگ سے عمل نہیں کیا جا سکا...
اینگلس

شمالی مورچہ انگریزوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ لیکن جنرل ولسن نے یہیں پیش قدمی روک دی۔ جو تابڑ توڑ حملے کیے جا رہے تھے، روک دیے گئے۔ توپوں کو آگے لایا گیا اور شہر کے پر مضبوط حصے کے سامنے انھیں نصب کر دیا گیا۔ اسلحہ خانے پر حملہ کر کے قبضہ کرنے کی بات چھوڑ دی جائے تو حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی کم لڑائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ باغیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے، اور وہ بڑی تعداد میں شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ولسن شہر میں احتیاط کے ساتھ داخل ہوئے۔ سترہ تاریخ کے بعد انھیں مشکل سے ہی کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بیس تاریخ کو انھوں نے شہر پر مکمل قبضہ کر لیا۔

حملے کی کارروائی کے سلسلے میں ہم پہلے ہی اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں۔ جہاں تک دفاع کا تعلق ہے، تو جوابی حملہ کرنے کی کوششیں، کابلی دروازے کے پاس، پہلو سے گھیرنے کی مساعی، جوابی گھاتیں، رائفل چلانے کی خندقیں، یہ سب اقدامات بتلاتے ہیں کہ جنگی تنظیم کے کچھ سائنٹفک طریقے سپاہیوں نے بھی سیکھ لیے تھے، لیکن ان پر کسی موثر ڈھنگ سے عمل نہیں کیا جا سکا۔ کیونکہ یا تو یہ سپاہیوں کو پوری طرح معلوم نہیں تھے یا پھر ان پر عمل پیرا ہونے کے لائق استعداد ان میں نہیں تھی۔ ان کے اختیار کردہ سائنسی طریقے ان کے اپنے ذہن کی ایجاد تھے یا پھر ان یوروپی لوگوں کے ذہن کی جو ان کے ساتھ تھے، یہ فیصلہ کرنا بلاشبہ مشکل کام ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے، یہ کوششیں جن پر حالانکہ ڈھنگ سے عمل نہیں کیا گیا، منصوبہ بندی اور تیاری کے اعتبار سے سیواستوپول کی فعال مدافعت سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ اور جس طرح سے ان پر عمل درآمد کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے گویا کسی یوروپی افسر نے سپاہیوں کے لیے ایک درست منصوبہ تیار کر دیا تھا، لیکن سپاہی یا تو اسے پوری طرح سے سمجھ نہیں پائے یا پھر منظم قیادت کے فقدان کے باعث یہ عملی منصوبے ان کے ہاتھوں محض کمزور اور بے جان کوشش بن کر رہ گئے۔

16 نومبر 1857 کو تحریر کیا گیا، اور 5 دسمبر 1857 کو نیویارک ڈیلی ٹریبیون کے شمارہ نمبر 5188 میں اداریتی مضمون کے طور پر شائع ہوا

اودھ پر حملے کی تفصیلات

فریڈرک اینگلس

8 مئی 1858

بالآخر لکھنؤ پر کیے گئے حملے اور اس کی شکست کی تفصیلی روداد ہمیں مل گئی ہے۔ سر کولن کیمپبل کی رپورٹ جو ملٹری نقطہ نظر سے اطلاعات کی فراہمی کا بنیادی ماخذ ہو سکتی تھی، وہ ابھی تک شائع نہیں کی گئی ہے۔ لیکن برطانوی اخباروں میں شائع ہونے والے مسٹر رسل کے خط، جن کے خاص خاص حصے ہم اپنے قارئین کے سامنے پیش کر چکے ہیں، حملہ آور فریق کی کارروائیوں کی عمومی صورت حال بتانے کے لیے کافی ہیں۔ برقی تار کے ذریعے موصولہ خبروں کی بنیاد پر دفاعی کارروائیوں سے ظاہر لاعلمی اور بزدلی کے تعلق سے جن نتائج پر ہم پہنچے تھے، انھیں تفصیلی رپورٹوں نے بالکل درست ثابت کر دیا ہے۔ ہندستانیوں کی مورچہ بندی بظاہر بڑی مستحکم لگ رہی تھی لیکن درحقیقت اس کی اہمیت ان آگ اگلتے ہوئے پروں والے اژدہوں اور خوفناک چہروں والی تصویروں سے زیادہ نہیں تھی جو چینی 'بہادر' اپنی ڈھالوں پر، یا شہر کی دیواروں پر بنا دیتے ہیں۔ بظاہر ہر قلعہ ایک ناقابلِ تسخیر مورچہ معلوم ہوتا تھا۔ گولہ باری کے لیے بنائے گئے رخنوں، کنگورے دار دیواروں اور چھجوں کے علاوہ اس میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے پر اس تک رسائی ہر اعتبار سے مشکل نظر آتی تھی۔ اس میں ہر جگہ توپیں اور چھوٹے ہتھیار اڑے ہوئے نظر آ جاتے تھے۔ لیکن ہر قلعہ بند مورچے میں دونوں بازوؤں اور عقب کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ مختلف مورچوں کے مابین باہمی ربط و تعاون کی بات تو جیسے سوچی ہی نہیں گئی تھی، اس کے علاوہ، ان کے درمیان کی اور آگے کی زمین کو صاف تک نہیں کیا گیا تھا۔ اس سے محافظوں کے علم میں آئے بغیر سامنے سے اور بازوؤں سے، دونوں طرف سے ان پر حملے کی تیاریاں کی جا سکتی تھیں اور بالکل محفوظ طریقے سے منڈیر سے قریب چند گز تک پہنچا جا سکتا تھا۔ بارودی سرنگیں بچھانے والے بغیر افسروں کے ایسے دستے سے، جو کسی ایسی فوج کا حصہ ہو جس میں بے خبری اور بے ضابطگی کا بول بالا ہو، جس قسم کی حصار بندی کی توقع کی جا سکتی ہے ویسی ہی حصار بندی انھوں نے کر رکھی تھی۔ لکھنؤ کی مورچہ بندی کیا تھی، یہ تو گویا دتی میں لڑی گئی مقامی سپاہیوں کی جنگ کی حکمتِ عملی تھی جس کو اینٹوں کی دیواروں اور مٹی کی منڈیروں کا روپ دے دیا گیا تھا۔ یوروپی فوجوں کی حکمتِ عملی کا مشینی حصہ تو جزوی طور پر وہ جان گئے تھے، فوجی قواعد کے اصولوں، پلٹنوں کی ڈرل کے طریقوں سے بھی وہ بخوبی واقف ہو گئے تھے، توپیں لگا کر مورچے کی تعمیر وہ کر سکتے تھے اور دیواروں میں خفیہ راستے بھی بنا سکتے تھے، لیکن کسی مورچے کی حفاظت کے لیے کمپنیوں اور بٹالینوں کی نقل و حرکت کو کس طرح منظم کیا جائے، یا بیٹریوں اور خفیہ راستوں والے مکانوں اور دیواروں کو ایک دوسرے سے کس طرح مربوط کیا جائے کہ دشمن سے مقابلہ آرائی کا حامل کیمپ تیار ہو جائے، اس کے تعلق سے وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس طرح ضرورت سے زیادہ رخنے ڈال کر انھوں نے اپنے محلوں کی ٹھوس اور مضبوط دیواروں کو کمزور کر لیا تھا۔ ان میں خفیہ راستوں اور رخنوں کی تہوں پر تہیں انھوں نے بنا رکھی تھیں، ان کی چھتوں پر چبوترے بنا کر مورچے بنا لیے تھے۔ لیکن یہ سب لا حاصل تھا کیونکہ انھیں بہت آسانی سے ان ہی کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح سے یہ سب جانتے ہوئے کہ فوجی حکمتِ عملی کے معاملے میں وہ کچے ہیں، اپنی کمزوری کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ہر چوک پر زیادہ سے زیادہ آدمی تعینات کر دیے تھے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا تھا کہ اس سے انگریزوں کی توپوں کو زبردست کامیابی مل جائے، اور بھانت بھانت کی اس بھیڑ پر کسی انجان سمت سے حملہ آور فوجیں جیسے ہی دھاوا بولیں، ویسے ہی ہر قسم کی منظم دفاعی کارروائی ناممکن ہو جائے۔

جب کہ اتفاقیہ صورتِ حال کے نتیجے میں انگریز اس قلعہ بندی کے بظاہر مضبوط سامنے کے حصے پر حملہ کرنے کو مجبور ہو گئے تو یہ پتا چلا کہ ان مورچوں کی تعمیر میں اس قدر خامیاں رہ گئی تھیں کہ بے دھڑک ان تک پہنچا جا سکتا تھا۔ امام باڑے میں ایسا ہی دیکھنے کو ملا۔ اس عمارت کے چند ہی گز کے فاصلے پر ایک پکی دیوار تھی۔ انگریزوں نے ایک چھوٹی سی سرنگ اس دیوار کے قریب بچھا دی تھی، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عمارت کے بالائی

> ...لکھنؤ کی مورچہ بندی کیا تھی، یہ تو گویا دلّی میں لڑی گئی مقامی سپاہیوں کی جنگ کی حکمتِ عملی تھی جس کو اینٹوں کی دیواروں اور مٹی کی منڈیروں کا روپ دے دیا گیا تھا۔ یوروپی فوجوں کی حکمتِ عملی کا مشینی حصہ تو جزوی طور پر وہ جان گئے تھے، فوجی قواعد کے اصولوں، پلٹنوں کی ڈرل کے طریقوں سے بھی وہ بخوبی واقف ہو گئے تھے، توپیں لگا کر مورچے کی تعمیر وہ کر سکتے تھے اور دیواروں میں خفیہ راستے بھی بنا سکتے تھے، لیکن کسی مورچے کی حفاظت کے لیے کمپنیوں اور بٹالینوں کی نقل وحرکت کو کس طرح منظم کیا جائے، یا بیٹریوں اور خفیہ راستوں والے مکانوں اور دیواروں کو ایک دوسرے سے کس طرح مربوط کیا جائے کہ دشمن سے مقابلہ آرائی کا حامل کیمپ تیار ہو جائے، اس کے تعلق سے وہ کچھ نہیں جانتے تھے.....
>
> اینگلس

حصے میں توپوں کے لیے بنے جھروکوں اور رخنوں سے بالکل سامنے کے میدان پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی تھے۔ اس کے بعد وہ دیوار جسے ہندستانیوں نے خود اپنی حفاظت کے لیے بنایا تھا، اس کا استعمال انگریزوں نے عمارت کو توڑنے کے لیے آڑ کے روپ میں کیا۔ اس دیوار کے پیچھے وہ 68-58 پونڈ کی دو توپیں (بحری فوج کی) لے آئے۔ برطانوی فوج میں 68 پونڈ والی ہلکی سے ہلکی توپ کا وزن بھی توپ گاڑی کے بغیر 87 ہنڈرڈ ویٹ ہوتا ہے، لیکن اگر مان لیں کہ بات آٹھ انچ والی توپ کی ہی کی جا رہی ہے تو اس طرح کی ہلکی سے ہلکی توپ کا وزن بھی 50 ہنڈرڈ ویٹ ہوتا ہے، اور گاڑی کے ساتھ کم سے کم تین ٹن۔ اس طرح کی توپوں کو ایک ایسے محل کے نزدیک لے آیا گیا جو کئی منزلہ ہے اور جس کی چھت پر توپ خانہ لگا ہوا ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ محافظ سپاہی فوجی انجینئرنگ کے بارے میں جتنے لاعلم تھے، اور عسکری اہمیت کے مقامات کے بارے میں جس قسم کا استہزائی احساس ان میں پایا جاتا تھا، ویسا احساس اور بے خبری کسی بھی قرار واقعی فوج کے بارودی سرنگیں بچھانے والے فوجیوں میں نہیں مل سکتی۔

اس سائنس کی بابت جس کا انگریزوں کو مقابلہ کرنا پڑا، اتنا ہی کافی ہے۔ جہاں تک حوصلے اور عزم کی بات ہے تو محافظوں میں ان کا بھی اتنا ہی فقدان تھا۔ جیسے ہی ایک فوج نے حملے کے لیے پیش رفت کی ویسے ہی مارٹینئر سے لے کر موتی باغ تک مقامی سپاہیوں بڑے پیمانے پر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان تمام لڑائیوں میں ایک بھی ایسی نہیں ہے (معرکہ تو اسے بمشکل ہی کہا جا سکتا ہے) جس کا اس قتلِ عام سے مقابلہ بھی کیا جا سکے جو سکندر باغ میں کیمپبل کے ذریعے ریزیڈنسی کی مدد کے وقت کیا گیا تھا۔ حملہ آور افواج جیسے ہی آگے بڑھتی ہیں ویسے ہی پیچھے کی طرف ہٹنے کے لیے عموی بھگدڑ مچ جاتی ہے، اور وہاں سے بھاگنے کے چونکہ چند ہی تنگ راستے ہیں اس لیے بے تحاشا بھاگتی ہوئی یہ تمام بھیڑ وہیں ٹھس جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر کشتم پشتم گرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ذرا بھی مزاحمت کیے بغیر لوگ انگریزوں کی گولیوں اور سنگینوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گھبرائے ہوئے دیسیوں کے اوپر کیے جانے والے ان خونی حملوں میں سے صرف ایک حملے کے دوران ہی انگریزوں کی سنگینوں نے جتنی جانیں لی ہیں اتنے لوگوں کی جانیں یوروپ اور امریکہ میں انگریزوں کے ذریعے لڑی گئی جنگوں میں ملا کر بھی نہیں لی ہوں گی۔ مشرق کی لڑائیوں میں، جہاں ایک ہی فریق فعال ہوتا ہے اور دوسرا بالکل بودے ڈھنگ سے ناکارہ، اس قسم کی سنگینوں والی جنگوں کا ہونا عام بات ہے۔ ہر ایک واقعہ برما کے بلووں کی مثال بن گیا ہے۔ مسٹر رسل کی روداد کے مطابق، انگریزوں کو بنیادی نقصان ان ہندستانیوں کے ہاتھوں پہنچا تھا جو فرار ہوتے وقت پیچھے رہ گئے تھے اور جنھوں نے بیریکیڈ بنا کر محلوں کے کمروں میں خود کو بند کر لیا تھا۔ وہاں کھڑکیوں کے اندر سے آنگن اور باغ میں قیام پذیر افسروں کے اوپر انھوں نے گولیاں برسائی تھیں۔

امام باڑے اور قیصر باغ کے حملے کے وقت ہندستانی اتنی تیزی سے بھاگ گئے تھے کہ ان کی چھوڑی ہوئی جگہوں پر قبضہ کرنے تک کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ان مقامات پر انگریز بس یوں ہی چلتے ہوئے پہنچ گئے تھے۔ لیکن درحقیقت دل چسپ بات اب شروع ہو رہی تھی، کیونکہ، جیسا کہ مسٹر رسل بھرپور جوش میں بتاتے ہیں، قیصر باغ کی فتح اس دن اس قدر غیر متوقع تھی کہ اندھادھند لوٹ مار اور غارت گری کو روکنے کی تیاری کرنے تک کا وقت نہیں مل سکا تھا۔ اپنے انگریز گرانڈیل فوجیوں کو اودھ کے ہزمیجسٹی کے ہیرے جواہرات، قیمتی ہتھیاروں، کپڑوں اور ان کی تمام پوشاکوں تک کو اس طرح کھل کر لوٹتے کھسوٹتے دیکھ کر سچے محبِ آزادی، جان بل کو ایک خاص طمانیت کا احساس ہوا ہوگا۔ سکھ، گورکھے اور ان کے تمام نوکر چاکر بھی انگریزوں کی اس مثال کی تقلید کرنے کو بالکل تیار بیٹھے تھے۔ اس کے بعد پھر

لوٹ اور تباہی کا ایسا نظارہ وہاں دکھائی دیا کہ اس کا بیان کرنے کی طاقت مسٹر رسل کے قلم میں بھی نہیں رہ گئی۔ ہر قدم کے ساتھ اب تاراجی اور تباہی کا بازار گرم تھا۔ قیصر باغ کی شکست 14 تاریخ کو ہو گئی تھی، اور اس کے آدھا گھنٹے بعد ہی شہری نظم وضبط جاتا رہا۔ سپاہیوں کے اوپر سے افسروں کا کنٹرول جاتا رہا تھا۔ 17 تاریخ کو لوٹ مار کی روک تھام کے لیے جنرل کیمپبل کو جگہ جگہ پہرا بٹھانے پر مجبور ہونا پڑا، اور اس وقت تک سرگرمی کو موقوف کرنا پڑا جب تک کہ 'موجودہ کھلی چھوٹ ختم نہ ہو جائے۔' ظاہر ہے کہ سپاہی ہاتھ سے بالکل نکل گئے تھے۔ 18 تاریخ کو ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ بہت ہی معمولی قسم کی لوٹ مار تو رک گئی ہے، لیکن غارت گری کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ شہر میں جس وقت فوج کا اگلا حصہ مکانوں کے اندر سے کی جانے والی مقامی لوگوں کی گولہ باری کا مقابلہ کر رہا تھا، اسی وقت اس کا عقبی حصہ خوب جی کھول کر لوٹ کھسوٹ اور غارت گری میں مصروف تھا۔ شام کو اس غارت گری کے خلاف ایک اعلان کیا گیا۔ فرمان جاری کیا گیا کہ ہر رجمنٹ سے چھانٹ چھانٹ کر مضبوط ٹکڑیاں بھیجی جائیں جو لوٹ مار میں ملوث اپنے سپاہیوں کو پکڑ کر واپس لے آئیں۔ انھیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے ماتحتوں کو بھی وہ گھروں سے نہ نکلنے دیں۔ جب تک کہیں ڈیوٹی پر نہ بھیجا جائے تب تک کوئی بھی شخص چھاؤنی سے باہر نہ جائے۔ 20 تاریخ کو اسی فرمان کو پھر سے جاری کیا گیا۔ اسی دن، دو انگریز 'افسر اور معزز لوگ' لیفٹننٹ کیپ اور لیفٹننٹ تھیک ول، شہر میں لوٹ مار کرنے گئے اور وہیں ایک گھر میں ان کو قتل کر دیا گیا۔ 26 تاریخ کو بھی حالات اتنے خراب تھے کہ غارت گری اور آبروریزی کو روکنے کے لیے نہایت سخت فرمان از سرنو جاری کرنے پڑے۔ ہر گھنٹے حاضری لینے کا انتظام نافذ کر دیا گیا۔ تمام سپاہیوں پر شہر میں داخل ہونے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ حکم بھی جاری کر دیا گیا کہ اگر چھاؤنی کے نوکر چاکر ہتھیاروں کے ساتھ شہر میں پائے جائیں تو انھیں پھانسی دے دی جائے۔ جس وقت سپاہی ڈیوٹی پر نہ ہوں وہ ہتھیار لے کر باہر نہ نکلیں، اور جن لوگوں کا لڑائی سے تعلق نہیں ہے ان سب سے ہتھیار چھین لیے جائیں۔ ان احکامات کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لیے 'مناسب جگہوں پر لوگوں کو بینتیں لگانے کے لیے بہت سے مثلث نصب کر دیے گئے۔'

انیسویں صدی میں کسی مہذب فوج کا اس طرح کا سلوک سچ مچ انوکھی شے ہے۔ دنیا کی کوئی بھی دوسری فوج اگر اس طرح کی زیادتیوں کے دسویں حصے کی بھی گناہ گار ہوتی تو غضبناک انگریزی اخبار اس کو کس طرح سے بدنام کرتے، اس کا تصور اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تو برطانوی فوج کے کارنامے ہیں، اور اسی لیے ہم سے کہا جا رہا ہے کہ جنگ میں اس قسم کے واقعات کا ہونا فطری بات ہے۔ برطانوی افسروں اور معزز لوگوں کو پوری آزادی ہے کہ چاندی کے چمچوں، ہیرے جواہرات جڑے کنگنوں اور چھوٹی موٹی ان تمام چیزوں کو، جنھیں وہ اپنی فتح وناموری کے مقامات پر پائیں، تمغوں کی صورت میں ہتھیا لیں۔ اور اگر عین درمیانِ جنگ کیمپبل کو اس بات کے لیے مجبور ہونا پڑا ہے کہ وسیع پیمانے پر جاری قتل وغارت اور ڈاکہ زنی کو روکنے کے لیے وہ خود اپنی ہی فوج کے ہتھیار بھی چھین لے، تو ہو سکتا ہے کہ اس اقدام کے لیے اس کے سامنے فوجی اسباب رہے ہوں۔ لیکن سچ سچ کون ایسا ہوگا کہ اتنی تھکن اور مصیبتوں کے بعد اگر وہ بیچارے چھٹی منائیں اور کچھ موج مستی کریں تو اس پر بھی اسے اعتراض ہو۔

سچ تو یہ ہے کہ یوروپ اور امریکہ میں کہیں بھی کوئی ایسی فوج نہیں ہے جس میں حیوانیت اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہو جتنی برطانوی افواج میں ہے۔ لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت اور تشدد، جنھیں سختی سے ہر جگہ ختم کر دیا گیا ہے، اس پر برطانوی سپاہیوں کا اب بھی قدیم حق، بلکہ خصوصی حق سمجھا جاتا ہے۔ جزیرہ نما کی جنگ (آئبیریا کی) میں باڈاجوز اور سان سیبسٹین پر حملہ کر کے قبضہ کر لینے کے بعد برطانوی فوجیوں نے کئی دن تک جو قابل مذمت کام کیے تھے ان کی کوئی دوسری مثال فرانسیسی انقلاب کے بعد کسی بھی ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مقبوضہ شہر کو لوٹ مار کے لیے سپاہیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کی عہد وسطی کی رسم پر سب جگہ پابندی لگا دی گئی ہے لیکن برطانوی فوج میں یہ اصول اب بھی اسی طرح مروج ہے۔ فوجی ضروریات کی وجہ سے دلّی میں اس لوٹ مار کو روکا گیا تھا، اور حالانکہ اس کے عوض زیادہ تنخواہیں دے کر افواج کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی تھی، پھر بھی وہ خاصی جز بز تھی۔ اور اب لکھنؤ میں اس نے دلّی کی ساری کسر پوری کر لی۔ بارہ دن اور بارہ رات تک لکھنؤ میں کوئی برطانوی فوج نہیں تھی۔ بس قانون سے بے نیاز، شراب کے نشے میں دھت، حیوانیت سے معمور ایک بھیڑ تھی۔ وہ ڈاکوؤں کے گروہوں میں منقسم تھی۔ اور یہ ڈاکو ان مقامی سپاہیوں سے کہیں زیادہ بے لگام، وحشی اور لالچی تھے جن کو وہاں سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ 1858 میں کی گئی لکھنؤ کی تاراجی اور غارت گری برطانوی افواج کے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے ایک نہ مٹنے والے داغ کی مانند کندہ رہے گی۔

ہندستان کو مہذب اور انسان بنانے کے عمل میں سفاک برطانوی فوجوں نے اگر مقامی لوگوں کے نجی سرمایے کو لوٹا تھا تو اس پر مستزاد یہ کہ برطانوی سرکار نے اس کے بعد یہ قدم اٹھایا کہ مقامی لوگوں کو فوری طور پر ان

...اس دوران لوٹ مار کے لیے برطانوی فوج کے بالکل
منتشر ہوجانے کے باعث، باغی بھاگ کر کھلے میدانوں
میں دور تک نکل چکے ہیں۔ ان کا پیچھا کرنے والا کوئی
نہیں۔ وہ روہیل کھنڈ میں پھر سے منظم ہورہے ہیں...

کی جایدادوں سے محروم کردیا۔ لوگ بات کرتے ہیں فرانسیسی انقلاب کی جس
میں امرا، روٴسا اور چرچ کی زمینیں چھین لی گئی تھیں! بات کرتے ہیں نپولین
کی جس نے اورلیان خاندان کی جائداد ضبط کرلی تھی! یہاں لارڈ کیننگ ہیں،
ایک برطانوی رئیس، جن کے قول وفعل اور احساسات نرم ہیں۔ یہ صاحب
اپنے اعلاترافسر، وائی کاؤنٹ پامرسٹن کے حکم سے سارے لوگوں کی زمینیں
ضبط کرلیتے ہیں، ایک ایک جریب، ایک ایک قصبہ اور ایک ایک ایکڑ زمین
چھین لیتے ہیں جو دس ہزار مربع میل کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے۔ جان بُل
کے لیے یہ سچ مچ ایک بڑی شاندار لوٹ ہے۔ اور نئی سرکار کے نام پر، لارڈ
ایلن برو جیسے ہی اس بے مثال اقدام کو غیر مناسب بتاتے ہیں، ویسے ہی اس
زبردست ڈاکہ زنی کی حمایت میں اور یہ دکھانے کے لیے کہ جان بل کو پورا
اختیار ہے کہ وہ جس شے کو چاہے ضبط کرلے، ٹائمز اور دوسرے چھوٹے
موٹے برطانوی اخبار فوراً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن، ہاں، جان بل تو
ایک استثنائی ذی روح ہے، اور، ٹائمز کے مطابق، جو بات اس میں مستحسن
ہے، دوسروں میں وہی عیب ہوسکتی ہے۔

اس دوران لوٹ مار کے لیے برطانوی فوج کے بالکل منتشر ہوجانے
کے باعث، باغی بھاگ کر کھلے میدانوں میں دور تک نکل چکے ہیں۔ ان کا
پیچھا کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ روہیل کھنڈ میں پھر سے منظم ہورہے ہیں۔ اس
کے علاوہ ان کا ایک چھوٹا سا حصہ اودھ کی حدود میں چھوٹے موٹے معرکوں
میں مصروف ہے۔ کچھ دوسرے فراری بندیل کھنڈ کی جانب نکل گئے ہیں۔
ساتھ ہی گرمی اور بارش کے موسم نزدیک آتے جارہے ہیں اور یہ توقع رکھنے
کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس بار بھی موسم گذشتہ برس کی طرح یوروپ
والوں کے لیے غیر معمولی طور پر موافق ہوگا۔ گذشتہ برس، بیشتر یوروپی فوجی
اس موسم کے عادی ہوگئے تھے۔ اس برس ان میں سے زیادہ تر نئے نئے
ہندستان پہنچے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جون، جولائی اور اگست کی فوجی
مہموں میں انگریزوں کو بہت بڑی تعداد میں جانیں گنوانی پڑیں گی۔ ہر ایک
مفتوح شہر میں گیریسنیں تعینات کرنے کی ضرورت کے سبب ان کی فعال
افواج جلد ہی ختم ہوجائیں گی۔ ابھی سے ہمیں یہ بتادیا گیا ہے کہ ایک ہزار
فوجیوں کی ماہانہ کمک پہنچنے پر بھی فوج اس حیثیت میں نہیں ہوگی کہ اسے موثر
کہا جاسکے۔ اور جہاں تک گیریسنوں کی بات ہے تو صرف لکھنؤ کے لیے آٹھ
ہزار فوجیوں کی، یعنی کیمپبل کی ایک تہائی فوج سے بھی زیادہ کی ضرورت
ہوگی۔ روہیل کھنڈ کی مہم کے لیے جو قوت منظم کی جارہی ہے وہ بھی لکھنؤ کی اس
گیریسن سے بمشکل ہی بڑی ہوگی۔ باغیوں کی بڑی بڑی ٹکڑیوں کے منتشر
ہونے کے بعد یہ بات طے ہے کہ چھاپہ ماری کی جنگ چھڑ جائے گی۔ ہمیں
یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ برطانوی افسروں میں یہ رائے بن رہی ہے کہ موجودہ
جنگ، اور اس کے ساتھ ہونے والے معرکوں اور حصار بندیوں کے مقابلے
میں چھاپہ ماری کی لڑائیاں انگریزوں کے لیے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور جان
لیوا ثابت ہوں گی۔ اور بالآخر اب تو سکھ بھی اس طرح کی باتیں کرنے لگے
ہیں جو انگریزوں کے لیے کسی طرح نیک فال نہیں کہی جاسکتیں۔ وہ محسوس
کرتے ہیں کہ ان کے تعاون کے بغیر انگریز ہندستان پر قبضہ برقرار نہیں رکھ
سکتے تھے، اور بغاوت میں اگر وہ بھی شامل ہوگئے ہوتے تو یہ طے ہے کہ کم از
کم کچھ عرصے کے لیے ہی سہی، ہندستان سے انگلینڈ ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اس
بات کو وہ زور سے کہہ رہے ہیں اور اپنے مشرقی ڈھنگ سے بڑھا چڑھا کر
کہہ رہے ہیں۔ انگریز اب ان کی نظر میں کوئی ایسی اعلی نسل کے لوگ نہیں رہ
گئے ہیں، جنھوں نے مڑکی، فیروز شاہ اور الیوال میں انھیں شکست دے دی
تھی۔ اس طرح کے تیقن کے بعد، کھلی عداوت پر اتر آنا مشرقی قوموں کے
لیے بس ایک قدم کے فاصلے جیسی بات رہ جاتی ہے، اور محض ایک چنگاری
سے بھی آگ بھڑک سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ لکھنؤ کی فتح بھی ہندستانی بغاوت کو کچلنے میں اسی طرح
ناکام ہوگئی ہے، جس طرح دلّی کی فتح ناکام ہوئی تھی۔ اس سال گرمیوں کی
فوجی مہم کے نتیجے میں ایسی صورت حال پیدا ہوسکتی ہے، جس کے سبب آئندہ
موسم سرما میں انگریزوں کو موٹے طور پر وہیں سے کام شروع کرنا پڑسکتا
ہے جہاں سے انھوں نے پہلے شروع کیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پنجاب کو
بھی انھیں پھر سے فتح کرنا پڑے۔ لیکن موافق ترین حالات میں بھی انھیں
ایک طویل اور تکلیف دہ چھاپہ مار جنگ سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔
ہندستان کی گرمی میں یوروپ والوں کے لیے یہ کوئی ایسی خوش کن بات
نہیں ہے، جس پر کوئی دوسرا رشک کرے۔

8 مئی 1858 کو تحریر کیا گیا اور 25 مئی 1858 کو نیویارک ڈیلی ٹریبیون کے
شمارہ 5333 میں خصوصی مضمون کے طور پر شائع ہوا

خط و کتابت

مارکس اور اینگلس کے خطوط

1857 پر تبادلۂ خیالات و معلومات

مارکس اور اینگلس نے ایک دوسرے کو بہت سے خط لکھے جن میں عصری حالات کا خاطر خواہ ذکر ہوتا تھا۔ یہاں ان کے خطوط سے صرف اٹھارہ سو ستاون سے متعلق اقتباسات پیش ہیں۔ آ

مارکس بنام اینگلس

15 اگست 1857

...جہاں تک دلی کے معاملات کا تعلق ہے، مجھے یہ لگتا ہے کہ برسات کے موسم میں شدت آنے سے پہلے انگریزوں کو پیچھے ہٹنا شروع کر دینا چاہیے۔ 'ٹریبیون' کے ملٹری نامہ نگار کے طور پر چونکہ تمھاری جگہ فی الحال میں نے مورچہ سنبھال رکھا ہے، اس لیے اس نکتے کو پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ نوٹ: اس مفروضے کی بنیاد پر کہ آج تک کی رپورٹیں حقیقت پر مبنی ہیں...

دلی کی شکست کے بارے میں ہندستان بھر میں افواہیں مسلسل گردش کر رہی ہیں۔ یہ افواہیں کوئی اور نہیں بلکہ کلکتہ سرکار خود پھیلا رہی ہے۔ اس کا مقصد، جیسا کہ مجھے ہندستانی اخبارات سے پتا چلا ہے، مدراس اور بمبئی کی پریزیڈنسیوں میں پھیلی بے اطمینانی کو قابو میں رکھنا ہے۔ تمھاری توجہ منعطف کرنے کی خاطر میں دلی کا ایک پلان منسلک کر رہا ہوں، لیکن یہ تمھیں مجھ کو لوٹانا ضرور ہوگا۔

اینگلس بنام مارکس

رائڈ، 24 ستمبر 1857

ہندستان کے تعلق سے تمھاری خواہش کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس سلسلے میں میرے خیالات جاننے سے تم کو کوئی دل چسپی ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ڈاک سے موصول ہونے والے نقشے کے مندرجات دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اب دیکھو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

گنگا کے وسطی اور اوپری خطوں میں انگریزوں کی حالت اتنی غیر موافق ہے کہ اگر ہم ملٹری کی زبان میں بات کریں تو واحد درست راستہ یہ ہوگا کہ ہیویلاک کی فوجی ٹکڑی اور دلی کی ایک ٹکڑی کا ایک جنکشن، اگر ممکن ہو سکے تو آگرہ میں بنا دیا جائے، لیکن صرف اسی وقت جب ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علاقے کے فوجی پڑاؤں کو، چاہے وہ مہم پر ہوں یا واپس بلا لیے گئے ہوں، خالی کرانے کی ہر ممکن کوشش کر چکی ہو۔ آگرہ کے علاوہ گنگا کے جنوبی خطے کے قریبی اسٹیشنوں، خصوصاً گوالیار (وسطی ہندستانی راجاؤں کے سبب) میں آدمی تعینات کیے جائیں اور گنگا کے نچلے علاقے کے اسٹیشنوں — فا

آباد، بنارس اور دیناپور پر، موجودہ گیریسنوں اور کلکتہ سے پہنچنے والی فوجی کمک کی مدد سے قبضہ کیا جائے۔ اس دوران ندی کے نچلے علاقوں میں عورتوں اور غیر عسکری لوگوں کو محافظت میں لیا جائے تاکہ فوجیں ایک بار پھر متحرک ہو سکیں، اور ان موبائل فوجوں کا استعمال مقامی لوگوں کا اعتبار حاصل کرنے اور رسد کی فراہمی کے لیے کیا جائے۔ اگر آگرہ قبضے میں نہیں آتا تو پھر چاہیے کہ فوجیں کان پور یا الہٰ آباد کی جانب کوچ کریں۔ آخر الذکر پر قبضہ کرنا ہر حال میں ضروری ہے کیونکہ گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں اس کی اہمیت کلیدی ہے۔

اگر آگرہ قبضے میں رہتا ہے اور بمبئی کی فوج بھی دسترس میں رہتی ہے تو پھر بمبئی اور مدراس کی فوجوں کو چاہیے کہ پورے جزیرہ نما پر، احمد آباد سے لے کر کلکتے تک، قبضہ کرلیں، اور شمال کے ساتھ رابطہ قائم کرنے لیے ٹکڑیاں بھیجیں... بمبئی کی فوج اندور اور گوالیار ہوتے ہوئے آگرہ پہنچے اور مدراس کی فوج ساگر اور گوالیار ہوتے ہوئے آگرہ اور جبل پور ہوتے ہوئے الہٰ آباد پہنچے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ آگرہ قبضے میں آجائے گا تو اس کے بعد رابطے کی دوسری لائنیں پنجاب سے آگرہ تک آنی چاہییں۔ ایک لائن کلکتے سے دیناپور اور الہٰ آباد ہوتے ہوئے آئے۔ اس طرح رابطے کی چار لائنیں قائم ہو جائیں گی۔ یوں پنجاب کو چھوڑ کر تین لائنیں کلکتہ، بمبئی اور مدراس واپسی کے کوچ کی بھی بن جائیں گی۔ جنوبی ہند سے آنے والی فوجوں کو آگرہ میں جمع کرنے سے دو مقصد پورے ہوں گے۔ ایک مرکزی ہندستان کے رجواڑوں کو قابو میں رکھنے کا، اور دوسرا، کوچ کے راستے میں پڑنے والے باغی اضلاع کی سرکوبی کا مقصد۔

اگر آگرہ پر قبضہ نہیں ہوتا تو مدراس کی فوج کو چاہیے کہ وہ پہلے الہٰ آباد سے رابطہ قائم کرے اور پھر وہاں کی فوجوں کے ساتھ آگرہ کی جانب کوچ کرے، جبکہ بمبئی کی افواج کو گوالیار کی جانب بڑھنا چاہیے۔

مدراس کی فوج میں لگتا ہے کہ گوڈر پوشوں سے لے کر باوضع لوگوں تک کی خصوصی بھرتی کی گئی ہے، اور اس حد تک یہ قابل اعتماد بھی ہے۔ جبکہ بمبئی کی فوج میں ایک بٹالین میں اوسطاً 150 ہندوؤں کا تناسب ہے، اور یہ اس اعتبار سے خطرناک ہیں کہ بقیہ فوج کو بے اعتنا اور نافرمان بنا سکتے ہیں۔ اگر بمبئی کی فوج بغاوت کر دیتی ہے تو سارے فوجی منصوبے وقتی طور پر بے کار ہو جائیں گے کیونکہ ان پر عمل نہیں کیا جا سکے گا، اور پھر اس کے بعد اس سے زیادہ یقینی کوئی بات نہ ہوگی کہ کشمیر سے لے کر کیپ کوموری (کنیا کماری) تک وسیع پیمانے پر قتل عام ہو۔ اگر بمبئی کی صورت حال یہ ہے کہ مستقبل میں بھی فوجیوں کو باغیوں کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکے گا تو پھر کم از کم مدراس کی ٹکڑیوں کو، جو اب تک ناگپور کی حدود سے باہر نکل چکی ہوں گی، کمک پہنچانی ہوگی اور جتنی جلد ممکن ہو سکے الہٰ آباد اور بنارس کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ہوگا۔

کسی حقیقی اعلیٰ کمان کی عدم موجودگی میں انگریز جس قسم کی مہمل صورت حال سے دوچار ہو گئے ہیں اس کا اندازہ دو متلازم امور سے ہوتا ہے۔ اول، یہ کہ جب ان کی فوجیں چھوٹے چھوٹے اور دور دور واقع اسٹیشنوں تک بکھری ہوئی تھیں تو انھوں نے اپنی قوت کو مجتمع کرنا چاہا، اور دوئم یہ کہ انھوں نے اپنی واحد متحرک فوجی ٹکڑی کو دلی کے سامنے جمع کر کے اس کے ہاتھ باندھ دیے ہیں، جہاں وہ کچھ بھی کرنے کی استعداد نہیں رکھتی، بلکہ درحقیقت وہاں وہ تباہ ہی ہوگی۔ انگریز جنرل جس نے دلی کی جانب پیش قدمی کا حکم دیا ہے، ملازمت سے معزولی اور سولی پر چڑھائے جانے کا سزاوار ہے کیونکہ اسے وہ بات ضرور معلوم رہی ہوگی جو ہمیں ابھی پتا چلی ہے، کہ انگریزوں نے پرانے مورچوں کو اس قدر مستحکم کر دیا ہے کہ اب اس مقام پر قبضہ صرف منظم محاصرے کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کم از کم پندرہ سے بیس ہزار لوگوں کی ضرورت ہوگی، اور اگر اس کا دفاع صحیح ڈھنگ سے کر لیا گیا تو اس سے بھی زیادہ لوگوں کی ضرورت ہوگی۔ موجودہ حالات میں، جب کہ وہ (انگریز فوجی) وہاں پہنچ چکے ہیں، سیاسی اسباب سے انھیں یہ ذمے داری نبھانی ہی ہوگی۔ اب پیچھے ہٹنے کا مطلب ہوگا شکست تسلیم کرنا، اور بہر حال اس سے بچنا مشکل ہی ہے۔

ہیولاک کی فوجوں نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس برس کے ایسے موسم اور وقت میں 126 میل کی مسافت صرف آٹھ دن میں طے کر لینا، جبکہ اس میں آٹھ فوجی جھڑپیں بھی شامل ہیں، یقیناً ماورائے انسان کام محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ بھی تھکن سے خاصے چور ہو چکے ہیں۔ کانپور کے تنگ سے دائرے میں جھڑپوں کا سامنا کرنے کے بعد وہ اور بھی زیادہ تھک جائے گا جس کے سبب محاصرے میں گھر جائے گا۔ یا پھر اسے الہٰ آباد واپس لوٹ جانا ہوگا۔

از سر نو فتح کے لیے درست راستہ گنگا کے میدان سے ہو کر جاتا ہے۔ خاص بنگال پر قبضہ برقرار رکھنا نسبتاً آسان ہوگا کیونکہ وہاں کے باشندوں کے حوصلے بے حد پست ہو چکے ہیں۔ سچ مچ خطرہ دیناپور سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لیے دیناپور، بنارس، مرزاپور اور خصوصاً الہٰ آباد کے مورچے سب سے اہم ہیں۔ الہٰ آباد میں رہ کر یہ ضروری ہوگا کہ پہلے دوآبے (گنگا اور جمنا کا درمیانی خطہ) پر، پھر دونوں ندیوں کے کناروں پر بسے شہروں پر، اور پھر اودھ اور بقیہ علاقے پر قبضہ کیا جائے۔ مدراس و بمبئی سے آگرہ اور الہٰ آباد تک کی لائنیں ان مہمات میں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہمیشہ کی طرح، بنیادی اہمیت فوجوں کے ارتکاز کی ہے۔ جو فوجی کمک

گنگا کے اوپری علاقے کی طرف بھیجی گئی تھی، وہ پورے علاقے میں منتشر ہوگئی ہے اور ابھی تک ایک بھی آدمی الٰہ آباد نہیں پہنچا ہے۔ اگر ان اسٹیشنوں کو محفوظ بنانا ہے تو پھر ایسا کرنا لازمی ہی ہوگا، یا شاید نہ ہو۔ جو بھی ہو، لیکن جن اسٹیشنوں پر قبضہ رکھنا ہے ان کی تعداد کم سے کم رکھنی چاہیے اور جنگ کے لیے فوجوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا شروع کر دینا چاہیے۔ سی کیمپبل کے بارے میں ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ وہ ایک بہادر آدمی ہے، جنرل کے طور پر ممتاز مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اسے ہر قیمت پر ایک متحرک فوج تشکیل دینی ہوگی، چاہے دلی چھوڑنی پڑے یا نہ پڑے۔ پچیس سے تیس ہزار یوروپی فوجیوں کی موجودگی میں اس سے زیادہ مایوس کن صورتِ حال کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس مہم کے لیے محض پانچ ہزار آدمی بھی جمع نہ کیے جا سکیں، جبکہ ان کا نقصان اسٹیشنوں سے واپس بلائی جانے والی گیریسنوں کے ذریعے پورا کیا جائے۔ اس کے بعد ہی کیمپبل یہ دیکھ سکے گا کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور کس قسم کے دشمن سے درحقیقت اس کا واسطہ پڑا ہے۔ لیکن دشواری کی بات یہ ہے کہ وہ احمقوں کی طرح دلی کے سامنے پڑا رہے گا اور اپنے آدمیوں کو روزانہ سو سو کی تعداد میں تباہی کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہے گا۔ اس صورت میں اس کا یہ اقدام مزید 'دلیرانہ' کہلائے گا کہ وہ اس وقت تک وہاں اٹکا رہے جب تک کہ اس کا ہر آدمی بخوشی اپنے انجام کو نہ پہنچ جائے۔ ماضی کی طرح آج بھی دلیرانہ احمق پن ہی کا اجارہ ہے۔

شمال میں جنگ کے لیے فوجیں جمع کی جائیں، مدراس سے زوردار کمک حاصل کی جائے، اور اگر ممکن ہو تو بمبئی سے بھی، بس اتنا ہی کافی ہے۔ اگر نربدا پر مراٹھا راجے دھوکا دیتے ہیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ مثال کے طور پر اس کا حوالہ دیا جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی فوجیں پہلے ہی باغیوں سے مل گئی ہیں۔ یقینی طور پر صرف اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ اکتوبر کے آخر تک یوروپ سے کمک کے پہنچنے کے انتظار میں فوجیں ڈٹی رہیں۔ لیکن اگر بمبئی کی چند اور رجمنٹیں بغاوت کر دیتی ہیں تو پھر فوجی حکمتِ عملی اور چالیں خاک میں مل جائیں گی۔ یہی بات فیصلہ کن بھی ہوگی۔

اینگلس بنام مارکس

جرسی، 29 اکتوبر 1857
3، ایڈورڈ پلیس

ہندستانی سپاہیوں نے دلی کا دفاع بڑے پھوہڑ پن سے کیا ہوگا۔ سب سے بڑا مذاق تو گھروں کے اندر دوبدو جنگ کا ہے، کیونکہ شاید مقامی فوجوں کو شروع میں ہی گھروں میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ اس طرح حقیقی محاصرہ — جسے پس آمدہ واقعات کی بنیاد پر مشکل سے ہی یہ نام دیا جا سکتا ہے — پانچ سے چودہ تاریخ کو محیط ہے۔ یہ اتنا طویل ضرور تھا کہ تین چار سو گز کی دوری سے بحری توپوں کی باڑھ مار کر فصیل میں دراریں پیدا کر دی جاتیں جس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ پانچ اور چھے تاریخ تک یہ توپیں پوزیشن لے چکی تھیں۔ لگتا یہ ہے کہ فصیل پر جو توپیں نصب کی گئی تھیں ان کو چلانے کے لیے موثر تعداد میں لوگ تعینات نہیں کیے گئے تھے، بہ صورتِ دیگر انگریز اتنی تیز رفتاری سے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

اینگلس بنام مارکس

31 دسمبر 1857
پیارے مؤر!

ہندستان کی خبروں کی تلاش میں میں نے شہر بھر کے اخبار چھان مارے ہیں۔ 'گارجین'* کی اپنی تمام کاپیاں میں تمھیں پرسوں ہی بھیج چکا ہوں۔ نہ تو میں 'گارجین' کے متعلقہ شماروں کا حساب رکھ سکا، اور نہ ہی 'ایگزامنر'** اور 'ٹائمز' کے شماروں کا۔ اس کے علاوہ بیلفیلڈ میں بھی کوئی اخبار نہیں بچا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم اس معاملے سے منگل کو ہی نمٹ چکے ہوگے۔ ایسے حالات میں میں مضمون نہیں لکھ سکتا۔ یہ صورتِ حال مزید پریشان کن اس لیے ہے کہ گزشتہ چار ہفتوں میں یہ پہلی شام ہے جب میں اپنے اہم کاموں کی جانب سے لاپروائی برتے بغیر لکھ سکتا تھا۔ جلد سے جلد مجھے یہ لکھو کہ ملٹری والے مضمون کی بابت آئندہ تمھارے ارادے کیا ہیں۔ اب صرف چوبیس گھنٹے بچے ہیں لیکن یہ فرق میرے نزدیک بہت اہم ہے۔

بہر حال، تفصیلی اطلاعات کا پریشان کن حد تک فقدان ہے۔ خبریں محض کانپور سے کلکتہ کے لیے بھیجے جانے والے برقی پیغامات پر ہی منحصر ہیں۔ اس وجہ سے تنقیدی تجزیہ کرنا سچ مچ ناممکن ہو گیا ہے۔ جو نکات میری سمجھ میں آرہے ہیں، یہ ہیں: (1) کانپور سے لکھنؤ (عالم باغ) کا فاصلہ محض چالیس میل ہے۔ ہیولاک کی فوجوں کی پیش قدمی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں طول طویل عرصے تک پندرہ میل یومیہ کے حساب سے چلنا بھی بہت زیادہ طویل مارچ ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے آگے صرف دو تین مارچوں کے بعد کولن (کیمپبل) کو کانپور سے چل کر تیسرے روز عالم باغ پہنچ جانا چاہیے۔ تب بھی اتنا دن ضرور باقی ہوگا کہ فوراً ہی دھاوا بولا جا سکے۔ یہ وہ معیارات ہیں جن پر کولن کے اقدامات کو پرکھنا چاہیے، لیکن مجھے تاریخیں بالکل بھی یاد نہیں آرہی ہیں۔ (2) اس کے پاس بہر حال سات ہزار آدمی تو

ہیں (گنتی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ کلکتہ اور کانپور کے درمیان مارچ بہت تباہ کن رہا ہوگا، اسی لیے بڑی تعداد میں فوجیوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑیں)۔ اگر اس نے اپنی سات ہزار کی فوج سے اودھ کو شکست دے دی ہے (عالم باغ اور لکھنؤ، دونوں گیریسنوں کو)، تو یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ انگریزوں کی پانچ سات ہزار کی فوج کو ہندستان کے کسی بھی علاقے میں جاکر، کھلے میدان میں کچھ بھی کر گزرنے کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات حریفوں پر فوراً اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ اودھ کے لوگ حالانکہ گنگا کے میدانی علاقے کی بڑی جنگجو نسل کے لوگ سمجھے جاتے ہیں لیکن نظم و نسق، اتصال اور ہتھیاروں وغیرہ کے معاملے میں وہ سپاہیوں کے مقابلے میں کمتر ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یوروپی تنظیم سے ان کو کبھی واسطہ نہیں رہا ہے۔ ان اسباب سے یہ جنگ محض بھگدڑ کا معرکہ بن کر رہ گئی۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک جھڑپ تھی جس میں اودھ کے لوگوں کو پسپا ہوکر ایک کے بعد ایک اپنا مورچہ چھوڑنا پڑا۔ یہ بات درست ہے کہ برطانیہ کی سبک پیدل فوج، روسی فوج کے علاوہ، یوروپ کی بدترین فوج ہے، لیکن اس نے کرائمیا کی جنگ سے کچھ تو سبق لیا ہے، اور اب اودھ کی فوج پر ان کو یہ سبقت حاصل رہی کہ ان کی حملہ آور ٹکڑی کو چوکیوں اور صفوں سے متواتر اور مناسب مدد ملتی رہی جو صرف ایک کمانڈر کے ماتحت تھیں اور سب کی سب اپنے واحد مقصد کے لیے پورا تعاون دے رہی تھیں۔ اس کے برخلاف ان کے حریف، اپنی عام ایشیائی روش کے مطابق، غیر منضبط ٹکڑیوں میں بٹ گئے جن میں سے ہر ٹکڑی محاذ پر سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس طرح بیچھے گنا سپاہی انگریزوں کے نشانے پر آگئے تھے۔ ان کے پاس کوئی مستقل مدد کا انتظام نہیں تھا، کوئی ریزرو فوج نہیں تھی، ہر ایک ٹکڑی کی کمان اس کے مقامی سردار نے سنبھال رکھی تھی جو اپنی مرضی سے آزادانہ فیصلے کرنے میں خودمختار تھا۔ یہاں یاد دلانا ضروری ہے کہ ابھی تک ہم نے ایسی ایک بھی مثال نہیں دیکھی ہے کہ ہندستان میں کوئی ایک بھی فوج کسی ایک معروف سردار کے ماتحت منظم کی گئی ہو۔ آنے والی ڈاک میں جنگ کی نوعیت کے بارے میں کوئی اور اشارہ موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فوجوں کی تعیناتی کی تفصیلات یا دائرۂ اثر کے بارے میں بھی کچھ خبر نہیں دی گئی ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں مزید کچھ کہنا میرے لیے بالکل ناممکن ہوگیا ہے (حافظے کی بات تو جانے ہی دیں)۔

* 'گارجین' بورژوا اخبار Manchester Guardian کا خفیف عنوان ہے۔ یہ Free Traders کا ترجمان تھا، بعد میں Liberal Party کا ترجمان بنا جو مانچسٹر میں 1821 میں وجود میں آئی تھی۔

** بورژوا لبرل ہفت روزہ The Examiners لندن سے 1808-81 کے دوران شائع ہوتا رہا تھا۔

مارکس بنام اینگلس

14 جنوری 1858

تمھارا مضمون شاندار ہے، اور اپنے اسلوب و نگارش میں Neue Rheinische Zeitung* کے عروج کے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں تک ونڈ ہیم کا سوال ہے، وہ بہت ناکارہ جنرل ہوسکتا ہے لیکن اس دفعہ اس شخص کی ناکامی کا سبب وہی ناتجربہ کار فوجیں ہیں جو ریڈان میں اس کی کامیابی کا سبب بنی تھیں۔ میری عمومی رائے یہ ہے کہ دلیری، خود انحصاری اور استحکام کے تعلق سے یہ، دوسری فوج جو انگلینڈ نے ہندستان بھیجی ہے (اور جس کا ایک بھی آدمی واپس نہیں لوٹے گا)، پہلی فوج کو مشعل پہنچانے سے قاصر رہے گی، کیونکہ لگتا یہ ہے کہ پہلی فوج لگ بھگ مکمل طور پر انحطاط پذیر ہوچکی ہے۔ جہاں تک فوجوں پر موسم کے اثرات کا تعلق ہے تو ملٹری ڈپارٹمنٹ کے عارضی انچارج کے طور پر میں نے اپنے کئی مضامین میں بالکل درست تخمینہ لگا کر یہ بتایا ہے کہ انگریزوں کی سرکاری ڈاک میں جو اعداد و شمار بتائے گئے ہیں حقیقت میں شرح اموات اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جان اور مال کا جو نقصان ہندستان کے ہاتھوں انگلینڈ کو ہوگا اس کے پیش نظر ہندستان ہمارا بہترین اتحادی ہوگا۔

* Neue Rheinische Zeitung. Organ deremocratie کولون (Cologne) سے یکم جون 1848 سے 19 مئی 1849 تک متواتر شائع ہوتا رہا۔ مارکس اس کے مدیر تھے، اور اینگلس ادارتی بورڈ میں شامل۔ یہ اخبار جمہوری تحریک کے پرولتاریہ بازو کا ایک انقلابی ترجمان تھا۔ اس نے عوام میں تعلیم اور بیداری لانے میں زبردست تعاون دیا اور رد انقلاب کی طاقتوں کے خلاف لڑائی میں لوگوں کو متحد کرنے کا کام کیا۔ اس اخبار کے اداریے، جو جرمن اور یوروپی انقلاب کے سلسلے میں اخبار کے موقف کے عکاس تھے، اصول کے طور پر مارکس اور اینگلس لکھتے تھے۔ پولس کی ستم رانیوں کے باوجود اس اخبار نے انقلابی جمہوریت پسندوں اور پرولتاریہ کے مفاد میں ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔ مارکس کی ملک بدری اور Neue Rheinische Zeitung کے دیگر مدیروں کے خلاف تادیبی کارروائی کے سبب یہ اخبار بند ہوگیا۔

مارکس بنام اینگلس

9 اپریل 1859

ہندستان میں جو اقتصادی ابتری پھیلی ہے اس کو ہندستانی بغاوت کے اصل نتیجے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ یہ مالی بحران اس وقت تک تو ضرور جاری رہے گا جب تک کہ ان طبقوں پر ٹیکس عائد نہیں کیے جاتے جو آج تک انگریزوں کے سب سے مضبوط حمایتی رہے ہیں۔ البتہ اس سے بھی کوئی قابلِ لحاظ مدد نہ مل سکے گی۔ لطیفہ یہ ہے کہ جان بُل ہندستان سے چار سے پانچ ملین

سالانہ نقد ادا کرے گا تا کہ گاڑی چلتی رہے، اور اس طرح اس نفیس پیچیدہ طریقے سے اپنے قومی قرضہ جات کی مناسب شرح ادائیگی میں معاون ہوگا۔ اس بات کا اقرار یقیناً بہت ضروری ہے کہ ہندستانی بازاروں میں مانچسٹر کے سوتی کپڑوں کی مانگ بہت اونچے داموں پر ہے۔ ملٹری کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ہندستان میں کوئی اسی ہزار یوروپی اور دو لاکھ سے دو لاکھ ساٹھ ہزار کے درمیان مقامی لوگوں کی آنے والے کئی برسوں تک کفالت کرنی ہوگی۔ اس پر تقریباً بیس ملین پاؤنڈ خرچ ہوں گے جبکہ محصولات کی مجموعی آمدنی پچیس ملین پاؤنڈ سے زیادہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، بغاوت نے پچاس ملین پاؤنڈ کے مستقل قرض میں اضافہ کیا ہے، یا ولسن کے تخمینے کے مطابق، تین ملین کا مستقل سالانہ خسارہ پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے کو، چلتے رہنے کی صورت میں، دو ملین پاؤنڈ سالانہ کی گارنٹی ہے، اور اگر ان کے محصولات پانچ فیصد کم جمع ہوتے ہیں تو اتنی ہی رقم غیر معینہ مدت کے لیے مختص ہے۔ اب تک ہندستان کو اس سارے جھمیلے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا ہے (ریلوے کی اس چھوٹی سی لائن کے علاوہ جو مکمل ہوگئی ہے)، سوائے اس اعزاز کے کہ اس نے انگریز سرمایہ داروں کو ان کے سرمایے پر پانچ فی صد کے حساب سے رقوم ادا کی ہیں۔ لیکن جان بل نے خود کو دھوکا دیا ہے، بلکہ اس کے سرمایہ داروں نے اسے دھوکا دیا ہے۔ ہندستان کی ادائیگی تو نام نہاد ہے، جبکہ سچ مچ بڑی رقمیں تو جان بل کو ادا کرنی ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ اسٹیلے کے قرض کا قابلِ لحاظ حصہ صرف اس مصرف کا تھا کہ انگریز سرمایہ داروں کا پانچ فی صد قرض ادا کیا جاتا رہے۔ ریلوے کے معاملے تک کی یہی صورتِ حال ہے جس کی عمارت ابھی بنی بھی شروع نہیں ہوئی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ افیون سے ہونے والی آمدنی کو، جو تقریباً چار ملین پاؤنڈ سالانہ ہوتی ہے، چینی معاہدے* کے نتیجے میں زبردست خطرہ درپیش ہے۔ جو بھی ہو، اب یہ اجارہ داری ختم ہو جائے گی اور جلد ہی چین میں افیون کی کھیتی اپنے شباب پر ہوگی۔ افیون پر ٹیکس اس لیے لیا جاتا تھا کیونکہ اس کا شمار ممنوعہ تجارتی اشیا میں ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ہندستان کا موجودہ اقتصادی بحران ہندستان میں ہونے والی جنگ سے کہیں زیادہ مشکل معاملہ ہے۔

* مارکس کا اشارہ چین اور برطانیہ کے درمیان جون 1858 میں قرار پائے غیر مساویانہ معاہدے Teintsin Treaty کی طرف ہے۔ اس کی رو سے 1856-58 کی دوسری 'جنگِ افیون' کا خاتمہ ہوا۔ اس معاہدے کے سبب غیر ملکی تجارت کی نئی بندرگاہیں یانگسی ندی کے کنارے منچوریا میں، جزیرہ ہائے تائیوان میں، ہائنان میں اور تائن تسن میں کھول گئیں۔ پیکنگ (موجودہ بیجنگ) میں مستقل سفارتی نمائندوں کو داخلہ ملا۔ غیر ملکیوں کو پورے ملک میں مفت بری سفر، اور ساحلی اور بحری سفر کا حق دیا گیا۔ عیسائی مشنریوں کے تحفظ کی بھی گارنٹی دی گئی۔

تاجرانہ عیاری سے جابرانہ عمل داری تک

ایک پس نوآبادیاتی مطالعہ

ارمان نجمی

■

ایسا نہ سمجھا جائے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی برطانوی حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر کوئی خود مختار ادارہ تھی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کمپنی کے در پردہ برطانوی حکومت تقریباً دو صدیوں سے محو پیکار تھی۔ اس کا اشرافیہ ہندوستان کو مفتوح دیکھنا چاہتا تھا، امیر طبقہ اس کی دولت لوٹ کر اسے برباد کرنا چاہتا تھا اور تاجر طبقہ اسے اونے پونے فروخت کرنا چاہتا تھا

■

نوآبادیاتی مورخین کے ساتھ ملکی تاریخ نویسوں نے بھی بہادر شاہ ظفر کی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ بسا اوقات ان سے تمسخرانہ سلوک بھی کیا ہے لیکن اب ان کی شخصیت کھل کر سامنے آ رہی ہے

■

تاریخ میں کبھی کبھی ایسا وقت یا دورانیہ بھی آتا ہے جس کا فوری اور طویل مدتی اثر قوموں اور ملکوں کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ برطانوی استعمار اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل کے خاتمہ سے پہلے ہی وطن عزیز پر اپنے پنجے گاڑنے لگا تھا۔ پلاسی کی جنگ 1757 میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کی شکست سے ہی غلامی کی زنجیریں ہمارا مقدر بن چکی تھیں 1764 میں بکسر کے مقام پر شاہ عالم (1759–1806) اور نواب اودھ کی متحدہ فوجوں کی شرمناک شکست کے بعد 1765 میں بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ مغلوں کی رہی سہی ساکھ کو غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں شاہ عالم کی آنکھوں پر سلائیاں پھیرنے کے سانحے نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور زوال کی ایک حد یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ 1785 میں وہ مہاراجہ سندھیا کے زیر حفاظت آ گیا جس نے دلّی کا نظم و نسق سنبھال لیا تھا۔ 1803 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جنرل لیک نے فوجی پیش قدمی کر کے دولت راؤ سندھیا کو ہرا کر دلّی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم صرف نام کا بادشاہ رہ گیا جسے کمپنی سالانہ خراج بھی ادا کرتی رہی اور حسب معمول سال میں کئی بار نذر بھی گذارتی رہی لیکن یہ حقیقت کہ "حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم" خواص و عوام پر ظاہر ہو چکی تھی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ 1707 میں اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی صرف پچاس سال کی مدت کے اندر صوبہ داروں میں خود مختاری کا دور دورہ ہو گیا۔ دکن میں نواب آصف جاہ، اودھ میں نواب غازی الدین حیدر اور بنگال میں علی وردی خان نے مطلق العنانی کی راہ اختیار کر لی۔ جب مرکز کمزور پڑ جاتا ہے تو مرکز گریز طاقتیں اپنا سر اٹھانے لگتی ہیں۔ بنگال کا صوبہ ملک کا آخری مشرقی کنارا کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل تھا۔ اُسے جس آسانی سے گنوا دیا گیا یہ سلطنت کے نظام پر بہت بڑا داغ ہے۔ پلاسی اس سلسلہ کا نقطۂ آغاز تھا جس میں عیاری اور سازش نے فیصلہ کن کردار ادا کیا لیکن ان اسباب کی

جانب نگاہیں کیوں نہیں اُٹھتیں کہ کمپنی کے ساتھ طاقت کی زور آزمائی اور تصادمات میں سراج الدولہ نے مرکز کی طرف کیوں رجوع نہیں کیا نہ ہی قرب وجوار کی علاقائی قوتوں کی حمایت طلب کی۔ جہاں بانی کے اصولوں سے چشم پوشی اور ایک غیر ملکی کمپنی کو تجارت کی اجارہ داری، محصول کی معافی کے علاوہ قلعہ بند حفاظتی دستے رکھنے کی بھی اجازت دینے کا آخر خمیازہ تو انہیں بھگتنا ہی تھا۔ فرخ سیئر جو اپنے دادا اورنگ زیب کی طرح نہ تو اولوالعزم تھا نہ ہی اس کے پاس وہ ذاتی کردار تھا جو اسے نڈر اور خطروں کے سامنے سینہ سپر ہونے کی جرأت بخشتا۔ اس نے 1717 میں کمپنی کو بے پناہ مراعات بخش کر ملکی تجارت کو ہی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس توازن کو بھی تہ وبالا کر دیا جو ہندوستان کے تاجروں کی برآمدات سے ایشیا کے دوسرے ملکوں اور یوروپ کے درمیان قائم تھا۔

یوروپ میں ان دنوں برطانیہ ہی واحد طاقت نہیں تھی بلکہ روس، پروشیا (جرمنی)، آسٹریا، ولندیز اور پرتگال کے ساتھ ہسپانیہ بھی نو آبادیاتی علاقے فتح کر رہا تھا۔ لیکن ہندوستان میں فرانس ہی اس کا واحد حریف تھا جس کا زور ہفت سالہ جنگ کی شکست کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ ایسا نہ سمجھا جائے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی برطانوی حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر کوئی خود مختار ادارہ تھی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کمپنی کے در پردہ برطانوی حکومت تقریباً دو صدیوں سے محو پیکار تھی۔ اس کا اشرافیہ ہندوستان کو مفتوح دیکھنا چاہتا تھا، امیر طبقہ اس کی دولت لوٹ کر اسے برباد کرنا چاہتا تھا اور تاجر طبقہ اسے اونے پونے فروخت کرنا چاہتا تھا۔

اس دور میں ملک کے تئیں وفاداری، وطنیت یا وطن پرستی و قومیت یا قوم پرستی، آپ جو بھی کہہ لیں ایسی کوئی شئے ان کے شعور میں داخل نہیں ہوئی تھی جس کے تحت وہ اپنے اعمال و افعال کی کوئی حد مقرر کر سکتے تھے۔ نہ ہی مذہب وملت کی اعلیٰ قدروں سے کوئی مثبت رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ اقتدار کی کش مکش میں کسی جائز یا ناجائز کا تصور کار فرما نہیں تھا۔ اپنی ذاتی عمل داری قائم رکھنے کے لیے کسی اندرونی یا بیرونی طاقت سے سمجھوتہ کرنے میں حکمران طبقہ کو کوئی عار نہیں تھا۔ اس کے دیرپا اثر یا نتائج کی انہیں شمہ برابر پروا نہیں تھی۔ جن امرا یا زعما کی نگاہ اس جانب تھی بھی وہ مصلحتاً خاموش تھے۔ دور اندیشی اور تدبر کا اثاثہ رفتہ رفتہ اُن کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ 19ویں صدی کی ابتدا ہوتے ہوتے اقتدار اعلیٰ فرنگیوں کے ہاتھوں منتقل ہو گیا اور مغلیہ سلطنت صرف اپنی پرچھائیں بن کر رہ گئی۔

کلائیو نے میر جعفر سے اپنے عہد وپیماں کا کچھ حد تک تو پاس ضرور کیا اور اسے یہ جھانسہ دیتا رہا کہ بنگالہ کے نواب کی حیثیت سے وہ چند معاملات میں ہی بادشاہ کا اطاعت گزار ہے ورنہ وہ خود مختار ہے لیکن وارن ہسٹنگس نے گورنر جنرل کے عہد پر فائز ہوتے ہی (1773-1784) نواب کے پر کتر ڈالے اور مغل بادشاہ کو خراج دینا بھی موقوف کر دیا۔ اس نے روہیلوں کے حملوں کے خلاف اودھ کی امداد کی اور مراٹھوں کی طاقت کو محدود کرنے کی طرف بھی اقدام کیا۔ گرچہ وہ آگرہ متھرا اور دہلی پر قابض ہو ہی گئے۔ وارن ہسٹنگس نے دوسرے سرداروں سے بھی رشتہ اُستوار کیا تاکہ اُس وقت کی ابھرتی ہوئی قوت کرناٹک کے حیدر علی کو روکا جا سکے۔ اس جنگ کے لیے اس نے اودھ کی بیگم اور بنارس کے راجہ چیت سنگھ سے بڑی رقومات کا قرض حاصل کیا۔ یہ دراصل خوشی کا سودا نہیں تھا بلکہ آتشیں طاقت کے زور پر مقامی حکمرانوں کو کمزور کرنے کی ایک سازش تھی۔ اس طرح وہ دھونس اور دھمکی سے زر و مال لوٹتا رہا۔ اس کے علاوہ اس نے کسانوں سے مال گذاری وصولنے کے لیے مقامی گماشتے مقرر کیے، اس خوف کے تحت کہ انگریز افسران اس معاملہ میں بہت زیادہ سختی سے کام لیں گے اور اُن کی رشوت خوری کے باعث بدنامی ہوگی۔ لیکن خود وارن ہسٹنگس نے اس قدر لوٹ مار کی تھی کہ اُس کے خلاف برطانیہ میں آوازیں اُٹھنے لگیں۔ بالآخر اسے بدعنوانیوں کی وجہ سے مواخذہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ایڈمنڈ برک نے بہت جوش وخروش سے اُس کے خلاف مقدمہ پیش کیا جو 10 برسوں تک چلتا رہا۔ اُسے برأت تو حاصل ہوگئی لیکن اس عرصہ میں وہ قلاش ہو چکا تھا۔ گرچہ کمپنی اس آڑے وقت میں اس کی امداد کرتی رہی۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی ثقافت کا دلدادہ تھا۔ اُس نے گیتا کا ترجمہ بھی کروایا تھا جس کی تمہید اس نے خود لکھی تھی۔ ہندو اساطیر سے تعلق کی بنا پر اسے پنڈتوں اور برہمنوں کا منت کش ہونا پڑا جو سنسکرت عبارتوں کی تفسیر اس طرح کرتے تھے کہ ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی ایک رخی اور محدود ہو کر رہ گئی اور اس کا دائرہ صرف اونچی ذات تک سمٹ گیا۔ پس ماندہ طبقے یا عوام کی اک بڑی تعداد سے بیگانگی ایک طرح کی نسل پرستی کی شکل اختیار کر گئی جس کا خمیازہ نچلی ذاتوں کو بھگتنا پڑا کہ وہ سیاسی سماجی اور معاشی دائرہ کار سے باہر ہو کر رہ گئے۔ مسلمان بھی اس کش مکش کے نتیجہ میں نظر انداز ہوتے چلے گئے۔ اور ایک طرح سے اُن کی حیثیت بے اثر ہوتی چلی گئی۔

ایک طرف تو شمالی ہندوستان، برطانوی توسیع پسندی کا شکار ہوتا جا رہا تھا تو دوسری طرف اس کی معیشت کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں۔ کسی بھی ملک کی معیشت کا دارومدار زراعت کے ساتھ صنعت وحرفت پر مبنی تجارت پر بھی ہوتا ہے بلکہ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہندوستانی زراعت کو نہ صرف دیدہ ودانستہ زوال پذیر کیا گیا بلکہ اُسے بے توجہی سے پامال کر دیا گیا۔ کوئی حیرت کی بات نہیں جب 1770 میں وہ بھیانک قحط

پڑا جس میں آبادی کا ایک بڑا حصہ بری طرح متاثر ہوا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ایک کروڑ (یعنی آبادی کا ایک تہائی) افراد لقمۂ اجل ہو گئے۔ خاطر نشان رہے کہ اُس وقت کا بنگالہ، بہار، مغربی بنگال، بنگلہ دیش، آسام کے کچھ حصے اور اڑیسہ، پر مشتمل تھا۔ زیادہ بربادی، بیر بھوم، مرشد آباد، ترہٹ، بیتیا اور چمپارن کے اضلاع میں ہوئی۔ گرچہ 1768 سے ہی فطری اسباب کی بنا پر فصلیں کم پیدا ہو رہی تھیں لیکن 1769 کے آخر تک حالات دگرگوں ہو گئے اور ستمبر 1769 میں شدید خشک سالی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ دیہی آبادی کی سخت مشکلوں کی مسلسل خبروں کے باوجود کمپنی کے افسران چشم پوشی کرتے رہے۔ 1770 میں تو بھوک مری عام ہو چکی تھی جس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ کچھ ماہ کے بعد چیچک کی وبا پھوٹ پڑی جس میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ بہت سارے علاقے آبادی سے خالی ہو گئے اور اُن میں جنگل آباد ہو گیا۔ بچی کھچی آبادی نے روزگار کی تلاش میں بڑے پیمانے پر نقل مکانی بھی کی۔ اس افرا تفری میں چوروں اور ٹھگوں کی بن آئی جن پر سخت قوانین نافذ کرنے کے باوجود برسوں بعد ہی قابو پایا جا سکا۔ قحط اور اس کے نتائج کے لیے کمپنی کو ہی ذمہ دار گردانا جاتا ہے، گرچہ وہ اس کے لیے براہ راست ذمہ دار نہیں تھی لیکن اس کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے اس میں شدت پیدا ہوئی۔

Simon Schama History of Britain. Vol ii. Page 504

یہ کمپنی ایک غیر ملکی تجارتی ادارہ تھی جس کا ایک ہی مقصد تھا زیادہ سے زیادہ منافع کمانا خواہ عوام زندہ رہیں یا مر جائیں۔ زمینوں کی مال گذاری سمیت ہر طرح کے محصولات وصولنے کا حق اُس کے نام منتقل ہو چکا تھا اس لیے اب تجارت کے علاوہ زراعت کا شعبہ بھی اُس کے ہاتھوں میں آ چکا تھا۔ کمپنی نے اس قانونی جواز کے ساتھ ہی مال گذاری میں تین سے چار گنا تک اضافہ کر دیا اور زراعتی پیداوار پر محصول 15 سے 50 فیصد تک ہو گیا۔ وصول شدہ رقم تقریباً پوری کی پوری ملک سے باہر ارسال کر دی جاتی تھی۔ طرفہ تماشا یہ کہ قحط سالی کی لپیٹ میں آنے کے باوجود اپریل 1770 میں مال گذاری 10 فیصد کے حساب سے بڑھا دی گئی۔ اور حکم نامہ جاری کر کے چاول کو ذخیرہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ جیسا کہ پہلے دستور تھا کہ محفوظ شدہ چاول آڑے وقتوں میں کام آتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ نیل کی کاشت کو بھی غیر قانونی قرار دے دیا گیا حالانکہ دھان کے بجائے نیل سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ غرض کہ کمپنی نے قحط سالی ہونے کے باوجود غلوں کی تجارت میں اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی اور غلوں کی کمی سے پیدا ہونے والی صورت حال سے برآمدہ نتائج کا سدباب کرنے کے لیے کوئی پلان نہیں بنایا تھا۔ سوداگروں اور تاجروں کو مشکلوں سے بچانے کی کچھ کوشش ضرور کی گئی۔ میک لین Maclene نے وارن ہیسٹنگس کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ اُن کے دور میں تشدد کے ذریعہ مال گذاری وصول کرنا عام بات تھی جس سے 1768 کے مقابلہ میں 1771 میں کمپنی کی یافت میں اضافہ ہوا۔ کمپنی کا منافع 1765 میں ڈیڑھ کروڑ تھا تو 1777 میں خشک سالی و قحط کے باوجود یہ بڑھ کر دگنا ہو یعنی 3 کروڑ ہو گیا۔

Romesh Chandra Dutta, The Economic History of India under early British Rule.
John R.Meclane : land and Local kingship in 18th C Bengal
Kumkum Chatteerji: Merchants Politics and Society in Early Modern India.

قارئین با تمکین! میں اس امر سے بہت پریشان رہا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی جس کا مقصد تجارت سے منافع کما کر اسے اپنے حصہ داروں اور ایک مخصوص سالانہ رقم حکومت برطانیہ کو تقسیم کرنا تھا ملک گیری کی جانب قدم کیوں بڑھانے لگی۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد مجھے ایسی خفیہ معلومات حاصل ہوئیں جن سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ وہ روزِ اول سے تجارت بزور طاقت کی قائل تھی۔ قدم جمانے میں انہیں تقریباً ایک صدی کا وقت ضرور لگا لیکن اس کے بعد انہیں روکنے کی طاقت مقامی حکمرانوں کے بوطے کے باہر تھی۔ ’’۱۷ویں صدی کے وسط تک ایشیا ساری دنیا میں یوروپ کی بہ نسبت کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا‘‘۔ ہسٹری آف یونیورس کا مصنف جے پائیرین مزید لکھتا ہے ’’کہ ایشیا کی دولت و ثروت یوروپی ریاستوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کی صنعتی تکنیک ایک ایسی ثقافت و روایت کا تسلسل تھی جو یوروپی دستکاری کی گرفت سے باہر تھی بلکہ مغربی ممالک کے تاجروں کے ذریعہ مستعمل طور طریقوں میں ایسا کچھ نہیں تھا جس پر ایشیائی تجارت رشک کر سکے۔ مال کے تبادلے تامین اور کار ٹل (Cartel) کے معاملات میں ہندوستان فارس (موجودہ ایران) یا چین کو یوروپ سے کچھ بھی سیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ صورت حال تھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے 17ویں صدی کے آغاز میں اپنی تاجرانہ سرگرمیوں کی داغ بیل ڈالی۔ برطانوی تاجر تو اس اُمید پر ہندوستان آئے تھے کہ وہ اپنے ملک کے بنے ہوئے کپڑے فروخت کر سکیں گے۔ انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اُن کی مانگ یہاں تھی ہی نہیں۔ مگر انہیں یہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پرتگالیوں کی طرح ہندوستانی مصنوعات اپنے ہی ملک میں فروخت کر کے خاصا منافع کما سکتے ہیں۔ یوروپ کے دوسرے تاجروں سے مقابلہ اور طویل تجارتی راستوں کے باعث یہ اولین برطانوی تاجر اس حالت میں نہیں تھے کہ اپنی شرطیں منوا سکتے۔ وہ رعایت بھی کرنے کو

دراصل ہندوستانی صناعی کے نازک نمونوں کی برطانیہ اور فرانس میں ایسی مانگ تھی کہ کمپنی والے ہندوستانیوں کو سونا اور چاندی دے کر بھی مال خرید لیتے تھے کہ مقامی تاجر اور کچھ قبول نہیں کرتے تھے

تیار رہتے تھے اور منت سماجت سے کام لے کر مقامی حکمرانوں اور تاجروں کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچاتے رہتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیب ہی ہندوستان کا وہ واحد بیدار مغز حکمران تھا جس نے برطانوی تاجروں کو دی گئی مراعات اور زمینی تجارت کی گھٹتی ہوئی آمدنی کے درمیان مضمرات کی شناخت کر لی تھی اور اسی لیے اس نے کمپنی کی سرگرمیوں اور مراعات کو محدود کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کمپنی والے حسب ضرورت منت سماجت اور خوشامد و چاپلوسی سے کام لے کر اپنے قدم جماتے رہے اور ملک کے دونوں ساحلوں پر اپنی تاجرانہ بنیاد ڈالتے رہے۔

اس دور میں کمپنی اور ہندوستانیوں کے درمیان رشتے بہ ہر نوع خوشگوار تھے اور تجارت کے علاوہ بھی کمپنی کے ملازمین کے مقامی لوگوں سے ذاتی تعلقات بھی قائم ہوئے۔ انھوں نے ہندوستانیوں سے شادی بھی کی اور انھی کے جیسا رہن سہن اختیار کیا، مقامی زبان کے الفاظ بھی سیکھے اور برابری کی سطح پر تعلقات استوار کیے۔ دراصل ہندوستانی صناعی کے نازک نمونوں کی برطانیہ اور فرانس میں ایسی مانگ تھی کہ کمپنی والے ہندوستانیوں کو سونا اور چاندی دے کر بھی مال خرید لیتے تھے کہ مقامی تاجر اور کچھ قبول نہیں کرتے تھے۔ اس منافع کی کئی وجوہات تھیں۔ کمپنی کے پاس سب سے بڑے مال بردار جہاز ہوا کرتے تھے اور قانونی طور پر اجازت یافتہ ہونے کے باعث برطانیہ کے بازاروں میں ان کا اچھا خاصا رسوخ تھا اور یہ بھی کہ وہ ہندوستانی مال کے لیے افریقہ اور امریکہ سے نئے خریدار بھی مہیا کر لیتے تھے۔

''...اور سب سے بڑی بات یہ کہ گرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی براہ راست بحر اطلانطک کے راستے غلاموں کی تاجرانہ نقل وحمل میں ملوث نہیں تھی، یہ تعلق بہت ہی قریبی بھی تھا اور منافع بخش بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ 18ویں صدی میں برطانیہ غلاموں کی تاجرانہ نقل وحمل میں سر فہرست تھا کہ یوروپی ممالک مل کر بھی اس سے کہیں پیچھے تھے... یہ یعنی برطانوی نظام غلامی کا دیو قامت نظام ہے جس کی مثال دنیا میں ناپید ہے۔ اسی لیے ہر اس ملک سے رفتہ رفتہ آزادی غائب ہو جاتی ہے جس پر برطانیہ کا غلبہ ہو چکا ہے۔'' دی سلیوزیڈ ڈومیسٹک اینڈ فورین 1858: ہنری کیسری

غرض کہ غلاموں کی تجارت بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی حیثیت کے استحکام کا ایک ناقابل تردید سبب ہوئی۔ (یوروپینس اینڈ دی کمرشیل ٹریڈ: ویرونیکا مرفی)

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کا اثر فارس (ایران) اور افغانستان کی محصولات پر بھی پڑا کہ اُن کی آمدنی کا اچھا خاصہ حصہ ہندوستانی تاجروں کے ذریعہ حاصل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی حکومت کو بھی اس کا خسارہ بھگتنا پڑا اور اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ گجراتی اور عرب تاجروں کی ساکھ کو بہت دھکا لگا۔ اس دوران مغلیہ سلطنت پر ادبار کے بادل منڈلانے لگے اور کمپنی نے حالات کا رنگ دیکھ کر حکمرانوں سے دن بہ دن رعایتوں میں اضافہ کی مانگ کرنی شروع کی جو بسا اوقات بہ حالت مجبوری قبول کی گئی۔ اسی زمانہ میں یوروپ میں چاندی کے ذریعہ قیمت ادا کرنے کے معاملے پر آوازیں بلند ہونے لگیں کہ اس طرح یوروپی چاندی باہر جا رہی ہے۔ لیکن ہندوستانی مال کی زبردست مقبولیت کے پیش نظر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا تو انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاجرانہ سرگرمیوں پر روک لگانے کا مطالبہ کیا جو منظور ہو گیا۔ لیکن کمپنی کو اس سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوا البتہ ہندوستانی تاجران اس سے زیادہ متاثر ہوئے کہ اب وہ اپنی برآمدات کے لیے کمپنی کے محتاج ہو چکے تھے۔ یہ خسارہ اُن تاجروں کو تباہ و برباد کرنے لگا جو اُن ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے جو مرکز کے زیر اثر نہیں رہا تھا، جیسے بنگالہ۔ کمپنی نے محصولات سے کمی کی بھرپائی کرنے کے لیے عوام کو لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ رشوت خور ملازمین نے اپنے تاجروں کے ذریعہ اپنی ناجائز آمدنی براہ راست اپنے گھروں میں بھجوانی شروع کی۔ اس طرح اپنے ملک کے درآمدی محصولات دینے سے بھی بچ گئے اور ناجائز رقومات کے لین دین کا کوئی ثبوت بھی ان کے خلاف برامد نہیں ہو سکتا تھا۔ مختصر الفاظ میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ برطانوی عمل داری نے ہندوستانی تاجروں اور صنعت کاروں کو زور و جبر سے میدان خالی کرنے پر مجبور کر دیا لیکن یوروپی تاجروں کو دانستہ یا نادانستہ اپنی تجارت میں شریک کر لیا۔

دی امریکن فربر The American Furber جس نے اپنا تحقیقی مقالہ 1949 میں شائع کرایا، یہ نکتہ پیش کیا کہ فرانسیسی اور ولندیزی حریف 1769 اور 1798 تک سرگرم رہے۔ اس نے اس امر کی جانب توجہ دلائی ہے کہ یہ ایک قسم کا عالمی Cosmopoliton اشتراک تھا۔ کم از کم اس کی جمع شدہ پونجی 320000 پاؤنڈ کا پانچواں حصہ ولندیزی ہاتھوں میں تھا اور

اس سرمایہ کا ایک بڑا تناسب امسٹرڈم، پیرس، کوپن ہیگن اور لسبن کے رقم لگانے والوں Financiers کے یہاں سے آتا تھا۔ اور یہ سرمایہ دار کمپنی کے معاملات میں براہ راست تعلق رکھتے تھے۔ فربر نے مزید لکھا ہے کہ برطانوی استعمار کی تعمیر میں یوروپ کے باشندوں نے اپنے ملک یا اُس کے باہر سے پورا حصہ لیا۔

ہندوستانی کپڑوں کی تجارت کے ذریعہ منافع کمانے کا موقع گنوا کر اب کمپنی کو اپنا کردار بدلنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ کہاں تو 1612 میں طامس رو Thomas Roe، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفیر نے مغل دربار میں یہ اعلان کیا تھا کہ تجارت کے ساتھ جنگ ناموزوں Incompatible ہے۔ لیکن 1669 میں امتناعی حکم سے پہلے ہی، بمبئی کی فیکٹری کے سربراہ نے ڈائرکٹروں کو لکھا تھا "اب وقت آ گیا ہے کہ اپنی تجارت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں تلوار کے ساتھ کرنا ہوگا۔" اور 1687 میں جواب میں ڈائرکٹروں نے انہیں بتایا کہ وہ گوا کی طرح ہندوستان میں اپنی خودمختار ریاست قائم کر سکتے ہیں۔ فرانسیسی ڈوپلے بھی کم و بیش ایسے ہی خیالات کا حامل تھا اور ولندیزی جین پائٹرزون کوئین Jan Pieter Zoon Coen نے بھی ڈائرکٹروں کو تو 1614 ہی میں لکھا تھا کہ تمہارے ہتھیاروں کے زور سے ہی ہندوستان میں تجارت جاری کی جا سکے گی۔ 'History of the Indian Ocean' August Toussain.

یہی نہیں کہ 18ویں صدی کی افیون کی تجارت (جس کے نتیجے میں جنگِ افیون کا آغاز ہوا) کے دوران برطانوی بحریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد کی خاطر اُن کا پوری طرح ساتھ دیا۔ اس طرح تجارت اور جنگ کا رشتہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں سے نوآبادی قائم کرنا صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اور جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا پلاسی ہند برطانوی رشتہ میں ایک نئے محرک کا اشاریہ تھا۔ نوآبادیاتی حکومت کے قیام کے کئی اسباب جیسے ہندوستانیوں کی پیدائشی خامیاں، ایشیائیوں کے کردار کی کمزوری، ہندوستانیوں میں حکمرانی کی نااہلیت کے علاوہ آر مکھرجی نے ایک مختلف تھیسس پیش کیا ہے۔ Rise and Fall of East India Company میں اُن کا کہنا ہے کہ ایسے معاشی عوامل تھے جنہوں نے یوروپی کمپنیوں کو نوآبادکاری کی جانب پیش قدمی پر مجبور کیا۔ انہوں نے یہ نکتہ نکالا کہ کمپنیوں کو خرید و فروخت کی مراعات حاصل تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ سستے داموں خرید سکتے تھے۔ اس کے لیے سیاسی کنٹرول لازمی تھا۔

ایک دوسرا مسئلہ کمپنی کے لیے یہ بھی تھا کہ اُن کے منافعے، برطانیہ میں مقیم تاجروں سے متصادم تھے۔ اسی لیے پلاسی، اور افیون کی جنگ کو اُن حالات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے جن کے تحت منافع کا قانونی اور باعزت ذرائع سے جاری رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ کچھ تاریخ دانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ کمپنی شریف تاجروں پر مشتمل تھی، اگر واقعی ایسا تھا تو وہ لوگ اتنی آسانی سے ہندوستانی کپڑوں کے بجائے افیون کی تجارت میں ہاتھ گندے نہ کرتے جسے آج کی زبان میں نشہ آور دواؤں کی غیر قانونی منتقلی Drug Running کا نام دیا جاتا۔ اور یہ بھی کہ اگر کمپنی واقعی باعزت مردوں کی آمدنی کا ذریعہ تھی تو وہ بامنافع تجارت کے حق سے محرومی پر دیوالیے ہو جاتے جیسا ایسا اوقات تجارت میں ہوتا آیا ہے۔ اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ افیون کی تجارت سے بے حساب منافع کے بعد وہ مزید یلغار سے باز کیسے آ جاتے۔ آدم خور شیر کے منہ کو جب خون کا مزہ مل جاتا ہے تو وہ اس سے باز نہیں آ سکتا۔ اور پلاسی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے مزید منافع خوری کی خاطر ہندوستانی کسانوں کو افیون کی کاشت پر مجبور کیا۔ یہی نہیں انہی دنوں ایشیا کی تجارت میں مصروف غیر یوروپی جہازوں پر بھی جو بین الایشیائی تجارت میں مصروف رہتے تھے فوجی حملے ہونے لگے۔ ان حملوں سے ہی کورومنڈل کے حکمرانوں اور مرہٹوں کے خلاف جنگ کی بنیاد پڑی جن کے تجارتی منافعے کم ہونے لگے تھے۔ کچھ تاریخ داں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ پلاسی اگر کمپنی کے لیے حیات و موت کی لڑائی تھی تو اس کے بعد کی جنگیں تجارتی مسابقتوں (خاص کر فرانسیسیوں کے خلاف) کا نتیجہ تھیں لیکن اس نظریہ کو ایک فرانسیسی تاریخ داں ایبے دی پریٹ Abbe de Pradt نے کتاب Les Trois Ages des Colonias Paris 1902 میں رد کر دیا ہے۔ اُس کے مطابق پلاسی کی فتح اور حکمرانی کے حقوق سلب کر لینے کے بعد، برطانیہ نے اپنے یوروپی حریفوں پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اُس کے لیے نئی دنیا (امریکہ) سے حاصل شدہ قیمتی دھات (چاندی) بھیج کر ہندوستان میں تجارت کرنا لازمی نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہیں کے عوام اور اجناس پر محصول لگا کر اُن سے حاصل شدہ مالیات Revenue ہی اس کام کے لیے کافی تھی۔ بلکہ برطانوی حکومت کی طرح دوسرے یوروپی تاجروں کو قیمتی دھات کے سرمائے لگانے سے بھی مستثنیٰ کر دے گی۔ اُس نے مزید لکھا ہے ...کہ اس طرح برطانوی فتوحات یوروپ کے لیے بھی فائدہ مند ہیں اور جیسے جیسے برطانوی مقبوضات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا یہ یوروپ کے لیے بھی فتح مندی کے مترادف ہوگا۔

درحقیقت یہ نقطہ نگاہ کئی دوسرے تجزیہ نگاروں کی رائے سے مطابقت رکھتا ہے جنہوں۔ نے اس تضاد Paradox کی جانب توجہ دلائی کہ 17ویں صدی کے موازنہ میں 18ویں صدی میں یوروپی ملکوں کے درمیان رسہ کشی

میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔ یعنی، ہندوستان کو نوآبادی بنانے کی دوڑ برطانیہ نے جیت لی تھی اور یہ فرانس کے اپنے مفاد میں تھا کہ وہ اس نقصان پر واویلا مچانے کے بجائے اس کے منافع سے لذت اندوز ہو۔ ایک ہندوستانی مورخ این کے سنہا ''اکونومک ہسٹری آف بنگال'' کا مصنف بھی اسی خیال کا حامل ہے کہ پلاسی کے پہلے یوروپیوں کو یہ معلوم تھا کہ جائز یا ناجائز تجارت، بنگال کے حق میں جاتی تھی کہ رقوم ہمیشہ نقد ادا کی جاتی تھیں۔ لیکن پلاسی کے بعد یہ فائدہ بنگال کے ہاتھوں سے چھن گیا کہ جبری محصولات کے ذریعہ عوام سے من مانے زر و مال وصول کیے جانے لگے۔

لیکن اس کا ایک برا اثر ملکی تاجروں پر یہ پڑا کہ مغل، گجراتی، بنگالی اور آرمینائی سوداگروں کے ہاتھوں میں درآمد برآمد اور مصنوعات کی جو آزاد تجارت تھی وہ بھی کمپنی کے ذریعہ مقرر شدہ درمیان والے Intei Mediaries کو منتقل ہو گئی جو ہر طرح کا زور و جبر کر کے انہیں نقصان پہنچانے لگے۔ یہی نہیں کمپنی کے اپنے سپاہیوں کے ذریعہ اس کے حریفوں کے کارخانے برباد کیے جانے لگے۔ کمپنی کے ذریعہ بہت ہی قلیل مزدوری پر کام کرنے سے انکار کرنے والے آزاد بنکروں کے انگوٹھے کاٹنے کا رواج بھی ہو گیا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ بین الملکی زمینی راستے کی تجارت پر بھی محض تین دہائیوں کے اندر کمپنی نے پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہندوستان کی معاشی اور سیاسی زندگی پر کمپنی نے پوری طرح اپنی آہنی گرفت مضبوط کر لی۔

Abbe de Perdet کی پیشین گوئی کے مطابق نوآبادکاری کے فوائد برطانوی تاجروں تک محدود نہیں رہ سکے۔ انھوں نے مقامی تجارت کا گلا گھونٹ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی تاجروں کا صفایا ہو گیا اور دوسرے یوروپی تاجر جیسے فرانسیسی، ولندیزی تاجروں نے ہندوستانی بازار سے سستے داموں مال خریدنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ کمپنی کے لیے پلاسی، وہ پہلا میدان تھا جہاں کوئی علاقائی طاقت اپنی حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ جب کہ ایک متحدہ ہندوستان نے یوروپیوں کی یلغار کو کامیابی سے روکا تھا۔ ایک منقسم ہندوستان کا ایک متحدہ یوروپ کے سامنے کوئی مقابلہ تھا ہی نہیں۔ ہندوستان پر برطانوی فتوحات کا سلسلہ علاقائی طاقتوں کی شکست کے ساتھ جاری رہا۔ 1818 میں مراٹھوں کی 1848 میں سکھوں کی فیصلہ کن ہار سے ملک کی باگ ڈور عیار انگریزوں کے ہاتھوں میں آ گئی اور کئی معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جھوٹے الزامات اور فریب کے ذریعہ ۱۸۵۶ میں نواب اودھ کو جلاوطن کر کے اُس کا تمام علاقہ سلطنت انگلشیہ میں ضم کر لیا گیا۔ 1857 تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتوحات کا سلسلہ ختم کرنے کی ایک کوشش تھی۔

لیکن اس کے نتیجے میں اسے پوری برطانوی استعماری قوت کا سامنا کرنا پڑا اور کمپنی کے بجائے، برطانوی سامراج کی نوآبادیاتی غارت گری کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ گرچہ اس کے بعد برطانوی بالادستی کو برابر چیلنجوں کا سامنا رہا لیکن 1947 کے پہلے آزادی کی سانس لینا ہمیں نصیب نہ ہو سکا۔ اور وہ بھی کس قیمت پر یہ سب جانتے ہیں۔

تقریباً 200 برسوں تک ہندوستان کی دولت منظم طریقے سے یوروپ منتقل ہوتی رہی۔ شروع میں صرف برطانیہ ہی مستفید ہوتا رہا لیکن اس کے یوروپی اور نئی دنیا کے اتحادی بھی کم فائدہ میں نہیں رہے۔ برطانوی بنکوں نے ہندوستانی رقومات کا استعمال کر کے امریکہ، جرمنی اور یوروپ میں دوسری جگہوں پر صنعتیں لگائیں بلکہ صنعتی انقلاب اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام صرف ہندوستان اور دوسری نوآبادیوں کی بنیاد پر ہی استوار کیا جا سکا۔ یہ جبریہ نوآبادی میں تبدیل شدہ صورت حال تھی جس کی وجہ سے امریکہ اور برطانیہ کی صنعتوں کو جدید بنیادوں پر کھڑا ہونے کا موقع مل سکا۔ جدید سرمایہ کاری کا کوئی بھی عمیق مطالعہ اس موضوع کو زیر بحث لائے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

'نادر شاہ نے ہندوستان کو صرف ایک بار لوٹا لیکن اہل برطانیہ ہمیں روز لوٹ رہے ہیں۔ ہر سال 45 لاکھ ڈالر کی رقم ملک سے باہر جا رہی ہے۔ اس طرح ہمارا خون چوسا جا رہا ہے۔ برطانیہ کو چاہیے کہ وہ فوراً ''ہندوستان کو چھوڑ دے۔'' یہ تحریر ہے سندھ ٹائمس 1884 کی یعنی ہندوستانی کانگریس نامی سیاسی جماعت کی تاسیس کے ایک سال قبل کی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ قومیت کا جذبہ کانگریس کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی بیدار ہوا۔ جب کہ سچائی تو یہ ہے کہ قومیت 1857 میں بھی موجود تھی اور برطانوی حکومت کے تمام دورانیہ میں مختلف طریقوں سے اس کا اظہار ہوتا رہا۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ 1888 میں سندھ کے شکارپور علاقہ میں معاشی قومیت کا مظاہرہ اس وقت ہوا تھا جب پریتم دھرم سبھا نے کئی معاشرتی اصلاحات کے ساتھ ساتھ سودیشی چینی، صابن اور کپڑے کے کارخانے قائم کیے تھے۔ (South Asian History سے ترجمہ از مصنف)

1857 میں آزادی کی جو جنگ لڑی گئی اُسے انگریز مورخوں کے ساتھ ساتھ کئی تاریخ دانوں نے بھی غدر، شورش یا بغاوت کا نام دیا ہے۔ تین جلدوں میں مشہور کتاب کے مصنف Jhon Kaeys نے A History of Sepoy war in India. میں اسے سپاہیوں کی جنگ کہا ہے تو سید احمد خاں نے اسے بغاوت کا نام دیا ہے (ملاحظہ ہو اُن کی کتاب 'اسباب بغاوت ہند') مسلمان علما نے اس جنگ کے لیے جہاد کی دعوت دی۔ جیسے فضل حق خیر

آبادی، مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا، تحریک ریشمی رومال) اور کئی دوسرے۔

محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر جیسے مؤقر صحافی نے فرنگیوں سے مقابلہ کرنے کی تحریک کا کام اپنے 'دہلی اردو اخبار' کے ذریعہ انجام دیا لیکن بین السطور میں اُن کا پیغام جہاد تھا کہ اس میں تو صرف مسلمان ہی حصہ لے سکتے تھے، جب کہ اُن کا مقصد ہندوؤں سمیت تمام آبادی کو اس میں شریک کرنا تھا۔ جس شخص نے پہلے پہل اسے جنگ آزادی کا نام دیا وہ تھا' ویر ساورکر'۔ مراٹھی میں اس کی لکھی ہوئی کتاب ' آزادی کی جنگ' 1907 میں منظر عام پر تو نہ آئی مگر مہاراشٹر کے نوجوانوں کے درمیان رازداری سے گھومتی تھی۔ اور چھپ چھپ کے پڑھی جاتی تھی۔ لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب ساورکر کے خیالات میں تفرقہ پرور تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ جس نے اسے ایک غالی فرقہ پرست میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔

ایک اور مصنف 'کنہیا لال' نے انگریزوں کے دیئے ہوئے نام کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے ایک بالکل غیر جانبدارانہ نام 'محاربہ عظیم' دے کر اپنی تصنیف پیش کی۔ اس کے اوراق میں انہوں نے وہ نقشہ پیش کیا جو اس لڑائی کی سچائی تھی۔ انہیں انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اور ان کی رسائی مختلف ماخذات تک تھی کیوں کہ ان کی ملازمت اس نوعیت کی تھی کہ وہ انگریزی کے ترجمے کرتے رہتے تھے۔ جیسے، محاذ جنگ سے لکھے ہوئے خطوط اور موقع واردات سے وہ تفصیلات جو انگریز افسروں نے اپنے حکام بالا کو روانہ کیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی دونوں کتابیں 'دنیا کی تاریخ کی جھلکیاں' اور 'ہندوستان کی دریافت' کے صفحات میں صرف ایک جگہ اسے جنگ آزادی سے موسوم کیا ہے۔

ابوالکلام آزاد نے ممتاز مورخ سریندر ناتھ کو 1957 میں اس کی صد سالہ تاریخ کے موقع پر اس کش مکش کی تاریخ لکھنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس کے پیش لفظ میں ابوالکلام آزاد نے 1857 کے واقعات کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ان دنوں ہندوستانیوں کا کردار پستیوں کی نذر ہو چکا تھا۔ اور اس جنگ کے رہنماؤں میں آپسی حسد اور بغض کے باعث یہ شکست پر منتج ہوئی۔ انھوں نے اسے کہیں بھی جنگ آزادی سے یاد نہیں کیا ہے۔ نہ ہی انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں کسی مثبت رائے کا اظہار کیا ہے۔ پنڈت نہرو نے اسے جاگیردارانہ اُبال Feudal Outburst قرار دیا ہے کہ اس وقت کے جاگیردار سرداروں نے اپنی مراعات کی خاطر یہ اقدام کیا اور یہ بھی کہ اُن کے پاس متحد ہونے کا جذبہ نہیں تھا سوائے غیر ملکیوں کی مخالفت کے جو کہاں تک کام آتا۔ میرے خیال میں اس سے اتفاق کرنا بڑا مشکل ہے کہ اب یہ بات تقریباً طے پا چکی ہے کہ اس جنگ میں حصہ لینے والوں میں کئی قسم کے یا کئی طبقے کے لوگ شریک تھے۔ ایک تو وہ جو انگریزی فوج میں ملازم تھا لیکن کارتوسوں میں گائے یا خوک کی چربی کے کراہیت آمیز استعمال کے خلاف برگشتہ ہو گیا تھا۔ یہ زیادہ اونچی ذاتوں (برہموں اور کشتریوں) پر مشتمل تھا۔ ایسے سابق فوجیوں کی تعداد تقریباً سوا لاکھ تھی۔ دوسرا طبقہ غریب عوام کا تھا۔

ولیم ڈیل رمپل نے ایک دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ معین الدین حسن نے جو پہاڑ گنج دہلی تھانہ میں ایک سپاہی تھے (خدنگ غدر میں) بہت سے پیشہ وروں کو بغاوت میں حصہ لینے والوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ مثلاً، جوہریوں، آہن گروں، راعیوں، دھوبیوں، حجاموں، چمڑا کا کام کرنے والوں، خاک روبوں، قصابوں، سپیروں، مشاطوں، دکانداروں، نان بائیوں، حلوائیوں، عطاروں، جوتا سازوں، اور گوٹا کناری کا کام کرنے والوں کو۔ یعنی عام لوگوں کی شمولیت سے ان کی وسیع بنیادوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں اس سے دلی کی سماجی زندگی کو سمجھنے میں بھی ہمیں مدد ملتی ہے کہ یہ معاشرہ محنت کشوں کے ساتھ ساتھ فارغ البال اور خوشحال عوام کا ایک آمیزہ تھا۔ اور یہ کہ انگریزوں کے خلاف اس آمیزہ کے دونوں طبقات نے جی جان لڑا دیا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سید احمد خاں نے لکھا: ''چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالوں کو پورا کرنے اور جاہلوں کے بہکانے کو اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام دے دیا۔ مفسدوں کی حرمزدگیوں میں سے یہ ایک حرمزدگی تھی نہ کہ جہاد'' (اسباب بغاوت ہند)

اور پنڈت نہرو نے تو اسے 'جاگیردارانہ ابال' (Feudal our Brust) قرار دیا کہ ان کے بقول ''اس وقت کے جاگیرداروں نے چند مراعات کی خاطر یہ اقدام کیا اور یہ بھی کہ ان کے پاس متحد ہونے کا جذبہ نہیں تھا سوائے غیر ملکیوں کی مخالفت کے جو کہاں تک کام آتا۔'' اور حالات کے ایک رخ کا مطالعہ کر کے یک رخہ نتیجہ نکالا۔ حالانکہ جزوی طور پر دونوں صحیح تھے۔ عرفان حبیب نے People Democracy Vol No04 میں لکھا ہے کہ 1857 کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ بہت سارے تعلقہ داروں کی زمین زبردستی بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھی۔ تاکہ کمپنی کی آمدنی میں اضافہ ہو۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ 1857 کے رستاخیز Uprising کے اسباب معاشی، معاشرتی، نفسیاتی سیاسی اور فوجی یعنی کثیر الجہتی تھے لیکن مذہبی زاویہ کی اہمیت کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا جاتا رہا

> ...ولیم ڈیل رمپل نے اپنی حالیہ کتاب 'آخری مغل' میں مذہبی مطالعہ کا نکتہ پیش کیا ہے کہ اس جنگ میں جہادی عناصر کا اچھا خاصا حصہ تھا...

ہے۔خاص کر قوم پرستوں اور یساریوں (بائیں بازو) نے یا تو اس کی اہمیت سے یک لخت انکار کیا یا اگر اسے قبول بھی کیا تو اسے صحیح تناظر میں پیش کرنے کے بجائے تحت بیانی سے کام لیا۔ولیم ڈیل رمپل نے اپنی حالیہ کتاب 'آخری مغل' میں مذہبی مطالعہ کا نکتہ پیش کیا ہے کہ اس جنگ میں جہادی عناصر کا اچھا خاصا حصہ تھا۔اُس نے بیس ہزار بنیادی دستاویزوں کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ وہ قومی ارشیف National Archieves میں گرد کھا رہے تھے کہ اب تک کسی تاریخ نگار نے اردو کے شکستہ طرز تحریر کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا ہی نہیں کی۔انھوں نے محمود فاروقی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کے تعاون سے ہی وہ ان دستاویزوں کی عبارت کا مفہوم سمجھ سکے۔

اس مذہبی زاویہ کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ 18 ویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ بہت زور و شور سے کرتے تھے۔قصہ یہ ہے کہ ان عیسائی مشنریوں نے اپنا کام ایسٹ انڈیا کمپنی سے بغیر کسی وابستگی کے آغاز کیا تھا۔لیکن 1830 کے بعد مذکورہ کمپنی صرف تجارت تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس نے عیسائی مبلغوں کو بھی اپنے زیر سایہ کر لیا تھا۔حیرت کی بات ہے کہ عیسائیت کے مبلغوں میں ولیم ولبر فورس William Wilbert Force بھی بہت پر جوش تھا۔یہ شخص غلامی کا خاتمہ کرنے والے کی حیثیت سے نمایاں تھا۔اُس کا خیال تھا کہ غلامی کا خاتمہ ہونے سے عیسائیت کے فروغ میں مدد ملے گی کہ آزادی حاصل کر کے غلام، عیسیٰ مسیح کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لیں گے۔لیکن اپنے دیگر ہم خیال رفیقوں کی طرح وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے ساتھ دوسرے مذاہب کا مذاق بھی اڑاتے تھے اور موقع بے موقع اُن کی تحقیر سے بھی باز نہیں آتے تھے۔اس رویہ سے ایک اور نکتہ کی وضاحت ہوتی ہے کہ نوآبادیاتی نظام کوئی یک جہتی Monolithic سلسلہ نہیں ہے۔

انیسویں صدی کے وسط تک نوآبادیاتی نظام کی مختلف شکلیں اور مختلف لیکن نمایاں جہتیں وجود میں آ چکی تھیں۔1850 تک کئی برطانوی افسران تجارت کے دوش بدوش اپنے مذہب کے لیے نئے پیرو Convert بھی چاہنے لگے تھے۔اور تبدیلی مذہب کی پر جوش تقریبات کے ساتھ نئے عیسائیوں کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ایسی ہی ایک تقریب میں جو جلسہ عام کی صورت اختیار کر گیا تھا، ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال کو پادری مڈگلی جان جیکسن نے عیسائیت میں داخل کیا تھا۔اس پادری کا رویہ مقامی غیر عیسائی آبادی Heathens کے ساتھ بہت ہی اہانت آمیز تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس نے کمبھ میلہ جا کر زائرین کو ان کی شیطانی بربریت Satanic Paganism پر بہت شور مچایا تھا۔کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ بغاوت کی ابتدا میں ہی مارا گیا۔انہی دنوں مقامی زبانوں میں عیسائی مذہبی مواد شائع ہونے لگا تھا سرامپور میں چھاپہ خانہ لگایا جا چکا تھا۔

ڈاکٹر چمن لال کو بھی جون 1857 میں اُن کے دواخانہ کے قریب بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور ماسٹر رام چندر نے باضابطہ انگریز افسران سے شکایت کی تھی کہ اُن کے ہم مذہب ہونے کے باوجود ان سے رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیاز برتا جا رہا ہے جو عیسائیت کے فلسفہ کے خلاف ہے۔تو مقامی آبادی کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہوتا جا رہا تھا کہ غلامی کے ساتھ انہیں عیسائیت کی پیروی کرنے پر مجبور ہی نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان کا آبائی مذہب بہ زور و جبر ان سے چھینا جا رہا ہے۔

کمپنی کی ملازمت کے دوران ہندوستانی سپاہیوں (جن کی بڑی تعداد اونچی ذات کے ہندوؤں پر مشتمل تھی) کو پادری کی جانب سے تبدیلی مذہب کی سرگرمیوں کا بھی سامنا تھا اور اُن کی طرف سے پیدا شدہ کچھ رکاوٹیں انہیں اپنے مذہبی امور انجام دینے سے روکتی تھیں۔ان کی فکرمندی کی ایک اور وجہ تھی کہ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں سمندر پار جانا نہیں چاہتے تھے۔اس پس منظر میں بیرک پور کے 1824 کی شورش کو دیکھا جا سکتا ہے۔1857 کے واقعات کی پہلی رسمی تفتیش جارج ڈبلو فارسٹ George W.Forrest نے انجام دی جس کا عنوان تھا Letter Dispatches and other State Papers 1857-58 جس میں پادریوں کے ذریعے سپاہیوں پر تبدیلی مذہب کے لیے مداخلت کاری اور رسمی طور پر اعلان جہاد، اہم نکات تھے۔اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ کیا فارس (ایران) نے باغیوں کی پشت پناہی کی تھی۔سید احمد خان کی 'اسباب بغاوت ہند' نامی کتاب کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ان کا مطمع نظر یہ تھا کہ یہ مکمل یا عام جہاد تھا ہی نہیں اور بغاوت کے پیچھے مذہبی مقصد تلاش کرنا غلط ہوگا۔ویسے انہوں نے پادریوں کی سرگرمیوں کے تذکرہ کو اولیت دی تھی (جیسے یہ مذہبی معاملہ نہیں تھا) اور بڑھتے ہوئے محصول (ٹیکس) زمینوں کی لوٹ، ریاستوں کی ضبطی اور کمپنی کی سفاک اور بدعنوان حکمرانی کو بھی بغاوت کے خاص اسباب

میں شامل کیا تھا۔

دراصل 1857 کی رستاخیز کو اب تک ایک محدود نقطہ نگاہ سے ہی دیکھا جاتا رہا ہے۔ جب کہ در حقیقت اس میں معاشرتی، معاشی، نفسیاتی، فوجی اسباب کے ساتھ نسل پرستی اور مذہبی عناصر کے عوامل بھی کارفرما تھے۔

مذہبی زاویہ کے دوسرے پہلو کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں ذرا کئی صدی پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا۔ 1498 میں 'واسکوڈی گاما' افریقہ کے گرد گھوم کر بحیرۂ عرب ہوتا بحر ہند میں کالی کٹ کے مقام پر لنگرانداز ہوا تھا۔ اُس وقت سمندری راستے کی تجارت جس میں گرم مصالحے کا کاروبار بھی شامل تھا (انڈونیشیا سے لے کر یوروپ کے ساحلوں تک) زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اور زمینی راستوں سے ہوتے ہوئے بحیرۂ قلزم کے راستے بحرۂ روم کی بندرگاہوں تک ان تمام علاقوں میں مسلمان جہازرانوں کی آمدورفت سے تجارت پھل پھول رہی تھی اور تقریباً تمام ساحلی شہروں پر مسلمان تاجروں نے بڑی بڑی کوٹھیاں بنوا رکھی تھیں۔

پرتگیزی پہلے یوروپی تھے جنہوں نے جہازرانی شروع کی ورنہ ان سے پہلے سمندری راستوں کے بارے میں یوروپ کا علم زیادہ نہیں تھا۔ غرناطہ کا سقوط 1492 میں عمل میں آیا اور اس کے بعد مذہبی گرفت Inquisition ہوئی اس کے نتیجے میں ہسپانیہ اور پرتگال کے مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا یا تہ تیغ کردیا گیا۔ یہ الگ لرزہ خیز داستان ہے۔ لیکن جیسے ہی پرتگیزیوں کا سابقہ مسلمانوں کے سمندری بیڑے یا تاجروں سے ہوا ان کی اسلام دشمنی اُن پر اس طرح غالب آئی کہ انہوں نے بحر ہند سے لے کر ملاکا تک ایک منظم منصوبہ کے تحت قتل وغارت گری اور بیڑوں کی لوٹ مار کا سلسلہ شروع کردیا۔

گوا فتح کرنے کے بعد پرتگیزی امیر البحر نے اپنے فرمان روا کو اس کا مژدہ سناتے ہوئے لکھا تھا ''گوا میں جو بھی مسلمان نظر آیا میں نے اُسے تہہ تیغ کیا۔ جہاں تک بھی ہو سکا میں نے کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا۔ وہ جب ہم سے بچ کر مسجدوں میں جمع ہو گئے تو ہم نے ان مسجدوں کو آگ لگادی۔'' کالی کٹ کے مسلمان حکمراں نے پرتگیزیوں کا مقابلہ کر کے انہیں بھگا دیا تھا۔ لیکن پرتگیزیوں کے جہاز گہرے سمندر میں محفوظ رہتے تھے جب کہ کالی کٹ کے جہاز اس ساخت کے نہ تھے۔ اس لیے ان کا تعاقب کرنا مشکل تھا۔ اس نے مصر سے مدد مانگی۔ مصری بیڑا پرتگیزیوں سے مقابلہ کرتا رہا لیکن اُن کی کمک نہیں آتی تھی۔ بلکہ پرتگیزیوں کو برابر کمک آتی رہی۔

اسی درمیان گجرات کے حاکم نے پرتگیزیوں سے سازباز کرلی تو مصری بیڑہ لوٹ گیا۔ اور اس علاقہ کے پانیوں پر پرتگیزی حاوی ہوتے گئے۔ انھوں نے ملکا میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ان کی تجارت پر قابض ہوگئے۔ ترکی کے سلطان سلمان اعظم نے پرتگیزیوں کی سرکوبی کے لیے اپنا بحری بیڑہ بھیجا لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ پرتگیزیوں نے عہد کیا تھا کہ مسلمانوں کو سمندر سے بے دخل کر کے اُن کی تجارت پر قبضہ کرلیں گے۔ واقعی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس دوران ولندیزی اور انگریز تاجران بھی اپنی قسمت آزمارہے تھے اور جیمس اوّل نے جہانگیر کے دربار میں اپنا سفیر بھیج کر سلسلہ جنبانی کا آغاز کیا تھا۔ اسی دوران بمبئی، مدراس اور کلکتہ کے ساحلی علاقوں پر انگریزوں کی تجارت کو فروغ ہوتا گیا۔ اور دوسری یوروپی طاقتیں اس کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ اور منظرنامہ سے غائب ہوتی چلی گئیں۔ تو اسلام دشمنی اس تجارت کا ایک بنیادی عنصر شروع ہی سے تھی۔ اور جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا کہ 18ویں صدی کے وسط میں اُن کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا اور وہ تجارت کے ساتھ اس ملک پر غلبہ حاصل کرتے چلے گئے۔ جس کی تفصیل سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے۔

سید ابوالحسن علی حسنی ندوی عرف علی میاں رقم طراز ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے مقابلہ کی پہلی صدا دینی طبقہ اور علما کے حلقہ سے بلند ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے اس خطرہ کو محسوس کیا اور انگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے حاشیہ میں اس خط کا بھی تذکرہ کیا ہے جو حضرت سید احمد شہید متوفی 1830 نے مہاراجہ گوالیار اور اُن کے افسر افواج کے نام لکھا تھا اور جس میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف متحدہ جنگ اور صف آرائی کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے نواب امیر خاں (بعد میں والیٔ ریاست ٹونک) کی رفاقت ترک کردی، جب انھوں نے انگریزوں سے مصالحت کرلی (سیرت سید احمد شہید جلد اوّل ص 304، 46، 47) انگریز مورخین نے صاف طور پر اس کا اظہار کیا ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی میں جس کو وہ غدر کے لقب سے یاد کرتے ہیں سید احمد صاحب کی جماعت مجاہدین کی چنگاریاں ہی کام کررہی تھیں اسی بنا پر اس جنگ آزادی میں سب سے بڑی قربانیاں اسی جماعت کے افراد وخاندانوں بالخصوص خاندان صادق پور پٹنہ نے دیں۔ اُن کی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ مکانات یہاں تک کہ مقابر منہدم کیے گئے اور بعض نامی گرامی افراد مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب کو جزیرہ انڈمان اور کالا پانی بھیج دیا گیا اور وہیں اول الذکر دونوں افراد کی وفات ہوئی۔''

کالا پانی، از مولوی محمد جعفر تھانیسری، ص 7۔ 6

ان حضرات کے علاوہ مولانا فضل حق خیرآبادی مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی اور مفتی مظہر کریم دریابادی کو بھی انڈمان میں جلاوطنی کی سزا دی گئی اور یہ سب تعلیمی حلقہ اور مدارس کے لوگ تھے۔ تذکرہ صادقہ از مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری مقدمہ ابوالکلام آزاد ص 7 ایضاً

پٹنہ میں صادق پور کی تباہی اس طرح ہوئی کہ چند مکانات کے علاوہ پورا محلہ زمین بوس کردیا گیا۔ قبرستانوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ اس کی تفصیل اختر اورینوی کی بہار میں اردو زبان کا ارتقا میں بھی مل سکتی ہے۔ پٹنہ میں ہی نواب چھجو کا باغ بھی جڑ سے اکھاڑ دیا گیا۔ اس کے درختوں سے ٹکٹکی لگا کر پھانسی دینے کا کام لیا گیا۔ ایک درخت کا قتل (افسانہ) اختر اورینوی مطبوعہ آجکل مئی 1971

پٹنہ کے پیر علی کو بھی برسرعام پھانسی دی گئی تھی۔ دلّی کی فتح کے بعد انگریزوں نے جس بے رحمی سے انتقامی کارروائی کی، اس کا ہدف مسلمان ہی تھے۔ خاص کر عالموں اور مدرسوں کو ذرا سے شبہہ پر تہہ تیغ کردیا گیا۔ بیس لاکھ علما نے اپنی جانیں آزادی کی خاطر قربان کیں۔ بہ حوالہ ٹائمس آف انڈیا

Defenders of Faith 03/03/2003

جب زندگی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا درس وتدریس کی جانب کون توجہ دیتا۔ 1857 تک دلّی اور اس کے نواح میں تقریباً ایک ہزار مدرسے تھے۔ جہاں لائق وفائق اساتذہ علم کا دریا بہاتے ہوئے ذہنی تربیت کا کام انجام دیتے تھے۔ لیکن 1858 کے بعد یہ تمام مدارس بند کردیئے گئے۔ اور ان میں سے بیشتر اساتذہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ان کی ایک قابل لحاظ تعداد کو کالا پانی بھیج دیا گیا۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کچھ باہمت افراد نے جن میں قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی شامل تھے دارالعلوم دیوبند قائم کرکے علم کی ضیاپاشی کا بیڑا اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ جس قیامت سے گذرے تھے اس کے بعد انگریزی زبان کی تعلیم کی طرف مائل ہونا بہت ہی دشوار تھا۔

اس کے علاوہ فتح مندی کے نشہ میں ڈوبے ہوئے انگریزوں نے انتقام کی کارروائی کو صرف قتل وغارت گری تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے اپنے نئے انتظامیہ میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کے دروازے ہی بند کردیئے۔ یہی نہیں بلکہ جن ذرائع سے مسلمانوں کے تعلیمی ادارے زندہ تھے اُن کی بیخ کنی کرنے لگے۔ جن جاگیروں یا جائدادوں کی آمدنی پر مدرسے اور تعلیمی نظام کا انحصار تھا اُنہیں یا تو ضبط کرلیا یا اُن کو غلط الزام لگا کر برباد کردیا۔ (اس ضمن میں ہنٹر کمیشن کی رپورٹ ملاحظہ کیجئے: Hunter Commission)

...دلّی کی فتح کے بعد انگریزوں نے جس بے رحمی سے انتقامی کارروائی کی، اس کا ہدف مسلمان ہی تھے۔ بیس لاکھ علما نے اپنی جانیں آزادی کی خاطر قربان کیں...

بہ حوالہ ٹائمس آف انڈیا

ہندو مسلمان منافرت کا بیج تو عین 1857 کے انقلاب کے وقت بویا گیا تھا۔ دہلی میں کمپنی کی جانب سے جو اشتہار چسپاں کیے گئے تھے وہ اس بوکھلاہٹ کا مظاہرہ تھا جس سے اہل فرنگ دوچار ہوئے اسی لیے یہ دھمکی بھرا بلکہ مذمتی اعلان خاص کر مسلمانوں کو مخاطب کرکے چھاپا گیا تھا۔

''بس اہل شہر تم آگاہ ہو کہ اول تو مقصود سزا وہی سپاہ ہنود کی ہے اور جو اُن کی امداد وحمایت کریں گے اُن کے تئیں بھی سزا دی جائے گی۔ تم کو چاہیے کہ بموجب حکم شرعی کے ہمارے شریک الحال ہو کر اہل ہنود کو قتل کرو ورنہ...''

اس اشتہار کا بہت ہی مدلل اور مسکت جواب مولوی محمد باقر نے دہلی اردو اخبار میں جس طرح دیا اس کا صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو ''خود (اہل کمپنی) لکھتے ہیں کہ چربی گاؤ کی تھی کوئی پوچھے کہ کیا اس سے دین ہندو کا نہیں بگڑتا؟'' بہ حوالہ امداد صابری ص 188-187

اس بے باکانہ حق گوئی کی سزا تو مولوی محمد باقر کو اس طرح دی گئی کہ توپ سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔ وہ اردو کے ہی نہیں بلکہ پہلے ہندوستانی صحافی تھے جنھیں وطن کی قربان گاہ پر شہادت نصیب ہوئی۔

جیسا پہلے عرض کیا گیا ہندو مسلم دشمنی کا بیج ان دنوں پنپ نہیں سکا تھا مگر اس وقت کے ہندو مسلم اکابرین نے اس کھیل کو سمجھ لیا تھا۔ تاہم چند ہی برسوں میں بنگالی دانشوروں کے ذہنوں میں ایسی باتیں ڈالی جانے لگیں جن کی رو سے مسلمان ملک دشمن اور اہل فرنگ ملک کے دوست قرار پائے۔ بنکم چندر چٹرجی سے پہلے کے ناول نگار جیسے لال بہاری ڈے اور سوشیل چندر دت کے ناولوں سے سرکار پرستی اور ہندو مسلم تصادم کے واضح اشارئیے ملتے ہیں۔ بالفاظ دیگر فرنگیوں نے اپنے قدم جماتے ہی ایک ثقافتی انقلاب برپا کردیا کہ مسلمان اپنے عقائد، نظام تعلیم اور جذبۂ حب الوطنی کے باعث اُن کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔

اس سلسلے میں سر ولیم ہنٹر Sir William Hunter کی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ اور ان کی تصنیف 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' کے ان اقتباسات سے میری بات کو بہتر طور سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ''قبل اس کے کہ ملک ہمارے ہاتھوں

میں آئے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہن اور فراست کے اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے۔ ان کا نظام تعلیم اعلیٰ درجے کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم ہندوستان کے تمام دیگر نظاموں سے حد درجہ فائق تھا۔'' بحوالہ علما ہند کا شاندار ماضی 16:5 مکتبہ محمودیہ لاہور 1992

نظام تعلیم کے خاتمہ کے ساتھ ہی ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر اس طرح بند کیے جانے لگے کہ ''ان معاندانہ پالیسیوں کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ 1869 تک ایک بھی شریف اور آسودہ حال مسلمان باقی نہ رہا جو کسی سرکاری عہدہ پر موجود ہو۔ علما، فضلا نوابین کی اولادیں لکڑ ہارے اور سقے Hewers to wood & Drawer of water بن جانے پر مجبور ہو گئیں۔ اور اگر کہیں مسلمانوں کو نوکری ملی بھی تو بقول ہنٹر یہ ملازمتیں تھی۔

''سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید نہیں رکھ سکتے کہ قلی، چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔'' حوالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 144، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، اس کتاب کے صفحات 160-140 کے مطالعے سے عبرت انگیز معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔

تو اس رستاخیز کا نشانہ جس طرح مسلمانوں کو بنایا گیا انہیں اس کا جو نقصان اٹھانا پڑا، اُس پر ہمارے دانشوروں نے کم ہی توجہ کی ہے۔ لیکن اس پہلو تہی کا ایک اور قابل افسوس رخ یہ بھی ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ساتھ دلّی کی مرکزیت کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، رانی لکشمی بائی اور منگل پانڈے کے ساتھ ساتھ مولوی لیاقت علی، بخت خاں، بیگم حضرت محل کی قربانیوں کو کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور جیسا کہ ولیم ڈیل رمپل نے اپنی کتاب 'آخری مغل' میں لکھا ہے کہ دلّی ہی اس کا مرکز تھا۔

بہادر شاہ کے ساتھ شہزادہ فیروز اور شہزادہ بیدار بخت کا کردار بھی کم اہمیت کا حامل نہیں کہ اوّل الذکر نے آزادی کا اعلان نامہ جاری کیا۔ اور موخر الذکر نے 'پیام آزادی' نامی اخبار کے ذریعہ عوام میں حریت کی روح پھونک دی۔ ان شہزادوں کے ساتھ ساتھ دوسرے شہزادے ابوبکر، خضر سلطان اور ہندوستانی فوج کے کمانڈر مرزا مغل کو جس بے دردی کے ساتھ بے لباس کر کے کرنل ہڈسن نے گولی ماری وہ اس بربریت کی مثال ہے جس سے جنگ جیتنے کے بعد فاتح انگریزوں نے کام لیا۔ صرف دلّی ہی نہیں لکھنو میں بھی ہفتوں تک قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔

The First Indian War of Independence 1857-1859; by Marx-Engels progres publishers moscow 1st print1959;p 118

عصر حاضر کے تناظر میں اگر بہادر شاہ ظفر کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی بلند قامتی حیرانی کا باعث بنتی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب تہذیبی تکثیریت multiculturalism کا نام بھی نہیں سنا گیا تھا انھوں نے اپنے قول و فعل سے تحمل tolerance اور تکثیریت pluralism کی روشن مثال قایم کی۔ 1857 کے عیدالاضحیٰ کے موقع پر انھوں تمام علاقہ میں گھوم کر گاؤ کشی بند کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اسی طرح جب شہنشاہ کی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنا حکمران مقرر کیا تھا تو دلی میں عام انتشار کو فرو کرنے کی خاطر انھوں نے مفتی صدرالدین آزردہ کو ساتھ لے کر استحکام بحال کرنے کی خاطر دلّی کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے مفتی صدرالدین آزردہ کو شہر کے حاکم city magistrate کا عہدہ پیش کیا تھا جسے مفتی صاحب نے قبول نہیں کیا مگر مشوروں سے بادشاہ کی موانعت کرتے رہے۔ نو آبادیاتی مورخین کے ساتھ ملکی تاریخ نویسوں نے بھی بہادر شاہ ظفر کی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ بسا اوقات ان سے تمسخرانہ سلوک بھی کیا ہے لیکن اب ان کی شخصیت کھل کر سامنے آرہی ہے۔ ان کی شخصیت کا موازنہ کیجئے ہندوستان میں مصروف کار مشنریوں کے ساتھ اور خود دیکھئے کہ وہ ہندو مذہب اور ہندوؤں کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس دور کے برطانوی مذہبی مبلغوں evangelicals کی طرح وہ بے حسی اور نخوت کا شکار نہیں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ہندو رعایا کی محافظت کا فرض انجام دیا کہ انھیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیاں مثبت رشتہ پر یقین کامل تھا۔

آخر میں یہ کہ مغرب خاص کر انگریزوں کی روشن خیالی کا بہت ڈنکا بجایا جاتا ہے۔ دراصل روشن خیالی ایک تحریک بن کر 1770-1660 کے درمیان یوروپ میں ابھری تھی۔ جس کی جولاں گاہ ادب اور فلسفہ کی دنیا تھی۔ بہت سارے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یوروپی آبادی اس دور میں بہت ہی متحمل مزاج اور نرم خو ہو گئی تھی۔ جب کہ درحقیقت ایسا کچھ نہیں تھا۔ تاریخ کے ایک سرسری مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دورانیہ میں اُن کی نو آبادیاتی سرگرمیوں میں بے پناہ اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اندرون ملک بھی زمینوں سے خانہ بدوشوں کی بے دخلی اور جادوگرنیوں کو زندہ جلائے جانے کا شغل بہت زور و شور سے جاری رہا۔ دراصل صنعتی انقلاب اور نو آبادیاتی کاروبار نے اہل یوروپ کو ہوس کا غلام بنا کر رکھ دیا تھا اور وہ دوہرے معیار سے ہر شے کو آنکنے میں چنداں دریغ نہیں کرتے تھے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو یہ دوہرا معیار آج بھی اہل مغرب کا طرہ امتیاز ہے۔

OO

غلامی کی نفسیات

نوآبادیاتی صورتِ حال

ناصر عباس نیّر

■

...نوآبادیاتی باشندہ، نوآبادکار کا اثبات اور اپنی نفی کرتا ہے۔ اثبات ونفی کے اس عمل سے گزرتے ہوئے وہ یہ غور نہیں کرتا کہ نہ تو کامل اثبات ممکن ہے نہ نفی۔ وہ نوآبادکار جیسا، اس لیے نہیں بن سکتا کہ وہ اپنی نوآبادیاتی حیثیت سے دست کش نہیں ہوسکتا۔ نوآبادیاتی صورتِ حال غلام کو آقا کا ہم پلہ بننے کا خواب دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہے کہ اس خواب کے ذریعے ہی نوآبادکار کی 'مقتدر ومثالی' حیثیت کا تسلط قایم رہتا ہے، مگر اس خواب کو پورا ہونے کی اجازت کبھی نہیں دیتی کہ اس طرح نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندے میں فرق مٹ جائے گا...

■

1857 نے ہماری تاریخ کو ہی نہیں ہمارے تاریخی شعور کو بھی بدل کے رکھ دیا۔ اس کے بعد ہم نہ صرف نئے عہد میں داخل ہوئے بلکہ خود کو اور اوروں کو نئے زاویوں سے دیکھنے لگے اور یہ نئے زاویے ہم نے خود تخلیق نہیں کیے تھے۔ نئی تاریخ نے یہ ہمیں تھما دیے تھے۔ یہ عمل ایک ایسے لمحے میں ہوا تھا کہ ہم انکار نہیں کر سکے۔ انکار کا انجام ہمارے سامنے تھا۔ اس غیر معمولی 'انقلاب' کو محض عسکری طاقت نے ممکن نہیں بنایا۔ عسکری طاقت تو ایک وسیلہ تھی جو دیگر وسایل کے ساتھ گٹھ جوڑ کیے ہوئے تھی۔ اصل یہ ہے کہ مذکورہ انقلاب کو جس بات نے ممکن بنایا وہ نوآبادیاتی صورتِ حال تھی۔ اس صورتِ حال نے متعدد وسایل اور تدبیروں کو یک جا کیا اور انھیں بروئے کار لائی۔

سوال یہ ہے کہ نوآبادیاتی صورتِ حال کیا ہے؟

نوآبادیاتی صورتِ حال، فطری اور منطقی صورتِ حال نہیں ہے۔ یہ ازخود کسی قابلِ فہم فطری قانون کے تحت رونما نہیں ہوتی۔ ہر چند اس کی رونمائی تاریخ کے ایک خاص لمحے میں ہوتی ہے، مگر تاریخ کا یہ لمحہ کسی الہامی حکم یا فطری طاقتوں کے اپنے قوانین کی 'پیداوار' نہیں ہوتا۔ اسے 'پیدا' کیا جاتا اور تشکیل دیا جاتا ہے۔ چوں کہ 'پیدا' کیا جاتا ہے، اس لیے مخصوص مقاصد کے حصول کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورتِ حال ہے۔ اس گروہ کو نوآبادکار نام دیا گیا ہے۔

نوآبادکار بعض تاریخی قوتوں کو اپنے اختیار میں لا کر ایک نئی 'تاریخی صورتِ حال' کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، جو اس کے سیاسی اور معاشی مفادات کی کفیل ہوتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم تک نوآبادکار یورپی (برطانیہ اور فرانس بالخصوص) تھے۔ بعد میں نوآبادکاری پر امریکا نے اجارہ

داری قائم کرلی، مگر بانداز دگر! اس نے براہ راست نوآبادیات بنانے کے بجائے بالواسطہ طریقے سے نوآبادیاتی صورتِ حال کو پیدا کرنے اور اپنے قابو میں رکھنے کی حکمتِ عملی اختیار کی ہے۔

نوآبادیاتی صورتِ حال کی 'منطق ثنویت' سے عبارت ہے۔ یہ دو دنیاؤں کو تشکیل دیتی ہے۔ ایک نوآبادکار کی دنیا اور دوسری نوآبادیاتی یا مقامی باشندوں کی دنیا۔ دونوں دنیائیں ایک دوسری کی ضد ہوتی ہیں۔ فرانز فینن کا کہنا ہے کہ یہ ضد کسی بڑی اکائی کو پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ دونوں ارسطالیسی منطق کے تحت ایک دوسرے کو خارج کرنے کے اصول پر قایم رہتی ہیں۔ (افتادگان خاک، ص34) یہ تو بجا کہ نوآبادکار کی دنیا، مقامی باشندوں کی دنیا کو خارج کرنے کے اصول پر قایم رہتی ہے۔ نوآبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آرا پھیلاتا ہے، وہ نوآبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت، ثقافت، علم اور فنون کے متعلق موجود آرا کے متضاد اور انھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں، مگر یہ درست نہیں کہ مقامی باشندوں کی دنیا، نوآبادکار کی دنیا کے اوصاف کو خارج کرنے کا اصول قایم کرتی ہیں۔

اپنی متقابل دنیا کی اشیا اور تصورات کو خارج کرنے کے لیے اقتداری حیثیت کا مالک ہونا ضروری ہے، نوآبادیاتی دنیا اس سے بُری طرح محروم ہوتی ہے۔ اپنی محرومی کا ادراک، نوآبادیاتی دنیا دو صورتوں میں کرتی ہے: محرومی کے خاتمے کی صورت میں اور محرومی کے سبب کی صورت میں۔ پہلی صورت میں وہ نوآبادکار کی دنیا کو جذب کرنے کی کوشش کرتی ہے اور دوسری صورت میں وہ نوآبادکار کو اپنی محرومی کا سبب سمجھتی اور اس کے خلاف بغاوت کا تصور کرتی اور شاذ و نادر مظاہرہ کرتی اور اپنی بازیافت پر مائل ہوتی ہے۔ مگر سب صورتوں میں وہ نوآبادکار کی دنیا کے اخراج سے قاصر رہتی ہے۔

نوآبادیاتی دنیا کی دو میں تقسیم کا اختیار، نوآبادکار کے پاس ہوتا ہے۔ نوآبادکار محض اس تقسیم کے ذریعے اپنے اختیار کا مظاہرہ ہی نہیں کرتا، اس تقسیم کے نتیجے میں اپنے اختیار کو بڑھاتا بھی ہے۔ یہ تقسیم طبعی اور ذہنی، بہ یک وقت ہوتی ہے۔ نوآبادکار اپنی اقامت گاہوں، چھاؤنیوں، دفاتر کو مقامی باشندوں سے الگ رکھتا ہے، اور مقامیوں کو ان کے قریب پھٹکنے کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ 'کتوں اور ہندستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے' کی تختی جگہ جگہ آویزاں ہوتی ہے۔ آرکی ٹیکچر کے شکوہ، حفاظتی دستوں کی طاقت اور تعزیری قوانین کے ذریعے مقامی باشندوں کو دور رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نوآبادکار اپنے طرزِ حیات اور طرزِ کار کے ذریعے بھی اپنے مختلف اور ممتاز ہونے کا تاثر برابر ابھارتا رہتا ہے اور نوآبادیاتی باشندوں کو دور رکھتا ہے۔ یہ دو طرح کی تقسیم نوآبادکار کی طاقت کو مسلسل بڑھاتی ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس طاقت کا نشانہ نوآبادیاتی قوم ہوتی ہے۔ نوآبادکار کی طاقت جتنی بڑھتی ہے، مقامی لوگوں کی طاقت اسی تناسب سے گھٹتی ہے، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ نوآبادکار، نوآبادیاتی اقوام کی طاقت کو اپنی طاقت میں شامل کرتا رہتا ہے۔

نوآبادکار، نوآبادیاتی دنیا کو دو میں تقسیم ہی نہیں کرتا، نوآبادیاتی باشندوں کی دنیا کو تشکیل بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نوآبادیاتی باشندوں کی دنیا ان کی اپنی دنیا نہیں ہوتی، انھیں اپنی 'دنیا' پر کوئی تصرف اور اختیار نہیں ہوتا، نہ اس دنیا کے حقیقی، عملی معاملات پر اور نہ اس دنیا کے تصور اور اس کے نظام اقدار پر۔ وہ اپنی ہی دنیا میں اجنبی، اور اس سے 'باہر' ہوتے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ نوآبادیاتی باشندے کو نوآبادکار جو تصورِ ذات دیتا ہے وہ اسے بالعموم قبول کرتا اور اس کے مطابق جینا شروع کر دیتا ہے اور نوآبادیاتی دنیا میں جو کردار اسے ادا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، وہ اسے عموماً تسلیم کر لیتا ہے۔

فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید تینوں اس امر پر متفق ہیں کہ نوآبادیاتی اقوام، نوآبادکار کے دیے گئے تصورِ ذات اور کردار کو تسلیم کر لیتی ہیں اور اس کی وجہ سے نوآبادیاتی نظام قایم رہتا ہے۔ چناں چہ یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں کہ نوآبادیاتی نظام کی برقراری میں خود مقامی باشندوں کا انفعالی کردار معاونت کرتا ہے۔

نوآبادیاتی باشندوں کو ایک ایسا 'تصورِ ذات' دیا جاتا ہے، جو نوآبادیاتی نظام کے قیام و استحکام میں مدد کرتا ہے۔ البرٹ میمی کے مطابق نوآبادکار مقامی باشندوں کی اساطیری تصویر بناتا ہے اور اس میں انھیں ناقابلِ یقین حد تک کاہل دکھایا جاتا ہے۔[1] جب کہ فرانز فینن کا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی باشندے کے لیے جو اصطلاحیں نوآبادکار استعمال کرتا ہے، وہ حیوانیات کی اصطلاحیں ہیں۔ (افتادگان خاک، ص38) کاہل یا حیوان کہنے کا مطلب مقامی باشندوں کو انسانی درجے سے گراتا ہے۔ نوآبادکار خود کو انسانی درجہ پر فائز قرار دیتا اور انسانی پیمانے کی مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ نوآبادیاتی اقوام کو کاہل اور حیوان باور کرا کے اوّلاً یہ بات ثابت کی جاتی ہے کہ انھیں ذہنی تحرک اور جستجو سے کوئی واسطہ نہیں، افکار و علوم کی تخلیق سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔ یہاں نوآبادکار اپنے ذہنی تحرک، جستجو، اور اپنے علوم کو بہ طور نمونہ پیش کرتا ہے۔

نوآبادکار اپنے اقتدار کے مراکز، پولیس اور عدالت کے نظام کو جائز ثابت کرتا ہے کہ کاہلوں اور حیوانوں کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کا

جابرانہ اور عدالت کا سفاکانہ نظام ناگزیر ہے۔ نوآبادیاتی باشندے بالعموم اپنے کاہل اور حیوان ہونے کا یقین کر لیتے ہیں۔ اس یقین کو پیدا کرنے کے لیے نوآبادکار کئی نفسیاتی حربے بروئے کار لاتا ہے۔ اور سب سے بڑا حربہ اپنی مقتدر حیثیت کا مختلف طریقوں اور زاویوں سے مظاہرہ ہے۔

نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندہ دونوں اپنی حیثیتوں سے برابر آگاہ ہوتے ہیں۔ نوآبادا اپنے آقا، مقتدر اور استحصال کنندہ ہونے کا شعور رکھتا ہے اور نوآبادیاتی باشندہ اپنے محکوم، بے بس اور استحصال زدہ ہونے کی آگاہی رکھتا ہے مگر دونوں کی آگاہی کا درجہ یکساں نہیں ہوتا۔ نوآبادکار کی آگاہی اختیار و اقتدار سے وابستہ ہونے کی وجہ سے غیر محدود اور ارتقا پذیر ہوتی ہے، وہ اپنے استحصالی مقاصد کو برابر وسعت دیتا اور ان کے حصول کے لیے نئے نئے وسایل کی دریافت میں مصروف رہتا ہے مگر نوآبادیاتی باشندے کی آگاہی محکومیت اور استحصال زدگی کی وجہ سے محدود، مشروط اور منجمد ہوتی ہے۔ اقبال نے اس شعر میں یہی حقیقت واضح کی ہے:

بھروسا کر نہیں سکتے، غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

(بال جبریل، ص 27)

یا بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام

(ضرب کلیم ص 171)

نوآبادکار اپنی آگاہی کی مقتدر حیثیت کو نوآبادکار کی زندگی کے تمام شعبوں میں سرایت کرنے کی حکمت عملی وضع کرتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کا یہ تجزیہ چشم کشا ہے۔

"(Authority) is formed, irradiated, disseminated, it is instrumental, it is persuasive, it has status, it establishes cannons of taste and value, it is virtually indistinguishable from certain ideas it dignifies as true and form traditions, perceptions and judgements it forms, transmits, reproduces."

(Orientalism, P 19-20)

نوآبادکار خود کو نوآبادیاتی اقوام کے سامنے قدر اور اصول کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پیش کرنے کا طریق کار علمی اور فلسفیانہ ہو سکتا ہے مگر اصل میں یہ اصول، طاقت اور اقتدار سے عبارت ہوتا ہے۔ نوآبادکار جب نوآبادیاتی اقوام کے علوم، زبان، ثقافت، تاریخ اور ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو یہ معروضی، غیر جانب دارانہ مطالعہ نہیں ہوتا۔ اس کی نوعیت ڈسکورس کی ہوتی ہے۔

ڈسکورس ایک ایسا کلامیہ ہے، جو سچائی کے مقابلے میں طاقت کو اہمیت دیتا ہے۔ سچائی یا 'علم' کو ڈسکورس دریافت ضرور کرتا، یا اس کا دعوا کرتا ہے، مگر یہ 'علم' مطلق، آفاقی اور معروضی نہیں ہوتا 'سماجی' ہوتا ہے۔ ڈسکورس کسی ایسے سرچشمے یا قانون کو تسلیم نہیں کرتا، جو 'علم' کی مطلقیت کو ثابت کرے۔ علم کی صداقت کا تعین ڈسکورس کے اپنے قوانین کرتے ہیں۔ گویا کسی شے کا 'علم' یا سچائی وہی ہے، جسے ڈسکورس کے قوانین، علم اور سچائی کا درجہ دیں۔ ان قوانین کا تعین طاقت کرتی ہے۔ "لوگ صرف اسی کو سچائی قرار دیتے ہیں، جو سچائی کے ان معیارات کے مطابق ہو، جنھیں اس عہد کی سیاسی یا دانش ورانہ مقتدرہ نے سچائی قرار دیا ہو۔"[2]

نوآبادکاروں نے نوآبادیاتی اقوام کا مطالعہ ڈسکورس[3] کے طور پر کیا۔ نوآبادکاروں نے ایشیائی/مشرقی اور افریقی اقوام کا 'علم' حاصل کیا، مگر نہ صرف اس علم کی صداقت کا تعین، صداقت کے اپنے، مغربی معیارات سے کیا جو اس عہد میں غالب تھے، بلکہ اس علم کو اپنی طاقت بھی بنایا یعنی اس علم کو اپنے اقتداری مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ ایڈورڈ سعید نے شرق شناسی میں نوآبادکاروں کے ڈسکورس کا ہی مطالعہ پیش کیا ہے۔ چوں کہ نوآبادیاتی اقوام اور ثقافت کا مطالعہ ایک ڈسکورس کے طور پر تھا، اس لیے نوآبادیاتی اقوام نے خود اپنے متعلق 'علم' نوآبادکاروں کی تحریروں سے حاصل کیا۔ ڈسکورس نے نوآبادیاتی اقوام کے مغربی مطالعات کو استناد کا درجہ دیا۔

نوآبادکار کی تشکیل دی گئی دنیا میں، نوآبادیاتی باشندوں کے لیے، بہ قول البرٹ میمی، دو صورتیں ہوتی ہیں: انجذاب اور بغاوت۔ (The Colonizer and the Colonized, P 184) نوآبادیاتی باشندہ یا تو نوآبادکار جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے، اس کی شخصیت، ثقافت، نظام فکر، اقتداری نظام کو مکمل طور پر جذب کرنے کی سعی کرتا۔ ہے، یا پھر اس کے خلاف بغاوت کرتا اور اپنی بازیافت کے عمل سے گزرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب بھی، نوآبادیاتی باشندے کا اپنا فیصلہ نہیں ہوتا۔ یہ نوآبادیاتی صورت حال ہے، جو کبھی ایک اور کبھی دوسرے کے انتخاب کا موقع پیدا کرتی ہے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ممکن ہوتی ہے، جو دونوں کا امتزاج ہوتی ہے۔ نوآبادکار کی ثقافت کو جذب بھی کیا جاتا ہے اور اپنی ثقافتی شناخت کو قایم بھی رکھا جاتا ہے۔ انجذاب کی صورت میں مغربیت میں اعتقاد پختہ ہوتا ہے۔ بغاوت کی صورت میں علاقائیت یا قومی شناخت کو

فروغ ملتا ہے اور امتزاج کے سبب آفاقیت کے نقطۂ نظر کا دعوا کیا جاتا ہے، آفاقیت بھی دیگر دو کی طرح نوآبادیاتی صورتِ حال کی 'عطا' ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا نوآبادیاتی صورتِ حال میں انجذاب، بغاوت اور آفاقیت کی اصل روح تک رسائی کا امکان ہوتا ہے؟ کیا نوآبادیاتی باشندہ ایک حقیقی یورپی/مغربی فرد بن سکتا، اپنی اصل ثقافت کے مکمل احیا پر قادر ہوسکتا اور دو مختلف اور متبائن ثقافتی نظاموں کے امتزاج کو ممکن بنا سکتا ہے؟ جب تک نوآبادیاتی صورتِ حال برقرار رہتی ہے اور نوآبادیاتی باشندہ اس کے جبر میں ہوتا ہے، وہ مذکورہ سوال کا سامنا ہی نہیں کرتا، وہ نہیں سوچتا کہ کیا کامل انجذاب، مکمل بغاوت یا مثالی آفاقیت ممکن ہے یا نہیں۔ وہ تو صورتِ حال کے دستیاب مواقع میں سے کسی کو اختیار کر لیتا ہے۔ یہ سوال ہمیشہ مابعد نوآبادیاتی مطالعات میں اٹھایا جاتا ہے۔ فرانز فینن اور البرٹ میمی نے بالخصوص یہ سوال اٹھایا ہے اور ان کا موقف ہے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی ممکن نہیں۔

نوآبادیاتی باشندہ نوآبادکار کو اپنے لیے جب ماڈل بناتا ہے تو خود اس جیسا بننے کی تگ و تاز کرتا ہے۔ اور اس تگ و تاز میں خود کو بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

"The first ambition of the colonized is to become equal to that splendid model and to assemble him to the point of disappearing in him."(AlbertMemmi,The Colonized and the Colonized,P 184)

نوآبادیاتی باشندہ، نوآبادکار کا اثبات اور اپنی نفی کرتا ہے۔ اثبات و نفی کے اس عمل سے گزرتے ہوئے وہ یہ غور نہیں کرتا کہ نہ تو کامل اثبات ممکن ہے نہ نفی۔ وہ نوآبادکار جیسا، اس لیے نہیں بن سکتا کہ وہ اپنی نوآبادیاتی حیثیت (جو اصل میں محکومیت، پس ماندگی، ذلت سے عبارت ہے) سے دست کش نہیں ہوسکتا۔ نوآبادیاتی صورتِ حال غلام کو آقا کا ہم پلہ بننے کا خواب دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہے کہ اس خواب کے ذریعے ہی نوآبادکار کی 'مقتدر و مثالی' حیثیت کا تسلط قایم رہتا ہے، مگر اس خواب کو پورا ہونے کی اجازت کبھی نہیں دیتی کہ اس طرح نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندے میں فرق مٹ جائے گا۔ یہ فرق نوآبادیاتی صورتِ حال کو قایم رکھنے کے لیے اشد ضروری ہے۔ نوآبادیاتی باشندہ انجذاب کے ذریعے نوآبادکار کا قرب حاصل کرنے اور نتیجتاً مراعات حاصل کرنے میں کام یاب ہوتا ہے مگر یہ مراعات بھی نوآبادکار کے اپنے ملک کے شہری کی مراعات کے برابر کبھی نہیں ہوتیں۔ ان مراعات کی قیمت ہوتی ہے، جو نوآبادیاتی باشندے کو لازماً ادا کرنا ہوتی ہے۔

انجذاب کے عمل میں نوآبادیاتی باشندہ، نوآبادکار کی زبان سیکھتا ہے اس کا لباس اختیار کرتا ہے، اس کے طرزِ بود و باش کی نقل کرتا ہے۔ نقل و تقلید میں وہ جتنا آگے جاتا ہے، اپنی تاریخ، ثقافت، اور اپنی اصل سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنی اصل سے دوری اسے طبعی اور نفسیاتی سطح پر ضرر پہنچاتی ہے، جسے وہ بہ خوشی قبول کر لیتا ہے۔ وہ اس ضرر کو محسوس کرتا ہے، مگر نوآبادکار جیسا بننے کی خواہش کا زور اس کے احساس پر غالب آجاتا ہے۔ یہ ایک پے چیدہ نفسیاتی عمل ہوتا ہے۔ نوآبادکار کی نقل سے ہر چند بعض مادی فواید وابستہ ہوتے ہیں، اور ایک حد تک ان فواید کا حصول نقل کا محرک ہوتا ہے، لیکن یہ واحد محرک نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو صرف وہی لوگ یا طبقے نوآبادکار کی نقل کرتے جنھیں مادی فایدے ملتے، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ نوآبادکار کی ثقافت کا انجذاب وہ لوگ اور طبقات بھی کرتے ہیں جو نوآبادکار سے دور ہوتے اور کسی فایدے کی انھیں توقع ہوتی ہے نہ امکان۔ انھیں ایک نفسیاتی اطمینان ملتا ہے۔ وہ نوآبادکار کی ثقافت کا تصور ایک 'اعلا یافت' کے طور پر کرتے ہیں۔ چوں کہ اعلا کا تصور تجریدی نہیں بلکہ ان کی اپنی ثقافت کے حقیر ہونے کے لازمی اور قوی احساس کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے حقیر کا 'ترک' اور اعلا کا 'قبول' انھیں ایک نفسیاتی آسودگی دیتا ہے۔ چناں چہ ایک مقام آتا ہے کہ نوآبادکار کی نقل و تقلید ایک آدرش بن جاتی ہے۔

اس صورتِ حال کی عمدہ عکاسی ملک راج آنند کے ناول اچھوت میں کی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار باکھا یوروپیوں جیسا بننے کی کوشش کرتا اور خود سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ باکھے کا تعلق بھنگیوں کے 'نیچ' طبقے سے ہے۔ وہ انگریزوں کی نقل کے عمل میں تمام ہندستانیوں کی نمایندگی کرتا ہے۔

> ''جب وہ (باکھا) اپنے چچا کے ساتھ برٹش رجمنٹ کی بارکوں میں رہنے گیا تھا۔ وہاں ٹھیرنے کے دوران اس نے ٹامیوں کی زندگی کی جھلکیاں دیکھی تھیں... اسے جلد ہی ایک شدید خواہش نے جکڑ لیا کہ وہ بھی ان ہی کی طرح زندگی بسر کرے گا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ صاحب لوگ تھے، یعنی زیادہ اعلا آدمی۔ اسے محسوس ہوا کہ جو ان کی طرح کپڑے پہنے گا وہ بھی صاحب بن جائے گا، اس لیے اس نے ان کی ہر بات میں نقل کرنے کی کوشش کی... باکھا خود بھی یہ جانتا تھا کہ انگریزی کپڑوں کے سوا اس کی زندگی میں کوئی چیز انگریزی نہیں تھی، لیکن اس نے جنتی سے اپنی نئی شکل کو برقرار رکھا اور وہ دن رات یہی کپڑے پہنے رہتا۔ وہ ہندستانی پن کے ہر حقیر دھبے سے بچتا تھا، حتا کہ بھدی شکل کے ہندستانی لحاف کو بھی نہیں اوڑھتا تھا، حالاں کہ وہ رات کو

ٹھنڈے کا نپتا رہتا تھا۔'' (اچھوت، ص13تا15)

نوآبادیاتی باشندہ، نوآبادکار کے خلاف بغاوت بھی کرتا ہے۔ یہ بغاوت براہِ راست اور بالواسطہ صورتوں میں ہوتی ہے۔ جب یہ بغاوت اپنی محرومی کے سبب کے تجزیے کے نتیجے میں ہوتی ہے، مقامی، نوآبادکار کو اپنی حالت زار کا سبب سمجھتا اور اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے تو یہ بغاوت براہ راست ہوتی ہے۔ بالواسطہ بغاوت اس طبقے کے خلاف ہوتی ہے، جو نوآبادکار کی ثقافت کے انجذاب کا قائل ہوتا ہے اور خود کو اس طرح، نوآبادکار کا حلیف بنا کر پیش کرتا ہے۔ نوآبادکار ماڈل ہوتا ہے اور بغاوت کی صورت میں اینٹی تھیسس کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ اصل میں بغاوت، انجذاب کا اینٹی تھیسس ہے۔ انجذاب کا اثبات، بغاوت کی نفی میں اور انجذاب کی نفی، بغاوت کے اثبات میں بدل جاتی ہے۔ بغاوت میں نوآبادکار کا انکار اور اپنا اثبات کیا جاتا ہے۔ اب اسی شدت سے اپنے ماضی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ بغاوت کے نتیجے میں علاقائیت اور قومی ثقافت کے احیا کی تحریکیں چلتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تمام نوآبادیاتی ممالک میں قومی ثقافتوں کی تحریکوں کا آغاز، نوآبادیاتی نظام کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں ہوا ہے۔ انجذاب میں استدلال سے زیادہ جذباتیت کارفرما ہوتی ہے، بغاوت میں بھی خالص استدلال سے زیادہ جذباتیت ہوتی ہے۔ قومی ثقافت سے جذباتی وابستگی کو اچانک دریافت کر لیا جاتا ہے۔

دو باتیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ثقافت ایک متحرک عمل ہے۔ ماضی کے ایک خاص حصے کو مثالی سمجھ کر اسے اپنے لیے ایک نمونہ خیال کیا جاتا اور اس کے احیا کی کوشش ہونے لگتی ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تاریخ کا وہ سنہرا دور، جن تاریخی وسماجی حالات کی پیداوار تھا، وہ حالات اب نہیں رہے، اس لیے اس کا کامل احیا ممکن ہی نہیں۔ دوسری یہ بات کہ قومی ثقافت کے تصور میں علاقائی، ثقافتی افتراقات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ افریقہ میں نیگرو ثقافت کا تصور تشکیل دیا گیا جو ایک تجریدی تصور ہے، اور افریقہ کی مقامی ثقافتی روایات کے اختلافات کو نظر انداز کرتا ہے۔ اسی طرح ایشیا میں عرب ثقافت کو مثال بنا کر پیش کیا گیا، پان اسلام ازم کی تحریک چلائی گئی اور عرب ممالک کے جغرافیائی، علاقائی، ثقافتی اختلافات کو پس پشت ڈالا گیا۔

البرٹ میمی کا خیال ہے کہ نوآبادیاتی اقوام بغاوت کے عمل میں، فکر کی جو تیکنیک اور جنگ کا جو حربہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ نوآبادکار سے مستعار ہوتا ہے (دی کولونائزر اینڈ کولونائزڈ، ص195) شاید اس لیے کہ جبھی نوآبادکار، مقامی باشندوں کی تحریک کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نوآبادیاتی باشندے اپنی بازیافت کے عمل میں دوہری صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں: وہ اپنی اصل سے بھی جڑنا چاہتے اور ایک بامعنی وجود بنا چاہتے ہیں مگر ساتھ ہی اپنے بامعنی وجود کا ادراک نوآبادکار کو بھی کروانا چاہتے ہیں۔ نوآبادیاتی باشندے کی یہ تگ ودو، دو وجوہ سے ناکام رہتی ہے۔

اوّل اس لیے کہ یہ تگ و دو ڈسکورس کا درجہ اختیار نہیں کر سکتی، نوآبادیاتی باشندہ اس سیاسی یا دانش ورانہ یا آئیڈیالوجیکل اقتدار کا حامل نہیں ہوتا، جو کسی بات کو حقیقت تسلیم کرانے کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے نوآبادکار مقامی باشندوں کی تحریک بازیافت کے مفہوم کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنی بازیافت کی کوششوں کے شعور میں تاریخ کے تحرک کے اصول کو پس پشت ڈالا جاتا ہے، ماضی کے ایک عہد کو مثالی تصور کر لیا جاتا اور دوسرے زمانوں اور خود اپنے زمانے کی زندہ سچائیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ احیا اور بازیافت کے جوش میں اپنے عہد کی اصل صورت حال سے صرف نظر کرنا، عقلی اصول بن جاتا ہے۔ چناں چہ نہ تو اپنے عصر کی صورت حال کی پوری تفہیم کی ہمہ گیر کوشش ہوتی ہے نہ اسے بدلنے کی کسی حکمت عملی کو وضع کرنے کا کوئی امکان ہوتا ہے۔

آفاقی نقطۂ نظر میں نوآبادکار اور نوآبادیاتی دنیاؤں کے اقداری فرق کو ختم کرنے کی کوشش ہوتی ہے، دونوں میں مماثلتیں دریافت کی جاتی ہیں اور انھیں یک جا کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ یہ عمل عموماً دو صورتوں میں ہوتا ہے: ایک یہ کہ نوآبادکار کی ثقافت کو آفاقی خیال کیا جاتا اور اس کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس صورت میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ 'آفاقی ثقافت' تمام خطوں کے لیے ہے۔ یہ بات نظر انداز کی جاتی ہے کہ جسے آفاقی خیال کیا جا رہا ہے وہ اپنا مکانی اور زمانی تناظر رکھتی اور اسی تناظر میں بامعنی ہے۔ کسی دوسرے تناظر میں وہ اجنبی یا محدود معنی کی حامل ہے۔ دوسری یہ کہ نوآبادکار اور مقامی ثقافتوں میں متعدد اشتراکات ہیں۔ ان اشتراکات کی تلاش ساتھ تاریخی اور منطقی سطحوں پہ کی جانے لگتی ہے۔ اس تلاش کو عملی ضرورتوں کا جبر مہمیز کرتا ہے۔ یہیں سے تاریخ کی نئی تعبیرات کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ان تعبیری کوششوں کا بنیادی نکتہ دونوں ثقافتوں کے درمیان موجود فاصلوں اور فرق کو ختم کرنا ہوتا اور انھیں یک جا کرنا ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ سب کچھ نوآبادیاتی صورت حال میں ہو رہا ہوتا ہے، اس لیے دونوں دنیاؤں کا اقداری فرق ختم کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مشرق، مشرق رہتا ہے، اور مغرب، مغرب۔ دونوں کے امتزاج کی کوشش میں ایک کا برتر اور دوسرے کا فروتر ہونا لازم ہے لہٰذا جسے، آفاقی نقطۂ نظر قرار دیا جاتا ہے، وہ دراصل محدود

انجذاب ہے۔ مشرق کا مغرب کو خود میں جذب کرنا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مظاہرہ ذولسانیت میں ہوتا ہے۔ ہر نوآبادیاتی صورتِ حال ذولسانیت کو جنم دیتی ہے۔ مگر دونوں زبانیں برابر رتبے کی نہیں ہوتیں، نوآبادکار کی زبان اسی کی مانند مہذب اور افضل ہوتی ہے، جب کہ نوآبادیاتی اقوام کی زبانیں، گنوار لوگوں کی زبانیں اور ناشائستہ ہوتی ہیں۔ زبان کا اقتداری درجہ اس کے بولنے والوں کی نسبت سے متعین ہونے لگتا ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ زبان ایک آلۂ اظہار کے بجائے ایک 'علامتِ رتبہ' بن جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان حقیقتاً کم تر ہوتی ہے نہ نامکمل۔ وہ اپنے بولنے والوں کی جملہ ابلاغی اور ترسیلی ضرورتوں کی تکمیل کر رہی ہوتی ہے، مگر نوآبادیاتی صورت حال میں زبان کا یہ تصور باقی نہیں رہتا۔

زبان اپنے بولنے والوں کے سیاسی اور ثقافتی مرتبے کی نسبت سے کم تر یا برتر سمجھی جانے لگتی ہے۔ نوآبادیاتی اقوام، نوآبادکار کی زبان کو اپنے اندر جذب کرنے کی سعی کرتی ہیں، اور اپنی زبان کے لچک دار اور ترقی پسند ہونے کا دعوا کرتی ہیں، نیز نوآبادیاتی باشندہ بہ یک وقت دونوں زبانوں پر دسترس کا دعوا کرتا ہے مگر اپنے ذولسانی اقتداری نظام میں نوآبادیاتی زبان کو وہی مرتبہ دیتا ہے، جس کا تعین نوآبادکار نے کیا ہے۔ نوآبادکار بھی مقامی زبانیں سیکھتا ہے، مگر وہ کبھی ان زبانوں کو وہ مرتبہ نہیں دیتا، جو اس نے اپنی زبان کو دے رکھا ہے۔

ان باتوں کی تائید سرسید کے زبان سے متعلق خیالات سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں آفاقیت کا مندرجہ صدر تصور کی دونوں صورتیں موجود ہیں۔

''اگر ہم اپنی اصل ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں ...ہماری زبان یورپ کی اعلا زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے۔'' (مقالات سرسید، حصہ پانزدہم، ص 66)

''...ہم روزمرہ کے کاموں میں بھی انگریزی کے محتاج ہیں۔ ادنا درجے کے لوگوں کو ادنا درجے کی انگریزی کی، اعلا درجے کے لوگوں کو اعلا درجے کی انگریزی کی محتاجی ہے، یہاں تک کہ ایک کنجڑے ترکاری فروش یا ایک چمار جوتی والے کو بھی اس قدر انگریزی جاننا ضروری ہے کہ وہ یہ کہہ سکے کہ ''خوشی ہو لیک، خوشی نہ ہو تو نو لیک''(مقالات سرسید، حصہ ہشتم، ص 47)

انجذاب، بغاوت اور آفاقیت وامتزاج کے آزادانہ مفاہیم بھی ہیں جو نوآبادیاتی صورتِ حال میں ظاہر ہونے والے مفاہیم سے مختلف ہیں۔ نوآبادیاتی باشندے جب تک، نوآبادیاتی صورتِ حال کے زمروں میں مقید ہو کر یہ عمل انجام دیتے ہیں، وہ اسی طرح کے نتائج تک پہنچتے ہیں جن کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ نوآبادیاتی نظام میں کیا کوئی مقامی فرد یا گروہ آفاقیت کا آزادانہ مفہوم قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا؟ کیا اس نظام کا جبر اتنا شدید، اتنا ہمہ گیر اور اتنا سرایت گیر ہوتا ہے کہ ایک خطے میں ایک عہد کی تمام انسانی روحیں نوآبادیاتی نظام کی صلیب پر لٹک جاتی ہیں؟ کوئی آزاد و فعال ذہن باقی نہیں رہتا؟

اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی صورت میں نوآبادیاتی ممالک کی قومی اہانت وہ تصور اُبھرتا ہے، جو نوآبادکار کو 'عزیز' ہوتا ہے اور اس کے تاریخی بیانیوں میں کثرت سے ابھارا جاتا ہے تاکہ اُس کے ہر اقدام کا جواز مہیا ہو سکے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر نوآبادیاتی ملک میں کچھ افراد یا گروہ آزاد، ذہنی فعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ نوآبادکار کی ثقافت کا براہ راست علم حاصل کرتے ہیں، مگر اپنی ثقافت سے بے گانگی کی قیمت پر نہیں۔ دونوں ثقافتوں سے راست اور گہرا ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے وہ حقیقی آفاقی نقطہ نظر اختیار کرنے کی اہلیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ نہ اپنی ثقافت کے سلسلے میں ماضی پرستی اور تعصب کا شکار ہوتے ہیں نہ نوآبادکار کی ثقافت سے مرعوب ہوتے ہیں، ان کا ذہنی رشتہ ثقافتوں کے فکری و عملی اور تخلیقی حاصلات سے قایم ہو جاتا ہے، چناں چہ وہ دونوں کی خوبیوں کے مداح اور دونوں کی کم زوریوں کے نکتہ چیں ہوتے ہیں، اور خوبیوں اور کم زوریوں کا تصور، وہ کسی ایک ثقافت سے نہیں، مجموعی انسانی ثقافت سے اخذ کرتے ہیں۔

نوآبادکار اپنی نوآبادیاتی ذہنیت کے مظاہرے کے لیے سیاسی و سماجی، معاشی، تعلیمی شعبوں کو منتخب کرتا ہے، ان میں اپنی آئیڈیالوجی کا بیج بوتا ہے۔ آفاقی نقطہ نظر ان شعبوں کے بجائے، مستقل اہمیت کے فکری و علمی منطقوں سے خود کو منسلک کرتا ہے۔ یہ نوآبادیاتی صورتِ حال سے فرار اور ذہنی خانقاہوں میں پناہ گزین ہونے کا عمل نہیں ہے، بلکہ نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کا تابع مہمل بننے سے انکار اور حقیقی انسانی علم کی روایت سے وابستہ ہونے کا آزادانہ ذہنی عمل ہے۔ OO

حواشی:

1۔ بحث کے لیے دیکھیے: The Colonizer and the Colonized
by Albert Memmi, P145

2۔ مزید بحث کے لیے دیکھیے: Contemporary Literary Theory
byRaman Selden and Petor Widdowson, P 158

3۔ ڈسکورس کی تھیوری مشیل فوکو کی پیش کردہ ہے، مزید مطالعے کے لیے دیکھیے:
The Archeology of Knowledge by Michael Foucault, P 40-50

حکومت و انتظامیہ

نظامِ حکومت اور جمہوری عناصر

محمد سبطین

انتظام مملکت کے لئے دستور و آئین ناگزیر ہوتا ہے۔ کچھ اصول اور قوانین ہوتے ہیں جو آئین کی روشنی میں مدون کئے جاتے ہیں۔ کچھ رہنما خطوط ہوتے ہیں جن پر حکومت کا کاروبار چلتا ہے۔ اسی لئے ارسطو نے جب حکومتوں کے قیام کے سلسلے میں بحث کی تو نراج کا بھی ذکر کیا جس کا انگریزی مترادف Anarchy یعنی جہاں کوئی راج نہ ہو۔ دورِ حاضر میں بھی جب کبھی لاقانونیت حد سے بڑھ جاتی ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ جنگل راج ہے۔ غالباً اس لفظی ترکیب کے پس منظر میں یہی راز ہوگا کہ جنگل میں کوئی قانون یا ضابطہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے جنگل میں جانوروں کے بھی کچھ قاعدے قانون ہوتے ہیں البتہ انسانوں کے ساتھ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جب خود پرستی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہاں کوئی قانون نہیں رہ جاتا۔

اسی بنیاد پر ارسطو نے حکومت کرنے کے مختلف نظریات سمجھائے تھے جن میں جمہوریت، اشرافیہ، آمریت، بادشاہت یا شہنشاہیت اہم تھے۔

دورِ حاضر میں تقریباً تمام ممالک میں جمہوریت برائے نام سہی مگر ہے۔ بادشاہت تو انگلیوں پر گنے جانے والی ملکوں میں رہ گئی ہے بقول کسی ظریف کے تاش کے پتوں کے چار بادشاہوں کو شامل کیجئے تو شاید بادشاہی نظام انگلیوں پر گنا جاسکے۔ لیکن بیسویں صدی کے دورِ آغاز تک ایشیائی ممالک میں بھی اور اکثر یورپی ممالک میں بھی بادشاہت تھی اور انیسویں صدی میں تو بادوشاہت کا ہی سکہ چل رہا تھا۔

بادشاہوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہر بادشاہ اپنے وزرا کے انتخاب میں اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھتا تھا کہ اس کے وزیر و مشیر ایسے ہوں کہ جنھیں عوامی تائید حاصل ہو۔ یا وہ اکبر کے نورتنوں کی طرح کسی ایک شعبہ میں مہارت رکھتے ہوں۔

■

براہِ راست جمہوری تصورات کا اظہار اس عہد میں ممکن نہ تھا۔ دہلی کے اربابِ حل وعقد نے بادشاہی جمہوریت یعنی انگلستانی طرزِ حکومت کو پسندیدہ اور محبوب سمجھا تھا۔ لیکن وہاں کی تفصیلات یہاں تک نہیں آسکی تھیں اس لئے بہت سے وہ پہلو نہیں اختیار کئے جاسکے جو پارلیمانی جمہوریت کا خاصہ ہیں۔ کابینہ کی تشکیل میں نامزدگی کا تصور زیادہ تھا۔ لیکن جمہوریت کا جو ایک منفی پہلو ہے، اس سے ان گوں نے دامن بچالیا تھا۔ یعنی صرف بندوں کی گنتی نہیں تھی بلکہ اہلیت اور تجربہ اور سن رسیدگی یا سینیرٹی کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔

■

ہندوستان میں 1526 سے لے کر 1803 تک تقریباً پونے تین سو برس مغلوں کی سلطنت اپنے جاہ وجلال اور رعب و دبدبہ کے ساتھ رہی حالانکہ بتدریج، انگریز اسے کھوکھلا کر چکے تھے مگر 1803 میں شاہ عالم نے انگریزوں کے ہاتھوں کچھ لاکھ روپیوں میں دیوانی بیچ دی تو وہ بادشاہ کے بجائے پنشن خوار رہ گئے اور یہ محاورہ مشہور ہوگیا تھا کہ ''حکومت شاہ عالم ازقلعہ تا پالم'' ہے اور اسی بنا پر جب 1857 میں اتر پردیش، بہار کے کچھ حصوں اور دہلی میں بغاوت ہوئی تو اسے انگریزوں نے بھی غدر کا نام دیا کہ ان کے خیال کے مطابق نہ کوئی نظامِ حکومت رہ گیا تھا نہ کوئی انتظامیہ۔ شورش نے سب کچھ درہم برہم کر دیا تھا اور ایک نراج یا Anarchy کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو حسین اور خوبصورت تصورِ حکومت کی پیش کی تھی اس سے ہندوستانیوں کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اس لئے جب ذرا سا ہندوستانیوں کے قدم جمتے ہوئے محسوس ہوئے تو انھوں نے باقاعدہ انتظامِ سلطنت اور نظامِ حکومت کے اصول مرتب کئے۔ سب سے پہلے دہلی میں جو حکومت قائم ہوئی تھی اس کی تشکیل اور طریقۂ کار کے جو رہنما اصول تھے وہ درج کیے جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ازاں جا کہ واسطے رفع برہمی سرشتہ ہا اور موقوفی بدا نتظامی طریقۂ فوجی وملکی کے، مقرر ہونا ایک دستور العمل کا واجب اور مناسب۔ اور واسطے عمل درآمد دستور العمل کے اولاً معین ہونا کورٹ کا پر ضرور ہے۔ اس کے حسب ذیل قواعد مقرر کئے جاتے ہیں:

1۔ ایک کورٹ قائم کی جائے اور اس کا نام کورٹ ایڈمنس ٹریشن یعنی جلسہ انتظام فوجی وملکی رکھا جائے۔

2۔ اس جلسے میں دس آدمی مقرر کئے جائیں۔ اس تفصیل سے کہ چھ جنگی اور چار ملکی[1] اور جنگیوں میں دو شخص پلٹن پیادگان سے اور یہ دو شخص رسالہ ہائے سواران سے اور دو شخص سرشتہ توپ خانے سے منتخب کئے جائیں۔

3۔ ان دس شخصوں سے ایک شخص باتفاق غلبہ آرائے پریسیڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور ایک شخص وائس پریسیڈنٹ، یعنی نائب صدر جلسہ مقرر ہو۔ رائے صدر جلسہ کی برابر دو رائے کے قرار پاوے گی اور ہر ایک سرشتہ میں بہ قدر ضرورت سکتر (سکریٹری) مقرر کئے جائیں، اور پانچ کس پر جلسہ کورٹ کا ہووے۔ خاص کام[2] ہمراہ کے ہوا کرے۔

4۔ ان دس شخصوں کے مقرر ہونے کے وقت حلف[3] ان باتوں کا لیا جائے کہ کام کورٹ کا دیانت اور امانت سے بلا رو رعایت کمال جاں فشانی اور غور وفکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ متعلقہ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے، اور حیلۂ اور صراحتاً اخذ وجبر یا رعایت کسی طرح کی کسی لحاظ سے وقت تجویز انتظام کورٹ میں نہ کریں گے، بلکہ ہمیشہ ساعی سرگرم ایسے انتظام امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائش رعیت ہو۔ اور کسی امر مجوزہ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحب[4] عالم قبل اجرائے اوس کے صراحتاً یا کنایتاً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

5۔ انتخاب اشخاص کورٹ کا اس طریقہ سے کہ غالبہ آرائے سے دو دو شخص پلٹن پیادگان اور رسالہ ہائے سوار ان سے اور سرشتہ توپ خانہ جنگی سے جو قدیم الخدمت اور ہوشیار اور واقف کار اور لائق (اور) عقیل ہوں، کیے جاویں اور اگر کوئی شخص ہوشیار، بہت اور عقیل اور فہیم اور لائق انصرام کار کورٹ ہو اور شرط قدیم الخدمتی کی اوس میں نہ پائی جائے تو صرف اس صورت میں یہی ایک امر خاص مانع تقرر ایسے شخص کا نہ ہوگا اور اسی طرح تقرر چار شخص ملکی کا بھی عمل میں آوے گا۔

6۔ بعد مقرر ہونے دس شخصوں کے اگر کوئی شخص جلسہ انتظام کورٹ میں رائے اپنی کسی امر میں، ایسی کو خلاف دیانت اور امانت یا محمول اوپر رعایت کسی کے ہووے گا تو بعد کامل غلبہ آرائے کورٹ سے وہ شخص علیحدہ کیا جائے گا، اور دوسرا شخص حسب قاعدہ پانچویں بجائے اوس کے انتخاب ہو۔

7۔ جو امورات انتظام کے پیش آویں اول تجویز اون کی کورٹ میں ہووے۔ بعد مرتب ہونے رائے غلبہ آرائے کورٹ سے واسطے منظوری پیش گاہ حضور صاحب عالم بہادر میں پیش ہو اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں ہوتی رہے گی، اور کورٹ تحت حکومت صاحب عالم بہادر کے رہے گی اور کوئی امور انتظام

جنگی اور ملکی بے تجویز کورٹ اور بلا منظوری صاحب عالم محتشم الیہ، اور بلا اطلاع حضور والا قابل اجرائے نہ ہوگا۔ اور در صورت اختلاف رائے صاحب عالم بہادر بعد تجویز ثانی کورٹ وہ رائے بہ حالتِ اختلاف بہ وساطت صاحب معظم الیہ پیش گاہِ حضور ظلِ سبحانی میں پیش ہو اور اس میں حکم حضور کا ناطق ہوگا۔

8۔ کورٹ میں سوائے اشخاص مقررہ جلسہ کے کوئی شخص غیر شریکِ جلسہ اور حاضر نہ ہوگا۔ مگر صاحب عالم بہادر[5] اور حضرت ظلِ سبحانی رونق افروز ہونے کا اختیار رکھیں گے، اور جب اشخاص متعینہ کورٹ میں سے، بہ عذر قوی لائق پذیرائی ایک شخص اپنی تعداد از زمرۂ مقرری سے، حاضر جلسہ کورٹ نہ ہو سکے تو رائے غلبہ آرائے اشخاص باقی حاضرین جلسہ کی بہ منزلہ رائے کل جلسہ کورٹ کے متصور ہوگی۔

9۔ جب کوئی شخص کورٹ میں سے بہ نسبت کسی امر کے رائے (تجویز) اپنی پیش کرنی چاہے تو اولاً اتفاق ایک رائے دوسرے شخص کورٹ کا بھی کر لے اس وقت رائے اپنی متفق علیہ دو شخص کورٹ کے پیش کرے۔

10۔ تجویز پیش کرنے سے قبل محرک ایک وضاحتی تقریر کرے گا اور جب تک اس کی تقریر ختم نہیں ہوگی دخل اندازی نہیں ہوگی۔ اگر کسی کو کوئی اختلاف ہے تو وہ بھی اپنی بات رکھ سکتا ہے۔ اگر کوئی ممبر کوئی ترمیم پیش کرنا چاہے تو اسے ضابطہ تحریر میں لا کر پیش کرے... رائے شماری سے اکثریت کے حق میں فیصلہ ہوگا اور ہر محکمہ کے معتمد (سکریٹری) کو بھیج دیا جاوے گا۔

11۔ جو لوگ مختلف شعبوں سے منتخب ہو کر آئے ہیں وہ چار افراد کی ایک کمیٹی بنا دیں گے اور سکریٹری کا متعلقہ محکمہ کے لئے تقرر کریں گے۔ کمیٹی کے سارے فیصلے اکثریت کی رائے کی بنیاد پر ہوں گے۔

12۔ مجلس کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اکثریت رائے سے آئین میں تبدیلی کر سکتی ہے۔

اس آئین کو Limited Monarchy یا محدود بادشاہت اور فوجی حکومت کی ملی جلی شکل لکھنا چاہئے۔ جو حالات درپیش تھے ان کے پیش نظر آئین ساز شخصی وفاداریوں کی بنیاد پر بادشاہ اور شاہزادوں کو زیادہ سے زیادہ منصب اور عہدہ دینے کے لئے مجبور تھے۔ فوج کی حصہ داری بھی لازمی تھی (دہلی میں فوج کے صرف دو جرنیل تھے جرنیل بخت خاں اور جنرل سدھاری سنگھ) اسی لئے قوانین کے اعلان کا لب ولہجہ فوجی زیادہ ہوتا تھا۔ مثلاً اٹھائیس جولائی اٹھارہ سو ستاون کو یہ فرمان جاری ہوا کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر اگر کوئی گائے یا بھینس کی قربانی کرے گا تو اسے سزائے موت دی جائے گی اور اسے توپ سے اڑا دیا جائے گا۔

مبارک شاہ خاں نے اس سلسلے میں ایک فہرست مانگی تھی کہ جن کے یہاں پالتو گائے ہیں ان کے نام فراہم کئے جائیں۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ براہ راست جمہوری تصورات کا اظہار اس عہد میں ممکن نہ تھا۔ دہلی کے ارباب حل وعقد نے بادشاہی جمہوریت یعنی انگلستانی طرز حکومت کو پسندیدہ اور محبوب سمجھا تھا۔ لیکن وہاں کی تفصیلات یہاں تک نہیں آسکی تھیں اس لئے بہت سے وہ پہلو نہیں اختیار کئے جا سکے جو پارلیمانی جمہوریت کا خاصہ ہیں۔ کابینہ کی تشکیل میں نامزدگی کا تصور زیادہ تھا۔ لیکن جمہوریت کا جو ایک منفی پہلو ہے، اس سے ان گوں نے دامن بچا لیا تھا۔ یعنی صرف بندوں کی 'گنتی' نہیں تھی بلکہ اہلیت اور تجربہ اور سن رسیدگی یا سینئرٹی کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔

لکھنؤ میں زیادہ دنوں تک حکومت رہی اور اس حکومت کی تشکیل سے پہلے فوج نے بیگم حضرت محل اور برجیس قدر کے سامنے کچھ شرائط رکھی تھیں جنھیں ان لوگوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ وہ شرائط درج کی جاتی ہیں۔ شرائط پیش کرنے والوں میں شہاب الدین خان، برکات احمد، امراؤ سنگھ، رگھوناتھ سنگھ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ وہ شرائط یہ ہیں:

شرط اول: دین کے احکامات کی پابندی کی جائے گی۔

شرط دوم: وزرا کا انتخاب فوج کرے گی۔

شرط سوم: رجمنٹ کے افسران فوج کی ایما کے خلاف مقرر نہیں کئے جائیں گے۔

شرط چہارم: جب سے باغیوں نے انگریزوں کی ملازمت چھوڑی ہے تب سے انھیں دوگنی تنخواہ دی جائے گی۔

شرط پنجم: جو لوگ انگریزوں کے بہی خواہ ہیں ان کے ساتھ جس طرح سے بھی پیش آیا جائے گا اس میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔

یہ ساری شرائط تسلیم کر لی گئیں تب فوج نے برجیس قدر کی قیادت تسلیم

کی اور بیگم حضرت محل ایک طرح سے 'راج ماتا' قرار پائیں۔ قاسم خاں شہر کے انچارج بنائے گئے تھے۔ شرف الدولہ کو سترہ پارچے کے خلعت کے ساتھ نائب السلطنت کا عہدہ ملا تھا۔ مہاراجہ بال کشن پندرہ پارچے کی خلعت کے ساتھ دیوان مقرر کئے گئے تھے۔ جے لال سنگھ نگران اعلیٰ تھے۔ قیدیوں کے بارے میں سارے فیصلے خود راجہ صاحب کرتے تھے، اور نواب شرف الدولہ کو مطلع کرتے تھے۔ مرزا علی رضا بیگ کوتوال شہر مقرر کئے گئے۔ حسام الدولہ بہادر جرنیل بنائے گئے۔ انھوں نے تیرہ نجیبوں کی پلٹنیں بنائی تھیں (نجیب: وہ رضا کار جو بھرتی کئے گئے تھے پہلے سے فوجی نہیں تھے)، ہر پلٹن کی نفری پانچ سو پچھتر تھی۔ فوج اگر کہیں بھیجی جاتی تو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل مجلس منتظمہ فیصلہ کرتی اور احکامات جاری کرتی۔ مجلس منتظمہ کے اراکین میں شیخ سکن، واجد علی خاں، جہاں گیر خاں، گھمنڈی سنگھ، راج من تیواری، امراؤ سنگھ، ممو خان، نواب شرف الدولہ، سنگم سنگھ، سرجو سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ راجہ جے لال سنگھ نگران اعلیٰ بھی تھے اور دور حاضر کی زبان میں کوآرڈینیٹر تھے یعنی بیگم حضرت محل اور فوج کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتے تھے۔

انتظامیہ میں صرف داخلی امور نہ تھے بلکہ سفارتی امور کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ ستمبر 1857 میں بہادر شاہ کو قاصد بھیجا گیا اور بہت سے قیمتی تحائف اس کے ہمراہ گئے تھے۔ راجا جنگ بہادر نیپال کو 11 مئی 1857 اور پھر 19 مئی اور پھر مولوی سرفراز علی کی طرف سے 19 جون کو خطوط گئے جن میں ان سے مدد مانگی گئی تھی۔ نانا صاحب لکھنؤ آئے تو ان کو بھی شاندار خلعت دیا گیا۔[6]

اس پہلو کی طرف متوجہ کرنا اس لئے ضروری تھا کہ عموماً یہ تصور قائم کیا گیا کہ کچھ جاگیردار تھے جنھوں نے اپنی پنشن کو بنیاد بنا کر علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ان کے پاس حکومت کا اگر کوئی تصور تھا تو وہ صرف شخصی تصور تھا۔ لیکن مندرجہ بالا واقعات اس غلط خیال کی نفی کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس وقت کے تمام ارباب حل وعقد عوام کی فلاح و بہبود کے ساتھ اقتدار میں ان کی حصہ داری بھی چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی ہو یا لکھنؤ دونوں جگہ فوج حاوی تھی اور اسی لئے نمایاں عہدوں پر فوج کے ہی لوگ رہے۔ لیکن دہلی میں اگر مولانا محمد باقر مولوی عبدالقادر حکیم احسن اللہ اور نواب جھجھر اور نجف گڑھ کے والیان ریاست شریک تھے تو لکھنؤ میں راجہ جے لال سنگھ، نرپت سنگھ، مولوی احمد اللہ شاہ اور رانا بینی مادھو جیسے لوگ تھے، جو فوج کے سرکردہ لوگوں سے نہیں تھے۔ اس طرح جو انتظامیہ وجود میں آیا تھا وہ جمہوریت تو نہیں تھی لیکن جگہ جگہ ''اکثریت کے فیصلے اسے جمہوریت سے قریب کر دیتے تھے۔ اسے Guided Democracy کہنا زیادہ درست ہوگا۔ انیسویں صدی کے وسط میں جاگیردارانہ نظام کی روایات کے تسلسل رکھنے والے ملک کے اس طرح کے انقلاب آفریں خیالات کو پختہ سیاسی شعور کی کرامت ہی سمجھنا چاہئے۔ دور حاضر کے مزاج کے لئے یہ نکات قابل عبرت ہیں کہ ایک طرف انتظامیہ میں ہندو مسلم اتحاد کے روشن نمونے اور اقتدار میں دونوں کی حصہ داری نظر آتی ہے تو دوسری طرف رشوت ستانی اور اقربا پروری کی سخت مخالفت ہے اور ایک فلاحی ریاست کے قیام کے لئے جدوجہد نظر آتی ہے۔

حواشی: 1۔ ملکی یعنی سول :2۔ اس جگہ دو لفظ پڑھے نہیں جاتے ہیں :3۔ حلف کے الفاظ یہ تھے۔ ''میں اپنے فرائض کو ایمانداری اور خلوص سے بجالاؤں گا اور کسی طرح کی اقربا پروری نہیں برتوں گا۔ دیانت و غور و فکر کے ساتھ کام انجام دوں گا اور بلاواسطہ یا بالواسطہ رشوت یا جانب داری سے کام نہیں کروں گا اور رعایا کی فلاح و آرام کے لئے حتی الامکان کوشاں رہوں گا اور جو مجلس کے فیصلے ہوں گے بغیر اجازت کے ظاہر نہیں کروں گا۔'' :4۔ مرزا ظہیر الدین کا ماڈرانچیف :5۔ بہادر شاہ بادشاہ :6۔ Struggle of Freedom movement in Uttar Pradesh Vol. II P.449-475

سلسلۂ بغاوت

بغاوت کی روٹی

عشرت علی صدیقی

■

ویلور کی بغاوت میں چپاتیوں کو پرچار کا ذریعہ بنایا گیا تھا اور اسی ترکیب اور تجربے کو 1857 کی بغاوت کی تیاری میں استعمال کیا گیا۔ معمولی آٹے کی چپاتیاں غیر معمولی پیغام رسانی کا کام کرتی تھیں۔ ان کے ذریعے بھیجا جانے والا پیغام صرف وہی لوگ سمجھ پاتے تھے جو ان کو لے جاتے تھے یا پاتے تھے۔ گاؤں کے جس چوکیدار اور بستی کے جس معتبر آدمی کو چپاتی ملتی وہ سمجھ جاتا کہ اسے پہلے سے طے کئے ہوئے پروگرام کو کب اور کس طرح عملی جامہ پہنانا ہے۔ انگریز حکمراں اور ان کے ہندوستانی کارندے جس طرح علما کی چلائی ہوئی ریشمی رومال تحریک کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام رہے اسی طرح وہ چپاتیوں میں چھپا ہوا معمہ حل نہیں کر سکے۔

■

آزادی کی جنگ کا آخری دور شروع ہونے کے قریب تھا جب جوش ملیح آبادی نے ایک نظم لکھی تھی، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' اس میں بدیسی حکمرانوں کو مخاطب کر کے ان کے ہاتھوں ہندوستان کی درگت کا ذکر تھا۔ (یہ نظم دوسری عالمی جنگ کے دوران انگریز حکومت کی طرف سے ہٹلر کے خلاف جنگ میں ساتھ دینے کے لئے ہندوستانیوں سے کی گئی اپیل کے جواب میں لکھی گئی تھی اور اس کی مقبولیت و معقولیت سے بوکھلا کر حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی بھی عائد کر دی تھی۔ ن ظ) جنگ آزادی کے 1857 والے معرکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا:

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے

اور لکھنؤ پر جو کچھ بیتی اسے یوں بیان کیا گیا:

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بار ہا
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

اختر تاجدار اودھ واجد علی شاہ کا تخلص تھا اور بہادر شاہ جو ظفر تخلص کرتے تھے ہندوستان کے بادشاہ تھے۔ 1857 کا انقلاب جب ناکام رہنے کی وجہ سے بغاوت بن گیا اور انگریزی حکومت نے اسے 'غدر' قرار دے دیا تو شاہ ظفر کو قید کر لیا گیا اور قیدی کی حیثیت سے ان کو رنگون بھیجنے سے پہلے ان کے سامنے ان کے شاہزادوں کے کٹے ہوئے سر خوان میں رکھ کر پیش کیے گئے تھے۔

انگریز ہندوستان میں سوداگر کی حیثیت سے دہلی کے بادشاہ کی اجازت سے آئے تھے۔ یہ اجازت ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملی تھی جو اپنی مہر میں خود کو شاہ عالم کا 'فدوی' کہتی تھی، اگرچہ بعد کو اس نے یک طرفہ کاروائی کر کے مہر بدل لی تھی اور شاہ دہلی کو جو نذر پیش کرتی تھی وہ بھی بند کر دی۔ مگر شاہ علم ان کے

جانشین اکبر شاہ یا بہادر شاہ ظفر بھی کبھی کسی مرحلے پر کمپنی کے اوپر اپنی حاکمیت یا اقتدار اعلا سے دستبردار نہیں ہوئے۔ بعض انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ اسی قانونی سقم کی وجہ سے لندن کی برطانوی عدالت کے بجائے دہلی کی فوجی عدالت میں چلا گیا اور انگریزی فوج کے افسروں نے من مانا فیصلہ کرلیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایسٹ (East) یعنی مشرقی ممالک میں تجارتی سرگرمی جاری کرنے کا پروانہ یعنی چارٹر، برطانی پارلیمنٹ نے دیا تھا لیکن اس کے ہندوستان آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد یہ ظاہر ہونے لگا کہ وہ تجارت کرنے کے بہانے حکومت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ بیوپاریوں کے ساتھ انگلینڈ سے فوجی بھی آئے تھے اور پادری بھی۔ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کے ٹکراؤ سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں اور ڈائرکٹروں کے درمیان بھی ٹکراؤ کے واقعات کا تذکرہ پرانے ریکارڈ میں ملتا ہے۔ مثلاً 1683 میں بمبئی کے جزیرے پر تعینات انگریزی فوج کے کمانڈر کپتان رچرڈ کیگ وین اور ان کے ماتحت فوجیوں نے کمپنی کی زیادتیوں کے خلاف بغاوت کردی اور جس علاقے کی حفاظت پر وہ تعینات تھے اس پر قابض ہوگئے اور سال بھر تک قابض رہے۔

کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ بلکہ ان سے زیادہ نمایاں طور پر اس کی سیاسی چیرہ دستیاں بڑھتی گئیں۔ اس کی فوج میں افسر تو سب انگلستان سے آئے ہوئے انگریز ہوتے تھے مگر سپاہیوں میں ہندوستانی بھی بھرتی کیے جانے لگے۔ ان کو روٹی روزی کی طرف سے اطمینان ہوا تو عزت آبرو اور اختیار واقتدار کا خیال آیا۔ انگریز سب اختیار واقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی طرف سے اور ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چھوٹی چھوٹی بغاوتیں بھی ہوئیں جن میں بعض کچھ 'موثی' ہوگئیں لیکن وہ سختی سے دبادی گئیں اور 1857 کی بغاوت کی طرح پھیلنے نہیں پائیں۔ ہندوستانی سپاہ کی پہلی بغاوت جو دھرنے یا ہڑتال کی شکل کی تھی، 1780 میں تیلی چیری میں ہوئی جب کنٹر بٹالین سے کہا گیا کہ اس کی جگہ تعیناتی کے لئے بمبئی سے پلٹن آرہی ہے۔ بعد میں یہ خبر افواہ نکلی تو کنٹر بٹالین نے جو مدراس سے لائی گئی تھی کام بند کردیا۔ اس کے ایک جوان کو حکم عدولی کے لئے دوسروں کو اکسانے کے الزام میں توپ دم کردیا گیا اور دو کو ہزار ہزار کوڑوں کی سزا دی گئی۔ چند ہی مہینے بعد وزاگاپٹم میں تعینات پلٹن نے مدراس جانے سے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مقامی ڈیوٹی کے لئے بھرتی ہوئی ہے۔ اس پلٹن کے لوگوں نے تین انگریز افسروں کو گولی ماردی۔ یہ بغاوت بھی آئینی اقدام سے دبادی گئی۔

جنوبی ہند کے مقام ویلور کی 1806 والی بغاوت پچاس برس بعد ہونے والی شمالی ہند کی 1857 والی بغاوت سے ملتی جلتی ہے۔ یہاں نئی رائفل کے ان نئے کارتوسوں کی وجہ سے بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی جن کی بابت یہ کہا گیا تھا کہ ان میں گائے اور سور کی چربی استعمال ہوئی ہے اور ان کو رائفل میں بھرنے سے پہلے دانت سے کاٹنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مدراس کی پیدل پلٹن سے کہا گیا کہ اس کا کوئی آدمی ذات برادری ظاہر کرنے والا نشان نہ لگائے، داڑھی مونچھ نہ رکھائے اور نئی پگڑی لگائے جس پر لگنے والے عہدے اور سرکاری اعزازات کے نشان چمڑے کے ہوں۔ عام لوگوں نے اس ضابطے کو مذہب بدلوانے کی کوشش سے تعبیر کیا۔

ویلور کی بغاوت سے لے کر 1857 میں میرٹھ کے معرکے تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں تقریباً ایک درجن بغاوتیں ہوئیں۔ باغیوں میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہی تھے مگر کچھ کمپنی کے انگریز ملازم بھی تھے۔ ہندوستانیوں کی بغاوت کے اسباب زیادہ تر معاشی ہوتے تھے اور انگریز باغیوں کو بھی عام طور پر یہ شکایت تھی کہ کمپنی کے ڈائرکٹر اور اعلا عہدے دار لوٹ کی تقسیم میں انہیں اتنا حصہ نہیں دیتے تھے جتنا ان کے خیال میں ان کا حق تھا۔ ہندوستانیوں کی شکایتوں میں کبھی کبھی مذہب کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ اس لئے کہ کمپنی کے ذمہ دار کبھی ان کے مذہبی عقائد کے خلاف ضابطے بناتے اور رائج کرنے کی کوشش کرتے اور کمپنی کی حمایت یافتہ مشینری جس میں زیادہ تر انگریز تھے ہندوستان میں رائج مذہبوں پر جارحانہ انداز کی نکتہ چینی کرتے اور ایسی نکتہ چینی بعض اوقات مذہبی تقریبات کے موقع پر میلوں اور ٹھیلوں میں کی جاتی اور نکتہ چینی کرنے والوں کے ساتھ پولیس یا فوج کے سپاہیوں کی موجودگی لوگوں میں یہ تاثر پیدا کردیتی کہ یہ نکتہ چینی حکمرانوں کی شہ پر ہورہی ہے۔ انگریز پادریوں کے انداز سے اس تاثر کو تقویت ملتی اور ہندوستان کے لوگ سمجھتے کہ انگریز ان کے سیاسی اور معاشی استحصال کے ساتھ مذہبی اور معاشرتی استحصال کے بھی درپے ہیں۔ حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں کاروبار شروع کرنے کی جو اجازت یہاں کے حکمرانوں نے دی تھی اور اس سلسلے میں جو چارٹر انگلستان کی پارلیمنٹ سے منظور ہوا تھا اس میں اس بات کی صراحت کردی گئی تھی کہ کمپنی یہاں کے عقیدوں اور ریت رواج کا لحاظ اور احترام کرے گی۔ کمپنی چارٹر میں مذہبی سرگرمی پر جو بندش شروع میں لگائی گئی تھی وہ برطانوی پارلیمنٹ نے وہاں کے مذہبی اداروں کے دباؤ میں آکر ہٹادی۔ اس ڈھیل سے جہاں ایک

طرف مذہب کا جارحانہ استعمال کرنے والوں کی ڈھٹائی بڑھ گئی وہاں دوسری طرف ہندوستان کی مذہبی رہنماؤں اور ان کے عقیدت مندوں کی ناراضی میں اضافہ ہوگیا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ ان کی دنیا ہی نہیں دین دھرم بھی خطرے میں ہے اور اس خطرے سے نکلنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کو دیس سے نکالنا ضروری ہے۔ ایک طرف انگریزوں کے قدم جمانے کے جتن کئے جارہے تھے اور دوسری طرف ان کے قدم اکھاڑنے کے طریقے سوچے جارہے تھے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں بہ ظاہر انگریزوں کے قدم جمتے جارہے تھے لیکن ان کے مظالم کے ساتھ ہی ہندوستانیوں کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوتا جارہا تھا اور آزادی کی جنگ کے ہیرو تیار ہورہے تھے۔ ان ہی میں ایک تھیں جھانسی کی رانی لکشمی بائی۔ وہ 18 برس کی تھیں جب 1842 میں ان کی شادی جھانسی کے مہاراجہ گنگا دھر راؤ باجی راؤ سے ہوگئی۔ نو برس بعد گنگا دھر راؤ کا انتقال ہوگیا۔ انتقال سے پہلے انہوں نے نانا صاحب کو گود بٹھا لیا تھا۔ اس لئے کہ ان کی کوئی سگی اولاد نہیں تھی۔ اسے پہلے 1818 میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جھانسی کا راج پاٹ ان سے لیا تھا تو ان کی پنشن آٹھ لاکھ روپے سالانہ طے ہوگئی تھی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد کمپنی نے پنشن دینے کے معاہدے کو یک طرفہ فیصلے سے منسوخ کردیا۔ مگر نانا صاحب پیشوا کی راج گدی پر اپنا حق جتاتے رہے اور اپنے مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے انہوں نے عظیم اللہ کو مختار بنا کر انگلستان بھیجا۔ مگر انگریزوں نے ان کی ایک نہ سنی اور نانا صاحب کی پنشن بحال کرنا تو در کنار برہم ورت کے راج میں ان کا حق ملکیت تسلیم کرنے سے بھی انکار کردیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے یہ کہہ کر کہ جھانسی چوں کہ کمپنی کے زیر انتظام علاقے کے بیچ میں واقع ہے اس لئے اس کا انتظام بھی ہماری مرضی کے مطابق ہونا چاہئے اور وہاں کی رعایا کو اس انتظام سے بہت فائدہ ہوگا۔ رانی لکشمی بائی کی جھانسی کو غصب کرلیا مگر 1853 میں اس پر قبضہ جمانے میں انہیں لوہے کے چنے چبانے پڑے۔

کمپنی کے غاصبانہ قبضے سے پہلے جھانسی ایک چھوٹی سی مرہٹی ریاست کی راجدھانی تھی جو پیشوا کی بڑی مرہٹہ ریاست کی باج گزار تھی۔ انگریزوں نے اسے اپنا محکوم بنانے سے پہلے پیشوا سے ناتا توڑ لینے کی ترغیب دی۔ اس تعلق کے ٹوٹ جانے سے دونوں ریاستیں کمزور ہوگئیں اور بیرونی طاقت کا کام آسان ہوگیا۔ اس نے دونوں کا کام تمام کردیا۔ یہی چال اودھ کے ساتھ بھی چلی گئی۔ پہلے یہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ تھا جس پر نواب وزیر دہلی کے بادشاہ کے صوبیدار کی حیثیت سے راج کرتے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے جو نواب وزیر تھے وہ بادشاہ بن گئے۔ کمپنی نے ان کی بادشاہت تسلیم کرکے ان کو اپنا محکوم بنانے کی سمت قدم بڑھایا اور اودھ کی محکومی نے پورے ہندوستان پر کمپنی کی حکمرانی کیلئے راہ ہموار کردی۔ بکسر کی لڑائی کو جو 1764 میں ہوئی، اس راہ کا سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ اس لڑائی میں شاہ عالم، شجاع الدولہ اور میر قاسم کے متحدہ محاذ نے، جس میں اندرونی انتشار اور باہمی خود غرضی کی وجہ سے بنیادی کمزوری پائی جاتی تھی، انگریزی فوج کے مقابلے میں شکست کھائی۔ شاہ عالم کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو دینا پڑی۔ شجاع الدولہ کو بھی دب کو صلح کرنی پڑی اور تب سے یہ دباؤ برابر بڑھتا رہا، یہاں تک کہ واجد علی شاہ کو اودھ سے کلکتہ لے جاکر مٹیا برج میں قید کردیا گیا۔

بکسر کی لڑائی کے بعد کمپنی نے اودھ کے حکمراں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے انگریزی فوج رکھیں اور اس کی تنخواہ اور بھتہ کے لئے 6 لاکھ روپے سالانہ دیا کریں۔ یہ ایک طرح سے اودھ کے خزانے میں نقب لگانے اور اسے لوٹنے کی ابتدا تھی۔ انگریزی فوج جو بہ ظاہر اودھ کی حفاظت کے لئے بلائی نہیں بلکہ زبردستی مسلط کی گئی تھی اس کی تعداد اور بڑھتی ہوئی فوج کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے لئے رقم کا مطالبہ بھی بڑھتا گیا۔ پھر کہا گیا کہ شاہی خزانہ چوں کہ یہ رقم ادا نہیں کرسکتا اس لئے مقررہ رقم کے بجائے مطلوبہ علاقہ کمپنی کے حوالے کردیا جائے۔ اس طرح روہیل کھنڈ اور دوآب کا علاقہ شاہ اودھ کی عملداری سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں چلا گیا، اور 1801 کے معاہدے میں کمپنی کے ذمہ داروں کی چالاکی اور شاہ اودھ کے صلاح کاروں کی نادانی یا غداری کی وجہ سے ایک شق یہ شامل کردی گئی کہ شاہی حکومت رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے گی اور رعایا کے جان و مال کی حفاظت کرے گی۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں کمپنی نے اسی شق کی آڑ لے کر اودھ کے بچے کھچے علاقے اور شاہ اودھ کے باقی ماندہ اختیار و اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

مرزا واجد علی بہادر 13 فروری 1847 کو واجد علی شاہ بنے۔ اپنی ولی عہدی کے زمانے میں انہوں نے کاروبار حکومت کا جو تجربہ اور مطالعہ کیا تھا اس میں انہوں نے دیکھا تھا کہ 1801 کے معاہدہ کو منسوخ کرکے کمپنی نے 1837 میں انہوں نے جو نیا معاہدہ کیا تھا اس نے سلطنت کو اور کمزور کردیا تھا۔ اس کی صحت بحال کرنے کی کوشش انہوں نے فوج کو چاق و چوبند بنانے سے شروع کی۔ ہر پلٹن کے ہر آدمی کے لئے ہر روز پریڈ پر حاضری ضروری

قرار دے دی گئی۔ پریڈ میں وہ خود بھی سپہ سالار کی وردی پہن کر آتے اور غیر حاضری پر دوسرے فوجیوں کی طرح وہ خود بھی دو سو روپیہ جرمانہ ادا کرتے۔ انھوں نے فوج کی از سر نو تنظیم بھی شروع کر دی اور اپنی دریادلی اور عدل گستری سے رعایا میں بھی مقبولیت حاصل کر لی۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر کمپنی کے کارندوں اور خوشامدیوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اتفاق سے انہیں دنوں شاہ بیمار پڑ گئے۔ شاہ کو فوج کی پریڈ میں روزانہ شرکت نہ کرنے اور کاروبار سلطنت میں براہ راست حصہ نہ لینے کا مشورہ دیا گیا اور ان کی توجہ تفریحات کی طرف مبذول کرانے کی کوشش بلکہ سازش کی گئی۔ اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ اودھ کے چپہ پر بھی اور نام کیلئے بھی شاہ کا اقتدار باقی نہ رہے۔ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کا ایک پیغام جو دراصل حکم نامہ تھا، لے کر ریزیڈنٹ جنرل اوٹرم واجد علی شاہ کے محل میں گئے جس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ انہوں نے 1801 کے معاہدہ کی پابندی نہیں کی ہے اس لئے اودھ کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی براہ راست اپنے ہاتھ میں لے رہی ہے۔

شاہ نے اور ان کی والدہ نے لاکھ کہا کہ سلطنت کی ضبطی کی بات کا 1801 کے معاہدہ میں کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ کہ شاہی خاندان کے کسی دوسرے فرد کو اودھ سلطنت سونپ دی جائے۔ لیکن جنرل اوٹرم اپنی بات پر اڑے رہے اور آخر میں انہوں نے یہ بات مان لی کہ اودھ کے تاجدار اپنا معروضہ برطانوی حکومت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں مگر ان کو اودھ کی سلطنت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ واجد علی شاہ اپنے خاندان کے چند افراد اور کچھ وفادار ملازمین کو لے کر لندن جانے کے ارادے سے کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں وہ پھر بیمار پڑ گئے اور ان کی والدہ البتہ لندن گئیں مگر وہاں ان کی کسی نے نہیں سنی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

واجد علی شاہ کی بچی کچھی سلطنت 7 رفروری 1856 کو ان سے چھین لی گئی۔ اس وقت دہلی میں مغلیہ سلطنت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ انگریز کم وبیش سو برس سے اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی عمر اس وقت 81 برس کی ہو رہی تھی۔ اودھ کی سلطنت کے انتزاع نے ان کو اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا اور ان کی رعایا کو بھی بے چین کر دیا، بے چینی کمپنی کی ہندوستانی فوج میں بھی پھیلی جس میں اودھ کے لوگ خاصی تعداد میں تھے۔ ایک طرف انگریز اپنی حکومت بڑھائے جانے کی کاروائی میں لگے ہوئے تھے دوسری طرف ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کے بیج بکھیرے جا رہے تھے۔ نانا صاحب نے اپنے نمائندے عظیم اللہ خاں کو اپنے معاملے کی پیروی کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ انہیں وہاں تو کامیابی نہیں ملی مگر انگلستان سے روس جا کر انہوں نے اس کی ہمدردی حاصل کر لی اور مصر سے بھی رابطہ قائم کیا۔ لارڈ رابرٹس نے ہندوستان میں بسر کئے ہوئے اپنے چالیس برسوں کا جو حال لکھا ہے اس میں انہوں نے ترکی کے سلطان اور دوسرے ذمہ دار افراد کے ساتھ عظیم اللہ کی خط و کتابت کا بھی تذکرہ کیا ہے جس سے آزادی کی تحریک کا دائرہ ملک کے باہر تک لے جانے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔ ملک کے اندر یہ تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر پھیل رہی تھی۔

واجد علی شاہ کے وزیر اعظم علی نقی خاں نے جو جلاوطنی میں ان کے ساتھ تھے، بنگال میں کمپنی کے ملازم سپاہیوں کو بغاوت پر اکسایا اور ان سے وقت ضرورت کام آنے کا وعدہ لے لیا۔ جاسوسوں کو فقیروں اور سنیاسیوں کے بھیس میں ہندوستانی افسروں کے پاس اور عوام میں بھیجا گیا۔ اس طرح بغاوت کے بیج شہروں اور قصبوں کے علاوہ دیہات کے چوپالوں اور کھیت کھلیانوں تک اور فوجی پلٹنوں میں ملازم پنڈتوں اور مولویوں کے ذریعہ سپاہیوں تک پہنچ گئے۔ لوک گیتوں، کٹھ پتلی کے تماشوں، نوٹنکیوں اور ناٹکوں کے وسیلے سے بھی بغاوت کا پرچار کیا گیا۔ مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں مولویوں اور پنڈتوں نے مذہبی تعلیم میں آزادی کے سبق جوڑ دیئے۔ بدیسی راج کے خلاف دیس کے باسیوں کو بغاوت کے لئے تیار کرنے کی اس مہم میں جہاد اور دھرم یدھ ہم معنی اور مسلمان اور ہندو ہم مشرب تھے۔

ویلور کی بغاوت میں چپاتیوں کو پرچار کا ذریعہ بنایا گیا تھا اور اسی ترکیب اور تجربے کو 1857 کی بغاوت کی تیاری میں استعمال کیا گیا۔ معمولی آٹے کی چپاتیاں غیر معمولی پیغام رسانی کا کام کرتی تھیں۔ ان کے ذریعے بھیجا جانے والا پیغام صرف وہی لوگ سمجھ پاتے تھے جو ان کو لے جاتے تھے یا پاتے تھے۔ گاؤں کے جس چوکیدار اور بستی کے جس معتبر آدمی کو چپاتی ملتی وہ سمجھ جاتا کہ اسے پہلے سے طے کئے ہوئے پروگرام کو کب اور کس طرح عملی جامہ پہنانا ہے۔ انگریز حکمراں اور ان کے ہندوستانی کارندے جس طرح علما کی چلائی ہوئی ریشمی رومال تحریک کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام رہے اسی طرح وہ چپاتیوں میں چھپا ہوا معمہ حل نہیں کر سکے۔ جس شخص کو چپاتی ملتی وہ اسے تبرک کی طرح ٹکڑے کر کے دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیتا اور پھر جس بستی میں چپاتیاں جاتیں وہاں اتنی ہی چپاتیاں تیار کر کے دوسری بستیوں میں بھیج دی جاتیں۔ کمپنی کے کچھ کارندوں نے پراسرار چپاتیوں کا اثر دیکھ کر ایسی کچھ چپاتیاں حاصل کر لیں، ان کو کوٹ کر سفوف بنایا، مگر وہ چپاتیوں کا معمہ حل نہیں کر سکے۔

OO

دہلی میں تدفین کا مطالبہ

کتنا ہے بدنصیب ظفر...

وِدّیا ساگر آنند

بلاشبہ برصغیر ہند میں انیسویں صدی کے نصف دوم یعنی 1857 کا انقلاب دنیا کی سب سے بڑی نوآبادیت مخالف مہم تھی۔ پورے دو برس تک ہندوستانی عوام انگریزوں کے آمرانہ اقتدار کو سرزمین ہند سے اُکھاڑ پھینکنے کے لئے پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ برسرپیکار رہے۔ اس انقلاب سے انگریز بہت زیادہ ڈر گئے تھے اور سراسیمگی کے عالم میں ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ ہندوستان کے لائق فائق سپوت ورہنما سبھاش چندر بوس نے اسے ہندوستان کی 'اولین جدوجہد آزادی' کا نام دیا تھا۔ کچھ وجوں کے باعث اس مشن میں ہندوستان کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ برطانوی فوج کے ایک جنرل نے بعد میں اعتراف کیا تھا کہ ''اگر اس موقع پر ہندوستانی متحد ہوکر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے تو ملک میں ایک انگریز بھی زندہ نہیں بچ پاتا۔'' یقیناً انگریز خوش قسمت تھے کہ ایسا نہیں ہوسکا۔ اگر 1857 میں انگریزوں کو شکست ہوگئی ہوتی تو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا سے برطانوی سامراج کا خاتمہ ہوچکا ہوتا۔ اس صورت میں برطانیہ 'بڑی طاقت' کے بجائے ایک معمولی سا ملک بن کر رہ گیا ہوتا، جیسا کہ اس کے سارے مخالف ممالک، خصوصاً فرانس، چاہتے بھی تھے۔

1857 کی لڑائی ہندو اور مسلمانوں میں نمو پذیر قومی ایکتا کا متحدہ مظاہرہ تھا جس کی قیادت ہندوستان کے قومی رہنما بہادر شاہ ظفر نے کی تھی۔ مختلف طبقوں، ذاتوں اور مختلف نقطۂ نظر اور مسالک کے افراد متحد ہوگئے اور کندھے سے کندھا ملا کر غیر ملکی غاصبوں سے دست وگریباں ہوئے۔ باغی فوجیوں نے اپنے ہتھیاروں کا استعمال کیا اور عام آدمی اپنی کلہاڑیوں، لاٹھیوں، تیر کمانوں یعنی جو بھی ہاتھ آیا اسے ہتھیار بنا کر جابروں پر پل پڑے۔

مغل دوسرے ممالک سے ضرور آئے تھے لیکن یہاں آکر وہ یہیں کے ہو رہے تھے۔ یہ لوگ حیرت انگیز طور پر مذہبی رواداری واقع ہوئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی والدہ ایک ہندو خاتون لال بائی تھیں۔ ظفر کی ولادت 1775 میں دلّی میں ہوئی اور اپنے والد اکبر شاہ کی وفات کے بعد ساٹھ سال کی

■

• نپولین کے باقیات سینٹ ہیلینا سے لائے گئے اور پورے قومی اعزاز کے ساتھ انھیں فرانس میں دفنایا گیا...

• آئرلینڈ والوں نے ملک پر قربان ہوجانے والے سرروجر کزمینٹ کو عزت دی... اور پھانسی کے پچاس سال بعد ان کی لاش کے باقیات آئرلینڈ لاکر یادگار قائم کی گئی...

• جلیاں والہ باغ کے قاتل مائیکل اوڈائر سے انتقام لینے والے اودھم سنگھ کو لندن میں دفنایا گیا تھا۔ 1974 میں ان کی لاش کے باقیات وہاں سے واپس لائے گئے...

• گزشتہ ساٹھ برس میں ہندوستان نے بہادر شاہ ظفر کے باقیات کو برما کے اس مقام سے ہندوستان منتقل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جہاں وہ 145 برسوں سے دفن ہیں اور جہاں کھڑے ہوکر سبھاش چندر بوس نے ''دہلی چلو'' کا تاریخی نعرہ بلند کیا تھا...

■

عمر میں وہ ایک شاندار جلوس کے ساتھ دلّی کے تخت پر نشین ہوئے۔ انکی عمر اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لیں یا ان کی قیادت کریں۔ اس لئے انھوں نے شروع شروع میں اپنے ہندوستانی بھائیوں، ہندو، مسلمان اور عیسائیوں کو، جو بغاوت پر کمربستہ تھے، سمجھانے کی کوشش کی کہ انھیں کوئی نوجوان قائد منتخب کرلینا چاہئے لیکن ہندوستانی عوام نے ان کی ایک نہ سنی اور دلیل پیش کردی کہ پورا ملک ان کی قیادت چاہتا ہے، ان سے عقیدت رکھتا ہے لہٰذا وہی برطانوی درندوں کو ہندوستانی سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے کی لڑائی میں ان کی قیادت کریں۔ ملکی عوام کی آواز پر بہادرشاہ ظفر نے بے خوفی کے ساتھ قیادت کی ذمے داری اپنے کمزور کندھوں پر لے لی۔

برطانوی افواج کے پاس اعلیٰ صلاحیت والے جدید ہتھیار تھے۔ اس نے اس بغاوت کو کچل دیا۔ اس بغاوت کے باعث ہندوستانیوں کو ایسی سزا بھگتنی پڑی جیسی تاریخ میں دوسری کسی قوم نے نہیں بھگتی۔

دلّی پر قابو ہونے کے بعد برطانوی افواج نے مقامی لوگوں پر قہر ڈھانا شروع کیا۔ پھانسیاں دینے، توپوں سے چھلنی کرنے، توپ سے باندھ کر اڑادینے اور اجتماعی قتل عام کا ایسا دور چلا کہ دلّی ویران ہوکر رہ گئی۔

آخری مغل تاجدار بہادرشاہ ظفر کو گرفتار کرکے انتہائی ذلت آمیز طریقے سے ایک بیل گاڑی کے ذریعے برما کے رنگون شہر تک لے جایا گیا، جہاں کی جیل میں انھیں انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں رکھا گیا۔ ہر طرح کی سہولت سے عاری اس جیل خانے میں پانچ برس تک زندہ رہنے کے بعد 1862ء میں بہادرشاہ ظفر نے جان جانِ آفریں کو سپرد کردی۔ بلاشبہ بہادرشاہ ظفر ہندوستانی جنگِ آزادی کا اوّلین اور اعلیٰ ترین نمائندہ تھا۔ نوے برس بعد 1947ء میں حصولِ آزادی کے ساتھ یہ جدوجہد انجام کو پہنچی۔

بہادرشاہ ظفر پر جس طرح مقدمہ چلایا گیا وہ نظامِ عدل کے ساتھ بھدا مذاق تھا۔ برطانوی اقتدار نے قانون کی دھجیاں اڑادی تھیں۔ اگر اس زمانے میں کوئی بین الاقوامی عدلیہ موجود ہوتا تو وہ یقیناً برطانوی اقتدار کو کٹہرے میں کھڑا کردیتا۔ لیکن اس طرح کے کسی بین الاقوامی ادارے کی عدم موجودگی کے باعث برطانوی حکومت کو من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ مل گئی۔ بہادرشاہ ظفر نے ایک خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کے بیٹے اور بھتیجے کو تحفظ عطا کیا جائے۔ اور ہڈسن نامی انگریز افسر نے ان کی اس خواہش کا احترام اس طرح کیا کہ بہادرشاہ ظفر کے بیٹے اور پوتے کے سر دھڑ سے الگ کردیے گئے اور انھیں ایک تھال میں سجا کر بہادرشاہ ظفر کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہندوستانیوں نے ہڈسن کی اس بربریت کا بدلہ اسے لکھنؤ بغاوت میں ہلاک کرکے چکایا۔

31 جولائی 1857ء کو کارل مارکس کا ایک مضمون نیویارک کے روزنامے "ٹریبیون" میں شائع ہوا جس میں کارل مارکس نے لکھا تھا "وقت گزرنے کے ساتھ ایسے حقائق ازخود اجاگر ہوں گے جو جان بُل کو بھی یہ سمجھانے کے لئے کافی ہوں گے کہ یہ ایک فوجی بغاوت نہیں قومی انقلاب تھا۔" اسی اخبار میں فریڈرچ اینجلس، جنھوں نے کارل مارکس کے ساتھ مل کر کمیونسٹ مینی فیسٹو تیار کیا تھا، نے لکھا "حقیقت یہ ہے کہ پورے یوروپ یا امریکہ میں ایسی کوئی فوج نہیں ہے جو بربریت اور آمریت میں برطانوی افواج کا مقابلہ کرسکے۔ لوٹ، تشدد، قتلِ عام اس فوج کا کردار ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی افواج میں جو اوصاف پائے جاتے ہیں وہ برطانوی فوج میں پوری طرح ندارد ہیں۔ برطانوی فوجی کسی حد تک بھی چلے جانا اور کچھ بھی کرڈالنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ پورے بارہ دنوں تک لکھنؤ میں جو قہر برپا ہوا اسے برطانوی فوج انجام نہیں دے رہی تھی بلکہ وہ شراب کے نشے میں دُھت آمریت کی انتہائی حد پار کئے ہوئے جنگلی اور خوں خوار لٹیرے اور قاتل تھے جو ڈاکوؤں کی طرح عام شہریوں کو لوٹ رہے تھے اور ان کی لاشیں بچھا رہے تھے۔ 1858ء میں برطانوی فوج نے جس بربریت، بے رحمی اور جنگلی پن کے ساتھ لکھنؤ پر قبضہ کیا اسے تاریخِ عالم میں انگریزی فوج پر سدا کے لئے ایک کلنک کے طور پر یاد کیا جائے گا۔"

2007ء کا سال ہندوستان میں مذکورہ تاریخی انقلاب کے 150ویں سال کے طور پر منایا جارہا ہے اور ملک ان سبھی کو یاد کررہا ہے جنھوں نے ملک کو آزادی دلانے کے لئے قربانیاں دیں۔ قومی سالمیت قائم کرنے کی اجتماعی جدوجہد میں اکثر قوموں کی اقدار اور وقار بکھر جایا کرتے ہیں لیکن اگر ہم ان شہیدوں کو احترام کے ساتھ یاد کریں جنھوں نے ملک کے لئے قربانیاں دیں۔ تو اسے بحال اور یکجا کیا جاسکتا ہے۔

1841ء میں فرانس جب ری پبلکن بنا تب فرانس کے عوام نپولین کے باقیات سینٹ ہیلینا سے لے کر آئے تھے اور پورے قومی اعزاز کے ساتھ انھیں فرانس میں دفنایا گیا تھا۔ بیس سال بعد نپولین کی شاندار یادگار قائم کی گئی۔ فرانسیسی قوم پرستی کے مضبوط نمائندے نپولین بوناپارٹ کو ڈوم ڈیز انویلائڈز (Dome Des Invalides) نامی اس یادگار میں قومی افتخار اور وقار کے ساتھ دفنا دیا گیا ہے۔

آئرلینڈ واسیوں نے بھی اسی طرح ملک پر قربان ہوجانے والے 'سر روجر کزمینٹ' کو عزت بخشی۔ سر روجر نے آئرلینڈ کی آزادی کی جدوجہد میں مسلح حمایت دی تھی۔

حالانکہ روجر کزمینٹ برطانوی ڈپلومیٹ تھے پھر بھی وہ نسل پرستی، سامراجی جبر اور ساؤتھ افریقہ میں کانگو واسیوں اور ہندوستانیوں کے استحصال کے خلاف تھے۔

1914ء میں جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تب انھوں نے آئرلینڈ کی آزادی کے جنگجوؤں کی مدد کے لئے جرمنی کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان پر سنگین مقدمہ چلایا گیا اور لندن کی پینٹن ویلے جیل میں 3/ اگست 1916ء کو اکیاون برس کی عمر میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔

کزمینٹ کی لاش کو پینٹن ویلے جیل کے احاطے کو نک لائم میں دفنایا گیا تھا۔ 1965ء میں، یعنی انھیں پھانسی دیے جانے کے ٹھیک پچاس سال بعد، کزمینٹ کی لاش کے باقیات آئرلینڈ لائے گئے جہاں پورے ملک نے انھیں پورے جذبے اور سرکاری فوجی اعزاز کے ساتھ ڈبلن کی ری پبلکن سرزمین کی گلاس نیون سیمیٹری پر پھر سے دفنایا۔ آئرلینڈ کے 85 سالہ صدر ایمن ڈی ویلرا اپنے ڈاکٹروں کے منع کرنے کے بعد بھی بیماری کی حالت میں اس فنکشن میں حصہ لینے پہنچے تھے۔ آئرلینڈ کے تیس ہزار سے زائد وطن پرست بھی اس موقع پر موجود تھے۔

جلیاں والہ باغ سانحے میں نہتے ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے مائیکل اوڈائر سے انتقام لینے والے اودھم سنگھ کو لندن پینٹن ویلے کے کوئک لائم یارڈ میں دفنایا گیا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ان کی لاش کے باقیات وہاں سے نکال کر بھارت لائے گئے۔

اودھم سنگھ نے مارچ 1940ء میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں قتل عام کرنے والے درندے مائیکل اوڈائر کو قتل کیا۔ 13/اپریل 1919ء کو انگریز فوج کے جرنیل اوڈائر نے فوج کو حکم دے کر نہتے مظاہرین پر گولیاں چلوائی تھیں جن سے 379 افراد موقع واردات پر ہی شہید ہو گئے تھے جن میں ایک چھ ہفتے کا بچہ بھی تھا۔ کچھ لوگوں کا اندازہ ہے کہ مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی اور اس سے دوگنی تعداد میں لوگ سنگین طور پر زخمی ہوئے تھے۔

اودھم سنگھ نے سورن مندر کے سامنے کھڑے ہو کر کھڑے قسم کھائی تھی کہ وہ اس درندگی کے ذمے دار ڈائر سے اس کا انتقام لے گا۔

اودھم سنگھ اپنے عہد کو ایک پل کے لئے بھی نہیں بھولا۔ وہ اپنے خرچ پر انگلینڈ پہنچا اور لگاتار جلیاں والہ باغ کے ہتھیار کو ڈھونڈتا رہا۔ مارچ 1940ء میں ایک دن اس نے لندن کے سیکسٹن ہال میں اسے ڈھونڈ نکالا اور اسے جان سے مار ڈالا۔

جولائی 1974 میں اودھم سنگھ کے جسم کے باقیات لندن سے ہندوستان لائے گئے۔ صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعظم اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوائی اڈے پر بھارت کے اس عظیم مجاہد آزادی کے باقیات کی پیشوائی کیلئے پہنچے۔

ان ساری مثالوں کے برعکس ہندوستان نے اپنے ایک عظیم محب وطن 1857ء کی بغاوت کے قائد اول بہادر شاہ ظفر کے معاملے میں سرد مہری دکھائی اور اس سرگرمی کا اظہار نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری آزاد ممالک ہے۔ گزشتہ ساٹھ برس میں ہندوستان نے بہادر شاہ ظفر کے باقیات کو برما کے اس مقام سے ہندوستان منتقل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جہاں وہ 145 برسوں سے دفن ہیں۔

ہر برس 15 اگست کو آزاد ہندوستان کا سربراہ اسی لال قلعے کی فصیل سے قوم کو خطاب کرتا ہے اور آزادی کی قسم دوہراتا ہے، جو بہادر شاہ ظفر کو پشتینی گھر ہے۔ بہادر شاہ ظفر یہیں پیدا ہوا، بڑا ہوا اور یہیں اپنا دربار لگاتا تھا۔ ہم غیر ممالک میں آباد ہندوستانی سبھی مذاہب، نسل اور طبقوں کے لاکھوں ہندوستانی محب وطنوں کی آواز میں آواز ملا کر ہندوستان کی موجودہ قیادت، حکومت اور دیس واسیوں سے مانگ کرتے ہیں کہ جس طرح فرانس اور آئرلینڈ کے محب وطن شہیدوں کے باقیات ان کے مالک واپس لائے گئے، ہندوستان کے شہید اعظم اودھم سنگھ کے باقیات بھارت لائے گئے، اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے باقیات بھی برما سے ان کے اپنے ملک میں لانے کی کوششیں کی جائیں۔

لاثانی محب وطن، ہندوستان کی تحریک آزادی کے اولین قائد اور 1857 کی بغاوت کے ہیرو بہادر شاہ ظفر کو برما سے دلّی لایا جائے اور ان کے باقیات کو دلّی میں اسی طرح اعزاز دیا جائے جیسے مادر وطن کے دوسرے شہید سپوتوں کو دیا گیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر ہمارا مہان نائیک تھا اور آج بھی ہے۔ یہی وہ شخص ہے، جس سے سبھاش چندر بوس نے ترغیب حاصل کی اور آزاد ہند فوج قائم کر کے برطانوی اقتدار کو بہادر شاہ ظفر کی طرح للکارا۔ بوس کا یقین تھا کہ آزادی بھیک میں نہیں ملتی، ملک کو آزاد کرانا ہے تو سارے ضروری قدم اٹھانے ہوں گے۔ تشدد بھی۔ بہادر شاہ ظفر کی سمادھی پر ہی نیتا جی نے یہ تاریخی نعرہ بلند کیا تھا۔ ''دلّی چلو''

نیتا جی سبھاش چندر بوس کے اس نعرے نے بھارت میں برطانوی سامراج کے بانیوں کی ریڑھ میں کپکپی پیدا کر دی تھی۔

صوفی، عالم، شاعر، بہادر شاہ ظفر اپنی وفات سے پہلے اپنے انجام کے بارے میں خود آگاہ کر چکے تھے۔ اس دانشور شہنشاہ نے کہا تھا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

میں پورے عزم کے ساتھ دوہراتا ہوں کہ بہادر شاہ ظفر کو ان کی پیاری دلّی میں اعزاز کے ساتھ واپس لایا جانا چاہئے اور یہاں کی مٹی میں پھر سے دفنایا جانا چاہئے۔

آزادی کے سبھی دیوانوں سے ہم اپیل کرتے ہیں کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں، وہ جہاں کہیں بیٹھے ہیں، ہماری آواز سنیں اور بہادر شاہ ظفر کے باقیات کو ان کے مادر وطن میں لایا جانے میں تعاون کریں، جس سے انھیں انصاف ملے، اور ہمارے ملک کے افتخار میں اضافہ ہو۔ OO

اٹھارہ سوستّاون

• 1857 •

اور

اردو ادب

بغاوت اور ادب

اردو ادب اور انقلاب 1857

سید احتشام حسین

1857 کا انقلاب ایک خاموش، کسی حد تک غیر منظم اور مبہم قومی احساس کا وہ نقطۂ آخر تھا جس کے بعد سے ہندوستانی ذہن نے ایک نیا سفر شروع کیا اور گو اس میں قدیم افکار و خیال اور چھوڑی ہوئی منزلوں کی گرد بھی شامل رہی لیکن آگے کی منزلوں میں قدم اٹھاتے وقت ایک نئے شعور کی رہبری ضرور کام آئی۔ اس لئے اسے 'غدر' کے بجائے انقلاب کہنا ہی موزوں ہوگا۔ یوں بھی ہے کہ اس 'بغاوت ہند' کو غیر ملکی حکومت نے 'غدر' کا نام دیا اور چونکہ اپنی فوری نتائج کے لحاظ سے یہ بغاوت ناکام رہی تھی اس لئے 'غدر' کے نام کی ترویج میں آسانی بھی ہوئی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ انقلاب ایک پیچیدہ سماجی، تاریخی، معاشی اور سیاسی عمل کا مظہر تھا جسے محض سیاسی کامیابی یا ناکامی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ جو واقعہ 10 مئی 1857 کو میرٹھ میں فوجیوں کی بغاوت کی شکل میں رونما ہوا وہ ایک صدی سے زیادہ کے دبے ہوئے خیالات اور گھٹے ہوئے جذبات کا نتیجہ تھا اور یہ سوچنا بالکل غلط ہوگا کہ کوئی قوم صدیوں کی غلامی میں بھی قومی احساس سے یکسر معرّا رہ سکتی ہے۔ یہ بھی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ اس دوران میں جو تخلیقی ادب وجود میں آیا ہو وہ قومی جذبات سے بالکل خالی ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان جذبات کا اظہار ایسی شکلیں اختیار کرلے جو بادی النظر میں قومی زندگی سے بے تعلق نظر آئیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اچھا تخلیقی فن کار اس کا احساس ہی نہ کرے۔ یہیں ادبی جائزے میں وہ مشکل مقام آتا ہے جسے سماجی حقیقت پسندی کے بغیر اچھی طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔ اب اگر 'غدر' کے ساتھ اردو ادب کا تذکرہ کیا جائے تو بہت سے لوگوں کو یہ بات ہی پسند نہیں آئے گی۔ ان کے خیال میں 'غدر' اور ادب میں کسی قسم کے تعلق کی جستجو فضول ہے۔ 'غدر' فوجیوں کی ناکام بغاوت تھی، ادب ادب ہے۔ اس مختصر مقالہ میں 1857 کی تحریک کے اس تصور کو ناقص اور گمراہ کن سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسے انقلاب کو دی گئی ہے جو محض چند مہینوں کی 'باغیانہ تگ و دو' تک محدود نہیں تھا بلکہ زمانہ کے ایک وسیع تر دائرہ پر حاوی تھا اور اس کی ہمہ گیری

■

'غدر' کے ساتھ اردو ادب کا تذکرہ کیا جائے تو بہت سے لوگوں کو یہ بات ہی پسند نہیں آئے گی۔ ان کے خیال میں 'غدر' اور ادب میں کسی قسم کے تعلق کی جستجو فضول ہے۔ 'غدر' فوجیوں کی ناکام بغاوت تھی، ادب ادب ہے۔ اس مختصر مقالہ میں 1857 کی تحریک کے اس تصور کو ناقص اور گمراہ کن سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسے انقلاب کو دی گئی ہے جو محض چند مہینوں کی 'باغیانہ تگ و دو' تک محدود نہیں تھا بلکہ زمانہ کے ایک وسیع تر دائرہ پر حاوی تھا اور اس کی ہمہ گیری نے محض سیاسی اور معاشی نظام کو نہیں بدلا بلکہ ادب کو بھی متاثر کیا۔

■

نے محض سیاسی اور معاشی نظام کو نہیں بدلا بلکہ ادب کو بھی متاثر کیا۔

اس تحریک کے پس منظر میں اردو ادب کا صحیح اور معقول مطالعہ تو یوں ہو سکے گا کہ سب سے پہلے ماقبل 1857 کے شعر و ادب سے بحث کر کے وہ عام باتیں متعین کر لی جائیں جو اس عہد کے تخلیقی ادب میں نمایاں ہیں۔ اس سلسلہ میں محض زبان، فن اور خیالات کی بحث نہ ہو بلکہ یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ اس وقت ادب کا تہذیبی زندگی سے کیا تعلق تھا۔ شاعر اور ادیب کس کے لئے لکھتے تھے اور لوگوں کا ذوق کن عناصر سے ترتیب پاتا تھا۔ کس قسم کے فلسفیانہ، اخلاقی، مذہبی اور سماجی تصورات کی کارفرمائی تھی اور شعرا کس حد تک ان کی موافقت یا تنقید کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ شعر و ادب کو قومی تہذیب سے الگ رکھ کر ان کا مطالعہ کرنے والا نہ تو ان باتوں کے جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ اس کے امکان میں ہے کہ ادب کے اس وسیع تر دائرہ میں داخل ہو۔ خیر یہ تو ایک اصولی بات کا ذکر تھا۔ مقصد یہ ہے کہ 1857 سے پہلے کے ادب کا مطالعہ بھی جنگِ آزادی کے دوران میں پیدا ہونے والے اور بعد میں تخلیق ہونے والے ادب مطالعہ کے لئے مفید ہوگا۔ کیونکہ اس سے روایتوں کے تسلسل اور شکست دونوں کا علم ہو سکے گا۔ اس کے بعد ان ادبی کاوشوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی جو براہِ راست 1857 کی تحریک سے متعلق ہیں۔ ایسی چیزوں کے مطالعہ میں چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔ جو شخص بھی اس رست خیز کا اندازہ لگا سکتا ہے، وہ یہ بھی تسلیم کرے گا کہ خوف و دہشت کے اس طوفان میں باقاعدہ ادبی کام کرنا آسان نہیں تھا۔ لوگ نتائج سے بے خبر تھے اس لئے کھل کر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تاریخ کی رفتار اور واقعات کی اصل نوعیت سے ناواقفیت وہ اندھا کنواں تھی جس میں اچھے سے اچھا قومی شعور رکھنے والے گر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات نہ صرف اس عہد کے ادب دیکھی جا سکتی ہے بلکہ تاریخوں اور دوسری کتابوں میں بھی۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ نہ جانے کتنے ادب پارے مختلف وجوہ سے اشاعت پذیر نہ ہو سکے ہوں گے اور جو شائع بھی ہوئے ان میں سے کتنے آج دستیاب نہیں ہو رہے ہیں۔

یہ تو اس ادب کا ذکر ہے جسے براہِ راست 1857 کی تحریک کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے یا جس میں 1857 کے واقعات کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بہت بڑا ادبی سرمایہ وہ ہے جو بلاواسطہ اس واقعہ سے متاثر ہوا اور جس میں تغیر کی وہی روح جاری و ساری ہے جس کا نتیجہ خود 1857 کی تحریک تھی۔ اس حقیقت کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ تغیرات کی جس رو نے سیاسی اور تاریخی محاذ پر اس تحریک کی صورت اختیار کی تھی، اس نے ادبی اور علمی سطح پر اس تخلیقی اور تنقیدی جدوجہد کی شکل اختیار کی جو سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد اور ذکاءاللہ وغیرہ کی تحریروں میں جلوہ گر ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک جانب ادب میں تغیر ان حالات کا نتیجہ ہے جو 1857 کی تحریک کا سبب بنے اور دوسری طرف سبب اور نتیجہ کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس لئے ادب تحریک 1857 کی اصل روح کو سمجھنے میں معاون ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم ادراک حقیقت کے علمی اور تاریخی ذرائع رکھتے ہوں اور ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی تاریخی اور تہذیبی نوعیت سے واقف ہوں۔

اس بحث کو نتیجہ خیز بنانے کے سلسلہ میں پہلی شرط یہ ہے کہ تحریک 1857 کے متعلق کوئی متوازن، تاریخی اور عقلی نقطۂ نظر قائم کر لیا جائے کیونکہ مختلف تقاضوں نے اس واقعہ کو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے۔

کیا 1857 کی تحریک محض ایک فوجی بغاوت یا سپاہیوں کی سرکشی کا نتیجہ تھی؟ کیا اس میں ایک غیر ملکی طاقت کے خلاف قومی جذبات اور سیاسی شعور کارفرما تھا؟ کیا یہ ان بادشاہوں اور جاگیرداروں کی بغاوت تھی جو اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینا چاہتے تھے؟ کیا اسے ملک کے مختلف طبقات کی حمایت حاصل تھی اور کیا سبھوں کے سامنے کوئی ایک واضح مقصد تھا جس کے لئے جدوجہد کر رہے تھے؟ کیا اس میں کسی حیثیت سے مذہبی جذبات اور خیالات کی کارفرمائی تھی؟ کیا اسے انقلاب کہہ سکتے ہیں؟ اب اگر ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لئے عصری مواد کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس مواد کا جزوِ غالب انگریزوں کے اقتدار اور غلبہ کے سایہ میں پروان چڑھا اور گو ان کے اندر بھی مدارج کا فرق ہے لیکن عموماً یہی نظر آتا ہے کہ وہ اسے کسی سیاسی اور قومی شعور کا نتیجہ نہیں بلکہ فوجی بغاوت اور بدامنی قرار دیتے ہیں اور اس کے فرو کرنے میں اپنی زیادتیوں کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ جن ہندوستانی مصنفین نے اس وقت اس واقعہ پر قلم اٹھایا ان کے یہاں بھی کم و بیش ایسے ہی خیالات ملتے ہیں لیکن تاریخ کا طالب علم اگر گہری نظر سے ان تحریروں کا مطالعہ کرے (چاہے وہ انگریزوں کی ہوں یا ہندوستانیوں کی) اسے بڑی آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ اسے محض ایک وقتی ہنگامہ یا صرف سپاہیوں کی بغاوت نہیں کہہ سکتے۔ اس کے اکثر رہنما جاگیردارانہ نظام یا مذہبی گروہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہ جاگیرداروں اور مذہب پرستوں کی بغاوت بھی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے کوئی منظم اور واضح تاریخی شعور نہیں تھا لیکن اسی شعور اور جذبہ نے بھیس بدلا تھا اور تاریخ اپنے مہروں سے ہندوستان کی بساط پر کام لے رہی تھی۔ اس لئے 1857 کی تحریک کے پیچیدہ واقعہ کو، جس کا تعلق ماضی اور مستقبل دونوں سے تھا، جو چند خاص قسم کے معاشی اور تاریخی اسباب کا نتیجہ تھا اور جس نے مستقبل کو متاثر کیا، آسانی سے کسی خانہ میں رکھ کر فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس واقعہ سے ان اثرات کے سوا اور کوئی اثر برآمد ہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ایسے اہم تاریخی واقعات کی نوعیت ان کے مجموعی اثر اور ردِ عمل سے متعین ہوتی ہے اور شعور کے وسیع دائرے میں ان خیالات کے لئے بھی

جگہ نکل آتی ہے جنھیں غالب نے پیش کیا اور ان کے لئے بھی جن کا اظہار سرسید، آزاد، حالی وغیرہ نے کیا۔ اس پر زور دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ادب کی سماجی حیثیت کے ماننے والے اور اس کے مخالف دونوں ادب کے مطالعہ میں میکانکی اندازِ نظر کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک سارے مادّی اور تاریخی تغیرات کا پتہ شعر و ادب میں لگانا چاہتا ہے اور کھینچ تان کر ادب کو معاشی اور اقتصادی عمل کا بہی کھاتہ بنا دیتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ دیکھو فلاں واقعہ ہو گیا اور ادب میں اس کا ذکر نہیں آیا، اس لئے ادب کا کوئی تعلق روزمرہ کے دنیوی حادثات اور واقعات سے نہیں ہو سکتا۔ بعض لکھنے والے یہی عمل 1857 کی تحریک کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ انسان اور اس کے ذہن کی پیچیدگی، اس کے تجربات اور مفادات واقعات کا احساس کن مختلف شکلوں میں کرتے ہیں۔ محض انفرادی نہیں، قومی شعور کے لحاظ سے بھی یہ احساس مختلف ہو سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے وابستگانِ دولت کے لئے اس انقلاب کی نوعیت اس سے یقیناً مختلف رہی ہوگی جو ان لوگوں کے لئے تھی جنھیں کمپنی بہادر نے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ قدیم نظام زندگی کے ماننے والوں کے لئے اس کی حیثیت کسی طرح وہ نہیں ہو سکتی تھی جو تبدیلی کا نیا شعور رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر لوگوں کے ذہن میں یہ ساری باتیں مل جل گئی تھیں۔ ماضی کا غم حال کی پریشانی، مستقبل کا خوف، تاریخ کی رفتار سے ناواقفیت، ایسے نئے حالات کی پیدائش، ایسے نئے عناصر کی موجودگی جن سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، قدیم رشتوں کی شکست اور نئے روابط کا واضح شکل میں موجود نہ ہونا۔ حکومت کی ایک بساط الٹ کر دوسری بساط کا بچھ جانا، تجارت، صنعت و حرفت کے نئے طریقوں کا رواج، پریس اور اخبارات، نئی تعلیم اور نئے وسائل آمد و رفت اور ان ہی کے ساتھ مذہب کے مٹنے کا خوف۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں کہ انھوں نے بہ یک وقت پیدا ہو کر شاعروں اور ادیبوں کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بنے بنائے راستوں پر چلنا ممکن نہ تھا اور نئے راستے اچھی طرح بنے نہ تھے۔ پرانے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا، نئے خیالات نے ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھی۔ اگر کوئی شخص ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھے تو 1857 کے زمانہ کے ادبی کارناموں کو سمجھ سکتا ہے ورنہ اسے یقیناً ہر قدم پر متضاد باتوں سے سابقہ پڑے گا اور وہ جھنجھلا جائے گا کیونکہ کوئی تصویر مکمل طور سے اس کے بنائے چوکھٹے پر نہیں لگ سکے گی۔

ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد 1857 کا انقلاب اردو ادب کے ارتقا کے لئے بھی ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اچانک ایسے شعرا پیدا ہو گئے جو سودا، میر اور غالب سے عظیم تر تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ نئے شاعروں کے سامنے زندگی کا دوسرا مطمحِ نظر تھا۔ ان کا لب و لہجہ بدلا ہوا تھا اور ماضی سے منسلک ہوتے ہوئے بھی وہ نئے دور کے ترجمان تھے۔ ایک معمولی سی مثال سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔ فارسی اور اردو شاعری میں شہر آشوب کی روایت اچھی خاصی پرانی تھی (خود شہر آشوب کا تصور امتدادِ زمانہ سے بدلا تھا لیکن میرے پیش نظر وہ شہر آشوب ہیں جن میں قومی زوال کا تذکرہ کیا گیا ہو) چنانچہ سودا، میر اور نظیر کے شہر آشوب لازوال ادبی حسن اور سماجی شعور کے مظہر ہیں جن میں قومی، تہذیبی اور اخلاقی زوال کا شدید احساس موجود ہے۔ لیکن وہ شہر آشوب جو 1857 کی تحریک کے زمانے میں یا اس کے دو چار سال کے اندر لکھے گئے ان کا انداز جداگانہ ہے۔ سودا، میر اور نظیر اکبر آبادی کے مقابلے میں یہ شہر آشوب سطحیت لئے ہوئے ہیں۔

حالانکہ ان کے لکھنے والے وہ تھے جنھوں نے آگ اور خون کا وہ کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس نے انھیں شعر لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ان شہر آشوبوں کے خالق کمتر درجہ کی تخلیقی اور شاعرانہ صلاحیت رکھتے تھے لیکن ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے اس تحریک کے مفہوم اور اس کی نوعیت کو نہیں سمجھا تھا۔ وقتی طور پر جو ذاتی تکلیفیں پہنچیں اور دہلی پر جو تباہی آئی اسی کی روشنی میں انھوں نے جذباتی انداز اختیار کیا۔ پھر ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر شعرا 1857 کا تکلیف دہ زمانہ جھیل لینے کے بعد کسی قدر اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے تھے اور دہلی کی تباہی کا غم ان کے لئے قومی احساس نہیں بن سکا تھا۔ تاریخ اور سیاست سے ناواقفیت کی بنا پر وہ اس انقلاب کو فلکِ کج رفتار کی کینہ پروری، انقلاب زمانہ، نظر بد اور اعمال کی سزا سے تعبیر کرتے تھے۔

اب اگر کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ 1857 کی تحریک نے اردو ادب کو متاثر ہی نہیں کیا کیونکہ یہ ساری باتیں تو پہلے بھی کہی جاتی تھیں تو یہ بات درست نہیں ہوگی کیونکہ اور بہت سے دوسرے شاعروں اور ادیبوں نے اس تبدیلی کے مقصد کو سمجھا، انھوں نے بغاوت کی دعوت نہیں دی لیکن حالات کے سمجھنے اور ہوا کا رخ پہچاننے پر زور دیا۔ میرا خیال ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کا احساس ہی وقت کا سب سے بڑا عطیہ ہے جس سے 1857 کے بعد کا اردو ادب بھرا پڑا ہے۔ جب 1857 کا انقلاب ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کی زندگی میں داخل ہوا تو انھوں نے اپنے انفرادی اور سماجی شعور کے مطابق اس سے کس طرح اثر لیا۔ 1857 کی تحریک نے یہی سب سے بڑا کام کیا کہ شاعروں اور ادیبوں کو شعوری طور پر ادب اور زندگی کے تعلق کی طرف متوجہ کیا۔ جنھوں نے ادب کو قومی تعمیر اور ذہنی تشکیل کے لئے ایک اہم آلۂ کار بنانے کی کوشش کی۔ جب ایک بار اس تعلق کا شعوری علم بھی ہو گیا تو ادب کامیابی یا ناکامی کے ساتھ زندگی کی ترجمانی میں لگ گیا اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔ OO

(نیا دور، ستمبر 1957)

تاریخی، تہذیبی پس منظر

1857: ایک ادبی تجزیہ

فیاض رفعت

■

اٹھارہویں صدی کے اختتام سے فارسی کا اثر رسوخ کم ہونے لگا اور اردو ایک انحطاط پذیر اور مائل بہ زوال معاشرے کی گود میں ترقی پانے لگی۔ اس دور میں 'مفلسوں کے شام سے بجھے ہوئے چراغوں' کا ذکر رمز کی صورت غزلوں تک میں آنے لگتا ہے۔ میر کے علاوہ قائم اور مصحفی، جرأت اور کمال نے بھی انگریزی حکومت کی تنقید میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مصحفی نے تو صاف صاف کہا:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ شعر غالباً اٹھارہویں صدی کے ثلث آخر میں کہا گیا ہوگا اور اس وقت بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ انگریز ہندوستان کو اقتصادی طور پر تباہ کر رہے ہیں۔

■

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

رام نرائن موزوں کا یہ شعر سراج الدولہ کی شکست اور اس کی دردناک موت کا محض نوحہ نہیں، انسانی معاشرے کی بے حسی اور زوال پذیری کا اعلامیہ بھی ہے۔ 1757 میں پلاسی کا معرکہ ہوا تھا۔ درباری ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے نتیجے کے طور پر والی بنگالہ کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا اور بنگال انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ اس کے چند سال بعد آرا کے مقام پر مشرقی صوبوں کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی لیکن شمالی ہندوستان میں زیادہ اقتدار مرہٹوں کا تھا۔ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد مرہٹے اس قابل نہ رہے تھے کہ انگریزوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں، لیکن اس قابل ضرور تھے کہ دہلی کے شاہِ شطرنج کو اپنے قابو میں رکھیں۔ شروع شروع میں ان کا اقتدار بہت موثر نہ تھا لیکن جب روہیلوں کی بغاوت ہوئی اور غلام قادر روہیلے نے بادشاہ کو تخت سے اتار دیا اور اس کے بعد مرہٹوں نے غلام قادر روہیلے کو شکست دی اور اسے قتل کر کے 1788 میں شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھا دیا تو وہ 1806 تک بادشاہ رہا، لیکن اس کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔

1805 میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد 1806 سے 1837 تک اکبر شاہ ثانی اور 1837 سے 1857 تک بہادر شاہ ظفر تخت دہلی پر متمکن رہے، لیکن ان کی حیثیت بھی شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ دراصل دہلی کی مغل حکومت 1788 ہی میں ختم ہو چکی تھی، جب شاہ عالم کو غلام قادر روہیلے نے اندھا کر دیا تھا اور وہ مرہٹوں کی مہربانی سے دوبارہ تخت نشین ہوا تھا۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں *

اس دوران مشرق کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا دائرہ وسیع ہورہا تھا۔ پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زماں، رنجیت سنگھ کو لاہور کی گدی دے گیا تھا جس نے جلد ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ 1820 کے آس پاس اس نے کشمیر اور پشاور فتح کرلئے، چنانچہ ان علاقوں میں سن 1849 تک سکھوں کی حکومت رہی۔ شمالی ہندوستان میں شاہان اودھ مقابلتاً زیادہ دیر تک محفوظ رہے اور 1856 میں جب تک یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نہ آگیا، شجاع الدولہ کی اولاد یہاں حکمراں رہی۔ سندھ کے امیروں کے اقتدار کا خاتمہ 1843 میں ہوا۔ جنوب میں سلطان حیدر علی شیر میسور نے ایک نئی حکومت قائم کی تھی، لیکن 1799 میں ایسٹ انڈیا کمپنی، مرہٹوں اور نظام کی مشترکہ افواج نے سلطان حیدر علی کو شکست دی اور اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ان ہنگاموں میں صرف نظام دکن کا تاج وتخت سلامت رہا۔ اور یہ محض اس لئے ممکن ہوسکا کہ وہ انگریزوں کے حاشیہ بردار تھے۔ وقتِ ستم دیدہ نے شاید انھیں اس کے لئے مجبور کردیا تھا۔

اس پُرآشوب دور میں قومی وحدت کے تصور کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ متصوفانہ شاعری میں مسجد ومندر کے بنیادی اتحاد پر زور دیا گیا، واعظ کی ہنسی اڑائی گئی، زاہد پر پھبتیاں کسی گئیں اور میر تو اپنے خیال میں اسلام ترک کرکے قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھ گئے۔ غالب نے ترک رسوم پر زور دیا اور کہا کہ جب ملتیں مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بنتی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اردو زبان کو یکساں طور پر اپنایا اور بقول علی جواد زیدی یہ متحدہ قومیت کا ایک محکم ستون بن گئی۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام سے فارسی کا اثر ورسوخ کم ہونے لگا اور اردو ایک انحطاط پذیر اور مائل بہ زوال معاشرے کی گود میں ترقی پانے لگی۔ اس دور میں 'مفلسوں کے شام سے بجھے ہوئے چراغوں' کا ذکر تو رمز کی صورت غزلوں تک میں آنے لگتا ہے۔ میر کے علاوہ قائم اور مصحفی، جرأت اور کمال نے بھی انگریزی حکومت کی تنقید میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مصحفی نے تو صاف صاف کہا:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ شعر غالباً اٹھارویں صدی کے ثلث آخر میں کہا گیا ہوگا اور اس وقت بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ انگریز ہندوستان کو اقتصادی طور پر تباہ کررہے ہیں۔ اسی طور بافہم طبقہ جرأت کے مانند یہ بری طرح محسوس کرنے لگا کہ پورب کے امیر ''انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر۔'' شاہ عالم کے بے دست وپائی نے اکثر شعراء کو متاثر کیا۔ ان میں کمال نے سب سے زیادہ کھل کر احتجاج کیا۔

اسی سے سمجھو رہا سلطنت میں کیا رتبہ
ہو جبکہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر، اب فرنگی ہیں مختار

فریڈرک جان شور نے اپنی کتاب 'نوٹس آن انڈین افیئرز' Notes On Indian Afairs مرقومہ 1937 میں تحریر کیا ہے:

''اگرچہ ہر طرف ایک سکون اور خاموشی کا عالم نظر آتا ہے لیکن فی الحقیقت سارا ماحول ایک بارودخانہ کی مانند ہوگیا ہے، جس کو ایک معمولی سی چنگاری بھی کسی وقت مشتعل کرسکتی ہے۔''

بالخصوص واجد علی شاہ کی معزولی سے اودھ کے سارے علاقوں میں ناراضی کی لہر دوڑ گئی۔ کارل مارکس نے نیویارک کے Daily Tribune میں 28 جون 1953 کو لکھا تھا:

''... برطانیہ نے تو ہندوستان کے سماجی نظام کو درہم برہم کرکے رکھ دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ابھی تک کسی نئے نظام کی داغ بیل پڑنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہندوستان اپنی پرانی دنیا تو کھو چکا ہے لیکن اسے نئی دنیا نہیں مل پائی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ برطانیہ کی غلامی میں آکر موجودہ ہندوستان اپنی گزشتہ روایات اور قدیم تاریخ سے ناطہ ہی توڑ چکا ہے۔''

برطانوی حکومت کے استحصال کے تاریک دور سے ماقبل ہندوستان کی تباہی میں خانہ جنگیوں، بیرونی حملوں اور آفات سماوی کا بھی کافی ہاتھ رہا تھا۔ انگریزی اجارہ داری نے معاشیات پر بھی کلی قبضہ کرلیا تھا۔

مثلاً تیل، پارچہ جات اور دیگر اشیا برآمد کی تجارت پوری طرح ان کے قبضہ قدرت میں تھی۔ ہندوستانی تاجروں کو چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت کی اجازت ضرور تھی مگر تاجروں کے نفع پر ڈاک محصول، چنگی، مدارس کے لئے چندے وغیرہ کے ٹیکس عائد کیے جاتے تھے۔

ادھر ''ولی اللّٰہی'' جماعت کے لوگ مدتوں سے عوام کو آمادۂ جہاد کررہے تھے۔ جہاد کی تحریک بظاہر مذہبی لیکن درحقیقت سیاسی تھی اور اس تیزی کے ساتھ سند مقبولیت حاصل کررہی تھی کہ مومن جیسے حسن وعشق کے شاعر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا بین ثبوت ان کی مثنوی 'جہاد' ہے جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔

سلطنت اودھ کے انتزاع کے بعد ہی ہندوستان کے طول وعرض میں ہر جگہ اور ہر طبقہ میں انگریزوں کے خلاف پھیلتی ہوئی بغاوت کی آگ یکا یک بھڑک اٹھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ فوج سے شروع ہوئی۔ 9 مئی 1857 کو ہندوستانی سپاہیوں نے میرٹھ میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ یہ جنگِ آزادی کی ابتدا تھی۔ مجاہدوں کی زبان پر ''دلّی چلو'' کے نعرے تھے۔ دلی پہنچ کر مجاہد سیدھے قلعہ کا رخ کرتے ہیں اور بہادر شاہ ظفر کو اس کا کھویا ہوا اقتدار واپس کرتے ہیں۔

یہ جنگ غیر منظم سہی لیکن تھی عوامی جنگ، جو حصولِ آزادی کے لئے لڑی گئی۔ وسیع مفہوم میں یہ قومی تحریک ہی تھی جس نے ہندوستانی عوام کو نئی گرمی، نیا ولولہ اور نئی روشنی عطا کی۔ عوام کے دلوں میں ایک نیا وطنی اور قومی احساس پیدا کیا۔ اس وطنی احساس نے علامت کے طور پر اودھ میں واجد علی شاہ کا اور دلی میں بہادر شاہ ظفر کا بھیس بدل لیا تھا:

''مئی 1857 میں انگریزوں کے مقابلے میں جو پہلی کامیابی حاصل ہوئی اس سے نہ صرف میرٹھ میں بلکہ سارے نواحِ دلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس مہینے کے دلی اخبار میں فتح افواج مشرق کی تاریخ نظم کی۔ اس کا پس منظر مولوی احمد اللہ شاہ کی انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری اور پھانسی کی سزا کا اعلان بھی تھا۔ ان کو تختہ دار سے بچانے کے لئے فیض آباد کے گردونواح میں جو زبردست عوامی تحریک چلی اس کے قائد صوبیدار دلیپ سنگھ تھے۔ انھوں نے فیض آباد کے تمام انگریز افسروں کو قید کر کے فیض آباد کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ پھر ہندوستانی سپاہیوں اور حریت کے شیدائی عوام نے جیل کی دیواروں کو توڑ کر مولوی احمد اللہ شاہ کو رہا کرا لیا۔ لیکن صوبیدار دلیپ سنگھ نے فیض آباد کی حکومت اپنے پاس نہیں رکھی بلکہ مولوی احمد اللہ شاہ کے سپرد کر دی اور مولوی احمد اللہ شاہ نے فوراً اعلان کر دیا کہ بادشاہ اصلی واجد علی شاہ ہیں۔ وہی علامتی بادشاہ!'' (اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ مرتبہ علی جواد زیدی)

ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی فوج نے اپنی دانش اور عیاری سے جلد ہی ہندوستانی بغاوت پر قابو پا لیا۔ سرفروش باغیوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ دلی کے گلی کوچوں میں ظلم وبربریت کی آندھی چلی۔ جنگِ آزادی کے سورماؤں کو سرعام پھانسیاں دی گئیں۔ شہیدانِ وطن کی فہرست میں اردو شاعروں اور ادیبوں کے نام بھی شامل تھے۔ مصطفیٰ خاں اور صہبائی کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ منیر شکوہ آبادی کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر قید کر لیے گئے۔ دلی اور لکھنو کے زوال اور انتزاع سلطنت کے بعد پورے ملک میں ماتم کی فضا طاری تھی جس کا اندازہ اس دور کے شعری اظہار سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ واجد علی شاہ کی مثنوی 'حزنِ اختر' ان کی اسیری کے دنوں کا نوحہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی 'قیدِ فرنگ' اور 'بیانِ درد' المیہ داستان کا آخری ورق ہے۔ 'بیانِ درد' کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں جن سے شکستگیِ دل کا برملا اظہار ہوتا ہے:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں، میرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا، کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
وے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی ان کے دل میں بخار ہے

مرزا داغ دہلوی نے 'شہر آشوب' میں دلی کی تباہی پر اپنے حزن وملال کا اظہار کیا اور 'فغانِ دہلی' میں تو انھوں نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے:

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمان دہلی
تھا مرا نام ونشان نام ونشان دہلی
اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہ ہووے گا حساب
بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیان دہلی

مرزا غالب نے دلی کی تباہی اور تاراجی پر اپنے بے پناہ تاسف کا اظہار کس قدر نم دیدگی کے ساتھ کیا ہے اس کا اندازہ ان کے ان اشعار سے ہوتا ہے جو 1857 کے پس منظر میں کہے گئے ہیں:

بسکہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا

OO

* میر کے 1752 میں رائج ہونے والے دیوان میں موجود یہ شعر فرخ سیر کے واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی آنکھوں میں 1722 میں سلائیاں پھیر کر اندھا کیا گیا تھا۔ شاہ عالم کا واقعہ اس کے کافی بعد 1788 کا ہے۔ (ف۔ ر)

ادبی تجزیہ

1857 کی بغاوت اور اردو ادب

علی احمد فاطمی

■

ہنگامے سے پہلے اور اس کے بعد کے احساس پس ماندگی اور شکست مکمل کے جو منفی اثرات اردو ادب میں نظر آتے ہیں وہ تصویر کا ایک دردناک رخ ہے لیکن دوسرا رخ اسی قدر تابناک بھی ہے۔ اس سے تاریخی واقعہ کی جدلیات (Dialectics) کا سراغ ملتا ہے۔ جب ہم شعرا اور ادیبوں کی تباہ حالی، عام لوگوں کے احساس بے بسی، ادبی مرکزوں کی سراسیمگی، کلیات، دیوانوں اور تصنیفوں کی تلفی، بے باک اہل قلم کی زبان بندی، قتل، پھانسی اور کالے پانی کی سزاؤں کے ساتھ زندگی کے گھپ اندھیروں میں نئے تصورات، عقلیت پسندی، نئی آگہی اور نئے قومی ذہن کی بیداری کو اونچے ہوتے دیکھتے ہیں تو یہ لو آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہے... ظ انصاری

■

1857 کا ہنگامہ ایک حادثے کے طور پر سرعت سے اٹھا اور دب گیا۔ لیکن اپنے آپ میں ایک ایسا تاریخی موڑ چھوڑ گیا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ اس حادثہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حادثہ محض اتفاقی نہ تھا بلکہ اس کے پس پردہ فکر و سیاست کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس حادثہ کا تعلق براہ راست سماجی وسیاسی حالات سے تھا لیکن اس کی اہمیت زندگی کے ہر گوشے پر اثر انداز ہوئی۔ زبان و ادب بھی اس کے اثرے سے نہ بچ سکے۔ زبان و ادب کا رشتہ سیاست و سماج سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادب اپنے سماج سے متاثر ہوئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر عہد کا ادب اپنے وقت کے سماجی اتار و چڑھاؤ سے ہر حالت میں کسی نہ کسی شکل میں منسلک رہتا ہے۔ پھر یہ عظیم ہنگامہ ذہن و خیال کی لپیٹ میں کیوں نہ آتا۔ بقول محمد حسن:

"1857 کی لڑائی فکر و خیال کے طویل سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے، اور چونکہ ادب بھی خیال اور جذبہ کا ہی نام ہے اس لئے اس عہد کے فکری تانے بانے کو اس لڑائی نے جس طرح متاثر کیا تھا وہ ادبی مورخ کے لئے بھی دلچسپی کا موضوع ہے۔"[1]

اس قول کے مطابق اس حادثے کا اثر ادب پر پڑنا لازمی تھا۔ اب یہ تلاش کرنے کے لئے کہ اس کے اثرات اردو ادب میں کس حد تک اور کس انداز سے رونما ہوئے، اس وقت کے ادب کی طرف مڑنا پڑے گا۔ اس ہنگامے کے وقت پورا ہندوستان اس میں شامل نہ تھا۔ کچھ ہی خطے اہم تھے جو اس عظیم کھیل میں اپنا رول ادا کر رہے تھے اور یہ خطہ شمالی ہند سے تعلق رکھتا ہے۔

غدر سے پہلے اردو ادب کا اور اردو دانوں کا ایک دوسرا ہی ماحول تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست عام طور پر امرا و رؤسا ہوا کرتے تھے۔

سماج میں نرمی، شیرینی اور آسودگی تھی۔ اس لئے اس وقت کے ادب میں بھی ہمیں یہی عناصر ملتے ہیں۔ پھر جب سے انگریز حاکم ہوئے رفتہ رفتہ ظلم و جبر کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس کے جواب میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ سارا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر شے میں ایک انقلاب آ گیا۔ بقول پروفیسر احتشام حسین:

''بغاوت رونما ہوئی، مبہم غیر معین، غیر منظم لیکن شدید قومی جذبے کی سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ چھوٹے بڑے، بہت سے دربار جو شاعروں کے سرپرست تھے، برباد ہو چکے تھے۔ اودھ کو جو فن و تہذیب کا بڑا مرکز تھا 1857 میں انگریزوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ دہلی میں مغل حکومت صرف نام کی رہ گئی تھی۔ ایک نئی سلطنت وجود میں آگئی جس کی جڑیں سرزمین ہند میں نہ تھیں اور جو ہندوستانی تمدن سے بیگانہ تھی۔''[2]

یہ تضاد، یہ انتشار پورے ہندوستانی سماج میں پھیلتا گیا، ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ظلم کا شکنجہ کستی چلی گئی۔ امتیازات بڑھنے لگے۔ دہلی اجڑ چکی تھی۔ لکھنوی تہذیب انگریزوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھی۔ ایسی حالت میں ادب کیسے بچ سکتا تھا، وہ بھی لپیٹ میں آیا۔ ادیب بھی پریشانی اور خستہ حالی کے بھنور میں پھنسے اور یہی خستہ حال، افسردگی ہمیں اس وقت کے ادب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب اس دور کے ادبی اور تمدنی روایات کے بہترین پیکر سمجھے جاتے ہیں اور جو بعض مقامات میں انگریزی پالیسی کے معترف بھی تھے لیکن جب بغاوت اٹدی تو یہ بھی اس میں پسے بغیر نہ رہ سکے اور اس کے نمایاں اثرات ان کے خطوط اور ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلح شور انگستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

یا اردوئے معلیٰ و عود ہندی (خطوط کے مجموعے) میں اس وقت کے حالات کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔ محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر کو گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔ مشہور شاعر امام بخش صہبائی کو ان کے دو بیٹوں کے ساتھ گولی سے اڑا دیا گیا۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس عہد کے مشہور و معروف عالم مولانا فضل حق کو جلا وطن کر کے انڈمان بھیج دیا گیا، جہاں ان کا بعد میں انتقال ہو گیا۔

منیر شکوہ آبادی کی نظموں میں اس وقت کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان سب کی تخلیقات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک ایک شعر میں اس عہد کی تصویر نظر آئے گی۔ افسردگی کا یہ مزاج اس وقت کی پوری شاعری میں سما گیا تھا۔ غزل نے ایک الگ روپ اختیار کر لیا۔ اشارے و کنائے کی زبانیں تیز ہو چلیں، امیر مینائی کے ایک شعر کے مطابق:

قریب ہے یار و روز محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ حکومت جو شاعر بھی تھے، ان کی لے میں کس قدر آہ و درد ہے۔ ظالموں نے ان کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ ان کی ایک غزل سے آنسو ٹپکتے ہیں:

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

واجد علی شاہ اختر جو اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے اور ایک خاص مزاج، نفاست اور لطافت کے مالک تھے، اپنی تباہ حالی کا بیان اپنی مثنوی حزن اختر میں بڑے درد کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی بعض غزلیں بھی سوز و گداز سے لبریز ہیں۔ شیفتہ اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ ان کے یہ دو شعر کس قدر دلی درد اور تڑپ کا اظہار کرتے ہیں:

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں
کیا زہر اگل رہے ہیں بلبل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

اردو شاعری کے یہ چند موتی جو اس آگ کی لپیٹ سے بچ سکے اس دور کی خستہ حالی، پریشانی اور مصیبتوں کے مظہر ہیں، ورنہ زیادہ تر سرمایہ تو برباد ہو گیا اور محفوظ نہ رہ سکا۔ پھر بھی جو تصانیف ہمیں مل جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

خطوط غالب۔ داستان غدر: مصنف ظہیر دہلوی، تاریخ سرکشی بجنور:

سرسید احمد، رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ تاریخ ہند: ذکاء اللہ، روزنامچہ غدر: مترجمہ نذیر احمد، فغان دہلی: آغا ہجو شرف۔ ان کے علاوہ واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر، غالب اور شیفتہ وغیرہ کی نظمیں جو دوران بغاوت میں لکھی گئیں اہم ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بغاوت اچانک اٹھی اور دب گئی، ہنگامے ہوئے اور سرد پڑ گئے۔ لیکن بغاوت کے بعد اس کی جو اہمیت تسلیم کی گئی اور اس کی باریکیوں، نزاکتوں اور دور سے نظر آنے والے فائدوں کو پڑھا اور سمجھا گیا، 1857 میں اس کی اصل شکل نہ سمجھی جا سکی تھی۔ وہ تو بس ہندوستان کی بدنصیبی، لاپروائی، اپنی کمزوری اور انگریزوں کی طاقت کی علامت سمجھی گئی۔ بقول احتشام حسین:

"بیشتر حالتوں میں اسے قہر الٰہی، فریب تقدیر، آسمان کی چشم بد، انقلاب زمانہ اور اعمال بد کی سزا کا تصور کہا گیا۔"[3]

ابتدا میں بغاوت کا صحیح تصور ذہن میں نہ تھا، لیکن جب بغاوت سرد پڑی تب ہندوستانی عوام کا ذہن جاگا، دل و دماغ میں بیداری آئی، اپنے آپ کو پہچاننے کی سمجھ آئی اور جب ان سب کے باوجود انگریزوں کے ظلم وزیادتی میں کسی طرح کی کمی نہ آئی تو ساری بیداریاں متحد ہو گئیں اور اپنے آپ کو ایک سنجیدہ اور روشن راہ پر گامزن کر دیا۔ ذہن جاگا، فکر نے کروٹ لی، خیالات روشن ہوئے اور ان سب کے نتائج غدر کے بعد رفتہ رفتہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔

ادب میں بھی اسی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہنگامے سے ذرا سے پہلے اور ہنگامے کے وقت جو افسردگی، بے بسی تاریکی اور ویرانی ادب میں ملتی ہے، بغاوت کے بعد اس میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ ظ۔ انصاری کا خیال بالکل درست ہے:

"1857 کے ہنگامے سے، اس کے پہلے اور اس کے بعد کے احساس پس ماندگی اور شکست مکمل کے جو منفی اثرات اردو ادب میں نظر آتے ہیں وہ تصویر کا ایک دردناک رخ ہے لیکن دوسرا رخ اسی قدر تابناک بھی ہے۔ اس سے تاریخی واقعہ کی جدلیات (Dialectics) کا سراغ ملتا ہے۔ جب ہم شعرا اور ادیبوں کی تباہ حالی، عام لوگوں کے احساس، بے بسی، ادبی مرکزوں کی سراسیمگی، کلیات، دیوانوں اور تصنیفوں کی تلفی، بے باک اہل قلم کی زبان بندی، قتل، پھانسی اور کالے پانی کی سزاؤں کے ساتھ، ادب کے سرپرستوں کی پریشان زندگی کے ان گھپ اندھیروں میں نئے تصورات، عقلیت پسندی، نئی آگہی اور نئے قومی ذہن کی بیداری کو اونچے ہوتے دیکھتے ہیں یہ لو آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہے اور اس کی روشنی اس خونی افق سے پھیلی ہے جس میں ہمارے بڑے بڑے روشن ستارے ڈوب گئے"[4]

یہ تھے اس موت کی آڑ میں جھانکتی زندگی کے آثار، کفن کی سفیدی میں پوشیدہ نظر آنے والی روشنی، ظلم کی آواز میں گونجتی مخالفت کی لہر۔ نیا شعور، نیا ذہن نیا سماج ابھر رہا تھا۔ اس کانپتے ہوئے دور میں جب انگریز حکومت اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی، ہندوستانی عوام، ہندوستانی سماج، نئے جذبات، نئے احساسات کے ساتھ ایک نئی اٹھکھیلیاں دکھا رہا تھا، افسردگی تازگی کا روپ دھارنے لگی، احساس پسپائی کی شدت میں کسی حد تک کمی آ چکی تھی، ماضی مستقبل کے لئے تڑپ رہا تھا۔ ان سب کا براہ راست اثر ادب پر پڑا۔ 1857 کے بعد اردو ادب میں ایک نئی فکر، ایک نئے جوش، ایک نئی تبدیلی، ایک نئی تحریر کا آغاز ہونے لگا۔ بقول احتشام حسین:

"اس کے بعد ادب کے بیشتر حصے سے ایک مختلف رنگ نمایاں ہے۔ اس کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کو نئے ادب کے راہی قرار دیا جا سکتا ہے، جنھوں نے ادب کو قوم کے ارتقا میں ایک تعمیری عمل تصور کیا۔ ان کے خیال میں ایک ادیب کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا ہے۔ ان میں اہم ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں: سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک۔ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے لئے مطابق بھی ہو اور اس کے لئے فائدے مند بھی ہو"[5]

غدر سے پہلے اور غدر کے بعد ادب میں یہ فرق تھا اور یہ فرق غدر ہی نے پیدا کیا تھا۔ اسی بنا پر 1857 کی جدوجہد تنہا ہماری سیاسی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ ہمارے ذہن، تمدن اور ادبی ارتقا میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

1857 کے بعد کا ماحول ڈگمگا رہا تھا، ادب میں ایک عجب سی بے چینی نظر آ رہی تھی، قدامت اور جدیدیت ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہی تھیں اور اچھے اور برے دونوں عناصر مل جل کر ایک نیا خمیر بنا رہے تھے۔ دربار سے رشتہ ٹوٹ کر سماج سے جڑنے لگا تھا۔ اپنے ذہن اور اپنے بازوؤں پر اعتماد کیا جانے لگا۔ شکست کے بعد اس حقیقت سے انکار کی گنجائش قطعی نہ رہ گئی تھی کہ نئے خیالات اور نئے حالات کو آنے سے اب کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ ماضی کی عظمت سے انکار نہیں، لیکن تنہا اس کو گلے لگا کر جینا اب مشکل ہے۔ یہ احساس رفتہ رفتہ سماج میں اثر کرنے لگا۔ اسی لئے ادبی تحریروں میں فرق آیا۔ ادیبوں نے سوچا کہ حال تو تباہ ہو گیا۔ اب مستقبل ہاتھ سے نہ جانے پائے اور مستقبل کو سنوارنے کے لئے روشن ماضی ہی کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ اسی خیال کے تحت ہم کو غدر کی اہمیت تسلیم کرنے میں شاید

ہچک نہ ہو کہ اسی وجہ سے ادب میں ایک خوش گوار انقلاب آیا، اور یہ حادثہ ہی ادب کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ کرتا ہے تو دوسرے سنبھلے ہوئے دور کا آغاز بھی۔

فراق گورکھپوری کا یہ خیال صحیح ہے کہ ''ہندوستان کا 1857 کا غدر دو دھاری تلوار تھا۔ جس نے دونوں طرف سے وار کیا اور جو تخریبی کے ساتھ ساتھ تعمیری اور تخلیقی بھی تھا۔''[6]

دربار سے شاعری کا رشتہ ٹوٹا تو اردو شاعری کا دامن نئے ہندوستان سے آراستہ ہونے لگا۔ اب شاعری کی باگ ڈور متوسط طبقے کے ہاتھ آ گئی۔ نئے نظام کے زیر سایہ پلنے لگی۔ نئے بکھرے ہوئے شاداب جھرنوں کے سوتے شاعری میں پھوٹنے لگے۔

سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ یہ سب الگ الگ مزاج، ایک الگ ذہن اور ایک نئی فکر کے ساتھ ادب میں داخل ہوئے۔ ان سب میں کسی کا تعلق دربار سے دور دراز تک نہ تھا اور نہ ہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی دربار کے طور طریقے سے واقف نہ تھا۔ ان لوگوں نے آگے چل کر کیا کیا گل افشانیاں کیں اس کا تذکرہ تفصیل چاہتا ہے۔ یہاں پر صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ غدر سے قبل جو داستانوں کا رواج تھا وہ ایک دم سے سلیس اور معنی خیز نثر میں تبدیل ہو گیا۔ بقول محمد حسن:

''داستانوں میں ہر داستان کا تاج شہزادوں اور بادشاہوں کے سر سے اتار کر متوسط طبقے کے گھرانوں کے حصے میں دے دیا گیا۔ اس نئی ادبی فضا نے کون سے رخ اختیار کئے، یہ جدید اردو ادب کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اس فضا کا نقطۂ آغاز 1857 ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔''[7]

مثنویوں کا دور ختم ہوا کیوں کہ ان کے مزاج کی فضا اب باقی نہ رہی۔ دربار اجڑ گئے تو قصیدے کا زوال آ گیا۔ پہلے ایک ایک شعر پر نواب اشرفیاں برسا دیتے تھے، اب خود نواب ہی مال و زر کو ترستے تھے۔ نیا دور آیا تو مشغولیات بڑھیں، داستانیں ہٹنے لگیں، فرد کے بجائے اب پوری جماعت سے تعلق ہونے لگا۔ ادیب سنبھلے اور اپنے قلم کو فضولیات سے ہٹا کر انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کی طرف موڑ دیا۔

نیا دور اپنے ساتھ سائنس لایا، مغربی رجحانات لایا۔ بس ایسے ہی ماحول میں اردو ادب کے چند علم بردار سامنے آئے جنھوں نے پورے سرمائے پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی کوششوں سے اس فرسودہ ادب میں نئے خیالات، نئے احساسات اپنے قلم کے ذریعے دیئے۔ سرسید کی بدولت فلسفیانہ، اخلاقی و مذہبی خیالات آئے۔ حالی نے مقدمہ اور مسدس لکھ کر ایک زبردست اضافہ کیا۔ نذیر احمد نے اردو ناول کا تعارف کرایا۔ شبلی نے تاریخ کے ذریعہ ایک نئی اور زندہ نثر سے ادب کو روشناس کرایا۔

غرض کہ ادب میں نئے خیالات کی بھرمار ہو گئی جس کے اثرات دور دراز تک پھیلنے لگے اور آج تک اردو کا پورا سرمایہ ان ہی خیالات کے اردگرد ناچ رہا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے یہ جدوجہد محض سیاسی بیداری کی ہی حامل نہیں بلکہ ہماری ذہنی، فکری اور ادبی تاریخ میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور محسن الملک ان سب نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جنھوں نے آگے چل کر اردو ادب میں ایسی واضح تبدیلیاں کیں کہ اردو ادب ان کے احسانوں سے کبھی سر نہ اٹھا سکے گا۔

حواشی:

1: 1857 کی ادبی اہمیت 'شعر نو' از محمد حسن ص 32

2: اردو ادب اور 1857 از: پروفیسر احتشام حسین ص 246: انقلاب 1857 مرتب، پی سی جوشی

3: اردو ادب اور 1857 از: احتشام حسین ص 246: انقلاب 1857 مرتب: پی سی جوشی

4: اردو ادب 1857 کے دور میں زبان و بیان از ظ انصاری ص 245

5: ادب اور انقلاب 1857 مرتب پی سی جوشی (پروفیسر احتشام حسین)

6: مرزا سودا، حیات اور ناول نگاری از آدم شیخ ص 35

7: 1857 کی ادبی اہمیت (شعر نو۔ محمد حسن ص 46)

اردو اکادمی دہلی

(دہلی سرکار)

اردو اکادمی دہلی راجدھانی میں اردو زبان کے شعر و ادب اور اردو صحافت کے فروغ کے لیے انتھک جدو جہد کر رہی ہے اور اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاکر اردو کی ترقی کے لیے جو سرگرم اور فعال رول ادا کر رہی ہے اس سے نہ صرف قومی دارالسلطنت کے علاقہ میں اردو کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا عمل تیز تر ہوا بلکہ اس کے لیے ایک خوشگوار اور حوصلہ افزا ماحول بھی پیدا ہوا ہے۔ دہلی کی منتخب سرکار نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ بھی کیا۔ اردو اکادمی کی یہ بھی خوش نصیبی رہی ہے کہ اس کی چیئر پرسن اور دہلی کی وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت اردو کی سچی ہمدرد ہیں اور وہ اس زبان کو اس کا جائز حق دلانے کی حتی الوسع کوشش کر رہی ہیں۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس کی ذاتی دلچسپی اور اردو زبان و ادب سے بے لاگ محبت نے اکادمی کی کارگزاریوں کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی ہے۔ ان کی سوجھ بوجھ اور وسعتِ قلبی نے اکادمی کا نام ملک اور بیرونِ ملک روشن کیا ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے پانچ سب کمیٹیوں کے مشوروں اور ایگزیکیٹو کمیٹی و گورننگ کونسل کے فیصلوں کے مطابق کام کرتی ہے۔

مالی سال ۲۰۰۷-۲۰۰۸ء کے لیے اردو اکادمی، دہلی کے چند اہم منصوبے

۱۔ ادبِ عالیہ کے حوالے سے کلاسیکی ادباء و شعراء پر ۲۸ مونوگراف تیار کرائے گئے ہیں جن میں سے بیشتر عنقریب منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے حوالے سے بھی کچھ نادر و نایاب کتابوں کے ری پرنٹ اور کچھ نئی کتابیں بھی شائع کی جائیں گی۔ دہلی کے نامور اردو قلمکاروں، صحافیوں، عالموں اور اردو اخبارات و علمی جرائد نیز اردو سے تعلق رکھنے والے اداروں کی ایک ڈائرکٹری تیار کرانے کی اسکیم بھی تیار کی گئی ہے۔

۲۔ اکادمی نے اس سال مندرجۂ ذیل سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ (۱) اردو تعلیم کے مسائل (۲) اردو میں تحقیق و تنقید: معیار و مسائل (۳) اردو ادب میں ہندوستانی فکر و فلسفہ (۴) اردو مشاعرہ کی روایت: کمال اور زوال۔ اس کے علاوہ ایک قومی سمینار ۱۸۵۷ء کی جدو جہد سے متعلق ملک کی تمام ریاستی اردو اکادمیوں کے اشتراک سے منعقد کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے۔

۳۔ اردو اکادمی، دہلی میں قائم اردو کمپیوٹر تربیتی مرکز کے علاوہ ایک مرکز فصیل بند شہر اور ایک مرکز جمنا پار کے علاقے میں کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۴۔ اکادمی کے اردو خواندگی مراکز سے فارغ طلباء کے لیے نیشنل اوپن اسکول کے اشتراک سے دس مراکز کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ان طلباء کو روایتی تعلیم حاصل کرنے کا اہل بنایا جاسکے نیز دو ووکیشنل ٹریننگ سینٹر کھولنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے، جن میں خاص طور سے طالبات کو سلائی کڑھائی اور بیوٹی کلچر کی تربیت دی جائے گی۔

۵۔ اردو اکادمی نے ممتاز اردو اسکالرز فیلوشپ جاری کرنے کی اسکیم کو اصولی طور پر منظور کرلیا ہے، جس کے قواعد و ضوابط ترتیب دیے جا رہے ہیں۔

۶۔ اردو اکادمی نے دہلی کے ان علاقوں میں جہاں اردو پڑھنے والے کثیر تعداد میں رہتے ہیں، لائبریریاں / ریڈنگ روم قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس کے لیے مناسب جگہوں کی تلاش کی جارہی ہے۔

۷۔ اکادمی کی جانب سے بیسویں صدی کی اہم علمی و ادبی شخصیات کی طویل مدتی خدمات کے اعتراف میں شامیں منعقد کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اکادمی نے اس سال سے "نوائے امروز" کے تحت دہلی کے ان ادباء و شعراء کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے، جو اپنا مقام بنا چکے ہیں اور مشقِ سخن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان ملاقاتوں میں ان کی تخلیقات کا تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ ان کی تخلیقات میں مزید نکھار پیدا ہو۔

جاری کردہ: اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی

اردو شاعری

جائزہ و تجزیہ

1857 اور اردو شاعری

گوپی چند نارنگ

بظاہر اس میں بوالعجبی معلوم ہوتی ہے کہ وہ شاعر جو انگریزوں کے خیر خواہ تھے اور وہ جو انگریزوں کے مخالف تھے ان کا اساسی نظریہ ایک کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ اصل چیز انگریزوں کی مدح یا قدح نہیں بلکہ وہ نقطۂ نظر ہے جس سے یہ لوگ 1857 کے واقعات کو دیکھتے تھے۔ ان کے بیانات میں بظاہر جو تضاد ہے، وہ دراصل نقطۂ نظر کا نہیں بلکہ ان تاریخی حالات کا ہے، جن میں یہ منظومات کہی گئیں۔ اردو کے وہ اشعار جن میں انگریز دشمنی کی بو آتی ہے۔ اس زمانے کی چیز ہیں جب انقلابیوں کا ستارہ عروج پر تھا اور شاعروں کو اظہار رائے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ تمام کلام جس میں 'غدر' کی مذمت کی گئی ہے اس زمانے کا ہے، جب انگریز فتح یاب ہو چکے تھے اور ان کے جور و ستم کا بازار گرم تھا۔

انیسویں صدی کے نصف اول کی اردو شاعری میں حب وطن کے جدید تصور کی تلاش عبث ہے۔ اس زمانے میں وطنیت کا تصور آج کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ یہ جدید تصور انیسویں صدی کے اواخر میں نئی تاریخی تبدیلیوں کے نتیجے میں نشاۃ الثانیہ کے اثرات کے نتیجے کے طور پر آیا۔ اس کے برعکس وطنیت کا قدیم تصور اپنے زمانے کے مخصوص تاریخی عوامل اور سماجی قوتوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس کی بنیاد اتنی سیاسی یا معاشی نہیں جتنی اخلاقی اور مذہبی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں انفرادیت زیادہ تھی اور اجتماعیت کم۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تصور ایثار، قربانی، جرأت اور مردانگی کے اعلیٰ جذبات سے مملو تھا۔ ہندوستان کا وحدانی تصور اس زمانے میں فاصلوں کی دوری، رجواڑوں کی باہمی رقابت، آپسی نفاق اور طوائف الملوکی کے باعث ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں انگریز اس ملک پر اپنا قبضہ و اقتدار بڑھاتے گئے اور ان کے مفاد عوامی مفاد سے ٹکرانے لگے، غلامی اور مظلومیت کا احساس رفتہ رفتہ ہندوستان کے تمام طبقوں میں قدر مشترک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس زمانے کی اردو شاعری میں بھی اس کے اثرات جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ کہیں کوئی مصحفی، کوئی جرأت، کوئی مومن، ان مخفی دلی جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں آزادی کا تصور ابھی مذہبی یا اخلاقی بنیادوں پر تھا، اس لیے عام طور پر انگریزوں کی مخالفت اس بنا پر ہوئی کہ ان کی حکومت میں دین اور مذہب خطرے میں ہے۔ اضطراب کی ان چنگاریوں کو جب شجاعت اور دلیری کے قدیم اوصاف کی ہوا ملی تو یہ 1857 میں جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف اس سرعت سے پھیل گئیں جس کا انگریزوں کو خواب و خیال تک نہیں تھا۔ وطنیت کی یہ تحریک جذباتی اور انفرادی سرچشموں سے پھوٹی تھی، اس لیے اس کا تخریبی پہلو زیادہ نمایاں رہا۔ انگریزی عمل داری کا خاتمہ

کرنے اور سرکاری اداروں کی تباہی و بربادی کی حد تک اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن جہاں تک انقلاب کے تعمیری حصے کا تعلق ہے، اجتماعی جذبات کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ پہلو بالکل نامکمل رہ گیا اور جن علاقوں پر دیسی سپاہ قابض ہوگئی تھی، ان کی شیرازہ بندی بھی ٹھیک طور پر نہ ہو سکی، جس وجہ سے بعد میں انگریز وہاں پھر متصرف ہو گئے۔

اس زمانے کی اردو شاعری تاریخی قوتوں کے اس تصادم اور ولولوں کی اس کشاکش کی آئینہ دار ہے۔ اس ضمن میں اردو شاعروں نے حب وطن کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، ان کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے ان تاریخی قوتوں کو نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے جو اس وقت کارفرما تھیں۔

لارڈ کلایو سے لارڈ ڈلہوزی تک کمپنی کے جوڑ توڑ سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز کسی نہ کسی بہانے سارے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ جس کام کی ابتدا جنگ پلاسی سے ہوئی تھی، اس کی انتہا بکسر کی لڑائی پر ہوئی۔ اس کے بعد نہ صرف اودھ کا نواب وزیر انگریزوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا بلکہ مغل تاجدار شاہ عالم بھی ان کے زیر اقتدار آ گیا۔ 1837 میں بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو گورنر جنرل لارڈ الن برا نے انھیں علانیہ قلعہ کی سکونت ترک کر دینے اور شاہی خطابات سے دست بردار ہو جانے کو کہا۔ مرزا فخرو کے انتقال کے بعد مرزا قویش کو ولی عہد ہی اس شرط پر بنایا گیا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد ان کے لیے صرف خطاب شہزادہ باقی رہے گا۔ پنشن سوا لاکھ کے بجائے پندرہ ہزار ہوگی اور قلعہ خالی کر دیا جائے گا۔ گویا آل تیمور کا خاتمہ ہر لحاظ سے ایک فیصلہ شدہ بات تھی۔

ادھر کمپنی دیسی ریاستوں پر بھی یکے بعد دیگرے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ وارن ہیسٹنگز بنگال، بنارس اور روہیل کھنڈ کو خاک میں ملا چکا تھا۔ ولزلی نے میسور، پونہ، ستارا اور کئی دوسری ریاستوں کو تختہ مشق بنایا۔ انگریزوں کی ان دست درازیوں کے خلاف راجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے دلوں میں شدید نفرت پھیل رہی تھی۔ ڈلہوزی کی بدعنوانیوں نے اسے شدید تر کر دیا۔ سلطنت کی حدود بڑھانے کے لیے کمپنی دیسی حکمرانوں کو معمولی معمولی بہانوں پر برطرف کرنے لگی اور ان کی پنشنیں ضبط کی جانے لگیں۔ 1849 میں انگریز پنجاب پر بھی قابض ہو گئے۔

معاشی استحصال کی حالت یہ تھی کہ کمپنی نے دیسی صنعت کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ تجارت کساد بازاری کا شکار تھی اور کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

سماجی سطح پر بھی ہندوستانیوں کا خطرہ کچھ ایسا بے جا نہ تھا۔ انگریز سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے نتیجے کے طور پر

مسلمانوں میں اصلاحی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد ان کے کام کو ان کے عزیزوں اور رفیقوں نے جاری رکھا۔ مولوی احمد شاہ مدراسی اور مولانا لیاقت علی نے اس سلسلے میں مزید خدمات انجام دیں اور شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں اہم حصہ لیا۔

ادھر نانا راؤ پیشوا اور عظیم اللہ دیسی ریاستوں میں خفیہ سازش کا جال بچھانے لگے۔ بنگال میں علی نقی خاں فقیروں اور سنیاسیوں کے ذریعے فوجیوں کو بھڑکا رہے تھے۔ چھاؤنیوں میں رات کو خفیہ جلسے ہوتے تھے اور 1857 کے آغاز ہی میں آتش زدگی کی اکا دکا وارداتیں شروع ہو گئی تھیں۔ حتیٰ کہ چربی لگے ہوئے کارتوسوں کا بہانہ پا کر فوجیوں کی نفرت کا لاوہ 10 مئی کو میرٹھ چھاؤنی سے پھٹ پڑا اور چند ہی دنوں میں بغاوت کی یہ آگ سارے شمال وسطی ہندوستان میں پھیل گئی۔ لیکن چونکہ بغاوت پوری طرح منظم نہ تھی، انگریزوں کو تیاری کا موقع مل گیا۔ ایران سے صلح ہو جانے کی وجہ سے ہرات سے انگریزی فوجیں فوراً لوٹ آئیں۔ چین کو جانے والے انگریزی دستے بھی کلکتے میں روک لیے گئے۔ ساتھ ہی پنجاب نے انگریزوں کو جو کمک پہنچائی اس نے تو باغیوں کی کمر ہی توڑ کے رکھ دی۔ انگریزوں نے سکھوں اور مغلوں کی دیرینہ عداوت کا پورا فائدہ اٹھایا اور حکمت عملی سے کام لے کر سکھوں کو باغیوں سے الگ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ 18 ستمبر کو دلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

الہ آباد میں بغاوت کے بانی مولوی لیاقت علی * لکھنؤ میں مولوی احمد شاہ، کانپور میں نانا صاحب اور جھانسی میں رانی لکشمی بائی تھیں۔ لکھنؤ میں

---

* الہ آباد میں شورش کے موقع پر جو اشتہار بنام شاہ اودھ اور دیگر مقامات قرب و جوار میں مشتہر کیے گئے تھے، ان میں سے دو پنڈت کنہیا لال نے نقل کیے ہیں (محاربہ عظیم ص 300)۔ یہ دونوں اشتہار اردو میں ہیں۔ ایک نثر میں ہے اور ایک نظم میں۔ جانے ایسے کتنے منظوم اشتہار اس زمانے کے شاعروں نے اپنے دلی جذبات سے مجبور ہو کر لکھے ہوں گے۔ الہ آباد میں مولوی لیاقت علی انگریزوں کے خلاف جہاد کے پرجوش مبلغ تھے۔ تاریخ محاربہ عظیم کا مولف کنہیا لال لکھتا ہے کہ موصوف جگہ جگہ وعظ کرتے پھرتے تھے اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف انتہائی جوش پیدا کر دیا تھا۔ یہ نظم فقط سنائی ہی نہیں جاتی تھی بلکہ جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں بھی کر دی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "اب وقت آ گیا ہے کہ ہماری بات سنو اور تلوار کو بڑھ کر مارو"۔ اس منظوم اردو اشتہار کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد
اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبی جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو جہاد کفار
اس کا ساماں کرو جلد اگر ہو دیندار
جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ وبال
جو رہ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں (جاری)

نابالغ شہزادے برجیس قدر کو مسند نشیں کیا گیا اور ملکہ اودھ حضرت محل نگراں مقرر ہوئیں۔ دسمبر 1857 سے فروری 1857 تک انگریزی فوجیں تانتیا توپے اور رانی لکشمی بائی کے ساتھ معرکوں میں مصروف رہیں۔ مارچ میں لکھنؤ پر تیسرا حملہ ہوا اور باغیوں کی پھوٹ کی وجہ سے انگریز لکھنؤ پر دوبارہ قابض ہو گئے۔

اس کے بعد باغی سردار بریلی میں جمع ہوئے، یہاں بھی شدید جنگ ہوئی اور باغی ہار گئے۔ جون 1858 میں مولوی احمد شاہ مدراسی اور رانی لکشمی بائی دونوں مارے گئے۔ گو نانا صاحب اور ان کے ساتھی اس کے بعد بھی انگریزی فوجوں پر چھاپے مارتے رہے، لیکن دراصل بریلی کی شکست کے بعد باغیوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان کے بچے کھچے رہنما نیپال کے جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر پر دہلی میں مقدمہ چلا گیا اور اکتوبر 1858 میں انھیں جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔

اردو کے اکثر شعرا 1857 کی آویزش و پیکار کی زد میں بری طرح آئے۔ ان میں سے بعض نے عملی طور پر بھی اس جنگ میں حصہ لے کر اپنی وطنیت کا حق ادا کیا۔ اردو کے یہ شاعر اگر چہ کسی ملکی یا منظم قومی جذبے سے تو آشنا نہ تھے، لیکن اپنی سلطنت کے جاتے رہنے سے ناخوش ضرور تھے اور غیر ملکی انگریزی حکومت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ کمپنی نے جس وقت ہندوستان میں اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنا شروع کیا، اردو شاعری ابھی تصوف کی آغوش میں تھی اور ہر قسم کے جذبات کسی نہ کسی حد تک روحانی انداز میں ادا کیے جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس زمانے میں بھی انگریزوں کے خلاف کہیں کہیں رمز و ایما کے پردے میں تو کہیں صاف صاف واقعاتی سیاسی اظہار خیال کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

جنگ پلاسی کے موقع پر نواب سراج الدولہ کی شہادت ایک قومی حادثہ تھی۔ درد مندوں کے دل پر اس سے جو گزری راجہ رام نرائن موزوں کا یہ شعر اس کی نہایت موثر ترجمانی کرتا ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

بکسر کی لڑائی کے بعد نواب وزیر انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے۔ کمپنی نے جنگ کا منہ مانگا تاوان لیا، اودھ کا بھی کچھ علاقہ چھین لیا۔ اس کے علاوہ انگریزی فوجیں بھی اودھ میں تعینات کر دیں جن کے خرچ کا بوجھ نواب وزیر کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ نواب بے چارے بے بس تھے اور انگریز جو چاہتے منواتے اور جو چاہتے کرتے تھے۔ اغلب ہے کہ جرأت نے یہ شعر انھیں حالات سے متاثر ہو کر کہے ہوں:

کہیے نہ انھیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ ہیں قفس میں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ یورپ کے اسیر

اسی طرح ہندوستان کے معاشی استحصال پر مصحفی نے یہ شعر اتفاقاً نہیں بلکہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا ہوگا:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی

انگریزوں کے خلاف ملک میں جو مذہبی اور نیم مذہبی تحریکیں پیدا ہوئیں، شاہ ولی اللہ دہلوی کی اصلاحی تحریک ان میں سب سے اہم تھی۔ یہ مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی لہر کو بھی روک دینا چاہتی تھی۔ اردو شاعروں میں مومن اس تحریک سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ مومن، شاہ اسماعیل شہید کے ہم سبق اور مولوی سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کے خیالات کا اثر مومن پر اتنا گہرا تھا کہ بقول خواجہ احمد فاروقی: ''وہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے۔''

مثنوی جہادیہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
حیات ابد ہے جو اس دم مرو
سعادت ہے جو جانفشانی کرے
یہاں اور وہاں کامرانی کرے

بقیہ حاشیہ

حق تعالی کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو سنی تم نے جو خوبی جہاد
چلو اب رن کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے
اپنی ہستی کا بجز افسوس نہ پھل پاؤ گے
بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولت بیدار سے مومن بھاگے
تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب
شکر سب تونے دیا اے مرے رب الارباب
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تونے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ کر مارو

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار
پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں
مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

مومن کے ایک فارسی قصیدے کے یہ اشعار بھی غور طلب ہیں:

این عیسویاں بلب رسانند
جان من و جاں آفرینش
تاچند بخواب ناز باشی
فارغ ز فغاں آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست
اے فتنہ نشاں آفرینش

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں
ہے معرکہ جہاد چل دیجے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز
وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

یہ اشعار بھی اس نفرت کی اڑتی ہوئی چنگاریاں ہیں:

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا
ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم
کہتے ہیں یہ ہم چاٹ کے خاک اس میں ہوں گو خاک
پر اب تو زمیں بوس کلیسا نہ کریں گے

غرض یہ کہ 'بغاوت' سے پہلے اردو شاعری میں بھی انگریز دشمنی کے خیالات کا اثر بڑھنے لگا تھا۔ بغاوت کا سب سے زیادہ زور دہلی میں رہا اور دہلی ہی اس وقت اردو شعر و ادب کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ یوں تو نادر شاہ اور مرہٹوں کے حملوں کے بعد دہلی میں شعر و شاعری کی محفلیں سرد ہو گئی تھیں، لیکن سیاسی اور معاشی ابتری کے باوجود محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں اردو نے کچھ ایسا سنبھالا لیا کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک دہلی میں بیسیوں باکمال شاعر جمع ہو گئے۔ ان میں شیخ امام بخش صہبائی، شیخ ابراہیم ذوق، منشی صدرالدین آزردہ، مرزا اسداللہ غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، حکیم آغا جان عیش وغیرہ جیسے کہنہ مشق شاعر بھی تھے اور آزاد، حالی، داغ، قادر بخش صابر، شہاب الدین ثاقب، سالک، مجروح، مرزا انور، باقر علی کامل وغیرہ جیسے نوعمر بھی۔ بقول صاحب گل رعنا "جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔" واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں دہلی کے ہر طبقے کے لوگ شعر گوئی کی طرف مائل تھے۔ بادشاہ اور شہزادے، امرا اور بازاری، صوفیہ اور رند مشرب سب کو شعر گوئی کا ذوق تھا۔ تذکرہ گلستان سخن 'غدر' سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا ہے۔ اس میں دہلی کے 375 شاعروں کا ذکر ملتا ہے جن میں زیادہ تر ہم عصر ہیں۔ شاہ نصیر، مومن اور ذوق وغیرہ تو خیر 1857 سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، باقی میں سے اکثر نے انقلاب کے دنوں میں دہلی کی صبح و شام اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ قلعہ کی تباہی اور شہر پناہ کی بربادی ان کی اپنی بربادی کی داستان ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ان واقعات کے آسودۂ ساحل تماشائی نہیں رہے بلکہ اس دریائے خوں کے شناور بن گئے۔ انھوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور انگریزوں کے خلاف خوب خوب نظمیں لکھیں۔ متعدد شاعروں نے قربانیاں دیں، مصیبتیں سہیں اور قید و بند کی کڑیاں جھیلیں۔ کئی بے گناہ گولی سے اڑا دیے گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد ذاتی مجبوریوں سے انقلابیوں کو "نمک حرام" کہتے اور انگریزوں کی مدح کرتے تھے۔ لیکن دہلی کی تباہی اور بربادی پر وہ دل ہی دل میں کڑھتے بھی تھے۔ غرض یہ کہ 1857 کے واقعات کی طرف اردو شاعروں کا ردعمل مختلف اور متنوع طریقوں سے ہوا۔ اس کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے پہلے چند اہم شاعروں کا ذکر فرداً فرداً کیا جاتا ہے۔ ان میں سے صہبائی، آزردہ، منیر شکوہ آبادی، ظہیر دہلوی اور مولوی محمد حسین آزاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

'غدر' کے وقت صہبائی کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ انگریزوں کے غلبہ کے بعد اس کوچہ پر جو مصیبت نازل ہوئی، صہبائی بھی اس کی زد میں آئے اور اس کوچہ کے کئی دوسرے باشندوں کی طرح بالکل بے گناہ و بے قصور قتل کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے بیٹے عبدالکریم سوز بھی ہلاک ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ اس قتل عام میں صہبائی کے کنبہ کے کل 21 افراد قتل ہوئے۔ آزردہ کا شعر ہے:

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

آزردہ 'غدر' کے دنوں میں دہلی کے صدر الصدور تھے۔ ان کا باغیوں کی اعانت کرنا اور فتویٰ جہاد پر دستخط کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ شکست دہلی کے بعد یہ بھی انگریزوں کے معتوب ٹھہرے۔ ملازمت موقوف ہوئی اور مال جائداد مکانات سب برباد ہو گئے۔ بیش قیمت اور نادر کتب خانہ لٹ گیا اور مدرسہ دار البقا جس میں وہ درس دیتے تھے ڈھا دیا گیا۔ ان صدموں کے باعث آزردہ کے آخری ایام بڑی تنگی میں بسر ہوئے۔ دہلی کی تباہی اور اپنی عزت و آبرو کی بربادی سے ان کے دل پر جو گزری اس کا کچھ اندازہ ان کے اس شہر آشوب سے ہوتا ہے جو فغانِ دہلی میں شامل ہے۔ یہ گیارہ بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند ہی میں میرٹھ کے 'کالوں' پر برسے ہیں اور کہا ہے کہ دہلی پر شامت اہل قلعہ کے اعمال کے بدولت آئی ہے۔ اس کے بعد اپنی خانہ ویرانی اور شہر والوں کی بے سروسامانی کا ذکر کیا ہے۔ یہ بند اس قدر پرتاثیر ہیں کہ انھیں پڑھ کر آج بھی رقت طاری ہو جاتی ہے:

زیور الماس کا تھا جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاج کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اوڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو کیا گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ ان کو آتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
ان کو تکیے کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مرزا غالب سنہ ستاون کے ہنگامے میں شروع سے آخر تک دہلی ہی میں رہے۔ اس زمانے کے حالات انھوں نے اپنی فارسی کتاب 'دستنبو' میں لکھے ہیں۔ فتح دہلی کے بعد انگریز فوجوں کی لوٹ مار سے مرزا غالب کا گھر تو محفوظ رہا لیکن جو قیمتی سامان اور زیورات ان کی بیگم نے حفاظت کے خیال سے میاں کالے صاحب کے تہ خانے میں رکھوائے تھے، انھیں فتح مند فوج نے لوٹ لیا۔ چند گورے غالب کے گھر میں بھی آ داخل ہوئے اور انھیں گرفتار کر کے کرنیل برن کے سامنے لے گئے۔ باز پرس ہوئی زندگی باقی تھی کہ مرزا بچ گئے۔ لیکن امن قائم ہو جانے کے بعد غالب نے جب پنشن اور دربار بحال کیے جانے کے لیے سلسلہ جنبانی کی تو انھیں صاف صاف کہا گیا کہ وہ غدر کے دنوں میں باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے[2] اور انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو سکہ کہہ کر گزرانا تھا۔ یہ سکہ دراصل کسی اور کا تھا جو بہادر شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر کہا گیا تھا لیکن ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے غالب اس الزام سے اپنی برأت ثابت نہ کر سکے۔ (حقیقت یہ ہے کہ غالب نے بادشاہ کا سکہ شعر کہا تھا۔ بعد کی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔) قلعہ کی تنخواہ تو گئی ہی تھی پنشن اور دربار کے معاملے میں بھی زک اٹھانا پڑی اور 'کوئین پوئٹ' بننے کا خواب بھی ادھورا ہی رہا۔

ان شخصی صدموں اور چند دوسری وجہوں سے غالب 'غدر' کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا کی نظر اپنے مستقبل پر تھی اور 'غدر' سے دو سال پہلے جب یہ فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ ختم ہو جائے گا تو غالب نے اپنے مستقبل کو انگریزوں سے وابستہ کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں چنانچہ انگریزوں کے کامیاب اور دوبارہ متصرف ہو جانے کے بعد اگر غالب نے ان کا ساتھ دیا تو غالب کی معاملہ فہمی اور مستقبل بینی کے پیش نظر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ چند ہی ماہ کے اندر اندر انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک قصیدہ "شمار یافت روزگار یافت" لکھا۔ یہ قصیدہ نومبر 1858 میں دستنبو کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ چھپوایا گیا اور دستنبو کے چند نسخے خاص اہتمام سے تیار کرا کے بعض "خاص مقاصد اور مطالب کے لیے" ہندوستان اور انگلستان کے اکابر کو بھجوائے گئے۔

'غدر' کو غالب نے اگر برے ناموں سے یاد کیا تو اس لیے کہ اس ہنگامے سے ان کے مستقبل کا نقشہ بگڑ گیا۔ 'غدر' کی تاریخ غالب نے "رستخیز بیجا" سے نکالی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حب وطن سے عاری تھے یا اپنے ہم وطنوں کے لیے ان کے دل میں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ 'غدر' کے بعد انگریزوں نے ہندستانیوں پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے تھے، غالب کو ان کا احساس تھا۔ اپنے طبقے کی پامالی اور شہر کی ویرانی کا جو تذکرہ غالب کے ہاں ملتا ہے، بڑا ہی دردناک ہے۔ ان خطوں کو پڑھتے ہوئے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ دہلی پر انگریزوں کے غلبے کے بعد کس کی ہمت تھی کہ انگریزوں کے خلاف

ایک لفظ بھی کہہ سکے پھر بھی مرزا کے خطوں میں انگریزوں کی زیادتیوں اور سختیوں کی طرف اہم اشارے ملتے ہیں۔

غدر کے بعد دہلی والوں اور خاص طور پر مسلمانوں پر مصائب اور آلام کے ایسے ایسے پہاڑ ٹوٹے کہ ان کے ذکر سے آج بھی آنکھیں آشوب کر آتی ہیں۔ غالب نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس مظلومیت اور بے بسی کا احساس ایک جگہ اس قطعہ میں ظاہر ہوا ہے:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

شیفتہ نے انگریزوں سے نفرت اپنے استاد مومن سے ورثہ میں لی تھی۔ فتح دہلی کے بعد یہ بھی انگریزوں کے معتوب قرار پائے۔ جاگیر ضبط ہوگئی اور ابتدائی عدالت نے سات برس قید کی سزا دی۔ بارے اپیل میں بری ہوگئے۔ دہلی مرحوم سے متعلق انھوں نے 13 شعر کا ایک مرثیہ لکھا ہے۔ یہ ان کے مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں۔ دہلی کی پامالی پر خون کے یہ آنسو ملاحظہ ہوں:

ہائے دہلی و زہے دل شدگان دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی
وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں
مٹ گئے پھر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی
گر نہ کہویں کہ یہ دلّی ہے تو ہرگز نہ پڑے
دلّی والوں کو بھی دلّی پہ گمانِ دہلی

میر مہدی مجروح اور قربان علی بیگ سالک کو بھی اس ہنگامے میں دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ ہنگامہ فرو ہوجانے کے بعد سالک کا واپس دہلی آنا ثابت نہیں۔ لیکن دشت غربت میں بھی وطن کی یاد برابر ستایا کی۔ دہلی کی بربادی سے متعلق انھوں نے ایک ترکیب بند، ایک غزل اور ایک قطعہ لکھا ہے۔

مجروح بے چارے شکست دہلی کے بعد گھر بار چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھاتے پیدل پانی پت پہنچے۔ یہاں وہ دہلی کے حالات جاننے کے لیے بڑے بیتاب رہتے ہیں۔ غالب کے خطوط سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان کے بار بار پوچھنے پر انھیں "ان کی دلی کی باتیں" لکھ بھیجا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے ہاں دہلی کی تباہی اور بربادی کے بارے میں جتنی مفصل معلومات مجروح کے نام کے خطوں میں ملتی ہیں، دوسرے خطوں میں نہیں ملتیں۔

غالب کے ایک خط مورخہ 16 ستمبر 1862 سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دوران مجروح دہلی آئے اور واپس بھی چلے گئے۔ دہلی میں قیام کے دنوں میں انھوں نے یہاں غالباً اس مشاعرے میں شرکت بھی کی جس کی غزلیں کوکب نے مرتب کی ہیں۔ "فریاد دہلی" میں مجروح کی سات اشعار کی غزل درج ملتی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

یہ کہاں جلوہ جاں بخش بتانِ دہلی
کیونکہ جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی
ان کا بے وجہ نہیں لوٹ کے ہونا برباد
ڈھونڈتے ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی

داغ سنہ ستاون کے حادثہ کے وقت قلعہ ہی میں تھے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا بیان ہے کہ "دہلی کی شکست کے وقت جب قلعہ خالی ہونے لگا تو یہ بھی بحال تباہ وہاں سے نکلے۔ جلدی میں ان کا بہت سا ابتدائی کلام وہیں رہ گیا جس کا انھیں ساری عمر افسوس تھا۔

اس زمانے کے حالات سے متاثر ہوکر داغ نے جو شہر آشوب لکھا تھا "فغان دہلی" میں درج ہے۔ اس کے شروع کے تین بند ہنگامے سے پہلے کی دہلی کی تعریف میں ہیں۔ چوتھے سے ساتویں بند میں میرٹھ کے سپاہیوں کے دہلی آنے اور دین کے نام پر جنگ و جدال کرنے کا تذکرہ ہے۔ بعد کے بند میں شہر اور عوام کی تباہ حالی کی ایسی پردرد تصویریں کھینچی ہیں جو آج بھی دل میں درد کی ٹیس پیدا کردیتی ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت
فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں
برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی
غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہوجائیں
کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہوجائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہوجائیں
جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہوجائیں
پئیں جو آب بقا بھی تو زہر ہوجائے
جو چاہیں رحمت باری تو قہر ہوجائے

اردو کے کئی دوسرے شاعروں کی طرح مولوی محمد حسین آزاد بھی انگریزوں کے زخم خوردہ تھے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر علی دہلی سے دہلی اردو اخبار نکالتے تھے۔ انھیں انگریزوں نے 'غدر' کے بعد اس الزام کی بنا پر گولی سے اڑا دیا کہ دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کو ہلاک کرانے میں انھوں نے باغیوں کی مدد کی۔ خود آزاد کا وارنٹ کٹ گیا تھا۔ یہ رات کی رات دہلی سے بھاگ نکلے۔ برسوں جنوبی ہندوستان میں مدراس، نیلگری اور بمبئی وغیرہ شہروں میں رہے۔ یہاں سے سیالکوٹ اور کشمیر گئے۔ آخر کار لاہور آئے جہاں ان کی زندگی کا باقی حصہ بسر ہوا۔ وارنٹ اس دوران میں غالبًا عدم سُراغ کی وجہ سے داخل دفتر ہوگیا۔

مولوی محمد حسین آزاد کے پوتے آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ آزاد غیر ملکی حکومت سے پرخاش رکھتے تھے اور دہلی اردو اخبار میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر بے لاگ تنقید کیا کرتے تھے۔ چنانچہ غدر کے بعد اس اخبار کے تمام پرچے ضبط کر لیے گئے۔ بارے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں کچھ پرچے محفوظ ہیں۔ ان میں سے 24 مئی 1857 کے پرچہ میں آزاد کی معرکہ آرا نظم "تاریخ عبرت افزا" درج ملتی ہے۔ آزاد کی وطن دوستی کے سلسلے میں یہ نظم خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کمپنی کی حکومت کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انقلابیوں کی کامیابی سے خوش تھے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :

کو ملک سلیمان و کجا حکم سکندر
شاہان اولی العزم سلاطین جہاں دار
کو سطوت حجاج و کجا صورت چنگیز
کو خان ہلاکو و کجا نادر خونخوار
ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب الابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
تھے صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت
تھے صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے
آفاق میں تیغ غضب حضرت قہار
سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے
سب ناخن تدبیر و خرد ہو گئے بیکار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار[1]

اردو کے بہت کم شاعروں کو غدر میں اتنی زک اٹھانا پڑی جتنی ظہیر دہلوی کو۔ (پورا نام سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا دہلوی ہے۔ وفات 1911 میں ہوئی) یہ بہادر شاہ ظفر کے داروغہ ماہی و مراتب تھے اور راقم الدولہ خطاب تھا۔ انگریزوں کے غلبہ کے بعد ان کا ہزاروں کا اسباب تاراج ہوا۔ سر ہلاک ہوئے اور یہ جان بچانے کے لیے برسوں جھجھر (سونی پت)، پانی پت، فیروزآباد، مرادآباد، بریلی وغیرہ چھپتے پھرے۔ بارے ایک مدت بعد نواب رام پور کی وساطت سے معافی نامہ مل گیا۔ ان ایام کی روداد ظہیر نے تفصیل کے

ساتھ اپنی کتاب ''طرازِ ظہیری'' عرف ''داستانِ غدر'' میں لکھی ہے۔

غدر کے بارے میں ظہیر کا اصل رویہ کیا تھا؟ اس سلسلہ میں کوئی قطعی ثبوت نہیں، لیکن خود ان کے بیانات سے اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ 'غدر' کی کچھ نہ کچھ حمایت انھوں نے کی۔ ورنہ ''داستانِ غدر'' میں وہ اپنی پاک دامنی پر اتنا زور نہ دیتے۔

ظہیر نے 'غدر' کے واقعات سے متاثر ہو کر ایک شہر آشوب (مخمس) اور ایک غزل لکھی تھی۔ اس میں اپنے زمانہ کے حالات کی سچی تصویریں کھینچی ہیں۔ شہر آشوب کے کچھ اشعار ''داستانِ غدر'' میں بھی موقع بہ موقع درج ہیں۔

حالی بھی سنہ ستاون کے واقعات کی زد سے محفوظ نہ رہے۔ یہ حصار سے پانی پت جاتے ہوئے بری طرح لٹیروں کا شکار ہوئے اور زخمی حالت میں وطن پہنچے۔ 'غدر' کے بعد پرانی تہذیب یکسر معدوم ہونے لگی تھی۔ حالی نے اس کا ذکر اپنی غزل 'تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ' میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نئی تاریخی قوتوں کا عمل ترقی پذیر تھا لیکن غلامی کی زنجیریں بھی کس گئیں اور مٹنے والی تہذیب کی اپنی رنگینیاں اور خوبیاں تھیں جو نقش بہ ہوا ہو گئیں۔ حالی کی غزل انھیں خوبیوں کا نوحہ ہے۔

منیر شکوہ آبادی (وفات 1879) نے بھی 'غدر' کے واقعات میں اہم حصہ لیا۔ ہنگامہ کے وقت یہ نواب باندہ، علی بہادر خاں کے مصاحب تھے۔ منیر انگریزوں کی چیرہ دستیوں کا احساس رکھتے تھے اور ان کے غلبے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہ بات ان قطعوں سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے انقلابیوں کی فتح کے موقعوں پر کہے۔ نواب باندہ نے جب قلعہ اجے گڑھ پر فتح پائی تو منیر نے فتح کی خوشی میں کہا:

چو فوج بندیلہ بباندا رسید
ز حصنِ اجے گڑھ برائے فساد
بر ایشاں ظفریاب نواب ما
دل اہلِ انصاف گردید شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت منیر
خدا فتح عالی بہ نواب داد

مفتی انتظام اللہ شہابی کا بیان ہے کہ نواب باندہ کی شکست کے بعد منیر شکوہ آبادی، مرزا ولایت حسین کے ساتھ امداد لینے کے لیے روانہ ہوئے۔ فرخ آباد میں یہ دونوں گرفتار ہو گئے۔ مرزا ولایت حسین کو تو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور منیر شکوہ آبادی پر مقدمہ چلتا رہا۔ اس دوران میں ان پر ایک طوائف نواب جان کے قتل کا جھوٹا مقدمہ قائم ہوا اور سزائے حبس دوام بہ عبور دریائے شور ہوئی۔ اسی زمانے کا شعر ہے:

روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش
آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل

منیر نے اپنی گرفتاری اور قید کے حالات کو اپنے اشعار میں بے محابا ظاہر کیا ہے:

فرخ آباد اور یارانِ شفیق
چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر
تنگ تر تھی حلقہ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے
ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم
ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتے کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

انڈمان میں اپنی اہلیت کی وجہ سے منیر کمشنر کے محکمہ میں منشی گیری پر مامور ہوئے اور قید بامشقت سے بچ گئے۔ ادھر نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے بھی ان کے لیے کوشش کی۔ چنانچہ باقی قید معاف ہوئی اور 1865 میں رہا ہوئے:

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیر
فضل حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو
اس جزیرے سے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں
اے خدا ہندوستاں کا اب سفر مسعود ہو

سنہ ستاون کے واقعات میں اردو شاعروں کا جو حصہ ہے، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس ہنگامے کے بعض سرگروہ مثلاً بہادر شاہ ظفر، مرزا خضر سلطان، مرزا ابر جیس قدر اور نواب بریلی اردو کے شاعر بھی تھے۔ بریلی کے نواب خان بہادر خاں مصروف تخلص کرتے تھے۔ یہ ہندوستان کے ان چند

نوابوں اور راجاؤں میں سے تھے جنھوں نے غدر کے زمانے میں انگریزوں کے خلاف نہایت بہادری اور پامردی سے لڑائیاں لڑیں۔ انگریزوں کے غلبہ کے بعد یہ گرفتار ہوئے اور بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔

برجیس قدر واجد علی شاہ کے چھوٹے شاہزادے تھے۔ انھیں لکھنؤ کی انقلابی فوج نے غدر کے دنوں میں اپنا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ لکھنؤ کی شکست کے بعد یہ اپنی والدہ ملکہ حضرت محل کے ساتھ نیپال میں پناہ گزیں ہوئے اور وہیں مدتوں خراب وخوار رہے۔ مولوی نجم الغنی نے ان کی ایک غزل تاریخ اودھ میں نقل کی ہے۔ یہ غزل ان کی بے کسی اور کس مپرسی کی یادگار کہی جاسکتی ہے۔

مرزا خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے شاہزادے تھے۔ مشورہ سخن غالب سے تھا۔ انقلاب کے دنوں میں دوسرے شاہزادوں کی طرح یہ بھی باغی فوج کے جرنیل بنائے گئے۔[2] دہلی پر انگریزوں کا غلبہ ہوجانے کے بعد یہ میجر ہڈسن کی گولی کا نشانہ بنے اور ان کی لاش چاندنی چوک کوتوالی کے سامنے پھانسی کے تختے پر ایک رات دن سر بازار لٹکی رہی۔

بہادر شاہ ظفر عمر اور مزاج کے تقاضوں کی وجہ سے انقلابیوں کا پورا پورا ساتھ نہ دے سکے۔ ان پر انگریز نواز مصاحبوں کا اثر بھی تھا جو انھیں اکثر انقلابیوں کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود جہاں تک بن پڑا انھوں نے انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ثبوت ان کے متفرق اشعار سے بھی ملتا ہے۔

منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ 2 اگست 1857 کو بادشاہ نے دربار عام میں جس میں مولوی صدر الدین آزردہ وغیرہ جیسے اہل قلم بھی حاضر تھے، اپنے کہے ہوئے چند اشعار سنائے۔ یہ اشعار بعد میں جنرل بخت خاں کو بھیج دیے گئے۔ ان کا مفہوم یوں ہے:

"خدا کرے کہ دین کے دشمن تباہ و برباد ہوجائیں
خدا کرے کہ فرنگی نیست و نابود ہوجائیں
قربانیاں دے کے عید قرباں کے تہوار کو مناؤ
اور دشمن کو تہ تیغ کرو کہ کوئی بچنے نہ پائے"

لشکرِ اعدا الٰہی! آج سارا قتل ہو
گورکھا گوجر سے لے کر تا نصاریٰ قتل ہو

اس زمانے میں بہت سے 'جنگی اشعار' کہے گئے جو بطور نعرہ استعمال ہوتے تھے۔ انگریزوں کی فتح کے بعد لوگ ان کو سناتے ہوئے ڈرتے تھے، پھر بھی کہیں کہیں محفوظ رہ گئے:

ایک دو تین
گھوڑے کی زین
بھاگ جاؤ وارن ہیسٹنگز

ذیل کا شعر بھی زبان زد خاص و عام تھا:

لبالب پیالہ بھرا خون سے
فرنگی کو مارا بڑی دھوم سے

ساور کر سے روایت ہے کہ 'غدر' کے دنوں میں جب انقلابیوں کا زور کم پڑنے لگا تو کسی نے طنزاً کہا:

دمدمے میں دم نہیں اب، خیر مانگو جان کی
اے ظفر ٹھنڈی ہوئی شمشیر ہندوستان کی

بہادر شاہ ظفر نے جواب دیا:

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
تب تو لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

ظفر کا زمانۂ 'غدر' کا کہا ہوا کلام نہیں ملتا۔ یہ کلام حکیم احسان اللہ کے پاس ترتیب کے لیے جمع ہوتا تھا۔ جانے انھوں نے اسے غائب کردیا یا ہنگامہ میں تلف ہوگیا۔ یہی حالت رنگون کے زمانہ کے کہے ہوئے کلام کی ہے۔ ایک روایت ہے کہ ظفر اپنے ملاقاتیوں کو اپنا تازہ کلام تحفتہً پیش کرتے تھے۔ اس کلام نے اپنے زمانے میں بہت شہرت پائی اور سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچنے سے یہ اتنا بدل گیا کہ آج یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ اس کی اصل صورت کیا تھی۔ متداول غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ظفر کے اس زمانے کے کلام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان کے مخصوص حالات کی ترجمانی کرتا ہے اور اس میں وطنی و اجتماعی جذبات کا بڑا ہی پر سوز اظہار ہوا ہے:

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
بندھے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ یہ حسرت ان کے گلے پڑی
وہ جو کاکلیں تھیں بڑی بڑی وہ انھیں کے پیچ میں آگئے

نہ دبایا زیر زمیں انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشان مزار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے
نہ دبایا زیر چمن انھیں، نہ دی گور اور نہ کفن انھیں

کیا کس نے یاروں فن انھیں بے ٹھکانے جن کا مزار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن ولے سب طرح کا تھا یاں امن
سو خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے

عوامی لہجہ اور بعض لفظوں کے تلفظ سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار قریہ قریہ ڈنڈے والے گاتے ہوں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تصرف ہوتا رہا۔ ذیل کے اشعار بھی بہادر شاہ ظفر کے نام سے مشہور ہیں:

کتنا ہے بدنصیب ظفر بعد مرگ بھی
دو گز زمین تک نہ ملی کوئے یار میں

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

(کہاجاتا ہے کہ ظفر کے نام سے مشہور یہ شعر دراصل مضطر خیر آبادی کا ہے۔)

ان شاعروں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا، اردو کے چند اور شاعروں نے بھی 'غدر' کے بعد دہلی کی ابتری اور زبوں حالی پر اپنے گہرے درد و غم کا اظہار کیا ہے۔ یہ بھی دہلی کے رہنے والے تھے، لیکن غدر کے سلسلے میں ان کے پورے حالات معلوم نہیں۔ ان شاعروں کے نام یہ ہیں:

قاضی فضل حسین افسردہ، حکیم تجمل حسین خان تجمل، محمد علی تشنہ، حکیم محمد تقی سوزاں، صفیر دہلوی، حکیم آغا جان عیش، بشن پرشاد فرحت، باقر علی خاں کامل، غلام دستگیر مبین، حکیم محمد محسن خاں محسن۔

یوں تو دہلی کے اجڑنے پر اپنے تاثرات کا اظہار ان میں سے چند نے غزلوں اور قطعوں میں بھی کیا ہے لیکن ان کی اہمیت ان کے شہر آشوبوں کی وجہ سے ہے اور یہاں انھیں کا ذکر مطلوب ہے۔ غزلوں کی بحث آگے آئے گی۔ یہ شہر آشوب زیادہ تر مسدس کی شکل میں ملتے ہیں۔ مخمس صرف صفیر اور فرحت نے کہے ہیں۔ افسردہ، تشنہ، سوزاں، کامل کا ایک ایک، عیش کے دو اور مبین کے تین مسدس ملتے ہیں۔ تجمل نے اکیس شعروں کا ایک بڑا موثر قطعہ بھی کہا ہے۔ عیش کے مسدس زیادہ وقیع نہیں۔ ان میں درد و اثر کی کمی ہے۔ سوزاں کا طویل مسدس بھی کمزور ہے۔ مبین کے ہاں گو طوالت ہے لیکن سوز و گداز کی کمی نہیں۔ اس نے حکیمانہ نظر کا بھی ثبوت دیا ہے اور اس سیاسی و معاشرتی بحران کے اسباب و علل کا پتا چلانے کی کوشش بھی کی ہے۔ کامل کا مسدس مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ محسن نے بعض تاریخی جزئیات کی خوب خوب تفصیل دی ہے، جس سے نظم میں واقعیت کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ لیکن ایک خصوصیت ان سب نظموں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ یہ کہ ان میں تقریباً ہر ایک شاعر نے 'غدر' کے مصائب و ابتلا کی خونچکاں داستان کے کسی نہ کسی واقعاتی پہلو کو بھی بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ شہر آشوب جن میں آزردہ، داغ اور ظہیر کے شہر آشوب بھی شامل کیے جاسکتے ہیں، اردو میں اپنی قسم کی پہلی چیز ہیں۔ ان میں دہلی کی سیاسی و مجلسی زندگی کے زوال اور اختلال کا ذکر ہجو کے پیرائے میں نہیں بلکہ مرثیے کے انداز میں کیا گیا ہے۔ غم انگیز جذبات یوں بھی پرتاثر ہوتے ہیں، لیکن جب اپنے ہی برباد ہونے کی داستان ہو تو اس کی اثر آفرینی کی حد نہیں۔ کہیں کہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ دل خون ہوگیا ہے اور آہوں اور نالوں نے کاغذی پیرہن اختیار کرلیا ہے۔

ان شہر آشوبوں میں شاعروں کا انفرادی تاثر نمایاں ہے۔ ہر کسی نے اپنے مخصوص حالات، مزاج اور طبیعت کے مطابق زوال اور اختلال کی اس داستان کو بیان کیا ہے۔ کسی نے المیہ کے صرف شاعرانہ ذکر پر اکتفا کیا ہے، کسی نے حکیمانہ نظر سے کام لیا ہے اور کسی نے ان واقعات کو مورخانہ نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ کوئی ایک بات سے مغموم ہے تو کوئی دوسری سے۔ کوئی دربار سے وابستہ تھا، کوئی بازار سے اور کوئی خانقاہ سے۔ کسی کو قلعہ کے اجڑنے کا غم ہے اور کسی کو یہ دکھ ہے کہ دہلی کی تہذیبی اور معاشرتی برتری مٹی میں مل گئی اور یہاں کے آثار و عمارات کا نقش تک باقی نہ رہا۔ کوئی اس بات کے لیے تڑپ رہا ہے کہ دہلی کی شستہ و پاکیزہ زبان اب کہاں؟ اب نہ وہ علمی مجلسیں ہیں نہ وہ ادبی ہنگامے۔ کوئی علم و کمال کا نوحہ خواں ہے، کوئی مال و متاع کے لٹ جانے کے صدموں سے جلا بیٹھا ہے، کسی کے دل پر احباب کی مفارقت کا داغ ہے، کسی کی آنکھیں زن و فرزند کے بے گناہ قتل کی یاد میں تر ہیں۔ غرض ان شہر آشوبوں میں ایک واقعے اور ایک محل کے باوجود مزاج کی رنگارنگی اور حالات کے تنوع کی وجہ سے ان تمام مصائب کا پورا پورا ذکر آگیا ہے جو انگریزوں کے غلبے کے بعد دہلی اور اہل دہلی پر نازل ہوئے تھے۔ ہر کسی نے اپنے چشم دید حالات کو من و عن بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ دل کا درد ہے، کسی نہ کسی صورت زبان پر آہی گیا ہے۔ چنانچہ انگریزوں کے ظلم و ستم اور دہلی کی بدحالی کی داستان کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ہو جس کا ذکر ان شہر آشوبوں میں نہ ملتا ہو۔ مثال کے طور پر چند بند ملاحظہ ہوں:

پسند خاطر ہر خاص و عام تھی دہلی
طلسم دل کش و جنت مقام تھی دہلی
طرب فزائے جہاں صبح و شام تھی دہلی
گل خوشی سے معطر تمام تھی دہلی
اجاڑا ایسا چمن جس کے غم سے دل ہے خوں
مٹے خزاں کی ہوا خاک میں ملے گردوں

ہر ایک سو ہے یہ غارت گری سے بیگانہ
کہ مثل دیدۂ گریاں ہے ہر در خانہ
رُلا رہا ہے فرشتوں کو بھی یہ افسانہ
نہ وہ ہے گھر نہ وہ محفل نہ شمع و پروانہ
بنا ہے گنج شہیداں بسانِ خرمنِ گل
فرشتے نعش پہ اب نالہ کش ہیں چوں بلبل

قیامت آئی قیامت سے کس لیے پہلے
دکھائے کس لیے قسمت نے حادثے ایسے
جو غم نہ سہنے کو جی چاہے آنکھ سے دیکھے
کہاں تلک کوئی روئے کہاں تلک پیٹے
کہیں پدر ہے تڑپتا کہیں پسر بے تاب
غضب ہے تفرقہ پرداز چرخ خانہ خراب

گھر ایسے لٹ کے ہوئے ہیں خراب کیا میں کہوں
کہ جیسے خشک ہوں بے اشک دیدۂ پرخوں
نہ زر نہ سیم نہ پوشاک نے ور مکنوں
لبوں پہ آتے ہیں اب نالہ دل محزوں
جو ورفشاں تھی کف دست ہے خزف آگیں
گہر جو دیتے تھے کوڑی بھی ان کے پاس نہیں

نہ دیکھا تھا جو ستم وہ فلک سے اب دیکھا
یہ وہ ہے حادثہ جس سے جگر بھی ٹکڑے ہوا
پدر کے سامنے بیٹے کو قتل ہائے کیا
غم آئے یاد نہ کیوں کر جناب اصغر کا
یہ کربلا کا نمونہ دکھاتی ہے دہلی
پدر کو نعشِ پسر پہ رلاتی ہے دہلی

مبین

کہاں وہ تاج کا مالک کہاں ہے وہ دربار
کہو کدھر گئی دیوانِ خاص کی وہ بہار
اب اس کے دیکھے جو اجڑے ہوئے در و دیوار
یہ جی میں آئی کہ سر پھوڑ اور چیخیں مار
ہے پارہ پارہ جگر کیسی دل فگاری ہے
بجائے اشک جو آنکھوں سے خون جاری ہے

ہمیشہ عطر جو پوشاک میں لگاتے تھے
بدلتے شام و سحر جوڑے اور بساتے تھے
تھی نکہت ایسی کہ اس سے نہ تاب لاتے تھے
خجل ہو گل کف افسوس ملتے جاتے تھے
وہ دیکھو پیرہن آلودہ خاک پھرتے ہیں
کہاں ہے جیب گریبان چاک پھرتے ہیں

وہ نازنیں کہ نزاکت بھی دیکھ گھبراوے
کہ جس کی بستر گل پر سے نیند اڑ جاوے
گمان میں جو نہ ہو کیا خیال میں آوے
لکھا ازل کا جو تقدیر سامنے لاوے
پکڑ کے زلف کیا ان کو قتل ننگے سر
صبا کے چھوئے سے جو ہوتے تھے پریشاں تر

برہنہ پا کوئی نکلا کوئی گریباں چاک
کسی کی چشم تھی گریاں کسی کے سر پر خاک
ہر ایک بید سا لرزاں تھا باول غم ناک
تھی دشمنوں کی بھی ہر سمت سے یہ ان پر تاک
قدم نہ اٹھتا تھا جو وہ قدم اٹھاتے تھے
ہزاروں ٹھوکریں کھاتے تھے گرتے جاتے تھے

سوزاں

یہ وہ ہی چوک ہے میلہ تھا جس جگہ ہر روز
یہاں تو رہتے تھے مہ طلعتان دل افروز
نظر کو ہوتی تھی کیفیت سرور اندوز
جدھر کو دیکھتے تھے اک بہار کلفت سوز
نشان بھی نہیں اب تو ہجوم خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقام عبرت کا

کامل

وہ لال جوڑے پہن کر کوئی نکلتے تھے
وہ بانکپن سے اٹھا پائنچوں کو چلتے تھے
وہ ہاتھ پاؤں میں مہندی کو اپنے ملتے تھے
وہ بات بات میں انداز سے مچلتے تھے
ہوئے ہیں رنج و تردد میں اب تو وہ محبوس
بجائے مہندی کے ملتے ہیں وہ کف افسوس

وہ لوگ بستر سنجاب پر جو سوتے تھے

سحر گلاب سے جب منہ کو اپنے دھوتے تھے
تمام عمر کو لہو و لعب میں کھوتے تھے
وہ بال بال میں موتی سدا پروتے تھے
اب ان کا حال تباہی سے ایسا ابتر ہے
بچھونا خاک ہے اور خشت بالش سر ہے
بنے ہوئے تھے وہ چوپڑ کے چوک میں بازار
کہ جیسے چار چمن ہوں یہ سطحہ گلزار
ہر ایک دیدہ آئینہ روشن و ہموار
تجل تھا جن سے خط عارضان گل رخسار
ہر اک دکان میں بیٹھا ہوا ہے فریادی
ٹپک رہی در و دیوار سے ہے بربادی
سناتے پھرتے تھے سقے کٹوروں کی جھنکار
وہ گل فروشوں کے پھولوں کے ٹوکروں کی بہار
وہ سودا بیچتے تھے لوگ واں پکار پکار
وہ پھرنا خوانچہ والوں کا واں قطار قطار
رکھا تھا دہلی کا لوگوں نے نام عشق آباد
بسان خانۂ عاشق وہ ہوگئی برباد

محسن

اردو شاعروں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے، جنھوں نے وطن کی بربادی سے متعلق اپنے دردوغم کا اظہار غزلوں کے ذریعے کیا ہے۔ ان میں سے اہم یہ ہیں: شہاب الدین ثاقب، داغ، مرزا حسین علی خاں راقم، قربان علی بیگ سالک، مصطفیٰ خاں شیفتہ، قادر بخت صابر، ظہیر الدین ظہیر، باقر علی خاں کامل اور میر مہدی مجروح۔

ان شاعروں میں سے اکثر کی غزلوں کا تعلق غالباً اس عظیم الشان مشاعرے سے ہے، جو اس خونیں ہنگامے کے بعد دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس یادگار مشاعرے کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ البتہ معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے یہ روایت ہے کہ دہلی میں امن وامان قائم ہوجانے کے بعد یہاں کے لوگوں نے ایک مشاعرہ کیا جس میں اس وقت کے بیشتر اساتذہ نے شہر کی تباہی کا رونا رویا تھا۔ (بگا بیگم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا نکاح زین العابدین خاں عارف کے بڑے بیٹے باقر علی خاں کامل سے ہوا تھا۔ تاریخ وفات 10 مئی 1945 ہے) مصرع طرح تو معلوم نہیں ہوسکا، لیکن زمین شانِ دہلی زبانِ دہلی تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کتنے شاعروں نے مشاعرے میں شرکت کی۔ بہرحال ان میں سے ستائیس کی طرحی غزلیں 'فغان دہلی' میں جسے تفضل حسین خان کوکب نے مرتب کیا تھا محفوظ ہوگئی ہیں (کوکب کے حالات نہیں ملتے۔ البتہ فغان دہلی کی تقریظ سے جو قربان علی بیگ سالک نے لکھی ہے، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کوکب بااستعداد آدمی تھے اور مختلف علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ وہ خود کو غالب کا شاگرد بتاتے ہیں۔ فغان دہلی میں جہاں ان کی غزل درج ہے اس کے آگے یہ عبارت ملتی ہے "از خوشہ چینان وزلہ ربایان مرزا اسداللہ غالب۔" 'فغان دہلی' کے اب تک چار ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ پہلا اکمل المطابع دہلی سے 1863 میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا اس کے کچھ ہی سال بعد مطبع مرتضوی دہلی سے چھپا۔ یہی کتاب معمولی اضافوں کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے 1931 میں تیسری بار فریاد دہلی کے نام سے شائع ہوئی۔ فغان دہلی کا چوتھا ایڈیشن اکادمی پنجاب لاہور نے 1954 میں شائع کیا۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ 1862 لٹن لائبریری علی گڑھ میں محفوظ تھا جس سے استفادہ کیا گیا)۔

اس مشاعرہ کی تاریخی اہمیت تو ہے ہی، ادبی لحاظ سے بھی یہ اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع تھا جس میں کم وبیش تیس شعرا نے مل کر ایک واقعاتی موضوع پر طبع آزمائی کی جو نوعیت کے اعتبار سے فقط انفرادی یا ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی وقومی تھا۔ تجل اور کامل نے دو غزلے کہے۔ راقم نے صرف مطلع پر اکتفا کی۔ شائق کی طرحی غزل فارسی میں ہے۔ احسن نے بھی طرحی اردو غزل کے علاوہ ایک غزل فارسی میں بھی اس زمین میں کہی۔ اکرام اور عیش کی غزلوں کی زمین تو یہی ہے لیکن بحر مختلف ہے۔ ممکن ہے اس مشاعرے کے لیے دو طرحیں دی گئی ہوں یا شاید اس سے ملتا جلتا کوئی اور مشاعرہ بھی اس زمانے کے لگ بھگ ہوا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان شاعروں نے اپنے طور پر اس زمین میں غزلیں کہی ہوں۔ ان طرحی غزلوں کے علاوہ کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جو اس زمانے میں فرداً فرداً کہی گئیں۔ ان غیر طرحی غزلوں میں سے تین غزلیں عیش کی ہیں، ایک مبین کی اور ایک تجل کی۔ عیش کی تیسری غزل میں دہلی کے علاوہ لکھنؤ کی بہار رفتہ کا بھی ماتم کیا گیا ہے۔

ان غزلوں میں سے چند کے حوالے پہلے دیے جاچکے ہیں۔ انھیں اور تجل اور مبین کی غیر طرحی غزلوں کو چھوڑ کر باقی میں سے اکثر غزلیں احساس کی اس شدت سے خالی ہیں جس کی نظیر شہر آشوبوں میں ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ غزلیں نسبتاً بعد میں لکھی گئیں اور دوسری یہ کہ شہر آشوبوں کی طرح یہ بے ساختہ زبان پر نہیں آئیں، بلکہ مشاعرے کی خاطر کہی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں بجائے آمد کے آورد زیادہ ہے۔ ردیف اور قافیے کی قید سے

خارجی واردات کا تفصیل سے بیان کرنا کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ ان غزلوں سے ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ایک ہی مضمون بار بار بندھا ہے۔ تکرار اور توارد کی مثالیں بھی کثرت سے ہیں۔ عام طور پر ان غزلوں میں بیان دہلی اور زبان دہلی کا ماتم ملتا ہے۔ 'غدر' سے پہلے کی دہلی کی تعریف اور پھر اس کے اجڑنے کا ذکر رسمی اور روایتی ہے اور اثر و تاثیر سے مملو نہیں۔ سیاسی انتشار اور معاشی زوال کی طرف بھی شاعروں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ واقعات کے تنوع اور واردات کی وسعت سے جو بے پایانی شہر آشوبوں میں پیدا ہو گئی ہے، زیادہ تر غزلیں اس سے خالی ہیں۔ ان میں درد و کرب کی فضا برائے نام ہے اور اس کا اثر دیرپا نہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ شعر البتہ ایسا نکل آتا ہے جہاں شاعر نے رمز و کنایے کے پردے میں اپنا دل کھول کے رکھ دیا ہے:

آل فرعون کے جوں ظلم سے آل موسیٰ
ایسے بے کس ہوئے افسوس کسان دہلی
کونسا غنچۂ دل تھا کہ نہ پژمردہ ہوا
ہند میں ایسی چلی باد خزان دہلی

ممتاز حسین احقر

بسکہ گلزار ہے زخموں سے تن اک عالم کا
بن گئی موسم گل فصل خزان دہلی

قادر بخش صابر

اب جو دلی ہوئی آباد تو کیا خاک ہوئی
جن سے زینت تھی کہاں ہیں وہ جوان دہلی

محمد محسن خاں محسن

نہیں بچنے کا پڑے گا بے شک
'چرخ' کی جاں پہ وبال دہلی

جمل حسین جمل

اس جائزے سے ظاہر ہے کہ سنہ ستاون کے واقعات کے خلاف اردو شاعروں کا ردعمل مختلف اور متنوع طریقوں سے ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہر شاعر ایک سا شعور اور ایک سا احساس نہیں رکھتا۔ مختلف ذہنی اور سماجی رابطوں کی وجہ سے بھی 'غدر' کے واقعات سے متعلق اردو شاعروں کا طرز فکر الگ الگ رہا۔ اکثر نے سیاسی وجوہ کا ذکر نہیں کیا۔ جو کوئی حقیقت حال سے آشنا تھا، اپنے مستقبل کو انگریزوں سے وابستہ دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کی۔ کسی نے ایک قدم آگے بڑھ کر انقلابیوں کی مذمت کی اور انگریزوں کی مدح سرائی اختیار کی۔ تاہم چند شاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے غدر کے اسباب و علل پر غور کیا تھا اور اسے آزادی کی جنگ سمجھ کر اس میں شریک ہوئے تھے۔ ایسے شاعروں میں سے منیر شکوہ آبادی، محمد حسین آزاد اور بدایوں کے اشرف علی نفیس [1] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (اشرف علی نفیس، نجف خاں بدایونی کے فرزند تھے۔ مولانا فضل رسول سے تلمذ تھا۔ ان کا یہ مصرع بدایوں میں آج تک مشہور ہے، 'لو ہے سے بہت ڈرتی ہے سرکار ہماری'۔ 'غدر' کے بعد انگریزوں نے انھیں پھانسی پر چڑھا دیا۔ روایت: فرخ جلالی بدایونی) منیر اور آزاد کے کلام کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ انگریزوں سے شدید نفرت رکھتے تھے، انقلابیوں کی کامیابی سے خوش تھے اور فتح کے موقعوں پر تاریخیں کہتے تھے۔ اس کے برعکس غالب اور ظہیر جیسے کچھ شاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ذاتی مجبوریوں کی بنا پر انگریزوں سے مراعات پانے کے لیے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا اور 'غدر' کی مذمت کی۔

لیکن جہاں تک وطنیت کے تصور کا تعلق ہے، وہ بنیادی طور پر ان دونوں طرح کے شاعروں کے ہاں ایک ہی ہے۔ بظاہر اس میں بوالعجبی معلوم ہوتی ہے کہ وہ شاعر جو انگریزوں کے خیر خواہ تھے اور وہ جو انگریزوں کے مخالف تھے ان کا اساسی نظریہ ایک کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ اصل چیز انگریزوں کی مدح یا قدح نہیں بلکہ وہ نقطہ نظر ہے جس سے یہ لوگ 1857 کے واقعات کو دیکھتے تھے اور یہ نقطۂ نظر ان دونوں کے ہاں تقریباً ایک ہی ہے۔ ان کے بیانات میں بظاہر جو تضاد ہے، وہ دراصل نقطۂ نظر کا نہیں بلکہ ان تاریخی حالات کا ہے، جن میں یہ منظومات کہی گئیں۔ اردو کے وہ اشعار جن میں انگریز دشمنی کی بو آتی ہے۔ اس زمانے کی چیز ہیں جب انقلابیوں کا ستارہ عروج پر تھا اور ان شاعروں کو اظہار رائے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ تمام کلام جس میں پوربیوں اور تلنگوں کو برا بھلا کہا گیا ہے اور 'غدر' کی مذمت کی گئی ہے اس زمانے کا ہے جب انگریز فتح یاب ہو چکے تھے اور ان کے جور و ستم کا بازار گرم تھا۔ ہندستانیوں کا خون اس وقت اس قدر سستا ہو گیا تھا کہ معمولی سے بہانے پر انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ محلے کے محلے ڈھائے جا رہے تھے اور ہزار ہا گھر ویران پڑے تھے۔ ایسے میں کس دیوانے کی شامت آئی تھی کہ انگریزوں کے خلاف اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتا۔ پھر یہ کہ ہر اہل قلم اہل سیف نہیں ہوتا۔ فضل حق خیر آبادی نے تو حق گوئی کی خاطر عمر قید برداشت کر لی، لیکن آزردہ نے جب پانسہ پلٹا ہوا دیکھا تو جاں بخشی کے لیے اپنا بیان بدلنے سے بھی گریز نہ کیا۔ آزردہ تو در کنار، جس کسی نے بھی انگریزوں کے غلبے کے بعد غدر کے موضوع پر قلم اٹھایا، انگریزوں کی خیر خواہی کے لیے 'غدر' کی مذمت کی

ہے۔(ملاحظہ ہو فریاد دہلی، ص 46۔63 اور 67 نیز ملاحظہ ہو قصیدہ غالب ''شمار ریافت روزگار یافت'' بشمول ''دستنبو'' جبکہ یہ حقیقت اب معلوم ہو چکی ہے کہ غالب نے بھی شورش کے دنوں میں قلعۂ معلّی سے رابطہ رکھا تھا اور بادشاہ کی شان میں سکہ شعر بھی کہا تھا۔ر.ک.ضمیمہ)

لیکن ان بیانات کو جوں کا توں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ باتیں حالات سے مجبور ہو کر کہی گئی ہیں۔ غور سے دیکھیے تو انھیں نیم صداقتوں کے لب و لہجے سے دلی رجحانات کا راز کھل جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن شاعروں نے 'غدر' میں حصہ لیا اور وہ بھی جنھوں نے نہیں لیا سب کے دل رنج و محن سے چور تھے۔ اپنے معاشرے کی تباہی اور اقتصادی بدحالی کا اکثر شاعروں کو احساس تھا اور اس بنا پر دل ہی دل میں یہ سب انگریزوں سے خائف تھے اور ان کے انسانیت سوز مظالم سے نالاں تھے، ورنہ وہ اپنے کلام میں اپنی تباہی اور زبوں حالی کا اتنے بڑے پیمانے پر کبھی ماتم نہ کرتے۔ فغان دہلی کی تقریظ میں قربان علی بیگ سالک نے لکھا ہے: ''ایسا انقلاب ظہور میں آئے زبان پر کوئی مہر نہیں ہے کہ گویائی سے باز رہے اور دل پر کچھ زور نہیں کہ درد سے بھر نہ آئے اور اظہار درد شاعرانہ نہ کیا جائے... کس کی طاقت ہے کہ سنے اور نہ روئے، کس کا جگر ہے کہ اس درد سے خون نہ ہوئے۔ جب کوئی کسی کا شعر اس باب میں سنا جاتا ہے، کان گنگ ہو جاتے ہیں، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔'' یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت وطنیت کا کوئی واضح سیاسی تصور نہیں تھا۔ سیاسی آزادی اس زمانے میں مذہبی اور تہذیبی آزادی کی شکلیں اختیار کرتی تھی۔ چنانچہ اردو شاعر بھی وطن کی سیاسی اور اقتصادی تباہ حالی کے لیے غیر ملکی حکومت یا اپنی غلامی کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنی تقدیر کو کوستے ہیں۔ اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے فقط دعاؤں میں یقین رکھتے ہیں یا پھر ان دردناک حالات میں جینے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی

آزردہ

جیسے جیسے ہم نے گنہ کیے
یہ انہیں گناہوں کا بار ہے

حسامی

زحل کی آنکھ بڑی اتفاق سے ناگاہ
تمام ہو گیا تاراج ملک و مال اور جاہ

تشنہ

کہیں یہ کس سے کہو کس کی تھی یہ گمراہی
ہے اپنی زشتیِ اعمال کی یہ رسوائی

سوزاں

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

مبین

کوئی ظاہر میں نہ تھا اس کی خرابی کا سبب
اپنے اعمال ہوئے آفت جانِ دہلی

ظاہر

تجھے کچھ خبر بھی ہے بے خبر
کہ یہ بخت بد کا ہے سب اثر

فرحت

سنہ ستاون کی جدوجہد ہندستانی تاریخ کی طرح اردو ادب میں بھی قدیم اور جدید کے درمیان حد فاصل قائم کرتی ہے۔ جدوجہد کی ناکامی سے ملک میں شکست خوردگی کی عام فضا میں انگریزوں کے مظالم اور دہشت انگیز کارروائیوں نے شدید خوف و ہراس کی ایسی لہر کا اضافہ کیا کہ لوگ انگریزی حکومت سے چھٹکارا پانے کو خواب و خیال سمجھ کر بھول گئے۔ اس ہنگامے کے بعد ربع صدی تک ہندوستان بالکل بے جان اور بے روح زندگی بسر کرتا ہے۔ چند مذہبی رہنماؤں اور قدامت پسندوں کے سوائے زیادہ تر لوگوں نے سنہ ستاون کی شکست کو حتمی سمجھ کر اس تاریخی و عمرانی تبدیلی کو چار و ناچار قبول کرنا شروع کیا۔ یہ تبدیلی سنگین و ناگزیر حقیقت تھی اور اسے روک سکنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ اس نے جہاں ادب اور معاشرت میں پرانی بساط تہ کردی، وہاں نئے اثرات کے لیے بھی راستہ صاف کردیا۔ عوام کے لیے اب سوائے اپنے کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جو لوگ قوم اور وطن کا درد رکھتے تھے، ان کے لیے بھی آگے بڑھنے کا راستہ صرف یہی تھا کہ نئی حکومت سے مفاہمت کی جائے اور انگریزی تعلیم نئی سائنسی اور مشینی ترقی اور مغربی تصورات سے اپنے ذہن کی حدود کو وسیع کیا جائے اور انگریزی حکومت کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے انگریزوں سے مراعات حاصل کی جائیں۔ یہ صورت حال انیسویں صدی کے آخر تک بنی رہی۔ حب وطن کا وہ تصور جو آج ہمارے پیش نظر ہے، بعد میں پیدا ہوا۔

OO

'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' مصنف: گوپی چند نارنگ سے

شاعری کا جائزہ

ناکام بغاوت اور اردو شعرا

محمد ارشد

■

1857 کا واقعہ ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنے بڑے سانحہ سے اردو شعرا بے نیازانہ گذر جائیں اور اپنی اور دوسروں کی سرگزشت کو صفحۂ قرطاس پر نہ لائیں۔ اگرچہ مورخین کا خیال ہے کہ اس کا بیشتر حصہ تلف ہوگیا ہے۔ ویسے بھی اس تحریک کے بعد انگریزوں نے ظلم وستم کا جو بازار گرم رکھا تھا اس کے بعد ایسی شاعری کے باقی رہ جانے کا کیا امکان تھا۔ معلوم نہیں کتنا ذخیرۂ ادب ان حالات کی نذر ہو گیا۔ پھر بھی آج بھی ایسی بے شمار نظمیں موجود ہیں جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

■

ہندوستان کی تہذیبی وسیاسی تاریخ میں 1857 کا دور ایسا گذرا ہے جب اس ملک کو ابتلا وآزمائش کے عظیم سمندر سے دوچار ہونا پڑا اور جس کے عقب میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

اگر اس پس منظر میں اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری تاریخی قوتوں اور ولولوں کی اس کشاکش کی آئینہ دار ہے، جو اس وقت کارفرما تھے جس وقت انگریز ہندوستان میں اپنی بنیادوں کو مستحکم کر رہے تھے۔ ہر قسم کے جذبات وخیالات خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے ہوں، تصوف کے پیرائے میں بیان کئے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثرات بڑھتے گئے اور ان کے اغراض ومقاصد ہندوستانی عوام سے متصادم ہونے لگے تو اردو شعرا وادیبوں کو بھی نئی صورت حال کی نزاکت کی آگہی ہونے لگی۔ اس زمانے کی اردو شاعری میں اس کے اثرات جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں سیاسی وقومی شاعری کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہیں رمز وایما کے پردے میں اور کہیں کہیں صاف واقعاتی، سیاسی اظہار کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتنے اشعار ایسے ہیں جو غزل کی رمزیت کا شکار ہوگئے جن کے سیاسی محرکات کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔ پھر بھی شاہ حاتم، سودا، میر، مصحفی اور راسخ عظیم آبادی نے اپنے شہر آشوبوں میں ملک کی ابتری، معاشی پریشانی اور یہاں کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ دراصل آنے والی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ ان شعرا کے شہر آشوبوں میں یہاں کے کوچہ وبازار کی بے رونقی، عمارتوں کی شکست وریخت، سلطنت کی ابتری، عوام کی پریشانی اور اقدار وروایات کے ٹوٹنے بکھرنے کا جو نقشہ ملتا ہے وہ بڑا ہی دردناک ہے۔ میر کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے غزلیں نہیں کہیں بلکہ دل اور دلّی کے مرثیے کہے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں جو سوز وگداز اور تڑپ ہے وہ دراصل انہی

حالات کا نتیجہ ہیں۔ جنگ پلاسی کے موقع پر نواب سراج الدولہ کی شہادت پر راجہ رام نرائن موزوں کا یہ شعر اس صورت حال کی مؤثر ترجمانی کرتا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

اسی طرح ہندوستان کے معاشی استحصال پر مصحفی کا یہ شعر انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور زیادتیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

غرض بغاوت سے قبل ہی اردو شاعری پر انگریز دشمنی کے خیالات کا اثر پڑنے لگا تھا۔ پھر بغاوت رونما ہوئی اور ظلم و تشدد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ بغاوت کا اثر سب سے زیادہ دہلی میں رہا۔ اس وقت دہلی اردو شعر و ادب کا مرکز تھی۔ اس لئے اردو شاعروں نے دہلی کے زوال کو دیکھا ہی نہیں بلکہ اس سے گزرے بھی۔ اپنے طبقے و تمدن کی بگڑتی ہوئی حالت سے وہ بے خبر نہیں تھے۔ بلکہ انقلاب کے دنوں میں انہوں نے دہلی کی بدلتی ہوئی صبح و شام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ قلعہ کی تباہی اور شہر پناہ کی بربادی ان کی اپنی داستان تھیں۔ ان میں کچھ ایسے تھے جو ان واقعات کے ساحل کے تماشائی نہیں رہے بلکہ اس دریائے خون کے شناور بن گئے۔ کئی ایسے تھے جو اس جنگ کی آویزش و پیکار کی زد میں آئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں اس تحریک سے وابستگی کی بنا پر مرحلۂ دار و رسن سے گذرنا پڑا۔ متعدد شاعروں نے قربانیاں دیں، مصیبتیں کہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مغلیہ حکومت کے آخری دور میں اردو شاعری پر عشقیہ مضامین اور روایتی شاعری کا غلبہ تھا۔ ملک پر برطانوی قبضہ کے بعد یہ شاعری سماجی و سیاسی شعور حاصل کرنے لگی۔ چنانچہ مختلف شاعروں نے انگریزوں کے خلاف نفرت کا اظہار کیا ہے اور اپنی تخلیقات میں روح عصر کو بڑی فنکارانہ بصیرت اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

1857 کا واقعہ ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنے بڑے سانحہ سے اردو شعرا بے نیازانہ گذر جائیں اور اپنی اور دوسروں کی سرگزشت کو صفحۂ قرطاس پر نہ لائیں۔ اگرچہ مورخین کا خیال ہے کہ اس کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا ہے۔ ویسے بھی اس تحریک کے بعد انگریزوں نے ظلم و ستم کا جو بازار گرم رکھا تھا اس کے بعد ایسی شاعری کے باقی رہ جانے کا کیا امکان تھا۔ معلوم نہیں کتنا ذخیرۂ ادب ان حالات کی نذر ہو گیا۔ پھر بھی آج بھی ایسی بے شمار نظمیں موجود ہیں جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

اردو شاعری میں بغاوت کے سیدھے سادے حوالے بہت کم ہیں، لیکن اقتصادی لوٹ کھسوٹ، دلی کی بربادی، اقدار و روایات کے ٹوٹنے بکھرنے، ایک تہذیب کے نیست و نابود ہونے اور ایک نظام کے ختم ہونے کی طرف بکثرت اشارے ملتے ہیں۔ سچ مچ اردو شاعروں نے خون کے آنسو روئے ہیں۔ ان نغموں میں نوحہ ہے دلی کی بربادی کا، دلی کے مٹتے ہوئے نظام کا۔ اردو شاعروں نے بار بار اس غم کا اظہار کیا ہے کہ اغیار نے نہ صرف اس عظیم ملک کو تباہ کر دیا بلکہ اس کی عزت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے اس دور کے شاعروں کی تخلیقات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ان شاعروں میں صہبائی، آزردہ، واجد علی شاہ اختر، بہادر شاہ ظفر، غالب، ظہیر دہلوی، منیر شکوہ آبادی، محمد حسین آزاد، داغ اور حالی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

غدر کے وقت صہبائی دہلی کے کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ انگریزوں کے دہلی پر قابض ہونے کے بعد اس کوچہ پر جو مصیبت نازل ہوئی، صہبائی نہ صرف اس کی زد میں آئے، بلکہ ان کے پورے خاندان کا صفایا ہو گیا۔ بقول خواجہ حسن نظامی: ''اس قتل عام میں صہبائی کے کنبہ کے کل 21 افراد قتل ہوئے۔''[1]

اس سے متاثر ہو کر آزردہ نے ایک شہر آشوب لکھا۔ اس میں انھوں نے اپنی خانہ ویرانی کے ساتھ ساتھ، اہل شہر کی بے سروسامانی نیز صہبائی و مصطفیٰ خاں شیفتہ جو اس ہنگامہ کی شورش کی زد میں آئے کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ اس کے ذکر سے آج بھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیونکر آزردہ نکل جائے جو سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اس واقعہ کا اثر نہ صرف دہلی میں رہا بلکہ اودھ بھی جو فن و تہذیب کا بڑا مرکز تھا، اس کی زد سے محفوظ نہ رہا۔ اس واقعہ سے تین سال پہلے ہی اودھ کو انگریزوں نے اپنے اقتدار میں شامل کر لیا تھا۔ واجد علی شاہ معزولی کے بعد مٹیا برج کلکتہ میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ اودھ کو انگریزوں نے جب اپنی محروسات میں شامل کر لیا تو بقول عبدالحلیم شرر:

''سننے والوں کے کلیجے پاش پاش ہو گئے۔''[2]

دراصل واجد علی شاہ کی معزولی اور اودھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط انگریزوں کی ملک گیری کے سلسلے کہ ایسی کڑی ہے، جس سے متاثر ہو کر ہندوستانی عوام نے انگریزوں کے خلاف بغاوت چھیڑ دی تھی۔ واجد علی شاہ اختر نے بحالت قید فرنگ ایک مثنوی 'حزن اختر' کہی۔ اس میں انھوں نے سلطنت کے انتزاع کی داستان، اپنے سفر کلکتہ اور راستے کی پریشانیوں اور قید و بند کی صعوبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے اودھ کی ضبطی اور بادشاہ کی معزولی سے عوام کس درجہ رنجیدہ خاطر تھے اور انہیں اپنے بادشاہ کی معزولی کا کتنا قلق تھا۔ پیش ہیں چند اشعار:

ہوئے بند در قید خانے کے جب
لکھوں کیا جو گذرا ستم اور غضب
کلیجہ مرا منہ کو آ آ گیا
رکا دم جو سینہ میں گھبرا گیا
کوئی رنج زنداں میں ایسا نہیں
جو اس بے سروپا کو پہنچا نہیں
مگر درد فرقت ہے سب سے سوا
ہر اک غم دیا ہے اسی نے بھلا

غدر کے واقعات میں اردو شاعری کا جو حصہ ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس ہنگامے کے بعض سرکردہ لوگ تاجدار تھے۔ بہادر شاہ ظفر جو مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار تھے ناچار اس میں ملوث ہو گئے۔ دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے بحالت قید اپنی زندگی کے باقی ایام گذارے۔ ان کے غدر کے زمانے کے کلام کا پتہ نہیں ملتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ اس ہنگامے کی نذر ہو گیا ہے۔ 'اردو میں قومی شاعری کے سو سال' مرتبہ علی جواد زیدی میں ان سے منسوب ایک شہر آشوب اور کچھ متداول غزلیں ملتی ہیں جو بحالت قید رنگون میں لکھی گئی تھیں۔ بقول گوپی چند نارنگ:

''بہادر شاہ ظفر عمر اور مزاج کے تقاضوں کی وجہ سے انقلابیوں کا پورا پورا ساتھ نہ دے سکے۔ اس کے باوجود جہاں تک ان سے بن پڑا انہوں نے انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کی۔''[3]

اس کا اندازہ ان کے متفرق اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا اک چمن، کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
نہ دبایا زیر زمیں انہیں نہ دیا کسی نے کفن انہیں
نہ ہوا نصیب وطن انہیں نہ کہیں نشان مزار ہے
کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

دہلی کے اجڑنے کی داستان ظفر نے اپنی متعدد غزلوں میں بیان کی ہے۔ جن کے چند اشعار بطور نمونہ اوپر پیش کئے گئے لیکن ان کی اہمیت ان کے شہر آشوبوں کی وجہ سے ہے۔ ان شہر آشوبوں میں شاعر کا انفرادی تاثر نمایاں ہے۔ تاہم ان میں دہلی کی سیاسی و تہذیبی زندگی کے زوال کا ذکر ہجو کے پیرائے میں نہیں بلکہ مرثیے کے انداز میں بیان ہوا ہے۔ غم انگیز جذبات یوں بھی پُر تاثیر ہوتے ہیں۔ لیکن جب خود کے برباد ہونے کی داستان رقم ہو تو اس کی اثر آفرینی اوج کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور آہوں اور نالوں نے کاغذی پیرہن اختیار کر لیا ہے۔

بالعکس ہیں زمانے میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے الٹا زمانے نے اختیار
ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجب روش باغ روزگار
جو نخل پر ثمر ہیں اٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

1857 میں دہلی کی بربادی و تباہی پر بلاشبہ سیکڑوں شعرا نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ شدت تاثر اور درد و الم کی چنگاری اس دور کی شاعری میں پوری طرح موجود ہے۔ غالب کا کلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

غالب اپنے دور کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دلی میں گذرا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس شہر کی تباہی و بربادی کو دیکھا۔ مغلیہ سلطنت کا زوال اور انگریزوں کا رواج غالب کی نگاہ میں بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ پرانی روایتوں کی بیخ کنی اور گذشتہ اقدار کی شکست و ریخت بھی جاری تھی۔ خارجی ماحول کی یہ تمام تاریخی حقیقتیں ایسی نہ تھیں کہ غالب ان سے متاثر نہ ہوتے۔ انہوں نے جس بے باکی سے اپنے اردگرد کے حالات و واقعات اور محسوسات کو اپنے خطوط میں بیان کیا ہے، تاریخ کا کوئی بھی مورخ اس سے صرف نظر کر کے 1857 کی معروضی تاریخ مرتب نہیں کر سکتا۔ ان کی بعض غزلیں بھی اس ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہونے والے درد و کرب کا موثر انداز میں اظہار کرتی ہیں۔ فتح دہلی کے بعد جو عالم

گیر مصیبت اہل شہر، بالخصوص مسلمانوں پر نازل ہوئی، اس کے ذکر سے آج بھی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ غالب جیسے انسان دوست شاعر کے لئے ان سانحات کی تاب لانا کتنا مشکل تھا۔ اس مظلومیت اور بے بسی کا اندازہ اس مشہور قطعہ بند سے لگایا جاسکتا ہے، جس کا پہلا شعر ہے:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج　　ہر سلحشور انگلستان کا

غدر کے نتیجے میں رونما ہونے والی صورت حال کو متعدد شاعروں نے بیان کیا ہے۔ ظہیر دہلوی ایک جواں سال مگر نامور شاعر تھے، جو بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے۔ غدر کے چند سال بعد انہوں نے 'داستان غدر' کے نام سے اپنی آپ بیتی قلم بند کی جس میں انہوں نے دہلی کے واقعات، اپنے مصائب وآلام اور اہل شہر کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان خونچکاں واقعات اور ان کے اسباب وعوامل کا اظہار اپنے شہر آشوبوں میں کیا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ:

"اردو کے بہت کم شاعروں کو 'غدر' میں اتنی زک اٹھانی پڑی جتنی کہ ظہیر دہلوی کو۔"[4]

غدر کے بارے میں ظہیر کا اصل رویہ کیا تھا انہیں یہاں بیان کرنا خارج از بحث ہے۔ انہوں نے ان واقعات سے متاثر ہو کر 'داستان انقلاب' اور 'ہنگامہ دار و گیر' میں اس زمانے کے حالات کی جو سچی تصویر کھینچی ہے، اس سے ان کی وطن دوستی کا پہلو کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے دہلی والوں اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم کا جو بازار گرم کر رکھا تھا ان شہر آشوبوں کے ہر ہر بند سے ظاہر ہے:

ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا
ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زباں خوش بیان قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے اک جہان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

اردو کے ایک اہم شاعر منیر شکوہ آبادی نے نہ صرف اس جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا، بلکہ انہیں بغاوت کے جرم میں کالے پانی کی سزا بھی ہوئی۔ منیر انگریزوں کی زیادتیوں کا احساس رکھتے تھے۔ دہلی پر انگریزوں کے قابض ہو جانے کے بعد کس طرح انہوں نے دلی کو تخت وتاراج کیا اس کا اظہار 'داغ غم' کے عنوان سے ایک نظم سے ہوتا ہے۔ انگریزوں کے جور وستم اور دہلی کی بدحالی کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ہو جو اس نظم میں مذکور نہ ہوا ہو:

دل تو پژمردہ ہے داغ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں دہان زخم خنداں ہوں تو کیا
سیکڑوں کو لوٹ کر دو چار گھر بھر دے فلک
سب ہی ماتم ہے اگر دس تہنیت خواں ہوں تو کیا
ہوگئے برباد شاہان سلیماں منزلت
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا
بیگمیں شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
سب چڑیلیں صاحبان قصر وایواں ہوں تو کیا
ہو کے محتاج کفن مر مر گئے زریں لباس
خلعت زیباں نصیب شخص عریاں ہو تو کیا

اس کے علاوہ انہوں نے اپنی دیگر نظموں 'فریاد زندانی' اور 'مصائب قید' میں اپنی گرفتاری اور قید و بند کی صعوبتوں کا ذکر بڑے دل خراش لہجے میں کیا ہے:

سیہ کاروں کے سر پر افسر عزت نظر آئے
بنے ہیں مرغ عیسیٰ ان دنوں مرغ سلیمانی
نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہوگیا پانی
فرخ آباد اور یاران شفیق
چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے

اردو کے کئی دیگر شعرا کی طرح محمد حسین آزاد بھی انگریزوں کے ظلم وستم کے نشانہ بنے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر کو جو 'دلی اردو اخبار' کے مدیر تھے انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ آزاد کے خلاف بھی گرفتاری نامہ جاری ہوگیا تھا۔ مگر وہ کسی طرح بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے 'غدر' کے موقع پر ایک عارضی فتح کی خوشخبری پاکر 'فتح افواج مشرق' کے نام سے ایک معرکتہ الآرا نظم لکھی۔ یہ نظم آزاد کی وطن دوستی کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

کو ملک سلیمان و کجا حکم سکندر
شاہان اولی العزم وسلاطین جہاندار
ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار
کام آئے نہ علم وہنر و حکمت وفطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو وہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردش گردوں بھی عجب گردش دوّار

اس کے علاوہ آزاد نے اس موقعہ سے متاثر ہو کر کئی نظمیں لکھیں۔ ان میں 'حب وطن' اور 'اولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں' قابل توجہ ہیں جو ان مخصوص حالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اردو کے ایک اہم شاعر داغ دہلوی بھی اس واقعہ کی آویزش و پیکار کی زد میں آئے۔ واقعہ کے وقت وہ قلعہ میں مقیم تھے۔ غدر کے بعد جب قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو یہ بھی تباہ حال وہاں سے نکلے۔ انہوں نے اس زمانے کے حالات سے متاثر ہو کر ایک شہر آشوب اور متعدد غزلیں کہیں۔ اپنے شہر آشوب کے پہلے بند میں انہوں نے دہلی کی گذشتہ شان و شوکت کا ذکر کیا ہے۔ باقی کے بند میں شہر کی ویرانی اور عوام کی کسمپرسی اور تباہ حالی کا بیان ہوا ہے۔ کس طرح دہلی ویران ہوئی اور پرانی تہذیب و ثقافت کس طرح چشم زدن میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں اس کے ہر ہر بند سے ظاہر ہے۔

فلک نے قہر و غضب ایسا تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

قدیم تمدن کے مٹنے اور ایک سلطنت کے ٹوٹنے بکھرنے کا نقش داغ کے دل پر گہرا تھا۔ مزید اشعار دیکھیے دہلی کے اجڑنے کی داستان کا ذکر کس پردرد لہجے میں کیا ہے:

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمان دہلی
تھا مرا نام و نشاں نام و نشان دہلی
اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہ ہووے گا حساب
بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیان دہلی

1857 کا واقعہ صرف ایک ایسا سیاسی واقعہ تھا بلکہ ایک تہذیب و ثقافت کا زوال تھا، اور تقریباً تین سو سال تک ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس مشترکہ تہذیب کے گیسو سنوارے تھے۔ غدر نے دلی کی بساط ایک دم الٹ دی اور پرانی تہذیب و معاشرت جن کی اپنی خوبیاں اور رعنائیاں تھیں اس ہنگامے کی بدولت نقش بہ ہوا ہوگئیں۔ حالی نے اس کا ذکر اپنی نظم 'دہلی مرحوم' میں کیا ہے۔

دراصل حالی اردو کے پہلے شاعر ہیں جو غدر کی سیاسیات سے متاثر ہوئے۔ غدر کے بعد اخلاقی، مادی اور روحانی انحطاط اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا تھا۔ حالی کا دل ہندوستان کی غلامی پر رویا بھی اور اس نے ہندوستان کی غفلت، مایوسی اور مظلومی پر آنسو بھی بہائے۔

اردو شاعری میں قومی شعور کی داستان قدرے طویل ہے۔ ان شاعروں اور ان کی تخلیقات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ایسی بے شمار غزلیں، نظمیں اور شہر آشوب موجود ہیں جو بغاوت سے پیدا ہونے والی صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ ان میں فضل حسین خاں افسردہ کی 'مصیبت دہلی' محمد علی تشنہ کی 'دار دسن' مرزا قربان علی بیگ سالک کی 'انقلاب دہلی' غلام دستگیر مبین کی 'گنج شہیداں' اور 'داستان الم' حکیم محمد حسن کی 'نوحہ دہلی' اور 'طوفان مخبری' اور حکیم آغا جان عیش کی 'دہلی و لکھنؤ' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ نظمیں اور شہر آشوب زیادہ تر مسدس کی شکل میں ہیں جن میں شاعروں کا انفرادی تاثر نمایاں ہے۔ ہر کسی نے اپنے اپنے مخصوص حالات، مزاج اور طبیعت کے مطابق اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کسی نے صرف اس المیہ کے واقعاتی ذکر پر اکتفا کیا ہے، کسی نے دہلی کی گذشتہ جاہ و حشمت پر اظہار افسوس کیا ہے، کسی نے دہلی کی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کے نیست و نابود ہو جانے کا ذکر کیا ہے، کسی نے حکیمانہ نقطۂ نظر سے کام لے کر واقعات کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، کسی نے اس سیاسی و معاشرتی بحران کے اسباب و علل کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم جو چیز ان سب میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں تقریباً ہر ایک شاعر نے غدر کے مصائب و آلام کی خونچکاں داستان کے کسی نہ کسی واقعاتی پہلو کو ضرور بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظمیں اور شہر آشوب اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہیں جن میں دہلی کی تہذیبی و سیاسی زندگی کے زوال وانحطاط کا مرقع اپنے پورے خدوخال کے ساتھ موجود ہے۔

اس طرح اس مختصر سے جائزہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اردو شاعری نے ہماری قومی تاریخ کے سب سے اہم موڑ پر بے حد نمایاں خدمات انجام دیں اور اردو شعرا نے اپنے تخلیقی عمل کے ذریعہ اپنے ماحول اور حالات کی خوب عکاسی کی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری میں حب وطن کا جو رجحان عام ہوا، وطنیت اور قومیت کے جو تصورات در آئے، اور جنہیں بعد کی شاعری میں ایک توانا اور مستحکم روایت کی شکل میں قبولیت عام کی حیثیت عطا ہوئی، وہ بڑی حد تک انقلاب 1857 کے رہین منت ہیں۔

OO

حواشی: 1۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ: عبداللہ یوسف علی الہ آباد 1936 ص 2:3۔ بحوالہ: ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2003 ص 292: 3۔ بحوالہ: ایضاً ایضاً ص نمبر 277: 4۔ بحوالہ: ایضاً ایضاً ص نمبر 5:303۔ بحوالہ: ایضاً ایضاً ص نمبر 300

بغاوت کے اوزار

جنگِ آزادی کے غیر معروف اردو شعرا

شارب ردولوی

■

ان کے کلام میں زبان و بیان پر گرفت بھی ہے۔ اور رعایت لفظی، استعارے، کنائے اور تشبیہات کا استعمال بھی! پھر بھی انھیں ان شعری پیمانوں سے پرکھنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ان کی اپنی ایک جمالیات ہے اور جمالیات کے عناصر اظہار، مقصد اور جذبہ ہیں اور جہاں تک ان کا تعلق ہے، اپنی جمالیات اور اظہار میں یہ شاعری ہر طرح کامیاب ہے۔ ان نظموں اور گیتوں نے اپنے زمانے میں بے شمار لوگوں کو متاثر کیا ہے لاکھوں مردوں اور عورتوں کے لبوں پر یہ نغمے آزادی کا خواب بن کر مچلتے رہے ہیں۔ انھیں پڑھ کر آج بھی جوش، ولولے اور قربانی کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی یہی اہمیت ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی ایک اور اہمیت ہے کہ ان کے پیچھے ایک بہت بڑی تاریخ ہے۔ ہندوستانی عوام کی مزاحمت کی تاریخ!

■

ہندوستان کی جنگِ آزادی دو ہتھیاروں سے لڑی گئی۔ ایک اہنسا دوسرے اردو زبان۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ان تمام لڑائیوں کو اہمیت نہیں دیتا جو میرٹھ کے سپاہیوں، دہلی کے باغیوں، نانا صاحب، رانی جھانسی، شاہانِ اودھ یا سبھاش چندر بوس نے لڑیں اور انگریزی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، جس پر قابو پانے کیلئے انگریزوں نے ان گنت بے گناہ مردوں اور عورتوں کو نہایت بے دردی سے پھانسی دے دی، توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا یا گولیوں سے بھون دیا، بلکہ اسے تو اور سو سال پیچھے سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی 1757 میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کی شکست اور شہادت سے، جس پر اردو شاعری نے اپنا ردِ عمل ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

راجہ رام نرائن موزوں

ان لڑائیوں اور قربانیوں کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ انگریز مخالفت کا خمیر انھی سے تیار ہوا۔ انگریزوں نے اپنے بے پناہ مظالم سے بغاوت پر قابو تو پالیا لیکن اس کے بعد پیدا ہونے والا سکون دراصل سکون نہیں تھا، ٹوٹ جانے کی بے بسی تھی۔ آج ہمارے پاس احساس کا کوئی ایسا آلہ نہیں ہے کہ اس کرب کی شدت کو محسوس کیا جا سکے جس سے خاص طور پر شمالی ہند کے لوگ گزرے تھے۔ ہر گھر ماتم کدہ تھا اور کسی ایک کا ماتم نہیں تھا بلکہ پورے پورے خاندان قتل کر دیے گئے تھے، حویلیاں مسمار کر دی گئی تھیں، بستیاں اجاڑ دی گئی تھیں، کھیت اور باغات جلا دیے گئے تھے جس کا اعتراف انگریز حاکموں نے بھی مصلحتاً ہی سہی لیکن کیا ہے۔ Tomas Edward کی کتاب The other side of the Award ایسے اعترافات سے بھری ہوئی ہے جس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"آج سے ایک سو سال بعد یقیناً ایک دن ایسا آئے گا جب غدر کے

متعلق تمام واقعات اور ہندوستانی روایات کا سختی سے احتساب کیا جائے گا اور اس پر تعصب یا پروپیگنڈے کی حیثیت سے نہیں بلکہ خاص تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے گی جس کے بعد وہ ایک مستند صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یقیناً غلامانہ زندگی کی یہ ایک نہایت خوفناک کہانی ہوگی۔"

(ترجمہ،تصویر کا دوسرا رخ، شیخ حسام الدین۔ ص95)

ڈاکٹر تارا چند، پنڈت سندر لال اور دوسرے مورخین و مصنفین نے حقائق کو مصلحت آمیز تاریخ اور پروپیگنڈے سے علاحدہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ابھی بہت سے لوگوں کا قرض باقی ہے، جس میں وہ ادیب وشاعر بھی ہیں جو بے گناہ شہید ہوئے۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر بی این چوپڑا کی کتاب Who's who of Indian Martyrs میں بھی نہیں ہے، جس کا ترجمہ 'شہیدانِ آزادی' کے نام سے ترقی اردو بورڈ نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایسے نہ جانے کتنے شعرا ہیں جن کی نظموں کا تو علم ہے لیکن ان کے نام اور حالات آج تک کسی کو معلوم نہیں۔ اس طرح جہد آزادی کی یہ داستان ابھی تک نامکمل ہے۔ نیشنل آرکائیوز کے ریکارڈ سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کب کون سی نظم کس اخبار یا رسالے یا پمفلٹ میں شائع ہوئی، لیکن بہت سی نظموں کے لکھنے والوں کا پتہ نہیں چلتا جس میں یقیناً ہماری کوتاہی شامل ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو شعرا نے انگریز حکومت بلکہ حکومت کے کاروبار میں ان کی دخل اندازی کے زمانے سے ہی ان کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کردی تھی، جو کبھی اشارے کنائے میں اور کبھی براہ راست ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔ یہ احتجاج یا اعتراض اردو کے بڑے شعرا ناسخ، آتش، مصحفی، جرأت یہاں تک کہ میر انیس کے یہاں بھی 'سب چھاؤنی اجاڑ محلے تباہ تھے' کی شکل میں مل جاتا ہے۔ مصحفی کے یہاں تو وہ شعور ہے کہ وہ انگریز کو ہندوستان کی معاشی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اودھ کے انقلابیوں نے سب سے زیادہ دیر تک انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن حالات نے ساتھ نہیں دیا اور بالآخر شکست ہوئی۔ لکھنؤ اور دہلی کی اس تباہی کی تصویریں اردو شعرا کے کلام میں بکھری ہوئی ہیں:

بے نشان ہوگیا عالم میں نشانِ دہلی
لا مکان بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی
گھر کھدا، مال لٹا، جان گئی اب تک بھی
ہیں مصیبت میں مصیبت زدگانِ دہلی

محسن

محلے ہیں ویران کوچے اجاڑ
گرا لکھنؤ پر ہے غم کا پہاڑ

نواب محمد رضا خاں عاشق

یہ آوازیں تحریک آزادی کے ساتھ تیز تر ہوتی گئیں اور جہاں صرف ماتم اور تباہی کا ذکر تھا۔ وہاں انقلاب کی تمنا کروٹیں لینے لگی۔ اردو شعرا نے اپنی شاعری کو کارزار آزادی کا ترجمان بنادیا اور ایک ایسی حکومت مخالف یا انگریز مخالف فضا پیدا کردی جو آزادی کے لئے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں معاون ہوئی۔ اردو شعرا نے تحریک آزادی کو جوش اور سرفروشی کی تمنا سے بھر دیا۔ ان میں کتنے شعرا ایسے ہیں جنھیں بے خطا موت کی سزا ملی، کتنے ایسے ہیں جنھیں قید اور عبور دریائے شور کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن کسی وقت ان کے جذبۂ حب الوطنی، آزادی کی تمنا اور ملک کو خوش حال دیکھنے کی خواہش میں کمی نہیں آئی۔ اس شاعری کی تاریخی اہمیت ہے اور تاریخ صرف قصہ اور واقعات کا بیان نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک عہد سانس لیتا ہے۔ اس میں اس عہد اور وقت پر اثر انداز ہونے والے کردار ہوتے ہیں اور وہ جنون ہوتا ہے جس کے آگے زندگی بھی ہیچ نظر آتی ہے اور یہ تاریخ ادب کے اوراق میں سانس لیتی ہے۔ اس لئے اگر اس عہد کے شعرا کو دیکھا جائے تو ان کے کلام میں قدم بقدم پر اس تاریخ کے نقوش نظر آئیں گے۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس تاریخ کو رقم کرنے میں اردو شعرا پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے صرف قلم سے ہی نہیں بلکہ میدان میں آکر دوسروں کے شانہ بشانہ اس جنگ میں حصہ لیا ہے۔ رام پرشاد بسمل اردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی پہچان جس شعر سے ہوئی وہ دراصل بسمل عظیم آبادی کا شعر ہے جو تخلص کے تسامح کی وجہ سے ان کے نام سے وابستہ ہوگیا لیکن نیشنل آرکائیوز کی ضبط شدہ نظموں کے اندراج نمبر 1636 میں 'وطن کا راگ' مرتبہ اکسیر سیالکوٹی کے حوالے سے ان کے نام سے درج ہے جس کا مطلع اور مقطع اس طرح ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

بسمل عظیم آبادی

یہ اشعار شاعر کے قدرت کلام کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں تغزل بھی ہے اور وہ اشارے اور کنائے بھی جنھوں نے اسے جنگ آزادی کا مقبول نغمہ بنادیا۔ ان کا خالق کوئی ہو لیکن اردو کے ان اشعار نے اس عہد کے نوجوانوں کے دلوں کو جوش اور جاں نثاری کے جذبے سے بھر دیا۔

رام پرشاد بسمل شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ شہیدانِ آزادی

میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ طالب علمی کے زمانے سے ہی قوم پرستانہ تحریکوں میں سرگرم حصہ لینے لگے تھے۔ ایک انقلابی جماعت ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کے رکن تھے۔ 19 اگست 1925 کی کارکوری ڈکیتی میں شامل تھے، جس کے بعد وہ گرفتار کر لیے گئے اور 19 دسمبر 1927 کو انھیں پھانسی دے دی گئی۔[1]

رام پرشاد بسمل کی کئی نظمیں ضبط شدہ نظموں میں ملتی ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں حکومت مخالف جذبات سے پُر ہیں۔ ان کی یہ نظم کانگریس پشپانجلی میں 1920 میں شائع ہوئی تھی جو ضبط کر لی گئی۔ اس کے دو اشعار دیکھیے۔

الٰہی خیر وہ ہردم نئی بیداد کرتے ہیں
ہمیں تہمت لگاتے ہیں جو ہم فریاد کرتے ہیں
ستم ایسا نہیں دیکھا جفا ایسی نہیں دیکھی
وہ چپ رہنے کو کہتے ہیں جو ہم فریاد کرتے ہیں

(نیشنل آرکائیوز اندراج نمبر 1652)

اس وقت کی یہ نظمیں جلسوں اور جلوسوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ رام پرشاد بسمل کی ایک اور نظم جو بہت مقبول تھی، اس کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

جدا مت ہو مرے پہلو سے اے دردِ وطن ہرگز
نہ جانے بعد مردن میں کہاں اور تو کہاں ہوگا
یہ آئے دن کی چھیڑ اچھی نہیں اے خنجر قاتل
بتا کب فیصلہ ان کے ہمارے درمیاں ہوگا
شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

(کرانتی پشپانجلی 1930 نیشنل آرکائیوز اندراج نمبر 1773)

ان کی ایک پُر درد نظم جو اس زمانے کی مقبول نظموں میں ہے اور جس کا ایک شعر آج بھی لوگوں کو یاد ہوگا۔ اس کا ایک بند دیکھیے:

اپنی قسمت میں ازل ہی سے ستم رکھا تھا
رنج رکھا تھا محن رکھا تھا، غم رکھا تھا
کس کو پرواہ تھی اور کس میں یہ دم رکھا تھا
ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

(نیشنل آرکائیوز اندراج نمبر 1711)

یہ نظم 'بندے ماترم' میں 1929 میں شائع ہوئی جس کے ساتھ ایڈیٹر کا ایک نوٹ درج ہے کہ "یہ وہ سادہ اور پُرخلوص نظم ہے جو مقدمہ سازش لاہور کی سماعت کے دوران اسیر پریم دت نے گا کر لوگوں کو رلایا تھا۔"[2]

ایک اور شہید آزادی اشفاق اللہ خاں بھی شاعر تھے۔ ان کی شاعری جوش اور ولولے سے بھری ہوئی تھی۔ وہ شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے، انقلابی جماعت مہاتر ویدی سنستھا[3] کے رکن تھے۔ کاکوری کیس میں گرفتار ہوئے اور 3 اپریل 1927 کو انگریز حکومت نے انہیں پھانسی دے دی۔

اشفاق اللہ خاں کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔ یہ نظم انھوں نے اپنی گرفتاری سے پانچ دن قبل لکھی تھی۔

"بہار آئی ہے شورش ہے جنونِ فتنہ ساماں کی
الٰہی خیر رکھنا تو مرے جیب و گریباں کی
بھلا جذبات الفت بھی کہیں مٹنے سے مٹتے ہیں
عبث ہیں دھمکیاں دار و رسن کی اور زنداں کی
نہیں تم سے شکایت ہم صفیرانِ چمن مجھ کو
مری تقدیر ہی میں تھا قفس اور قیدِ زنداں کی
یہ جھگڑے اور بکھیڑے میٹ کر آپس میں مل جاؤ
عبث تفریق ہے تم میں یہ ہندو اور مسلماں کی

(ماہنامہ کیرتی امرتسر 1930 نیشنل آرکائیوز اندراج نمبر 1642 بحوالہ آوازِ انقلاب۔ صفحہ 92)

آج احمق پھپھوندی کا نام کچھ ہی لوگوں کے ذہن میں ہوگا، وہ بھی ان کی مزاحیہ شاعری یا ان کے لغت کی وجہ سے، لیکن تحریک آزادی کے وہ ایک اہم رکن تھے۔ بنیادی طور پر سنجیدہ شاعر تھے، محمد مصطفیٰ خاں ان کا نام اور مداح تخلص تھا۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں احمق تخلص کرتے تھے۔ پھپھوند ضلع اٹاوہ سے ان کا تعلق تھا۔ گاندھی جی کے پیروؤں میں تھے اور جیل کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ جنگ آزادی کی نظموں میں ان کے گیت اور نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔ ان کا ایک گیت تو ترانے کی شکل میں گایا جاتا تھا:

ملک کو حاصل ہو آزادی
ختم ہو دورِ ستم ایجادی
دور ہو اس کی سب بربادی
چرخ پہ چمکے بن کے تارا
پیارا بھارت دیس ہمارا
ہم میں پیدا ہو یکجائی
سب ہوں باہم بھائی بھائی
ہندو مسلم سکھ عیسائی
گائیں مل کر گیت یہ پیارا
پیارا بھارت دیس ہمارا

(نیشنل آرکائیوز اندراج نمبر 1712 بحوالہ آوازِ انقلاب صفحہ 60)

جنگِ آزادی کی ایک بہت بڑی دین مختلف مذاہب خاص طور پر ہندو مسلم اتحاد تھا، جو بعد میں انگریز کی سیاست کا شکار ہو گیا۔ اس وقت کے تمام شعرا بار بار اس بات پر زور دیتے رہے کہ ہم ایک ہو کر ہی ملک کو آزادی، ترقی اور کامرانی کے راستے پر چلا سکتے ہیں۔ اس وقت کے تمام چھوٹے بڑے شاعروں کی نظموں میں اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں۔ یہ اشعار بھی ضبط شدہ نظموں کے حوالے سے پیش کئے جا رہے ہیں:

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستان سے ہے

ظفر علی خاں

(نیشنل آرکائیوز اندراج نمبر 1712)

مزدور ہوں، دہقاں ہوں، ہندو ہوں، مسلماں ہوں
سب ایک تو ہو جاؤ پھر ان کو دکھا دیں گے

صفی لکھنوی

(جنوری 1930 نیشنل آرکائیوز نمبر 2326)

محبت کا حلقہ بڑھانا پڑے گا
کہ رنگ دوئی کو مٹانا پڑے گا
ہیں ہندو مسلمان دونوں برابر
اب آپس میں ان کو نبھانا پڑے گا

کامریڈ عثمان حامد

(مارچ 1930 نیشنل آرکائیوز نمبر 1712)

حالت بہت خراب ہے ہندوستان کی
کچھ فکرِ چارہ سازیِ بیمار کیجیے
ہے اتحاد ہی میں نجات اہل ہند کی
اس امر واقعی سے نہ انکار کیجیے
ہرگز نہیں ہے ہندو و مسلم میں فرق کچھ
کیوں امتیاز کافر و دیندار کیجیے

منوہر سہائے انور

(نیشنل آرکائیوز نمبر 1711)

جہاں تک ہو سکے تفریق باہم کو مٹا ڈالو
بنو آپس میں تم درد آشنا ہندوستاں والو
ضرورت کے مطابق ہر طرف ہنگامہ آرا ہو
اگر چاہو کرو محشر بپا ہندوستاں والو

پنڈت دتاتریہ پرشاد فدا

(مارچ 1930 نیشنل آرکائیوز نمبر 2371)

جس قدر انگریزوں کے مظالم بڑھ رہے تھے اسی قدر مجاہدین آزادی میں جذبۂ جاں نثاری زور پکڑتا جا رہا تھا۔ آزادی کی ان نظموں نے ایثار و قربانی کے جذبے کو اور بڑھا دیا۔ یہ نظمیں اور غزلیں عوامی ترانے بن گئے تھے جو ہر شخص کی زبان پر تھے اور ہر جگہ گائے جاتے تھے۔ ان نظموں نے سب سے بڑا کام یہی کیا کہ لوگوں میں غیرت قومی کو بیدار کیا اور انھیں مذہب، ذات پات، علاقہ، عالم و جاہل، کسان و مزدور، سارے فرق سے بلند کر کے ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس طرح اردو شعرا نے تمنائے آزادی کا ایسا مضبوط قلعہ تعمیر کر دیا جسے انگریزوں کے بڑے سے بڑے مظالم بھی نہیں توڑ سکے اور جوش آزادی عوام کی آواز بن کر پھیلتا ہی گیا۔ ان شعرا سے کوئی واقف نہیں، نہ ہمارے تذکروں اور کتابوں میں چند کو چھوڑ کر کسی کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان کے الفاظ آج بھی آزادی کی دستاویز پر درج ہیں:

اٹھو اے نوجوانو! جوش رحمت کی گھٹا ہو کر
جگا دو غافلانِ ہند کو بانگِ درا ہو کر
تمہاری منتظر ہے شوکت و توقیر مستقبل
امر ہو جاؤ آزادیِ بھارت پر فدا ہو کر
کوئی حد بھی ہے آخر جور و استبداد کی صاحب
کوئی کب تک رہے خاموش مجبور جفا ہو کر
اگر احساس ہے کچھ تم کو زندانِ غلامی کا
تو زنجیر غلامی توڑ دو نکلو رہا ہو کر

کنور ہری سنگھ جری

(نیشنل آرکائیوز نمبر 1711)

الٰہی ہند کب آزاد ہوگا — دلِ مضطر ہمارا شاد ہوگا
نہ ہو گر مارشل لا سے تسلی — تو اک حربہ نیا ایجاد ہوگا

کنہیا لال ثاقب

(مارچ 1920 نیشنل آرکائیوز نمبر 1712)

نوبہار صابر کو پھانسی کا پھندا چومنے کی تمنا ہے:

پلا قاتل کہ ہم جامِ شہادت کو ترستے ہیں
اسی مے کو پیا کرتے ہیں بادہ خوار آزادی
ذرا ٹھہرو مجھے پھانسی کا پھندا چوم لینے دو
یہی تو ہے شہیدوں کے گلے کا ہار آزادی

نوبہار صابر قنوری

(نیشنل آرکائیوز نمبر 2606)

فیروز الدین منصور آزادی کو اپنا حق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم آزادی کے حقدار ہیں، سائل نہیں:

مانگا پہلے اب نہ مانگیں گے مگر لیں گے ضرور
حق آزادی، کہ ہم حقدار ہیں سائل نہیں
زندگی آزاد گی، آزاد گی ہے زندگی
موت بہتر ہے، اگر آزادی کامل نہیں

فیروز الدین منصور

(جولائی 1924 ماہنامہ کیرتی نیشنل آرکائیوز نمبر 649)

سیوک رام باصر غلامی کو ننگ آدمیت اور خلاف فطرت قرار دیتے ہیں:

غلامی میں پڑا رہنا خلافِ رمزِ فطرت ہے
غلام اس دورِ آزادی میں ننگِ آدمیت ہے
غلامو! تابہ کے محرومِ آزادی رہو گے تم
بتاؤ تابہ کے یہ ظلم کی سختی سہو گے تم
اٹھو اور توڑ دو مل کر یہ زنجیریں غلامی کی
یہی خواہش ہے گاندھی کی یہی مجھ جیسے عامی کی

سیوک رام باصر

(18 مارچ 1930 نیشنل آرکائیوز نمبر 371)

روس کے اکتوبر انقلاب اور وہاں سوشلسٹ حکومت کے قیام کا ہندوستان کی تحریک آزادی پر زبردست اثر ہوا۔ لوگوں میں ایک امید پیدا ہوئی کہ جس طرح روسیوں نے اپنے ملک کو آزاد کرالیا، اسی طرح ہم بھی ہندوستان کو آزاد کراسکتے ہیں۔ انقلاب روس کی کامیابی کے بعد یہاں کی شاعری میں عام طور پر انقلاب کا لفظ استعمال ہونے لگا اور انقلاب کا ایسا جوش پھیلا کہ صرف شاعری ہی نہیں ہندوستان کی پوری فضا، انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ بھگت سنگھ کی پھانسی پر نوجوان بھارت سبھا، لاہور کے ٹیکا رام سخن صرف انقلاب ہی نہیں سرخ جھنڈے کا ذکر بھی اپنی نظم 'فطرت دشمن' میں کرتے ہیں:

کوئی کہہ دے حکومت سے نہ الجھے نوجوانوں سے
انھیں سکھلا دیا ہے ظلم نے ظالم سے ٹکرانا
یقیناً انقلاب ہند ہوگا اے سخن ہوگا
ہمیں زیبا ہے اپنے گھر میں جھنڈا سرخ لہرانا

(ضبط شدہ نظمیں مرتبہ خلیق انجم/مجتبیٰ حسین صفحہ 109)

پرتاپ چند آزاد اپنی نظم میں لکھتے ہیں:

گولیاں تو کھا چکے اب توپ بھی ہم دیکھ لیں
مرمٹیں گے دیش پر، پھر انقلاب آنے کو ہے

(ضبط شدہ نظمیں ص 108)

شیو لال بسمل، احمق پھپھوندوی، جوش ملیح آبادی اور بہت سے معروف وغیر معروف شعرا نے انقلاب پر نظمیں اور گیت لکھے۔ شیو لال بسمل نے ایک طویل ترانہ انقلاب لکھا جس میں انھوں نے انقلاب کی ضرورت اور ملک کی حالت کا احساس دلایا ہے:

انقلاب زندہ باد — زندہ باد انقلاب
انقلاب لاجواب — لاجواب انقلاب
انقلاب انقلاب
ادھر ہیں چیرہ دستیاں — ادھر ہیں فاقہ مستیاں
ہیں آرزو کی بستیاں — یہ انقلابی ہستیاں
جو جھیلتی ہیں سختیاں — ہے سختیوں میں انقلاب
انقلاب انقلاب

(نیشنل آرکائیوز اندراج نمبر 2312)

جنگِ آزادی کے ان غیر معروف شعرا کے علاوہ ایک بڑی تعداد ضبط شدہ نظموں میں ایسی ہے جن کے ناموں پر فرضی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ یہ نظمیں اور غزلیں لاہور، امرتسر، گڑگاؤں، سہارنپور، بمبئی، کانپور کے غیر معروف ہفت روزہ اخباروں، ماہناموں اور کتابچوں میں شائع ہوتی تھیں اور کسی طرح گھر گھر پہنچائی جاتی تھیں۔ گرفتاری اور حکومت کے مظالم کے خوف سے اکثر شعرا فرضی ناموں سے اپنی نظمیں شائع کراتے تھے یا بغیر کسی نام کے نظمیں اور گیت شائع ہوتے تھے۔ ان میں اخبارات اور اشاعت گھر کے نام بھی فرضی ہوسکتے ہیں اس لئے کہ جس طرح کے جذبات کا ان میں اظہار کیا جاتا تھا وہ حکومت کے لئے قابلِ اعتراض تھے۔ جب کہ صورت یہ تھی کہ ذرا سے اشارے یا کنائے کی وجہ سے نظمیں ضبط کرلی جاتی تھیں۔ جن ناموں پر فرضی ہونے کا شبہ ہے ان میں خجندی، فلک، روشن خیال، قانون شکن، خورشید، نیر، آغا اور مرزا دبنگ وغیرہ ہیں۔ ان میں مرزا دبنگ اس طرح دعوت انقلاب دیتے ہیں:

اشہب فکر تیز گام ہے آج
سیفِ مضمون بے نیام ہے آج
انقلاب آرہا ہے بھارت میں
دعوتِ انقلاب عام ہے آج
صفِ ماتم بچھی ہے مغرب میں
جشنِ مشرق کا اہتمام ہے آج

(ویر بھارت 6 مارچ 1930 نیشنل آرکائیوز نمبر 2225)

قانون شکن، نوجوانوں اور آزادی کے پروانوں کو اس طرح للکارتے ہیں۔ان بندوں میں رعایت لفظی کے استعمال، زبان کے حسن اور آزادی کے جوش کو ملاحظہ کیجئے:

اے جوانو! ہے اگر اپنے وطن سے الفت
باغبانو! ہے اگر اپنے چمن سے الفت
تشنہ کامو! ہے اگر گنگ وجمن سے الفت

آؤ آزادی کے جھنڈے کو اٹھالیں مل کر
ہند کو قید غلامی سے چھڑالیں مل کر

کہہ دو انگریز سے اب باندھ لے بستر اپنا
ساحل ہند سے لے جائے وہ لشکر اپنا
منہ نہ دکھلائے کہیں ہم کو ستم گر اپنا
ڈھونڈھ لے جا کے کہیں اور کوئی گھر اپنا

ورنہ یہ یاد رہے حشر ہی برپا ہوگا
گوشہ گوشہ سے قیامت ہی کا چرچا ہوگا

(ہفتہ وار کرگ لاہور، 18 مارچ 1930 نیشنل آرکائیوز نمبر 2371)

ان ناموں میں ایک نام اے ایچ ساحر کا بھی ہے جن کی نظم ہفت روزہ افغان بمبئی میں شائع ہوئی۔ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے لیکن شبہ ہوتا ہے کہ یہ نظم ساحر لدھیانوی کی ہے اس لئے کہ ان کے نام عبدالحئی کا مخفف اے ایچ ہوسکتا ہے۔نظم کے چند اشعار ہیں:

حکومت کی بنیاد ڈھائے چلا جا
جوانوں کو باغی بنائے چلا جا
برس آگ بن کر فرنگی کے سر پر
تکبر کی دنیا کو ڈھائے چلا جا
گرا ڈال قصر شہنشاہیت کو
امارت کے معبد جلائے چلا جا

(نیشنل آرکائیوز نمبر 2579)

نیشنل آرکائیوز کے ریکارڈ میں ایسی بہت سی غزلیں اور نظمیں ہیں جن پر کسی کا نام درج نہیں ہے۔ جس خوف سے بہت سے لوگوں نے فرضی ناموں سے اپنا کلام شائع کرایا، اسی خوف سے بعض لوگوں نے اپنا نام دینا پسند نہیں کیا۔مثلاً ایک نظم ہے:

سنو گوشِ دل سے ذرا یہ ترانے
انوکھے نرالے ہیں جنگی فسانے
کہیں شور ماتم کہیں شادیانے

اسی طرح کٹتے رہے ہیں زمانے
کرو تھوڑی ہمت نہ ڈھونڈو بہانے
چلو جیل خانے چلو جیل خانے

(وطن کا راگ، مرتبہ: آنند یالکوٹی نیشنل آرکائیوز نمبر 1938 آواز انقلاب صفحہ 169)

ایک اور نامعلوم شاعر کی نظم 'فرنگی' کے یہ شعر دیکھئے:

باز آ اب تو جفا سے اے فرنگی باز آ
پھونک ڈالے گی تجھے ہی یہ شرر باری تری
کچھ نظر آتا نہیں چارہ بغاوت کے سوا
بڑھ چلی ہے آہ اس حد تک ستم گاری تری
حریت کا دور ہے اب دن غلامی کے گئے
فرض تھی جب ہم غلاموں پر وفاداری تری

(رنگ کا مرید لاہور، 24 فروری 1930 نیشنل آرکائیوز نمبر 2494)

یہ کلام ادبی اعتبار سے کیسا ہے یہ ایک علاحدہ سوال ہے کسی حد تک اس کا جواب ان اقتباسات ہی میں موجود ہے۔ ان میں زبان وبیان پر گرفت بھی ہے۔ رعایت لفظی، استعارے، کنائے اور تشبیہات کا استعمال بھی ہے پھر بھی انھیں ان شعری پیمانوں پر رکھنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ان کی اپنی ایک جمالیات ہے اور جمالیات کے عناصر اظہار، مقصد اور جذبہ ہیں اور جہاں تک ان کا تعلق ہے، اپنی جمالیات اور اظہار میں یہ شاعری ہر طرح کامیاب ہے۔ ان نظموں اور گیتوں نے اپنے زمانے میں بے شمار لوگوں کو متاثر کیا ہے لاکھوں مردوں اور عورتوں کے لبوں پر یہ نغمے آزادی کا خواب بن کر مچلتے رہے ہیں۔ انھیں پڑھ کر آج بھی جوش، ولولے اور قربانی کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی یہی اہمیت ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی ایک اور اہمیت ہے کہ ان کے پیچھے ایک بہت بڑی تاریخ ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی، انگریزوں کے مظالم اور ہندوستانی عوام کی مزاحمت کی، ان کے جذبے، ایثار اور قربانی کی۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح اردو شاعری جنگ آزادی کے ہر موڑ پر، خواہ وہ پُر تشدد رہا ہو یا پُرامن۔ اس کا سب سے زیادہ طاقت ور حربہ رہی ہے۔ آج جس آزادی پر ہمارا ملک فخر کرتا ہے اس میں ان گمنام، بے نام، معروف وغیر معروف شعراء، اور اردو زبان کا بہت بڑا حصہ ہے جسے ہم نے آزادی حاصل کرنے کے بعد فراموش کردیا۔

حواشی: 1۔ بحوالہ شہیدان آزادی، مرتبہ ڈاکٹر پی این چوپڑا، جلد اول صفحہ 82: 2۔ ضبط شدہ نظمیں مرتبہ خلیق انجم ومجتبیٰ حسین صفحہ 89: 3۔ شہیدان آزادی، ڈاکٹر پی این چوپڑا، جلد اول صفحہ 24 :4۔ آواز انقلاب مرتبہ فاروق ارگلی صفحہ 96

OO

حالات کا مرثیہ

بہادر شاہ ظفر کی حزنیہ شاعری

گلشن کھنہ

خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اردو کے ممتاز ترین شعرا میں سے تھے۔ وہ 1775 میں دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد اکبر شاہ کی وفات کے بعد 1837 میں باسٹھ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ وہ ایک دردمند دل کے مالک تھے۔ طبیعت میں سنجیدگی اور متانت موجود تھی۔ علم و ادب کے شیدائی تھے اور ادیبوں وشاعروں کی بے انتہا قدر کرتے تھے بلکہ علما اور فضلا کی محفلوں کا انعقاد کر کے بصیرت حاصل کیا کرتے تھے۔ انہیں بچپن سے ہی شعر و شاعری سے شغف تھا اس لیے انہوں نے دورِ جوانی میں ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ جب اُن کی شاعری میں ذرا نکھار پیدا ہوا تو وہ اپنا کلام شیخ محمد ابراہیم ذوق کو دکھانے لگے تھے کیونکہ وہ اس دور کے بڑے ذہین اور موزوں طبع شاعر تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے کلام کی راہیں متعین کرنے میں اُن کی بڑی رہنمائی کی اور غزل کی جانب مائل کیا۔ بہادر شاہ ظفر خود بھی اپنی طبیعت کی موزونی کے باعث نہایت عمدہ اور اعلیٰ پایہ کے شعر کہنے لگے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کا دور کیا تھا، برِ صغیر کی شاعری کا عالمِ شباب تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نصیر، ذوق، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ کی شاعری فضائے بسیط میں گونجتی تھی۔ نصیر نے ریختہ میں مضمون آفرینی کی بنیاد رکھی۔ ذوق نے غزل کو زبان اور محاورات کا انوکھا رنگ دیا۔ مومن نے اپنی نازک خیالی اور شوخیٔ ادا سے ہر ایک کے دل کے تار چھیڑ دیئے۔ غالب کے طرزِ بیان نے اور مسائلِ تصوف اور نکاتِ فلسفہ نے اردو شاعری کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا مگر بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں ایک الگ دل پذیرائی سادگی اور دلکشی تھی اور اُن کا طرزِ بیان اُن سب سے مختلف تھا۔ انہوں نے کہا تھا:

طرزِ سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے
اُس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا

■

...رنگون میں ہی وہ 17 نومبر 1862 کو انتقال فرما گئے اور اُسی بنگلہ کے صحن میں انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا جہاں انہیں سزائے عمر قید کے لئے نظر بند رکھا گیا تھا۔ انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ اب وطن کی مٹی نصیب نہیں ہوگی۔ شائد اسی لیے انہوں نے یہ شعر تحریر کیا تھا:

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ بدنصیب بہادر شاہ کی حسرتوں کا احترام کرتے ہوئے اُن کے جسمِ خاکی کو رنگون کی قبر سے مکمل اعزاز و احترام کے ساتھ بھارت لاکر اُن کی پیاری دلّی یعنی کوئے یار میں عزت کے ساتھ سپردِ خاک کیا جائے... کیا دلّی کی حکومت سن رہی ہے؟...

■

اُن کے اس منفرد طرزِ بیان کی اصل وجہ اُن کی طبیعت کی روانی تھی:

خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو
ترا ہر شعر تیرے بحر میں بحر المعانی ہے

بہادر شاہ ظفر کو شعر و شاعری بڑی مرغوب تھی اور اُن کی شاعری کا امتیازی رنگ حزن و ملال ہی تھا۔ اُنہوں نے اپنے سوز و گداز کو اشعار میں اس خوبصورتی سے سمویا تھا کہ اُن کے اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے۔ وہ غم کے سچے جذبات کی بڑے عمدہ شاعرانہ انداز میں اور بڑی مہارت کے ساتھ غمازی کرتے ہیں۔ اُن کے پہلے دیوان سے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

نہ مرا مونس کوئی ہے اور نہ کوئی غم گسار
غم مرا غم خوار ہے میں غم کے غم خواروں میں ہوں

بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا رنگ اور پس منظر بڑا واضح اور وسیع ہے کیونکہ وہ شاعری برائے شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی شاعری اُن کے ذاتی غم اور ذات کی عکاسی بھی کرتی ہے اور اُن کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی بھی ڈالتی ہے۔ اُن کی ایک مشہور اور مقبولِ عام غزل کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ رُوپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا، میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، مجھے سُن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا امتیازی رنگ حزن و ملال ہی ہے۔ اُنہوں نے اپنے سوز و گداز کو غزل کے اشعار میں اس خوبصورتی سے سمویا کہ اُن کے اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے۔ ان کے اشعار میں اُس شخص کی آواز سنائی دیتی ہے جس نے زندگی سے شکست کھائی تھی۔ اُس ذہن میں فراری کیفیت کا ردِعمل ہے جس نے گرد و پیش کے حالات سے مفاہمت کی کوئی صورت نہ دیکھی ہو۔ بادشاہ ظفر کی زندگی مسلسل، مستقل اور مکمل المیہ تھی۔ زمانہ شہزادگی اور پھر ولی عہدی کا ایک طویل عرصہ تاج پوشی کے انتظار میں گزر گیا۔

ظفر کا سارا عہدِ شباب تخت نشینی کی آرزو کی نذر ہو گیا اور پھر کہیں باسٹھ برس کی عمر میں وہ بادشاہ بنے۔ اس طویل انتظار کے بعد حکومت ملی بھی تو بقول شخصے " از دلی تا پالم "۔ سکونِ خاطر، فراغِ طبع اور اطمینانِ قلب جیسے ان کے حصے میں آئے ہی نہ تھے۔ زندگی کے ان مصائب اور پریشانیوں کی ترجمانی ہمیں اُن کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ اُن کے اشعار میں ان کی تاریخی زندگی کا نوحہ ہی نہیں ملتا بلکہ اُس دور کی ساری ذہنی بے چینی، جذباتی ناآسودگی اور اجتماعی حزن کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اُن کی ایک اور سوز و گداز سے بھری غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

بہادر شاہ ظفر کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگی، بے تکلفی، فصاحت اور محاورہ بندی ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے ظفر کے ہاں وہ رنگ پیدا ہو گیا تھا جو ان کا اپنا رنگ تھا۔ اُن کا شمار اردو کے صفِ اول کے شعرا میں نہ سہی لیکن عمدہ درجے کے شاعروں میں اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ اُن کا رنگِ سخن سب سے الگ مانا جاتا ہے اور اُن کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ اپنی غزلوں کے اشعار میں اپنے غم و یاس کی دروں بینی کے باعث اس قدر پارس ہو جاتے ہیں کہ اُن کا رنگ الہامی سا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اُن کی اوپر درج غزل کا یہ مقطع:

کتنا ہے بد نصیب ظفر، دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اس شعر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر ایک مآل اندیش شاعر تھے۔ اُنہیں مستقبل کے حالات کی بھی اپنے ذاتی حوالے سے خبر ہو گئی تھی لیکن وہ ہر حال میں صبر و شکر کر کے اُسے قبول کر لیتے تھے۔ اُنہیں عہدِ رفتہ کی عظمتوں کا بھی پورا پورا احساس تھا۔ وہ ایسی صورتِ حال کا بیان اپنے اشعار میں بڑی خوبی سے کرتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر بعض جگہ اپنے کلام میں کچھ خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ایک کامیاب شاعر تھے۔ سادگی روانی اور بے تکلفی اُن کے کلام کی

نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی مثالیں اُن کے چاروں دیوانوں میں بکثرت ملتی ہیں۔ ظفر اپنا ایک خاص آہنگ اور ایک خاص رنگ رکھتے تھے۔ اُن کے آہنگ و رنگ میں بہت سی فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اُن کے کلام کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ان کی شخصیت کا آئینہ دار اور بڑی حد تک اُن کی ذاتی زندگی سے ہم آہنگ ہے۔ وہ بادشاہ تھے۔ صوفی تھے۔ خدا ترس تھے۔ اہلِ زبان تھے۔ مظلوم تھے۔ دُکھی تھے اور یہ ساری خصوصیات اُن کے کلام میں پوری طرح اُبھر کر آتی ہیں۔ وہ بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود شاعر تھے۔ وہ شاعروں کے قدر دان اور سرپرست تھے۔ اُن کے دربار میں محفل ہائے رقص و سرود منعقد ہونے کے ساتھ ساتھ مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ ان مشاعروں میں اُستاد ذوق، مرزا غالب، مومن، اور غلام عباس جیسے شعرا شرکت کرتے تھے اور ان محفلوں اور مجالس میں آدابِ محفل کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ شاید اسی لیے عوام اپنے بادشاہ کی عزت کرتے تھے اور انہیں پیرومرشد کے نام سے پکارتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر اپنے دور کے ایک ایسے شاعر تھے جن کے یہاں انسان دوستی اور انسانی عظمت کا شعور ملتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے طاہرہ خاتون رقم طراز ہیں۔

"ظفر حقیقی اور فطری شاعر تھے۔ رنج واندوہ، الم، حسرت و یاس کی کیفیات وہ موثر طریقہ اور فصاحت کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں سلاست روانی اور آمد ہے۔ فصاحت، معاملہ بندی، محاورہ بندی اور شیریں زبانی کا رنگ بھی اُن کے کلام سے بخوبی ظاہر تھا۔ ان کی غزلیں کیفیاتِ الم کی دنیا ہیں۔ اخلاقی مضامین بھی کثرت سے ملتے ہیں اور صوفیانہ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔"

بہادر شاہ ظفر کا دور شاعری کے لئے ہی مشہور نہیں بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اُن کے عہد حکومت میں ہی ہندوستان کی آزادی کی پہلی چنگاری بھڑکی تھی۔ اپریل ۱۸۵۷ میں جب میرٹھ چھاؤنی میں ظلم کے خلاف آگ بھڑک اُٹھی تو سامراجی حکومت نے اسے بغاوت کا نام دیا تھا مگر اصل میں یہ ہندوستان کی جنگ آزادی کا آغاز تھا۔ جنگِ آزادی کی فوج گیارہ مئی 1857 کو دہلی پہونچی اور چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد اُنہوں نے دہلی کو فتح کرلیا۔ لال قلعہ کی فوج کے انگریز افسر اور اُس کے ماتحت دستے کو ختم کر کے قلعہ میں داخل ہوگئے۔ پھر فوج کے سرکردہ افسر اور افراد بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنی شہنشاہیت کا اعلان فرمادیں اور جنگِ آزادی کی فوجوں کی سرداری کریں۔

بہادر شاہ ظفر کی عمر اُس وقت اسی (80) سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ جسمانی طاقت بھی جواب دے چکی تھی اور انہیں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ خود اُن کے آدمی ہی شاید اُن سے دغا کریں گے جیسا کہ ٹیپو سلطان کے میر صادق وغیرہ نے کیا تھا۔ ظفر نے اپنے اس اندیشے کا اظہار ذیل کے مصرع میں کیا تھا:

فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

مگر اس خدشے کے باوجود حب الوطنی اور غیرت قومی نے اُن میں ایسی قوت، جُرأت اور ہمت پیدا کر دی کہ وہ کہہ اُٹھے:

ظفر یہ بارِ عشق اُٹھے نہ اُٹھے ہم ضعیفوں سے
مگر اک بار اپنی تاب و طاقت آزماتے ہیں

"جنگِ آزادی کے سپاہیوں نے اپنا مستقل ہیڈ کوارٹر دہلی شہر میں بنایا تھا اور انگریزی کمپنی کی وفادار فوجیں شہر دہلی کے باہر پہاڑی پر خیمہ زن تھیں۔ جنگِ آزادی کے مجاہدوں نے کمپنی کی فوجوں پر اس شدت سے گولہ باری کی کہ اُن کے دانت کھٹے ہوگئے۔ مگر 12 ستمبر 1857 تک کمپنی کی فوجیں اس قابل ہوگئیں کہ شہر دہلی کا محاصرہ کرسکیں۔ دو دن بعد کمپنی کی فوجوں نے شہر دہلی پر مسلسل گولہ باری شروع کردی اور 16 ستمبر 1857 کو وہ شہر دہلی کی فصیل کے کشمیری گیٹ کی طرف رخنہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئیں۔ 20 ستمبر 1857 کو کمپنی کی فوجوں اور مجاہدین جنگِ آزادی میں دست بدست لڑائی ہوئی اور مجاہدین شکست کھا کر دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور کمپنی کی فوجوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہوگیا۔ انگریز حکومت نے بہادر شاہ ظفر کو قید کرلیا اور پھر باغیوں کی مدد کرنے اور کمپنی کی حکومت کے خلاف کاروائی کرنے کے الزام میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ فوجی عدالت نے بہادر شاہ کو عمر قید اور جلاوطنی کی سزا سنائی اور پھر 1858 کے اختتام تک انہیں رنگون بھیج دیا گیا اور وہاں صدر بازار کے ایک بنگلہ میں نظر بند رکھا گیا۔ پھر رنگون میں ہی وہ 17 نومبر 1862 کو انتقال فرماگئے اور اُسی بنگلہ کے صحن میں انہیں سپردِ خاک کردیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر شاید اپنے آنے والے حالات سے واقف تھے اسی لیے اُنہوں نے یہ شعر تحریر کیا تھا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

ہم سب آزادی کے دیوانے چاہتے ہیں کہ اُس بدنصیب بادشاہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُن کے جسمِ خاکی کو رنگون کی قبر سے بڑے اعزاز اور احترام کے ساتھ بھارت لایا جائے اور اُن کی پیاری دلی یعنی کوئے یار میں عزت کے ساتھ دفنایا جائے۔ OO

حکومت اور شاعری

بہادر شاہ ظفر کی شاعرانہ عظمت

منور احمد کنڈے

آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا دور آشوب و ابتلا کا دور تھا۔ ہندوستان پر انگریز اپنا تسلط جمائے تھے اور دن بہ دن ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو عہد جہانگیر میں وارد ہندوستان ہوئی تھی دربار میں قیمتی تحائف پیش کرکے ہندستان میں تجارتی امور کی اجازت حاصل کرچکی تھی جب کہ تجارت کی آڑ میں اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اپنی طاقت میں اضافہ کرکے اور غداران وطن کو انعام و اکرام کا لالچ دے کر خود سے ملالیا جائے تاکہ ان سے قیمتی راز حاصل کرکے مغلوں کی جڑیں کاٹ کر انہیں اس درجہ کمزور کردیا جائے کہ وہ دفاعی قوت سے محروم ہوکر خود بخود ان کے آگے خود سپردگی اختیار کرلیں اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ہندوستانی عوام انگریزوں کی غلامی میں اندر ہی اندر کھول رہے تھے اور آزادی کے لئے انہیں کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا اس لئے سب کے سب راہ فرار اختیار کئے ہوئے تھے۔ ضعیف العمر مغل شہنشاہ جس کی حکمرانی محض قلعہ معلی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی قلعہ کے اندر اپنے اجداد کی روایتی شان وشوکت کی زندگی بسر کررہے تھے۔ ان کے بیٹے بیٹیوں اور پوتے پوتیوں کا وہی مقام تھا جو مغل شاہزادوں اور شہزادیوں کا ہوتا ہے۔ بادشاہ کو شعر و شاعری کا شوق تھا اور وہ ذوق کے تلمیذ تھے۔ بلی ماران میں رہنے والے غالب کی شاعری کا غلغلہ جہاں دلی کے عوام میں تھا وہیں بہادر شاہ کی شاعری کا دربار قلعہ معلی میں لگا کرتا تھا۔ شاہی محفل میں ذوق بھی حاضر رہتے تھے۔ شعری انجمن میں غزلیں اور قصیدے پڑھے جاتے تھے اور قصیدہ گو شعرا بڑے بڑے شاہی انعام و اکرام اور جاگیروں سے نوازے جاتے تھے اور ان شعری انجمنوں کی رونق کو دیکھ کر لگتا ہی نہ تھا کہ یہ پرآشوب اور ابتلا کا دور ہے۔ مگر یہ سب کچھ زیادہ دن نہ چل سکا۔ گرتی ہوئی جس دیوار کے سائے میں پناہ لی گئی تھی ایک دن وہ ان پر گر ہی پڑی۔

■

ظفر کی شاعری ہر طرح کی مجہولیت ابہامیت اور مہملیت سے پاک ہے۔ ان کے الفاظ سادہ زبان شستہ لہجہ نرم و سبک اور اسلوب دلکش اور دلآویز ہے۔ اشعار میں تغزل کی فراوانی لفظوں کی سحر بیانی و شیرینی اور موسیقیت سے بھرپور مترنم لہجہ ان کی خاص خوبیاں ہیں۔ اس کے علاوہ جو دل گداختگی حزنیہ لے اور سوز وساز کی سلگتی ہوئی درد جگاتی سی مدھم آنچ ہمیں ان کی شاعری میں ملتی ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی نے ان کے اوپر ایسے ایسے قہر ڈھائے کہ کلیجہ نکل پڑے۔ ان کے تغزل سے بھرپور سادہ اشعار میں جو سوز وساز کی دلکشی اور نغمگی ہے وہ قلب و احساس کو برانگیختہ کردیتی ہے۔

■

یہاں بہادر شاہ ظفر کی شاعرانہ عظمت پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اردو غزل کا نرم و نازک سا جو پودا ولی دکنی نے دلّی کی مٹی میں لگایا تھا وہ انیسویں صدی عیسوی کے غالب و ذوق ظفر کے عہد زریں میں ایک تناور اور چھتنار درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جوق در جوق دلّی والے اس بت طناز صد عشوہ طراز غزل کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو چکے تھے۔ غالب ذوق ظفر اور مومن غزل کو اعتبار و وقار سے ہم کنار کر چکے تھے، شاہی دربار میں بھی غزلیں تخلیق کی جا رہی تھیں اور دلی کے گلی کوچوں میں بھی۔ درباری مشاعروں کی عظمت اپنی جگہ تھی اور عوامی سطح پر انعقاد پذیر مشاعروں اور شعری نشستوں کا رواج اپنی جگہ اہم تھا۔ پھر بھی یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری سے وابستگی نے بھی اردو شاعری کے وقار کو دوبالا کر دیا تھا اور لوگ شاعری اور بالخصوص غزل کو ذریعہ عزت ماننے لگے تھے۔ دلی کے گلی کوچوں میں اگر ایک طرف غالب اور بہت سے عوامی شاعر داد و تحسین سے نوازے جا رہے تھے تو دوسری طرف مغل دربار کی اہمیت و افضلیت اپنی جگہ مستحکم تھی۔ دربار سے وابستہ شیخ محمد ابراہیم ذوق جو خود بھی اپنے وقت کے ایک اعلیٰ پایہ اور قادر الکلام شاعر تھے اور ان کے بہت سے اشعار مقبول عام ہو چکے تھے بہادر شاہ ظفر نے انہیں کے آگے زانوئے ادب تہہ کئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد فارغ التحصیل ہو کر شاعری میں انہوں نے نام بھی پیدا کیا اور ان کا کلام بھی داد و ستائش کا حق دار بنا۔ اس وقت شاعری کی جو مختصر تعریف بیان کی گئی تھی اس کو بنیاد بنا کر شعر کہنا یعنی حسن و عشق کے معاملات اور قلبی واردات کا بیان شعر کی تعمیر میں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وطنیت، فلسفہ تصوف اور اخلاقیات کے مضامین بھی عشق و عاشقی کے ذیل میں آتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری بھی انہی تمام موضوعات سے آراستہ نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں اخلاقی نظریات اور پاکیزہ خیالات کی معصومیت اور دلبری وارفتگی و شیفتگی اور فریفتگی کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی شاعری ہر طرح کی مجہولیت ابہامیت اور مہملیت سے پاک ہے۔ ان کے الفاظ سادہ زبان شستہ لہجہ نرم و سبک اور اسلوب دلکش اور دلآویز ہے۔ ایک اہم ترین خوبی جو ان کی شاعری کا خلاصہ ہے، وہ ہے ان کی غزلوں میں تغزل کی فراوانی لفظوں کی سحر بیانی و شیرینی اور موسیقیت سے بھرپور مترنم لہجہ۔ اس کے علاوہ جو دل گداختگی حزنیہ لے اور سوز و ساز کی سلگتی ہوئی درد جگاتی سی مدھم آنچ ہمیں ان کی شاعری میں ملتی ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی نے ان کے اوپر ایسے ایسے قہر ڈھائے کہ کلیجہ نکل پڑے۔ ان کے تغزل سے بھرپور سادہ اشعار میں جو سوز و ساز کی دلکشی اور نغمگی ہے وہ قلب واحساس کو بری طرح برانگیختہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

راقم الحروف یہاں ان کے چند ایسے منتخب اشعار نقل کر رہا ہے جن میں ان کی شاعری کے تمام تر متذکرہ اوصاف کو بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ایسا اس لئے کیا جا رہا ہے کہ ان کی ہر شعری خوبی کے حوالے سے اگر الگ الگ اشعار نقل کئے جائیں تو مضمون طول طویل ہو جائے گا اس لئے اب جو اشعار نقل کئے جا رہے ہیں ان میں وہی تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی نشاندہی راقم الحروف نے کی ہے ان کی پہچان میں قارئین کو ذرا بھی پریشانی نہ ہوگی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سر شام سے ہی بجھا دیا

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

نبھے کیوں کر مرا اور اس پری پیکر کا یارانہ
وہ بے پروا میں سودائی وہ سنگیں دل میں دیوانہ

مجھے آنا ملے کیونکر تری محفل میں جانانہ
مری صورت فقیرانہ ترا دربار شاہانہ

یہ 1857 کا سال تھا جب عوام اور انگریز بیزار فوج نے سور کی چربی کے کارتوسوں کی آڑ میں نافرمانی کرتے ہوئے انگریزی فوج کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا 10 مئی تاریخ کا اہم اور یادگار دن اس لئے قرار دیا جاتا ہے کہ اس دن اجتماعی طور پر عوام کی رگ حمیت و غیرت اچانک ہی پھڑک اٹھی تھی اور انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی یہ پہلی جنگ تھی جسے 1857 کے غدر سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ عوام اور فوج دونوں ہی انگریز کے خلاف سینہ سپر ہو گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو اس موقع پر بادشاہ بنا دیا

گیا اور 12 مئی کو اقتدار میں آتے ہی بہادر شاہ ظفر نے اپنی انقلابی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ ان کا یہ حکم کہ ٹیکس انگریزی حکومت کو دینے کے بجائے اپنی دہلی کی حکومت کو ادا کیا جائے نیز یہ کہ اگر کسی نے انگریز کو پناہ دینے کا جرم کیا تو وہ مورد عتاب ہوگا انگریزوں کے خلاف ان کی بغاوت کا کھلم کھلا اعلان تھا۔ اب وہ شعر و شاعری کی محفلوں کو بالائے طاق رکھ کر جوش و جذبے کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے تھے۔ وہ خطرناک مورچوں پر ڈٹ گئے تھے۔ سلیم نگر کے قلعے کے وہ خود ہی نگراں تھے اور بارودی کارخانے کا معائنہ بھی وہ خود ہی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں، مرزا مغل مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر اور مرزا عبداللہ کو بھی اپنی فوج کا سالار مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک جنگی مجلس مشاورت کا عبوری طور پر انعقاد بھی کیا جو بارہ عدد ممبران پر مشتمل تھا۔ ان میں نصف درجن ممبروں کا انتخاب فوج سے اور بقیہ چھ عدد ممبروں کا انتخاب عوام میں سے کیا گیا تھا۔ فوج کے ان چھ ممبروں میں فوجی جنرل بخت جو توپ خانے کے مالک اور بریلی میں فوج کے سالار تھے انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے اب دہلی دربار کی وفاداری میں آچکے تھے۔

اس جنگ میں علما بڑے پیمانے پر انگریزوں سے لوہا لے رہے تھے۔ ہر طرف قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں کے نرغے میں گھر جانے کے خوف سے اپنے خاندان کے افراد کو قلعے سے نکال کر ہمایوں کے وسیع و عریض مقبرے میں پہنچا دیا تھا۔ بہت سے لالچی بے ضمیر اور غدار انگریزوں سے ملے تھے جو انہیں پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ بہادر شاہ کی مع خاندان ہمایوں کے مقبرے میں موجودگی بھی اب راز نہیں رہی تھی۔ میجر ہڈسن نے جنرل ولسن سے بادشاہ کی گرفتاری کی اجازت طلب کی تو اس شرط پر ملی کہ بادشاہ کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ ہڈسن فی الفور سو سوا سو سواروں کو ساتھ لے کر ہمایوں کے مقبرے کی طرف بڑھا تو معلوم ہوا چھ ہزار باغی جن میں آدھے فوجی اور آدھے شہری تھے سڑک کے دونوں اطراف کی گھنی جھاڑیوں میں چھپے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ میجر ہڈسن کو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ لہٰذا اپنے ایلچی کے ذریعے اس نے اور میکڈونلڈ نے شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ مقبرے سے باہر آ کر خود کو گرفتار کرا دیں۔ شہزادوں نے کہا ''ہم کسی کے غلام نہیں ہیں ہندوستان ہمارا ہے ہم اس ملک کے تخت و تاج کے اصلی وارث ہیں ہم ہرگز بھی باہر نہیں آئیں گے۔'' اس پر مرزا الٰہی بخش جو بادشاہ کے سمدھی تھے، شہزادوں کو اپنی لچھے دار باتوں میں لے کر شاہزادوں کو مقبرے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ فوج انہیں گرفتار کر کے واپس لوٹ گئی اور جبکہ دہلی شہر کا فاصلہ ایک میل رہ گیا تھا انہوں نے شہزادوں کو قتل کر دیا۔ ولسن نے ان کا خون پی کر رقص کیا پھر ان کی لاشیں شہر میں لا کر کوتوالی کے دروازے پر الٹی لٹکا دیں جو چوبیس گھنٹے تک لٹکی رہیں۔ بعد میں ان کے سر کاٹ کر شاہ ہندوستان کو تحفتاً نذر کر دیئے گئے اس طرح مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر نے جام شہادت نوش کیا۔ اب مرزا بختیار بچے تھے تو بعد میں ان کو بھی تہہ تیغ کر دیا گیا۔ شہنشاہ کو بھی ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار کر لیا گیا اور لال قلعے میں لا کر ملکہ زینت محل کے محل میں قید کر دیا گیا۔ ولسن نے محض اس خیال سے بادشاہ کے قتل کی اجازت نہیں دی تھی کہ اس سے بغاوت پھر سے نہ بھڑک اٹھے جب کہ وہ خود بھی انہیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بادشاہ کے نواسوں اور پوتوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ قتل عام شہر میں بھی ہوا اور قلعے میں بھی۔ بغاوت ناکام ہو گئی تھی۔ اس جنگ میں ستائیس ہزار حریت پسندوں کو سولی پر چڑھایا گیا اور بہت سوں کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ بادشاہ کے خلاف عدالت میں ساڑھے تین سال تک مقدمہ چلا اور جلاوطنی کا فیصلہ سنایا گیا۔ بادشاہ نے جلاوطنی کے دردناک دن رنگون میں گذارے اور وطن کی مٹی میں دفن ہونے کا ارمان دل میں لئے ایک دن دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ OO

داستانِ الم

بیگم حضرت محل *

مری سرفروشی، مری نارسائی

حکومت جو اپنی تھی، اب ہے پرائی
اجل کی طلب تھی اجل بھی نہ آئی

نہ تخت اور تختہ، اسیری نہ شاہی
مقدر ہوئی ہے جہاں کی گدائی

وہ رتبہ جو پایا تھا ہم نے وطن میں
اسی کی بدولت ہوئی یہ لڑائی

عدو بن کے آئے، جو تھے دوست اپنے
نہ تھی جس کی امید، کی وہ برائی

گھڑی دو گھڑی کے یہ جھگڑے ہیں سارے
ابھی ہوگی قیدِ الم سے رہائی

زمانہ رکھے گا، پر اپنی نظر میں
مری سرفروشی، مری نارسائی

اسی خاک پر میرا مدفن بنے گا
پہاڑوں میں ہم نے ہے بستی بسائی

لکھا ہوگا حضرت محل کی لحد پر
نصیبوں جلی تھی، فلک کی ستائی

سبطین آباد گزٹ سے

* بیگم حضرت محل شعری اظہار پر کتنی قدرت رکھتی تھیں اس کا ثبوت یہ پر درد اور کرب سے بھرے اشعار ہیں۔ انہوں نے نیپال میں خود اختیار کردہ جلاوطنی میں اپنی باقی زندگی گزاری

واجد علی شاہ اختر

داستان انتزاع سلطنت

مثنوی "حزن اختر" جس کا یہ ٹکڑا ہے اگر چہ واجد علی شاہ نے 1856 میں بحالت قید فرنگ کہی تھی لیکن ان کی معزولی اور اودھ کی سلطنت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط انگریزوں کی کوشش ملک گیری کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جس کے خلاف 1857 میں پہلی جنگ آزادی چھڑی تھی۔ مثنوی سے ظاہر ہے کہ عوام واجد علی شاہ کی معزولی سے برافروختہ تھے اور یہ ان ہی کی شدید ناراضی تھی جس نے 1857 میں حکومت برطانیہ کے خلاف کھلی بغاوت کی شکل اختیار کی

بس اب ترک تمہید کر دے جواں
سنا ابتدا سے تو یہ داستاں

یہ واجد علی ابن امجد علی
سناتا ہے اب داستاں رنج کی

کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے
جو طالع تھے بیدار سونے لگے

ہوا حکم جنرل گورنر یہ یار
کرو سلطنت کو خلا ایک بار

جو تھے ملک میں بیٹھتے سہ کروڑ
اسی کی تھی یہ بادشاہی یہ زور

جفاکش کا شاہِ اودھ نام ہے
حکومت کا آخر یہ انجام ہے

جو وہ لاٹ ڈلہوزی اس وقت تھے
مضامیں انھوں نے یہ خط میں لکھے

"رعایا بہت تم سے ناراض ہے
تمہاری ریاست ہے بدنام شے"

"رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ
فقط نام کے تم رہو بادشاہ"

"مہینہ ہر اک ماہ اک لاکھ کا
ملے گا تمھیں کچھ نہیں شک ذرا"

ریزیڈنٹ جرنیل اوٹرم جو تھے
گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے

ہوا گھر میں کہرام سن کر یہ بات
وہ دن دوپہر ہوگئی ساری رات

وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج
کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج

یہ بندہ بہت اُن دنوں تھا علیل
کہا دل نے کیا سوچوں اس کی سبیل

علی نقی خاں تھے میرے وزیر
وہی میرے ہر حال میں تھے مشیر

مرے دل میں آتا تھا ہر دم خیال
جو ہونا تھا وہ ہو چکا کیا ملال

کرو مہر تم راضی نامہ پہ اب
گئی سلطنت تو گئی بے سبب

مگر سارے گھر نے نہ چھوڑا مجھے
دبایا، ڈرایا، جھنجھوڑا مجھے

رعایا یہ سب کہتی تھی "واہ واہ
کیا ہم کو اس بادشاہ نے تباہ

یہ جائے جو فریاد کو خوب ہے
یہ ناحق جو راضی ہو معیوب ہے"

علی نقی خاں کو دہلا دیا
کہ سب آبِ طعنہ میں نہلا دیا

خصوصاً مرا حال تھا یہ کیا
کہ پہرا ہر اک سمت پر تھا کھڑا

جو آجائے کوئی نہ یہ تھی مجال
مجھے زندگی ہوگئی تھی وبال

کر اب میران جی کا مہینہ رقم
کہ جس میں ہوا حکم تھا یہ علم

ولا بست و ہفتم تھی اس ماہ کی
چھٹی سلطنت جس میں مجھ شاہ کی

اکہتر تھے سن بارہ سو پر زیاد
تو میری زباں سے رکھ اب اس کا یاد

وہ دن پنجشنبہ کا تھا اے عزیز
نہ باقی رہی کچھ ریاست کی چیز

کہا دل نے آخر کروں کیا سبیل
طبیعت کا یہ حال ہے ہوں علیل

سبھوں کی بس آخر یہ ٹھہری صلاح
کرو چل کے فریاد ہے یہ فلاح

بلا کر عزیزوں کو میں نے کہا
کہ رخصت میں ہوتا ہوں حافظ خدا

رعایا سے اور تھے جو میرے عزیز
ہر اک سے کہا میں نے اے باتمیز

رہے جب تلک میرے سایہ میں سب
کرم سے کیا پرورش روز و شب

جو کچھ رنج پہنچا ہو ظاہر کرو
دلِ خستۂ شہ کو باہر کرو

سبھوں نے دیے راضی نامے مجھے
کہ آخر کے تھے سب کے یہ حوصلے

oo

واجد علی شاہ اختر

رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں*

شب اندوہ میں رو رو کر بسر کرتے ہیں
دن کو کس رنج و تردد میں بسر کرتے ہیں
نالۂ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

صاف صاف اب تو عدو میرا ضرر کرتے ہیں
دوست حالت پہ میری چاک جگر کرتے ہیں
اب تو پاؤں سے ہم راہ سفر کرتے ہیں
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دوستو شاد رہو تم کو خدا کو سونپا
قیصر باغ جو ہے اس کو صبا کو سونپا
ہم نے اپنے دلِ نازک کو جفا کو سونپا
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

مژۂ یار سے اب دل کو عداوت ہوگی
خار صحرا سے ہمیں اب تو محبت ہوگی
لوحِ دل پر یہی مرقوم حکایت ہوگی
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

شکوہ کس سے کروں ہاں دوست نے مارا مجھ کو
جز خدا کے نہیں اب کوئی سہارا مجھ کو
نظر آتا نہیں بن جائے گزارا مجھ کو
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کس کو الزام دوں قسمت کا ہے سارا یہ پھیر
تھا زبردست میں جن جن پہ ہوا ان کا زیر
اب مرے جانے میں اے اہلِ جہاں کچھ نہیں دیر
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

گردشِ چرخ نے یہ بات بھی سنوائی ہے
اپنے مالک کو یہ نوکر کہے سودائی ہے
اب تو در پیش ہمیں بادیہ پیمائی ہے
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

خاک سے پاک کیا جس کو وہی ہے دشمن
بعد مردن نہ ملے اس کو خدا چاہے کفن
اسی مردود کے باعث سے چھٹا اپنا وطن
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کس سے فریاد کروں ہے یہی رقت کا مقام
کیسا کیسا مرا اسباب ہوا ہے نیلام
میرے جانے سے ہر اک گھر میں پڑا ہے کہرام
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

رنج جو ہے اسے اب اے دلِ پُر درد اٹھا
تعزیہ خانوں تلک کا مرا اسباب لٹا
فصلِ گرمی میں تاسف! مرا گھر تک چھوٹا
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یارب خلقت
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

OO

* یہ واجد علی شاہ اختر کی ایک غیر مطبوعہ نظم ہے۔ جو اُن کی ایک بیگم نواب زہرہ بیگم کے ملفوظات اور مخطوطات شاہی سے نواب زکی علی خاں ہاتف مرحوم کو دستیاب ہوئی اور ممتاز حسین صاحب جونپور کے پاس محفوظ تھی۔ ممتاز صاحب کی عنایت سے یہ غیر مطبوعہ نظم پہلی بار شائع ہوئی۔
واجد علی شاہ نے لکھنؤ چھوڑتے وقت یہ پُر درد شعر:

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اپنے وطن کو مخاطب کر کے کہا تھا جو بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہوا اور اب بھی لوگ بھولے نہیں ہیں۔ اسی شعر پر انھوں نے مصرعے لگائے اور یہ پُر درد مخمس کہا۔

واجد علی شاہ اختر

حُزنِ اختر

زمانۂ اسیری میں نواب واجد علی شاہ کی تصنیف کردہ مثنوی 'حزنِ اختر' کے اقتباسات

رجب کی ہوئی پانچویں جبکہ یار
شب پنجشنبہ ہوئی آشکار
کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر
لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر
رجب بھر رہے کانپر میں مقیم
برٹن کے بنگلے میں باخوف وبیم
دکھائی دیا ماہ شعباں کا جب
روانہ ہوئے واں سے باصد تعب
الہا جو آباد ہے ایک نام
رہے آٹھ دن اس میں اے خوش خرام
بنارس میں آکر رہے چودہ روز
وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز
بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ
اتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ
وہ مصروف خاطر ہوا اس قدر
فرشتہ بنا کہنے کو تھا بشر
وہاں پر دخانی کیا اک جہاز
چڑھے اس پہ جس دم ہوئے سرفراز
رہے اس پر ہم بیس انیس دن
وہ جاشو تھے اس پر کہ جس طرح جن
دکھائی دیا جب کہ ماہِ صیام
تو کلکتہ میں آئے اے نیک نام
جو گنئے تو تاریخ تھی ساتویں
کہ داخل ہوئے ہم ملول وحزیں
ہر اک جا ہماری سلامی ہوئی
جو توپیں چلیں نیک نامی ہوئی

O

برس گزرا ہم کو جو اے خوش سیر
یکا یک جہاں میں اڑی یہ خبر
کہ بلوائی کچھ جمع ہونے لگے
وہ لکھا مقدر کا دھونے لگے
ہوئی خوب برگشتہ انگریزی فوج
امنڈتی ہے جس طرح دریا کی موج
سبب اس کا ہم نے تو تھا یہ سنا
کہ کچھ کارتوسوں پہ قصہ ہوا
وہ تھے گاؤ کے چرم کے کارتوس
اسی پر ہوئی تھی یہ بانگِ خروس
کہوں کیا میں ان روزوں تھا جو علیل
شفا کی نکلتی نہ تھی کچھ سبیل
غرض بعدِ تجرید پائی شفا
نہ طاقت بھی آئی تھی اے مہ لقا
ہوئیں نذر کی گھر میں تیاریاں
لگی کھلنے خلعت کی گل کاریاں
ہوا ہر طرف ناچ گانا شروع
درختِ خوشی کے جمے سب فروع
وہ جلسہ رہا دھوم سے ثلث شب
گھڑی چار باقی رہی رات جب
تو سوسو رہے جا کے سب گلبدن
گیا خواب میں وہ چمن کا چمن
میں سوتا تھا غفلت کا جاگا ہوا
مقدر ادھر مجھ سے بھاگا ہوا
یکا یک یہ غل کان میں آگیا
غضب ہوگیا ہے ستم چھا گیا

O

ارے دوڑو للہ لوگو چلو
اٹھاؤ اٹھاؤ اٹھاؤ اٹھو
اٹھا خواب سے سن کے آواز میں
بھچک رہ گیا دیکھ انداز میں
جو دیکھا تو لہری ہے انگریزی فوج
چلی آتی ہے جیسے دریا کی موج
کوئی کہتا ہے اب اڑا دیں گے یہ
کہ سب موچی کھولا* گرادیں گے یہ
کوئی کہتا ہے اے خدائے جہاں
مری آبرو اب تو رکھ الاماں
کہا میں نے کیا شور وغوغا یہ ہے
یہ کون آیا ہے کیسا چرچا یہ ہے
کوئی بولا کیا کہئے اے بادشاہ
علی نقی خاں ہوئے قید آہ
سکرتر جو تھے لاٹ کے پیشکار
وہ کہنے لگے مجھ سے اے شہریار

* موچی کھولا یعنی مٹیابرج (کلکتہ) جہاں لکھنؤ سے آنے کے بعد واجد علی شاہ مقیم ہوئے

کہ چلیے مرے ساتھ یہ حکم ہے
نہ کیجیے سوا اس کے اب کوئی شے
کہا میں نے کیا وجہ فرمائیے
قصور آپ بندے کا بتلائیے
کہا حکم سرکار سے یہ ہوا
کہ کچھ شبہ سرکار کو آگیا
جو تھا اڈمنسٹن سکرتر کا نام
میں کرنے لگا ان سے بڑھ کر کلام
کہ میرا تو ہرگز نہیں ہے قصور
میں جھگڑوں سے رہتا ہوں خود دور دور
مفصل تو بتلایئے اس کا حال
مجھے رنج ہے اس سخن سے کمال
کہ مجھ سے الٰہی ہوئی کیا خطا
ہوئے لاٹ صاحب جو مجھ پر خفا
انھوں نے کہا اتنا معلوم ہے
کہ غیروں کی شرکت کی کچھ دھوم ہے
میں کھانے لگا ان سے قسمیں شدید
کہ یہ افترا وہم سے ہے بعید
دوم یہ طبیعت بہت ہے علیل
سوائے خدا کون ہے اب کفیل
مرے گھر پہ ہو انتظامِ حضور
یہیں کیجیے مرا ثابت قصور
نہ مانا انھوں نے یہ مرا یہ پیام
کہا کچھ نہیں ہے دلائل سے کام
چلیں گے جو ہمراہ فرمائیے
جنھیں ساتھ لینا ہو بتلایئے
وہاں جمع تھے میرے سارے رفیق
کہا میں نے ہیں یہ ہمارے رفیق
چلیں گے یہ سب ساتھ لکھ لیجیے نام
وہ کرنے لگے اس طرح سے کلام

سوا آٹھ لوگوں کے ہووے نہ اور
ان ہی ناموں میں کیجیے آپ غور
مجاہد کو دولہ سے کیجیے بہم
تو ہو نام اس خوش لقب کا رقم
چچا ہیں یہ میرے عجب ذی کرم
وہ آکر ہوئے مجھ سے اس دم بہم
دیانت سے دولہ جو آکر ملے
قلم نام خوش اس جواں کا لکھے
جواں تھا وہ بے مثل زنگی نژاد
وہ گاڑی کے پیچھے چڑھا خوش نہاد
سکرتر، چچا، میں وہ زنگی جواں
ہوئے ایک گاڑی میں جلوہ کناں
قلی* وہ جو دروازۂ قلعہ تھا
اتارا وہاں مجھ کو بامد بکا
میں اترا وہاں درد و غم کے قریں
ملول و مفکر الم میں حزیں
جو کلکتہ کے قلعہ میں میں رہا
تو ان لوگوں نے ساتھ میرا دیا

O

رہے جب قلی باب میں آٹھ روز
ہوئی آتشِ رنج و غم سینہ سوز
جو کوٹھی ہے اک قلعہ کے بیچ میں
یہ تجویز ٹھہری وہاں پر رہیں
غرض ہم کو لائے اٹھا کر یہاں
فلک الاماں الاماں الاماں
کوئی آنکھ ہم سے ملاتا نہیں
پرِ جانور تک بھی آتا نہیں

ہوئے بند در قید خانے کے جب
لکھوں کیا جو گزرا ستم اور غضب
کلیجہ مرا منہ کو آ آگیا
رکا دم جو سینہ میں گھبرا گیا
زن و مرد تیئیس تھے میرے ساتھ
انھیں لائے کوٹھی میں سب باتھوں ہاتھ
چچا میرے نواب والا حشم
نہایت ہیں محسن بڑے ذی کرم
یہ کہتے تھے وہ ہاتھ میں لے کے تیغ
نہیں تم سے جان اپنی مجھ کو دریغ
اگر حکم ہو لالہ گوں رنگ ہو
کہا میں نے موقوف یہ ڈھنگ ہو
میں ہوں بے گنہ میری شرکت رہے
مصیبت پڑے پر بھی طاعت رہے

O

کوئی رنج زنداں میں ایسا نہیں
جو اس بے سروپا کو پہنچا نہیں
مگر دردِ فرقت ہے سب سے سوا
ہر اک غم دیا ہے اسی نے بھلا
یہ گرداب فرقت ہے زنداں نہیں
یہ وہ بحر ہے جس کا پایاں نہیں
یہ وہ غم ہے جس سے نہیں بچتی جاں
اسی غم سے بوڑھے ہوئے ہیں جواں
اسی غم نے پانی سا دل کر دیا
اسی غم نے کوہِ الم دھر دیا
مرا غنچۂ دل ہوا غم سے بند
چمن بن گیا داغوں سے بند بند
دلِ زار ہرگز سنبھلتا نہیں
وہ کوہ گراں ہے کہ ٹلتا نہیں
ہر اک سمت پھرا ہر اک سمت یاس

---

*فورٹ ولیم کالج کا ایک پھاٹک قلی دروازہ کہلاتا تھا۔ آٹھ دن یہ قیدی اس کے بالا خانہ پر رہے اور اس کے بعد قلعہ کے اندر ایک کوٹھی میں بادشاہ اور ان کے ہمراہیوں کو جگہ دی گئی

رفیق و ملازم میں خوف و ہراس
کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کج کلاہ
اودھ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ
ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
ہوئے قید اس طرح ہم بے گناہ
اسیروں میں ہوں نام ہے بادشاہ
زن و مرد اٹھارہ اور اک یہ جاں
شب و روز زنداں میں ہیں دل طپاں
ہر اک اپنے جینے سے بے زار ہے
ہر اک قیدِ غم میں گرفتار ہے
بہشتی جو آتا ہے اور خاکروب
وہ پہرے کی شدت سے ہے سینہ کوب
جو جاروب دیتا ہے وہ سینہ سوز
تو گورا بھی ہمراہ آتا ہے روز
بہشتی کا یہ حال تحریر ہے
وہ جس طرح ہے نقشِ تصویر ہے
کبھی روشنی والا لائے جو تیل
تو دیتا ہے گورا اسے بھی ڈھکیل
اور اک ہربرٹ صاحبِ خوش بیاں
سحر شام ہوتے ہیں جلوہ کناں
وہ میجر ہیں کرنیل کے پیش دست
وہ کرتے ہیں زنداں کا خود بندوبست
وہ گنتے ہیں خود آ کے شام و سحر
جو بیمار ہو لیتے ہیں وہ خبر
ہے اک اور داروغہ زندان کا
کہ کالن ہے نام اس نگہبان کا
وہ تکلیف ہے جس سے دل تنگ ہے

شب و روز زنداں کا بد رنگ ہے
زبس ہے یہ کوٹھی* نہایت کلاں
مگر میرے کس کام کی اے جواں
ہر اک اس کا در بند ہے آہ آہ
وہ گرمی وہ گرمی کہ دل ہے تباہ
کھلے ہیں جو در تو ادھر دھوپ ہے
یہ ہے رنگ کوٹھی کا یہ روپ ہے
اس اوسط کے درجہ میں دل شق ہیں ہم
نہ اوپر نہ نیچے معلق ہیں ہم
کئی خط کئے لاٹ کو بھی رقم
ہوئے سرفراز ایک سے بھی نہ ہم
کسی خط کا لکھا نہ ہم کو جواب
خدا جانے کس امر پر ہے عتاب

O

یہ ناکارہ اختر کی ہے التجا
نہ رد کرنا تو اس کو اے کبریا
کہ یہ بے گنہ قید میں ہے تباہ
شب و روز زنداں میں کرتا ہے آہ
نہ کوئی خطا ہے نہ کوئی قصور
نہ خاطیِ غلماں نہ ہے دزدِ حور
نہ خونی نہ رہزن نہ ٹھگ ہے نہ چور
کیا ہے نہ گا ہے غریبوں پہ زور
گرہ بُر نہیں میں اُچکا نہیں
نہ لے بھاگا تھا میں کوئی نازنیں
شرابی نہیں ہوں جواری نہیں
کسی مال کی راہ ماری نہیں

کسی کو نہیں مجھ پہ دعویٰ کوئی
کہے گا مرے سامنے کیا کوئی
تو ہی جانتا ہے تو ہی ہے علیم
جو میں ہوں سزاوارِ نارِ جحیم
جلائے اگر تو تو تن پاک ہو
جو ہوں خاک تو کیمیا خاک ہو
نظر رحم کی چاہئے کردگار
یہ بخشائے بر من پئے جانِ زار
دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں میں
دُرِ اشک رو کر بہاتا ہوں میں
مری آبرو رکھ خدائے کریم
بہت اپنے بندوں پہ ہے تو رحیم
الٰہی رہیں شاد یارانِ ہند
پھر آباد ہوویں جوانانِ ہند
رہائی تری ہو تو ہے بے گناہ
یہ درگذرا اس سے نہیں بادشاہ
عوض بادشاہی کا گر جان ہے
تو بندہ بھی خائف ہر اک آن ہے
فقط نامِ شاہی سے ہوں میں خراب
کہاں میں کہاں قید کیسا عذاب
اٹھاتا ہوں قرآں نہیں ہے یقیں
کروں کس سے فریاد میں دل حزیں
دلِ زار ہونٹوں پہ آ آ گیا
میں گھبرا گیا سخت گھبرا گیا
الٰہی مجھے قید سے دے نجات
نکلتی نہیں غم سے اب منہ سے بات
بس اب الحذر الحذر اے خدا
کر اس اخترِ زار کو تو رہا

OO

* فورٹ ولیم کالج کی وہ کوٹھی جس میں واجد علی شاہ اور ان کے ہمراہی قلی دروازہ کے بالائی حصہ میں آٹھ روز قیام کے بعد منتقل کئے گئے

نواب محمد رضا خاں عاشق

زوالِ لکھنؤ
(مثنوی 'رشکِ ماہِ تمام'* سے)

کہاں ہیں وہ جلسے کہاں ہیں وہ رنگ
مئے عیش و راحت کے جتنے تھے ڈھنگ
کہاں ہیں وہ غنچے کہاں ہیں وہ گل
نہ ساغر ہے باقی ، نہ بوتل، نہ مل
نہ وہ زمزمے ہیں نہ وہ چہچہے ہیں
نہ محفل نشیں ہیں نہ وہ قہقہے ہیں
کہاں ہے وہ سلطاں کہاں ہے وہ فوج
نہیں لکھنؤ کا وہ باقی اب اوج
پڑے توپ خانے ہیں سنسان سب
نہ جانے یہ اب ہوں گے آباد کب
سواروں کی 'ملٹنیں' ہوئیں سب اجاڑ
گرا آسماں ان پہ ، ٹوٹا پہاڑ
'نجیبوں' کی جب پلٹنیں ٹوٹیں سب
غریبوں کی حالت ہوئی غیر تب
ہوئی ہر طرف جب 'تلنگوں' کی فوج
کہاں پھر وہ کپتان صاحب کا اوج
کمیدان کوڑی کے دو دو ہوئے
مثل ہے نہ کپڑے بھی ثابت رہے
خزاں کا سواروں پہ پتھرزہ چلا
ہوئے سب نشانہ وہ بندوق کا
الٰہی کہاں ہے وہ تختِ رواں
اڑا لے گئیں اس کو پریاں کہاں
غضب ہے جہاں فرش مخمل بچھے
ستم کی اسی جا پہ جھاڑو پھرے
محلے ہیں سنسان کوچے اجاڑ
گرا لکھنؤ پر ہے غم کا پہاڑ
'بگل' کی صدا تھی بہت خوش نما
'جلاجل' کی آواز تھی دلربا

کہاں ہیں وہ گھوڑے کہاں ہیں وہ فیل
کہاں ہیں جو رہتے تھے ان کے کفیل
کہاں ہیں کبوتر، کہاں ہیں وہ باز
کہاں اڑ گئے کر کے آپس میں ساز
کہاں ہیں وہ چیتے، کہاں ہیں وہ شیر
شکم وہ کریں آ کے دشمن سے سیر
کہاں ہے وہ فخرِ سلیماں گیا
پتہ دے 'ہمایوں' کا بادِ صبا
سنا ہے یہ اک روز وقتِ سحر
گیا اک فرنگی کمر باندھ کر
جہاں 'جانِ عالم' تھے پہنچا وہاں
یہ پوچھا بتاؤ ہے نائب کہاں
سنا جب یہ نائب نے دوڑے گئے
ہزاروں خیالات دل میں بھرے
گئے پاس جس دم تو اس نے کہا
کہاں 'جانِ عالم' ہیں مجھ کو بتا
نظر آئے طور ان کو جس دم برے
نہ آپے میں اپنے وہ اس دم رہے
گئے ہو کے مجبور سلطاں کے پاس
کہا بیٹھے کیا ہو تم اے حق شناس
بلاتا ہے انگریز در پر کھڑا
نظر مجھ کو آتا ہے ساماں بُرا
کہا شہ نے جو مرضیِ کردگار
کہ ہے مالک الملک کو اختیار
کیا جا کے قلعے☆ میں سلطاں کو بند
لگے دینے ایذائیں ظالم دو چند
عجب غم سے تھا جانِ عالم کا حال
کرے رحم ان پر مرا ذوالجلال

لگے بڑھنے سنبل کی صورت سے بال
الجھتا ہوا ان کا دل پر وبال
وہ کاکل کہ عنبر کی جن میں مہک
اسی میں نہ کنگھی ہو کیوں اے فلک
ہوا زرد رخ مثلِ برگِ خزاں
نہ تھا سبزہ خط تھے کبودی نشاں
خطِ سبز ایسا تھا رخ پر بڑھا
لگا صاف مخمل میں تھا مورچا
جب غم سے ایسا ہوا جسم زار
نظر آتا نظروں میں مانندِ تار
ہوا حد سے افزوں بدن ناتواں
تجمل درد چہرے سے تھی زعفراں
نقاہت سے سر تھا اٹھانا محال
ہوا بوجھ دل پر تھا، بار خیال
وہ آنکھیں جو نرگس سے تھیں خوب تر
رواں ان سے آنسو تھے دو دو پہر
کسی کا مقدر ہو ایسا نہ بد
نہیں 'جانِ عالم' کے صدموں کی حد

* 'رشکِ ماہِ تمام' نواب محمد رضا خاں عاشق نے 1859 میں شروع کی اور 1860 میں یہ مکمل ہوئی۔ مثنوی میں واجد علی شاہ کی معزولی، ان کا سفرِ کلکتہ، مٹیا برج کھولا (مٹیا برج کلکتہ) میں نظر بندی فورٹ ولیم میں ان کے قید کئے جانے اور اس انقلاب میں لکھنؤ جن مصائب و آلام کا گہوارہ بنا ان سب کا ذکر ہے۔ یہاں مثنوی کے چند ہ اشعار ان کیفیات کی بابت دیئے گئے ہیں، اور یہ اقتباس پورے تسلسل میں نہیں ہے۔ ادارہ

☆ فورٹ ولیم کلکتہ

مولوی محمد ظہور علی

تاریخِ تباہیِ انگریز*

آں قوم بہانہ جو نصارا
ظالم بہ نہان و آشکارا
ناگاہ عذابِ حق رسیدہ
از اوجِ بخاک در کشیدہ
یعنی ہمہ فوج و لشکر او
گردید عدوئے پیکرِ او
در ماہِ صیام گشت ناگاہ
قتل و قمعش بحکم اللہ
اکثر شد ازاں گروہ فی النار
مفرو شدند نیز بسیار
تاراج شدہ خزانۂ شاں
یک بار بسوخت خانۂ شاں
در بنگلہ و کمرہ آتش افتاد
شد مال ومنال جملہ برباد

آں لشکرِ غازیانِ جراز
آمد بحضورِ شاہِ دیں دار
یعنی کہ ابو ظفر شہِ دیں
مقبولِ خدا شریعت آئیں
شد لشکر و ملک تابع او
باز آمدہ آب رفتہ در جو
حاضر شدہ بخت خاں بہادر
در حشمت وجاہ شد تکاثر
تاریخ تباہیِ نصارا
خواہم کہ نمایم آشکارا
فرمود خرد کہ اے سخن گو
انگریز تباہ شد بہر سو

1273 ہجری

* یہ نظم فارسی کی ضرور ہے لیکن جنگ آزادی کی ابتدائی فتوحات کا سب سے زیادہ واضح بیان اسی نظم میں ملتا ہے۔ مختصر سے تغیر الفاظ کے ساتھ یہ نظم 'صادق الاخبار دلی' کی اشاعت مورخہ 27 جولائی 1857 میں شائع بھی ہوئی تھی۔

مرزا غالب

1857

بس کہ فعّال مایُرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل وجاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

مفتی صدرالدین خاں آزردہ

مصطفی و صہبائی ☆

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

☆شہیدراہ آزادی

لامعلوم

صہبائی کا مرثیہ*

ندانم کجا رفت آں نقش پاک
مُلک بُرد یا ماند بر روئے خاک
ندانم کسے داد او را کفن
ویا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کردہ است با او سپہر
زجامہ کفن کردیا تاب مہر
بخاکش نمودند او را نہاں
ویا مرتفع شد سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم براو خواندہ است
بعطر گلابی برافشاندہ است
کداے گل وبلبل وباد دشت
بخاکش بہ حسنِ عقیدت گزشت

*یہ مرثیہ اگرچہ فارسی میں ہے لیکن ایک ایسے ادیب کی یاد دلاتا ہے، جس نے جنگ آزادی کے سلسلے میں جام شہادت نوش کیا۔

بازار موت

مرزا قربان علی بیگ سالک

شہر دلّی ہوا ہے کیوں خالی
کیوں مٹی یاں سے صورت آدم
روز بازار موت دیکھ کے چین
ملک الموت کو نہیں اک دم
ڈھیر کس جا نہیں ہے مردوں کا
کس زباں پر نہیں فغاں پیہم
نہیں تل دھرنے کو زمیں میں جگہ
مردے کا دفن ہو بلا سے اہم
خاک آلود گان پیشیں پر
یہ نئے طور کا ہوا ہے ستم
ایک کی قبر میں گئے سو اور
تنگی جا سے لڑتے ہیں باہم
قافلہ قافلہ گئے کیوں لوگ
کب ہے اتنا وسیع ملک عدم
نہیں جاتے مگر عدم کو یہ لوگ
اور بھی نکتہ اس میں ہے مبہم
کرۂ خاک وباد و آتش و آب
فرطِ خلقت سے ہوگئے تھے کم
روئے اپنی کمی پہ یہ چاروں
ہوگیا رحم خالق عالم
دے دیا ان کو لے کے خلقت سے
کچھ عناصر جو مل رہے تھے بہم

واجد علی شاہ کی معزولی

آغا حجو شرف*

مدد کیجئے لکھنؤ لٹ گیا
خبر لیجئے لکھنو لٹ گیا
تباہی کو آبادی ہے ناپسند
غلاموں کا حضرت کے ہے رزق بند
یہ (تقدیر؟) بھولے ہیں اللہ کو
نکالا ہے واجد علی شاہ کو
عطا کیجئے ان کو پھر تخت و تاج
ملے راج پھر ان کو راجیں یہ راج
پریشان ہیں سب صغیر و کبیر
یہ اللہ ہو جلد ہو دستگیر
لے آؤ واجد علی شاہ کو
بٹھا جاؤ واجد علی شاہ کو
حمایت میں لے لو ولی عہد کو
ولی عہدی پھر دو ولی عہد کو
خدا وند بہرِ خدائے قدیر
عنایت ہو پھر ان کو تاج و سریر

ہوا شہر میں غل، سواری چلی
گلستاں سے بادِ بہاری چلی
جو وامانده تھے رنج ان کو رہے
ہزاروں کی آنکھوں سے آنسو بہے
ہوا پانچویں کو، رجب کی سفر
رقم بارہ سو سن بہتر کو کر
قلق سے زمانہ کا دم گھٹ گیا
خداوند سے جب وطن چھٹ گیا
نمک خوار جتنے سرافراز تھے
چلے ساتھ یہ سب کہ مختار تھے
وزیر الممالک ہیں خانہ نشیں
ہوا ہے ابھی ان کا جانا نہیں

* مثنوی 'افسانہ لکھنؤ' جس کے اقتباسات یہاں دیے جارہے ہیں آغا حجو شرف لکھنوی نے مٹیا برج کلکتہ کے قیام میں 1856 میں لکھنؤ میں جو حالات رونما ہوئے ان کے بارے میں 1290 ہجری مطابق 1873 میں لکھی تھی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے شرف کے حالات میں اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہرحال اس مثنوی کا قلمی نسخہ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ یہاں 'واجد علی شاہ کی معزولی' کے عنوان سے جو ٹکڑا دیا جارہا ہے وہ دراصل منقبت کے اشعار ہیں جن میں حضرت علیؓ سے واجد علی شاہ کی بحالی کی دعا مانگی گئی ہے۔ دوسرے ٹکڑے میں شرف نے واجد علی شاہ کی لکھنؤ سے روانگی کا پر درد منظر پیش کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے قطع نظر یہ مثنوی اس حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اس زمانے کے مشاہیر شاعروں، ادیبوں، تاریخی کرداروں، مختلف فن کاروں، ندیموں، مصاحبوں امیروں، منصب داروں کے نام جو آئے ہیں وہ غالباً کہیں اور ایک جگہ نہ ملیں گے۔ اودھ کے معرکوں میں آزادی کے جن پروانوں نے دادِ شجاعت دی ان کا نام بنام ذکر بھی ملتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر

قیدِ فرنگ

بالعکس ہیں زمانے میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے الٹا زمانے نے اختیار
ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجب روشِ باغِ روزگار
جو نخل پُر ثمر ہیں اٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

بادِ صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں سر بہ سر کفِ افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخل مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تم میں جاں
جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

یہ گنبد فلک ہے عجب طرح کا قفس
طاقت نہیں ہے نالہ کی بھی جس میں اک نفس
جنبش ہو ایک پر کی تو پر ٹوٹ جائیں دس
رہ جائے دل کی دل میں نہ کسی طرح سے ہوس
کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے

کیا کیا جہان میں ہوئے شاہانِ ذی کرم
کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم
دارا کہاں کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم
کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

بیانِ درد *

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
وے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی ان کے دل میں بخار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا اک چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے
شب و روز پھول میں جو تلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انھیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
سبھی جا وہ ماتمِ سخت ہے کہو کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں دیکھو وہ کس طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے
نہ وبال تن پہ ہے سر مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا مجھے اپنی زندگی بار ہے
کیا ہے غم ظفر تجھے حشر کا جو خدا نے چاہا تو بر ملا
ہمیں ہے وسیلہ رسولؐ کا وہ ہمار احامیٔ کار ہے

* بعض حضرات اسے حسامی کی غزل بتاتے ہیں لیکن نیشنل آرکائیوز کے کاغذات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ غزل حقیقتاً بہادر شاہ ظفر ہی کی ہے۔ حسامی 1882 تک زندہ تھے انہیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا اور اکثر ظفر کی یہ غزل موثر انداز میں گایا کرتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے ظفر کی یہ غزل ان کے نام سے منسوب ہو گئی۔ حوالہ: NAFD.POL.A.No 3/4 AUG 1862

نواب مرزا داغ دہلوی

شہر آشوب

فلک زمین وملائک جناب تھی دہلی
بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی
جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی
فلک نے قہر و غضب خوب تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں
لہو کے چشمے ہیں چشم پُر آب کی صورت
شکستۂ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لئے ہیں گھر دل خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں توبہ عذاب کی صورت
زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی
رسن ہے طوق ہے گردن ہے بے گناہوں کی
زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے
ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل وعورت وپیر و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے
جو کہئے جوششِ طوفاں کبھی نہیں جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھ زندوں کو بےچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی
جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت
چڑھے ہی آتے تھے سر پر بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی اک اک گنوار کی صورت
چھپی نہ ان سے پر اہل دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہل قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا
زبان بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی
ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی
پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی
جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں
بنا ہے خال سیہ، رنگ مہ جمالوں کا
دوتا ہوا ہے قدراست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا
عجیب حال دگرگوں ہے دلّی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی
تلاش بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
یہ نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی
کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی
یہ اہل سیف وقلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ
غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں
کہ ہیں جو لعل وگہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں
جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں
پئیں جو آب بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمت باری تو قہر ہو جائے

فغان دہلی

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام ونشاں نام ونشانِ دہلی
اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہ ہووے گا حساب
بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیانِ دہلی
دے دیئے فوج کو حکام نے انعام میں سب
گنج قاروں سے فزوں گنج نہانِ دہلی
نیر وغالب وآزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

ظہیر دہلوی

ہنگامۂ دارو گیر*

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے
گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور یہ کیا زوال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے

جو عطرِ گل کو نہ ملتے، ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ نہ چلتے، ملے وہ مٹی میں

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی
سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی
ہر ایک سمت سے فریاد گیرو دار ہوئی

ہر ایک دشتِ بلا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا

ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا
ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہلِ زباں خوش بیاں قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے اک جہان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے
وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے
جفا کی تیغ کے سب زخمِ دل پہ کھائے ہوئے

وہ داغِ مرگِ عزیزاں وہ دشت پیمائی
وہ ریگِ خارِ مغیلاں وہ آبلہ پائی

داستان انقلاب

سوادِ ہند میں عرشِ احتشام تھی دہلی
بیاضِ مردمکِ خاص و عام تھی دہلی
زمینِ چرخ کی قائم مقام تھی دہلی
جب آیا عہدِ جوانی تمام تھی دہلی

یہ وہ زمیں ہے زمیں جس کی زر اگلتی ہے
یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

جہان آباد لقب تھا یہ عز و شاں کے لئے
جہاں کا لفظ بنا تھا اسی مکاں کے لئے
یہ درجے اس کے لئے تھے نہ آسماں کے لئے
کہ اس سے کام زمانے نے دو جہاں کے لئے

فلک سے رتبہ میں رتبہ دو چند تھا اس کا
مقامِ عرش سے پایہ بلند تھا اس کا

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا مہ جمالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا ذی کمالوں کا

یہ وہ مکاں ہے مکیں جس کے قیصر و جم تھے
یہ خطہ وہ ہے گدا جس کے فخرِ حاتم تھے

بدی کے تخمِ شقی کشتِ دل میں بونے لگے
کہ بے گناہ زن و بچہ قتل ہونے لگے
جو اہلِ درد تھے رو رو کے جان کھونے لگے
مسیح و خضر بھی منہ ڈھانپ ڈھانپ رونے لگے

ستونِ خانۂ نصفت گرا دئے یکسر
چراغِ بزمِ عدالت بجھا دئے یکسر

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سر و ساماں
وہ جانا پردہ نشینوں کا باسرِ عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں
وہ دارو گیر سپاہِ شریرِ بے ایماں

درازِ دستِ تطاول ستم شعاروں کا
فلک کو یاس سے تکنا ستم کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے
ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے
قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے

کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمینِ شہر نے اک اک کے پاؤں پکڑے ہیں

گلوں سے جسموں پہ اک مردنی سی چھائی تھی
وہ مہ سے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی
غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی
غرض کہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی

بیان کیجئے نصیبوں کی کیا برائی کا
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

* مرزا الٰہی بخش شاہزادے کی نشان دہی پر تیس شاہزادگانِ دہلی جن میں بادشاہ کے بیٹے، پوتے، نواسے اور داماد شامل تھے گرفتار کر کے بیرون دہلی دروازہ ولائے گئے اور وہاں ان کو قتل کر کے ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھیج دئے گئے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

دہلئ مرحوم

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی، مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رُلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی ہرگز
یاد کر کرکے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کردیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانا ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

کالے گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل، مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ ہُشت مُشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کے
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جاکے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھی تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا کہ ''سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار''
اور کہا کالے سے ''تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار''

منیر شکوہ آبادی

فریادِ زندانی

سیہ کاروں کے سر پر افسرِ عزت نظر آئے
بنے ہیں مرغِ عیسیٰ ان دنوں مرغِ سلیمانی
ہوا ہے مشتری محبوس گویا برجِ عقرب میں
نظر آتے ہیں اہلِ علم و فضل اس سال زندانی
کیا زاغ و زغن نے آشیانہ چترِ منزل پر
سرِ تختِ ہما ہیں بوم صرفِ بال افشانی
عدالت سے ملی ہے چغد و بوم و زاغ کو ڈگری
ہوئی ہے ضبط ملکِ بلبل و طاؤس بُستانی
بہار آئی بھی دنیا میں تو دیوانے کہاں ہوں گے
کرے گی بوئے گل کس کے دماغِ جاں کی مہمانی
ملا ہے عہدۂ خورشید شاید سعدِ ذابح کو
کہ لاکھوں ہر سحر تلوار سے ہوتی ہیں قربانی
قضا جتنی معلق تھی وہ مبرم ہوگئی اب کی
لٹک کر پھانسی میں جاتی رہی بنیادِ انسانی
گئی سرخی سڑک پر جانتے ہیں دیکھنے والے
ہوا ہے خونِ ناحق سے یہ فرشِ خاک افشانی
لڑے ہیں گورے کالے ہند میں باہم غضب آیا
غراب البین کے سایہ سے پہلے ہے یہ ویرانی
جہاں دیکھو سپاہی مست ہیں حکام مجنوں ہیں
اب اس کو فوج داری کوئی سمجھے خواہ دیوانی

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے* میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہوگیا پانی
پھنسے ہیں ایک جا ادنیٰ و اعلیٰ واہ ری قسمت
برابر خانۂ زنجیر میں ہے سب کی مہمانی
مٹا ہے نام شاہی ہند سے اس درجہ ان روزوں
نہیں ممکن کہ اب بانات بھی کہلائے سلطانی
عدالت ان دنوں ایسی بڑھائی ہے زمانے نے
کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں اک ہی گھاٹ پر پانی
پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے
الٰہی روئے کس کا سر پکڑ کر تاجِ سلطانی
کسی نے کوڑیوں کے مول بھی پوچھا نہ ان روزوں
چڑھے نیلام پر سلطانی و نوابی و خانی
نکلوا کر وطن سے بھر دیا جنگل میں لاکھوں کو
جگہ رہنے کی اب پاتے نہیں غولِ بیابانی
پھنسا ہے اس طرح مجھ سا مفیدِ خلق محبس میں
کہ علمِ کیمیا جیسے دلِ قاروں میں زندانی
اگر اشیا میسر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی
بڑی قسمت جو روٹی دال مل جائے بآسانی
مناجات و دعاؤ استغاثہ بڑھتے جاتے ہیں
نہیں جاتی نہیں جاتی نہیں جاتی پریشانی

رباعیات

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہرِ غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

زنداں میں تو ہم اسیر و مجہول آئے
کس طور سے نیند حسبِ معمول آئے
گھر سے نکلے جو بے حواسی میں منیر
خوابِ راحت پلنگ پہ بھول آئے

ہیں ضعف سے ہڈیاں عیاں سرتاپا
سونے سے زمیں کے بہت ہے ایذا
اکسیر ہے فرشِ خوابِ زنداں میں منیر
سونا ہے پلنگ کا نصیبِ اعدا

زنداں میں جو بڑھ چلنے کے آہنگ ہوئے
کپڑے بھی ہم سے عازمِ جنگ ہوئے
ملبوسِ خلافِ وضع کے شکوے میں
کچھ عرض کیا تو پائنچے تنگ ہوئے

ہر چند کہ زنداں میں جگر جلتا ہے
پر چھوڑ کے ضعف ہمیں کب ٹلتا ہے
اٹھتے ہیں عصا کے زور سے پاؤں منیر
ٹٹو لاٹھی کے خوف سے چلتا ہے

پہلے ہوئے چھ روپے ہماری تنخواہ
پھر آٹھ سے دس ہوئے خدا ہے آگاہ
ننانوے کا پھیر رہا قید میں بھی
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

* جزیرہ انڈمان، جہاں منیر کو 1857 کی تحریک کے سلسلے میں قید کر کے بھیجا گیا تھا

منیر شکوہ آبادی

مصائبِ قید

فرخ آباد اور یارانِ شفیق
چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے

آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے

اک مرا شاگرد تھا اس شہر میں
پھل وہ پائے گلشنِ تقدیر سے

لفظ خاں کا جزوِ اول کر وزیر
نام اس کا جان اس تقریر سے

کیں سعادت مندیاں اس نے بہت
رہ گیا عاجز مری تقدیر سے

جس قدر احباب خالص تھے وہاں
در گزر کرتے نہ تھے تدبیر سے

پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کر تیر سے

شمر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں
قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے

مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں
کج رؤوں میں بڑھ کے چرخِ پیر سے

کر کے خونِ ناحق نواب جاں
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

کچھ شدائد قید کے کہہ دوں اگر
خون ٹپکے ہر لبِ تقریر سے

باندہ کے زندان میں لاکھوں ستم
سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے

پانی تھا نایاب مثلِ آبِ رود
چاٹتے تھے خنجر و شمشیر سے

مثلِ گوہر جانتے اس کو عزیز
قطرۂ پیکاں جو ملتا تیر سے

گالیاں کھانے کو تھیں یا زخم و داغ
تھا یہ حاصل مطبخِ تقدیر سے

روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں
نانِ گندم تھی ہوا اکسیر سے

گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب
خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے

بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی
سخت دانہ دانۂ زنجیر سے

تھا بچھونا ٹاٹ کمل اوڑھنا
گرم تر پشمینۂ کشمیر سے

کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں
دست و پا بدتر تھے آتش گیر سے

کانپتے تھے موسمِ سرما میں یوں
جیسے عریاں سردیٔ کشمیر سے

محنت و مزدوری و تکلیف و رنج
تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے

اس جہنم کے موکل سب کے سب
دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے

قاتلِ اشراف و اہلِ علم تھے
رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے

بے مروت بے حیا اہلِ دغا
کج طبیعت ہر جوان و پیر سے

جعل میں ٹھگ بڑیا میں بے بدل
نقدِ جاں تک چھین لیں تزویر سے

پھر الہ آباد میں بھجوا دیا
ظلم سے تلبیس سے تزویر سے

ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش
نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے

جو الہ آباد میں گزرے ستم
ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے

پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

ہتکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے

راستے میں ظلمِ اعدا بے شمار
ہر گھڑی تھے شامتِ تقدیر سے

بے حواس و بے لباس و بے دیار
دل گرفتہ جورِ چرخِ پیر سے

سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

نقشہ کلکتہ میں کھچوایا مرا
رنگ منہ کا اڑ گیا تصویر سے

کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک
کٹ گئی قیدِ ستم تقدیر سے

یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیر
صاف نکلے خانۂ زنجیر سے

1277ہجری

مولوی محمد حسین آزاد

اولو العزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امیدِ یمین ویسار تم
میدانِ عزم وجزم کے ہو شہ سوار تم
بڑھ جاؤ گے کروگے اگر مار مار تم
چلاّ رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم
اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دو رُخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

ہیں کوہ ودشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین ونسترن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن
اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

ہمت کے شہ سوار جو گھوڑے اٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو جھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے
چمکایا چہرہ صبح نے با آب وتاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو

آؤ کہ کھولے اپنے نشاں ننگ ونام نے
باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شادکام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے
دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اجال دو
پوچھے کوئی اِرادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے
اب خاتموں پہ آگئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے
وہ گونجا طبلِ فتح کہ میدان لے لئے
ہے کترنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

بیسویں صدی

تحریکِ آزادی

اور

شعری ادب

جائزہ

کلام

جائزہ و تجزیہ

اردو شاعری:1857 کے بعد

گوپی چند نارنگ

■

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری پر قومی اور سیاسی تحریکوں کا گہرا اثر پڑنے لگا تھا اور جدو جہد آزادی کے لیے ذہنی فضا تیار کرنے میں اردو خاطر خواہ حصہ لے رہی تھی۔ غزل اس زمانے میں مجموعی طور پر غمزہ جاناں کے تیغ و سناں کا شکار رہی۔ حالی نے اس کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی اس کا اثر ایک مدت تک نہ ہوا اور لوگ امیر و داغ کے چٹ پٹے اشعار پر سر دھنتے رہے۔ صفی، ثاقب، شاد، عزیز، آرزو اور اثر کی پہلے دور کی شاعری اور جلیل، نوح، سائل، ریاض اور بے خود کی تمام تر شاعری اجتماعی زندگی کی تلخیوں اور بے مہریوں سے بے تعلق معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ ذہنی طلسمات کی دنیا میں رہتے تھے اور شاعری کو عشق و آرائش تک محدود رکھتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے زندگی کی پیچیدگیاں بڑھتی گئیں اور مغربی علوم وفنون سے ذہن کے دریچے کھلنے لگے...

■

غدر کے بعد ہندوستان کا عمرانی ڈھانچہ جو پچھلی ایک صدی سے مائل بہ انحطاط تھا، ٹوٹ گیا اور سماجی نظام میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ انگریزوں کے اثر سے ہندوستان میں جو نئے سیاسی اور عمرانی حالات پیدا ہوئے تھے، ان کا احساس غدر سے پہلے شروع ہو گیا تھا اور اس دور کے صاحبان نظر اور بزرگوں کو اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ موجودہ سماجی ڈھانچے میں کوئی انقلابی تبدیلی لانا ضروری ہے اور عملی قوتیں جو بیکار ہو گئی ہیں انھیں پھر سے زندہ کرنا چاہیے۔ برہمو سماج اور وہابی تحریک نے اپنے دور کے فکری اور تہذیبی ڈھانچے کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا اور نئے عمرانی و سیاسی حالات کا ساتھ دینے کے لیے اس میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فرسودہ اور بے جان روایتوں کو ٹھکرایا اور سماجی برابری، اقتصادی مساوات اور انصاف و عمل کی آواز بلند کی۔ ان کا یہ اقدام بڑی حد تک ترقی پسندانہ تھا، لیکن نئے سیاسی اور سماجی حالات کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے انھوں نے مذہب اور ماضی کی طرف واپسی پر زور دیا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے پیروؤں نے مستقبل کی نجات کا راستہ قدیم اصولوں میں دکھایا اور مشرکانہ عقائد اور بے جا توہمات کو ترک کر کے سیدھی سادی پرہیزگارانہ زندگی بسر کرنے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت کی مخالفت اور سیاسی آزادی کی آرزو مذہبی آزادی کا جزو بن کر پنپتی رہی۔

ماضی کی طرف لوٹنے، اس کو glorify کرنے اور قدیم یادوں میں ذہنی آسودگی ڈھونڈنے کا یہ رجحان اس زمانے کے ادب میں بھی ملتا ہے۔ غدر کے بعد برطانوی حکومت کو حقیقت ثابتہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ لیکن کچھ چھن جانے اور کچھ کھو دینے کا احساس بھی دلوں میں پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے نگاہیں اٹھ اٹھ کر ماضی کی عظمت پر پڑنے لگیں۔ حالی نے یادگار غالب کے دیباچہ میں اور مسدس میں گزرے ہوئے دور کا ماتم کیا اور مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی کی تصویر دکھائی۔ آب حیات لکھنے سے محمد

حسین آزاد کا مقصد یہی تھا کہ بزرگوں کی مقدس یادوں کو محفوظ کر لیا جائے۔ قدیم قدروں یا قدیم دور سے محبت کا جذبہ نذیر احمد کے ناولوں میں بھی ملتا ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت شبلی نے مختلف اکابر کی سوانح عمریاں لکھیں اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کے نقوش کو ابھارا۔

مذہب میں قدیم سے محبت اور احیائے ماضی کے یہ جذبات انتہا پسندی اور سخت گیری کو اپنے ساتھ لائے۔ 'غدر' کے بعد مسلمان عام طور پر یہ سمجھنے لگے تھے کہ مادی زوال روحانی زوال کا نتیجہ ہے اور اس سے قدیم مذہب ہی نجات دلا سکتا ہے۔ چنانچہ قدیم قدروں کا سہارا لے کر قدیم اخلاقی اور مذہبی تصورات کو پھر سے زندہ کیا جانے لگا۔ غلامی کی توجیہہ چونکہ مذہبی نقطہ نظر سے کی گئی، آگے چل کر جب آزادی کے لیے عملی جدوجہد شروع ہوئی تو سیاسی اور مذہبی قدروں میں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ مذہبی تحریکیں ایک طرف تو سامراج دشمنی اور حریت پسندی کے جذبے کو تقویت پہنچاتی تھیں لیکن دوسری طرف چونکہ یہ معاشی اور سیاسی بدحالی کا تجزیہ تصوراتی سطح پر کرتی تھیں، اس لیے ماضی پرستی اور تجدید مذہب کے رجحانات شدت پکڑنے لگے جس سے آگے چل کر علاحدگی پسندی کو تقویت ملی۔

مذہبی احیا کی یہ تحریکیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں غدر کے بعد بڑے زور و شور سے جاری ہوئیں۔ دیوبند کا مدرسہ جو 1867 میں قائم ہوا تھا، شاہ ولی اللہ کی تحریک کے بالواسطہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بلاواسطہ اثر سے اصلاح مذہب کا اہم مرکز بن گیا۔ دوسری طرف ہندوؤں میں سوامی رام کرشن پرم ہنس اور وویکانند مذہبی روح اور مہارشی دیانند مذہبی جوش و خروش پیدا کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے اپنے دائرے میں ان تحریکوں نے اہم سماجی خدمات بھی انجام دیں، لیکن بڑھتے ہوئے مذہبی احساس کی وجہ سے تہذیبی سطح پر ان کا تصادم ناگزیر ہو گیا اور اس کا سب سے پہلا اظہار زبان کی نزاع کے سلسلے میں ہوا۔

ہندوؤں میں تجدید مذہب کے تحت سنسکرت کے احیا کے ساتھ ساتھ ادبی ہندی کو قومی زبان بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ ہندی کے حامیوں نے اردو کی اس اہمیت کو نظر انداز کر دیا جو اسے مشترک ہندستانی تہذیب کی ترجمان کی حیثیت سے پچھلی تین صدیوں سے حاصل تھی۔ اس سے مسلمانوں کو قدرتی طور پر صدمہ پہنچا کیونکہ تاریخی تبدیلیوں کے تحت وہ عربی فارسی چھوڑ کر اردو ہی کو اپنی تہذیبی زبان مان چکے تھے۔ پھر یہ کہ ہندی کی فوقیت کو تسلیم کرانے کی کوشش اس علاقے میں شروع ہوئی جو اردو کا بھی گھر تھا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ادبی ہندی کے حامیوں اور بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا کی طرف سے یہ تحریک چلائی گئی کہ صوبہ جات متحدہ اور بہار میں عدالتوں وغیرہ میں اردو زبان کی بجائے ناگری ہندی کو جاری کیا جائے۔ اس کے خلاف کچھ ہندوؤں نے بھی آواز اٹھائی لیکن مسلمانوں نے شدید مخالفت کی۔ بعد میں یہ نزاع کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سر اٹھاتی رہی اور ایک خطرناک تفریقی قوت بن گئی۔

سر سید پر جو اس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے اور دونوں کو ایک چہرے کی دو آنکھیں کہتے تھے، انتشار اور تفریق کے ان رجحانات کا گہرا اثر پڑا اور انھیں ہندو مسلم اتحاد سے مایوسی ہو گئی۔ اس سے پہلے ان کی اصلاحی و تعمیری کوشش صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی۔ ان کا مراد آباد کا فارسی مدرسہ غازی پور کا انگریزی مدرسہ اور سائنٹیفک سوسائٹی یہ سب ادارے عام ہندستانیوں کے لیے تھے۔ لیکن انھوں نے جب ہندوؤں میں احیائے ماضی کا جوش دیکھا تو انھیں یقین ہو گیا کہ ہندو مشترکہ قومیت کے راستے پر نہیں چل رہے ہیں۔ آریہ سماج کی مذہبی تبلیغ نے ان کے ان خیالات کو مضبوط کیا۔ اس کے بعد وہ قوم کے لفظ کو جسے شروع میں وسیع معنوں میں کل اہل ہند کے لیے استعمال کرتے تھے، فقط مسلمانوں کی جماعت کے لیے استعمال کرنے لگے اور انھوں نے اپنی اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں کا دائرہ مسلمانوں تک محدود کر لیا۔

'غدر' کے بعد مسلمان بعض وجوہ سے نئی تاریخی قوتوں کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس کے برعکس ہندو نئی تعلیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ چنانچہ سر سید نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے نئی تعلیم حاصل کرنے اور انگریزوں سے مفاہمت کرنے کو لازمی قرار دیا، تاکہ وہ ہندوستان کے دوسرے لوگوں سے ذہنی، مادی اور معاشی طور پر پچھڑے ہوئے نہ رہیں۔

سر سید تحریک اور آریہ سماج کی ابتدا تقریباً ساتھ ساتھ ہوئی۔ دونوں کا مقصد تعلیمی، سماجی اور دینی زندگی میں اصلاح کرنا تھا۔ لیکن دونوں کا دائرۂ عمل محدود اور نقطۂ نظر فرقہ واریت کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ دونوں نے فرسودہ عقائد، توہمات اور مذہب کے سکہ بند تصور کے خلاف آواز بلند کی۔ سر سید نے اسلام کی تازہ تاویل کی اور اسلامی اصولوں کی عظمت اور اہمیت کو عقل کی کسوٹی پر کسا۔ آریہ سماجیوں نے پورانک عہد کی دور از کار روایات اور پیچیدہ معاشرتی ادارات کی مخالفت کی اور ہندو مذہب سے ویدانت کے دقیق خیالات کو خارج کر کے ویدک زمانہ کے سیدھے سادھے عقائد اور رسوم پر زور دیا۔ آریہ سماج اور سر سید تحریک دونوں نے تعلیمی اور فکری سانچوں میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور نئے سماجی اور سیاسی حالات میں اپنی قوم کو ابھارنے کے لیے لائحہ عمل تیار کیے۔ سماجی طور پر دونوں تحریکیں کسی حد تک ترقی پسندانہ رجحانات کی علم بردار تھیں۔ انھوں نے اپنے اپنے حلقے سے شکست خوردگی، مغلوبیت اور قنوطیت کے جذبات دور کیے۔ دلوں میں قوت و

عمل کے جذبے کو بیدار کیا اور آگے بڑھنے یا مشکلوں کے باوجود ابھرنے کی امنگ اور آرزو پیدا کی، لیکن اس کے باوجود بنیادی طور پر یہ دونوں تحریکیں گہرے تضاد کا شکار تھیں۔ آریہ سماج نئی معاشی اور سیاسی پیچیدگیوں کو سمجھے بغیر معاشرے کا رخ ماضی بعید کی طرف پھیر رہا تھا۔ یہ ہر قسم کے غیر ویدک اثرات کا، خواہ وہ اسلامی ہوں یا مغربی، سخت مخالف تھا۔ چنانچہ جہاں یہ مغرب کی سیاسی اور ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا خواہاں تھا، وہاں مسلمانوں کو غیر ملکی اور غیر ہندستانی سمجھتا تھا۔ آریہ سماج کے اس رویے نے مسلمانوں کے خدشوں کو ہوا دی اور ان کے تحریک آزادی میں شامل ہونے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ قومیت کے منفی جذبے کو فروغ دینا یقیناً ایک غیر ترقی پسندانہ قدم تھا اور اس کا شکار سرسید بھی تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو الگ قوم قرار دیا اور ہندو مسلم تفریق بڑھانے کے لیے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔ مسلمانوں کو سیاست سے الگ رہنے کی تلقین کر کے انھوں نے تحریک آزادی کو نقصان پہنچایا اور ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا خون چوسنے والے انگریزوں کی حمایت کی۔ انھیں الگ الگ ہندو مسلم فوجیں بنانے کی ترغیب دی تا کہ بغاوت کے موقعے پر وہ ایک دوسرے کے خلاف استعمال کی جا سکیں اور انگریز کا سایہ تا دیر ہندوستان پر قائم رہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے متحدہ قومیت کا تاریخی راستہ نظر انداز کر کے مسلم قومیت کا نظریہ پیش کیا، جس کا منطقی تسلسل بعد میں علاحدگی پسندی اور ملک کی تقسیم پر آ کر ختم ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ سرسید کی کوششیں نیک نیتی اور خلوص پر مبنی تھیں۔ ان کے دردِ دل اور حب الوطنی پر شبہ کرنا تاریخی دیانت داری کو ہاتھ سے دینا ہے۔ ان کے پیش نظر وسیع اور بلند تر مقاصد تھے۔ وہ مشرق اور مغرب کا ملاپ کرانا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی تعلیم کو جدید تہذیب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے جانشین ان کے نظریات کو غلو کی حد تک لے گئے۔ انھوں نے انگریز دوستی کی بجائے انگریز پرستی کو اپنا شعار بنا لیا۔ مسلمانوں کی مادی اور ذہنی ترقی کی بجائے انگریز حاکموں کی خوشنودی اور قربت کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا۔ سیاست سے علاحدگی پر زور دیا اور مسلمانوں کو تحریک آزادی سے الگ رکھا۔ ان رجحانات نے آگے چل کر مسلمانوں کو بقول ابوالکلام آزاد: ''ملکی ترقی کے لیے ایک رکاوٹ راہ آزادی میں سنگ گراں ... اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر'' بنا دیا۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ سرسید تحریک کے بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر سے مسلمانوں کے ایک حصے نے سامراجیت کے ہاتھ مضبوط کیے اور شبلی، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں کے باوجود ہندو مسلم تفریق کو قائم رکھنے میں مدد دی۔ اس کے دوررس نتائج دیکھنا ہوں تو حالی اور اکبر کے واسطے سے اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ گو اقبال بعد میں مطالبہ پاکستان کے حامی نہیں رہ گئے تھے، لیکن علاحدگی کے جذبات کو ہوا دی جا چکی تھی۔

حالی سرسید سے عمر میں اکیس برس چھوٹے تھے۔ انھوں نے جب ہوش سنبھالا اور مسلمانوں کی سیاسی حالت کے بارے میں سوچنا شروع کیا، سرسید ان کے فکر و عمل کا راستہ معین کر چکے تھے اور انھیں وہ فلسفہ دے چکے تھے، جو ان حالات میں بہت سے خطروں سے بچاتا تھا اور مادی ترقی کا نقشہ دکھاتا تھا۔ حالی نے بھی اسے تسلیم کیا۔ حالی کی فکر و نظر پر سرسید کا گہرا اثر ہے۔ لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا کہ ان سے نظمیں فطرت نے لکھوائیں اور قومی و ملی شاعری سرسید نے کروائی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ فراق نے غلط نہیں کہا کہ حالی لطیف ترین عشقیہ شاعری کے ساتھ وطن و ملت کی شاعری کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ سرسید کے ترغیب دلانے سے اتنا ہوا کہ حالی کی شاعری کی فضا میں وسعت آگئی۔

حالی نے مغلیہ سلطنت کی بساط اپنی آنکھوں سے اجڑتے دیکھی تھی۔ انگریزی حکومت کو انھوں نے ناگزیر حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان مادی، اخلاقی اور روحانی زوال کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں۔ ان میں حکومت کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور انگریزی حکومت کا قائم ہونا انھیں تاریخی حالات کا نتیجہ ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنا پہاڑ سے ٹکرانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ سرسید کی طرح حالی نے بھی انگریز دوستی کو اصول قرار دیا۔ انگریزی حکومت کی حمایت کی اور اس کی عدل گستری کے گن گائے۔ لیکن جیسا کہ احتشام حسین نے لکھا ہے: ''حالی کے ہاں پیروی مغرب کوری مفاہمت نہیں ہے بلکہ آگے بڑھنے کا راستہ ہے۔ حالی کا سیاسی شعور واضح نہیں تھا، تاہم وہ کبھی کبھی آزادی کا خواب دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر تعلیم، ترقی اور سائنس کی برکتوں سے مالا مال ہو کر ان سے آگے نکل جائیں گے اور اس طرح ہندوستان کبھی نہ کبھی آزادی حاصل کر لے گا۔''

حالی اردو کے پہلے شاعر ہیں جو ہندوستان کی سیاسیات سے متاثر ہوئے اور جن کا دل ہندوستان کی غلامی پر رویا۔ گو انگریزوں کی وفاداری اور کانگریس کی مخالفت میں وہ سرسید کے ہم نوا تھے، لیکن ان کی نظموں اور تحریروں میں انگریز دوستی سے زیادہ سماجی ترقی اور حب الوطنی کا جذبہ تراوش کرتا ہے۔

الی کے وطنی شعور پر قومی ادبار کی پرچھائیاں گہری ہیں۔ انھوں نے ہندستانیوں کی غفلت، غلامی اور مظلومی کا راگ بڑے درد سے چھیڑا اور

وطنیت کے احساس کو قومی شعور دیا۔ ان کی مثنوی حب وطن کے بارے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں: ''اس میں محض وطن کے مناظر سے محبت یا اس کے ماضی سے عقیدت یا اس کی تاریخ کی یاد نہیں ہے۔ اس میں وطن دوستی کے اس تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے جو خدمت کے احساس سے بنتا ہے۔''

مسدس حالی کا شاہکار ہے۔ اسے بلاشبہ اردو کی پہلی عظیم نظم کہہ سکتے ہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کے لیے لکھی گئی اور بیشک ایک مذہبی نظم ہے، لیکن اس میں ہندوستان کی فضا ہے۔ سردار جعفری نے غلط نہیں کہا کہ ''حالی چونکہ اسلامی تہذیب وتمدن کے انحطاط اور مسلمان شریف خاندانوں کی پستی کا بیان انتہائی خلوص اور شاعرانہ دردمندی سے کر رہے تھے، مسدس ہندوستان کے جاگیرداری عہد کے زوال کی بڑی مکمل تصویر بن گئی ہے۔'' اس لحاظ سے یہ ہماری قومی شاعری کا سنگ بنیاد ہے، جس کے ذریعہ حالی نے پورے جوش اور ولولے کے ساتھ قوم کو حرکت اور بیداری کا پیام دیا اور یہی اس کی اہمیت کا راز ہے۔

انگریزی حکومت اگرچہ بدنیتی، معاشی استحصال، جابرانہ لوٹ کھسوٹ اور خودغرضی کا نہایت مکروہ پہلو رکھتی تھی، لیکن تاریخی طور پر وہ سرمایہ داری کی ترقی پسند قوتوں کی آلۂ کار تھی، غیرارادی طور پر یہی حکومت ہندوستان کو تاریخ کے نئے سانچے میں ڈھالنے کا باعث بنی، شاہی مطلق العنانی کا خاتمہ ہوگیا، قدیم معاشیات بدل گئیں، ہندوستان ایک صنعتی ملک بننے لگا اور انگریزی حکومت ہی کے ذریعے بالآخر ہندوستان میں نئی تعلیم، آزاد پریس، ذرائع آمد ورفت اور رسل ورسائل کی ترقی اور سیاسی وحدت پیدا ہوئی۔ حالی انگریزی حکومت کے ان ترقی پسندانہ پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے تھے۔ جدید تعلیم کے اثر سے متوسط طبقے میں جو آزاد خیالی گھر کر رہی تھی، حالی اس کے ترجمان ہیں اور زندگی کی نئی رو کو قبول کر کے دوسروں کو اسے تسلیم کرانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت کے تاریخی حالات میں اس کی ضرورت بھی تھی۔ مسلمان عام طور پر افلاس، پستی، بے عملی اور پریشاں حالی کا شکار تھے۔ حالی انھیں کبھی انگریزوں کے عروج کا نقشہ دکھا کر، کبھی اپنی پستی پر رلا کر ترقی کے امکانات سے آگاہ کر کے ایک مضبوط قوم بنانا چاہتے تھے۔ فطری طور پر حالی چونکہ امن پسند اور صلح دوست تھے انگریزی حکومت کی برکتوں میں سب سے زیادہ زور انھوں نے امن اور آزادی پر دیا۔ ''امن اور آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد اور کسی دور میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔'' آزادی کے تصور سے ان کی مراد مذہب اور رسم ورواج وغیرہ کی انفرادی آزادی سے تھی۔ ایک اور جگہ وہ رعیت کی آزادی کو ''حکومت انگلشیہ کی بے بہا اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک'' بتاتے ہیں۔ انھوں نے کوئین وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر جو قصیدہ کہا، اس کا ایک مصرع ہے:

ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر

وکٹوریہ کے مرنے پر انھوں نے اس کا مرثیہ بھی لکھا۔ انگریزی حکومت کو وہ ہندوستان کے لیے سایۂ رحمت وبرکت تصور کرتے تھے:

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ سرسید کی طرح انھوں نے بھی کانگریس کی مخالفت کی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر اتحاد کا اخلاقی پہلو تھا۔ اس کی سیاسی اہمیت پر انھوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

سرسید کی زندگی کے آخری برسوں میں حالی ان کے نظریوں کے زیادہ قائل نہیں رہے تھے۔ اس زمانے میں سرسید انگریزوں کے اشارے پر چلنے لگے تھے اور روشن خیال مسلمان طبقہ ان کی مخالفت کر رہا تھا۔ جمال الدین افغانی نے بھی سرسید کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کیا۔ حالی گو قومی ضرورت اور مصلحت کے تحت سرسید کے ہر کام کی تاویل کرتے تھے، لیکن ایک زمانے میں انھوں نے بھی حیات جاوید لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کہہ دیا تھا کہ میں سرسید کے کاموں پر خاک بھی نہیں ڈال سکتا۔ سرسید کے انتقال سے کچھ پہلے پیسہ اخبار میں ان کا وقار الملک اور محسن الملک کا ایک مشترکہ بیان سرسید کے خلاف نکلنے والا تھا کہ سرسید کی وفات کی وجہ سے یہ قدرتی طور پر رک گیا۔ سرسید کی وفات کے بعد حالی کے شعور میں واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔ آگے چل کر انھوں نے سودیشی تحریک کی حمایت کی اور انگریزوں کی ملازمت کے مقابلے میں تجارت اور صنعت وحرفت اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ سودیشی تحریک کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم وبیش ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہوگیا ہے، جس راستے سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے۔ مگر اس راستے کا بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس کے لیے جلدی کرنا نیچر سے مقابلہ کرنا ہے:

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو کہ اس کو بہت جلد کامیابی ہوئی۔''

لیکن مجموعی طور پر حالی آخری وقت تک اعتدال پسند رہے۔ ان کی

سیاست خوشامدانہ طلب حق سے آگے نہ بڑھ سکی اور قومی آزادی کا وسیع تر تصور ان کی دسترس سے باہر رہا۔ اس کے برعکس شبلی انگریزوں سے کسی قسم کی مفاہمت یا سمجھوتہ بازی کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے اور حالی کے شعور میں وہی فرق ہے جو 1857 اور 1877 میں ہونا چاہیے۔ شبلی نے جب ہوش سنبھالا، سرسید کا بتایا ہوا راستہ تاریخی اعتبار سے ختم ہو چکا تھا۔ سرسید تحریک اپنا فریضہ ادا کر کے سامراج پسندی کی آلۂ کار بن چکی تھی۔ شبلی نے اس کے خلاف آواز بلند کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ سرسید سے شبلی کے اختلافات ضمنی یا فروعی نہیں، بنیادی تھے۔ شبلی نے جس گہوارے میں تعلیم پائی تھی، اس کی روایتیں سرکار پرستی کے سخت خلاف تھیں۔ اس کے برعکس سرسید انگریزوں کے غالی مداح اور انگریزی طریق حکومت کے طرف دار تھے۔ شبلی کو انگریز پرستی سے چڑ تھی۔ 'صبح وطن' میں انھوں نے سرسید کی ذاتی تعریف کی، لیکن ان کی سوانح لکھنے سے انکار کر دیا۔ ان کی وفات پر بھی شبلی نے اردو ادب سے متعلق ان کی خدمات کا اعتراف کیا اس سے زیادہ کچھ نہ لکھا۔

شبلی کا تعلق علمائے دیوبند کی اس جماعت سے تھا جو حریت پسندی اور سیاسی جدوجہد کی علم بردار تھی۔ اس کے برعکس سرسید تحریک سیاسی مصلحتوں کی پابند تھی اور غلام رہنے اور غلامی کے آداب سکھانے کی تلقین کرتی تھی۔ سرسید کی سیاسی زندگی پر شبلی کا یہ قطعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے:

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سیدِ مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
•ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

شبلی عمر میں سرسید سے 40 اور حالی سے 20 برس چھوٹے تھے اور اس لحاظ سے وہ ان دونوں سے بہت آگے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن نے قدیم علمی سرمایہ سے بھی استفادہ کیا اور اس جدید شعور سے بھی روشنی حاصل کی جو نئی تاریخی قوتوں کے تصادم سے پیدا ہو رہا تھا۔ 1880 کے لگ بھگ جب شبلی نے ہوش سنبھالا، ہندوستان میں سماجی اور سیاسی حالات تاریخ کے ایک نئے موڑ پر آ گئے تھے۔ کاشتکاروں کی حالت روز بہ روز گر رہی تھی اور دیسی صنعتیں اور دست کاریاں برطانوی مصنوعات کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے تباہ اور برباد ہو چکی تھیں جس سے زراعت پر بوجھ بڑھنے لگا تھا اور ملک میں قحط نمودار ہو رہے تھے۔ 1877 میں جب دہلی میں ملکہ وکٹوریہ کا دربار منعقد ہو رہا تھا، ہندوستان ایک ہولناک قحط کی زد میں تھا اور انگریزی حکومت کی 'رعایا پروری اور حق پسندی' کی پول کھل رہی تھی۔*

ادھر جدید ذہن نئی تعلیم کے خزانے سے اپنے لیے صحیح قسم کا ساز و سامان حاصل کر رہا تھا۔ انقلاب فرانس، امریکہ کی جنگ آزادی اور اٹلی اور آئرلینڈ کے لوگوں کی قومی جدوجہد اور ان کے نتائج سے ہندستانی تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہو چکا تھا۔ لوگ سیاسی آزادی اور اس کی اہمیت سمجھنے لگے تھے۔ تھامس پین، سپنسر، برک، مل، والٹیر، میزینی اور گیری بالڈی کی کتابیں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں اور آزادی کی تمنا دلوں میں کروٹیں لینے لگی تھی۔ البرٹ بل کے واقعہ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔

البرٹ بل ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا منشا ہندستانیوں اور یورپیوں کو قانون کی نظر میں ایک کرنا تھا، لیکن یورپین طبقے نے اس کی سخت مخالفت کی اور بل پاس نہ ہو سکا۔ اس واقعہ نے غافل ہندستانیوں کو چونکا دیا اور انھوں نے پہلی بار رائے عامہ کو جمہوری طریقہ پر منظم کر کے اپنے حقوق کا مطالبہ شروع کیا۔ قوت وقومیت کے احساس کے ساتھ تعمیر و ترقی کی امنگ پیدا ہوئی۔* آئینی جدوجہد کا جذبہ بڑھا جو دو سال کے اندر اندر کانگریس کی تشکیل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کانگریس شروع شروع میں اعلیٰ درجہ کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے مقاصد انتظامی امور میں اصلاح اور کونسلوں میں انتخابی طریقہ رائج کرانا تھا۔ لیکن یہ بیسویں صدی کے آغاز تک اونچے متوسط درجے کی سیاسی انجمن بن گئی اور سیاسی حقوق کے لیے آئینی جدوجہد کرنے لگی۔ اس وقت کے بڑے لیڈر دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، راناڈے، بدرالدین طیب جی، سریندر ناتھ بینرجی اور فیروز شاہ مہتہ تھے۔

شبلی چونکہ فکری طور پر دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھے، تحریک آزادی میں دلچسپی لیتے تھے اور کانگریس کے ہم نوا تھے۔ اس وقت مسلمان عام طور پر سرسید کے اثر سے سیاست سے الگ تھے اور بقول شخصے "تعلیم کی سرداش" کو سینہ سے لگائے

•اس قحط سے متعلق ایک اردو شاعر کی یہ ادنالی ملاحظہ ہو:

گلستان جہاں میں کیا خزاں نے گل کھلایا ہے
کہ ہر برگ شجر کو زعفرانی کر دکھایا ہے
کسانوں کی یہ حالت ہے کہ دن بھر دھوپ میں جلنا
اور اس پر شہر کی خشکی نے دل ان کا سکھایا ہے
کوئی کوئیں چلاتا ہے کوئی بوکہ لگاتا ہے
کہ خشکی نے انھیں پانی سے پتلا تر بنایا ہے
خدا کچھ رحم فرمائے تو ہو اس کال سے جاں بر
وگرنہ کال اب دنیا کا بے ڈھب سر پہ آیا ہے

سرجارج ڈیش شور، دیوان دوم، ص 192

ہوئے تھے۔ ان حالات میں شبلی کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو ہندستانی سیاست میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ مغرب کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی استحصال کے بت کو بے نقاب کیا اور انھیں آزادی کے حصول کے لیے ہندوستان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر قدم بڑھانے کا مشورہ دیا۔

حالی کے ہاں آزادی کے جس جذبہ کا اظہار دبے دبے اور معتدل لہجے میں ہوا ہے، شبلی کے ہاں وہ پر جوش لاوا بن کر ظاہر ہوا ہے۔ ان کا سیاسی شعور واضح تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی فلاح محض انگریزی تعلیم سے نہیں ہو سکتی۔ انگریزی تعلیم کے ذریعہ سرسید مسلمانوں کو جدید تہذیب سے روشناس کرانا چاہتے تھے، لیکن شبلی کے دیکھتے دیکھتے جو نئی نسل وجود میں آرہی تھی، وہ سرکاری مشین کے کل پرزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی اور انگریزی حکومت کے ملازموں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کوئی خدمت انجام دیتی نظر نہیں آتی تھی۔ شبلی ایک طرف سرسید تحریک کی مغرب پرستی کے خلاف تھے اور دوسری طرف علما کی تنگ نظری کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو مجموعی طور پر ایک حریت پسند اور روشن خیال قوم بنانا چاہتے تھے تاکہ آگے چل کر وہ ہندوستان کی قیادت میں مناسب حصہ لے سکیں۔

شبلی کی سیاسی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے معرکوں اور ہنگاموں کو محدود مذہبی اور دینی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ وطنی اور قومی زاویے سے انھیں ایک بڑے سانچے کا جزو بنا کر دیکھتے تھے۔ شبلی اردو شاعری کو جدید ہندستانی مسائل سے قریب تر لائے اور اس میں انھوں نے ہندستانی تحریک آزادی کی دھڑکنیں سمو دیں۔ ان کی سیاسی نظموں نے پست ہمتی اور مغلوبیت کے غبار کو ہٹانے میں قابل قدر حصہ لیا۔ انھوں نے شہنشاہیت کے خلاف پر جوش نظمیں لکھیں۔ سامراج کی لوٹ کھسوٹ پر چوٹیں کیں۔ علما کو قومی کاموں میں حصہ لینے اور مسلمانوں کو آزادی کی راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دی۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہماری تحریک آزادی میں نیا ابال آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کا آغاز سارے ایشیا کے لیے ایک نیا پیام تھا۔

ترکی میں انقلاب آیا، ایران میں حالات بدلے، چین نے بیداری کی کروٹ لی اور جاپان نے روس کو شکست دے کر یورپ کی برتری کے طلسم کو توڑ دیا۔ ان تبدیلیوں سے ہندوستان نے بھی گہرا اثر قبول کیا۔ یہاں کے اندرونی حالات بھی روز بروز بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ جزوی اصلاحات کی ناکامی اور انگریزوں کی تعزیری تدبیروں سے کانگریس میں انتہا پسند طبقہ ابھر آیا تھا۔ تلک، وپن چندر پال، آربندو گھوش، لاجپت رائے وغیرہ آئینی ایجی ٹیشن چھوڑ کر عملی جدوجہد کے لیے فضا تیار کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں پھر قحط پڑا اور پلیگ کی وبا نے لاکھوں جانیں لیں۔ لارڈ کرزن نے جو ایک طرح کی روشن خیال استبدادی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اپنی غلط کارروائیوں سے عوام کی بے چینی بڑھا دی۔ کلکتہ کارپوریشن کے اختیارات کم کر دیے گئے اور بنگال کے صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس سے چونکہ ملک کی سیاسی تحریک پر بالواسطہ اثر پڑتا تھا، کلکتے کے تعلیم یافتہ بنگالیوں نے، جو اس وقت ہندوستان کی سیاسی تحریک میں پیش پیش تھے، بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی اور مجموعی طور پر ملک بھر میں سیاسی بیداری کی لہر اور اونچی ہو گئی۔

الہلال، ہمدرد، ہمدم، مدینہ اور مسلم گزٹ کے جاری ہونے کا یہی زمانہ ہے۔ ہندستانیوں کے جمود و تعطل کو دور کرنے کی روایت اودھ پنچ نے قائم کی تھی۔ الہلال نے اسے نئے معنی دیے۔ الہلال مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں نکلتا تھا۔ آل احمد سرور نے صحیح لکھا ہے کہ ابوالکلام آزاد نے مذہبی احساس کو سیاسی شعور اور سیاسی شعور کو ادبی رنگ دیا۔ مولانا محمد علی ہمدرد میں نثر کے ساتھ ساتھ نظم سے بھی کام لیتے تھے۔ مسلم گزٹ کے ایڈیٹر وحیدالدین سلیم تھے۔ یہ اخبار شبلی کی کوشش سے نکلا تھا۔ شبلی کا مشہور مضمون "مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ" اسی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ان کی نظمیں زیادہ تر الہلال میں چھپا کرتی تھیں۔ اسی اخبار میں انھوں نے مسلم لیگ پر چوٹیں کرنا شروع کیں۔

مسلم لیگ کا قیام 1906 میں عمل میں آیا۔ شبلی کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی میں ممد و معاون ہونے کی بجائے اس کی راہ میں حائل ہونا چاہتی ہے اور کسی قربانی و ایثار کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ انھوں نے شدت سے اس کی مخالفت کی اور اس کے خلاف متعدد نظمیں لکھیں، جن میں اس کے محدود مقاصد اور اس کی بے عملی پر طنز و تعریض کی۔ اس سے شبلی کی روشن خیالی، بیدار مغزی اور دور بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے دل میں آزادیِ وطن کے لیے تڑپ تھی اور وہ کسی ایسے سمجھوتے پر تیار نہ تھے جو ہندستانیوں کی غلامی اور غفلت کو قائم رکھنے میں مدد دے۔

شبلی اپنی زندگی کے آخری برسوں میں تھے کہ 1912 میں جنگ بلقان چھڑ گئی۔ اس میں انگریز چونکہ ترکی کو اپنی سیاسی بساط کا مہرہ بنانا چاہتے تھے، ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ انگریزوں کی ان ریشہ

* لاہور کے اخبار عام میں مندرجہ ذیل نظم 10 مارچ 1883 کو چھپی تھی

اے ساکنانِ خطۂ ہندوستاں بڑھو
آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں بڑھو
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو
کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو
بیٹھے ہو پاؤں توڑ کے کیوں کنجِ غم میں تم
دیکھو ذرا نشیب و فرازِ جہاں بڑھو
ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہے
چلا رہا ہے طوطیِ ہندوستاں بڑھو

(بحوالہ نوائے آزادی، ص 135)

دوانیوں کے خلاف ہندستانی لوگ آتش فشاں پہاڑ کی طرح ابلنے لگے، پر جوش مضمون لکھے گئے، جلسے کیے گئے اور نظمیں کہی گئیں۔ شبلی نے اپنی معرکہ آرا نظم "شہر آشوب اسلام" اسی پر آشوب زمانے میں لکھی۔ اس میں نہایت پر سوز اور پر تاثیر انداز میں قوم کے وطنی جذبات ابھارے گئے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ نظم شبلی نے لکھنؤ کے ایک عام جلسے میں، جو ترکی کے فراہمی چندہ کے لیے ہوا تھا، پڑھی۔ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے۔"

ادھر جنگ بلقان جاری تھی کہ مسجد کانپور کا دردناک واقعہ پیش آیا۔ کانپور میں ایک مسجد سے لگتی ہوئی ایک سڑک نکالی گئی اور مسجد کا وضوخانہ جو سڑک کے بیچ میں آتا تھا، مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود ڈھایا گیا۔ مسلمانوں نے منہدم دیوار کو پھر سے کھڑا کرنا طے کیا اور دیوار پر اینٹیں چننے لگے کہ حکومت نے گولی چلانے کا حکم دیا اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ عوام کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ ملک کے طول و عرض میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کہنے کو یہ ایک مسجد کا واقعہ تھا، لیکن اس کی تہہ میں آزادی اور حریت پرستی کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، محمد علی اور دوسرے اکابر قوم نے انگریزی حکومت کے اس قہر و جبر کے خلاف شدید احتجاج کیا اور مضمون لکھے۔ شبلی کی نظمیں "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں"، "علمائے زندانی"، "آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم"، "خون کے چند قطرے" اور "گنج ہائے گراں مایہ" اسی واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ ان نظموں کے ذریعہ انھوں نے انگریز دشمنی کے جذبات کو تیز کیا اور مشترکہ قومیت اور وسیع وطنیت کے شعور کو نیا احساس دیا۔

شبلی نے ایک سچے ہندستانی کی طرح قدمے سخنے آزادی کی جدوجہد کو تقویت پہنچائی۔ سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ "علما میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سیاسی مسئلوں میں دلچسپی لی اور کانگریس کی حمایت میں آواز بلند کی۔" وہ ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ انھوں نے دونوں کی سیاسی مصالحت پر مضمون لکھے اور سامراج کی جابرانہ ذہنیت پر چوٹیں کر کے اس ذہنی انقلاب کی علم برداری کی جو صدیوں کے پسے اور پچھڑے ہوئے ہندوستان کو آزادی اور جمہوریت کی منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔ ان نظموں میں پوری شاعرانہ دردمندی سے ہندستانیوں کو ان کی غفلت، غلامی، بے بسی اور بدحالی کا احساس دلایا گیا ہے اور آزادی کی آزمائش سے گزرنے کے لیے ذہنی فضا تیار کی گئی ہے۔

شبلی چونکہ ترقی پسند قوتوں سے وابستہ تھے، بقول آل احمد سرور نئی نسل پر ان کا اثر سرسید سے زیادہ ہوا۔ حالی نے اردو ادب کی حدود کو وسیع کیا، شبلی کی گوناگوں خدمات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے ذہنی افق کو نئی وسعتیں عطا کیں۔ انھیں اپنے ملک کے سیاسی مسئلوں سے روشناس کرایا اور ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا اہل بنایا۔ آل احمد سرور نے صحیح لکھا ہے کہ شبلی نے مسلمانوں میں حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی۔ سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، عبدالسلام، ظفر علی خاں، محمد علی اور اقبال پر سرسید سے زیادہ شبلی کا اثر ہے۔

سرسید، حالی، اکبر اور اقبال میں سے ہر ایک کے نظریات اپنے اپنے تضاد لیے ہوئے ہیں۔ حالی جیسے محب وطن کی وطن دوستی بھی ہمیں تھوڑی دیر تو اپنے ساتھ رکھتی ہے لیکن زیادہ دور نہیں لے جاتی۔ اس کے برعکس شبلی کے بتائے ہوئے راستے سے اختلاف نہ اس وقت ممکن تھا نہ اب ہے۔ یہی ان کی اعلیٰ دماغی، روشن خیالی، تدبر، فراست اور حب الوطنی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

شبلی نے علی گڑھ تحریک کی جو مخالفت کی وہ سلبی نہیں، ایجابی تھی۔ سرسید کے جانشین مسلمانوں کو انگریز پرست بنانا چاہتے تھے۔ شبلی نے اسے روکا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کے ماضی سے مستقبل کی بشارت لی اور اس کی مدد سے ان کے حال کو سنوارا اور ان کی عملی صلاحیتوں کو ابھار کر انھیں وسیع تر قومی تحریک کا حصہ بنایا۔ اس کے برعکس اکبر الٰہ آبادی کا نقطۂ نظر کسی حد تک منفی تھا۔ وہ نہ سرسید کے ساتھ تھے نہ کانگریس کے ہم نوا۔ ان کا شمار مولوی قسم کے لوگوں میں بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن بقول سید احتشام حسین وہ روشن خیال بھی نہیں تھے۔ نئی تعلیم اور مغربی تمدن کی برکتوں کا احساس سرسید تحریک کا ترقی پسندانہ پہلو تھا۔ اکبر نے سب سے زیادہ مخالفت اس کی کی اور ان کی قدامت پرستی کا یہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ شبلی اور سرسید کے اختلاف سیاسی تھے۔ اکبر اور سرسید کے ذاتی۔ سیاسی شعور کے اعتبار سے اکبر کی شاعری منفی نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بقول رشید احمد صدیقی آخر انیسویں صدی اور شروع بیسویں صدی کی "ہماری داستان سود و زیاں کی اور ہوش و ہوس کی اکبر کی شاعری میں پوری واقعیت کے ساتھ جلوہ گر ہے"۔ لیکن اصل چیز تصویر کشی نہیں وہ نقطۂ نظر ہے جس سے تصویروں کو اجاگر کیا گیا، ان کا وہ تاثر جو دوسروں پر مرتب ہوا۔ اس لحاظ سے اکبر کی شاعری ایک المیہ ہے۔ یوں تو وہ مغربی تمدن اور اس کے اثرات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، لیکن سرسید کی طرح انگریزی حکومت کے خلاف آواز اٹھانا قوم کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ ان کی حکام پرستی اور سیاست سے کنارہ کشی سرسید سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سرکاری ملازم تھے۔ انھوں نے خود بھی ایک جگہ اپنے مدخولہ گورنمنٹ ہونے اور گاندھی کی گوپیوں میں شامل نہ ہو سکنے کا اقرار کیا ہے۔ لیکن اگر وہ حکومت کے وظیفہ خوار نہ ہوتے، تب بھی نئی تاریخی قوتوں کی طرف ان کا نقطۂ نظر بدلنے والا نہ تھا۔ وہ گہرے ماضی پرست تھے۔ ہر تبدیلی کو "جذبات کی عینک" سے دیکھتے تھے اور ہر نئی چیز کے سائے سے بھڑکتے تھے۔ وہ قدیم اخلاقی قدروں کو سد راہ بنا کر نئی تاریخی قوتوں کا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ بقول سید احتشام حسین "حال کو سمجھنے کے لیے ان کے پاس کوئی معقول علم نہیں

تھا۔" ان کی شاعری لفظوں سے خوب کھیلتی ہے۔ وہ فکر و نظر سے جہاں بھی کام لیتے ہیں، ان کا ذہنی تضاد نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ایک طرف وہ مغربی اثرات کی مخالفت کرتے ہیں، انگریزی حکومت کی برائیوں کا احتساب کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف آزادی کی جدوجہد کو بے سود قرار دیتے ہیں۔

اکبر کی جو مانو بیٹھ رہو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو۔

اکبر کی مزاحیہ شاعری کی ابتدا کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جو کانگریس کے قیام کا ہے۔ اس وقت سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک ان کی آنکھوں نے کیا کیا نہ دیکھا اور اس دوران میں قومی جدوجہد نے کیسے کیسے پہاڑ نہ کاٹے، لیکن انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی ان کوششوں سے ذرا بھی اثر نہ لیا اور ہمیشہ انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے۔ ان کے اس شعر پر نقادوں نے بہت کم توجہ کی ہے:

ہرگز نہ مستقل سمجھ اس انقلاب کو
رکھ راہ راست بھونکنے دے ان کلاب کو

اکبر ہندستانیوں کی غلامی کا جواز اخلاقی گراوٹ میں تلاش کرتے تھے اور کرنا بھی چاہیے۔ لیکن اس بات کو انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا کہ سیاسی اور اجتماعی آزادی کے بغیر اخلاقی اور روحانی قدروں کا فروغ بھی ممکن نہیں۔

وہ ہندوؤں اور ہندی مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں سمجھتے تھے اور مذہب اور سیاست کی باہم مختلف نوعیت کو سمجھنے سے انکار کرتے تھے۔ محدود قومیت کا تصور انھوں نے سرسید سے ورثہ میں لیا۔ ان کے یہ خیالات "گاندھی نامہ" کے اشعار میں پوری طرح ظاہر ہوئے ہیں۔

اردو شاعری میں وطنیت کا کھلا ڈلا احساس درگا سہائے سرور، اقبال اور چکبست کے کلام سے پیدا ہوتا ہے۔ درگا سہائے سرور کو شراب بجائے شباب کے موت کی طرف لے گئی اور ان کے شعور کو پختہ ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کی شاعری جذبے کی شاعری ہے، خیال کا عنصر اس میں کم ہے۔ یہ وطنی تو ہے قومی نہیں۔ قومی شاعری کا اطلاق اقبال کے کلام پر پوری طرح ہوتا ہے۔ حالی ملی شاعر تھے۔ چکبست کا رنگ ان تینوں سے جدا ہے۔ ان کی شاعری براہ راست سیاسی قومی جدوجہد سے تب و تاب حاصل کرتی ہے۔ لیکن ظفر علی خاں کے کلام کی طرح یہ یکسر سیاسی ہنگامی نہیں۔ یہ سیاسی ادبی بھی نہیں۔ سیاسی ادبی شاعری کی مثال محمد علی جوہر کا کلام ہے۔ چکبست کی شاعری کو ادبی سیاسی کا نام دینا موزوں ہوگا۔

سیاسی طور پر درگا سہائے سرور بھی اصلاح پسندی کے قائل تھے۔ حالی اور اکبر کی طرح انھوں نے بھی انگریزوں کی تعریف کی ہے۔ ایڈورڈ ہفتم کی وفات پر ان کا کہا ہوا نوحہ ان کے مطبوعہ کلام میں شامل ہے۔ لیکن ان کی وطنی شاعری کی شان دوسری ہے۔ یہ قدیم و جدید کی کشمکش سے آزاد معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جذبے میں سادگی، خیال میں معصومیت اور محبت میں عقیدت کا عنصر ملتا ہے۔ سیاسی جدوجہد اور وقتی اور عارضی مسائل کا اس پر بظاہر کوئی اثر نہیں۔ سرور نے نہ سیاسی ہنگاموں اور معرکوں کو ادبی رنگ دیا، نہ سیاسی قدروں کو اپنایا۔ ان کی وطن دوستی بے میل بے ریا اور بے لوث ہے۔ یہ اجتماعی احساس سے نا آشنا نہیں، لیکن سیاست کے نشیب و فراز سے بلند و بے نیاز ہے۔ درگا سہائے سرور کے ہاں حب وطن کا جذبہ دریا کی ایک لہر بن کر سامنے آتا ہے۔ رواں دواں، متحرک، مترنم اور رقصاں۔ جذبے کی صداقت اور سادگی نے اس میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر دی ہے۔ اردو شاعری میں سب سے پہلے سرور نے وطن کا تصور ماں کی حیثیت سے کیا اور اسے ماں جیسے رسیلے اور میٹھے لب و لہجہ میں یاد کیا۔ یہ آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ بات ان کی نظموں، حب وطن، عروس حُبِ وطن، پھولوں کا گنج اور مادر ہند کے مطالعہ سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

چکبست کی شاعری ہماری تحریک آزادی کی اعتدال پسند اور مصلحانہ روش کی بہترین مظہر ہے۔ اردو شاعری کو تحریک آزادی کے اصلی رنگ اور صحیح مزاج سے آشنا کرانے کی اولیت شبلی کے بعد چکبست کو حاصل ہے۔ وہ نہ انتہا پسندوں کے ساتھ تھے نہ اعتدال پسندوں کے۔ وہ تلک کا اتنا ہی احترام کرتے تھے جتنا گوکھلے اور گاندھی کا۔ لیکن ان کی نکتہ سنج طبیعت نے تحریک آزادی کی ہندستانی اعتدال پسندی، نرم گفتاری اور میانہ روی کو پا لیا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انھیں قدروں کو عام کیا ہے۔ ان کا یہ یقین کچھ ایسا غلط نہ تھا۔ کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہندوستان آزادی کی منزل تک پہنچا۔ چکبست کے نزدیک ایک غلام قوم کے لیے وطن دوستی کی قدر سب قدروں سے اہم ہے اور ان کی شاعری کا قصر انھیں بنیادوں پر قائم ہے۔ چکبست کی شاعری کے بڑے حصے کا تعلق چونکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کے زمانے سے ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اقبال کی شاعری میں سرسید، حالی اور شبلی کی روایات کا امتزاج ملتا ہے لیکن نہایت اعلیٰ، ارفع، منفرد اور ممتاز سطح پر۔ یہ شاعری تقریباً نصف صدی کے عرصے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ابتدائی حصہ میں وطن دوستی کا جذبہ خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

اقبال کی شاعری صحیح معنوں میں نئے دور کی شاعری ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو نیا احساس، نیا لب و لہجہ، نئی ذہنی بلندی اور نیا شعور دیا۔ اقبال کے نزدیک شاعری 'شیریں دیوانگی' نہیں، ایک اہم سماجی فریضہ ہے۔ عظیم شاعری سے عظیم پیام کی توقع کرنا غلط ہے لیکن عظیم شاعری انسانی زندگی کی عظمت و منزلت کا احساس دلاتی ہے اور ان طاقتوں سے سمجھوتہ نہیں کرتی جو اسے ذلت اور گمراہی کی پستیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ اقبال کی عظمت کا راز یہی ہے کہ انھوں نے پورے شاعرانہ رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے ہمیں اس انسان کا عظیم الشان تصور دیا جو فطرت کا جزو ہوتے ہوئے فطرت کو بدل سکنے پر قادر ہے۔

اقبال کی شاعری کی ابتدا حب وطن اور سامراج دشمنی کے جذبے سے ہوتی ہے۔ آگے چل کر بعض وجوہ سے ان کی وطن دوستی کا ہندستانی رنگ باقی نہ رہا۔ لیکن سامراج دشمنی کا جذبہ آخر وقت تک باقی رہا، جس پر ضرب کلیم اور ارمغان حجاز گواہ ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سفر یورپ کے بعد ہندوستان کے لیے اقبال کا جذبۂ محبت سرد پڑ گیا۔ ترانۂ ہندی کی جگہ ترانۂ ملی نے لے لی۔ وہ مشترکہ قومیت اور قومی تہذیب کے داعی نہ رہے یا ایک نقاد کے الفاظ میں وہ "فرقہ پرست اور کٹر مذہبی مفکر" بن گئے۔ اس قسم کے اعتراض اقبال کی شاعری پر عموماً کیے جاتے ہیں اور شاید کیے جاتے رہیں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سفر یورپ کے دوران ان کے وطنی نظریات میں جو تبدیلی آئی، وہ ان کے شعور کے ارتقا کی وجہ سے تھی۔ اس کے بعد ان کا ذہنی افق وطن اور قوم کے محدود دائرے تک محدود نہ رہا۔ ان کے سامنے اب کسی ایک ملک کا مسئلہ نہ تھا، بلکہ ان کی نظر انسان، کائنات اور خدا کے باہمی تعلق کے ابدی سوال پر پڑنے لگی تھی اور اسے انھوں نے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا یہ حل ہندستانی ملکی روح اور مزاج عامہ سے متعارض اور مختلف تھا۔ بہر حال اس میں کلام نہیں کہ وہ ملت اسلامیہ کی بیداری کے بلند ترین نقیب اور ترجمان ہیں۔

اقبال کی وطنی شاعری کا سلسلہ ہمالیہ سے شروع ہوتا ہے اور بانگ درا کی کئی نظموں میں جاری رہتا ہے۔ اس دور کی شاعری میں اقبال کی نظر ہندوستان کے ہر ذرہ کو آفتاب بنا کر دکھاتی ہے۔ یہاں کے کوہ و صحرا، ندیاں، چشمے، نظارے سب حب وطن میں جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ترانۂ ہندی میں وہ ہندوستان جنت نشان کو سارے جہاں سے اچھا قرار دیتے ہیں اور اس کی تہذیب و تمدن اور ان کے تسلسل و تنوع پر فخر و ناز کرتے ہیں، وہ نانک اور چشتی کے وطن کو اپنا وطن بتاتے ہیں، ہندستانی بچوں کا قومی گیت لکھتے ہیں، خاک ہند کو اپنی امیدوں کا مرکز بتاتے ہیں، رام، نانک اور رام تیرتھ کی عظمت کے ترانے گاتے ہیں، ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور قومی اتحاد کے موضوع پر نیا شوالہ جیسی بے مثل نظم کہتے ہیں۔ اتحاد کے موضوع پر اردو میں آج تک جتنی نظمیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی نیا شوالہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ غلامی کی تاریکی دور کرنے اور سامراج کے بند و سلاسل توڑنے کے لیے اقبال اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہیں۔ آپس کے جنگ و جدال اور اپنوں سے بیر رکھنے کی مذمت کرتے ہیں۔ انھوں نے مندر و مسجد کی بنیادوں پر ایک نیا شوالہ بنا کر نقش دوئی کو مٹانے اور بچھڑوں کو ملانے کی بشارت دی اور بتایا کہ باہمی محبت و مروت اور اخوت و آشتی کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستان کی رنگا رنگی میں وحدت کا یہ تصور اور خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھنے کا یہ مشرب حالی، شبلی اور مخزن کی تحریک سے بہت آگے دیکھ رہا تھا اور اردو شاعری میں نئی وسعتیں لے کر آیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے اقبال کی فکر کائناتی آہنگ سے آشنا ہوتی گئی، وہ اس طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ البتہ سامراج کی چیرہ دستیاں اور ہندستانیوں کی غفلت انھیں ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ تصویر درد میں انھوں نے ہندوستان کے نظارے پر خون کے آنسو بہائے اور کمال دردمندی سے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ جو قومیں غفلت اور غلامی کے خلاف جدو جہد نہیں کرتیں وہ صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں۔ شعاع امید میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ اس کے ایک ایک شعر سے اقبال کے دل کا درد ظاہر ہے۔ وہ ہند کی تاریک فضا سے نالاں ہیں اور مردان گراں خواب کو بیدار کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں حالی، اقبال، سرور اور چکبست کے کلام کے اثر سے اردو شاعری کا دل وطنی اور قومی تحریکوں کی تال پر دھڑکنے لگتا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی، وحید الدین سلیم، شوق قدوائی، عظمت اللہ خاں اور برج موہن دتاتریہ کیفی نے بھی اس سلسلے میں بعض اچھی نظمیں لکھیں۔ وطنی اور ملی نظمیں لکھنے کا شرف نذیر احمد کو بھی حاصل ہے، لیکن شاعری ان کی پہچان نہیں۔ وہ اس کوچہ میں بہت جلد سپاٹ ہو جاتے ہیں اور انگریزوں کی مداحی پر اتر آتے ہیں۔ وحید الدین سلیم کا قومی مخمس اور "آریوں کی آمد ہندوستان میں" وطنی اور قومی احساس کا پتہ دیتی ہیں، لیکن حالی جیسی دردمندی ان میں نہیں۔ شوق قدوائی کا قومی جذبہ ماحول اور مناظر فطرت کی عکاسی میں ظاہر ہوا ہے۔ عظمت اللہ خاں کی نظم "وطن" اور برج موہن دتاتریہ کیفی کی "صبح وطن" اس دور کی عمدہ وطنی نظموں کے ساتھ جگہ پا سکتی ہیں۔ ہاشمی فرید آبادی کی نظمیں "چل بلقان چل"، "ماتم طرابلس"، "بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی" بھی سامراج دشمنی اور وطن دوستی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ لیکن جنگ بلقان کے تاثرات پیش کرنے میں کوئی نظم اقبال کی "حضور رسالت مآب میں" سے آگے نہ بڑھ سکی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری پر قومی اور سیاسی تحریکوں کا گہرا اثر پڑنے لگا تھا اور جدو جہد آزادی کے لیے ذہنی فضا تیار کرنے میں اردو خاطر خواہ حصہ لے رہی تھی۔ غزل اس زمانے میں مجموعی طور پر غمزۂ جاناں کے تیغ و سناں کا شکار رہی۔ حالی نے اس کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی اس کا اثر ایک مدت تک نہ ہوا اور لوگ امیر و داغ کے چٹ پٹے اشعار پر سر دھنتے رہے۔ صفی، ثاقب، شاد، عزیز، آرزو اور اثر کی پہلے دور کی شاعری اور جلیل، نوح، سائل، ریاض اور بے خود کی تمام تر شاعری اجتماعی زندگی کی تلخیوں اور بے مہریوں سے بے تعلق معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ ذہنی طلسمات کی دنیا میں رہتے تھے اور شاعری کو عشق و آرائش تک محدود رکھتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے زندگی کی پیچیدگیاں بڑھتی گئیں اور مغربی علوم و فنون سے ذہن کے دریچے کھلنے لگے، غزل کا خیالی طلسم بھی شکست ہونے لگا۔ عزیز، صفی اور ثاقب نے غالب سے روشنی لی اور شاد اور اثر نے میر سے رجوع کیا۔ لیکن یہ حالی کی

کوششوں کا اثر تھا کہ غزل رندی اور بوالہوسی کے مضامین سے پاک ہوگئی اور اس کا لب و لہجہ متین، شریف اور شائستہ ہونے لگا۔

حالی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کی غزلیں جاگیردارانہ فضا، دربار اور درباری ماحول اور انفرادی زندگی کو خیرباد کہتی نظر آتی ہیں۔ ان میں ملک اور قوم کا درد ہے اور ہندوستان کی اداسی کی فضا ہے۔ حالی کی اس روایت کا کچھ اثر ان سے اگلی نسل کے شاعروں میں اقبال کے علاوہ آرزو، صفی اور شاد پر بھی ہوا ہے۔ شاد کا وطنی شعور حالات کی رفتار کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا ہے۔ اس کا ابتدائی رنگ وہی ہے، جس کا اظہار مثنوی "مادر ہند" میں ہوا ہے۔ ماں اپنے دونوں بیٹوں رام اور رحیم کو مل جل کر رہنے کی تلقین کرتی ہے اور انگریز تجار سے کہتی ہے کہ وہ اس کے بیٹوں کے ساتھ رعایت سے پیش آئیں۔ لیکن جیسے جیسے زمانے کا رنگ بدلتا ہے، شاد کا شعور بھی واضح ہونے لگتا ہے۔ آرزو نے وطنی تقاضوں کے تحت غزل میں بول چال کی ٹھیٹھ اردو سے خوشگوار اضافے کیے اور قومی گیت لکھے۔ صفی نے بھی قومی اور وطنی جذبہ کو لے کر بعض اچھے شعر کہے۔ مناظر فطرت اور ماحول کی عکاسی کے لیے انھوں نے غزل سے زیادہ نظم سے کام لیا۔

حسرت سے اردو غزل میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ شعر و ادب کے معاملے میں وہ جتنے اعتدال پسند تھے، سیاسی طور پر اتنے ہی نڈر، بے باک اور انتہا پسند بھی تھے۔ سیاسی طور پر ان کا مسلک چکبست سے مختلف تھا۔ حسرت بغاوت اور انقلاب کے علم بردار تھے۔ چکبست نظم کے شاعر تھے۔ انھوں نے شاعری سے واضح وطنی اور سیاسی خدمت لی۔ حسرت فطرتاً غزل گو تھے، اس لیے انھوں نے شاعری کو کھلی ڈلی سیاست سے الگ رکھا اور جو کچھ کہا غزل کے محاورہ میں رمز و ایما کے پیرایہ میں کہا۔ اپنی شخصیت کے اثر سے انھوں نے غزل کو دلیری بھی دی اور دلبری بھی۔ ان کی شخصیت بڑی دلچسپ اور رنگارنگ ہے۔

حسرت ایک فطری عاشق اور حسن پرست، بے ریا صوفی اور بے باک سیاسی کارکن تھے۔ بظاہر ان چیزوں میں میل نہیں، لیکن حسرت کی شخصیت بقول رشید احمد صدیقی 'مرکب نہیں مفرد' ہے۔ وہ مصالحت میں یقین نہیں رکھتے اور ہر شے کو الگ الگ نبھا دینے کا سلیقہ جانتے تھے۔ اپنی شاعرانہ حیثیت کو بے لوث رکھتے ہوئے انھوں نے قومی جدوجہد میں جس مجاہدانہ عزم، حوصلے اور جرأت سے حصہ لیا، ہمارے شاعروں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

1906 میں ملک میں سودیشی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا مقصد عوام میں خود اعتمادی پیدا کرنا اور انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا اور دیسی دستکاریوں اور صنعتوں کو پھر سے زندہ کر کے انھیں ترقی و فروغ دینا تھا۔ اس تحریک سے حسرت بھی متاثر ہوئے اور نہایت گرم جوشی سے اس میں حصہ لیا۔ انھوں نے بمبئی کے ایک نامور رئیس التجار سر فضل بھائی کریم بھائی سے کپڑا خریدا اور سودیشی اسٹور قائم کیا۔ بعد میں شبلی بھی اس کام میں شریک ہوگئے اور اس اسٹور کی کئی شاخیں قائم کی گئیں۔

اس زمانے میں جنگ بلقان چھڑی۔ ترکوں کے خلاف انگریزوں نے جو ریشہ دوانیاں کیں، ان سے ہندستانی مسلمانوں کو پہلی بار سامراجیت کے استبداد کا احساس ہوا۔ ہندو عوام نے بھی یہ محسوس کیا کہ مشرقی ملکوں میں برطانوی پالیسی کی کامیابی ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں اور زیادہ مضبوط کردے گی۔ مسلمان ترکی کو اب تک خلافت کا مرکز سمجھتے تھے۔ اس کے خلاف انگریزوں کی کارروائیوں سے ان کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچی اور ان کے جوش و خروش اور غم و غصہ کی انتہا نہ رہی۔ حسرت کی یہ غزل اس زمانے کے جذبات کی عمدہ ترجمانی کرتی ہے:

قبضہ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دست پیغمبر میں ہے
جور یورپ ہے بنا بیداری اسلام کی
خیر ہے دراصل یہ با آنکہ شکل شر میں ہے
قلت افواج ترکی پر نہ ہو انکی دلیر
ایک ہے سو کے لیے کافی جو اس لشکر میں ہے
اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہے بلند
رایت حریت و حق جو کف انور میں ہے

پہلی جنگ عظیم تک کا زمانہ حسرت کی شاعری کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری کی شان الگ ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے بیان کی شگفتگی، خیال کی شادابی اور جذبہ کی رنگینی پر اس رجائیت اور نشاطیت کا گہرا اثر پڑا ہے، جو کسی عقیدہ پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ حسرت کے ہاں یہ عقیدہ عبارت ہے وطن دوستی اور سیاسی آزادی سے۔ وہ تحریک آزادی کی آخری منزل تک ہمارے ساتھ رہے ہیں اور ان کے سیاسی عقیدہ کا یہ شعلہ کبھی سرد نہیں ہونے پایا۔ انھوں نے شاعری کو وقتی اور عارضی مسائل سے الگ رکھا، لیکن ان کے یقین کی چنگاریاں ان کی غزل میں جگہ جگہ آتش گل کی طرح دہکتی نظر آتی ہیں۔

شعر و ادب کی دنیا میں کوئی ایک سال مشکل سے حد فاصل قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اردو کے بہترین نقاد اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ 1914 "ایک بساط کے الٹنے اور دوسری بساط کے بچھنے کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے"۔ اس زمانے میں اردو شاعری ایک طرف درگا سہائے سرور (وفات 1911) حالی (وفات 1914) اور شبلی (وفات 1914) کی آوازوں سے محروم ہوجاتی ہے تو دوسری طرف اقبال، چکبست اور حسرت کی شاعری ترقی کی نئی منزلیں طے کرنے کے لیے پر تولنے لگتی ہے۔ OO

'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' مصنف: گوپی چند نارنگ سے

ڈاکٹر محمد اقبال

جذبۂ حریت

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
دکھادوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو
کہ اپنی زندگی کو تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری ظلمت میں مَیں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا
نہیں بے وجہ وحشت میں اڑانا خاک زنداں کا
کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا
شریکِ محنتِ زنداں ہوں گو یوسف صفت خود بھی
مگر تعبیر خواب اہل زنداں کر کے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
ابھی مجھ دل جلے کو ہمصفیرو اور رونے دو
کہ میں سارے چمن کو شبنمستاں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی
مسلمانوں کو آخر نا مسلماں کر کے چھوڑوں گا
اٹھادوں گا نقابِ عارضِ محبوب یک رنگی
تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا
دکھادوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو تیرا درد تھا تاکا ہے اس نے میرے پہلو کو
تری افتاد نے توڑا ہے میرے دست وبازو کو

شاد عظیم آبادی

مادرِ ہند

اک ملک جو ایشیا کی ہے جاں
فردوسِ بریں ہو جس پہ قرباں
وہ قطعۂ ارضِ پاک و مشہور
ہم صورتِ خلد چشم بد دور
عظمت میں کنشت سے فزوں تر
خوبی میں بہشت سے فزوں تر
بتخانۂ چیں وہاں کے بازار
ہر اک مکاں، دکانِ عطار
ہر گوشہ زمیں کا رشکِ گلشن
جس نخل کو دیکھئے وہ چندن
پورب پچھم تھا معدنِ زر
دکھن اترے خوش نما تر
اس ارض کو زر نثار کہئے
اک قلعۂ استوار کہئے
ہر ذرہ تھا آبرو میں گوہر
ہر سنگ جواہرات پتھر
ہر نخل ہو جس کا سرو پیکر
طوطی بولے نہ اس کا کیونکر
بازارِ عدن وہاں کے رستے
پانی کے عوض گہر برستے
رنگت میں مزاج میں قوا میں
کیا ظلم و جفا میں کیا وفا میں

یہ جملہ صفات غیر محدود
اس قطعۂ ارض میں تھے موجود
خوش رنگ ہر اک شجر کے اثمار
کوزوں میں لئے نباتِ تیار

اک محتشمہ وہاں کی ساکن
اس مادرِ دہر کی تھی ہم سِن
پہنچی تھی جو دور دور شہرت
پھیلی تھی جہاں میں اس کی عظمت
ذی جاہ و خجستہ کام تھی وہ
عالم میں بلند نام تھی وہ
دولت کے وفور میں تھی مشہور
خلق وکرم وعطا سے معمور
مشہور تھا فیض عام اس کا
تھا مادرِ ہند نام اس کا
شاہوں سے زیادہ اس کا درجہ
جتنے راجہ تھے اس کے پرجا
ہوتا تھا بسر عجب زمانہ
ہر طرح گھر اس کا عیش خانہ
ہر گوشۂ ملک سبز و شاداب
راجہ تھا کوئی تو کوئی نواب
کالے کوسوں سے آکے تجار

اجناس خریدتے تھے ہربار
اس ملک کو سادہ لوح پا کے
آتے تھے جتھے بنا بنا کے
تا منزلت و وقار پائیں
رفتہ رفتہ اثر بڑھائیں
پھل پھول کا جنگلوں کے کیا مول
بک جاتے تھے وہ بھی سونے کی مول

اس محتشمہ کے دو پسر * تھے
دونوں سے قوی دل و جگر تھے
دانا و ذکی وخوش بیاں تھے
ہر طرح سے فخرِ خانداں تھے
ایک لختِ جگر کا رام تھا نام
خوش خو تھا بہت وہ نیک انجام
دلبندِ دوم جو نامور تھا
نام اس کا رحیم مشتہر تھا
ہر طرح سے دونوں من چلے تھے
گہوارۂ ناز میں پلے تھے
ہر شخص فریفتہ تھا ان کا
جو دل تھا وہ شیفتہ تھا ان کا
کہتا تھا یہ دیکھ کر زمانہ
دونوں سے ہے گھر نگار خانہ

* ہندو مسلم

سیماب اکبرآبادی

ہندوستان

وہ پرستش گاہِ فطرت، سجدہ گاہِ آفتاب
گرد گارِ صبحِ مشرق، شامِ گیتی کا شباب
تھا صنم زارِ عرب جس کے صنم خانوں کی دھوپ
آتشِ بزمِ عجم تھی جس کے ایوانوں کی دھوپ
بت کدوں میں جس کے زندہ تھے بتانِ آذری
عشق کی پروردگاری، حسن کی پیغمبری
سرخ صندل سی جبینیں ان پہ قشقوں کے چراغ
برگ سے نازک طبیعت، پھول سے نازک دماغ
جس کے دریا آئینے، پگھلے ہوئے بہتے ہوئے
جس کے پربت کائناتِ ابر کو گھیرے ہوئے
جس کی ندیاں موجِ مے کی طرح لہراتی ہوئی
گھومتی، گرتی، گزرتی، گونجتی، گاتی ہوئی
شام مستی آفریں، رنگِ سحر جلوہ پناہ
عشق کی پہلی جماہی، حسن کی پہلی نگاہ
لہلہاتے سبزہ زاروں میں بہار آئی ہوئی
اک گھٹا برسی ہوئی اور اک گھٹا چھائی ہوئی

جیسے رقصاں ہو فضا میں حسن کا رنگیں خدنگ
مختلف رنگوں کا جیسے اڑ رہا ہو اک پتنگ

دیکھ کر افغانیوں نے اس کی پروازِ جمیل
لے لیا آغوشِ قوت میں بہ اندازِ جمیل
مل گئی شمعِ حرم، بت خانے کے فانوس سے
ابنِ آذر نے اذاں دی پردۂ ناقوس سے
مسلکِ بدھ کو تحفظ کا اشارہ مل گیا
کرشن کے مندر کو مسجد کا سہارا مل گیا
ذرہ ذرہ محفلِ زہرہ نظر آنے لگا
خون سا قشقہ ثریا بن کے اترانے لگا

ہند علم و فضل و رعنائی کا گہوارہ بنا
یہ پتنگ اتنا ہوا اونچا کہ سیارہ بنا

شامِ مغرب یہ ستارہ دیکھ کر للچا گئی
سادہ و بے نور آنکھوں میں چکا چوند آ گئی
فلسفی بھی دام لے لے کر بڑھے تجار بھی
اپنا پھندا لے کے اٹھا دیوِ استعمار بھی
عرشِ سطوت پر تھی موجِ عشرتِ افغانیاں
جلوۂ ساغر سے تھیں چمکی ہوئی مہتابیاں
تھیں یہی دو چار باتیں گرمیٔ بزمِ شباب
نغمۂ مطرب، کنارِ شاہد و جامِ شراب
کارواں غافل ہوا رعبِ شبِ منزل گیا
پاسبانِ وقت کو شب خوں کا موقع مل گیا

شامِ مغرب صبحِ مشرق پر یکا یک چھا گئی
سرخ اک بدلی زمیں سے آسماں تک چھا گئی

اب وہ سیارہ جو رفعت پر سبک پرواز تھا
پستیٔ حالات سے پھر نقشِ پا انداز تھا

آہ اے ہندوستاں! یہ تیری پستی وہ شباب!
کچھ تری تقدیر ہی میں فطرتاً ہے انقلاب
گو بظاہر تو نشاطِ ندرتِ ایام ہے
فی الحقیقت بے سکوں بے چین بے آرام ہے
وہ بہاریں، وہ چمن، وہ گلشن ایجادی کہاں
اے غلام آباد اب وہ تیری آزادی کہاں
بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار
ایک ذرے، ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار
اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساطِ ماہتاب
تیری موجِ خاک سے اب بھی برستے ہیں گلاب
روح سے خالی ہے لیکن پیکرِ مردہ ترا
جلوہ پژمردہ ہے تیرا، باطن افسردہ ترا
جیسے شمعِ صبحِ محفل، جیسے چھپتا آفتاب
جیسے شاعر کا بڑھاپا اور بیوہ کا شباب

پستیوں کو ارتقا پھر جلوۂ آغاز دے
کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

برج نرائن چکبست

فریادِ قوم*

ہے آج اور ہی کچھ صورت بیاں میری
تڑپ رہی ہے دہن میں مرے زباں میری
چھدیں گے قلب وجگر تیر ہے فغاں میری
لہو کے رنگ میں ڈوبی ہے داستاں میری
مبالغہ نہیں تمہید شاعرانہ نہیں
غریب قوم کا ہے مرثیہ فسانہ نہیں

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز
ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد قوم کے دم ساز
ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز
وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کرلینا
''ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا''

جو مٹ رہے ہیں وطن پر یہ ہے صدا ان کی
لہو پکار رہا ہے یہ ہے وفا ان کی
بندھی ہے عالمِ تہذیب میں ہوا ان کی
غضب کی جا ہے جو گردن جھکے ذرا ان کی
تمہارے دل میں نہ الفت کی ہوک اٹھے افسوس
وطن کا قافلہ پردیس میں لٹے افسوس

ٹرینسوال کے حاکم وفا شعار نہیں
کچھ ان کے قول کو دنیا میں اعتبار نہیں
ہماری قوم پہ احساں کا ان کے بار نہیں
یہ ظلم کیوں ہے ہم ان کے گناہگار نہیں
اگر وہ دولت برطانیہ کے پیارے ہیں
تو اہل ہن اسی آسماں کے تارے ہیں

مگر جفا سے نہیں ظالموں کو مطلق عار
اجاڑتے ہیں وہ بستی جو تھی کبھی گلزار
جہاں خوشی کے ترانوں کا گرم تھا بازار
سنائی دیتی ہے واں بیڑیوں کی اب جھنکار
کیا ہے بند مسافر سمجھ کے راہوں کو
پنہائی جاتی ہے زنجیر بے گناہوں کو

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے
تمہیں تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے
ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے
وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوارے
جو چپ رہیں تو ہوا قوم کی بگڑتی ہے
جو سر اٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

اگر دلوں میں نہیں اب بھی جوش غیرت کا
تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار وعزت کا
وفا کی پھونک دو ماتم کرو محبت کا
جنازہ لے کے چلو قوم ودین وملت کا
نشاں مٹادو امنگوں کا اور ارادوں کا
لہوں میں غرق سفینہ کرو مرادوں کا

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار
پکارتے ہیں مدد کے لئے درو دیوار
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار
زمین ہلتی ہے اڑتا ہے خون بن کے غبار
جگہ سے اپنی چتور کی زمیں سرکی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

اگر نہ قوم کے اس وقت بھی تم آئے کام
نصیب ہوگا نہ مرنے پہ بھی تمہیں آرام
یہی کہے گا زمانہ کو تھا برائے نام
وہ دھرم ہندوؤں کا وہ حمیتِ اسلام
ذرا اثر نہ ہوا قوم کے جبینوں پہ
وطن سے دور چھری چل گئی غریبوں پہ

جو دب کے بیٹھ رہے سر اٹھاؤ گے پھر کیا
عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا وجود کی ذلت مٹاؤ گے پھر کیا
تم اپنے بچوں کو قصے سناؤ گے پھر کیا
رہے گا قول یہی ان سے ان کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمہاری ہے بے حیاؤں کا

مٹا جو نام دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگادے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے
فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

* یہ نظم جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی حالتِ زار سے متاثر ہوکر کہی گئی جو ٹرانسوال کے حکام کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے عاجز اور پریشان تھے۔ گاندھی جی ان غریب الوطنوں کی حالت کو سدھارنے میں دل وجان سے مصروف تھے۔ چنانچہ یہ نظم ایک رسالے کی شکل میں شائع کی گئی اور اسے گاندھی جی کے نام سے اس طرح معنون کیا گیا:

بخدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی
نثار ہے دل شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر
چکبست لکھنوی

درگا سہائے سرور جہان آبادی

بد نصیب بنگال

آہ اے بنگال آلام ومصائب کے شکار
آہ اے کرزن کی پالیسی کے صید بے قرار

آہ اے نخچیر ناوک خوردۂ دستِ اجل
آہ اے خونیں جگر خونیں کفن خونیں مزار

آہ اے محنت کش وحرماں نصیب ودرد مند
آہ اے برگشتہ ایام وپریشاں روزگار

مل گئیں تیری وفائیں خاک میں سب ہائے ہائے
ہوگیا حکام کی نظروں میں تو بے اعتبار

کرکے دو ٹکڑے کلیجے کے ترے یہ آہ کون
چل دیا تجھ کو تڑپتا چھوڑ کے بیگانہ وار

کرزنِ بیداد خو، اہل پولس، حکام وقت
تو ہوا اُف! اُف! نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار

جگر مرادآبادی

قحط بنگال

بنگال کی میں شام وسحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور وکفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں
بچوں کا تڑپنا وہ بلکنا وہ سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں
انساں کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّر تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
خاموش نگاہوں میں امنڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں
بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں
انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنا دل کا نشیمن
صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
اک تیغ کی جنبش سی نظر آتی ہے مجھ کو
اک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں

حسرت موہانی

دیکھئے کب تک رہے

رسم وفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حب وطن محو خواب دیکھیے کب تک رہے
دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس وہراس
قبضۂ شرم وحجاب دیکھیے کب تک رہے
تابہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر یہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے
ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب وکباب دیکھیے کب تک رہے
حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض وعتاب دیکھیے کب تک رہے

چکی کی مشقت

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی
دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر
اے ساقیِ جاں پرور کچھ لطف وعنایت بھی
رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمت بے تابی
یاں نالۂ مضطر کی جب مجھ میں ہو قوت بھی
اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حریتِ کامل کا
منظورِ دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

محمد علی جوہر

رنذِ سحر

طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
چاک کر سینے کو پہلو چیر ڈال
یوں ہی کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے
لو وہ آپہنچا جنوں کا قافلہ
پاؤں زخمی خاک منہ پر سر کھلے
اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا
نا خدا کیا دیر ہے، لنگر کھلے!
یہ نظر بندی* تو نکلی رنذِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

*مولانا کی پہلی نظر بندی 1915 تا 1917

اور ہی کچھ ہے

یہ جور نرالا، یہ جفا اور ہی کچھ ہے
یہ ظلم نہیں نامِ خدا اور ہی کچھ ہے
ہوں لائق تعزیر یہ الزام ہے جھوٹا
مجرم تو ہوں بے شک پہ خطا اور ہی کچھ ہے
ہو مکر و دغا لاکھ شعار اہلِ ہوس کا
پر شیوۂ اخوانِ صفا اور ہی کچھ ہے
سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم
پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے
یہ صدر نشینی☆ ہو مبارک تجھے جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

☆آل انڈیا کانگریس کی صدارت کی طرف اشارہ

تلوک چند محروم

شہید بھگت سنگھ

زنداں میں شہیدوں کا وہ سردار آیا
شیدائے وطن پیکرِ ایثار آیا
ہے دار و رسن کی سرفرازی کا دن
سردار بھگت سنگھ سردار آیا

تا دار و رسن شوق سے اٹھلا کے گیا
تو شانِ شہادت اپنی دکھلا کے گیا
ٹکڑے ہوتا ہے دل ترے ماتم میں
لاشے کا انگ انگ کٹوا کے گیا

پی کر مئے شوق جھومنا وہ تیرا
بے پروایانہ گھومنا وہ تیرا
ہے نقش ترے اہلِ وطن کے دل پر
پھانسی کی رسن کو چومنا وہ تیرا

جامِ حبِ وطن کے اے متوالے
اے پیکرِ ناموس، حمیت والے
ہو عالمِ ارواح میں شاداں کہ نہیں
اب تیرے وطن میں وہ حکومت والے

مولانا ظفر علی خاں

فانوس ہند کا شعلہ

زندہ باش اے انقلاب اے شعلۂ فانوسِ ہند
گرمیاں جس کی فروغِ مشعلِ جاں ہوگئیں

بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی خاموشیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہوگئیں

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہوگئیں

مرحبا اے نو گرفتارانِ بیدادِ فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہوگئیں

زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہوگئیں

ہندوستان

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

تہذیب ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موج رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے

ذرے میں گر تڑپ ہے تو اس ارضِ پاک سے
سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے

ہے اس کے دم سے گرمی ہنگامۂ جہاں
مغرب کی ساری رونق اسی اک دکاں سے ہے

فریادِ جرس

کل کہہ رہے تھے ایک محبِ وطن بزرگ
ہندوستان رہنے کے قابل نہیں رہا
انساں سے چھین لی گئی آزادیٔ ضمیر
لیلیٰ کے ناقے کے لئے محمل نہیں رہا
تھا حق کا دشنہ تیز بھی خوں ریز بھی مگر
کچھ دن سے درخورِ رگِ باطل نہیں رہا
سچ اور جھوٹ میں نہیں باقی رہی تمیز
اب امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
ہم آپ اپنی راہ کے سنگِ گراں بنے
رہرو کو فکرِ دوریٔ منزل نہیں رہا
آزادیٔ حیات کی جس دل میں تھی تڑپ
اب پہلوئے وطن میں وہی دل نہیں رہا
جو کوشش آشتی کی ہوئی رائگاں گئی
اور کوئی اتحاد کا قائل نہیں رہا
پھر کس لئے یہ شکوہ کہ لطفِ خدائے پاک
ہندوستاں کے حال کو شامل نہیں رہا

جوش ملیح آبادی

وفادارانِ ازلی کا پیغام شہنشاہِ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ دریوزہ گروں کے شہریار
اے ہمارے عالموں کے ''حامیِ دینِ مبین''
دورِ سید* کے ''اولی الامر'' و ''امیرالمومنین''
اے رئیسِ پاک دل اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجے سلام
راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یوں ہی رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو
دل کے دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پہ اک دھجی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں
تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں
شکریہ ان روٹیوں کا اے شہِ گردوں نشاں
روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدام نے
آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے
آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا
کھا بھی لیں گے آج گر، روٹ کر تو کل کھائیں گے کیا
صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام
کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام
آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قومِ نامراد
کھائے جاتا ہے اسے خدامِ عالی کا عناد
معدہ محرومِ غذا ہے کیسہ ہے محرومِ زر
آپ کے عمال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر
آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج
آج اس بھارت کا سر ہے اور تیغِ احتیاج
ہر جبیں پر ہے شکن، اس کج کلاہی کی قسم
ہر مکاں اک مقبرہ ہے قصرِ شاہی کی قسم
آپ کے سر پر ہے تاج، اے فاتحِ روئے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں
ہم وفا کیش آپ کی نظروں سے بھی گر جائیں گے
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائیں گے
ہم سے باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات
ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرے ذرے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں
کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب
گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ
ہم وفادارانِ پیشیں، ہم غلامانِ کہن
قبر جن کی کھد چکی تیار ہے جن کا کفن
تندرو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کے امنگوں کو دبا سکتے نہیں
مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی
جیسے کوئی دھار چھوتا ہے اپنی تلوار کی
آپ سے کیوں کر کہیں ہندوستاں پُرہول ہے
آپ کا نام آگ ہے اور کانگریس پٹرول ہے
وہ سرنگیں کھد رہی ہیں الحفیظ و الاماں
صرف انگلستان کیا یورپ سما جائے جہاں
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی
صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی
آپ کے ایواں میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی
ہندیوں کی سانس سے آتی ہے بو بارود کی
غور سے سن لیجئے اے خواجۂ عالی نژاد
آپ کو دھوکے میں رکھ سکتے نہیں ہم خانہ زاد
کیجئے درماں میں عجلت ورنہ دل ڈر جائیں گے
حاکم اپنے گھر چلے جائیں گے ہم مر جائیں گے
چونکئے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہوجانے کو ہے

*سر سید احمد خاں مرحوم

جوش ملیح آبادی

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

جوش ملیح آبادی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟
''دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو''
''جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن وبقا''
''باغ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں''
''ہات ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر''
سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی تمہارے ہات کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمہیں جلیانوالا باغ بھی
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
'ڈائر' گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے
اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جس پر طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جن میں کوڑوں کی صدا
آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو کیوں
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
'بینکی' اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم

اہلِ حق روشن نظر ہیں اہلِ باطن کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں
کیا کہا ''انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں''
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپ تازی کیا شفاخانے میں ہے؟
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

ماخذ: 'آزادی کی نظمیں' مرتبہ: سبط حسن، ناشر: حلقۂ ادب، لکھنؤ
1940 ضبط شدہ ادبیات نیشنل آرکائیوز، اندراج نمبر 1712

احمق پھپھوندوی

انگریزی ذہن کی تیزی

کس طرح بپا ہوں ہنگامے آپس میں ہو کیوں کر خوں ریزی
ہے ختم انہی اسکیموں میں انگریزی ذہن کی سب تیزی

یہ قتل و خوں یہ جنگ و جدل یہ جور و ستم یہ بغض و حسد
باقی ہی رہیں گے ملک میں سب باقی ہے اگر راج انگریزی

گلزار وطن اک بنجر ہے، یا خاک ہے اب یا صرصر ہے
کیا پھول یہاں اور کیسے پھل، کیا شادابی کیا زرخیزی

ہر سو ہے بپا ہنگامۂ خوں، ہر سمت ہے ڈھیر اک لاشوں کا
اڈوائرو ڈائر کے دم سے، قائم ہے نشانِ چنگیزی

شدھی ہے کہیں، تبلیغ کہیں ، ناقوس کہیں، تکبیر کہیں
یہ پیچ نہ ہوں تو مشکل ہے دم بھر کے لئے راج انگریزی

کڑے مرحلے

نہیں سہل آزادیٔ ہند یارو
ابھی تم کو میداں میں آنا پڑے گا
ابھی امتحاں تم کو دینے پڑیں گے
ابھی تم کو جیلوں میں جانا پڑے گا
ابھی چکیاں پیسنی ہوں گی تم کو
ابھی پمپ و گڑا چلانا پڑے گا
ابھی جسم ہوں گے لہو پتھروں سے
ابھی زخم سینے پہ کھانا پڑے گا
پڑے گا ابھی کام تیغ و تبر سے
ابھی خاک و خوں میں نہانا پڑے گا
چلیں گی ابھی ہر طرف گن مشینیں
ابھی توپ کی زد پہ آنا پڑے گا
ہوائی جہاز آ کے یورش کریں گے
ابھی سر پہ بم کا نشانا پڑے گا
یہ سب امتحاں ختم ہو جائیں گے جب
یہ سر تم کو اپنا کٹانا پڑے گا
کھچو گے ابھی تختۂ دار پر تم
ابھی تم کو پھانسی پہ جانا پڑے گا
بہت سے کڑے مرحلے راہ میں ہیں
یہ طے کر کے منزل تک آنا پڑے گا

جدوجہدِ آزادی

اور

ترقی پسند شاعری

جائزہ

کلام

بیسویں صدی کی جدو جہد آزادی

ترقی پسند اور قوم پرست شعرا

گوپی چند نارنگ

ترقی پسند شاعری کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہماری وطنیت کے دھارے وسیع بنیادوں پر استوار کیے، اسے غیر مذہبی بنیادیں دیں اور مذہب وملت کی بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندیوں سے یکسر آزاد کیا...

اب شاعری ایک لمحۂ سرخوشی کی یاد نہ رہی بلکہ دردمند دل کی فریاد بن گئی۔ آزادی اور جمہوریت پر زور دیا جانے لگا اور فن میں تجربات کا دور شروع ہوا، جس سے اگر ایک طرف کچھ بے راہ روی پھیلی تو کچھ کارآمد اضافے بھی ہوئے۔ زلفوں کی گھٹا، گردن کی صراحی اور آنکھوں کے پیمانے نئی زندگی کے درد و کرب، اس کے خواب وخیال اور شکست و فتح کا ساتھ نہ دے سکے اور جدید شاعروں نے نئی قسم کی ایمائیت کو فروغ دیا۔ یہ ایمائیت کلاسیکی ایمائیت سے مختلف تھی...

1936 سے آزادیِ ہند تک کا زمانہ اردو میں ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ ہے۔ ان برسوں میں ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی حدود کو وسیع کیا اور اسے اپنے زلزلوں سے خاصا زیروزبر بھی کردیا۔

ترقی پسند تحریک کی بنیاد اشتراکی اصول ونظریہ پر ہے۔ انقلاب روس کے بعد اشتراکی نظریے کا اثر ہندوستان میں بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے اور ان کی تنظیم روز بروز مضبوط ہونے لگی۔ اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے کسانوں اور محنت کشوں کا درد محسوس کیا اور ان میں ولولہ اور امنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اقبال ہی نے سب سے پہلے مزدور سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال کی نظم ''خضرراہ'' جو بقول آل احمد سرور اردو شاعری میں New Testament کی حیثیت رکھتی ہے، مسلم نقطۂ نظر سے لکھی گئی لیکن اس میں ہندستانی محنت کش طبقے کا درد نمایاں ہے۔ یہ اردو کی پہلی نظم ہے جس میں مزدوروں کی اہمیت کے پیش نظر انھیں بیداری اور عمل کا پیغام دیا گیا۔ ''فرشتوں کا گیت'' میں صاف صاف کہتے ہیں:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمَرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

حسرت نے بھی ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے اشتراکی نظریہ قبول کرلیا تھا۔ 1926 میں پہلی کمیونسٹ کانفرنس کانپور میں ہوئی۔ حسرت اس کی

استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے اور اپنے خطبہ میں انھوں نے کمیونزم کے اصول اور اس کے اغراض ومقاصد سے کھل کر بحث کی۔ بعض جگہ شعر کے پردے میں بھی انھوں نے محنت کش طبقے سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا اور انھیں مستقبل کے لامحدود امکانات کی بشارت دی:

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جورِ بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد بین الاقوامی تحریکوں کے اثر سے 1936 میں پڑی۔ اس کے پہلے اعلان نامہ پر منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین اور مولانا نیاز فتح پوری جیسے چوٹی کے ادیبوں نے دستخط کیے۔ حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، علی عباس حسینی، قاضی عبدالغفار اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ بہت جلد اس تحریک نے ہندوستان میں ایسی وسعت اختیار کرلی کہ نئے لکھنے والوں میں سے اکثر اس میں شامل ہوئے اور بعض کوتاہیوں کے باوجود بہت جلد اس کا حلقۂ اثر اپنی تنظیم کی حدوں سے بھی آگے نکل گیا۔

اردو ادب میں انسان دوستی، حب الوطنی، سامراج دشمنی اور آزادی کا جذبہ پہلے بھی موجود تھا، لیکن 1935-1936 میں جب دنیا دوسری جنگ عظیم کا بھیانک خواب دیکھ رہی تھی اور فاشزم کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا، ضرورت تھی کہ جمہوری رجحانات، اقدار اور طرزِ فکر کو تقویت پہنچائی جائے اور ہندوستان کی تحریک آزادی کا پرجوش ساتھ دیا جائے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے یہ ضرورت نہایت خوبی سے پوری کی اور ادیبوں کو ایک واضح اور منظم نصب العین کی دعوت دی۔ انجمن کے پہلے اعلان نامہ میں اس بات پر خصوصاً زور دیا گیا کہ ہندستانی ادیب ہندستانی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں۔ انھوں نے یقین دلایا کہ ”ہم اپنے آپ کو ہندستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم ... ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب وتمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔“

ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے والے ادیب فکر وفن کے جدید ترین رجحانات کے علم بردار تھے۔ انھیں احساس تھا کہ اب امیری اور غریبی کی تقسیم ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ اگر آزادی حاصل ہو تو سائنس، صنعت وحرفت اور نقل وحمل کی نئی قوتوں کی مدد سے اتنی دولت پیدا کی جاسکتی ہے کہ امیری اور غریبی کی تفریق ختم یا کم کردی جائے اور ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جائے جس میں ہر انسان کو ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ چنانچہ اس نئی دنیا کی تخلیق کے لیے ذہنی فضا تیار کرنا ادب کا مقصد قرار پایا۔ ادیب کی خلاقانہ حیثیت سے بحث کرتے ہوئے منشی پریم چند نے پہلی کانفرنس کے خطبہ صدارت میں کہا:

”ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہوجائے گی۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کرسکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں، تب ہماری خودداری انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تب ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کرکے مطمئن نہ ہوجائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرایئے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے لیے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔“

پریم چند کا اُسی سال انتقال ہوگیا۔ جوش اور فراق کے دیکھتے دیکھتے نو مشق ادیبوں کا ایک بڑا گروہ ترقی پسند تحریک میں شامل ہوا۔ شاعروں میں مجاز، جذبی، مخدوم، سردار جعفری، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال، اختر انصاری، مجروح، سلام مچھلی شہری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں اکثر نوعمر تھے اور جوانی کے تقاضوں کی وجہ سے رومانیت کا شکار تھے۔ لیکن بقول سردار جعفری ”یہ سنجیدہ قسم کے نوجوان تھے جو سماجی ذمہ داریوں کا بھی احساس رکھتے تھے اور تھوڑا سا شعور بھی۔ ان کے شعور کی مختلف سطحیں تھیں۔ ان کے تجربے مختلف تھے اور فکریات الگ الگ۔ کوئی گاندھی وادی اور اہنسا کا پرستار تھا... کوئی نہرو کو اپنا ہیرو بنائے ہوئے تھا... کوئی کمیونسٹ تھا... پھر ایسے نوجوان بھی تھے جو کسی سیاسی مسلک سے تعلق نہیں رکھتے تھے ... لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک تھی کہ سب کے سب اپنے ملک کی غلامی پر شرمندہ تھے اور کسی خوبصورت منزل تک پہنچنے کے لیے کسی حسین راستے کی تلاش میں تھے۔“ ترقی پسند ادب، ص 182

یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کا ذرہ ذرہ بے چینی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ 1936 کے بعد سیاسی آزادی کے معنی معاشی آزادی کے ہوگئے تھے۔ سوشلسٹ پارٹی، کسان سبھائیں اور ٹریڈ یونینیں وجود میں آچکی تھیں اور قومی جدوجہد میں حصہ لینے لگی تھیں۔ مجموعی طور پر ہندوستان سامراج سے آخری ٹکر لینے کو تیار ہو رہا تھا، لیکن برطانوی حکومت ہندستانیوں کا جوش وخروش ٹھنڈا رکھنے کے لیے انھیں جھوٹی آزادی کا خواب دکھا رکھی تھی۔ 1937 میں ہندوستان میں جو فاق

لاگو ہوا بقول ظفر علی خاں '' کاغذی گھوڑے '' سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لیے
اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا

اس ایکٹ سے ہندوستان کی کسی پارٹی کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ احمق پھپھوندوی مغربی کاغذ تراشوں کے اس خوش رنگ پھول کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے حکومت کی یہ فیاضی بہت ہی شاندار
اس رعایا پروری پر دنگ ہے عقلِ مغول
خیر مقدم ہے کہیں اس کا سیہ پرچم کے ساتھ
ہے کہیں ہڑتال کی صورت میں اظہار عدول
ہے کہیں جلسوں میں پاس اس کے لیے لعنت کا ووٹ
ہے جلوسوں میں کسی جا اس کے سر پر خاک دھول
کوئی دیتا ہے اسے تشبیہ خارستان سے
کوئی کہتا ہے اسے باغ سیاست کا ببول
ملک والوں سے حکومت کی ہے یہ اک دل لگی
آج اس کو حق بھی ہے اس کا کہ ہے اپریل فول

نیا وفاق یکم اپریل 1937 کو نافذ ہوا تھا۔ جوش اس کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نوید گل
اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے
یہ بوستاں یہ اہل سیاست کی شاخِ گل
شیطاں کے پاس باغ کی سوکھی ببول ہے
ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

نئے وفاق سے انگریزوں کا یہ منشا تھا کہ برطانوی صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کو ملا کر مرکز میں ایک وفاقی حکومت قائم کی جائے۔ اس کی ملک میں ہر طرف سے شدید مخالفت ہوئی اور ایکٹ کا یہ حصہ نافذ نہ ہوسکا۔ دوسرا حصہ صوبوں کو ایک حد تک خود اختیاری دیتا تھا۔ گو گورنر کو مداخلت کے غیر محدود اختیارات یہاں بھی حاصل تھے، لیکن حکومت کے تمام محکمے جمہور کے چنے ہوئے نمائندوں کو سپرد کیے جانے تھے۔ کانگریس نے شروع میں ایکٹ کے اس حصے کی بھی مخالفت کی لیکن بعد میں سمجھوتہ ہوگیا اور کانگریس نے انتخابات میں حصہ لیا۔ یہاں اسے توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ پانچ صوبوں میں کانگریس قطعی اکثریت سے کامیاب ہوئی اور دو صوبوں میں اس کی حیثیت غالب پارٹی کی تھی۔ حکومت کا کام سنبھالنے سے پہلے کانگریس نے وائسرائے سے یہ بات صاف کرلی کہ گورنر روزمرہ کے کاموں میں دخل نہیں دیں گے۔

کانگریس نے صوبوں میں بڑی کامیابی سے حکومت کی اور اس کی مقبولیت دیکھ کر ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس میں شامل ہوگئی جو نہ تو ملک وقوم کے شیدائی تھے نہ اتحاد کے طالب بلکہ سیاسی اقتدار کے خواہش مند تھے۔ اس سے کانگریس کی ہیئت بدل گئی اور اس پر مصلحت اندیشی اور فرقہ وارانہ رنگ چڑھنے لگا۔ نتیجے کے طور پر مسلم لیگ کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقع مل گیا اور وہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی ایک جداگانہ ریاست کا مطالبہ کرنے لگی۔

1939 میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ وائسرائے نے مجلس قانون ساز سے مشورہ کیے بغیر یہ اعلان کردیا کہ ہندوستان بھی جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دے گا۔ یہ بات دستور کے خلاف تھی اس لیے کانگریسی وزارتوں نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ کانگریس کے ذمہ دار لیڈر جمہوریت کی حمایت اور فسطائیت کی مخالفت کے سوال پر متفق تھے۔ لیکن ہندستانی رائے عامہ جنگ کو لمحۂ غنیمت سمجھتی تھی اور زیادہ تر لوگ یہ چاہتے تھے کہ آزادی کا مطالبہ پورے زور و شور سے پیش کیا جائے۔ اس زمانے کی ایک نظم کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

اڑ رہا ہے ظلم واستبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ
موت ہنس کر دیکھتی ہے آئینۂ تلوار میں
زر پرستی کا سفینہ آ گیا منجدھار میں
یہ ہے وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
یہ ہے وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے

سردار جعفری

چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حکومت برطانیہ کو یہ پیش کش کی کہ اگر ہندوستان کو جنگ کے بعد آزاد کرنے کا وعدہ کیا جائے تو کانگریس جنگی کوششوں میں پوری طرح مدد کرے گی۔ حکومت نے اس پر مطلق کوئی توجہ نہ کی۔ ادھر نازی جنگ میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کر رہے تھے اور اتحادیوں کے پرخچے اڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ بقول سردار جعفری:

ہل چکا ہے تختِ شاہی گر چکا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج

جاپان مشرقی محاذ پر ملایا اور برما کو روندتا ہوا ہندوستان کے دروازے تک آ پہنچا تھا۔ اس نازک موقع پر ہندستانیوں میں اپنے ملک کی حفاظت کا

جوش پیدا کرنے کے لیے برطانوی جنگی کیبنٹ نے کرپس کی سرکردگی میں ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ اس نے پیش کش کی کہ "جنگ کے بعد ہندوستان کو برطانوی سلطنت کے ایک خود مختار رکن کی حیثیت دی جائے گی اور ہر صوبے اور ریاست کو آزادی ہوگی کہ ہندستانی وفاق میں شامل ہو جائے یا براہ راست تاج برطانیہ سے تعلق رکھے۔" اس پیش کش نے کسی سیاسی جماعت کو پوری طرح مطمئن نہ کیا اور کرپس مشن کو ناکام لوٹنا پڑا۔ جوش ملیح آبادی کے یہ اشعار ہندستانی رائے عامہ کی صحیح عکاسی کرتے ہیں:

کھلاڑی اب کے لائے ہیں نئے مہرے نئے پانسے
کہ تا اس بار کھیلیں ہندوالوں کی رگ جاں سے
بڑی کاری گری کے ساتھ شاطر نے تراشے ہیں
نئے دھوکے نئے حیلے نئے چکمے نئے جھانسے

کرپس مشن کی ناکامی سے ہندستانی عوام میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شرانگیز عناصر کو فتنہ وفساد پھیلانے کا موقع مل گیا۔ کیفی اعظمی نے اپنی مثنوی "خانہ جنگی" میں انھیں حالات پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

انگریزوں کی بے حسی دیکھتے ہوئے اگست 1942 میں "ہندستان چھوڑ دو" تحریک کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں سبھاش چندر بوس روپوش ہوکر کسی طرح جاپان پہنچ چکے تھے۔ ان کی کارروائیوں سے انگریزوں کو شبہ ہوا کہ پوری کانگریس جاپان سے سازباز رکھتی ہے اور اس کی مدد سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ بغیر کسی گفت وشنید کے ایک دم سے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر گرفتار کر لیے گئے۔ انگریزوں کی اس حرکت سے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں کا غم وغصہ بھڑک اٹھا اور چاروں طرف فساد کی آگ پھیل گئی۔ سارا ملک بیدار ہو چکا تھا۔ آزادی کی آرزو ہر دل میں موجزن تھی۔ بقول شمیم کرہانی:

تھا زبانوں پر یہ نعرہ "آشیاں کو چھوڑ دو"
"چھوڑ دو اے غاصبو! ہندوستاں کو چھوڑ دو"

اردو ادب نے بھی اس زمانے میں آتش شوق کو تیز سے تیز تر کرنے میں وقت کا ساتھ دیا۔ آزادی کے گیت گائے اور راہ کی مشکلوں کو گوارا بنانے کے لیے صبح آزادی کی بشارت دی۔ جوش ملیح آبادی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" وقت کا پیغام سنایا۔ ان کے پچھلے مظالم سے پردہ اٹھاتے ہوئے ان الفاظ میں سامراج کی موت کا اعلان کیا۔

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

فراق گورکھپوری نے "آزادی" اور "زمانے کا چیلنج" جیسی نظمیں لکھیں اور آنے والے تاریخی تغیر کا پتہ دیتے ہوئے کہا:

عالم نزع ہے آئین شہنشاہی کا
چارہ گر اب تری بے کار مسیحائی ہے

روش صدیقی، آنندنرائن ملا، مخدوم اور مجاز نے بھی اس سلسلے میں بڑی ولولہ انگیز نظمیں کہیں۔ ملا نے عوام کو "آثار وقت" کا پتہ دیا۔ مجاز نے "دور نو" کا مژدہ سنایا اور "بدیسی مہمان سے" مخاطب ہوکر کہا:

مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے
وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے
بگولے اٹھ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں
فضائے دہر میں ہلچل مچی ہے
یہاں ہر شاخ شمشیر برہنہ
گلوں سے خون کی بو آرہی ہے
مرتب اک نیا دستور ہوگا
بنا اک دور نو کی پڑ رہی ہے
یہاں کے آسمان آتشیں پر
بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہے
یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے
یہاں سے ایک آندھی اٹھ رہی ہے

روش صدیقی نے بھی آزادی کے جذبات کو مہمیز کرتے ہوئے کہا:

جگا دو روح آدم کو جگا دینے کا وقت آیا
کیا صدیوں زمیں نے رقص سیاروں کے افسوں پر
بہت جھکتے رہے اہل زمیں دہلیز گردوں پر
غرور آسماں کا سر جھکا دینے کا وقت آیا
رخ قدرت رہا زیر نقاب خیر وشر برسوں
رہا روپوش حسن شاہد فکر و نظر برسوں
اٹھو ان بے حجابوں کو اٹھا دینے کا وقت آیا

مخدوم محی الدین نے "زلف چلیپا" کی برہمی کا نقشہ کھینچا اور سرمایہ داری کے حق میں جام اجل تجویز کیا:

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج

فرقِ گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج
جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے
رام و لکشمن کی زمیں وہ کرشن و گوتم کی زمیں
وہ محمد کی زمیں وہ ابنِ مریم کی زمیں
اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اس کی نظر میں موت ہے
برہمی زلف چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

سکندر علی وجد نے "نئے ارادوں" کے راز کو عام کیا۔ سیم و زر پر جان دینے والوں کو وطن پر نثار ہونے کی تلقین کی اور عوام کو "صبحِ نو" کے آثار سے آگاہ کیا:

بزمِ تاریک وطن کو روشنی درکار ہے
شمع کے مانند جلنے کا زمانہ آگیا
ہو گیا ہے آگ تپ تپ کر غریبوں کا لہو
اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آگیا
اہلِ زنداں کو مبارک ہو فروغِ صبحِ نو
قیدِ ذلت سے نکلنے کا زمانہ آگیا

شمیم کرہانی نے سنہ بیالیس کے طوفانی دنوں میں کہی گئی نظموں کو "روشن اندھیرا" کے نام سے ایک الگ کتابچہ میں شائع کیا ہے۔ "جاگا ہندوستان رے ساتھی جاگا ہندوستان" "فوجی لاری" "ہلکی سی کرن" اور "کل نہ رہے گا" نظموں میں لاوے کی سی تیزی، ولولہ اور گرم جوشی ہے۔ چونکہ قومی جوش و خروش اور ملک کی بے چینی کا بیان ہے، لب و لہجہ کہیں کہیں خطیبانہ ہو گیا ہے۔ شمیم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں تحریک آزادی کی بے چین روح کا پورا عکس اتار لینے میں کامیابی حاصل کی:

یہ رات یہ بَن یہ سناٹا یہ دیس کے اندھے پروانے
اینٹوں پہ کدالیں بجتی ہیں پل توڑ رہے ہیں دیوانے
تنگ آ کے غلامی سے انساں زنداں ہی کو ڈھانے والا ہے
دیوار سے طوفاں ٹکرا کر اک راہ بنانے والا ہے

"قصرِ زرنگار" شمیم کرہانی کی بہترین نظم ہے۔ لہجے میں خلوص اور دردمندی ہے۔ پوری نظم تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

حیات کو شرار پر تپا رہی ہے زندگی
ہری بھری جوانیاں جلا رہی ہے زندگی
ستارے توڑ توڑ کر لٹا رہی ہے زندگی
بنے ہوئے ہیں جشنِ قتل گاہ کی بہار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

امن لکھنوی نے سنہ بیالیس کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی نظم "کاروان و منزل" لکھی۔ کیفی اعظمی نے "آخری مرحلہ" میں قومی جدوجہد کے اس موڑ کی بڑی موثر تصویر کھینچی اور وطن کے سپوتوں کو نفاق کے خطروں سے محتاط کرتے ہوئے انھیں آخری محاذ فتح کرنے کی دعوت دی:

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے
شجاع حیدر و ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک و رنجیت کے سکھائے ہوئے
جبیں پہ دھان کے کھیتوں کی نرم ہریالی
نظر میں قحط کی پرچھائیاں چھپائے ہوئے
ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ رن
کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن
پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن
نکل کے صف سے کھڑے ہو گئے ہیں کچھ سادھنت
بڑھا کے ہاتھ محبت سے تھام لو دامن
مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

سنہ بیالیس کی تحریک کا جواب انگریزی حکومت نے نہایت بے رحمی اور سختی سے دیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی بد انتظامی اور مقامی احکام کی بد دیانتی کی وجہ سے ہندوستان میں قحط اور وبائی امراض کا دور دورہ شروع ہوا۔ بنگال میں اس کا اثر سب سے زیادہ تھا جہاں لاکھوں عوام بن آئی موت مر گئے اور ملک کا یہ حصہ زندہ جہنم کا منظر پیش کرنے لگا۔ اردو میں اس واقعہ کے بارے میں جہاں "ان داتا" جیسے افسانے لکھے گئے، وہاں "قحطِ بنگال" (جگر مرادآبادی) "تازیانہ" (روش صدیقی) "بھوکا بنگال" (وامق جونپوری) اور "کیوں گنگا کے دھارے" (شمیم کرہانی) جیسی نظمیں تخلیق کی گئیں۔ ان نظموں کا آہنگ ان کا درد و اثر اور اجتماعی جوش بے پایاں وطن دوستی کا حامل ہے۔

اس وقت دنیا کا ایک بڑا حصہ جنگ کی لپیٹ میں آچکا تھا اور اس کے مہیب بادل ہندوستان کی طرف بھی نہایت تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ادھر

اندرون ملک قحط، بھوک اور وباؤں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا اور سیاسی اور معاشی اعتبار سے عجیب کرب اور بے چینی پھیل رہی تھی۔ یہ بے چینی اور کرب اردو شاعری میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس حوصلہ شکن ماحول نے انگریزوں کی عطا کردہ 'کاغذی پھولوں سے سجی ہوئی ساری آرائشیں نوچ پھینکیں اور ان کی بے رنگی ظاہر کردی۔' حقیقت ایک بے رحم دیوی کی طرح سامنے آئی۔ ترقی پسند تحریک نے طبقات کی تقسیم اور ان کی باہمی کش مکش واضح کردی تھی۔ شاعر کی نگاہیں زندگی کے بنیادی مسائل کا از سر نو جائزہ لینے لگیں اور ان میں سب سے اہم مسئلہ تھا غیر ملکی سامراج سے آخری ٹکر لینے کا۔ چنانچہ آزادی سے ہم کنار ہونے کی امنگ کئی گنا بڑھ گئی۔ وطن دوستی اور سامراج دشمنی کی روایت اردو میں نئی نہیں تھی۔ حالی، اقبال، سرور، چکبست، حسرت اور ظفر علی خاں اس میں روح پھونک چکے تھے، ترقی پسند شاعری نے اسے نیا احساس اور نیا ادراک دیا اور عوام دوستی کی وسیع تر بنیادوں پر قائم کیا۔ قومی جدوجہد میں عوام کا ساتھ دینے کی آرزو کئی گنا بڑھ گئی اور انفرادی و قومی آزادی کی خواہش شدید تر ہوگئی۔ اس دور کے شاعر آزادی اور غلامی، انصاف و ظلم، آسودگی اور بھوک کے درمیان کسی قسم کے سمجھوتے کے حامی نہیں۔ وہ مثبت انداز میں جنگ کے مقابلہ میں امن اور سامراج کے مقابلہ میں آزادی کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں غیر ملکی سامراج کو سراہا گیا ہو۔ جنگ کی تباہ کاریوں سے اردو شاعروں نے فسطائیت کی برائیاں محسوس کیں اور جمہوریت کی قدر پہچانی۔ اس دور میں جمہوریت کی طرف رجحان واضح اور گہرا ہوگیا۔

اسی زمانے میں جب ملک ایک طرف آزادی کی منزل سے قریب ہو رہا تھا، تہذیبی مسائل نے خطرناک تفریقی شکل اختیار کرکے وطن دوستی، آزادی اور ادب کی قدروں کو بری طرح الجھا دیا تھا۔ احتشام حسین نے صحیح لکھا ہے کہ "ادیبوں کا ایک بڑا گروہ زندگی کی ان قدروں کو جمہوری اور انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا لیکن کسی نہ کسی گوشے سے زہر کی وہ دھار بھی پھوٹ بہتی تھی جو آزادی اور جمہوریت کے بہتے ہوئے دریا میں ایک لکیر کی طرح قائم ہوگئی تھی... ٹھیک اسی وقت ہندستانی مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے بڑے طبقے نے فرقہ وارانہ بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا متفقہ مطالبہ کیا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی سیاست میں یہ بہت ہی نازک موقع تھا لیکن اردو کے کسی اچھے ادیب یا شاعر نے اس مطالبہ کی تائید نہیں کی۔ اردو ادیبوں کے لیے باعث فخر ہے کہ وہ فرقہ واریت کے اس سیلاب میں نہیں بہے۔ اگر کسی نے اس مطالبۂ تقسیم کو صحیح سمجھا بھی تو اس کی سیاسی نوعیت بالکل جداگانہ تھی۔ فرقہ وارانہ تقسیم سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔"

ترقی پسند شاعری کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہماری وطنیت کے دھارے وسیع بنیادوں پر استوار کیے، اسے غیر مذہبی بنیادیں دیں اور مذہب و ملت کی بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندیوں سے یکسر آزاد کیا۔ اس نے اپنا رشتہ محنت کش عوام اور پس ماندہ طبقے سے جوڑا۔ اس کی کاوشوں سے اردو شاعری کی بساط دور تک پھیلی اور وطن سے محبت اور ماحول کی سخت گیری کے خلاف نفرت کا جذبہ گھر گھر پہنچا۔ ترقی پسند شاعری نے حسن و عشق کے روایتی تصور کو بدل کر نئی زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کی شاہراہ کھول دی۔ اب شاعری ایک لمحۂ سرخوشی کی یاد نہ رہی بلکہ دردمند دل کی فریاد بن گئی۔ آزادی اور جمہوریت پر زور دیا جانے لگا اور فن میں تجربات کا دور شروع ہوا، جس سے اگر ایک طرف کچھ بے راہ روی پھیلی تو کچھ کارآمد اضافے بھی ہوئے۔ زلفوں کی گھٹا، گردن کی صراحی اور آنکھوں کے پیمانے نئی زندگی کے درد و کرب، اس کے خواب و خیال اور شکست و فتح کا ساتھ نہ دے سکے اور جدید شاعروں نے نئی قسم کی ایمائیت کو فروغ دیا۔ یہ ایمائیت کلاسیکی ایمائیت سے مختلف تھی۔ اس کے اثر سے زبان و بیان میں بے اعتدالیاں بھی برتی گئیں لیکن مجموعی طور پر اس دور کی نظم زبان کی سہولت اور سادگی کے اعتبار سے اہم ہے۔ یہ پیچیدہ علامتوں اور ترکیبوں سے بوجھل نہیں اور اپنے زمانے کی گوناگوں تلخیوں اور بے مہریوں کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی ہے، نیز اپنے قاری سے جڑی ہوئی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی پانچ سات سالوں میں اردو شاعروں نے بہت کچھ سوچا، بہت کچھ بگاڑا اور بہت کچھ سنوارا۔ ترقی پسند شاعری حقیقت نگاری کی منزل تک پہنچنے کے لیے رومانیت کے کئی گلزاروں اور خارزاروں سے گزری۔ گو اس میں ماحول کی سخت گیری اور وطن دوستی کا احساس شروع سے موجود تھا لیکن بیان کی قدرت، خلوص کی گہرائی اور شعور کی سطح کے مطابق یہ احساس ہر شاعر کے ہاں مختلف شکلیں اختیار کرتا تھا۔ سردار جعفری نے اسے غیر صحت مند رومانیت اور صحت مند رومانیت کا نام دیا ہے۔

انھوں نے "خواہش مند رومانیت" اور "انقلابی رومانیت" کی بحث بھی اٹھائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حاوی رجحان انقلابی رومانیت کا تھا جس کی حد درجہ جذباتیت ایک خاص نوع کی خطابت اور اشتہاریت کا شکار بھی ہوئی جس پر ادبی نقطۂ نظر سے اعتراض کیا گیا۔

یہ انقلابی رنگ دوسری جنگ عظیم کے زمانے تک اردو شاعری کی فطرت ثانیہ بن گیا۔ اس کی ابتدا جوش کی شاعری سے ہوتی ہے۔ یوں تو اقبال، چکبست اور ظفر علی خاں کی شاعری میں بھی انقلابی رنگ پایا جاتا ہے، لیکن اس سے بعد میں جو مفہوم لیا جاتا تھا، اس کی روایت جوش ہی سے شروع

ہوئی۔ بقول سردار جعفری: ''جوش نے براہ راست سیدھی سادی ایجی ٹیشنل نظمیں کہیں۔ یہ نظمیں کتنی سطحی اور جذباتی کیوں نہ سمجھی جائیں، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا ہیجان اور ابال ہندوستان کی سیاسی زندگی کے ہیجانی دور کا ترجمان بن گیا۔''

جوش کی ایک مقبول نظم ''شکست زنداں کا خواب'' ہے جو انھوں نے غالباً سنہ 24-1923 میں کہی تھی۔ اس زنداں کا پھاٹک لوہے کا اور اس کی دیواریں اینٹ اور پتھر کی نہیں ہیں۔ اس زنداں کا نام ہندوستان ہے۔ شاعر انقلاب نے اس نظم میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے عوامی پہلو، برطانوی حکومت کے جبرو استبداد اور اس سے پیدا ہونے والے ہیجان اور ابال کو پیش کیا ہے۔

اس طرح کی نظموں نے اردو میں ایک نئے قسم کی متحرک، ولولہ خیز اور مجاہدانہ Militant شاعری کی بنیاد ڈالی ہے، جس کا اثر ترقی پسند شاعروں کی پوری نسل پر پڑا ہے۔

فیض کی فکر و گفتار ایک انوکھی شان رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کا خمیر ''صورت جاناں'' اور ''شورش دوراں'' کے امتزاج سے ہوا تھا۔ ابتدا میں ان کے ہاں آزادی کی خواہش نسبتاً کمزور تھی لیکن جیسے جیسے تحریک آزادی زور پکڑتی گئی ان کے ہاں جذبہ و فکر اور عشق و حقیقت کا امتیازی سنگم زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ انھوں نے خود بھی ''دلے بفروختم جانے خریدم'' کہہ کر اس کی حد بندی کر دی ہے۔ ان کی دردمندی اور وطنی آرزومندی کی بہترین مثال ان کی نظمیں ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' ''رقیب سے'' ''بول'' ''میرے ہمدم میرے دوست'' اور قطعہ ''متاع لوح و قلم'' ہیں۔ وہ ہندستانی نوجوان کی مایوسی اور مجبوری کے سچے ترجمان ہیں اور ایک نئے اسلوب میں امید اور عمل کا پیغام دیتے ہیں جس کے ذریعے وطن اور آزادی کا تصور ایک حسین محبوب بن کر دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔

مجاز نے اپنی البیلی آواز سے وطن دوستی کو نیا آہنگ دیا۔ ان کی انقلابی شاعری میں جذبۂ آزادی والہانہ طور پر سامنے آتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا، فاتحانہ انداز میں طبیعت کی حیرت انگیز سرشاری کے ساتھ کہا۔ انھیں انقلاب کا مطرب کہا گیا۔ وہ مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گیت گانے اور ان کی ہیبت چھین لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ''انقلاب'' ''مطرب سے'' ''مزدور'' ''نوجوان سے'' اور ''ہمارا جھنڈا'' میں یہی رجز ملتا ہے۔ ان کے بارے میں احتشام حسین کی رائے ہے: ''مجاز انقلاب کے رنگیں نوا شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری کی رنگینی میں شعلہ کی سرخی شامل ہے۔ اس لیے وہ بہ یک وقت ساز، جام اور شمشیر سب کے پرستار ہیں۔''

جذبی ہندستان کی روح میں بسی ہوئی یاس پسند فضا کے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں بیرونی سامراج کی ناانصافیاں سوز دل میں ڈوبی ہوئی فریاد بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔

سردار جعفری نے انقلابی شاعری کو نئی توانائی دی اور اسے ایک نئے رخ سے آشنا کیا۔ وہ ہماری ان خوں گشتہ حسرتوں اور ارمانوں کے شاعر ہیں جو صدیوں کی غلامی کے خلاف دلوں میں پیدا ہوئے۔ ''نئی دنیا کو سلام''، اختر شیرانی کی ''سلمیٰ'' اور مجاز کی ''نورا'' سے مختلف ہے۔ یہ اردو شاعری کی رومانیت کے ایک نئے دور کا پتہ دیتی ہے۔ سردار جعفری ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو علم اور یقین کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔ انھوں نے تحریک آزادی کے عروج کے زمانے میں بڑی دلیری اور حوصلہ مندی سے اردو شاعری کو انقلابی مضامین دیے اور انھیں وقار اور حسن بخشنے کی سعی کی۔ لیکن ان کے یہاں بھی جوش کی طرح لطیف شاعرانہ احساس کے ساتھ داخلی سوز کی کمی اور خطابت کی بہتات کھٹکتی ہے، جس کی وجہ سے ان کا نعرہ انقلاب سرود مستانہ میں کم ڈھلتا ہے اور ہنگامی ابال بن کے شاعرانہ تناسب کے طلسم کو متاثر کرتا ہے۔

ساغر نظامی نے وطنیت کے ترانے دل کی لہک کے ساتھ گائے ہیں۔ ہندی الفاظ کے مترنم استعمال کی مدد سے انھوں نے اپنی شاعری میں چاشنی پیدا کی ہے۔ بقول احتشام حسین ''ساغر نظامی نے حب وطن اور قوم پرستی کے جذبے کو ایک تقدس عطا کیا۔ وقت کی بڑھتی ہوئی رو کے ساتھ ساتھ ان کا یہ جذبہ نکھرتا گیا اور اس میں وسعت آتی گئی۔''

احسان دانش مزدور طبقہ کی بے کسی اور دکھ درد کے شاعر ہیں۔ وہ باغی نہیں لیکن بغاوت بھڑکانے والے آثار کی بڑی موثر عکاسی کرتے ہیں۔ وہ انقلاب اور مزدور طبقہ کی ترقی کے داعی ہیں، لیکن داخلی سوز کی کمی ان کے ہاں بھی محسوس ہوتی ہے۔

مخدوم کے یہاں بھی فیض کا سا جمالیاتی رچاؤ ہے۔ انھوں نے بھی انقلاب کا تصور ایک حسین محبوب کی حیثیت سے پیش کیا، جس کی کاوش انتظار میں وہ بڑے درد و سوز سے ترنم ریز ہوتے ہیں۔ وہ تعمیر سے پہلے تخریب ضروری سمجھتے ہیں، ان کی سوگواری اور سرمستی میں جو لطیف آنچ ہے، اس سے ان کی شاعری دو آتشہ ہوگئی ہے۔ ''مشرق''، ''انقلاب''، ''کہو ہندوستان کی جے''، ''مستقبل'' اور ''جہان نو'' لطف و اثر سے بھرپور نظمیں ہیں۔

سلام مچھلی شہری نے بھی وطن اور آزادی کے ترانے خلوص اور سوز کے ساتھ گائے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ کی نرم آہنگی سے ان کا خیال اور پیام عوام کے دلوں کے قریب ہوگیا ہے۔ سماجی تلخیوں نے جاں نثار اختر کو بھی رومانی خول سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی آواز میں تہ داری نہیں، یہ سادہ اور دل

نشیں ہے۔ وطن پرستی کا جذبہ ان کی شاعری میں کچھ نرم اور لطیف ہو کر آتا ہے جس سے اس کی دلکشی تو بڑھ جاتی ہے لیکن درد و اثر کم ہو جاتا ہے۔

ساحر لدھیانوی کی انقلابی شاعری کی امتیازی شان اس کی روانی اور نغمگی ہے۔ ان کے یہاں گھن گرج بالکل نہیں، ایک البیلا پن اور سرشاری و سرمستی ہے۔ وہ ہنگامی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی شائستگی اور ضبط کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ "میرے گیت"، "آوازِ آدم"، "کچھ باتیں" اور "کل اور آج" ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ "آہنگ" کے بعد "تلخیاں" اس دور کی مقبول ترین کتاب ہے۔

کیفی اعظمی قدرت بیان کا جوہر رکھتے ہیں۔ ان کی وطن دوستی میں خلوص کی آنچ اور یقین کا نور ہے۔ انھوں نے اکثر وقتی موضوعات پر نظمیں کہی ہیں اور سوز دروں میں تپا کر انھیں آب دی ہے۔ "فیصلہ"، "تلاش"، "آخری مرحلہ"، "نئی جنت"، "ہم"، "آزادی" اور "مژدہ" میں حب الوطنی کا جذبہ نکھر کے سامنے آتا ہے۔

سکندر علی وجد بھی دل پر ذلت وطن کا داغ لیے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری آزادی کے جذبے اور قوم کے درد کی ترجمان ہے۔ لیکن وہ نہ کہیں گرجتے ہیں اور نہ غم و غصہ سے بے قابو ہوتے ہیں۔ وہ سرمایہ داری اور بیرونی سامراج کے سلاسل پگھلتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی خوش سلیقگی میں ایسا ضبط ہے کہ تھما ہوا طوفان معلوم ہوتی ہے۔

وطن دوستی کی روایت کو نکھارنے میں وامق جون پوری نے بھی حصہ لیا ہے۔ ان کا عزم جواں اور جذبہ آزادی بے باک ہے۔ سماجی حقائق کی تلخیوں نے ان کے کلام میں بھی دبی ہوئی چنگاریاں بھر دی ہیں، جن کی آنچ "بول رے ساتھی بول"، "بھوکا بنگال" اور "جنتا کی لڑائی" میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

نشور واحدی، شورش کاشمیری، الطاف مشہدی، نخشب جارچوی اور مطلبی فرید آبادی نے بھی اس دور میں وطن دوستی کی روایت کو نئی آب و تاب دینے میں حصہ لیا ہے۔ شورش قوت جمہور کے پرستار ہیں۔ "نئے دور کا فرمان" اور "ذرا صبر" میں ان کا یہ احساس شدت سے ظاہر ہوتا ہے۔ مطلبی عوام کے لب و لہجے میں عوام کو انقلاب کا ترانہ سناتے ہیں۔ ان کی نظم "جدوجہد آزادی کے تین دور" خاصا اثر رکھتی ہے۔ نشور واحدی کی نظم "خون میں پانی"، نخشب کی "اتحاد باہمی" اور الطاف مشہدی کی "وطن آزاد کرنے کے لیے" ہماری قومی شاعری کا حصہ ہیں۔

ترقی پسند شاعروں میں بعض کے ہاں بڑی خطابت اور قطعیت بھی تھی جس نے ادب کو پروپیگنڈا کی سطح تک پست کر دیا۔ ان میں سے اکثر مقصدیت کے جوش میں انقلاب، کسان اور مزدور کا نام لے کر جذباتی سینہ کوبی کرتے اور نعرہ لگاتے تھے۔ ترقی پسند شاعری کا بڑا حصہ وقتی اور ہنگامی ہو کر رہ گیا۔ اس میں ابال اور گرمی تو ہے، گہرائی اور روشنی نہیں۔ اس کا اثر وقتی ہے۔ لیکن وہ وقت ہی ایسا تھا جب سیاسی جدوجہد اور معاشی ناآسودگی نے ذہنوں کو اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ کچھ مدت کے لیے شعر و ادب کے جمالیاتی تقاضے بھی نظر انداز ہو گئے۔ غالب کا شعر ہے:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

اس دور میں ہندستانی زندگی کے درد و کرب کی عکاسی اور جذبۂ آزادی کی ترجمانی صرف ترقی پسند شاعروں تک محدود نہ تھی۔ اردو کے بعض دوسرے شاعر بھی جو ترقی پسند تحریک کے پیرو نہیں تھے، حب وطن کی شمع روشن کیے ہوئے وقت کے نئے تقاضوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں: آزاد انصاری، جگت موہن لال رواں، برق دہلوی، اقبال سہیل، نہال سیوہاروی، احمق پھپھوندوی، اثر لکھنوی، تلوک چند محروم، افسر میرٹھی اور حفیظ جالندھری۔ بعد کے شاعروں میں اختر شیرانی، جمیل مظہری، آنند نرائن ملا، عرش ملسیانی، آل احمد سرور، روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد اور شمیم کرہانی، اگرچہ ان میں سے اکثر ترقی پسندوں میں بھی شامل ہوتے تھے جو اس زمانے کا عام رنگ تھا۔

آزاد انصاری نے اپنی نظم "پیغام وطن" میں طبقۂ حکام کی خبر لی ہے اور ان کی حکومت نوازی پر چوٹ کرتے ہوئے پوچھا ہے:

لب پہ آہ سرد بھی ہے یا نہیں
دل میں قومی درد بھی ہے یا نہیں

"درس آزادی" میں انھوں نے ملی اور ملکی حمیت پیدا کرنے کی ترغیب دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا:

جنسِ آزادی بلا قیمت نہ مانگ
جنسِ آزادی کی قیمت پیش کر

برق دہلوی نے "تباہی ہند" میں اور رواں نے "ہند مظلوم" میں ہندستانیوں کی سوئی ہوئی غیرت کو ابھارا ہے۔ رواں کا یہ شعر درد محبت کا ترجمان ہے:

چند مظلوم زن و مرد کچھ اجڑے ہوئے گھر
سرخیاں ہیں یہ مری قوم کے افسانوں کی

اقبال سہیل بڑے باہمت اور بے باک قوم پرست تھے۔ ان کے یہاں حب وطن عارضی کیفیت نہیں بلکہ ایک مستقل بہنے والی جوئے رواں ہے، جس سے ان کے افکار اور جذبات دونوں سیراب ہوئے۔ ان کی اس دور کی نظموں میں سے "یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے" اور "منظر رخصت" بہترین ہیں۔

نہال سیوہاروی کی قوم پرستی کی جھلکیاں ان کے مجموعہ کلام "شباب و انقلاب" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ "وطن"، "ہمالیہ" اور "ہندستان" وطنی جذبات سے لبریز ہیں۔

احمق پھپھوندوی کا کلام اس دور کی مزاحیہ شاعری میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی ظرافت سستی یا سطحی نہیں، اس میں معنویت کا جوہر ہے۔ انھوں نے اکثر اپنی نظموں اور غزلوں میں ملک کی سیاسی رفتار کا تجزیہ کیا ہے، اس کی خوبیاں ابھاری اور خامیوں پر ہمدردانہ طنز کیا۔ سیاسی عقیدے کے اعتبار سے وہ کانگریسی تھے اور مشکل سے مشکل لمحوں میں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار نہیں ہوئے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں انھوں نے عملی طور پر حصہ لیا۔ سامراج دشمنی ان کا اصول نہیں ایمان تھا۔ اس سلسلے میں انھیں مالی نقصان بھی اٹھانے پڑے اور سخت دشواریوں کا سامنا بھی ہوا، لیکن ان کے عقیدے میں فرق نہیں آیا۔ احمق کی شاعری ظرافت کے پردے میں ہماری غیرت کو بیدار کرتی ہے۔ ان کے ہاں غلامی کا جو احساس اور آزادی کی جو امنگ ملتی ہے، اردو کی مزاحیہ شاعری میں وہ نئی چیز ہے۔ ان کے دل میں ملک اور قوم کا گہرا درد ہے۔ یہ درد اکبر کے دل میں بھی تھا، لیکن انھیں مستقبل کی بہ نسبت ماضی زیادہ عزیز تھا۔ احمق کی نظر مانچسٹر کی ملوں اور لندن کی کونسلوں تک پہنچتی ہے جن کے معاشی اور سیاسی استبداد نے ہندوستان کو بھوکا اور کنگال بنا دیا تھا۔ احمق کی شاعری کا سرچشمہ یہ احساس ہے کہ صدیوں کی غلامی نے ہندستانیوں کے دل ویران کر دیے ہیں اور قوم کی زندگی کے سوتے بند ہو گئے ہیں۔ ان کے شعر پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ "سونے کی چڑیا" مٹی کا ڈلا بن گئی ہے۔ ہندوستان کی دولت وحشمت انگریز حکمرانوں نے کھینچ لی ہے، دستکار بے کار ہیں، کھلیان سونے اور دھرتی بانجھ پڑی ہے۔

مرتے ہیں ہر سال فاقے سے کروڑوں آدمی
ہند پر برٹش کے احسانات تو دیکھو ذرا
تو اپنی بھوک کا شاکی فضول ہے اے ہند
مریض کو یونہی فاقے کرائے جاتے ہیں
ہماری بے حسی نے گور میں پہنچا دیا آخر
کفن بھی اب تو ہم کو مانچسٹر سے ملتا ہے
اہل یورپ نے کیا ہے وہ تماشا جو کبھی
آپ کے باپ سے بھی حضرت شیطاں نہ ہوا
دور دورہ ہے چمن میں ظلم کا بیداد کا
خوب الّو بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

احمق اپنے ہم وطنوں کو بار بار اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب متحد ہوں اور باہمی ناچاقیاں بھول جائیں:

باہمی ناچاقیوں کا حال یہ ہے ملک میں
پھر جو آزادی کی خواہش ہے تو کس بنیاد پر

آزادی کی خواہش احمق کی شاعری کا سب سے بڑا محرک ہے۔ ان کا کوئی سا مجموعہ اٹھا کر کہیں سے کھولیے، یہ جذبہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور کارفرما ملے گا۔ احمق کا کلام ان لوگوں کے خلاف ایک قہقہہ ہے جو شاعری کے سماجی اور وطنی منصب کے قائل نہیں۔ نظریاتی طور پر ان سے اختلاف ممکن ہو سکتا ہے لیکن ان کے جذبے کی صداقت اور ارادے کی اہمیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

تلوک چند محروم کی وطن دوستی دوسری جنگ عظیم کے بعد اور بھی نکھر آئی۔ یہ عزم کی بلندی اور ارادے کی پختگی کے اعتبار سے قابل احترام ہے۔ محروم کی سیاسی شاعری سے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ تحریک آزادی کے مایوس سے مایوس کن لمحوں میں بھی اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان چند برسوں میں ملک ایسے ایسے مرحلوں سے گزرا کہ بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ لیکن محروم کے ہاں کہیں بے دلی یا حوصلہ شکنی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ جگہ جگہ انھوں نے یقین کی شمع روشن رکھی ہے اور آزادی کی تصویر پیش کرتے ہوئے آنے والے بہتر دور کی بشارت دی ہے۔ مثال کے طور پر "شعاع امید" کے یہ اشعار دیکھیے:

جلوۂ صبح یقینی ہے شب تار کے بعد
دور اقبال ہے ہر قوم کو ادبار کے بعد
چھوڑ مت دامن امید مصائب میں کہ ہے
دست گل چیں میں گل تر خلش خار کے بعد
جہد ہستی سے نہ گھبرا کہ نمایاں ہوگا
دورہ امن و اماں گرمی پیکار کے بعد

آزادی کی خیر و برکت کا احساس کرانے اور اس کی خوبیاں اجاگر کرنے کے سلسلے میں محروم نے جو نظمیں کہی ہیں، ان میں مثنوی "تصویر غلامی" اہم مقام رکھتی ہے۔ ساٹھ ستر اشعار کی اس مثنوی میں محروم نے فلسفۂ غلامی کو عام فہم اور دلچسپ انداز میں نظم کیا ہے۔ آخر میں بتایا ہے کہ غلام قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب کوئی مرد مجاہد اپنے عمل اور سوز یقیں سے مردہ قوم میں پھر سے جان پھونک دیتا ہے۔ مثنوی کے شروع میں غلامی کی مذمت کی ہے اور اس کی لعنتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آزادی کی نعمتوں کا احساس دلایا ہے۔

افسر میرٹھی اور اثر لکھنوی نے بھی اس دور کی قومی تحریکوں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا۔ افسر نے سرمایہ داری کی برائیاں عام کیں۔ اثر لکھنوی کے ہاں بھی وطن دوستی کا جذبہ نمایاں ہے۔ ان کی ایسی نظموں میں سے "بادۂ حب وطن" بہترین نظم ہے۔ حفیظ جالندھری اہل وطن کو بیداری اور تعمیر و ترقی کا پیام دیتے ہیں، آزادی

کے گیت گاتے ہیں، سرمایہ داری کی مخالفت کرتے ہیں لیکن ان کا نقطۂ نظر اخلاقی زیادہ ہوتا ہے اور سیاسی کم۔ وہ قومی جدوجہد کے مخالف نہیں لیکن ان کی آواز میں یقین کی حدت نہیں۔ حفیظ نغمہ ریز رومانی نظموں کے شاعر ہیں۔ ان کی وطنی اور سماجی نظموں میں سے ''فریب آزادی'' بہترین قرار دی جاسکتی ہے۔

اختر شیرانی سرتاسر رومانی شاعر تھے۔ ان کی شاعری نے سیاسی اور سماجی تلخیوں سے کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن جہاں آزادی کا ذکر آگیا ہے، شاعر اس پر اپنی عزیز ترین متاع یعنی عشق کو بھی قربان کرسکتا ہے اور ''اسیر زلف''، ''غلام آزادی'' نظر آنے لگتا ہے۔

آنند نرائن ملا کی انسان دوستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اپنا وطن سامراج کے شکنجے سے آزاد ہو اور خوشی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو۔ ''آثار وقت'' میں وہ انگریزی حکومت کی موت کا اعلان کرتے ہوئے اہل وطن کو آنے والی تبدیلیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

عرش ملسیانی کی نظم ''بڑھے چلو'' قومی جدوجہد کے بڑھتے ہوئے جوش کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آل احمد سرور اپنی نظم ''جنگ عظیم کا ایک تاثر'' میں اہل وطن کو صبح آزادی کی بشارت یوں دیتے ہیں:

اسی امید پہ بیٹھا ہوں سر راہ گزار
ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہوگی

روش کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ ایک البیلی اور رسیلی آن بان کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ وہ ہندوستان کو ایشیا کا دل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایشیا کی بیداری کے ترانے گاتے ہوئے ان کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ہندوستان ہی رہتا ہے۔ وہ مشرق کی بیداری کے نقیب ہیں اور اپنی روش خوب پہچانتے ہیں۔ ۱۹۲۷ کے بعد ہماری تحریک آزادی کے ہر موڑ کی جھلک ان کی شاعری کے آئینہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی نظمیں ''نوید فردا''، ''جمال آزادی'' اور ''منشور آزادی'' ہماری بہترین سیاسی نظموں میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ ان میں صداقت کی چمک، خلوص کی دھیمی آنچ اور شعور کی روشنی ہے۔ روش کی وطنی شاعری نعرۂ مستانہ اور ولولہ مجاہدانہ۔ سے بچ کر چلی ہے۔ وہ زیادہ بلند آہنگ ہوکر اپنی آبرو نہیں کھوتی۔ اس کا سوز دروں، خود اعتمادی اور خوش سلیقگی اس کی انفرادیت کی ضامن ہے۔

جمیل مظہری کی نظمیں ''اے مرد جواں چل''، ''مزدور کی بانسری'' اور ''موسم کے اشارے'' وطن سے ان کی گہری محبت کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کے ہاں مزدور اور کسان کا ذکر تو ملے گا لیکن ان کی شاعری مزدور کا نغمہ یا ''تیشہ کا رجز'' نہیں۔ عالمگیر محبت، اعتدال اور خود ضبطی اس کے جوہر ہیں۔

شمیم کرہانی سیاسی عقیدے کے اعتبار سے قوم پرست اور کانگریس کے ہم نوا رہے ہیں۔ سنہ بیالیس کی تحریک کے بارے میں انھوں نے بڑی پرجوش اور ولولہ خیز نظمیں کہی ہیں۔ وہ ایک ایسی رنگین اور دلکش دنیا کی آرزو کرتے ہیں جس کی بنیاد عدل و انصاف پر قائم ہو اور جس میں نابرابریاں نہ ہوں۔ داخلی جذبے کی شدت اور خلوص کی گہرائی نے ان کے اشعار کو مترنم اور متحرک بنادیا ہے۔

ان شاعروں کے علاوہ سیدہ اختر، آمنہ برجیس، عروج زیدی، ادا جعفری بدایونی اور ضامن کنتوری نے بھی اپنے کلام میں ہندوستان سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔

حالی اور اقبال نے اردو شاعری کا رخ غزل سے نظم کی طرف موڑ دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں اس روایت کو بڑا فروغ ہوا۔ لیکن غزل بھی اس دوران میں پنپتی رہی۔ ترقی پسندی نے نظم کو زیادہ متاثر کیا غزل کو کم۔ تاہم اس دور کی غزل میں بھی کچھ تبدیلیاں ہوئیں لیکن یہ تبدیلیاں اتنی ترقی پسندی کے اثر سے نہیں جتنی تحریک آزادی اور قومی رجحانات کی وجہ سے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل کو بھی اس دور میں نئی سماجی تبدیلیوں اور قومی جدوجہد کے ساتھ ساتھ نئے حالات اور مطالبات کے ''گلشن گلخن'' سے گزرنا پڑا، جس کے اثر سے اس میں سماجی احساس اور جذبہ حریت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ اس دور کے اہم غزل گو شاعروں میں جگر مرادآبادی، فراق گورکھ پوری، فیض احمد فیض، معین احسن جذبی اور مجروح سلطان پوری کے نام لیے جاتے ہیں۔

جگر سرتاپا ایک غنائی شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی رندانہ شخصیت اور ساحرانہ بانکپن سے اس پرآشوب زمانے میں غزل کو نئی تب و تاب دی۔ ان کی غزل زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی: ''خارجی حالات و حوادث سے موجودہ غزل گویوں میں جگر سے زیادہ براہ راست متاثر ہونے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔ جگر میں یہ بات آج سے نہیں مدتوں سے ہے۔ انھوں نے ہر بڑے حادثے کا اظہار اپنے کلام میں کسی نہ کسی شکل میں اکثر کیا ہے۔ کچھ دنوں سے ان کے کلام میں اثر پذیری کی یہ لہر اور ابھر آئی ہے۔ غزل میں یہ چیز شروع تو حسرت سے ہوئی لیکن حسرت کے ہاں ان کی حیثیت خبر کی ہے اور جگر کے ہاں نظر کی۔'' ملک کی بیداری اور حکومت کے جور و جبر کا احساس ایسے اشعار میں بے پایاں سرشاری کے ساتھ نمایاں ہوا ہے:

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں
بیدار عزائم ہوتے ہیں اسرار نمایاں ہوتے ہیں
وہ جتنے ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
یہ خون ہے جو مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن

کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوتے ہیں
آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں
جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

فراق ترقی پسند تحریک کے اولین علم برداروں میں ہیں۔ لیکن اپنے داخلی اور جمالیاتی فلسفے کی وجہ سے زیادہ دیر تک وہ اس کا ساتھ نہ دے سکے بلکہ مختلف سمت میں بڑھ گئے۔ ان کے نزدیک مقاصد شاعری کے لیے ہوتے ہیں شاعری مقاصد کے لیے نہیں۔ ان کا شمار جدید دور کے منفرد اور ممتاز غزل گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اودھی اور کھڑی بولی کے میل سے اپنے لہجے میں ایسی ندرت اور نیا پن پیدا کیا ہے کہ غزل کا لطف و اثر کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ محبوب کے جسم و جمال اور عشق کی نفسیاتی باریکیوں کے شاعر ہیں۔ وہ عظیم آریائی تہذیب کی جمال آرائی کی کوشش کرتے ہیں لیکن سماجی کشمکش اور ملک کی غفلت و غلامی سے غافل نہیں۔ مجموعی طور پر وہ زندگی کی رونق کا خواب دیکھتے ہیں اور اس کی تعبیر کے لیے فضا تیار کرنے کی حسرت کو اجاگر کرتے ہیں۔ انھوں نے سیاسی یا وقتی موضوعات پر براہ راست بہت کم کہا، لیکن بیرونی سامراج اور سرمایہ داری سے نفرت ان کے اشعار میں خاموش درد کی طرح بسی ہوئی ہے۔ وہ آزادی کے پرستار ہیں لیکن ان کا جذبۂ آزادی بے اختیار نہیں، بلکہ روشن ستارے کی طرح اپنی جگہ پر قائم اور کم کم چمکتا رہتا ہے۔ فراق نے وطنی جذبے کے تحت ''آزادی'' اور ''زمانے کا چیلنج'' جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں اور ان میں تغزل کے حسن کو برقرار رکھا ہے۔

فیض اور جذبی کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مجروح نے سماجی کشمکش، انقلاب اور قومی و وطنی مضامین کو شاعرانہ اور فنی خلوص سے غزل میں داخل کیا ہے۔ ان کا عشق شاخ گل بھی ہے اور تلوار بھی۔ اپنے افکار میں بڑی کج کلہی سے بزم کو رزم سے ملا دیتے ہیں۔ مجروح کے تصور عشق کے پیچھے گہرا سماجی شعور ہے۔ انھوں نے درد عشق کو درد وطن سے ملا دیا ہے اور تغزل کی ایمائیت کو برقرار رکھا ہے۔ غزل کے جمالیاتی تقاضوں کا حق ادا کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے داخلی سوز، شاعرانہ سلیقہ اور فنی خلوص شرط ہے، ورنہ عام طور سے قومی اور سماجی موضوعات بیان کرتے ہوئے غزل گو شاعر پروپیگنڈے کی سطح پر اس بری طرح اتر آتے ہیں کہ نہ شاعر کی شکل پہچانی جاتی ہے اور نہ غزل کی۔

اوپر جس دور کی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا، قومی تحریک کی انتہائی شدت کا زمانہ تھا۔ ہندستانی تحریک آزادی میں وہ موڑ آ گیا تھا جہاں تاریخ کروٹ بدلتی ہے۔ بیرونی سامراج کی بنیادیں لرز رہی تھیں اور آزادی کا جذبہ ہر دل میں بے قرار تھا۔ ہمارے شاعروں میں سے بھی اکثر انقلاب کی رفتار کے ساتھ تھے۔ انھیں قوموں کی ترقی اور زوال کا حال معلوم تھا۔ وہ تاریخ کی نئی سمتوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ہندوستان کی جنگ آزادی میں عملاً شامل بھی تھے اور کچھ عوام کو فتح کا مژدہ سنا رہے تھے۔ وہ اپنے ذاتی اور انفرادی رنج و غم بھول کر اپنی آتش نفس سے غلامی کا قصر پھونکنے اور ایوان نو کی طرح ڈالنے کا سامان کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض غم و غصہ میں بے قابو ہو جاتے ہیں، کچھ تیز رفتار ہیں اور کچھ نرم رو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ انھوں نے آزادی کے تخیل کو واضح اور جاندار بنایا اور اس کی نعمتوں اور برکتوں کے گیت گائے، دشواریوں کا مقابلہ کیا، سرکار پرستوں پر چوٹیں کیں اور حکومت کے جور و ظلم کا سامنا کیا۔ ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ ہوئی اور وہ آزادی کے اپنے عقیدے پر چٹان بنے ڈٹے رہے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک ہندستانی تحریک آزادی اپنے آخری دور میں داخل ہو چکی تھی۔ عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی، کرپس مشن کی ناکامی، جنگ کے آلام، بین الاقوامی صورت حال اور آزاد ہند فوج کا غلغلہ ہندوستان کو نہایت تیزی سے اس منزل کی طرف لا رہا تھا، جسے جوش نے یوں ادا کیا ہے:

لیلائے آب و رنگ کا ڈیرا قریب ہے
تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے

اس زمانہ میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج انگریزوں کو اکثر پریشان کیا کرتی تھی۔ ادھر ہندستانی عوام اس فوج کی کارروائیوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور سبھاش چندر بوس اس وقت کے محبوب ترین لیڈر تھے۔ ہمارے شاعروں نے بھی اس دور میں سبھاش چندر کے بارے میں کئی نظمیں لکھیں۔ ان میں سے جگن ناتھ آزاد کی نظم ''سبھاش چندر بوس (بہادر شاہ ظفر کے مزار پر)'' قابل ذکر ہے۔ اس میں ہندستانی عوام کے جذبۂ حریت کو بڑے دلکش اور موثر لہجے میں ادا کیا گیا ہے۔

ہمارا مشہور قومی نعرہ ''جے ہند'' اسی زمانے میں مقبول ہونا شروع ہوا تھا۔ تلوک چند محروم اپنی نظم ''سحر نو'' میں اس زمانے کا نقشہ دکھاتے ہوئے کہتے ہیں:

''جے ہند'' کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے
''جے ہند'' کی عالم میں صدا گونج رہی ہے
یہ ولولہ یہ جوش یہ طوفان مبارک!
ہر آن مبارک!

1945 میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ ہندوستان کی سیاسی گتھی

سلجھانے کے لیے کیبنٹ مشن بھیجا گیا لیکن اس کی پیشکش نے کسی سیاسی پارٹی کو مطمئن نہ کیا اور اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ جوش نے اس "ہنگیش فریب" سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا:

چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہلِ مشن
شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں
پڑی ہوئی ہے جہاں خار و خس پہ چادرِ گل
وہ سبز باغ ہمیں پھر دکھائے جاتے ہیں

احمد ندیم قاسمی نے "سمندر پار کے فرشتہ ہائے رحمت" کو وقت کا چیلنج سناتے ہوئے خبردار کیا:

مورخوں سے کہو خون میں ڈبوئیں قلم
بدل چکا ہے ارادے میں اضطراب اپنا
خزاں رہے کہ بہار آئے ہرچہ بادا باد
اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا

برطانیہ میں لیبر حکومت کے برسر اقتدار آتے ہی امید جی اٹھی۔ لیبر پارٹی ہندوستان کو آزادی دینے کے حق میں تھی، لیکن خود ہندوستان میں تہذیبی مسئلہ جسے اب تک کانگریس نظر انداز کرتی رہی تھی ایک خطرناک تفریقی قوت بن چکا تھا۔ مسلم لیگ اس کی آڑ میں مسلمانوں کو کانگریس سے الگ کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور مطالبہ تقسیم روز بروز شدت اختیار کر رہا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھے۔ ان کی سرکردگی میں کانگریس اور لیگ میں بہت دنوں سمجھوتے کی بات چیت ہوتی رہی۔ آخر یہی طے پایا کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ مان لیا اور 15 اگست 1947 کو برصغیر تقسیم ہوا اور دو ملک ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔

آزادی ملنے سے پہلے کے آٹھ دس مہینوں میں اردو ادب جو منظر پیش کرتا ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں "اس زمانے میں اردو ادیبوں کی کاوشوں میں تین خواہشات کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ہندوستان کا جسم زخمی نہ کیا جائے۔ فرقہ واریت انگریزی سیاست کی ناجائز اولاد ہے۔ اس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اگر ہندوستان کی تقسیم ہونا ہی ہے تو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں اس طرح ہو کہ جیسے بھائی بھائی اپنی ملکیت تقسیم کرتے ہیں یعنی یہ تقسیم انگریزوں کے ہاتھوں سے نہ ہو بلکہ آپس کے سمجھوتے کا نتیجہ ہو۔

"اس سیاسی بحران میں جو ہندوستان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ادیبوں کا اس طرح سوچنا بے حد قابل قدر تھا۔ افسانوں، ڈراموں اور ناولوں میں تو نہیں لیکن شعری ادبیات میں ایسے مقامات بہت سے ملیں گے جہاں شاعر نے قومی رہنماؤں کو برطانوی سیاست کی چال بازیوں سے آگاہ کیا ہے۔ ان کے جال میں پھنسنے سے روکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے رہنماؤں کی غلط کاریوں پر تنقید بھی کی ہے۔ مختلف سیاسی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ملک کی سیاسی اور معاشی آزادی کی خواہش میں جوش، مجاز، مخدوم، جاں نثار اختر، فیض، فراق، سردار جعفری، کیفی، قاسمی، شمیم کرہانی، آنند نرائن ملا وغیرہ ہم آواز رہے۔"

بہر حال انگریز ہندوستان چھوڑ تو گیا لیکن:

لالے کو دبایا سنبل سے قمری کو لڑایا بلبل سے
جاتا تو تو ہے صیاد مگر گلشن کو لٹا کر جاتا ہے

اقبال سہیل

آزادی کی دیوی نمودار تو ہوئی لیکن خون میں ڈوبی ہوئی۔ زمین سے آسمان تک فرقہ واریت کا زہر بھر گیا۔ تعصب اور تنگ نظری کی آگ اتنی بھڑک چکی تھی کہ صدیوں کا تہذیبی سرمایہ اس میں فنا ہوتا نظر آتا تھا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور درندگی، سفاکی اور بربریت کی وحشی قوتیں بے لگام ہو گئیں۔ ہندوستان کی ترقی اور سربلندی کا خواب دیکھنے والوں کو ان حالات سے سخت صدمہ پہنچا۔ اس وقت ملک میں جو بجھی بجھی فضا اور درد کی لہر تھی وہ فیض کی نظم "صبح آزادی" کے مصرعوں میں ہمیشہ کے لیے مجسم ہو گئی ہے اور ہم اسی کے ساتھ اس داستان کو ختم کرتے ہیں:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

درد کی ٹیس سے مملو یہ آرزومندی جتنی اس وقت برحق تھی اتنی ہی آج بھی برحق ہے۔

OO

'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' مصنف: گوپی چند نارنگ سے

تخلیق اور تجزیہ

راہی معصوم رضا کی ایک یادگار نظم

سید مجاور حسین رضوی

■

ڈاکٹر راہی معصوم رضا پر میر انیس اور ان کے مراثی کا بہت گہرا اور دیرپا اثر تھا۔ یہ اثر ان کے ہندی ناول 'آدھا گاؤں' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کی ہر تخلیق میں یہ اثرات نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ 'مہابھارت' (ٹی وی سیریل میں لکھے ہوئے اُن) کے بیشتر مکالموں کو اگر اردو میں ڈھال دیا جائے تو وہ میر انیس کا مصرع بن جائیں گے۔ یہ انقلاب آفریں نظم لکھتے ہوئے راہی جب دلّی کے المیے سے گزر کر اور وہاں کے کرداروں سے رحم، خوف اور دہشت کی سوغات لے کر جھانسی کی طرف مڑتے ہیں تو میر انیس کے مشہور مرثیے کے مطلع سے آغاز کرتے ہیں:

اے قلم منزل دشوار کو آساں کر دے

■

تاریخ شہر خموشاں نہیں، شہر آرزو ہے۔ انسانی خوابوں کی متحرک تصور تاریخ کے ایوانوں میں سجی ہوئی ہے تاریخ کا ہی کوئی لمحہ جب شعر میں ڈھل جاتا ہے تو دونوں کی چمک اور بڑھ جاتی ہے، شعر میں وقار آجاتا ہے اور واقعہ مزید تابناک ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک بات ہے۔ واقعہ بھی ایسا ہو کہ وہ پھر تاریخ کے ذریعہ سے مستقبل کو آواز دے۔ اسی طرح کی آواز جیسی تیز آندھی میں پہاڑ پر سے اذان کی آواز آتی ہے جو آندھی کے گزر جانے کی خبر بھی سناتی ہے اور ایک پُرسکون ماحول کی بشارت بھی دیتی ہے۔

اس لئے شاعری میں بھی تاریخی واقعات ملتے ہیں۔ اپنی تمام تر غنائیہ خصوصیات کے ساتھ تال و سر کے ساتھ، ہر تان کی طرح دل و دماغ کو مسحور کرتے ہوئے اپنی گنگناہٹوں اور ترنم کے ساتھ یہ واقعات... کبھی الفاظ کی گھن گرج سے کبھی صف جنگ میں خون برساتے ہوئے، کبھی تیغوں کی بجلیاں چمکاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور غور کیجئے رزمیہ کی یا المیہ کی جو تعریف ارسطو نے کی ہے اس میں یہی تو بتایا گیا ہے کہ:

(1) واقعہ مہتم بالشان ہو (2) سالم ہو (3) زبان مزین ہو (4) رحم وخوف اور دہشت کے جذبات کو ابھار کے ان کا تزکیہ یا کیتھارسس کرے۔

اردو شاعری نے اس طرح کے واقعات کی تلاش کی ہے اور حسن شوقی کا فتح نامہ، نصرتی کا علی نامہ یا دوسرے شعرا کے جنگ نامے یقیناً ملتے ہیں مگر ان میں تاریخ کی عظمت نہیں ہے۔ یہ قصے ہیں ان میں واقعات بڑی حد تک درست ہیں لیکن سب کچھ سچ نہیں ہے۔ پھر یہ ماضی کے ایوان کی تصویریں ہیں، سجی ہوئی، خوبصورت حسین خد و خال والی تصویریں مگر یہ بولتی نہیں ہیں نہ مہتم بالشان ہیں نہ ان سے کیتھارسس ہوتا ہے۔

مرثیہ کی رفعت و عظمت کا کیا کہنا! اس میں مہتم بالشان واقعہ بھی ہے

زبان بھی ہوئی بھی ہے، کیتھارسس بھی ہے لیکن ہر شہید کے حال کا مرثیہ اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہے اور اس میں پورا واقعہ نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں نے رزم نامہ انیس و دبیر ضرور تیار کیا ہے مگر وہ رزم نامے ذہین نقاد کی تحسین آفرینی کا نقش ہیں، خالق کی تخلیق نہیں۔

لیکن ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی طویل نظم 'اٹھارہ سو ستاون' اردو کا واحد رزمیہ ہے، جس کا واقعہ مبتم بالشان ہے جو سالم اور مکمل ہے، جس کی زبان مزین اور آراستہ ہے اور جو ہمارے جذبات کے کیتھارسس کی پوری قوت رکھتا ہے۔ نظم کے پس منظر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد نظر آتا ہے 'طوفان سے پہلے' عنوان کے تحت راہی لکھتے ہیں:

پاٹھ شالے ہیں پریشان صدا دیتے ہیں
مدرسے چاک گریبان صدا دیتے ہیں

راہی نے اس کا خیال رکھا ہے کہ ان کی ساری ہمدردیاں مجاہدوں کے ساتھ ہیں وہ عہد فرنگی سے خفا ہیں مگر وہ معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے:

فکر مذہب کی نہیں ہے غم جاگیر تو ہے

اس مصرع میں 'غم جاگیر' کی ترکیب اس پہلو کی وضاحت کردیتی ہے کہ اس انقلاب میں جاگیردار اپنے ذاتی مفاد کے لئے بھی شریک ہوئے تھے۔ نظم میں اختتامیہ سمیت تیرہ عنوانات ہیں۔ ہر عنوان کے تحت فضا اور ماحول کے ساتھ شعری ہیئت بدل جاتی ہے اور ہر واقعہ یا جذبہ کے لئے اس کی مناسبت سے شعری ہیئت ملتی ہے۔ مسدس کی ہیئت کے بعد ایک دم سے تیز دھن والے مصرعے ملنے لگے ہیں:

کٹاریں اعتقاد کی نکل پڑیں خیال آخرت نے فیصلہ کیا
گھروں میں گونجنے لگیں کہانیاں، بہن نے بھائیوں سے تذکرہ کیا

یہ تحریک اس طرح گھر گھر پھیلی، کنول کا پھول اور روٹی مذہبی افراد کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پیغام رسانی کا ذریعہ بنے۔ یہ سارے پہلو بھرپور اشاریت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں پھر وہ داخلی احساسات کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ واقعات کے بیان کے ساتھ جس طرح سیاسی عدم مرکزیت نے مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کو بے بس کردیا تھا وہاں بحر بدل جاتی ہے اور یہ شعری نادرہ کاری ہے کہ ایک مصرع پوری سیاسی تاریخ سنا دیتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے لئے یہ کہنا:

یہ مقطع غزل عشرت شبانہ ہے

سترہ سو چونسٹھ سے اٹھارہ سو چھپن تک کے مسلسل زوال کی داستان ہے۔ وہ اس دور کی دہلی کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کا التزام کرتے ہیں کہ جس جس انداز سے اس زمانے میں غزلیں کہی گئی ہیں ان کی نمائندگی ہوجائے۔ آخر میں شاعر خود کہتا ہے:

بہادر شاہ اب کچھ بھی نہیں ہے
مگر وہ اک مقدس یاد تو ہے

نظم کی لے پھر بدلتی ہے اور ایسے شعر ملتے ہیں جو اس دور کی اقتصادی اور معاشی حالت کی تصویر ہیں:

انگریزوں کی جیب میں جا پہنچی اپنی بدحالی تک
گیہوں کی بالی سے لے کر کانوں پر بالی تک

اور اسی طرح راہی پھر مسدس پر آجاتے ہیں۔

'کرانت کتھا' حالاں کہ چھ مصرعوں کی ہے لیکن اس کا لہجہ خالص عوامی شاعری کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے گاؤں کی چوپال میں لوگ جمع ہیں، ڈھولک گمک رہی ہے اور کوئی جیالا گا رہا ہے:

سنو بھائیو! سنو بھائیو! کتھا سنو ستاون کی

راہی نے تاریخی واقعات سے صرف نظر نہیں کیا ہے۔ پٹنہ میں وہابی تحریک کے اثرات کی نشان دہی بھی پس منظر کے اشعار میں ملتی ہے۔ جو بے اطمینانی، تہذیبی اعتبار سے شکست خوردگی کا جو احساس عام ہندوستانی کے دل میں تھا یا دہلی میں جس طرح مغل بادشاہ کی بے کسی اور بے چارگی پر اس سے عقیدت بڑھ گئی تھی ان سب کو سمیٹتے ہوئے 'کرانت کتھا' میں راہی نے فضا آفرینی میں صوتی آہنگ کے ذریعہ شعری مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ چھ مصرعے دیکھئے:

اتر بھارت میں پورب سے پچھم تک تیاری
ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ باجی ڈگڈگی کیا کہتا ہے مداری
نٹ آئے تو کود پھاند میں ان کی مار ماری
کٹھ پتلی کا ناچ دیکھنے آئے ہیں نر ناری
کٹھ پتلی کے ناچ کی گت پر کرانت کی گرم ہوا نکلی
سنو بھائیو، سنو بھائیو کتھا سنو ستاون کی

اس طرح راہی نے گویا 'منظوم اسباب بغاوت ہند' پیش کیا ہے۔ جس میں انھوں نے بہار کا بھی ذکر کیا ہے جو عموماً نظر انداز ہوجاتا ہے۔ نظم آگے بڑھتی ہے تو پھر تاریخی واقعات اور بیانات کے بجائے راہی تخیل کی مدد سے اس عہد کے افراد کے داخلی احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ 'اکیلا طوفان' کے تحت انھوں نے بڑا خوبصورت شعری تجزیہ کیا ہے۔ جب تک کردار اپنے جذباتی تصادم کا شکار رہتا ہے، بحر دوسری رہتی ہے جب اس پر خارجی اثرات مرتب ہوتے ہیں تو آہنگ بدل جاتا ہے۔ یہ بند دیکھئے:

نہا کے لوٹا تو راستے میں وہ چودھری کے مکاں پہ ٹھہرا
اداس کیوں ہو نراس کیوں ہو کنکھار کر نرملوں نے پوچھا

وہ بحر تو وہی رکھتے ہیں صرف ارکان میں اضافہ کر دیتے ہیں اس سے زور بھی پیدا ہوتا ہے اور آہنگ میں رزمیہ خطابت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ دیکھئے:

اداس کیوں ہوں یہ پوچھتے ہو نراش کیوں ہوں یہ پوچھتے ہو
ہماری بے غیرتی نے غیرت کے ناگ کا سر کچل دیا ہے
اداس اس لئے ہوں کہ منگل[1] ہے دار پر اور میں یہاں ہوں
یہ اس کو غیرت کا اور خاکِ وطن سے الفت کا پھل ملا ہے

یہ ایک طرح سے گریز ہے، وہ بحریں بدلتے ہوئے منگل پانڈے کے واقعہ کی طرف آجاتے ہیں اب وہ آزاد نظم کا سہارا لیتے ہیں اور منگل پانڈے کے واقعے نے کس طرح فوجیوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا تھا اس کی بڑی خوبصورت تصویریں ملتی ہیں۔

تو چھ مہینے کا میر امنا
مزے میں سویا ہوا تھا
اور مسکرا رہا تھا
تم اپنے منے کو پیار کرلو
میں جا رہا ہوں تم انتظار کرلو

ملک کے حالات پر بھرپور شعری تبصرہ ہے جو اردو شاعری میں منفرد بھی ہے اور بے حد شاندار ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں میں کس طرح احساس بے چارگی تھا وہ دیکھئے:

جھریوں کے دریچے کھلے ہیں، بے بسی جھانک کر ہنس رہی ہے
بوڑھے ہاتھوں میں ہے صرف لرزش، دھندلی آنکھوں میں بے چارگی ہے

وہ دھیرے دھیرے واقعات کے سہارے تاریخ کے اس موڑ پر آجاتے ہیں جہاں میرٹھ ہے۔ جس طرح میرٹھ میں سپاہیوں کی غیرت کو للکارا[2] گیا اور اس طرح انقلاب کی فضا ہموار ہوئی یہ سارے گوشے ابھرتے ہیں جہاں وہ کہتے ہیں:

چھاؤنی میں میرٹھ کی
لال وردیاں پہنے
بہترین فوجیں ہیں...

وہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں:

زندگی کی راہوں میں دار اور رسن بھی ہے
بے ستوں سے ٹکرانا عشق کا چلن بھی ہے

آگے چل کر کہتے ہیں:

آج ہوگا ارضِ میرٹھ پر ہمارا فیصلہ
طاقتیں یکساں ہیں دونوں آج یہ اچھا ہوا

راہی نے فضا اور ماحول سے ہم آہنگی برقرار رکھتے ہوئے رباعی کی بحر بھی اختیار کی ہے۔ اس میں انھوں نے یہ لحاظ رکھا ہے کہ تاریخی واقعات کا کارواں کہیں ٹھہرنے نہ پائے۔ اس طرح کے مصرعے دیکھتے چلئے:

اس سمت تو مجلس سے وہ دیوانے چلے
بیرک میں ادھر گیارھویں پیدل بھی اٹھے
انیسویں دستے نے بھی ہتھیار لئے

مرثیے کا خصوصاً میر انیس کا جو اثر راہی کے ذہنی افق پر تھا، جگہ جگہ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

سنتے ہیں فرنگی کی ہے جرأت مشہور
تدبیر بڑی ان کی سیاست مشہور
اپنا بھی ہے پر عزمِ شہادت مشہور

اور اسی پر عزمِ شہادت کا نمونہ کرنل فنس کی موت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ گیارھویں پیدل فوج نے بغاوت کردی اور 'کرانت کتھا' پھر آگے اس طرح بڑھی:

مئی اگارہ کے دن کو تھا میرٹھ میں سناٹا
سورج نے ہر راہ پہ دیکھا انگریزوں کا لاشا
چار دشاؤں میں میرٹھ کے تھا بس خون خرابا
چوہے کے بل تک میں گھسنے کو انگریز نے سوچا
ساری اکڑفوں نکل گئی ایک دن میں بس انگریزن کی
سنو بھائیو! سنو بھائیو! کتھا سنو ستاون کی

اس حصے میں راہی نے میرٹھ میں بغاوت کی ناکامی کی حالت بھی لکھی ہے۔ شبھن سنگھ کی شہادت کا ذکر بھی کیا ہے اور اسی حصے میں یہ معرکہ خیز شعر بھی ملتا ہے:

شاعر سے پوچھو تو شاعر بتلائے گا حالت
کیا جانے تاریخ بے چاری آخر کیا ہے صداقت

اور وہ صداقت یہ ہے کہ نفرت کو دبایا تو جا سکتا ہے لیکن نفرت مرتی نہیں ہے۔ راہی نے انگریزوں کے خلاف اس پھیلی ہوئی نفرت کو مکمل تاریخی تفصیل کے ساتھ میرٹھ سے دلی منتقل کیا ہے۔ 'چاندنی چوک میں چراغاں ہے' کے عنوان کے تحت انھوں نے دلّی پر قبضہ ہندوستان کی تاریخ بیان کردی ہے۔ کہتے ہیں:

ساقی پلا شراب کہ یہ روزِ عید ہے

اور تاریخ سے اس کی سند[3] بھی ملتی ہے۔ وہ پھر 'کرانت کتھا' کے عنوان کے تحت پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ پھیلنے کا ذکر کرتے ہیں اور کنور سنگھ کے بغاوت میں شامل ہونے کی طرف اشارہ کر کے ایک دم سے 'گنگا کے اجلے پانی پر' کے عنوان کے تحت کان پور کے حالات کی منظر کشی کرتے ہیں۔ انھوں نے مسدس اور مربع کی ہیئت میں تمام واقعات کی تاریخی تفصیل بیان کی

ہے۔ تاریخی کردار مثلاً نانا صاحب، عظیم اللہ، ٹیکا سنگھ، شمس الدین وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا واقعہ نظم کرکے وہ اس نفسیاتی نکتہ کو نمایاں کرتے ہیں کہ جب اشتعال ہوتا ہے تو پھر دبا ہوا انسان بھی بہت کچھ دالتا ہے:

ایسی گوراشاہی کی اب ایسی تیسی

اور:

اب ہتھیار اٹھائیں ساتھی اب ہتھیار اٹھائیں

کس طرح مذہب نے اس تحریک کو مثبت انداز میں حوصلہ بخشا تھا اس کے کچھ پہلو ان اشعار میں دیکھئے:

جنوں کا سورج جو سر پہ آیا تو گھٹ گئے مصلحت کے سائے
کھلی تھی آنکھیں جو مندروں کی حرم کے در بھی تھے کسمسائے

اور یہاں سے بحر بدل جاتی ہے، کہتے ہیں:

پھر وہی داستان دہراؤ
زور بازوئے حیدری لاؤ
ذہن فاروق کی چمک دکھلاؤ
نور اسلام کی دمک دکھلاؤ
یوں کھنچو رام کی کمان بنو
کرشن کا چکر بن کے وار کرو
ہر طرف پھر وہی اجالا ہو
پھر سے بھارت کا بول بالا ہو

وہ پہلے بھی بھوجپوری کو استعمال کر چکے ہیں، یہاں بھی ایک نمونہ دیکھ لیجئے:

گوری تو ہرے گال پہ ماسا چلی گنزا سانا
چھم چھم چھم چھم باجے پا ایلیا
بور اکل با لال چنز یا دیکھ پون کی چال
گوری ہو کہ گورا بھیا آج سبھی بے حال

راہی نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ معروف شخصیتوں کے ساتھ ان بے نام افراد کو بھی خراج عقیدت پیش کریں جو موت سے بے جھجک گفتگو کر گئے اور لڑے صرف اپنے وطن کے لئے۔

کان پور میں جس طرح انگریزوں پر برا وقت پڑا تھا اس کی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے راہی نے مجاہدین آزادی کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے کہ انگریزوں کے سلسلے میں ان کے پاس جب بھی ہمدردی کا کوئی جذبہ ابھرتا تھا تو ان کھیتوں کی یاد آتی تھی جنھیں انگریزوں نے برباد کر دیا تھا ان گھروں کی یاد آتی تھی جو اب نہیں رہ گئے تھے، اپنی گنگا کی لہریں بے چین کرتی تھیں کہ انھیں ٹیمز کی موجیں نگل گئی تھیں اور اس وجہ سے مجاہدین نے یہ طے کیا کہ یہ فرنگی ہیں، ان کی موت کی سزا ہے مارلو مارلو۔

لیکن راہی نے انھیں بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے، جو بے گناہ مارے گئے، کہتے ہیں:

فرنگیوں کی جنگ ایک یادگار جنگ ہے
مرا قلم بھی ان کی جراتوں پہ آج دنگ ہے

فتح مندیوں اور کامرانیوں کی داستان دھیرے دھیرے تدبر کے وسط سے گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور 'میں ہوں اب ایک لفظ' کے عنوان کے تحت وہ بہادر شاہ ظفر کی نفسیات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں جسے اپنے قلعۂ احمر سے پیار تھا، دیوان خاص کے سنگِ مرمر سے الفت تھی۔ اس نے خواب حکمت بھی دیکھا تھا لیکن وہ ہار گیا۔ اور اب دادا کی قبر پر بیٹھا ہوا بخت خاں کے ساتھ نہیں جاتا، بخت خاں چلا جاتا ہے۔ وہ اس عنوان کو ان اشعار پر ختم کرتے ہیں اور مقطع ظفر کا ہی ہے۔

اب لطف ہجر میں نہ کشش انتظار میں
دل پر خزاں نے زخم لگایا بہار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

راہی نے یہ نظم 'بھوالی سینی ٹوریم' سے واپسی کے بعد الہ آباد ہی میں لکھی تھی۔ وہ لکھتے جاتے تھے، ان کے احباب سنتے جاتے تھے داد و تحسین کے پھول نچھاور کرتے تھے۔ یہ نظم 1957 میں تمام ہوگئی تھی۔ کتابت وطباعت میں بہت وقت لگ گیا تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل یہ نظم کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی مگر اب کمیاب ہے۔

ان پر میر انیس اور ان کے مراثی کا بہت گہرا اور دیرپا اثر تھا۔ یہ اثر ان کے ہندی ناول 'آدھا گاؤں' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کی ہر تخلیق میں یہ اثرات ہیں۔ یہاں تک کہ مہابھارت کے بیشتر مکالموں کو اگر اردو میں ڈھال دیا جائے تو وہ میر انیس کا مصرع بن جائیں گے۔ یہ انقلاب آفریں نظم لکھتے ہوئے راہی جب دلّی کے المیے سے گزر کر اور وہاں کے کرداروں سے رحم، خوف اور دہشت کی سوغات لے کر جھانسی کی طرف مڑتے ہیں تو میر انیس کے مشہور مرثیے کے مطلع سے آغاز کرتے ہیں:

اے قلم منزل دشوار کو آساں کر دے

اس میں کوئی شک نہیں کہ تقریباً سو بند میں راہی نے مرثیہ شناسی کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مہارانی لکشمی بائی کو معرکۂ شہادت کا زندۂ

جاوید کردار بنادیا ہے۔ راہی چہرہ، سراپا، رجز، آمد، جنگ تمام اجزائے مرثیہ کی پاسداری کرتے ہیں، یہاں تک کہ صنائع بھی اسی طرح نظر آتی ہے جس طرح مراثی انیس میں! یہ بند دیکھئے:

گھن[4] گرج بن کے ہراک جسم کے جم جائیں قدم
رے کہے خاک میں ملتا ہے فرنگی کا حشم
عین آئیں تو اڑاتے ہوئے نصرت کے علم
قاف ہوں قلعۂ جھانسی کی طرح مستحکم
بے کہے لکشمی بائی[5] کی بغاوت ہم ہیں
تے کہے تاتیا توپی کی روایت ہم ہیں

یہ مشکل صنعت ہے مگر راہی نے مرثیے کی روایات کی پاسداری کی ہے اور اس کا اندازہ بالکل اس سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے بے شمار بند ایسے ہیں جو لاجواب ہیں اور کتاں کی طرح ہیں کہ لفظوں کی چاندنی اگر پڑے گی تو وہ شکستہ ہوجائیں گے۔ اس لئے ان پر تبصرہ کئے بغیر کچھ بند پیش کئے جاتے ہیں:

دیکھے چڑھتا ہوا سورج وہ ہے انداز خرام
قدِ موزوں کو کریں نیزے بھی جھک جھک کے سلام
خم ابرو کی تمنا میں رہے ماہ تمام
آنکھیں کہتی ہیں کہ سیکھے کوئی انداز کلام
ہونٹ کہتے ہیں کہ بس اس سے زیادہ ہیں نہ کم
لاکھ مبہم ہیں مگر ایک ہی بات ہیں ہم

کٹ کے گر جائیں پہ قبضہ کو نہ چھوڑیں ہیں وہ ہاتھ
پنجۂ شیرِ غضب ناک کو توڑیں ہیں وہ ہاتھ
جوش میں آئیں تو آہن کو نچوڑیں ہیں وہ ہاتھ
چاہیں جس راہ پہ تاریخ کو موڑیں ہیں وہ ہاتھ
ساتھ والوں میں بھی پھر جوشِ شہادت بڑھ جائے
ہاتھ ایسے ہوں تو سردار کی قیمت بڑھ جائے

اسی طرح جنگ کے مناظر کے سلسلے میں یہ بند ملاحظہ ہوں:

غل ہوا رانی نے تلوار نکالی، بھاگو
وار رانی کا ہے جائے گا نہ خالی، بھاگو
ٹالنے سے نہ اجل جائے گی ٹالی، بھاگو
سب سے کہتی ہے یہ بہتی ہوئی لالی، بھاگو
یاد اس تیغ کو ہیں مارنے کے کتنے ہاتھ
ایک مکتب میں رہی ہے ملک الموت کے ساتھ

ایک بھگدڑ صفِ اعدا میں پڑی ہے ہر سو
موت بن کر صفِ دشمن میں کھڑی ہے ہر سو
مردہ پتی کی طرح لاش جھڑی ہے ہر سو
ایک تلوار ہے پر آنکھ لڑی ہے ہر سو
روک بکتر نہیں، اور ڈھال کوئی آڑ نہیں
لکشمی بائی کی تلوار ہے کھلواڑ نہیں

اب رجز کے سلسلے کے بند ملاحظہ ہوں:

دور سے لکشمی بائی کی پڑی اس پہ نگاہ
یہ بھی ڈر تھا کہیں ٹکرائے نہ بھارت کی سپاہ
پھن نکالے ہوئے آیا جو نظر مارِ سیاہ
ایسے میں اس کو نظر آئی فقط ایک ہی راہ
بولی! میدان میں میں اپنے قدم دھرتی ہوں
سندھیا آ، میں مبارز طلبی کرتی ہوں

دیکھ لوں تجھ کو، تو پھر یہ ترا لشکر دیکھوں
لڑنے آیا کہ نہیں بیٹھا ہے افسر دیکھوں
آ، کہ میں بھی تیری تلوار کا جوہر دیکھوں
تو بڑھے گا، کہ تجھے میں وہیں آکر دیکھوں
کیوں ہے چپ چاپ کھڑا راہ کے پتھر کی طرح
کیا یہ تلوار لگا رکھی ہے زیور کی طرح

پورے رجز میں کوئی بند ایسا نہیں ہے جسے ترک کیا جائے لیکن بعض اشعار تو وہ ابدی تاثیر رکھتے ہیں جو آفاقی شاعری کی اعلیٰ ترین میراث ہیں، کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں:

دیکھ دنیا تجھے دھتکار رہی ہے بزدل
ایک عورت تجھے للکار رہی ہے بزدل
بھاگنا بعد میں کر لے ذرا یہ چھوٹا سا کام
پہلے تاریخ کو بتلادے کہ کیا ہے ترا نام
کیا سردار ہے کیوں موت سے گھبراتا ہے
یہ ہے میداں ارے اس سمت کہاں جاتا ہے

جھمی بائی کی لڑائی میں راہی نے مرثیہ سے ملی روایت کو شعری شخصیت کا جز بنا کے پیش کیا ہے:

داہنے بائیں جو آیا وہ قلم ہو کے گرا
سر اٹھائے ہوئے جو آیا وہ خم ہو کے گرا

جسم جو بھی گرا پورا نہیں، کم ہو کے گرا[6]

لکشمی بائی کی جنگ میں انہماک کی کیفیت صرف ان دو مصرعوں میں سامنے آجاتی ہے:

زخم سر باندھ لے اتنی اسے فرصت ہی نہیں
دیکھ لے مڑ کے کبھی اس کی یہ عادت ہی نہیں

جو لوگ لکشمی بائی کے ساتھ تھے اس کے سلسلے میں ان کی وفاداریوں کی متحرک تصویر اس شعر میں نظر آتی ہے:

ایک ایک کر کے ادا کر گئے سب حق وفا
اب فرنگیوں کے مجمع میں ہے رانی تنہا

بین یا شہادت کا منظر اگر راہی اور جھانسی بائی کا نام نہ لکھا جائے تو بلاشبہ معلوم ہوتا ہے کہ مرثیے سے اخذ کیا گیا ہے خاتمہ سے پہلے یہ یادگار شعر:

ہم نہ اس کو کبھی یوں جاں سے گزرنے دیں گے
ہم اسے یاد بنالیں گے نہ مرنے دیں گے

ندرت، اثر آفرینی، منجھی اور بجی ہوئی زبان رزمیہ کے تمام اصولوں کی پابندی اور ایک بے نظیر شاہ کار یہ حصہ ہے، جو سو بند پر مشتمل ہے۔ راہی کو تشہیر کے وہ ذرائع نہیں ملے جو سبھدرا کماری چوہان کو ملے اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستانی عوام نے بھی اٹھارہ سو ستاون سے وہ وابستگی نہیں رکھی جس کی تاریخ مستحق تھی ورنہ اس کا ایک ایک بند گھر کی چار دیواری میں گونجتا، میدان جنگ میں سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا، اس کی للکار سے ایک نئی نفسیات کی تخلیق ہوتی۔

اس کے بعد یہ طویل المیہ منظوم ڈرامے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں آٹھ کردار ہیں، نواں کردار نہیں ہے بلکہ اجتماعی نغمہ ہے جس کا عنوان ہے گومتی اور اس میں ایسے لازوال مصرعے بھی ملتے ہیں:

(1) اپنے ہی خون میں ڈوب کر سرخ رو
(2) اب بھی زندہ ہے یہ مرکز رنگ و بو
(3) لکھنو نار بھی ہے نور بھی ہے
(4) لکھنو گل بھی دامن نم بھی
(5) لکھنؤ سوز بھی ہے نغمہ بھی

یوں تو سب کچھ جہاں میں ہوتا ہے
کوئی نغمہ فنا نہیں ہوتا

ان مصرعوں کے ذریعہ سے راہی لکھنؤ کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں اور ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں جو متحرک ہیں۔ راہی نے مثنوی کی مخصوص بحر استعمال کی ہے اس لئے کہ یہاں بیان غنائی ہونے کے باوجود غم انگیز بھی ہے

اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی درد بھرا یاس سے لبریز عزم و حوصلہ حضرت محل کے مکالمہ میں ہے، کہتی ہیں:

گو یہ صدمہ اٹھا رہی ہوں میں
یہ قسم کھا کے جا رہی ہوں میں
قید خانے میں مر نہیں سکتی
صلح گوروں سے کر نہیں سکتی

یہاں یہ احساس مایوسی پیدا کرتا ہے کہ جنگ ہاری جا چکی ہے مگر یہ حوصلہ ہے کہ لڑائی جاری ہے اور جاری رہے گی۔ گومتی نے اسے یہی نصیحت دی ہے۔

زندگی کا فریب کھانا مت
سر کٹا دینا سر جھکانا مت

اور اس طرح پورے رزمیہ کا اختتام 'کتھا سنوستاون کی' پر ہوتا ہے۔

اردو شاعری ہی میں نہیں بلکہ یہاں تک کہنے کی جرأت کی جاسکتی ہے کہ عالمی شاعری میں کسی بھی زبان میں ایسی کوئی نظم نہیں ہے جس میں ہیئت کے اتنے تجربے ہوں اور ہر تاریخی واقعہ اپنی صداقت اور اپنی جزئیات کے ساتھ بھرپور شعری آہنگ کے ساتھ ابھرتا ہو۔ ہندوستان نے اس زبردست جدوجہد کے نوے برس بعد آزادی جیت لی۔ آج اگر ہندوستان کو اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش، اپنی رزمیہ میراث کی جستجو ہے، تاریخ کے شہر خموشاں کو شہر آرزو بنانے کا حوصلہ ہے تو ایسے ہی ادبی کارنامے ہندوستان کو مشترکہ ہیروز دے سکیں گے۔

راہی نے خوب کہا ہے:

آرزو ڈھال بھی تھی آرزو تلوار بھی تھی
آرزو دار بھی تھی آرزو دلدار بھی تھی

اسی شہر آرزو سے شاعر آواز دیتا ہے:

میری آواز پہ آواز دے اے ارض وطن
وادیٔ گنگ و چمن میرے خیالوں کے وطن
دیکھ وہ صبح ہوئی پھوٹ رہی ہے وہ کرن
سن مرے پیروں کی چاپ اور مرے دل کی دھڑکن
جاگ! دیوانوں کے دامن کی ہوا لایا ہوں
تحفۂ خونِ شہیدانِ وفا لایا ہوں

OO

حواشی: 1۔ منگل پانڈے تھا ہم سب سے بڑا دیوانہ رے۔ 2: طرازِ ظہیری، ظہیر دہلوی۔ 3: سولہ رمضان کو 11 مئی تھی اور 13-14 دن میں دلی پر مکمل تسلط ہو گیا تھا۔ 4: ایک توپ کا نام جسے 'کڑک بجلی' بھی کہتے تھے۔ غوث خاں کو یہ توپ بہت عزیز تھی۔ 5: ان کی اردو کی مہر دیکھنے کے بعد انھیں لکشمی کے بجائے لچھمی بھی لکھا جائے گا۔ 6: طوالت سے بچنے کے لئے پورا بند نہیں لکھا گیا ہے۔

مخدوم محی الدین

آزادیٔ وطن

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو دھو نہیں سکتی
وطن کی شمعِ آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علم بردارِ آزادی
وطن کے پاسباں وہ تیغ جوہر دارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خو کو سمویا ہے
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ بر اندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

فیض احمد فیض

تسلی

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہ لیں تڑپ لیں رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر! کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

معین احسن جذبی

اے کاش

شغل مے کرتا، پر اے کاش نہ ہوتا محسوس
تلخیٔ زہر بھی تلخیٔ مئے ناب میں ہے
چھیڑتا ساز پر آگاہ نہ ہوتا اے کاش
اک شرارہ سا بھی ہر جنبشِ مضراب میں ہے
کاش دریا کی خموشی سے نہ آتی آواز
اک تلاطم سا بھی ہر موجِ تہِ آب میں ہے
ابرِ نیساں کا برا ہو نہ بتاتا اے کاش
آبرو نام کی، ہر گوہرِ نایاب میں ہے
چاندنی راتوں میں یہ علم نہ ہوتا اے کاش
داغِ دریوزہ گری سینۂ مہتاب میں ہے
محفلِ عیش میں اے کاش نہ ہوتا واقف
کس قدر رنگ وفا فطرتِ احباب میں ہے
کاش کہتی نہ یہ مزدور کی گل رنگ نظر
حسرتِ خواب ابھی دیدۂ بے خواب میں ہے
کاش مفلس کے تبسم سے نہ چلتا یہ پتہ
کتنے فاقوں کی سکت غیرتِ بے تاب میں ہے
کاش توپوں کی گرج میں نہ سنائی دیتا
جذبۂ غیرتِ مظلوم ابھی خواب میں ہے
کاش امڈے ہوئے اشکوں سے نہ ہوتا ظاہر
اک قیامت سی دلِ شاعرِ بے تاب میں ہے

علی سردار جعفری

اُٹھو

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو
اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
کسانو اٹھو، کامگارو اٹھو
نئی زندگی کے شرارو اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے
اٹھو خاکِ بنگال و کشمیر سے
اٹھو وادی و دشت و کہسار سے
اٹھو سندھ و پنجاب و ملبار سے
اٹھو مالوے اور میوات سے
مہاراشٹر سے اور گجرات سے
اودھ کے چمن سے چہکتے اٹھو
گلوں کی طرح سے مہکتے اٹھو
اٹھو کھل گیا پرچمِ انقلاب
نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب
اٹھو جیسے دریا میں اٹھتی ہے موج
اٹھو جیسے آندھی کی بڑھتی ہے فوج
اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے
کڑکتے گرجتے، برستے ہوئے
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

فراق گورکھپوری

آزادی

مری صدا ہے گلِ شمعِ شامِ آزادی
سنا رہا ہوں دلوں کو پیامِ آزادی

لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی

مجھے بقا کی ضرورت نہیں کہ فانی ہوں
مری فنا سے ہے پیدا دوامِ آزادی

جو راج کرتے ہیں جمہوریت کے پردے میں
انھیں بھی ہے سرِ سودائے خامِ آزادی

بنائیں گے نئی دنیا کسان اور مزدور
یہی سجائیں گے دیوانِ خامِ آزادی

فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے
ارے یہ صبحِ غلامی! یہ شامِ آزادی

یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بامِ ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقامِ آزادی

فضائے شام و سحر میں شفق جھلکتی ہے
کہ جام میں ہے مئے لالہ فامِ آزادی

سیاہ خانۂ دنیا کی ظلمتیں ہیں وہ رنگ
نہاں ہے صبحِ اسیری میں شامِ آزادی

سکوں کا نام نہ لے، ہے وہ قیدِ بے میعاد
ہے پے بہ پے حرکت میں قیامِ آزادی

یہ کاروان ہیں پسماندگانِ منزل کے
کہ رہروؤں میں یہی ہیں امامِ آزادی

دلوں میں اہلِ زمیں کے ہے نیو اس کی مگر
قصورِ خلد سے سے اونچا ہے بامِ آزادی

وہاں بھی خاک نشینوں نے جھنڈے گاڑ دیے
ملا نہ اہلِ دوَل کو مقامِ آزادی

ہمارے زور سے زنجیرِ تیرگی ٹوٹی
ہمارا سوز ہے ماہِ تمامِ آزادی

ترنمِ سحری دے رہا ہے جو چھپ کر
حریفِ صبحِ وطن ہے یہ شامِ آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق
ہمارے سانس سے روشن ہے نامِ آزادی

احسان بن دانش

ناقوس بیداری

ہوشیار اے ہند اے غفلت شعاروں کے دیار
نالہ برلب ہیں ترے الجھے ہوئے لیل و نہار

اب ترے سر میں ترقی کا جنوں باقی نہیں
اب ترے انصاف کی نبضوں میں خوں باقی نہیں

سایہ ہے ابرِ تعطل کا تری تنظیم پر
چل گیا تخریب کا افسوں تری تعلیم پر

پیستے ہیں دانت سناٹے ترانوں پر ترے
خار زاروں کی نظر ہے گلستانوں پر ترے

شاہ راہوں میں بھیانک خامشی چھانے کو ہے
خون ہر ذرّے کی آنکھوں میں ابل آنے کو ہے

آ گیا خورشید سر پر کھول آنکھیں بے خبر
اپنی غفلت غیر کی بیداریوں پر کر نظر

ناخدا تیرے نہنگانِ اجل ہیں سر بسر
اپنی غرقابی سے پہلے ان کے بیڑے غرق کر

جس قدر ہیں پیشوایانِ تمدّن فتنہ خو
تیرے درماں کے لئے اکسیر ہے ان کا لہو

جن کی خواہش ہے کہ بجھ جائے اخوت کا چراغ
پیس دے گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے ان کے دماغ

دل کا کینہ رات بھر بیتاب رکھتا ہے انھیں
دیدۂ دولت طلب بیتاب رکھتا ہے انھیں

شوقِ سلطانی بنا دیتا ہے ان کو ہرزہ کار
ان کے مذہب کا نہ ان کی دوستی کا اعتبار

بے کسی مزدور کی جرأت دلاتی ہے انھیں!
آنسوؤں کی شبنمی میں نیند آتی ہے انھیں

یہ وہ محسن ہیں جو کر دیتے ہیں قوموں کو ہلاک
ان کے دم سے ہر شرافت کا گریباں چاک چاک

مورچے یہ کبر و نخوت کے اڑا کر پھینک دے
دمدمے ان کی سیاست کے اڑا کر پھینک دے

اختر شیرانی

لوری

کبھی تو رحم پر آمادہ بے رحم آسماں ہوگا
کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہوگا
کبھی تو سر پہ ابرِ رحمتِ حق گل فشاں ہوگا
مسرت کا سماں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

کسی دن تو بھلا ہوگا غریبوں کی دعاؤں کا
اثر خالی نہ جائے گا غم آلود التجاؤں کا
نتیجہ کچھ تو نکلے گا فقیرانہ دعاؤں کا
خدا گر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

خدا رکھے جواں ہوگا تو ایسا نوجواں ہوگا
حسین و کارواں ہوگا دلیر و تیغ راں ہوگا
بہت شیریں زباں ہوگا بہت شیریں بیاں ہوگا
یہ محبوبِ جہاں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن اور قوم کی سو جان سے خدمت کرے گا یہ
خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کرے گا یہ
ہر اپنے اور پرائے سے صدا الفت کرے گا یہ
ہر اک پر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

مرا ننھا بہادر ایک دن ہتھیار اٹھائے گا
سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہِ رزم جائے گا
وطن کے دشمنوں کے خون کی نہریں بہائے گا
اور آخر کامراں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کی جنگ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے
یہ اس شیدائے ملت باپ کا پُر جوش بیٹا ہے
ابھی سے عالمِ طفلی کا ہر انداز کہتا ہے
وطن کا پاسباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا
ہے رستہ دیکھتی کب سے فضائے کارزار اس کا
ہمیشہ حافظ و ناصر رہے پروردگار اس کا
بہادر پہلواں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اٹھائے گا
وطن کے دشمنوں کو کنج تربت میں سلائے گا
غرور خانداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

سرِ میداں جس دم دشمن اس کو گھیرتے ہوں گے
بجائے خوں رگوں میں اس کے شعلے تیرتے ہوں گے
سب اس کے حملۂ شیرانہ سے منہ پھیرتے ہوں گے
تہ و بالا جہاں ہوگا
میرا ننھا جواں ہوگا

حفیظ جالندھری

آزادی

شیروں کو آزادی ہے آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں کھائیں پیئیں آنند رہیں

شاہیں کو آزادی ہے آزادی سے پرواز کرے
ننھی منی چڑیوں پر جب چاہے مشق ناز کرے

سانپوں کو آزادی ہے ہر بستے گھر میں بسنے کی
ان کے سر میں زہر بھی ہے اور عادت بھی ہے ڈسنے کی

پانی میں آزادی ہے گھڑیالوں اور نہنگوں کو
جیسے چاہیں پالیں پوسیں اپنی تند امنگوں کو

انسان نے بھی شوخی سیکھی وحشت کے ان رنگوں سے
شیروں سانپوں، شاہینوں گھڑیالوں اور نہنگوں سے

انساں بھی کچھ شیر ہیں باقی بھیڑوں کی آبادی ہے
بھیڑیں سب پابند ہیں لیکن شیروں کو آزادی ہے

شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں اک من بھاتا کھاجا ہے
باقی ساری دنیا پر جا شیر اکیلا راجا ہے

بھیڑیں لاتعداد ہیں لیکن سب کو جان کے لالے ہیں
ان کو یہ تعلیم ملی ہے بھیڑیے طاقت والے ہیں

ماس بھی کھائیں کھال بھی نوچیں ہر دم لاگو جانوں کے
بھیڑیں کاٹیں دورِ غلامی بل پر گلہ بانوں کے

بھیڑیوں سے گویا قائم امن ہے اس آبادی کا
بھیڑیں جب تک شیر نہ بن لیں نام نہ لیں آزادی کا

انسانوں میں سانپ بہت ہیں قاتل بھی زہریلے بھی
ان سے بچنا مشکل ہے آزاد بھی ہیں پھرتیلے بھی

سانپ تو بننا مشکل ہے اس خصلت سے معذور ہیں ہم
منتر جاننے والوں کی محتاجی پر مجبور ہیں ہم

شاہیں بھی ہیں چڑیاں بھی ہیں انسانوں کی بستی میں
وہ نازاں اپنی رفعت پر یہ نالاں اپنی پستی میں

شاہیں کو تادیب کرو یا چڑیوں کو شاہین کرو
یوں اس باغ عالم میں آزادی کی تلقین کرو

بحر جہاں میں ظاہر و پنہاں انسانی گھڑیال بھی ہیں
طالب جان و جسم بھی ہیں شیدائے جان و مال بھی ہیں

یہ انسانی ہستی کو سونے کی مچھلی جانتے ہیں
مچھلی میں بھی جان ہے لیکن ظالم کب گردانتے ہیں

سرمائے کا ذکر کرو مزدوروں کی ان کو فکر نہیں
مختاری پر مرتے ہیں مجبوروں کی ان کو فکر نہیں

آج یہ کس کا منہ ہے آئے منہ سرمایہ داروں کے
ان کے منہ میں دانت نہیں پھل ہیں خونی تلواروں کے

کھا جانے کا کون سا گر ہے جو ان سب کو یاد نہیں
جب تک ان کو آزادی ہے کوئی بھی آزاد نہیں

زر کا بندہ عقل و خرد پر جتنا چاہے ناز کرے
زیرِ زمیں دھنس جائے یا بالائے فلک پرواز کرے

اس کی آزادی کی باتیں ساری جھوٹی باتیں ہیں
مزدوروں کو مجبوروں کو کھا جانے کی گھاتیں ہیں

جب تک چوروں راہزنوں کا ڈر دنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے

اسرار الحق مجاز لکھنوی

ایک جلا وطن کی واپسی

پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے
پھر وہ زندانیٔ زندانِ وطن آتا ہے
وہ خرابِ گل و ریحانِ وطن آتا ہے
مصر سے یوسفِ کنعانِ وطن آتا ہے
"کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے"

رندِ بے کیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش
ایک بھونرے کو خزاں میں تھی گلِ تر کی تلاش
خود صنم خانۂ آذر کو تھی آذر کی تلاش
مژدہ اے دوست کہ وہ جانِ بہار آ پہنچا
اپنے دامن میں لئے برق و شرار آ پہنچا

اپنا پرچم کچھ اس انداز سے لہراتا ہے
رنگ اغیار کے چہروں سے اڑا جاتا ہے
کوئی شاداں، کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحلِ مشرق پہ نظر آتا ہے
اپنے میخانے کا اک میکشِ بے حال ہے یہ
ہاں وہی مردِ جواں بخت و جواں سال ہے یہ

مردِ سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
روحِ انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم
جذبۂ عشق کی ہر شورشِ فانی کی قسم
تجھ کو اپنی اسی بدمست جوانی کی قسم
آ کہ اک بار گلے سے تو لگا لیں تجھ کو
اپنے آغوشِ محبت میں اٹھا لیں تجھ کو

نطق تو اب بھی ہے پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں
سوزِ پنہاں سے تری روح تپاں ہے کہ نہیں
تجھ پہ یہ بارِ غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خونِ جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ، تیرے پرستار ہیں ہم
جنسِ آزادیٔ انساں کے خریدار ہیں ہم

ساقی و رند ترے ہیں مے گلفام تری
اٹھ کہ آسودہ ہے پھر حسرتِ ناکام تری
برہمن تیرے ہیں کل ملتِ اسلام تری
صبحِ کاشی تری سنگم کی حسیں شام تری
دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں، وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائلِ جنگ نظر آتا ہے ہر مردِ جواں
سرفروشانِ بلاکش کا سہارا بن جا
اٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

ساحرلدھیانوی

آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمہارا مغنی، تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامن چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں
میں تمہارا مغنی ہوں نغمہ نہیں ہوں
اور نغمے کی تخلیق کا ساز و ساماں
ساتھیوں! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے
بربریت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرا رہے ہیں

بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
میرے گیتوں کی لے، میرے سُر، میری نے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو
ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں
سرفروشی کے خوابیدہ جذبے ابھارے
اور اس صبح کی راہ دیکھی
جس میں اس ملک کی روح آزاد ہے
آج زنجیر محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس ملک کے بحر و بر بام و در
اجنبی قوم کے
ظلم افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں

کھیت سونا اگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہیں
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
ان کے خوابوں کو تکمیل کا روپ دو
ملک کی وادیاں گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں، بچیاں
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو ان کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچوں کو ان کی خوشی بخش دو
ملک کی روح کو زندگی بخش دو
مجھ کو میرا ہنر، میری لے، بخش دو
میرے سُر بخش دو، میری نے بخش دو
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اس بھکارن فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہاں ہوں
مجھ کو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمہارا مغنی، تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہوں گا

OO

جمیل مظہری

بھارت ماتا

ماتا، ماتا، پیاری ماتا
بچے تجھ پر واری ماتا

او ماتا! او بھارت ماتا
تجھ پہ خدا کی رحمت ماتا
سندری تو ہریالی تو ہے
دھانی آنچل والی تو ہے
پھول کھلائیں تیری ہوائیں
بن برسائیں تیری گھٹائیں
شہد کی نہریں دودھ کی دھاریں
گودی میں جنت کی بہاریں
میٹھے میٹھے پھل دیتی ہے
ان دیتی ہے جل دیتی ہے
کنگن اور چوڑی کی جھنا جھن
شاعر کے دل کی ہر دھڑکن
نام ترا جپتی ہے ماتا
تو کتنی پیاری ہے ماتا
چاندنی راتوں کے جلوے میں
بندرا بن کے سناٹے میں
جب تاروں کی سبھا سجتی ہے
ہر دے کی بنسی بجتی ہے

آدھی رات کو کالی کوئل
موسم کی متوالی کوئل
پھیلتی ہے جب آم کی خوشبو
گیت ترا گاتی ہے کوکو
جگ دیتا ہے تجھ کو دعائیں
ہم تیرا گن کیسے نہ گائیں

ماتا تو ہے ہماری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

ہے مشہور تری مہمانی
پورب پچھم تیری کہانی
تبریزی، طوسی، شیرازی
مصری، رومی اور حجازی
ارمنی، چینی، جاپانی
پی کر تیرا میٹھا پانی
ہوگئے سوجی جان سے تیرے
ڈال دئے گنگا پر ڈیرے

گھر کو چھوڑا در کو چھوڑا
تجھ سے اپنا ناتہ جوڑا
تو نے انھیں گودی میں اٹھایا
پالا اور پروان چڑھایا
تیرا گھر ہے سب کو پیارا
سر اونچا کیوں ہو نہ ہمارا

سب کی ماتا ہماری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

جگ ماتا بھارت مہرانی
ستونتی، دھنونتی، گیانی
تجھ پہ سلام اے سوہنی ماتا
جگ ماتا، جگ موہنی ماتا
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
تیری گود میں بھائی بھائی
چھینٹوں میں تیرے بادل کے
سائے میں تیرے آنچل کے

مسجد، گرجا اور شوالہ
لنکا سے تا کوہ ہمالہ
گنگا اور جمنا کی روانی
کہتی ہے ماتا تیری کہانی
امریکہ کے ایوانوں میں
افریقہ کے میدانوں میں
مصر و عجم کے بازاروں میں
یورپ کے دولت زاروں میں
ملک عرب کی پاک فضا میں
مکے کے تپتے صحرا میں
تیری سبیلیں جاری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

او دیالو ماں، او داتی ماں
ستونتی ماں، کلیانی ماں
آنچل میں تیرے بن برسیں
اور ترے بچے ان کو ترسیں

من کے روگی پیٹ کے مارے
جیتے ہیں غیروں کے سہارے
ذلت، رسوائی، بد نامی
سو دھتکاریں ایک غلامی
کیسی ہوا پچھم سے آئی
جل گئی تیری کھیتی مائی
ویرانی ہر سمت برستی
اجڑی نگری سونی بستی
کیا ہوئیں وہ معمور فضائیں
دولت کی بہتی گنگائیں
نورتنی دربار کہاں ہے
پرتاپی تلوار کہاں ہے
ماں تیری تقدیر ہے کیسی
ہاتھوں میں زنجیر ہے کیسی
ہاتھ بندھے ہیں بال کھلا ہے
مانگ اجڑی ہے سر ننگا ہے
وہ تیموری تاج کہاں ہے
چندر بنسی راج کہاں ہے
مکھڑا کیوں میلا میلا ہے
کاجل کیوں پھیلا پھیلا ہے

آنسو کیوں ہیں جاری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

آ، ہم تیرے بال سنواریں
تجھ پر اپنی جانیں واریں
سیس ترے چرنوں پہ نوائیں
پیت کے میٹھے منتر گائیں
قومیت کی کڑیاں جوڑیں
لعنت کی زنجیریں توڑیں

نام ترا لے لے کے پکاریں
سوتی غیرت کو للکاریں
پیاری ماں من کیوں میلا کر
سر اونچا کر اور اونچا کر
دیکھ اپنے بچوں کا لشکر
ٹھاٹھیں لے جس طرح سمندر
دیکھ کھڑے ہیں تیرے سپاہی
رخ پہ جلالِ شاہنشاہی
جنتا ان کو کیوں نہ دعا دے
چتون سے ظاہر ہیں ارادے
لہراتا ہے ہاتھ میں جم جم
ماں تیرے اقبال کا پرچم
جب کہتے ہیں جے ماتا کی
دنیا گونج اٹھتی ہے خدا کی
ماتا تیرے دودھ کی دھاریں
کیوں نہ رگوں میں موجیں ماریں
گھر کو تجے تن من کو تیاگے
نعرے ہیں آکاش سے آگے
جیوٹ ہیں یہ جیالے ہیں یہ
تیری گود کے پالے ہیں یہ
تیرے لئے جانوں پر کھیلے
لے لے ان کی بلائیں لے لے
یہ تجھ کو آزاد کریں گے
گھر تیرا آباد کریں گے

مت رو اے دکھیاری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

یاد ہے ماں وہ تیرا زمانہ
تخت شہانہ تاج شہانہ

گرد ترے بھگتوں کی قطاریں
ہاتھوں میں ننگی تلواریں
کیا ہوئے ماں وہ تیرے جیالے
ٹیڑھی ترچھی پگڑی والے
کاندھے جن کے تخت کے پائے
پرجا پر بھگوان کے سائے
طوفانوں کو جھیلنے والے
موت سے اپنی کھیلنے والے
نظریں اس منظر کی پیاسی
آنکھوں میں ہے جنگِ پلاسی
یاد ہیں وہ چلتی تلواریں
وہ جھنکاریں وہ للکاریں
سینے تانے تیرے پیارے
جی کو توڑے جان کو ہارے
گونجے، گرجے، برسے، کڑکے
مر گئے تیرے نام پہ لڑ کے
گونگی دنیا بول رہی ہے
دھرتی اب تک ڈول رہی ہے
للکاریں اس گونجتے رن کی
موہن لال اور میر مدن کی
ہیں اب تک بے چین فضا میں
بھٹکی پھرتی ہیں صحرا میں
ٹکراتی رہتی ہیں دلوں سے
جیسے ہوا اٹھتے پودوں سے
ماں وہ تیرے کوکھ کے بچے
دھن کے پکے قول کے سچے
ہو گئے تیری لاج پہ قرباں
تیرے مقدس تاج پہ قرباں
اب ہے ہماری باری ماتا
ماتا، ماتا، پیاری ماتا

او ماتا، گوتم کی ماتا
ارجن اور بھیشم کی ماتا
ٹیپو کی ماں، اکبر کی ماں
ستونتی ماں، بلونتی ماں
شکتی تجھ سے ست تجھ سے ہے
مت تجھ سے ہمت تجھ سے ہے
شورش دے سودا دے سر دے
دل کا دیا پھر روشن کر دے
دار و رسن کا کھیل سکھا دے
نام پہ اپنے بھینٹ چڑھا دے
ٹیپو اور پورس پیدا کر
ایک اٹھے تو دس پیدا کر
دیس کا ہر سیوک ہو آندھی
ہر بچہ آزاد اور گاندھی
ہر پتری ہو سروجنی مائی
ہر مائی ہو لکشمی بائی
ہر دل میں اک طوفاں کر دے
شعلہ بھر دے بجلی بھر دے
جی میں اپنے لگن پیدا کر
من اجلا کر تن، اجلا کر
جیون دے، جیون کا پھل دے
شکتی دے، ہمت دے، بل دے

زنجیریں ہیں بھاری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

ماتا، ماتا، پیاری ماتا
بچے تجھ پر واری ماتا

OO

روش صدیقی

بار دولی

عظمتِ جلوہ گہِ صدق وصفا کیا کہیے
شدتِ جذبۂ تسلیم ورضا کیا کہیے
دور تک سلسلۂ اہلِ وفا کیا کہیے

منزلِ قافلۂ مقصدِ ہستی ہے تو
سرفروشوں کی بسائی ہوئی بستی ہے تو

نونہالوں کو شجاعت کا دھنی دیکھ لیا
جوش پہ ولولۂ کوہ کنی دیکھ لیا
مرحبا جذبۂ حب الوطنی دیکھ لیا

ناتواں طاقتِ اغیار سے ٹکراتے ہیں
تیرے بچے رسن و دار سے ٹکراتے ہیں

یہ بہادر یہ فدائی یہ رضا کار کسان
یہ الوالعزم، یہ جانباز، یہ خودار کسان
تیری عزت کے نگہبان ونگہدار کسان

لڑکھڑاتے ہیں نہ آلام سے گھبراتے ہیں
مسکراتے ہوئے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں

ظلم و بیداد کی شدت ہے مگر پھر خوش ہیں
جوشِ طوفانِ شقاوت ہے مگر پھر خوش ہیں
ہاں مصیبت پہ مصیبت ہے مگر پھر خوش ہیں

جانتے ہیں کہ بھلائی سے بھلا ہوتا ہے
صبر والوں کا مددگار خدا ہوتا ہے

گھر جولٹ جائے تو ابرو پہ شکن کیوں آئے
قید میں لب پہ کوئی تلخ سخن کیوں آئے
نہ رکیں اشک تو پھر یادِ وطن کیوں آئے

یہی شیوہ ہے صداقت کے پرستاروں کا
شکر ہر حال میں مذہب ہے رضا کاروں کا

کچھ نہیں ہے تو نہ ہو ہاں دلِ بیدار تو ہے
ہاتھ خالی ہیں تو کیا صبر کی تلوار تو ہے
حسنِ کردار سے خم ظلم کی دیوار تو ہے

ہیں نہتے مگر امیدِ ظفر رکھتے ہیں
یہ جری عدم تشدد کی سپر رکھتے ہیں

حوصلہ پست ہو مغرور ستم گاروں کا
بول بالا ہو صداقت کے پرستاروں کا
عبرت انگیز ہو انجام جفاکاروں کا

حق تعالیٰ تجھے اس جنگ میں منصور کرے
ارضِ گجرات سے غیروں کے قدم دور کرے

سید مطلبی فرید آبادی

جدوجہد آزادی

پہلا دور 1919-1921

اک دو کیسے لاکھ ہزار
کون کرے ان کا شمار
ابل پڑے سگرے نر نار
ایکا ہے ان کا ہتھیار
گھبرائی گوری سرکار
بھارت جاگا، مچی پکار

ہندو مسلم اور عیسائی
سب کہویں ہم بھائی بھائی
جو توڑے اپنی ایکتائی
اس کو سمجھو نپٹ قصائی
کتا ہے اسے دوؤ دھتکار
بھارت جاگا، مچی پکار

محمد علی کے نعرے ہیں
گاندھی کے جیکارے ہیں
پریم کے اپلے دھارے ہیں
جھنجلائے ہتیارے ہیں
لے کر جھپٹے چھری کٹار
بھارت جاگا، مچی پکار

دیش لہو سے ہوتی ہولی
شہر شہر میں چلتی گولی
پیتی لہو دھرتی ہے بولی
بھارت ماں کی بھر دی جھولی
گاؤں بچے نہ ہاٹ بزار
بھارت جاگا، مچی پکار

پھر چھائے جھاجھن کارے
تھک پڑے دشمن ہتیارے
ٹوٹن لاگے بندھن سارے
نئے چاند کے درشن پیارے
گونجن لاگے من کے تار
بھارت جاگا، مچی پکار

گھبرائی گوری سرکار
کتا ہے اسے دودھتکار
لے کر جھپٹے چھری کٹار
گاؤں بچے نہ ہاٹ بزار
گونجن لاگے من کے تار
بھارت جاگا، مچی پکار

دوسرا دور 1930

ہزار الجھنیں سہی
ہزار کاوشیں سہی
ہزار دشت خاردار
فلک کی گردشیں سہی
ہے وقت کی یہی صدا
اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

یہ باہمی عداوتیں
نہیں نہیں رقابتیں
یہ کش مکش ہے زندگی
نہ سمجھو ان کو آفتیں
کہو نہ کچھ برا بھلا
اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

اٹھا نہیں خمیر ابھی
بنا نہیں ضمیر ابھی
رگوں کا خون ست سا
تپا نہیں سریر ابھی
بڑھو تو طے ہو مرحلہ
اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

ہچر مچر ہے موت اب
ٹھنک لچک ہے موت اب
پلٹنا پیچھے دیکھنا
ہر اک اٹک ہے موت اب
کٹھن ہو لاکھ راستہ
اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

قدم کو ہے قرار، موت
وفا سے ہے فرار، موت
سکون اب فریب ہے
ہے اس کا لالہ زار موت
نہ دیکھو اپنے نقش پا
اٹھو، بڑھو، چلو، چلو

تیسرا دور

ہزار لاکھ ہوں ستم
جھکیں گے کس طرح سے ہم
وہاں سے یاں تک آ لئے
سفر ہو لاکھ بیش و کم
رکیں گے کس طرح سے ہم
اٹھے قدم، بڑھے قدم

نظر میں کل جہان ہے
اور عزم نوجوان ہے
عجب ہے اپنی عاشقی
کہ ہند اپنی جان ہے
عزیز ہیں عرب عجم
اٹھے قدم، بڑھے قدم

صحیح اگر شعور ہو
تو غیب بھی حضور ہو
یہ وقت کی پکار ہے
ہر اختلاف دور ہو
کہ ہند پھر سے لے جنم
اٹھے قدم، بڑھے قدم

تمام جال توڑ کر
حماقتوں کو چھوڑ کر
حریف نابکار کی
کلائیاں مروڑ کر
بلند اپنے ہوں علم
اٹھے قدم، بڑھے قدم

ہزار لاکھ ہوں ستم
رکیں گے کس طرح سے ہم
عزیز ہیں عرب عجم
یہ ہند پھر سے لے جنم
بلند اپنے ہوں علم
اٹھے قدم، بڑھے قدم

وامق جونپوری

زنداں

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

گولی کے یہ چلنے کی سن سن
پھیلا ہوا اگنی کا دامن
کس جرم کی ہیں یہ پاداشیں
کیوں لوٹتی پھرتی ہیں لاشیں
اس ظلم کی کوئی حد بھی ہے
آخر کوئی اس کا رد بھی ہے

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

بہتی ہے یہاں اُلٹی گنگا
نوکر چنگا مالک ننگا
کھانے کو لوہے کی تھالی
گندی گندی کالی کالی
خونخوار نگاہوں کی سازش
پیٹھوں پر کوڑوں کی بارش

ہاتھوں میں چکی کے چھالے
ہر سانس پہ جینے کے لالے
قدغن ہے لبوں کے ہلنے پر
پابندیاں آنکھیں ملنے پر

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

چھپ چھپ کے یہ ملنا آپس میں
پھنکتے ہوئے دل کس کے بس میں
خاموش نظر کے جیکارے
یہ جیکارے یہ انگارے
اک روز قیامت ڈھائیں گے
بے نام ونشاں کرجائیں گے

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

اختر الایمان

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں
پھینک دو اس کا جسم خاکی
یہ سیمگوں نرم نرم کرنیں
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حسن بے نام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے
جوان، دلکش، حسین چہرے سے
چھین لی غم نے تابناکی!
کھلی ہوئی بدنصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخرش راندۂ جہاں سے
زمیں کی آغوش نے وفا کی
اسی لئے کیا اگا کریں گے
یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ ان کو ایک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلادیں

سکندر علی وجد

بشارت

چہرے پہ بکھر جائیں گے انوار تبسم
پیشانیٔ گیتی کی شکن کل نہ رہے گی
اٹھتی ہے نقاب رخ لیلائے حقیقت
تاریکیٔ اوہام کہن کل نہ رہے گی
پائے گی دل آویزیٔ ملبوس عروسی
بے نور سحر مثل کفن کل نہ رہے گی
کھل جائے گا سب پر در میخانۂ عشرت
افراط غم و رنج و محن کل نہ رہے گی
ہو جائے گی انسان کی فطرت متوازن
بیگانگیٔ روح و بدن کل نہ رہے گی
آزادیٔ افکار کے گل دل میں کھلیں گے
یہ خار غلامی کی چبھن کل نہ رہے گی
گانے کے لئے قمری و بلبل کو چمن میں
منت کشیٔ زاغ و زغن کل نہ رہے گی
شمشاد صفت بستۂ آئین گلستاں
بوئے گل و نسرین و سمن کل نہ رہے گی
افسردہ شگوفوں کے جنازوں پہ پریشاں
مانند صبا روح چمن کل نہ رہے گی
یہ دشمن انصاف و کرم ظلم کی دیوی
بیکس کا لہو پی کے مگن کل نہ رہے گی
ارباب ہمم شاد و سرافراز رہیں گے
یہ سرکشیٔ دار و رسن کل نہ رہے گی
فریاد کناں سینۂ خاور میں مقید
آزادیٔ مشرق کی کرن کل نہ رہے گی
پرہول فضا حسرت صد شام غریباں
یہ کیفیت صبح وطن کل نہ رہے گی

آل احمد سرور

ٹیپو کی آواز

گو رات کی جبیں سے سیاہی نہ ڈھل سکی
لیکن مرا چراغ برابر جلا کیا
جس سے دلوں میں اب بھی حرارت کی ہے نمود
برسوں مری لحد سے وہ شعلہ اٹھا کیا
پھیکا ہے جس کے سامنے عکس جمال یار
عزم جواں کو میں نے وہ غازہ عطا کیا
میرے لہو کی بوند میں رقصاں تھیں بجلیاں
خاک دکن کو میں نے شرر آشنا کیا
جس کو بھلا سکیں نہ کبھی شیخ و برہمن
ہندوستان کو وہ فسانہ عطا کیا
ساحل کی آنکھ میں مگر آئی نہ کچھ نمی
دریا میں لاکھ لاکھ تلاطم ہوا کیا
خواب گراں سے غنچوں کی آنکھیں نہ کھل سکیں
اک شاخ گل سے نغمہ برابر اٹھا کیا
یہ بزم ایسی سوئی کہ جاگی نہ آج تک
فطرت کا کارواں ہے کہ آگے بڑھا کیا
مارا ہوا ہوں گو خلش انتظار کا
مشتاق آج بھی ہوں پیام بہار کا

ساغر نظامی

ترانۂ شباب

اے جوانو، نوجوانو
توڑ دو بند زارِ غلامی
خوش جمالو، نونہالو
پھینک دو سر سے بارِ غلامی

اے حسین و علی کے سپوتو
اے محمدؐ کے شہ زور بیٹو
نسل سے بادشاہوں کی تم ہو
پھر بھی ہو یادگارِ غلامی
اے جوانو، نوجوانو
بھیمو کی اولاد تھے تم
عہدِ ماضی کی روداد تھے تم
یاد ہے پہلے آزاد تھے تم
اب ہو اک یادگارِ غلامی
اے جوانو، نوجوانو
یہ تمہاری چھلکتی جوانی
اور یہ لعنتِ جاودانی
یہ سراسیمگی سرگرانی
یہ دلِ داغدارِ غلامی!!
اے جوانو، نوجوانو

اس غلام آسماں کو الٹ دو
ارضِ ہندوستاں کو الٹ دو
ہو سکے تو جہاں کو الٹ دو
کیوں ہے باقی دیارِ غلامی
اے جوانو، نوجوانو
ختم ہو دور بربادیوں کا
وقت ہے عالم ایجادیوں کا
کردو اعلان آزادیوں کا
ہو چکا اشتہارِ غلامی
اے جوانو، نوجوانو
اپنی عزت کی بنسی بجاؤ
اپنی عظمت کی بھیری بجاؤ
آتش افشاں نفیری بجاؤ
پھونک دو نغمہ زارِ غلامی
اے جوانو، نوجوانو

یہ وطن ساری قوموں کا ملجا
یہ وطن مسکن اہلِ وفا کا
یہ وطن ساری دنیا کا کعبا
اور یوں شرمسارِ غلامی!
اے جوانو، نوجوانو
آن ظاہر ہو اہلِ وفا کی
شان ظاہر ہو دستِ خدا کی
ہے جہاں قبر اہلِ وفا کی
اب وہاں ہو مزارِ غلامی
اے جوانو، نوجوانو
نغمے نغمے سے بیراگ برسے
ہر طرف آتشیں راگ برسے
ہر طرف سے نئی آگ برسے
جل اٹھے کاروبارِ غلامی
اے جوانو، نوجوانو

علی جواد زیدی

سیاسی قیدی[1] کی رہائی

مبارکباد تم کو آج میں کیا دوں رہائی پر
نکل پڑتے ہیں آنسو ملک کی بے دست وپائی پر

"رہائی" لفظ بے معنی ہے دنیائے غلامی میں
بسر ہوتی ہے ساری زندگی قیدِ دوامی میں

ہر اک گوشے پہ قید و بند کے قانون حاوی ہیں
یہاں تو یکتیں آزاد و قیدی کی مساوی ہیں

گر آوازیں اٹھائیں بھی کبھی سرکش جوانوں نے
سزائے قید دی امن واماں کے پاسبانوں نے

کوئی بھی ان کے چنگل سے نکل کر جا نہیں سکتا
کہیں بھی ہواماں ان رہزنوں سے پا نہیں سکتا

پنپنے ہی نہیں دیتے یہاں نخلِ جوانی کو
جکڑ رکھا ہے زنجیروں میں ساری زندگانی کو

تمناؤں پہ سنگینوں کی خوں خواری کے پہرے ہیں
وفورِ شوق کے دل پر ستم کے زخم گہرے ہیں

دبی ہے ظلم کے پہیئے کے نیچے روحِ آزادی
بھنور میں پھنس گئی ہے سارے ہندوستاں کی آبادی

رکا ہے سارا ہندوستاں مگر قانون[2] جاری ہے
اسی کا دور دورہ ہے اسی کی روبکاری ہے

رہا ہو کر اسی قانون کی گودی میں جاتا ہے
تمہیں پھر گھوم پھر کر محفلِ زنداں میں آتا ہے

دلِ صیاد کو ہر دم خیالِ صید رہتا ہے
رہائی میں بھی صد پیغامِ بند و قید رہتا ہے

ہمارا ملک اک زندانِ بے دیوار ہے ہمدم!
یہاں ہر اک قدم پر امتحاں دار ہے ہمدم!

1۔ قاضی جلیل عباسی جو زیدی ہی کے ساتھ قید تھے مگر ان سے کچھ دنوں پہلے رہا ہوئے۔ 2۔ ڈفنس آف انڈیا ایکٹ

آنند نرائن ملا

گاندھی کا قتل

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لو تھرّاتی ہے
اتر دکھن، پورب پچھم ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے
نوعِ انساں کاندھوں پہ لئے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے
آکاش کے تارے بجھتے ہیں، دھرتی سے دھواں سا اٹھتا ہے
دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایا اٹھتا ہے

جب ناخنِ حکمت ہی ٹوٹے دشوار کو آساں کون کرے
جب خشک ہو ابرِ باراں ہی شاخوں کو گل افشاں کون کرے
جب شعلۂ مینا سرد ہو خود جاموں کو فروزاں کون کرے
جب سورج ہی گل ہو جائے تاروں میں چراغاں کون کرے
ناشاد وطن! افسوس تری قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
انگلی کو پکڑ کر چلتے تھے جس کی وہی رہبر چھوٹ گیا

کچھ دیر کو نبضِ عالم بھی چلتے چلتے رک جاتی ہے
ہر ملک کا پرچم گرتا ہے، ہر قوم کو ہچکی آتی ہے
تہذیب جہاں تھرّاتی ہے تاریخ بشر شرماتی ہے
موت اپنے کئے پر خود جیسے دل ہی دل میں پچھتاتی ہے
انساں وہ اٹھا جس کا ثانی صدیوں میں بھی دنیا جن نہ سکی
مورت وہ مٹی نقاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی

اس حسن سے کچھ ہستی میں تری اضداد ہوئے تھے آکے بہم
اک خواب و حقیقت کا سنگم مٹی پہ قدم نظروں میں ارم
اک جسم نحیف و زار مگر اک عزم جوان و مستحکم
چشمِ بینا معصوم کا دل خورشید نفس، ذوقِ شبنم
وہ عجز غرورِ سلطاں بھی جس کے آگے جھک جاتا تھا
وہ موم کہ جس سے ٹکرا کر لوہے کو پسینہ آتا تھا

دیکھا نہیں جاتا آنکھوں سے یہ منظرِ عبرت ناکِ وطن
پھولوں کے لہو کے پیاسے ہیں اپنے ہی خس و خاشاکِ وطن
ہاتھوں سے بجھایا خود اپنے وہ شعلۂ روحِ پاکِ وطن
داغ اس سے سیہ تر کوئی نہیں دامن پہ ترے اے خاکِ وطن
پیغامِ اجل لائی اپنے اس سب سے بڑے محسن کے لئے
اے وائے طلوعِ آزادی، آزاد ہوئے اس دن کے لئے

سینے میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اس گل کی لطافت کیا کہئے
جو زہر پئے امرت کر کے اس لب کی حلاوت کیا کہئے
جس سانس میں دنیا جاں پائے اس سانس کی نکہت کیا کہئے
جس موت پہ ہستی ناز کرے اس موت کی عظمت کیا کہئے
یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پر رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات

یکساں نزدیک و دور پہ تھا بارانِ فیضِ عام ترا
ہر دشت وچمن ہر کوہ و دمن میں گونجا ہے پیغام ترا
ہر خشک و تر ہستی پہ رقم ہے خطِ جلی میں نام ترا
ہر ذرّے میں تیرا معبد، ہر قطرہ تیرتھ دھام ترا
اس لطف وکرم کے آئیں میں مر کر بھی نہ کچھ ترمیم ہوئی
اس ملک کے کونے کونے میں مٹی بھی تری تقسیم ہوئی

تاریخ میں قوموں کی ابھرے کیسے کیسے ممتاز بشر
کچھ ملکِ زمیں کے تخت نشیں کچھ تختِ فلک کے تاج بسر
اپنوں کے لئے جام وصہبا اوروں کے لئے شمشیر وتبر
نردِ انساں پٹتی ہی رہی دنیا کی بساطِ طاقت پر
مخلوقِ خدا کی بن کے سپر میداں میں دلاور ایک تو ہی
ایماں کے پیمبر آئے بہت انساں کا پیمبر ایک تو ہی

بازوئے فرواڑا ڑ کے تھکے تیری رفعت تک جانہ سکے
الفاظ و معنی ختم ہوئے عنواں بھی ترا اپنا نہ سکے
ذہنوں کی تجلی کام آئی خاکے بھی ترے ہاتھ آنہ سکے
نظروں کے کنول جل جل کے بجھے پرچھائیں بھی تیری پانہ سکے
ہر علم ویقیں سے بالاتر تو ہے وہ سپہر تا بندہ
صوفی کی جہاں نیچی ہے نظر، شاعر کا تصور شرمندہ

پستی سیاست کو تونے اپنے قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ الفت دی
قاتل کو بھی گر لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دعائے رحمت دی
'ہنسا' کو 'اہنسا' کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں اک 'پریم سندیسہ' لایا تھا

اس 'پریم سندیسے' کو تیرے سینوں کی امانت بننا ہے
سینوں سے کدورت دھونے کو اک موجِ ندامت بننا ہے
اس موج کو بڑھتے بڑھتے پھر سیلابِ محبت بننا ہے
اس سیلِ رواں کے دھارے کو اس ملک کی قسمت بننا ہے
جب تک نہ بہے گا یہ دھارا شاداب نہ ہوگا باغ ترا
اے خاکِ وطن دامن سے ترے دھلنے کا نہیں یہ داغ ترا

جاتے جاتے بھی تو ہم کو اک زیست کا عنواں دے کے گیا
بجھتی ہوئی شمعِ محفل کو پھر شعلۂ رقصاں دے کے گیا
بھٹکے ہوئے گامِ انساں کو پھر جادۂ انساں دے کے گیا
ہر ساحلِ ظلمت کو اپنا مینارِ درخشاں دے کے گیا
تو چپ ہے لیکن صدیوں تک گونجے گی صدائے ساز تری
دنیا کو اندھیری راتوں میں ڈھارس دے گی آواز تری

کیفی اعظمی

آخری مرحلہ

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے
بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار
اٹھے ہیں جنگِ خلافت کے آزمائے ہوئے
شجاع حیدر و ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک و رنجیت کے سکھائے ہوئے
خمارِ بادۂ اقبال کا نگاہوں میں
لبوں پہ نغمۂ ٹیگور مسکرائے ہوئے
نفس میں آنچ گرجتی ہوئی مشینوں کی
قدم پہ آتش و آہن کا سر جھکائے ہوئے
جبیں پہ دھان کے کھیتوں کی نرم ہریالی
نظر میں قحط کی پرچھائیاں چھپائے ہوئے
بھڑک کے دوشِ ہوا پر بچھار ہے ہیں کمند
شرر جو سرد کتابوں میں تھے دبائے ہوئے
فضا میں سرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغِ عمل جلائے ہوئے
تڑپ کے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے

ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ رن
کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن
پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن
یہ انتشار، یہ ہلچل، یہ مورچوں میں شگاف
مذاق اڑاتے ہیں عزمِ جہاد کے دشمن
نکل کے صف سے کھڑے ہو گئے ہیں کچھ ساونت
بڑھا کے ہاتھ محبت سے تھام لو دامن
پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلا دو شکوک کے خرمن
یہ یاس کیوں؟ یہ تمنائے خود کشی کیسی؟
نویدِ فتح ہے قلبِ عوام کی دھڑکن
مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

جاں نثار اختر

ساقی

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج مے خانے کا دروازہ
ہر اک مے کش یکا یک بے پئے برہم اٹھا ساقی

یہ کیسا مے کے بدلے خون جھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز ہے اک نالۂ ماتم اٹھا ساقی

ہوائے زہر آگیں چل اٹھی شاید گلستاں میں
یہ پیمانے الٹ ساقی، یہ جامِ جم اٹھا ساقی

اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

راہی معصوم رضا

آخری پڑاؤ

زبان تیرے لئے خونِ دل دیا میں نے
قلم ترے لئے کیا کچھ نہیں کیا میں نے
صلیب پر بھی گیا زہر بھی پیا میں نے
ہزار بار ہتھیلی پہ سر لیا میں نے

اب آج میرے بیاں کو نئی حرارت دے
مری وفا کی مجھے دے سکے تو قیمت دے

بیانِ خوابِ غرورِ عدن سے ڈرتا ہوں
بیانِ نافۂ روحِ ختن سے ڈرتا ہوں
بیانِ حسنِ بہارِ چمن سے ڈرتا ہوں
بیانِ روئے نگارِ وطن سے ڈرتا ہوں

بساطِ شعر پہ بھولے سے بر بھی نہ رہے
بیاں ہے میرے وطن کا کوئی کمی نہ رہے

یہ کوہسار جواں ماں کی آرزو کی طرح
یہ سربلند کسی گھر کی آبرو کی طرح
یہ برف بستہ حسیں چوٹیاں سبو کی طرح
سجی ہوئی کسی دیہات کی بہو کی طرح

شعاعِ مہر کی مشاطگی کا کیا کہنا
ہمالیہ تری دوشیزگی کا کیا کہنا

جوان دشت و جبل رنگ و بو کا اک عالم
سحر کے ہاتھ میں ہیں صد ہزار ساغرِ جم
یہ آبشاروں کی شوخی یہ گیسوئے برہم
یہ پھول بارِ گراں جن پہ ہیں صبا کے قدم

یہ وہ مکاں ہے کہ ہے فخر ہر مکیں کے لئے
میں آسمان کو ٹھکرا دوں اس زمیں کے لئے

یہ رودِ گنگ و جمن دل کے ہر سوال کا حل
ہر ایک بوند میں ان کی ہزار شیش محل
نہ ان کا کوئی مقابل نہ ان کا کوئی بدل
کھلے ہیں ان میں ہماری روایتوں کے کنول

زمیں پہ ساتھ، خیالوں میں ساتھ ہیں دونوں
بلائیں لیتی ہوئی ماں کے ہاتھ ہیں دونوں

کہاں ہے یوں کسی جمنا کے پاس ایسی غزل
کسی کے پاس نہ جمنا، نہ کوئی تاج محل
بجھا نہ موت سے بھی پیار کا حسین کنول،
جو سوزِ عشق ہو دل میں تو اس دیار میں چل

ہر اک قدم پہ کئی دل ہیں پیار ملتا ہے
جوان حسنِ شبِ انتظار ملتا ہے

یہ سارناتھ کے مندر سکونِ دل کا پیام
یہ دل کی طرح سنوارے ہوئے حسیں اصنام
یہ روشنی کے منارے رقیبِ ظلمتِ شام
ہر ایک ذرہ میں محفوظ اب بھی بدھ کا کلام

مرے وطن میں یوں ہی کس کا مان ہوتا ہے
ہریش چندر کا بھی امتحان ہوتا ہے

یہ حسنِ صبحِ بنارس شگوفہ جیسے کھلے
یہ دھند چھٹتی ہے یا خواب گہ کے پردے ہلے
قبائے دل کے کئی چاک صبح سے نہ سلے
پجاریوں کے جتھے مندروں سے آ کے ملے

اندھیری رات بھی آ جائے تو صبحِ گلشن ہے
طلسمِ شامِ اودھ کا چراغ روشن ہے

ہزار گیت لکھوں گا وطن کی الفت میں
ہزار رنگ بھروں گا وطن کی عظمت میں
قلم ہے سوچ میں لیکن خیال حیرت میں
میں کیوں کہوں کہ جہنم ہے میری جنت میں

خطا ہوئی ہے نہ حوا سے اور نہ کچھ ہم سے
یہاں یہ خوشۂ گندم خفا ہے آدم سے

یہ لکھنؤ کا چکن، یہ زری کی شام و سحر
ہر ایک تار میں سو بار الجھے تارِ نظر
یہ جامدانی ہے یا کہکشاں کی راہ گزر
کہ ایک تختۂ گل رات بھر کی اوس میں تر

میں کیوں کہوں کہ ہے خالق برہنگی ان کی
کسی کی موت کا خطرہ ہے زندگی ان کی

مرے وطن ترا شاعر ہوں رنج سہتا ہوں
ہر ایک شکل میں ہر گھر میں جا کے رہتا ہوں
میں خون بن کے ہر اک زخمِ دل سے بہتا ہوں
میں انقلاب کی سوگند کھا کے کہتا ہوں

کہ اس کمان کا بس آخری تناؤ ہے یہ
اندھیری رات کا بس آخری پڑاؤ ہے یہ

شمیم کرہانی

جگاوا

جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
جشن بپا ہے موت کے بن میں
حشر عیاں ہے صحنِ چمن میں
آگ لگی ہے باغِ وطن میں
امن کی راہ نکال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
ٹوٹ پڑا ہے ظلم کا لشکر
گرم ہے قتل و غارت گھر گھر
کیسے بچے گی عصمتِ مادر
کھلتے ہیں سر کے بال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
ظلم کی آندھی، غم کا اندھیرا
بحر پہ ہے طوفان کا ڈیرا
موت کا منہ ہر موج کا گھیرا
قوم کی ناؤ سنبھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال

دھوپ میں مزدوروں کے دل ہیں
چین میں کیسے اہل دوَل ہیں
عرش سے اونچے شیش محل ہیں
ہاتھ میں تول کدال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
لڑکے مرے ہیں ایسے بھی گلرو
موج ہوا میں جن کی ہے خوشبو
سونگھ رہی ہوں نکہت گیسو
عطر میں آب کو ڈھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
قوم کا دم بھرنا ہی دوا ہے
فرض ادا کرنا ہے وفا ہے
دیس جئے مرنا ہی بقا ہے
میان سے تیغ نکال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
ماں تو نہیں اس جنگ کی حامی
قتل ہوں جس میں ہند کے نامی
پر نہیں اٹھتا بار غلامی
گرتی ہوں اٹھ کے سنبھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال

غلام ربانی تاباں

انتقام

میں کس سے انتقام لوں
یہ سچ ہے بیکسوں کے خوں سے سرخ ہوگئی زمیں
مصیبتوں کی داستاں میں سن چکا ہوں ہم نشیں
میں سن چکا ہوں کس طرح بزرگ و ناتوان بھی
بلکتے شیر خوار بھی فسردہ نوجوان بھی
اجل کے گھاٹ ایک ایک کر کے سب اتر گئے
گھروں کی شاہزادیاں، حریم ناز کی مکیں
(جو عشتیں گنوا چکیں، جو عصمتیں لٹا چکیں)
بھٹک رہی ہیں در بدر
برہنہ پا، برہنہ سر
میں سن چکا ہوں ہم نشیں یہ داستان دل خراش
مگر کسے میں دوش دوں
میں کس سے انتقام لوں
تباہیوں کی گود کے پلے ہوئے کسان سے؟
کہ جنگ انقلاب کے سپاہی نوجوان سے؟
غریب و ناتوان سے؟
نہیں نہیں!!
یہ سب میرے عزیز ہیں، یہ سب مجھے عزیز ہیں
میں کس سے انتقام لوں
بتا کسے میں دوش دوں
چمن میں کس نے آگ دی ہے موسم بہار میں
اک اجنبی سفید ہاتھ، آتشیں و شعلہ بار
فضائے تیرہ وطن میں رقص کر رہا ہے آج

سلام مچھلی شہری

سات رنگ

تصویر وہ بناؤں کہ مسحور ہو سکوں
ایسے خطوط کھینچوں کہ مغرور ہو سکوں

اک نوجواں کو شہر میں تشویشِ روز گار
اور دور ایک گاؤں میں برسات کی بہار
ہاتھوں میں اک حسینہ کے ٹوٹا ہوا ستار

دریا سے ہٹ کے، سامنے چھوٹا سا ایک گاؤں
پگڈنڈیوں سے دور وہاں پیپلوں کی چھاؤں
وہ دھندلی دھندلی صورتیں، وہ میلے میلے پاؤں

موجوں کے رخ پہ چھوٹی سی کشتی رواں دواں
دریا کے اس بہاؤ سے ملاح بد گماں
ساحل کے ایک جھونپڑے میں موت کا سماں

کچھ لوگ محوِ سیرِ چمن زارِ شالیمار
ہنستا ہے سامراج پہ الفت کا شاہکار
پھاٹک پہ ہٹ کے، میلے فقیروں کی اک قطار

سونے کا ماہتاب مناروں کے درمیاں
چاندی کا آفتاب چناروں کے درمیاں
اور اک 'خدا' فضائی نظاروں کے درمیاں

زنداں کی ایک شمع پہ پروانے مضطرب
اور اپنی اپنی فکر میں دیوانے مضطرب
باہر حیاتِ تازہ کے افسانے مضطرب

سڑکوں پہ انقلاب کی گونجی ہوئی صدا
کالج کے ایک 'ہال' میں دنیا پہ تبصرہ
اک نوجواں کے ہاتھ میں اخبار آج کا

موضوع اتنے جیسے کہ گھبرا رہا ہوں میں
شاید کہ اپنے فکر پہ خود چھا رہا ہوں میں

جگن ناتھ آزاد

سبھاش چندر بوس بہادر شاہ ظفر کے مزار پر

السلام اے عظمتِ ہندوستاں کی یادگار
اے شہنشاہ دیارِ دل! فقیرِ بے دیار
آج پہلی بار تیری قبر پر آیا ہوں میں
بے نوا ہوں نذر کو بے لوث دل لایا ہوں میں
گردشِ تقدیر کے ہاتھوں وطن سے دور ہوں
ایک بلبل ہوں مگر صحنِ چمن سے دور ہوں
شوقِ آزادی کا مجھ کو کھینچ لایا ہے یہاں
آج دشمن ہے زمیں میری عدو ہے آسماں
میں بھی ہوں اپنے وطن سے دور تو بھی دور ہے
ہاں رضائے پاک یزداں کو یہی منظور ہے
میرا دامن بھی یہاں کی خاک سے آلودہ ہے
فرق صرف اتنا ہے میں آوارہ تو آسودہ ہے
اے شہِ خوابیدہ! اے تقدیرِ بیدارِ وطن
آئینہ میری نگاہوں پر ہے ادبارِ وطن
میرے دل کو یاد ہے اب تک وہ ستاون کی جنگ
جس کے بعد اس سرزمیں پہ چھا گئے اہلِ فرنگ
میری نظروں میں ہے میرٹھ اور دہلی کا زوال
جانتا ہوں میں جو تھا جھانسی کی رانی کا مآل
میں نہیں بھولا ابھی انجامِ نانا فرنویس
ہے نظر میں کوششِ ناکامِ نانا فرنویس
داستاں جیسے بھی ہو گزری وہ سب معلوم ہے
تیرے دلبندوں پہ جو گزری وہ سب معلوم ہے
یہ وطن روندا ہے جس کو مدتوں اغیار نے
جس پہ ڈھائے ظلم لاکھوں چرخِ ناہنجار نے

جس کو رکھا مدتوں قسمت نے ذلت آشنا
جس نے ہر پہلو میں دیکھی پستیوں کی انتہا
آج پھر اس ملک میں اک زندگی کی لہر ہے
خاک سے افلاک تک تابندگی کی لہر ہے
آج پھر اس ملک کے لاکھوں جواں بیدار ہیں
حریت کی راہ میں مٹنے کو جو تیار ہیں
آج پھر ہے بے نیام اس ملک کی تلوار دیکھ
سونے والے جاگ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ
اس طرح لرزے میں ہے بنیادِ ایوانِ فرنگ
کھا چکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ
حب قومی کے ترانوں سے ہوا لبریز ہے
اور توپوں کی دنادن سے فضا لبریز ہے
شورِ گیر و دار کا ہے پھر فضاؤں میں بلند
آج پھر ہمت نے پھینکی ہے ستاروں پر کمند
پھر امنگیں آرزوئیں ہیں دلوں میں بے قرار
قوم کو یاد آ گیا ہے اپنا گم گشتہ وقار
نوجوانوں کے دلوں میں سرفروشی کی امنگ
عشق بازی لے گیا ہے عقل بے چاری ہے دنگ
آج پھر اس دیس میں جھنکار تلواروں کی ہے
کچھ نرالی کیفیت پھر دیس کے پیاروں کی ہے
جو توانائی ارادوں میں ہے کہساروں کی ہے
ذرے ذرے میں نہاں تابندگی تاروں کی ہے
یہ نظارہ آہ لفظوں میں سما سکتا نہیں
"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں"

فتح و نصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہے
نعرۂ "جے ہند" سے ساری فضا معمور ہے
مجھ کو اے شاہِ وطن! اپنے ارادوں کی قسم
جن کے سر کاٹے گئے ان شاہزادوں کی قسم
تیرے مرقد کی مقدس خاک کی مجھ کو قسم
میں جہاں ہوں اس فضائے پاک کی مجھ کو قسم
اپنے بھوکے جاں بلب بنگال کی مجھ کو قسم
حاکموں کے دست پر ورکال کی مجھ کو قسم
لال قلعے کی ، زوالِ شہرِ دہلی کی قسم
محسنِ دہلی! مآلِ شہرِ دہلی کی قسم
میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا
اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہو کر آؤں گا
تیغ ہندی جس کا لوہا مانتا ہے اک جہاں
جس کی تیزی کی گواہی دے رہا ہے آسماں
تیغ ہندی جس کو میں نے کر دیا ہے بے نیام
جس کا شیوہ حریت کیشی، جہانگیری ہے کام
جس نے پوری منصفی کی آج تک دنیا کے ساتھ
ظلم کی دشمن ہے جو اک ظلم بے پروا کے ساتھ
ہر قدم پر جس نے باطل کو ملایا خاک میں
جس کے ساکھوں کی ابھی تک گونج ہے افلاک میں
آج پھر اپنی نظر جس کی چمک سے خیرہ ہے
جس کی تابانی سے روشن اک جہانِ تیرہ ہے
اک جزیرے کے حسیں ساحل سے جب ٹکرائے گی
چین سے مجھ کو بھڑکتی آگ میں نیند آئے گی

اٹھارہ سوستاون

• 1857 •

نثری ادب

جائزہ

نثری مرثیہ

ڈراما

بغاوت اور ادب

اردو نثری اصناف پر 1857 کے اثرات

سید علی حیدر

تاریخ میں جب کوئی مہتم بالشان واقعہ وجود میں آتا ہے تو اس عہد کا ادب اس کی یاد کو محفوظ کر کے اسے عمر جاوداں عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ماضی میں نشاۃ الثانیہ کی تحریک رہی ہو یا 1789 کا انقلاب فرانس یا امریکہ کی جنگ آزادی۔ ان واقعات نے انسانی ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور عرصہ تک ادیب و دانشوران واقعات کو دہراتے رہے۔ والٹیر اور روسو نے تو انقلاب فرانس کو ادب اور فلسفہ کا ناقابلِ تنسیخ جز بنا دیا۔

1857 میں ہندوستانی تاریخ کے سمندروں میں ایسا ہی مد و جزر ابھرتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ہندوستانیوں کو شمشیر وسنان اول کا سبق یاد دلانے آیا تھا۔ اور وہ ہندوستانی جو طاؤس ورباب میں گم تھے ان کے اصلی خد و خال دنیا کے سامنے پیش ہوئے اور لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مرد و خواتین اپنے تاریخی تسلسل کو بھولے نہیں ہیں۔ سراج الدولہ، نانا فرنویس اور ٹیپو سلطان کی روایت کے وارث تلواروں کی جھنکار کے ساتھ اٹھے اور اپنی سرفروشیوں کی ابدی داستان اس طرح لکھ گئے کہ ان کا عہد بھی متاثر ہوا اور ان کے بعد بھی ان کے اثرات محسوس کئے گئے۔ چنانچہ اردو ادب پر 1857 کے اثرات خود اپنی جگہ پر ایک مستقبل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں یہاں مختصراً صرف نثری اصناف کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جنھوں نے 1857 کے اثرات کو قبول کیا تھا۔ شاعری پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن نثر کی طرف اتنی توجہ نہیں کی گئی جتنی کی جانی چاہئے تھی۔ یہاں سرسری طور پر 1857 کے اثرات کا اجمالی تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

کسی بھی واقعہ کا اثر دو طرح سے سامنے آتا ہے ایک معاصر ادب میں اس کا بیان دوسرے بعد کی تخلیقات پر اس کا اثر۔

1857 نے اردو کو بہت سے نئے گوشوں سے روشناس کیا۔ مثلاً اس سے پہلے خود نوشت کا کوئی تصور اردو میں نہیں تھا۔ جعفر تھانیسری وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے 'کالا پانی' کے عنوان سے اپنی خود نوشت لکھی۔ اس میں غدر کے

■

1857 میں ایک پہلو اور ابھر کر سامنے آیا اور وہ تھا بیاضوں اور یادداشتوں کو مرتب کرنے کا۔ ان یادداشتوں میں جہاں ذاتی اور شخصی واقعات درج ہیں اور 1857 کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے وہیں ان سے آئندہ چل کر افسانہ اور ناول میں ایک نئے طرز اظہار کے لئے راہیں ہموار ہوتی ہیں، یعنی ذاتی اور نجی واقعات کو بیانیہ انداز میں دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا رجحان۔ ان یادداشتوں میں شعرائے کرام اور ادیبوں کی یادداشتیں ہیں جن میں اہم نام بیگم حضرت محل کا ہے لیکن ان لوگوں سے زیادہ اہمیت ان مخالفین کے بیان کی ہے جنھوں نے گورنر جنرل برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اپنے یادداشتوں کے نقول بھیجے۔

■

واقعات تو اتنے نہیں ہیں مگر بذات خود 'کالا پانی' اس غدر کی نشان دہی کر رہا ہے۔

1857 میں ایک نئی صنف سے اردو ادب آشنا ہوا جسے روزنامچہ کہنا چاہئے۔ یہ سارے روزنامچے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں رائے بہادر جیون لال کا روزنامچہ غدر کی صبح وشام، معین الدین حسن خاں کا روزنامچہ (خدنگ غدر) اور بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ قابل ذکر ہے۔ یہ روزنامچے تاریخ کے واقعات کا بیان کرتے ہیں اور انھیں پڑھتے ہوئے جہاں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ آنے والے دور نے رپورتاژ اور نامہ نگاری کی اصناف کے لئے کس حد تک ان روزنامچوں سے استفادہ کیا۔

1857 میں ایک پہلو ابھر کر سامنے آیا اور وہ تھا بیاضوں اور یادداشتوں کو مرتب کرنے کا۔ ان یادداشتوں میں جہاں ذاتی اور شخصی واقعات درج ہیں اور 1857 کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے وہیں ان سے آئندہ چل کر افسانہ اور ناول میں ایک نئے طرز اظہار کے لئے راہیں ہموار ہوتی ہیں، یعنی ذاتی اور نجی واقعات کو بیانیہ انداز میں دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا رجحان۔ ان یادداشتوں میں شعرائے کرام اور ادیبوں کی یادداشتیں ہیں جن میں اہم نام بیگم حضرت محل کا ہے لیکن ان لوگوں سے زیادہ اہمیت ان مخالفین کے بیان کی ہے جنھوں نے گورنر جنرل برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اپنے یادداشتوں کے نقول بھیجے۔

قدیم انتظامیہ میں ایک عہدہ پرچہ نویس کا ہوتا تھا۔ یہ پرچہ نویس عہدہ اخبار پر مامور ہوا کرتے تھے۔ ریاستوں میں دوسری ریاستوں کی طرف سے پرچہ نویس ہوا کرتے تھے دور حاضر کے اعتبار سے انھیں انٹیلی جنس یا ایل آئی یو (LIU) والا آدمی سمجھا جاسکتا ہے۔ انھیں پرچہ نویس کہئے یا واقعہ نگار۔ انھوں نے ساری تفصیلات فراہم کی ہیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں ہندوستانی بھی ہیں غیر ہندوستانی بھی ہیں اور میں منکاف صاحب کو مورخ کے بجائے پرچہ نویس ہی مانتا ہوں۔ خود ہڈسن نے دلی کے سلسلہ میں پرچہ نویس کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ بھوانی پرشاد جو نواب سکندر جہاں بیگم بھوپال کی طرف سے پرچہ نویسی کی خدمت پر مامور تھے، انھوں نے رانی جھانسی اور انگریزوں کی معرکہ آرائی کی رپورٹ بیگم صاحبہ بھوپال کو روانہ کی ہے، جو میدان جنگ کی بڑی اچھی منظر کشی بھی کرتی ہے۔

نامہ نگاری کی روایت دراصل اسی دور سے شروع ہوتی ہے۔ اس عہد کے مشہور اخبارات میں ڈاکٹر عتیق صدیقی کے مطابق بیشتر رپورٹنگ خود ایڈیٹر کے قلم کی معلوم ہوتی ہے یا اور کسی آدمی نے لکھا ہو یا پھر ان جگہوں پر اخبار کے نمائندے رہے ہوں۔ مثلاً 'الظفر' میں کول (علی گڑھ) میرٹھ، بلند شہر دلی کی سرخیاں لگا کر خبریں دی گئی ہیں۔ عموماً یہ اندازہ ہے۔ سنا گیا ہے کہا جاتا ہے، بیان کیا جاتا ہے، یہ پہلو قابل غور ہے کہ نامہ نگاری کے ابتدائی خدوخال کا نقطۂ آغاز 1857 کے یہی اخبارات ہیں۔

غدر کے سلسلہ میں ایک اہم کتاب ظہیر دہلوی کی 'فغان دہلی' جسے ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے طراز ظہیری کے نام سے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ظہیر دہلوی نے غدر سے پہلے دلی کا پس منظر۔ بہادر شاہ ظفر کے معمولات جواں بخت کی شادی کے سلسلہ کی تفصیلات وغیرہ درج کی ہیں۔ ایک تہائی سے زیادہ حصہ 1857 تک محدود ہے۔ اس کتاب کو واقعہ نویسی میں شمار کرنا چاہئے۔ اور اس کا نصف حصہ خود نوشت میں شمار ہونا چاہئے۔

اگر دوسرے زاویے سے 1857 کے ادبی منظر نامے پر غور کیا جائے تو اردو میں سیاست کو موضوع بنا کر کوئی تخلیق وجود میں نہیں آئی تھی۔ شاعری تو گل وبلبل، عشق عاشقی کی وجہ سے بدنام رہی باقی بچی نثر تو اس کا اثاثہ اور سرمایہ لے دے کر داستانیں تھیں۔ 1857 میں پہلی بار نئے موضوعات سامنے آئے۔ جس کی داغ بیل سرسید کے ہاتھوں پڑی۔ چنانچہ رسالہ 'اسباب بغاوت ہند' اردو کی پہلی مستند سیاسی تصنیف ہے۔ سرسید نے پہلی بار ایک بہت بڑی سیاسی طاقت یعنی انگریزوں کو اس کتاب کے ذریعہ چیلنج کیا ہے۔ سرسید 1857 کی بغاوت کے ہم نوا نہ تھے بلکہ خلاف تھے۔ مگر انھوں نے نہایت دیانت داری سے یہ محسوس کیا کہ 1857 میں جو شورش ہوئی اس کی ذمہ داری دبرٹش ایسٹ انڈیا کمپنی پر بھی عائد ہوتی تھی۔ یہ بڑی جرأت کی بات تھی لیکن سرسید نے بے مثال حق گوئی سے کام لیا اور جو سچ سمجھا وہ لکھا۔ ان کی دوسری کتاب 'تاریخ سرکشی ضلع بجنور' بھی سیاسی ادب کا اہم ستون ہے۔ آج کے دور میں سرسید سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے لیکن جس زمانہ میں یہ کتابیں لکھی گئیں ہیں یہ ممکن نہیں تھا کہ اس بے خوفی کے ساتھ انگریزی اقتدار کے خلاف بھی قلم اٹھایا جائے۔

نثری اصناف پر 1857 کی نشاندہی میں متداول مروجہ اصناف کا ذکر ضروری ہے۔ ان میں سب سے پہلے ناول کا نام آتا ہے۔ 1857 کے واقعات کا بہت ہی جاندار نقشہ ابن الوقت میں نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کی ہمدردیاں نوبل صاحب کے ساتھ ہیں لیکن انھوں نے انگریزوں کی پھیلائی دہشت گردی سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ لکھنؤ کے واقعات امراؤ جان ادا میں ملتے ہیں۔ بطور قصہ 1857 کے واقعات کو خواجہ حسن نظامی اور عبداللہ فاروقی نے (بہادر شاہ کا فسانۂ غم) لکھا ہے۔ حیرت انگیز طور پر سرشار اور شرر کے یہاں 1857 کا ذکر نہیں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دامن بچا رہے ہوں۔

کہانیوں میں پریم چند کے یہاں براہ راست 1857 کے حوالے سے کوئی کہانی نہیں ہے لیکن جگنو کی چمک میں مہارانی چندن کور کا ذکر ہے جو رانا جنگ بہادر کے یہاں نیپال چلی گئی تھیں۔ لیکن اس سے الگ ہٹ کر اور کوئی

تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ قرۃ العین حیدر نے بہت باقاعدہ طور پر 'کار جہاں دراز ہے' میں ان مجاہدین کا ذکر کیا ہے جو سر بلند ہونے جا رہے تھے یا ہوئے تھے۔ دور حاضر میں انتظار حسین نے 1857 کو آرکی ٹائپ بنا کر پیش کیا ہے۔

ڈراموں میں بہت سے ڈرامے 1857 کو موضوع بنا کر لکھے گئے تھے جن میں پروفیسر مجیب کا 'آزمائش' سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ لیکن یہ تمام اصناف اپنی جگہ پر، مگر اس ضمن میں غالب کی اولیت اور کارکردگی واقعی غالب ہے۔ اگر اس نے شاعری میں:

بس کہ فعال مایرید ہے آج — ہر سلح شور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ایسے شعر کہے تو نثر میں اپنے مکتوب کے ذریعے سے اس نے ایک دستاویز چھوڑ دی ہے جو ادبی شاہکار بھی ہے اور تاریخ کے لئے بے حد اہم، مصدر اور ماخذ کی حیثیت بھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''غدر کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے تھے غالب کو ان کا احساس تھا۔ اپنے ہم وطنوں کی پامالی اور شہر کی ویرانی کا تذکرہ غالب کے یہاں ملتا ہے بڑا ہی دردناک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے دہلی کے بعض دوسرے شعرا کی طرح کوئی شہر آشوب یا طویل نظم نہیں لکھی لیکن ان کے خطوط میں دہلی اور اہل دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو اہم تفصیل ملتی ہے غدر کا کوئی بھی مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔''[1]

میر مہدی مجروح کو اپنے ایک خط لکھتے ہیں:

''میں جس شہر میں ہوں اس کا نام دلی اور محلّہ کا نام بلی ماران کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔''[2]

غدر کے بعد دہلی سرکار کے حکم سے جو مسماری ہوئی ان کے بارے میں ایک اور خط میں ان ہی کو لکھتے ہیں۔

''جامع مسجد راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو مکان ہو جائے۔''[3]

غدر کے بعد دلی کا حال اپنے دوست عبدالغفور کے خط میں یوں لکھتے ہیں:

''بڑے بڑے نامی، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار، کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے .... برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ وکلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے غلہ گراں ہے موت ارزاں ہے۔ میوے مول اناج بکتا ہے۔''[4]

1857 میں اودھ کی تاریخ کس طرح تبدیل ہوتی ہے۔ اودھ کی خود مختار ریاست تاریخ کے صفحات سے مٹ جاتی ہے۔ اپنے ایک دوست غلام حسین قدر بلگرامی کو اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''اب ملاحظہ فرمائیں! ہم اور آپ کس زمانہ میں پیدا ہوئے... تباہی ریاست اودھ نے باآنکہ بیگانہ محض ہوں مجھ کو اور بھی افسردہ کیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔''[5]

یا مہاراجہ الور کے اختیارات جو 1857 کے غدر میں انگریزی سرکار نے چھین لئے تھے اور پھر کچھ دنوں بعد یہ سننے میں آ رہا تھا کہ وہ پورے اختیارات کے ساتھ بحال ہو جائیں گے۔ اس ضمن میں غالب اپنے ایک اور خط میں غلام حسین قدر بلگرامی کو یوں لکھتے ہیں:

''تمام عالم کا ایک سا الم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضہ قدرت میں رکھا آدمی کو بدنام کیا ہے۔''[6]

یہ اور اس طرح کے ان کے تمام خطوط غدر کے بعد کی، ملک کی تاریخ بن جاتے ہیں جو ملک وقوم کی تباہی و بربادی کا نقشہ تاریخ کے باب کی طرح پیش کرتے ہیں۔ یہ غالب کے سحر کارانہ اسلوب کا کمال ہے کہ ایک وہ پہلو جو صرف شخصی اور ذاتی ہوا کرتا تھا تاریخ کا ایک اہم جز تو بن ہی گیا آنے والے دور کے لئے ایک نئی صنف کی راہیں بھی ہموار کر گیا۔ آج صرف اردو ہی نہیں انگریزی میں بھی خطوط شائع کرنے کا عام رواج ہے۔ بڑے سیاسی رہنما ہوں یا ادیب یا مذہبی رہنما ہوں۔ یا ان کے درمیان مذاکرات ہوں۔ ان سب کے مکاتیب شائع ہو رہے ہیں۔ آج جو غبار خاطر پر یہ بحث ہو رہی ہے کہ اسے مکاتیب کی صنف میں رکھا جائے یا یہ انشائیے ہیں۔ حالانکہ غالب نے مکاتیب سے الگ ہٹ کر 'دستنبو' میں اور زیادہ تفصیل سے واقعات غدر لکھے ہیں اور اس کا ترجمہ بھی اردو میں شائع ہو چکا ہے مگر بہر حال چونکہ کتاب بنیادی طور پر فارسی میں ہے اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن مکاتیب میں ہی غالب کے معنی خیز اشارے 1857 کے واقعات کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔

اس طرح 1857 جہاں ہندوستانی تاریخ کے لئے بے حد اہم ہے وہیں اردو ادب کے لئے بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے نئی اصناف سے متعارف کرایا۔ متداول اصناف کو نئی روشنی دی اور اردو نثر کو نئے انداز فکر سے روشناس کرایا۔

حواشی: 1۔ غالب نمبر نئی دہلی جنوری 1981 صفحہ 30:2۔ اردو معلی صفحہ 58:3۔ اردو معلی صفحہ 137:4۔ ایضاً صفحہ 103:5۔ ایضاً صفحہ 403:6۔ عود ہندی صفحہ 93 OO

داستانِ جنوں

جنگِ آزادی اور اردو ڈراما

محمد تاتار خان

■

انگریز ہندوستانیوں میں دہشت وخوف کا ماحول پیدا کرتے رہے مگر دوسری طرف ان تمام وسائل سے کام لے رہے تھے جن سے عوام ان کی حکومت کو بہتر سمجھ کر قبول کرلیں۔ ان ہی میں ایک وسیلہ ڈراما بھی تھا۔ چنانچہ متھرا کے انگریز کلکٹر نے اپنے پیشکار بھگوتی پرساد سے 'سبز پری' نام سے کھیل تیار کروایا۔ جس میں انگریزوں کی خوب مدح سرائی اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ انگریز حکومت کتنی بہتر ثابت ہوسکتی ہے۔ مگر ڈرامے کا ردِ عمل یہ ہوا کہ کسی نے بھگوتی پرساد کو گولی ماردی۔ اس سے اردو ڈرامہ نگاروں نے یہ سبق لیا کہ ڈرامے کے ذریعہ سیاسی مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں اور یہ عمل پروپیگنڈہ کے لئے ہتھیار ثابت ہوگا۔

■

جنگ پلاسی میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کی شکست، اودھ میں واجد علی شاہ کی معزولی اور دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری یہ تین ایسے بڑے المیے واقع ہوئے تھے جو ہندوستان کی تاریخ کو تہس نہس کردینے کے برابر تھے اور ان المیوں کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا۔ 1857 میں انگریزوں نے فوجی غلبہ حاصل کرنے کر کے اقتدار پر قبضہ تو کرلیا مگر وہ عوام کے دلوں کو نہ جیت سکے۔

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں ہر مذہب، ہر قوم ونسل اور مختلف زبانوں کے ماننے والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان پر انگریز حکومت ظلم کرے گی۔ سزائیں دیں گی جیل بھجوائے گی۔ پھانسی کے پھندے پر لٹکادے گی۔ باوجود اس کے ان کے جوش وخروش میں کمی نہیں آئی۔

محمد علی جوہر نے کہا "میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ دینا ہوگا یا میری قبر کے کے لئے جگہ دینی ہوگی" جبکہ ان کی والدہ محترمہ نے کہا "بیٹا وطن کی آزادی اور خلافت پر اپنی جان لٹادو"۔

شیخ الہند محمود الحسن نے یوں فرمایا "مرنے کا مجھے کچھ غم نہیں ہے۔ غم تو اس بات کا ہے کہ میں بستر مرگ پر مر رہا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں میدان جہاد میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کرتا۔"

اشفاق اللہ خاں کو 1927 ٹرین ڈکیتی میں پھانسی سزا مقرر ہوئی۔ ان کی آخری آرزو پوچھی گئی تو فرمایا۔

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سے خاکِ وطن کفن میں

اشفاق اللہ خاں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اے میرے ہم وطنوں، ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا سندھی یا آسامی تم سب ایک

جان ہو تمہارا ملک ایک ہے اور ہمارا دشمن ایک ہے اور ہم سب کا مقصد بھی ایک ہے۔ خدارا آپس میں مل جل کر رہو، ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یاد رکھو کہ غلاموں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ان گورے آقاؤں کو بتادو کہ ہم ہندوستانی غلامی کا مطلب جان چکے ہیں۔ گھبراؤ نہیں بہت جلد آزادی کا تابناک سورج نکلنے والا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مادرِ وطن پر قربان ہو رہا ہوں، میرا آخری سلام لو اور میرے مقصد کو پورا کرو۔''

آزادی کی لڑائی میں لکشمی بائی جو جھانسی کی رانی کے نام سے شہرت رکھتی ہیں شہید ہو گئیں، تانتیا ٹوپے کو پھانسی دی گئی۔

حسرت موہانی نے ایک اخبار 'اردوئے معلیٰ' جاری کیا اس میں انگریز کے خلاف مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ان مضامین میں انگریزوں کی سازشوں اور سیاسی رویوں پر آزادانہ لکھا جاتا تھا۔ انگریز حکومت نے اخبار اور حسرت موہانی پر مقدمہ دائر کرتے ہوئے نہ صرف پانچ سو روپے کا جرمانہ عائد کیا بلکہ دو سال کی قید بھی ہوئی۔

مولانا ابوالکلام کی جانب سے شائع ہونے والے پرچے 'الہلال' اور 'البلاغ' کو انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں ضبط کر لیا۔ غالب کے خطوط میں بھی انگریزوں کے مظالم کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

منشی پریم چند کے افسانوں کے مجموعہ 'سوزِ وطن' کا بھی یہی حال ہوا۔ شعرا حضرات کے قلم اور زبان پر پابندی لگادی گئی۔ ان تمام پابندیوں کے باوجود بھی ہندوستان کی آزادی کے متوالوں میں جوش و خروش جاری رہا۔

انگریز ان ہی مکارانہ چالوں سے ہندوستانیوں کی زندگیوں کو برباد اور وحشت و خوف کا ماحول پیدا کرتے رہے مگر دوسری طرف ان تمام وسائل سے کام لے رہے تھے جن سے عوام ان کی حکومت کو بہتر سمجھ کر قبول کر لیں۔ ان ہی وسائل میں ایک وسیلہ ڈراما بھی تھا۔

چنانچہ متھرا کے انگریز کلکٹر نے اپنے پیشکار بھگوتی پرساد سے 'سبز پری' نام سے کھیل تیار کروایا۔ جس میں انگریزوں کی خوب مدح سرائی کی گئی تھی۔ اس ڈرامے کے پس پردہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ انگریز حکومت کے بنائے ہوئے اصول اور کارکردگی کے پیمانے کتنے بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔

مگر اس ڈرامے کا ردعمل یوں ہوا کہ کسی نے بھگوتی پرساد کو گولی ماردی۔ اس سے اردو ڈرامہ نگاروں نے یہ سبق ضرور لیا کہ ڈرامے کے ذریعہ سیاسی مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں اور یہ عمل پروپیگنڈہ کے لئے ہتھیار ثابت ہوگا۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد عام طور پر مایوسی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جنگ آزادی کے ان مجاہدین کو نہیں بھولے تھے جنہوں نے اپنا سب کچھ حتیٰ کہ جانیں تک قربان کر دی تھیں۔ کاذب نے ایک ڈراما 'ماتمِ شاہ ظفر' کے نام سے لکھا جس میں انگریزوں کے ظلم و ستم کو پیش کیا گیا۔ اس طرح جھانسی کی رانی پر متعدد ڈرامے لکھے گئے۔ جھانسی کی رانی ایسی دلیر خاتون تھیں جنھوں نے بڑی جواں مردی سے انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس ڈرامے میں اس کی حوصلہ افزائی، ہمت اور آزادی کے لئے جدوجہد کو پیش کیا گیا۔

انگریزوں کے نزدیک بڑے سے بڑے ہندوستانی کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور وہ ہر ہندوستانی کو اپنے سے کمتر درجہ کی شے سمجھتے اور ذلیل کیا کرتے تھے۔ انہیں ہندوستانیوں کی عزت اور وقار کا ذرہ برابر بھی لحاظ نہیں تھا۔ ایسے میں امراؤ علی نے ایک ڈراما 'البرٹ بل' لکھا۔ اس ڈرامے میں یہ بتایا گیا ہے کہ گپتا بابو جو بار ایٹ لا ہیں مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز کئے جاتے ہیں لیکن انگریز ان کی بے عزتی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی کیفیت اور ذہنی تناؤ سے مایوس ہو کر وہ چھٹی لے لیتے ہیں۔ اردو میں اس نوعیت کا یہ پہلا ڈراما تھا جس میں اپنے حقوق کے لئے قانونی لڑائی لڑتے ہوئے دکھلایا گیا تھا۔

ونائک پرشاد طالب نے اپنے ڈرامے 'نگاہِ غفلت' عرف 'بھول میں بھول کانوں میں پھول' میں بڑے ہی شگفتہ انداز میں انگریز حکومت کی پالیسیوں جیسے لائسنس اور ٹیکس وغیرہ پر کھلے انداز میں طنز کیا ہے۔

نقوی صاحب کے ڈرامے 'ور بچہ' میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مزدور کے چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک کھڑکی ہے۔ جس سے روشنی آتی ہے اور بچے اور کھڑکی میں آسمان پر بادلوں سے نئی نئی شکلیں بنتے بگڑتے دیکھتے اور خوش ہوتے ہیں۔ گویا بچوں کی تفریح کا ذریعہ ہی وہ واحد کھڑکی ہے۔ لیکن انگریز نئے قانون کے ذریعہ اس کھڑکی کو بند کروادیتے ہیں۔ اس سے بچے نہ صرف تفریح سے محروم ہو جاتے ہیں بلکہ کمرہ بھی تاریک ہو جاتا ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک ڈراما 'کھڑکی' ہے جسے ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے نے بنگالی زبان میں لکھا اور شاہد احمد دہلوی نے ترجمہ کیا ہے۔ انگریز حکومت روشنی پر ٹیکس لگا کر کھڑکی کے شیشوں کو کالا کر دیتی ہے۔ مزدور اس پر احتجاج کرتے ہیں اور کھڑکی کو توڑ ڈالتے ہیں۔

لارڈ کرزن 1892 میں ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے ان کے طمطراق میں ایک منظوم شکل میں ڈراما 'کرزن سبھا' نام سے لکھا۔ اس کا انداز امانت لکھنوی کی 'اندر سبھا' کا سا تھا، جس کا

اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے:

اندر سبھا، امانت لکھنوی: سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
کرزن سبھا، اکبرالہ آبادی: سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے
اندر سبھا: معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
کرزن سبھا: ہوں نار سے معمور حکومت سے بھری ہوں
اندر سبھا: دھانی میری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں
کرزن سبھا: ذریں مرا دامن ہے میں اقبال پری ہوں

حافظ عبداللہ نے 'پولس ڈراما' نام سے ایک ڈراما تحریر کیا تھا۔ اس ڈرامے کی وجہ تصنیف اس طرح ہے کہ ایک انگریز پولیس سپرنٹنڈنٹ کی بیوی حافظ محمد عبداللہ کی کمپنی میں شراکت دار بننا چاہتی تھی۔ چونکہ حافظ ایک خوددار انسان تھے اور اپنی زندگی میں انگریزوں سے کافی تکالیف اٹھائی تھیں اس شراکت سے انکار پر انگریز پولیس سپرنٹنڈنٹ برہم ہوگیا اور موقع پا کر حافظ کی کمپنی کو آگ لگادی۔

تب حافظ نے نئے سازوسامان کے ساتھ ڈرامے پیش کرنا شروع کیا۔ اس ڈرامے میں انگریز پولیس اور اس کے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے نہ صرف یہ بلکہ انگریزی حکومت کی لوٹ کھسوٹ اور ظالمانہ رویہ کا پردہ فاش کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک انگریز ہندوستان میں رہیں گے ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

پنڈت سدرشن نے 'آنریری مجسریٹ' نام سے ڈراما لکھا جس میں بتایا گیا ہے کہ حکومت ان پڑھ اور جاہل لوگوں کو آنریری مجسریٹ مقرر کردیتی ہے جو قدم قدم پر اپنی جہالت اور حماقت کا ثبوت دیتے ہیں۔ انگریزوں کا کہنا تھا کہ چونکہ سابقہ حکومتوں نے ہندوستانیوں کو کوئی قانون نہیں بتایا۔ اس لئے وہ قانون کے ذریعہ ہندوستانیوں کو انصاف دلانا چاہتے ہیں۔

اسی پس منظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شہنشاہ حسین نے اپنے ڈرامے 'دفعہ 144' میں ثابت کیا کہ یہ قانون ایک موم کی ناک کی طرح ہے جسے جب چاہے، جدھر چاہے موڑ لیا جاسکتا ہے۔

ایک طرف تو ڈراموں میں انگریزوں کی زیادتیوں ناانصافیوں اور مظالم کا پردہ فاش کیا جارہا تھا تو دوسری طرف ایسے ڈرامے لکھے جارہے تھے جن کے ذریعہ ہندوستانیوں کے احساس کمتری کو ختم اور انہیں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار کیا جاسکے۔

مولانا ظفر علی خان نے 1905 میں 'جنگِ روس و جاپان' نام سے ڈراما لکھا۔ اس ڈرامے میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح جاپان ایک چھوٹا ملک ہوتے ہوئے بھی روس جیسے بڑے ملک کو شکست دیتا ہے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ ہندوستانی بھی انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال سکتے ہیں۔

اختر شیرانی نے 'ملعون پیمبر' نام سے ڈراما لکھا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک عیاش اور ظالم بادشاہ، ایک قحط زدہ ملک پر اپنے ظلم ڈھاتا ہے جب کہ اس کے ملک کے عوام بھوکوں مررہے ہیں۔ 'عزک' نامی ایک شخص بادشاہ سے چند سوالات کرتا ہے اور بادشاہ سے خاطر خواہ جواب نہ ملنے پر عوام کو حکم دیتا ہے کہ وہ بادشاہ کا جمع کیا ہوا غلہ لوٹ لیں۔ اس ڈرامے میں بھی ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

آغا حشر کاشمری نے 'رستم وسہراب' کے نام سے ڈراما تحریر کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ حب الوطنی کے جذبہ پر عوام وخواص کی نگاہ مبذول کروائی ہے بلکہ وطن کے لئے قربانی اور آزادی کے لئے جدوجہد کا ایک پیغام دیا ہے۔ 'رستم وسہراب' میں گرد آفرید (ایک کردار) کا ایک ایک جملہ ملک کی آزادی کا پیغام ثابت ہوتا ہے:

"بہادرو! سہراب اس دنیا میں دنیا سے علاحدہ کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح مٹی پانی سے بنا ہوا انسان ہے، وہ بھی تمہاری طرح اپنی زندگی اور موت سے بے خبر ہے۔ اس لئے تنکے کو پہاڑ اور پہاڑ کو آسمان سمجھ کر اپنی طاقتوں کو حقیر نہ سمجھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔ مست ہاتھی کی طرح جھوم کر، آندھی کی طرح جھلا کر، بادل کی طرح گرج کر، پُر غیظ بجلی کی طرح تلوار کھینچ کر حفاظتِ وطن کے لئے اٹھو۔"

گرد آفرید کی یہ آواز سارے ہندوستانیوں کی آواز تھی جو انگریز حکومت کے خلاف نبرد آزما تھے۔

مذکورہ بالا مصنفین کے علاوہ بھی کئی ایسے ڈراما نگار تھے، جنھوں نے اپنے ڈراموں میں وطن کی آزادی اور انگریزوں کے ظلم وبربریت کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ ان میں چند ایک نام قابل ذکر ہیں:

مظفر حسین اظہر دہلوی (بیداری) کشن چند زیبا (قومی تلوار) نذیر رضوی (حب وطن) احمد شجاع پاشا (وطن کے لئے) صدیقہ بیگم سیوہاروی (سرخ سویرا) وغیرہ۔

آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ غدر کے پس منظر میں محمد مجیب نے 'آزمائش' اور منجو قمر یدالہی نے 'بہادر شاہ ظفر' لکھ کر یاد دلایا کہ کس طرح انگریزوں نے مغل شہنشاہ ظفر اور ان کے خاندان پر ظلم ڈھائے تھے۔ یہ دونوں اردو کے شاہکار ڈراموں میں شامل ہیں۔ OO

دلّی کی آخری بہار

علامہ راشد الخیری

اسّی نوّے سال پہلے ہندوستانی مسلم خواتین کے ذہنوں کو 'عصمت' جیسے مقبول ماہنامے کی اشاعت سے برسوں تک روشن کرتے رہنے اور اپنے حزنیہ اندازِ بیان سے دلوں کو تڑپا دینے والے علامہ راشدالخیری کو اردو ادب کیسے بھول سکتا ہے۔ ان کے بیان میں وہ سوز اور درد تھا کہ حالی کو مصورِ فطرت کہا گیا تو وہ مصوّرِ غم کہلائے۔ 1857ء کے بعد کی دہلی سے متعلق ان کے غم انگیز مضامین گویا اس ناکام انقلاب کا مرثیہ ہیں، جسے لوگ آج بھی نم آنکھوں سے پڑھتے اور آہ بھرتے ہیں۔ منظوم مراثی میں جو مرتبہ دبیر و انیس کو حاصل ہے، نثر کے رثائی ادب میں یقیناً وہی درجہ علامہ راشدالخیری کا ہے۔ ان کی تصانیف 'آمنہ کا لال' اور 'سیدہ کا لال' اس کی دلیل ہیں۔

علامہ کے فرزند اور 'عصمت' کے مدیر رازق الخیری نے 'دلّی کی آخری بہار' کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

"...(1857ء کے بعد کے حالات اور) اس انقلاب کا علامہ مغفور کی طبیعت پر بہت گہرا اثر پڑا، اور انھوں نے جہاں آباد کے متعدد مرثیے لکھے۔ کون سی آنکھ ہوگی جس نے 'وداعِ ظفر' اور 'بیلہ میں میلہ' میں بربادیٔ دہلی کے افسانے پڑھ کر دو آنسو نہ گرائے ہوں۔ ان تصانیف کے علاوہ علامہ مغفور نے متعدد مضامین میں بھی جہاں آباد کے دورِ گذشتہ کی بہار دکھا کر ہزاروں درد مند دلوں کو تڑپایا تھا۔" 'دلّی کی آخری بہار' مطبوعہ علیمی پریس دہلی، جنوری 1937

یہاں علامہ کی چند یادگار تحریریں غدر کے بعد کی دہلی کے احوال کے تعلق سے پیش ہیں۔

بہادر شاہ کی بھانجی نند کے قدموں پر

آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک معاشرت انسانی کی مختلف صورتیں رہی ہیں جس طرح ہر ملک اور ہر قوم کی زبان میں آسمان زمین کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی معاشرت بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ یہ افتراق کچھ تعجب انگیز نہیں رونے یا ہنسنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم وقت کے تحت میں حالات کے اعتبار سے ایسا چولا بدلے کہ سفیدی سیاہی نظر آنے لگے اور سیاہی سفیدی۔

ہندوستان کی موجودہ اسلامی معاشرت کا مقابلہ اگر اس صدی کی ابتدائی حالت سے کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو جائے گا کہ نسوانی تمدن کس سرعت کے ساتھ کینچلی بدل رہا ہے اور پرانی باتیں روز بروز مردود ہو رہی ہیں، اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ قدیم روایات کی حمایت میں منہ سے بھاپ نکالنی بھی گناہ عظیم ہے۔ یہی ہیں وہ اسباب جو اب مجھ کو کچھ لکھنے کی اجازت نہیں دیتے اتفاق سے اسی ہفتہ میں مجھے ایک ڈپٹی صاحب کے ہاں شادی میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ میں ان چیزوں سے اب بہت دور رہتا ہوں، لیکن مجبور ہو گیا اور صرف چند منٹ کے واسطے چلا گیا واپسی پر رفعت آرا بیگم کی شادی یاد آ گئی آج یہ کہنے کی ہمت نہیں ہے کہ خوبیوں سے لبریز وہ شادی تھی یا یہ۔ جو دیکھا وہ لکھتا ہوں۔ فیصلہ پڑھنے والوں پر ہے۔

رفعت زمانی بیگم بادشاہ کی ماموں زاد بہن محمد زمانی بیگم کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد سلطان دولہا نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ یہ 1857 کی باتیں ہیں۔ میری عمر آٹھ نو سال کی ہوگی۔ مہینہ میں ایک یا دو دفعہ میرے دادا مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم جو دونوں میاں بیوی کے استاد تھے، ان کے پاس نظام الدین میں جہاں ان کی مستقل سکونت تھی جاتے رہتے تھے۔ میں بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ رفعت زمانی کی عمر جہاں تک

مجھ کو یاد ہے تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ کبھی ہم ان کے ہاں گئے ہوں اور دونوں میاں بیوی نے مولوی صاحب سے بچی کی شادی کے متعلق فکر نہ ظاہر کیا ہو۔ ایک سم تھا کہ دونوں کے سر پر سوار تھا۔ اور ان کا یہ کہنا یقیناً صحیح تھا کہ رات کی نیند اور دن کی بھوک اڑ گئی تھی، رفعت کی شادی کے سوا ان کے سامنے کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ ان کے پاس مختلف حیثیت کے پیام تھے۔ اور ان ہی کو وہ مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیتی تھیں اور ان کے ساتھ ہی اپنی رائے اور سلطان دولہا کی رائے بھی بیان کر دیتی تھیں۔

میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تمدن موجودہ کا قدامت پر یہ زبردست حملہ ہے کہ لڑکیاں شادی کے معنی سمجھنے سے قبل نکاح کے چولہے میں جھونک دی جاتی تھیں۔ یہ کہہ دینا مشکل نہیں ہے، مگر یہ غور کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ اس طویل بحث کی تہ میں جو چیز مجھ کو صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ کنواری لڑکی کو ایک بیش بہا جوہر اور اپنے تئیں امین سمجھتے تھے اور اس جوہر کی قیمت ان کی نگاہ میں اس قدر تھی کہ وہ اس کو ہوا لگنے کے احتمال سے بھی محفوظ رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میں اس پر بحث کرنی نہیں چاہتا کہ یہ احتیاط صحیح تھی یا غلط۔ مگر مطعون کرنے سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ محمد زمانی بیگم کی خواہش یہ تھی کہ لڑکے میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ بدمزاج نہ ہو، جھوٹ نہ بولتا ہو، اور اسے روٹی کھلا سکے۔ انھوں نے برادری کا ایک اچھا پیام صرف اس لئے رد کر دیا کہ لڑکا کبوتر باز تھا حالانکہ سو روپے ماہوار وظیفہ تھا اور اڑتالیس روپے ماہوار کی آمدنی کو اس واسطے منظور کر لیا کہ لڑکا رحم دل نمازی اور نیک تھا۔ مولوی صاحب بھی اس رائے سے متفق ہوگئے اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔

مجھے جو خاص بات اس وقت کہنی ہے وہ یہ ہے کہ جس شادی نے مجھے یہ لکھنے پر آمادہ کیا اور جہاں میں کھانے پر مدعو تھا وہ وسیع پیمانہ پر تھی، اور دستر خوان پر پچاس کے قریب مہمان تھے لیکن قریب قریب یہ سب غیر تھے۔ عزیزوں میں سے گنتی کے دو تین آدمی تھے صاحب خانہ کے حقیقی بھائی جو مفلس تھے ان کے خاندان کا کوئی فرد مجھے نظر نہ آیا۔ ہاں دولہا میاں کے ہم جماعت اور ان کے والد کے دوست کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ معزز عہدہ دار ہیں اس لئے محفل ان ہی کے رنگ کی تھی۔ میں اسی شام کو اتفاق سے ان کے بھائی سے ملا تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس رقعہ بھی نہیں گیا۔

یہ 1933 کی شادی ہے جہاں غریب بھائی اس واسطے نہیں پوچھا گیا کہ مفلس ہے! اس کے بچے اس دستر خوان پر اور اس کی بیوی اس مجلس میں شریک ہونے کے قابل نہ تھی۔ رفعت زمانی بیگم کی شادی 1875ء میں ہوئی اور اٹھاون برس میں مسلمانوں کی معاشرت کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔

محمد زمانی بیگم کی حقیقی نند جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔ سیتارام کے بازار میں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر آصف مرزا کو جو کچھ ملتا تھا وہ ان کے اخراجات کو کافی نہ تھا۔ بچے بہت سے تھے اس لئے مشکل سے گذر ہوتی تھی۔ ان کا بڑا لڑکا اعظم بھی جوان تھا۔ دونوں باپ بیٹے دن رات مچھلی کے شکار میں رہتے۔ رات کو آٹھ نو بجے گھر میں گھسے اور صبح نماز کے وقت دریا پر جا پہنچے کسی موقعہ پر دونوں نند بھاوجوں کی لڑائی ہوئی اور اس لڑائی نے ایسا طول کھینچا کہ ملنا جلنا، آنا جانا سب بند ہوگیا۔ سلطان دولہا بھی کبھی بہن کے ہاں نہ جاتے۔ اس موقعہ پر جب رفعت کی تاریخ مقرر ہوگئی تو ایک روز مولوی صاحب نے محمد زمانی بیگم سے کہا کہ "یہ تو کہئے کہ نند کو بلاوا دینے کون جائے گا؟"

محمد زمانی: "جس کو آپ فرمائیے"

مولوی صاحب: "تم کو خود جانا چاہئے"

محمد زمانی: "مجھے ان کے ہاں گئے دو سال ہوگئے وہ بھی اس عرصہ میں نہ خود آئیں، نہ ان کا کوئی بچہ آیا۔ سنتی ہوں کہ انھوں نے قسم کھالی ہے اور بچہ کو وصیت کر دی ہے کہ سلطان بھائی کو میرے جنازہ پر بھی نہ آنے دیں۔"

مولوی صاحب: "تو تمہارا ارادہ اب کیا ہے۔ کیا بغیر ان کے لڑکی وداع کروگی۔"

محمد زمانی: "میری تو یہ خواہش نہیں ہے۔ انھوں نے بے خطا مجھے اور اپنے بھائی کو ہزاروں باتیں سنائیں اور ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ میں نے عید پر حصہ بھیجا۔ عیدی بھیجی۔ سویاں بھیجیں۔ لیکن انھوں نے سب واپس کر دیا، اور ہزاروں باتیں سناڈالیں۔"

مجھے اب مولوی صاحب کے الفاظ یاد نہیں۔ البتہ ان کا مفہوم ذہن میں ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں ادا کرتا ہوں۔

میں مان لیتا ہوں کہ تمہارا بیان حرف بہ حرف صحیح ہے اور تم بے خطا ہو اور قصور سرتاسر تمہاری نند کا ہے۔ مگر تم کو یہ ماننا پڑے گا کہ میں تم کو مسلمان سمجھوں اور اس کے بعد تم سے ان تمام حقوق کی ادائیگی کا متوقع ہوں جو اسلام نے تم پر عائد کئے۔ تم کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ آصف دلہن اور سلطان دولہا ایک ہی گھر میں پلے اور بڑھے ان دونوں نے ایک ہی مرنے والی کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے، اور ایک ہی عورت کے دودھ اور گود سے پروان چڑھے۔ کیا اس ماں کے دودھ کا یہی حق ہے کہ سلطان دولہا اور اس خوشی کے موقعہ پر جب خدائے بہتر و برتر ان کو ایک اتنے بڑے فکر سے سبک

دوش کر رہا ہے۔ حقیقی بہن کو جو مرحوم باپ اور مغفور ماں کی نشانی اور یادگار ہے، اپنے گھر پر بھی نہ آنے دیں اور تمہارے دسترخوان پر جہاں مجھ جیسے غیر مکلف کھانوں سے پیٹ بھریں ماجائی اور اس کے بچے قطعاً محروم رہیں۔ محمد زمانی! یہ شادی اور اس کی مسرتیں فانی ہیں۔ مگر اس کے اثرات باقی رہیں گے اور اس سے بڑا سنگین واقعہ تمہاری یہ حرکت ہوگی کہ تم سلطان دولہا کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کے عزیزوں کو اس برے طرح دھتکارو کہ ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ ہو۔

میرا خیال اگر غلط نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو تمہارے بیسیوں عزیز امیر اور غریب رفعت کی شادی میں شریک ہوں گے۔ مگر کیا سلطان دولہا جس کا ایک بہن کے سوا کوئی عزیز زندہ نہیں اتنا بھی حق نہیں رکھتا کہ اس کی بہن اور بچے اسی خوشی میں شریک ہوں۔

تم کو اسلام کی یہ تعلیم یاد ہوگی کہ کسی مسلمان کو روا نہیں کہ دوسرے مسلمان کی طرف سے تین دن سے زیادہ اپنے دل میں کدورت رکھے۔ اگر آصف دلہن اس گناہ کی مرتکب ہوئی تو کیا ضرور ہے کہ تم بھی شریک گناہ ہو۔ تم محض خدا کے واسطے جس نے تم کو یہ مبارک گھڑی دکھلائی نفس کو زیر کرو، خودی کو مٹا دو، اور گردن نیچی کرلو۔ دنیا تمہاری تعریف کرے گی اور خدا تم سے خوش ہوگا۔ اور جب تم نند کے غصے اور فضیحتی پر بھی ان سے شرکت کی التجا کروگی تو وہی نفس جو بھڑک کر آگ لگائے گا کسی نہ کسی وقت تمہارے کان میں مرحبا کہے گا اور تم کو وہ خوشی نصیب ہوگی جو رفعت کی شادی سے زیادہ پائیدار ہے۔

مولوی صاحب کی تقریر سے محمد زمانی بیگم اور سلطان دولہا اس قدر متاثر ہوئے کہ دونوں میاں بیوی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے ہم دونوں بھی ساتھ تھے۔ بچی کی شادی کا نام سنتے ہی آصف دلہن اچھل پڑیں۔ بھاوج کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور لپٹ کر رونے لگیں۔ محمد زمانی بیگم نہایت رقیق القلب عورت تھیں۔ نند کا یہ طرز عمل اس قدر مؤثر تھا کہ انھوں نے فوراً بھاوج کے قدم پکڑ لئے۔ اور دونوں نند بھاوجیں دیر تک روتی رہیں۔ سلطان دولہا نے دونوں کو الگ کیا۔ اور پانی پلایا، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور آصف دلہن شوہر اور بچوں سمیت نظام الدین گئیں۔

رفعت کی شادی کا یہ واقعہ لکھنے کے بعد اب میں اپنے معزز دوست ڈپٹی صاحب سے جن کے ہاں شادی میں شریک ہوا۔ اس قدر عرض کروں گا کہ وہ غور فرمائیں، اور سوچیں کہ ان منوں کھانے میں غریب بھائی اور بھاوج شرکت سے کیوں محروم کئے گئے۔ کیا یہ بھائی اس گود کا بچہ نہیں ہے، جس میں آپ نے پرورش پائی، اور کیا آپ کی بیگم صاحبہ جو میری ہی ہم عمر ہیں یہ یاد فرمالیں گی کہ مرنے والے بہو کو ہزار برس کی نیو کہتے تھے۔ کیا ڈپٹی صاحب کی والدہ ہزار برس کی نیو سے جس پر خاندانی عمارت تعمیر ہوگی یہی توقع رکھتی تھیں کہ جس روز آپ کے نوکر بریانی مُتَنجن سے پیٹ بھریں اس وقت آپ کے حقیقی بھائی اور اس کے بیوی بچے اپنے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں سوکھی روٹیاں کھائیں۔ عصمت 1933

تیراکن اماں

جہاں آباد میں غدر کے بعد کا ابتدائی دور ایسا گذرا ہے کہ آج بھی اس کے خیال سے کلیجہ تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ دن جب بے گور و کفن مردے چاروں طرف سسک رہے تھے ختم ہو چکے تھے اور وہ راتیں جب زندوں کے نالے مردوں کو تڑپا رہے تھے گذر چکی تھیں مگر اب ان مصیبتوں کی یادگار ایک دوسرے رنگ میں قیامت بپا کر رہی تھی سونے چاندی میں کھیلنے والے ہاتھ دو دو دانوں کو محتاج تھے اور جن کے گھروں سے لنگر تقسیم ہوتے تھے ان کا پیٹ دوسروں کے رحم پر بھرتا تھا۔ آزردہ نے اس انقلاب کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

سنگ سینہ سے اٹھایا تو سرہانے رکھا
ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا

جس طرح آج کل مسلمان عورتیں رات کے وقت پارکوں یا اور دوسرے مقامات پر سیر و تفریح کے لئے نکل جاتی ہیں اسی طرح اس وقت مصیبت کی ماری فاقہ زدہ عورتوں کے جھلو عشا کی نماز کے بعد جامع مسجد پر اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑے، چاروں طرف پھرتے بھیک مانگتے دعائیں دیتے اور اپنی کیفیت سنا کر پیٹ بھرتے۔ کھاری باؤلی والے صوبہ دار اشرف خان دومن کی خمیری روٹی اور چنے کی دال کا بھرتہ نماز کے بعد تقسیم کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر دوسرے ذی استطاعت مسلمان بھی ایسا کرتے تھے اور اس طرح ان بدبختوں کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ ان میں بیسیوں اللہ کی بندیاں ایسی بھی تھیں جن کو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اس کے سوا کچھ میسر نہ آتا تھا۔

خدا کی مخلوق میں جس طرح صورتوں کے اعتبار سے مختلف شکلیں ہوتی

ہیں اسی طرح عادت و خصلت کے اعتبار سے بھی طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہرے بھرے صاحب کے مزار کے پاس جہاں اب تو چوک کی وجہ سے میلہ لگا رہتا ہے۔ اس وقت آبادی زیادہ نہ تھی اور بہت کم آدمی ادھر نظر آتے تھے۔ مزار کے دائیں طرف ایک بی بی سفید برقع میں ہمیشہ دکھائی دیتی تھیں انھوں نے زبان سے کبھی سوال نہ کیا صرف ان کا ہاتھ برقع سے باہر ہوتا تھا۔ یہ تیرا کی کے استاد خلیفہ رحیم کی بیوی تھیں۔ کسی زمانے میں ان کا دور دورہ تھا اور پیر جی محمد عمر صاحب جو اُن کے پڑوسی تھے ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے کہ ان کے دستر خوان سے بیسیوں بھوکوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ وقت نے ان کو یہ دن دکھادیا۔ ان بی بی کی خاموشی اور ان کے حالات کا شہر بھر میں چرچا تھا اور سب ان کو تیرا کن اما کہتے تھے۔ پیر جی فرماتے تھے کہ ایسی قانع عورت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے یہ حقیقت بھی تھی اور میں اب بھی جب کبھی ان مٹی ہوئی صورتوں کا خیال کرتا ہوں تو اجڑی ہوئی دلّی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ میں اور میرے ساتھ اور بھی تین چار آدمی تھے رات ہو چکی تھی تیرا کن اما نماز عشا پڑھ کر سڑک پر آ کھڑی ہوئیں اور برقع میں سے ہاتھ نکال دیا۔ مرحوم مرزا محمد اشرف گورگانی کے والد خلیفہ کے شاگرد تھے۔ اس لئے مرزا ان کو نانی کہتے تھے۔ ایک دوانّی نکال کر مرزا نے ان کو دی۔ تیرا کن اما نے بہت سی دعاؤں کے ساتھ وہ دوانّی واپس کر دی اور کہا "پکانے ریندھنے کے قابل نہیں ہوں، آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ کوئی گھر نہیں کوئی در نہیں جہاں جگہ ملی پڑ رہی، ابھی پیٹ بھرنے کو دو روٹیوں کی ضرورت لگی ہوئی ہے۔ یہ مانگ لیتی ہوں، وہ رازق ہے پیٹ بھر دیتا ہے یہ دوانّی تمہارے زیادہ کام آئے گی رکھ لو۔"

مجھے اب بھی جب ان کے الفاظ یاد آتے ہیں تو ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیسی با اصول اور سیر چشم عورتیں تھیں۔ جب مرزا نے زیادہ اصرار کیا تو دوانّی لے لی، اور اس کو بھنا کر وہ پیسے، بچوں کو تقسیم کر دیئے۔

دلّی کی خاک سے جو باکمال پیدا ہو چکے مشکل ہے کہ زمانہ اب ایسی صورتیں دوبارہ دکھائے خدا اپنی رحمتوں کے پھول ان پر نازل کرے۔ عصمت: 1934

اگلے لوگوں کی ایک جھلک

غدر 1857 کی مصیبت نے جہاں آباد پر قیامت ڈھا رکھی تھی۔ کالوں کی عارضی حکومت نے گورے اور کالے کا امتیاز اٹھا دیا تھا۔ گورا اس لئے کہ گوری رنگت رکھتا ہے اور کالا اس لئے کہ باغی ہے واجب القتل ہے۔ امیر اس واسطے کہ دولت والا ہے اور غریب اس لئے کہ مفلس ہے گردن زدنی۔ دین دین کے نعروں نے جن کے استقبال میں ننگی تلواریں صف بستہ حاضر تھیں شہر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ پوربیوں کی حکومت نے، پانی کے بلبلہ کی طرح جس کی مدت حیات ایک دو لحہ سے زیادہ نہیں ہوتی، یا باغ کے اس پھول کی مانند جو اپنی بہار و خزاں ایک رات میں ختم کرتا ہو، علی الصباح بلبل کے لاتعداد نالے اپنے ساتھ لے کر دامن گل چیں میں پہونچ جاتا ہے، گلیوں اور کوچوں میں، محلوں اور سڑکوں پر خون کے پرنالے بہا رکھے تھے۔

میرے جد امجد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور ان کے بہنوئی شمس العلما مولوی نذیر حسین صاحب مغفور محدث دہلوی مسلمانوں کی نگاہ میں اس وجہ سے کافر ٹھہرے کہ ان لوگوں نے جہاد کے فتوے پر دستخط نہیں کئے۔ اب ان کے مدارس و مساجد میں صبح سے شام تک بجائے قرآن و حدیث کے مفسدوں کی گالی گلوج اور نماز و اذان کے بدلے تلواروں اور بلموں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ ایسے نازک وقت میں جب حق و انصاف کا جنازہ نکل چکا تھا۔ دلائل و براہین قبروں میں پہونچ چکے تھے۔ علما کے اس گروہ کا ایمان کو قائم رکھ کر موت کو دعوت دینا ان ہی کا کام تھا۔ چار پانچ روز تک علما کے کفر کا مقدمہ مفسدوں کے سامنے پیش رہا۔ آخر ایک روز چار پانچ آدمی نماز فجر کے وقت مسجد میں داخل ہوئے۔ ادھر مولوی عبدالقادر نے سلام پھیرا ادھر ایک پوربیے نے ان کا ہاتھ جو دعا کے واسطے اٹھ رہا تھا گھسیٹ کر کہا۔

باگی ان کا منڈہ تو ہئیں تیرا منٹا چکا دیں

(یعنی تو ہی باغیوں کا سردار ہے، تیرا پاپ کاٹ دیتے ہیں)

پوربیے کے ہاتھ میں بلم تھا۔ مگر دفعتاً اس کے ہمراہیوں کی آواز باہر سے غل غپاڑے کی آئی اور یہ سب مولوی صاحب کو چھوڑ چھاڑ چلے گئے۔ دن بھر مولانا مرحوم مسجد میں رہے۔ عصر کی نماز پنجابی کٹرہ کی مسجد میں جو ریلوے اسٹیشن کی نذر ہوئی پڑھتے تھے، چنانچہ وہاں تشریف لے گئے اور مغرب پڑھ کر واپس ہوئے۔

اب وہ وقت آتا ہے جس کو سن کر دور حاضرہ سناٹے میں رہ جائے گا اور معلوم ہوگا کہ قرونِ اولیٰ کے نہیں اس گئے گذرے زمانے کے مسلمان بھی حق و صداقت کے معاملہ میں دنیا کی ہر چیز کو ہیچ سمجھتے تھے۔ راستی ان کے گھر کی کنیز اور حقیقت ان کی بال باندھی لونڈی تھی۔ ان کی زندگی ایمان کے سائے

میں گذرتی تھی۔ اوران کی دنیا کے سامنے دین کا تاج زریں ہر وقت جگمگا رہا تھا۔ مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم جوانی کی حدود سے تجاوز کررہے تھے۔ بڑھاپا ان کے شباب کو فنا کر چکا تھا۔ مگر جوانی جیسے بیش بہا جوہر گم شدہ کے آثار ابھی چہرے پر موجود تھے۔ لاہوری دروازے کے پاس انھوں نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی (مولوی نذیر حسین محدث دہلوی بھی ہمراہ تھے۔ راشد الخیری)۔ یہ ایک مظلوم انسان کی صدا تھی جو اس شخص کے کان میں آئی جس کی موت کا اس جرم میں فیصلہ قطعی ہو چکا تھا کہ وہ انگریزوں کی دشمنی میں باغیوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ زخمی کے نالوں نے مولانا کو اپنی طرف کھینچا اور انسانیت کی رہبری قریب لے گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز عورت خون میں شرابور زخموں میں چکنا چور دم توڑ رہی ہے۔ گو تکلیف کی شدت نے دست و پا بیکار کر دیئے ہیں۔ مگر موت کی پیاس پانی کا تقاضا کر رہی ہے۔ ایک بدنصیب زخمی انگریز عورت کے سرہانے ایک مسلمان مرد کا جس کے قتل کا فتویٰ بغاوت کے جرم میں صادر ہو چکا ہے، کھڑا ہونا آسان کام نہ تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ ظالم اگر اڑتی سی خبر سن پائیں گے تو بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔ انسانیت اور ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ جان صداقت پر قربان ہو ایک بے گناہ عورت کی حمایت میں ہر مصیبت راحت اور ہر اذیت مسرت ہوگی۔

میں ارتقا کے اس مسئلہ سے واقف ہوں کہ طاقتور کا کمزور کو فنا کر دینا جائز حق ہے اور اسی کے تحت میں، میں اس واقعہ کو جائز سمجھ رہا ہوں۔ جب ایک مہینے کے قریب ہوا کہ ایک نوجوان سائیکل سوار نے ایک بڈھے کہار کو جس کے کندھوں پر ڈولی تھی اس جرم میں خونم کر دیا کہ گلی تنگ ہونے کی وجہ سے بڈھا جوان کو رستہ نہ دے سکا مگر اس کے ساتھ یہ مجھے شیخ سعدی رحمۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مناجات یاد آئی جس میں شیخ خالق الموجودات کے حضور میں گڑگڑا کر جن چیزوں کا واسطہ دے رہا ہے ان میں جوانوں کی صداقت اور بڈھوں کی اطاعت کا حوالہ ان الفاظ میں دیتا ہے۔

بہ صدق جوانانِ نوخاستہ ‏ ‏ ‏ ‏ بہ طاعات پیرانِ آراستہ

سبحان اللہ سبحان اللہ شباب و ضعیفی کے مدارج کو کس خوبصورتی سے طے فرمایا ہے اور دونوں کیفیتوں کو ملحوظ رکھ کر کیسے بجے تلے الفاظ کہے ہیں۔ واہ واہ جوانوں کی صداقت میں انسانیت کی ہر صفت آگئی۔ ارتقائی فلسفہ درست لیکن انسانیت کی کسوٹی بھی کچھ وقعت رکھتی ہے اور وہی شیخ کے سامنے ہے کاش مسلمان سائیکل سوار اس جوہر سے باخبر ہوتا۔ یہی واقعہ مجھ کو صداقت و طاعت کی طرف لے لیا۔ اور معاً مجھ کو اپنے جدامجد کی یہ حقیقت یاد آگئی جس کو قلم بند کر رہا ہوں۔

رات کے ابتدائی حصہ میں جب دنیائے اسلام کا سرخدائے عزوجل کے حضور میں جھکا ہوا تھا تو مولوی عبدالقادر صاحب ایک انگریز عورت کو کندھے پر لئے گھر میں داخل ہوئے۔ زخمی خاتون سسک رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور جسم کے اکثر حصوں سے خون نکل رہا تھا گھر کی عورتیں اپنے بدنصیب مہمان کی تیمارداری میں مصروف ہوگئیں۔ زخموں کو دھویا بدن صاف کیا۔ پانی اور شربت حلق میں ٹپکا رہے تھے۔ دو بجے دروازے پر دین دین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ اس شخص کا گھر ہے جس کی موت کا مسئلہ صبح ہی طے ہو چکا تھا۔ اور یہ وہ عورتیں ہیں جو دن بھر شوہر اور باپ کی موت کو رو چکی ہیں۔ اور یہ اس شخص کے قتل کی کوشش ہے جو جہاں آباد کو انسانیت کے معنی بتا رہا ہے۔ غریب عورتوں کی جان نکل گئی بھولے اور سیانے بچوں کے ہوش جاتے رہے لیکن مولوی صاحب مرحوم نے استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ باغیوں نے دروازے پر آفت مچادی اور دین دین کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ سوچتے سوچتے مولوی صاحب کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی اور وہ یہ کہ مہمان کو اپلوں کی کوٹھری میں لٹا کر اوپر سے اپلے چن دروازہ کھول دیا۔

رات کے تین بجے رہے ہیں اور چودھویں کا چاند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے کہ پندرہ بیس آدمی مولوی صاحب کے گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ تلواریں اور بلم صاحب خانہ کے سر پر چمک رہے ہیں اور دشمن عورتوں کے سامنے ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ مولانا خاموش ہیں۔ عورتیں اللہ اللہ کر رہی ہیں بچے رو رہے ہیں اور لڑکے حسرت سے باغیوں کا منہ تک رہے ہیں۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ اپلوں کی کوٹھری کھلی اور وہ جفا کار اس میں داخل ہوئے۔ آج کے مسلمان اس کو اتفاق محض سے تعبیر کریں یا وقت سے میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ کس طرح اس کا کرم شامل حال ہوتا ہے۔ خدا کا فضل ایک نہیں پندرہ بیس آنکھوں پر پردہ بن کر پڑا اور چاروں طرف دیکھ بھال کر باغی چیختے پیٹتے واپس ہوئے۔

ہفتہ بھر سے زیادہ ہو چکا زخمی کی دوا نیم کی پتیاں اور غذا مٹکوں کا پانی ہے۔ مگر قدرت کے تماشے دیکھنے کے قابل ہیں۔ حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے زخم بھر رہے ہیں اور دماغ لحظہ بہ لحظہ صحیح ہوتا جاتا ہے۔ باغیوں کا زور بھی ڈھے رہا ہے دین دین کی آوازیں بھی کم ہو رہی ہیں۔ اور شہر کے بڑے حصے پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ سترھواں روز تھا کہ صبح کے وقت مہمان نے میزبانوں سے رخصت طلب کی اور کہا صرف مجھ کو انگریزی کیمپ تک پہونچا دیجئے۔ یہ خواہش بھی کچھ کم خطرناک نہ تھی، مگر اب نسبتاً شہر میں امن تھی۔ قتل وغارت کے واقعات پوری طرح بند نہ ہوئے تھے لیکن وہ بے چینی نہ تھی۔

رات کے آخری حصے میں عورتوں نے اپنے مہمان کو وداع کیا اور مولوی

عبدالقادر صاحب نے اس انگریزی خاتون کو انگریزی کیمپ تک پہونچا دیا۔ جدائی کے وقت میم صاحب نے میزبان سے یہ الفاظ کہے۔

"میں جب تک شہر کی حالت صحیح نہ ہو آپ سے نہیں مل سکتی۔ اور جس وقت تک انگریزوں کا پورا قبضہ شہر میں نہ ہو جائے غالباً کوئی خدمت نہ کر سکوں گی اس عرصہ میں اگر کوئی موقعہ آ جائے اور میری ضرورت ہو تو میرا نام یاد رکھیے گا۔ مسز لیسن مین آپ کے احسانات اور آپ کی معزز مستورات کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتی مجھ کو ہمیشہ یاد رکھیے گا میں اطمینان ہوتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گی۔"

باغیوں کا قلع قمع ہو چکا قلعہ معلیٰ پر انگریزی جھنڈا لہرا رہا ہے اور مفسد اپنے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں روزانہ آٹھ بجے کے قریب کنار جمن پر کوتوالی اور دہلی دروازے کے باہر پھانسیاں ہوتی ہیں، اور منکاف صاحب کے ایک اشارے پر بیسیوں بندگانِ خدا دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں... صاحب مرحوم جن کا نام لینا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا عبدالقادر صاحب کے حقیقی ہم زلف منکاف صاحب کی ناک کے بال اور مخبروں کے سرادہ ہیں۔ ان کی اطلاع پر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم گرفتار کیے گئے اور چار آدمیوں کی زبانی شہادت پر پھانسی کا حکم ہو گیا۔

وہ گھٹا جو کالوں کی بغاوت کا لباس پہن کر آسمان جہاں آباد پر نمودار ہوئی تھی۔ اب اس سے خون کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا خاندان ہوگا جس کے گھر اور در ان چھینٹوں سے محفوظ ہوں۔ رات کے وقت جب ممتا کی ماریوں کے نالے بلند ہوتے تھے تو سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اور صبح کے وقت جب گھونگھٹ کی دلہنوں کے خاموش آنسو بیوگی کی فریاد کرتے تو در و دیوار ان کے ساتھ روتے۔ مصائب کے اس طوفان میں گنہگار اور بے گناہ سب بہہ رہے تھے۔ جہاں اطمینان و مسرت کی ریل پیل تھی وہاں کہرام مچے ہوئے تھے۔ دودھ پیتے بچے بلوں بلوں کرتے اور حسن کی دیویاں دو دو دانوں کو ترستیں۔ مخبروں کا راج اور پھانسیوں کا بازار گرم تھا۔ ہر وقت ست ہی ست پر جان تھی کہ نہ معلوم کب گرفتار ہوں اور پھانسی لگ جائے۔ پھانسی کے پھندے منکاف صاحب کی جیب میں رہتے تھے اور وہ اپنے سامنے درخت میں بندھوا دیتے تھے دو دو مجرم ایک ایک درخت کے نیچے پشت کی طرف مشکیں باندھ کر بٹھا دئے جاتے تھے اور صاحب کے حکم سے پھانسی ہو جاتی تھی۔

آج مولوی عبدالقادر کی پھانسی کا دن ہے۔ صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔ گورا فوج کا معمولی دستہ مسلح کھڑا ہے۔ مدرسہ اور مسجد کے متعلقین خاموش بیٹھے ہیں کہ دو آدمی گھوڑوں پر سوار دلی دروازے کی طرف سے نکلے۔ اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تقدیر تھی یا اتفاق کہ دونوں مجمع دیکھ کر ادھر چلے آئے ان میں ایک میم تھی اور ایک انگریز یعنی مسز لیسن اور مسٹر لیسن۔ مسز لیسن گھوڑا بڑھا کر قریب آئی تو مولوی عبدالقادر کو مشکیں بندھے دیکھا۔ جیب میں سے پنسل نکال کر اپنی ٹوپی پر لکھا "انتظار کرو" ٹوپی درخت پر لٹکا دی، پہرہ دار کو حکم دیا کہ صاحب کو دکھا دینا اور گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ اب نو بج چکے ہیں لوگ متحیر ہیں کہ یہ کیا ہوا اور میم کیا کرے گی۔ منکاف صاحب آ گئے اور مجرم کو پھانسی کے واسطے تیار ہوئے کئی آدمیوں کو پھانسی ہوئی۔ مولوی صاحب کے درخت پر ٹوپی دیکھ کر منکاف صاحب ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ ایک رتھ اور اس کے ساتھ گھوڑے پر میم صاحب آتی ہوئی دکھائی دیں۔ رتھ میں میری دادی صاحبہ یعنی مولوی صاحب کی بیوی جو "بڑی استانی صاحبہ" کے نام سے مشہور تھیں تشریف رکھتی تھیں ان کے ساتھ ان کی لڑکیاں اور بچے بھی تھے جنھوں نے صبح سے رو رو کر خون کر رکھا تھا۔ منکاف صاحب نے میم صاحب کی صورت دیکھ کر ٹوپی اتاری ہاتھ ملایا۔ اور پوری داستان سننے کے بعد اپنے ہاتھ سے مولوی صاحب کی مشکیں کھول کر حکم دیا قاری... مخبر کو حاضر کرو۔ تعمیل میں کیا دیر تھی قاری صاحب ڈرتے ڈرتے اور روتے کانپتے اور ہانپتے حاضر ہوئے۔ صاحب نے اپنے ہاتھ سے ان کی مشکیں باندھ کر حکم دیا اس کو فوراً لٹکا دو۔

جب قاری صاحب پھانسی پر چڑھنے لگے تو مولوی صاحب کی خواہش پر میم صاحب نے سفارش کی اور قاری صاحب اس شرط پر چھوڑے گئے کہ دو سال کے واسطے شہر سے باہر چلے جائیں۔ آج قاری صاحب اور مولوی صاحب دونوں کی ہڈیاں خاک ہو چکیں۔ مگر ان کے اعمال موجود ہیں اور انسانیت کی کسوٹی پر کسے جا رہے ہیں۔

منکاف صاحب نے مولوی صاحب کو رتھ میں بٹھایا اور مسز لیسن کو ساتھ لے کر چھاؤنی روانہ ہوئے۔ شام کو ایک بہت بڑی دعوت ہوئی جس میں مولوی صاحب اور مسز لیسن محفل میں برابر برابر بیٹھے۔ اور منکاف صاحب نے مولوی صاحب کو بہت سے انگریزوں سے ملوایا۔

مسٹر اور مسز لیسن اس کے بعد مولوی صاحب کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ پنشن کے بعد بھی ولایت نہ گئے اور دہلی میں رہ پڑے۔ ہر سال مسز لیسن کے اس واقعہ کی سال گرہ منائی جاتی تھی اور مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا تھا۔

مسز لیسن کی کوٹھی کشمیری دروازے کے باہر تھی اور ہر جمعہ کو دوپہر کا کھانا مولوی صاحب اس کے بچوں کے ساتھ کھاتے۔ میں بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا اور دیکھتا تھا کہ مسز لیسن کس طرح مولوی صاحب کے احسان کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ عصمت 1933

انقلاب تمدن

تڑپ، تڑپ، دل بے قرار تڑپ اور ان صورتوں پر خون کے آنسوؤں سے رو جنھوں نے آبادی چھوڑ جنگل بسائے۔ گئے اور ایسے داغ دے کر گئے جو ہمیشہ تازہ رہیں گے۔ عمر کہیں سے کہیں پہونچ جائے مگر ان کی یاد دل سے نہ جائے گی۔ آنے والا زمانہ ان کے نام آنکھوں سے لگائے گا اور یہ فانی دنیا ان کی ہستی پر فخر کرے گی۔

راتیں اور دن ہیں تو ویسے ہی مگر لوگ وہ نہیں ہیں۔ ختم ہو گئے وہ دن صبح ہو گئیں وہ راتیں اور مٹ گئے وہ لوگ غدر 1957 سے برسوں پہلے کا وقت ہے اور زندہ ہیں وہ صورتیں جن کے قدم سرزمین جہاں آباد آنکھوں سے لگا رہی ہے۔

دلی بگڑ بگڑ کر بنی اور بن بن کر بگڑی مگر پھر اس خاک سے ویسے لوگ نہ اٹھے۔ یہ عالی شان محلوں اور پکی محل سراؤں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کے گھر ہیں تو کچے ڈھابے اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں مگر لپے تپے، صاف ستھرے، لیونڈر کا تو انھوں نے نام بھی نہیں سنا۔ مگر چکنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کی سادگی مذاق کا پورا پورا پتہ دے رہی ہے۔

ان کے دماغ مغربی ہوا کے جھونکوں سے آشنا نہیں ہیں۔ مگر آنکھیں کبھی کبھی ایک آدھ صورت ایسی بھی دیکھ لیتی ہیں جو ان کو ششدر و متحیر بنا دیتی ہے۔ ان کی صورت ظاہری لباس پوشاک وضع قطع نہ چنداں دلچسپ ہے، نہ دل کش، قبہ دار ٹوپیاں، چینٹ دار انگر کھے، کمر میں پٹکے، ہاتھ میں عصا، جیب میں لمبے لمبے رومال۔ مگر ان کے باطن پر کائنات کا ہر ذرہ درود پڑھ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں پابندی وضع جن کی گھٹی میں پڑی، ہمدردی کے دودھ سے پلے اور خلوص کی آغوش میں بڑھے۔ بساط تعلقات پر قولاً و فعلاً ایسے پھول برسا گئے جن کی خوشبو سے آج تک زمانہ مہک رہا ہے۔

یہ بھولی بھالی صورتیں، یہ سیدھے سادھے لوگ جنھوں نے نمک کو نون اور چاقو کو چکو اکہا چند روز کے مہمان ہیں۔ کان ان کی آوازوں، آنکھیں ان کی صورتوں اور دل ان کی باتوں کو ترسیں گے۔ ملکہ مغرب کی سواری کا غلغلہ بلند ہو چکا۔ یہ وہ سیمتن ہے جس کے آگے زاہد صد سالہ سجدے کریں گے اس کی اداؤں میں متقیوں کے دل بھی لوٹ پوٹ کر دیں گی۔ ان کی باتیں سن لو اور صورتیں دیکھ لو پھر یہ کہاں اور تم کہاں۔ دیکھنا! دیکھنا! یہ پان برس کے دو چھوٹے ہوئے دوست ملے ہیں۔ سنو سنو ان کی باتیں سنو اور یاد رکھو کہ محبت کا سکہ ان ہی کے دم تک اقلیم انسانیت میں چل رہا ہے آ گیا ہے وہ وقت کہ مغرب کا دست شفقت اس تمدن پر پانی پھیر دے۔

"ہائیں! خلیفہ بندو؟ ارے بھائی کلیجہ سے تو لگ جا، صورت دیکھے مدتوں ہو گئے تجھلے احمد بیگ کیا مرے وہ طبقہ ہی الٹ گیا۔ میاں بودی کالے کوسوں حیدر آباد پہونچے، سمندی کو چچا امیر بیگ کی نظر کھا گئی۔ ہائے بند کیا کڑیل جوان اٹھا ہے۔ دھیان آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ آ بھائی ایک دفعہ اور مل جی نہیں بھرا۔ ارے بنے ایک پانچ ہی برس میں ڈاڑھی بگلے کا پر ہو گئی۔ وہ ڈنر قہقہے کچھ بھی نہ رہے۔

بندو۔ آؤ میاں یوسف آڑے جب سے نہیں کہتے کہ میں ہوں آڑے تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ شہر کے شہر میں ہو اور اتنی خبر نہیں کہ بودی کو مرے ہوئے تیسرا مہینہ ہونے آیا۔ بے چارے کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئی ہوں گی۔ کوئی ایسا ہی نصیبے کا ولی ہوگا۔ جو دکن جا کر جیتا جاگتا پلٹا ہو۔ تین کی سناؤنیاں تو ہم سن چکے ہیں۔ بودی کا بڑا لڑکا تو تمہیں یاد ہوگا۔ اس نے باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ سر اٹھایا کہ ماں کو ناک چنے چبوا دیئے۔ دو ڈھائی آنے روز فقط چٹخے مٹھوں کو چاہئیں۔ وہ بے چاری مر کر صبح سے شام تک تین ساڑھے تین آنے کی مزدوری کر کے اس کا بھرنا بھرتی ہے۔ پرسوں پیسہ پاس نہیں تھا اس وقت کا جو نکلا ہوا ہے تو اب تک نہیں پلٹا سرنوں کی طرح روتی پھرتی ہے۔ صبح نماز دم دیکھتا کیا ہوں کہ کنڈی کھٹکھٹا رہی ہے۔ میرا دل بھی دھکڑ دھکڑ کرنے لگا کہ یہ گجر دم خدا خیر کرے۔ اس کو گھر میں بٹھا کر جو نکلا تو یہ وقت ہو گیا۔ پہاڑ گنج، تیلی واڑہ، صدر، باڑہ، شہر بھر چھان مارا مگر کہیں پتہ نہیں چلتا۔ صبح سے نہار منہ ہوں۔ اب کہاں ڈھونڈوں۔ لوٹ کے جاتا ہوں تو خرابی۔ اس بے چاری کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اب یہ سنا ہے کہ بدر پور گیا۔ سو بھائی وہاں جا رہا ہوں۔ چھ کوس کی منزل ہے اور جھٹ پٹا ہو گیا چلتے ہاتھ پاؤں جو کام ہو جائے اچھا۔ پھر تو ان کو کیڑے بھی نہیں کھائیں گے۔ خدا دیکھتا ہے جو محبت بودی کے جیتے جی اس کی اولاد سے تھی آج کے دم تک اس میں فرق نہیں آیا۔ میاں رشتہ نہیں ناطہ نہیں مگر برابر کا یار تھا۔ اس کی بیوی دھاروں روئے اور ہم چپکے بیٹھے سیر دیکھیں۔ تم سے مل کر جی خوش ہو گیا اب تو جانے دو اللہ چاہے صبح ہی آؤں گا۔"

یہ ہیں دو دل۔ جو حاضر و غائب ایک اور ظاہر و باطن یکساں۔ اس جہالت پر علم سو سو بار تصدق اور ایسی بد تہذیبی ہزار ہزار بار قربان۔ مرے ہوئے دوست کی تصویر جب تک زندہ رہے آنکھ کے سامنے رہی۔ اپنا سکھ چین، عیش آرام ان کے بچوں پر نثار کر دیا۔ کیا لوگ تھے کہ رانڈوں اور یتیموں کو وارثوں

کی موت بھلادی۔ مرگئے مگر وضع کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جس سے جتنا مل لئے آخر وقت تک نباہ گئے۔ بے وقوف تھے یا جاہل جیسے بھی تھے اور جو کچھ بھی تھے ایسے تھے کہ یہ آسمان جو مدتوں ان کے سر پر چھایا رہا آج حسرت سے ان کی قبروں پر رو رہا ہے اور یہ زمین جوان کو کلیجہ سے لگائے پڑی ہے باآواز بلند یہ صدا دے رہی ہے کہ:

مادر گیتی کے پیارو تمہارے بعد تم جیسی صورتیں نظر نہ آئیں۔

بندو اور آڑے کی ملاقات کو دو برس سے زیادہ ہو گئے زمانہ سرعت کے پروں سے اڑا چلا جارہا ہے اور آناً فاناً نئے نئے انقلاب برپا ہو رہے ہیں مگر بساغنیمت رہے یہ وقت بھی کہ شرافت کے جوہر ہندوستانی تمدن میں اسی آب وتاب سے چمک رہے ہیں۔

ملکہ مغرب کا جہاز وسط سمندر میں اٹکھیلیاں کرتا چلا آرہا ہے اور مشرق اس...جلوس کے انتظار میں چشم براہ ہے۔ دور کے ڈھول سہانے بچہ بچہ نئے مہمان کے آنے کی تیاریاں کر رہا ہے مگر فلک پیر جس نے سینکڑوں قومیں اور بیسیوں ملک تباہ و برباد کر ڈالے ان کی ناتجربہ کاری پر ٹھٹھے مار رہا ہے۔ اس کی دوربین نگاہیں تاڑ چکی ہیں کہ مشرق آج جس کو ہنر سمجھ رہا ہے ایک سو ہی برس کے الٹ پھیر میں مغرب کی صحبت اس ہنر کو عیب اس فخر کو ذلت اور اس وضع داری کو بیہودگی بنادے گی۔

وہی دن ہیں، وہی لوگ مگر کیسے؟ وہ جو محبت کا خاتمہ اپنے ساتھ کر جائیں گے اور زمانہ جن کا خلوص قیامت تک نہ بھول سکے گا۔

ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا! کرتے میں تو گھنڈی تکمہ ہی ہے، مگر اس جلتے جھلتے وقت میں کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے سر پر بوجھ ڈھوئے چلے آرہے ہیں۔ ان کی صورت دیکھ کر منحوست ان کے گن دیکھو اور پھر کہو کہ یہ کیسی صورتیں ہیں۔

غریب تین چار آنے روز کا مزدور ہے۔ مگر پڑھنے والوں کا کلیجہ کٹے گا جب یہ سنیں گے کہ اپنی مزدوری چھوڑ کر یہ گٹھری اس بیوہ کے بُو ہیں جس کے سر پر کوئی وارث نہیں۔ جو صبح سے بھوکی بیٹھی تھی جو آس تک رہی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مجھے بُو لادے تو پیس کر اپنا اور اپنے ننھے ننھے یتیم بچوں کا پیٹ بھرلوں۔

ذرا اس کا جواب بھی تو سن لو جب انھوں نے آواز دی ہے۔

"لو بہن اپنے بُو لے جاؤ" تو بھوکی پیاسی جو صبح سے اللہ اللہ کر رہی تھی، اٹھ کر دروازے پر آئی۔ اس کی آنما دعائیں دے رہی تھی مگر جب اس نے زبان سے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے:

"احسان کی کیا بات ہے۔"

"حق ہمسایہ، ماکا جایہ"

لیجئے مغربی ملکہ آپہنچیں اس وقت کو گذرے مدتیں ہو گئیں۔ انیسویں صدی کے دس برس نکل گئے آڑے اور بڑے میاں جیسی صورتیں کبھی کی چھپ چکیں آج مغربی تہذیب وتمدن کا دور دورہ ہے۔ مگر چشم بینا سے دیکھنے والوں انصاف سے کہنا دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ مشرق اپنے جوہر مغرب پر قربان کر چکا اور آج وہ نازک وقت ہے کہ سوسائٹی ان متبرک صورتوں کو انسانیت سے خارج بتا رہی ہے۔ لیکن فانی دنیا کا ہر ذرہ یہ صدا دے رہا ہے کہ زمانہ کتنی ہی ترقی کر جائے مگر وہ بھولی بھولی اور پیاری پیاری صورتیں اب آنکھوں کو دیکھنی نصیب نہ ہوں گی۔ تمدن 1911

دلی کے بچھڑے لکھنؤ میں

جب زمانہ نے بساط زندگانی پر مشرقی میزبان کو کروٹ دی اور مغربی مہمان نے ان بچھونوں پر پاؤں پھیلائے تو چشم بینا کیا دیکھتی ہے کہ ایک ہی دور میں مشرقی پھول مغربی عینک سے کانٹے نظر آنے لگے۔ کچھ پرانی وضع کے رخصت ہوئے کچھ بے گناہی کے بھینٹ چڑھے۔ بعض کو موت لے گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ صحبتیں ٹھنڈی اور وہ جلسے برباد ہو گئے۔

1870 تک کا زمانہ پھر غنیمت تھا۔ اس کے بعد تو مشرقی جواہرات ایسے ماند پڑے کہ کوئی ان کو پوچھنے والا تک نہ رہا۔ اب بھی جو دو چار صورتیں رہ گئی ہیں وہ بھی آنکھوں سے مجبور کانوں سے معذور۔ مشرقی موتیوں کے پرکھنے والے جوہری کہاں سے آئیں۔ عروس مغرب کی اداؤں کو مسخر کر گئی

اب وہ صحبتیں کہاں اور وہ لوگ کہاں۔ دل رہے، نہ زبان، بڈھے رہے نہ جوان۔ زمانہ کی روسب کو لے گئی۔ جن پھولوں نے ایک عالم مہکار کھا تھا، ان کی پنکھڑیاں رلتی پھرتی ہیں اور کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

کہتے ہیں مشرق (باعتبار زبان) اتصال مغرب سے مالا مال ہو گیا، ہو گیا ہو گا ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اگلا سارنگ روپ بھی ختم ہوا۔ لطفِ زبان تو مرنے والوں کے ساتھ گیا اب اس کی تلاش فضول مگر سادگی جو زیور تھا وہ بھی نہ رہا۔ تحریر تقریر جس کو دیکھو آمیزش غیر سے لتھڑی ہوئی۔ موٹے الفاظ بھدا اختلاط۔ اقتضائے وقت ہے۔ سلاست میں رچی ہوئی زبان آج اس قابل ہے کہ اغیار کی چھری گردن پر ہو اور احباب خنجر قاتل کی داد دیں!

علامہ راشد الخیری اردو کے پہلے افسانہ نگار!

منشی پریم چند (31 جولائی 1880-8 اکتوبر 1936) کو بالعموم اردو کا پہلا افسانہ نگار یا Short Story Writer مانا جاتا ہے۔ لیکن مشہور محقق ڈاکٹر مرزا اسلم بیگ نے ثابت کیا ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ علامہ راشد الخیری (1870 تا 1936) نے لکھا تھا جو 1903 میں ان کے رسالہ مخزن میں شائع ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ 'دوست کا خط' اس کے تین سال بعد 1906 میں، سلطان حیدر جوش کا 'نابینا بیوی' 1907 میں اور منشی پریم چند کا پہلا افسانہ 1908 میں چھپا۔ علامہ طبعاً رقیق القلب ہونے کے ساتھ زود نویس بھی تھے۔ کل ملا کر انہوں نے 78 تصانیف چھوڑی ہیں جن میں ناول بھی شامل ہیں۔ آمنہ کا لال اور سیدہ کا لال کے علاوہ دلّی کی آخری بہار، شامِ زندگی، شبِ زندگی، سات روحوں کے اعمال نامے، اندلس کی شہزادی، ستونتی، عروسِ کربلا، دادا لال بجھکو، مدّورہ، نانی عشو، قطراتِ اشک، ڈیڈیا کی سرگزشت، لڑکیوں کی انشا، سوکن کا جلاپا، یاسمینِ شام، رودادِ قفس، بیلہ میں میلہ، سیاحتِ ہند اور ولائتی ننھی ان کی مشہور کتابوں میں شامل ہیں۔

جب یارانِ طریقت ہی رقیب بن گئے تو دوسروں کی شکایت کیا۔ وہ اگلی چنک منک وہ دلربا انداز دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہوئے۔ رنگیں دوپٹوں کی اوڑھنے والی مہ جبین آج مغربی لباس پہنے نظر آرہی ہے۔

یہ ہی اردو ہے اور یہ ہی ہندوستان مگر زمانہ یہ نہیں ہے۔ دلّی بگڑ چکی۔ لکھنؤ سعادت علی خان کے دم سے اہلِ کمال کو سر آنکھوں پر رکھ رہا ہے۔ بھانت بھانت کے پکھیرو اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ امین آباد میں ایک ساقن حقہ لئے بیٹھی اونگھ رہی تھی کہ ایک بڑے میاں برابر سے گذرے ٹھٹکے اور کہا۔

"وحید النسا، تو بڑے کی خیر! ایک دو ہی برس میں سوکھ کر قاق ہو گئیں کالی کالی زلفیں بگلے کا پر اور تنا ہوا سینہ چھچھنی بن گیا۔"

ساقن: "اوہو خلیفہ بندو ہیں۔ ارے بھائی بادشاہ کی بادشاہی نہ رہی تو میں کس گنتی میں تھی۔ یہ دیکھو اس آنکھ میں پانی اتر آیا۔ فجر سے شام تک ٹکریں کھاتی ہوں جب کہیں چولہا سیدھا ہوتا ہے۔ صدموں نے اور بھی کمر توڑ دی۔ اسمٰعیل ایسا کڑیل جوان اٹھا کر رہے سہے ہوش جاتے رہے۔ دلّی کیا چھٹی جینے کا مزہ ہی چھٹ گیا اب تو پاپڑ بیلنے ہیں۔ جی کیا خاک رہی ہوں۔ ایڑیاں رگڑ رہی ہوں۔ خلیفہ! علی کی قسم، ایمان سے کہنا دلّی میں کبھی ساون میں خاک اڑتی دیکھی؟ ان دنوں میں زندگی کا مزا آجاتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں زمانہ بدل گیا۔ میں کہتی ہوں اللہ ہی وہ نہیں۔ بھلا یہ موسم اور غضب خدا کا گھر دم پسینے میں نہا رہی ہوں۔ ذرا ہاتھ تو لگاؤ شوربہ شوربہ ہو رہی ہوں۔

"شہر آبادی کے دن بھی کیا دن تھے۔ سیر کی نفیری بجتے ہی جان میں جان آجاتی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ دھوں تال پانی پڑ رہا ہے۔ جھولے پڑ رہے ہیں۔ پینگیں چڑھ رہی ہیں۔ مور جھنگھاڑ رہے ہیں پپیا کوک رہا ہے۔ جدھر دیکھو جل تھل۔ لبالب جھرنے۔ گھاس لہرا رہی ہے۔ ساون پر درخت آسمان پر ابر جھوم رہا ہے۔ وہ سماں گیا گذرا ہوا۔"

خلیفہ بندو: "اری بوا وحید النساء وہ تو ایک خواب تھا آنکھ کھلتے ہی تڑکا ہو گیا۔ برسات ہی پر کیا موقوف ہے، بارہ مہینے دن عید رات شب برات تھی۔ ڈیڑھ انکھے آکا کی بیٹھک یاد ہے۔ کڑکڑاتے جاڑے دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ چائے کے دور چل رہے ہیں۔ سموار چڑھا ہوا ہے۔ آندھی جائے مینہ جائے یاروں کا جمگھٹ نہ جائے۔ مرزا احمد کو تو نظر ہی کھا گئی۔ ان ہی کے دم کا غنچہ تھا کہ چھ گھڑی کی توپ چھوٹنے سے پہلے سب اڑے ہوئے ہیں۔

پورا مزا تو مہاوٹوں میں آتا تھا، دنیا لحافوں میں منہ چھپائے پڑی ہے یوسف برف کی رکابی لئے کھڑے ہیں اور بعدے کے بعدے زبردستی منہ میں ٹھونس رہے ہیں۔ آج تم کو دیکھ کر پرانے یاد آ گئے۔ اب رہا ہی کون ہے۔ ایک بھورے زلفی کو دیکھ لو۔ سو وہ بھی جی کیا رہے ہیں سسک رہے ہیں گھلتے گھلتے چارپائی سے لگ گیا، کیا ہاتھی مرنڈا ہوا ہے۔"

چشمِ مغرب کی گھائل آنکھیں ذرا اس مشرقی بیگم کو بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ لیں۔ اس کا لباس میلا چکٹ سہی مگر سادگی اس کی نفاست پر قربان ہو رہی ہے۔ دلی کی ساقن لکھنؤ کی سرزمین پر، بنگالے کی مینا بول رہی تھی۔ اب یہ دلکش صدائیں ختم ہوئیں۔ بسا غنیمت ہے کہ ابھی یہ مہ جبین زندہ ہے؟ مگر قریب آ گیا ہے وہ وقت کہ اس کے فراق پر ہم جیسے رونے والے بھی رخصت ہوں۔

نوجوانو! عروسِ مشرق کی وداع مبارک۔ مگر شاہجہاں کی پاک روح جس نے اس بچہ کو خونِ جگر پلا کر پالا ہے حسرت آمیز نظروں سے تمہارے کرم کی منتظر ہے۔

اس کا دل رکھنا اور کند چھری کو اتنا تیز کر لینا کہ بسمل نیم جان تڑپتا نہ رہے۔ تمدن 1914

'بابر کی اولاد'

سلمان خورشید کا ڈراما

اطہر فاروقی

■

...ڈرامے کا ایک فورمیٹ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے مرکزی خیال میں تاریخی پس منظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسے شہنشاہ بابر سے شروع کر کے 1857 کے ہولناک حالات اور بہادر شاہ ظفر کی جلا وطنی تک کے واقعات کی عکاسی کرنے والے مغل سلطنت کے مختلف ادوار تک محدود کر دیا جاتا۔ سلمان خورشید مگر ڈرامے کو عہدِ موجود تک لے آئے جہاں آر ایس ایس جیسی فسطائی قوتیں ہندستانی شناخت اور نیشنلزم کے حوالے سے 'بھارتیتا' کے ایک مخصوص تصور کی برتری اور بالادستی کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کے لیے حقارت کے ساتھ 'بابر کی اولاد' جیسی ہجو آمیز اصطلاح کی گردان مسلسل کرتی رہی ہیں...

■

بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر پلے تحریر کرنے کا خیال سلمان خورشید صاحب کو اب سے تقریباً چھے سات برس قبل آیا تھا۔ اس وقت انھوں نے کچھ نوٹس لیے اور پلے کا پہلا ڈرافٹ بھی تیار کیا جو برسوں یوں ہی پڑا رہا۔ یوپی کے اسمبلی انتخابات کے خاتمے کے بعد جب سلمان صاحب کو جون 2007 میں اس متن پر کام کر کے اسے فائنل کرنے کا موقع ملا تو حسنِ اتفاق کہ 1857 کے واقعات کو جنگِ آزادی کی ڈیڑھ صدی تقریبات کے طور پر منانے کا اہتمام حکومت کی طرف سے بڑے پیمانے پر کیا جا رہا تھا۔ سرکاری امداد سے منعقد ہونے والی اس قسم کی تقریبات کی سوسیولوجی حالاں کہ ایک علاحدہ ہی مطالعے کی متقاضی ہے مگر اس بہانے سے 1857 کے مرکزی کردار بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے بعض دل چسپ اور تاریخی اعتبار سے امتیازی پہلوؤں سے روشناس کرانے کے باب میں اس پلے کو ایک بہتر ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

سلمان خورشید نہ تو پیشے ور پلے رائٹ Playwrite اور ڈرامہ نویس ہیں، نہ ہی انھوں نے کبھی اس فن کے متعلقہ زاویوں کی کوئی تربیت حاصل کی ہے۔ وہ اس قسم کا کوئی دعویٰ بھی نہیں کرتے۔ وہ ایک سیاست داں ہیں اور ان کا سیاسی و تہذیبی پس منظر شمالی ہند کے اس مسلم اشراف کا ہے جو آزادی کے بعد ہندستان کے تبدیل شدہ منظر نامے میں کانگریس کی سیاست کا حامی رہا۔ سلمان خورشید کے نانا ذاکر حسین جدو جہد آزادی ہی کے وقت گاندھی جی کی تعلیم کی نیشنلسٹ تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اپنے بعض رفقا کے ساتھ ذاکر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے محرکین میں شامل رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اب دہلی میں واقع ایک سینٹرل یونی ورسٹی ہے۔

ذاکر صاحب کے کوئی لڑکا نہ تھا یوں ان کی سیاسی وراثت ان کے داماد اور سلمان خورشید کے والد خورشید عالم خاں نے سنبھالی۔ خورشید عالم خاں

صاحب مدتِ مدید تک مختلف وزارتوں کے وزیر اور صوبۂ گوا اور کرناٹک کے گورنر بھی رہے۔ سلمان خورشید بھی 96-1991 کی لوک سبھا میں فرخ آباد سے منتخب ہوئے اور پہلے کومرس کے ڈپٹی وزیر اور پھر وزیرِ مملکت برائے امورِ خارجہ رہے۔ اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد میں پٹھانوں کی ایک بستی قائم گنج اس خاندان کی تہذیبی اساس ہے۔

سلمان خورشید نے حال کے کچھ برس اتر پردیش کی اس ہنگامہ پرور سیاست میں گذارے ہیں جو پوری طرح ذات پات کے نام پر منقسم ہے۔ وہ ستمبر 2007 کانگریس کی ریاستی تنظیم کے صدر تھے۔ سیاسی سلسلۂ مراتب یا ہیرارکی hierarchy میں یہ بڑا طاقت ور عہدہ ہے۔ ان حالات میں، بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر ڈرامہ تحریر کرنا ــــ سلمان خورشید کے حالات میں ــــ اغلب ہے کہ کوئی آسان کام نہیں رہا ہوگا۔

سلمان خورشید کو اپنے اسکول کے دنوں سے ہی، بہادر شاہ ظفر کی زندگی میں گہری دل چسپی محسوس ہونے لگی تھی حالانکہ انھوں نے اپنے اسکول کے زمانے کے علاوہ کبھی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔ علاوہ ازیں، انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اسکولی سطح کے نصاب میں عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں بہادر شاہ ظفر کے حالاتِ زندگی پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی زندگی میں سلمان صاحب کی دلچسپی محض اس لیے نہیں تھی کہ ظفر ہندستانی تاریخ کی ایک دل آفریں شخصیت کے مالک تھے بلکہ ڈرامے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلمان خورشید صاحب کو ظفر کی زندگی سے یہ دل چسپی اردو شاعری کے ایک انتہائی قابلِ فہم اور لائقِ رسائی شاعر کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔

اردو ادب اور شاعری سے سلمان خورشید کی دل چسپی پرانی ہے۔ انھوں نے کالج میں بھی ایک اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھی تھی۔ بعد کے برسوں میں اردو ادب خصوصاً اردو شاعری سے یہ دل چسپی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اُن کے کالج کے دنوں میں ظفر کی ''لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں / کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں'' جیسی غزلیں خاصی مقبول تھیں۔ ظفر کے کلام کی مقبولیت ہی دراصل اس ڈرامے کی تحریر کا محرک ثابت ہوئی۔

اس ڈرامے کا واقعتاً کوئی ایک مرکزی خیال نہیں ہے لیکن جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے کہ ڈرامے کی تھیم ہندستان سے اس ملک کے شہریوں کے اس تعلق پر مبنی ہے، جس سے ہندستان کا مخصوص تکثیریتی معاشرتی مزاج عبارت ہے۔ مغل سلطنت کی تاریخ بلکہ یوں کہیں کہ ہندستان کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر بہادر شاہ ظفر نے جدید ہندستانی شناخت کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا اور جدید ہندستان کی تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اکثریتی ہندو معاشرے پر مسلم بالادستی کا خاتمہ ہوگیا۔ مسلم ذہن اس صورتِ حال کو اب تک قبول نہیں کرسکا ہے۔

1857 کے واقعات جدید ہندستان کی تاریخ میں فیصلہ کن اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ 1857 کے آس پاس شناخت کا وہ تصور موجود نہ تھا جس نے بعد میں مختلف مذہبی، علاقائی اور لسانی نیز نسلی جدوجہد اور تنازعات کو فیصلہ کن شکل دی۔ ہندستان میں نیشنلزم کا موجودہ تصور بھی انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد ہی تیزی کے ساتھ ارتقا پذیر ہوا۔ آزادی کے بعد کے برسوں میں دنیا بھر میں اور خود ہندستان میں بھی شناخت اور نیشنلزم کے مختلف زاویوں پر متعدد علمی کام ہوئے؛ ہندستان میں ہی ہماری قومی شناخت اور نیشنلزم کے متعدد تصورات زیرِ بحث رہے۔

ہندستان کی مجموعی شناخت کو مختلف مذاہب، اجتماعی تمناؤں اور باہم متضاد بلکہ متصادم لسانیاتی گروپوں کی تشکیل کی جڑوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان معاملات کو سیاسیات میں ہی نہیں بلکہ عوامی زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی فیصلہ کن اہمیت حاصل رہی ہے، اسی لیے، ہندستانیت کا تصور مختلف مذاہب اور تہذیبوں نیز ضمنی تہذیبوں بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں کے تجربے سے کشید تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس ڈرامے کا ایک فورمیٹ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ڈرامے کے مرکزی خیال میں اس کے تاریخی پس منظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسے شہنشاہ بابر سے شروع کر کے 1857 کے ہولناک حالات اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی تک کے واقعات کی عکاسی کرنے والے مغل سلطنت کے مختلف ادوار کے جائزے تک محدود کر دیا جاتا۔ سلمان خورشید مگر اس ڈرامے کو عہدِ موجود تک لے آئے۔ معاصر سیاست میں آر ایس ایس جیسی فسطائی قوتیں ہندستانی شناخت اور نیشنلزم کے حوالے سے 'بھارتیتا' کے ایک مخصوص تصور کی برتری اور بالادستی کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کے لیے حقارت کے ساتھ 'بابر کی اولاد' جیسی ہجو آمیز اصطلاح کی گردان مسلسل کرتی رہی ہیں۔

آر ایس ایس اور اس کی بغل بچہ سیاسی و ثقافتی تنظیمیں جن میں بھارتیہ جنتا پارٹی ان معنوں میں سب سے زیادہ اہم ہے کہ اس نے 1999 سے 2005 تک مرکزی حکومت کی سربراہی کر کے آر ایس ایس کی دیگر فسطائی تنظیموں کو فیصلہ کن طاقت دی اور گجرات 2002 واقع ہوگیا جس میں کی گئی فسطائیت کی کوئی نظیر ہندستان کی تاریخ میں موجود نہیں۔ معصوم بچوں کا وحشیانہ قتل، حاملہ عورتوں سے زنا اور پھر ان کے پیٹ پھاڑ کر یہ تصور عام

کر کے ایسے بے ہودہ خیالات کو تقویت دینا کہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی ایک اور مسلمان کو قتل کر دیا گیا، اس کی نظیر ہندستان میں جنگوں کی کسی تاریخ میں موجود نہیں۔ ہندو نیشنلزم کے متعدد چہرے ہیں جن میں یقیناً سب فسطائی تو نہیں ہیں مگر اکثر فرقہ پرست، نسل پرست، علاقائیت کے حامی ہیں۔ ہندو نیشنلزم کے ان چہروں میں اہم ترین چہرہ Centrist طرزِ سیاست کا ہے۔ اس Centrist تصورِ سیاست کی سب سے بڑی ہم نوا کانگریس پارٹی ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی قوت کے پیشِ نظر آر ایس ایس کے 'بابر کی اولاد' یعنی مسلمانوں کے مخصوص غیر ملکی ہونے کے اس نظریے کو قبول کرنے سے انکار کرنے کا دعوا تو کانگریس کرتی رہی ہے مگر عملاً اس کا کردار خصوصاً نہرو کے انتقال کے بعد ہندو نیشنلسٹ پارٹی ہی کا کردار رہا ہے۔

راجیو گاندھی نے 1989 کی انتخابی مہم ایودھیا میں رام مندر کا شیلانیاس کر کے شروع کی تھی۔ یہ بھی مگر درست ہے کہ اقتدار پر قابض رہنے کے لیے کانگریس کو مسلم ووٹوں کی ضرورت ہمیشہ رہی اور اس نے ممکن حد تک اس توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی مبینہ مسلم نوازی کی اس زبانی جمع خرچ کی پالیسیوں کو برقرار رکھا جن کی وجہ سے مسلمانوں کو صرف نقصانات ہوئے، فائدہ کبھی کوئی نہیں ہوا۔

سلمان خورشید نے اس ڈرامے میں بابر کی اولاد کے فقرے یا یوں کہیں کہ اس ہجو آمیز اصطلاح کا استعمال کر کے ایک طرف تو معاصر فسطائی سیاسی قوتوں کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف بہادر شاہ ظفر سے متعلق متعدد تصورات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان محرکات کے سنجیدہ مطالعے کی بھی ضرورت ہے جن کے سبب افغانستان جیسے ــــ اس زمانے کے اعتبار سے ــــ دور دراز ملک سے آنے والے ایک قبیلے کے سردار بابر نے ہندستان جیسی عظیم سلطنت کی بنیاد تو رکھی لیکن اپنے آخری ایام میں وہ کابل سے اپنی محبت کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

ہمارے مورخین نے ان سیاسی بلکہ نفسیاتی اسباب کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے کہ آخر کیوں اس عظیم شہنشاہ کی آنے والی نسلوں نے ہندستان سے اس درجہ محبت کی کہ ان کی نسل کے آخری تاجدار کو مسلمانوں ہی نہیں بلکہ ہندوؤں نے بھی بغیر کسی تکلف کے اپنا ہیرو تصور کر کے اس کے زیرِ قیادت اپنی بقا کی ایک فیصلہ کن جنگ لڑی جو بدقسمتی سے شکست آمیز ثابت ہوئی۔

ظفر سے منسوب بعض انتہائی خوبصورت مگر اداس اور سوز و گداز سے بھرپور غزلیں اسی دور کی تخلیق کہی جا سکتی ہیں۔ ظفر کی شاعری کے ایک حصے کے استناد کا معاملہ چوں کہ اردو ادب کے محققین کی روزی روٹی سے جڑا ہوا ہے یوں یہ ضرورت سے زیادہ ہی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ عوامی حافظے میں وہ غزلیں ظفر ہی کی ہیں، محققین جن کا استناد مشکوک بتاتے ہیں۔ مگر اس سے ڈرامے کی ہیئت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈرامے کی صنف ایک تخلیقی عمل ہے جس کا تحقیق کی مکتبی ضرورتوں سے کچھ تعلق نہیں۔ ظفر کی اس شاعری سے جو تصورات ابھرتے ہیں ان سے اس ڈرامے میں ہندستانیت کا تاریخی اور جذباتی جواز اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندستان اور ہندستانیت کا نظریہ آج بھی اس حد تک مکمل نہیں ہو سکا ہے کہ اس کی کوئی یقینی اور سب کے لیے قابلِ قبول توجیہہ کی جا سکے۔ مخصوص سیاسی رویے کی زائیدہ ہندستانیت کی اصطلاح میں ہندستان کے مخصوص و متنوع سماجی پس منظر بالخصوص ملک میں بولی جانے والی سینکڑوں زبانوں کی بوقلمونی کے رول کو پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شہریت، قومیت، وطنیت اور دھرتی کے لال جیسے تصورات کو تاریخی عناصر وقتاً فوقتاً اور جگہ بہ جگہ اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے غلط سیاق و سباق میں استعمال کر کے ان کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ اس لیے اس ڈرامے میں اس اصطلاح کے حوالے سے معاصر طرزِ سیاست کے لیے کوئی حتمی اور اکملیت کا اصول تو تلاش نہیں کیا جا سکتا تاہم اس میں معاصر ہندستان میں روز مرہ پیش آنے والے واقعات کی غیر یقینی کیفیت کو نمایاں کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔

اس پلے میں متعدد مزید اہم خیالات کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے لیکن معاصر قارئین اور اسٹیج پر پیش کیے جاتے وقت ناظرین کی توجہ اور ان کے تصورات تک رسائی کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پلے کو معاصر زندگی سے جوڑا جا سکے؛ تاریخ یقیناً ہر عہد اور بالخصوص معاصر عہد سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رکھتی ہے۔ کل جو کچھ ہوا وہ براہِ راست یا بالواسطہ آج کی زندگی کو بہرحال متاثر کرتا ہے۔ آج رونما ہونے والے واقعات ہی کل لکھی جانے والی تاریخ کے محرک ہوں گے۔ تاریخ کے زمانی تسلسل کے لیے ضروری دور اندیشی، علم اور تحمل کے منطقی ربط کو جس مخصوص تناظر میں دیکھنا ضروری ہے، آزاد ہندستان میں لکھی گئی مغل تاریخ کے بڑے حصے میں ان تمام عناصر کا فقدان بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔

اصولاً جو فن پارے اپنے مخصوص پس منظر کو صحیح طور پر برت پاتے ہیں ان کی افادیت دیر تک برقرار رہتی ہے۔ کسی بھی فن پارے کے لیے مگر سب سے اہم چیز فن کارانہ چابک دستی ہے جسے اس پلے میں بہ آسانی

شناخت کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی بھی پلے/ ڈرامہ یا ادبی فن پارے میں اپنے عہد کے ضمیر کی روح کو نمایاں کرنے کی صلاحیت ہو۔ اس نوعیت کی تحریروں میں عوامی دل چسپیوں کے عنوانات پر زور دینا شاید اسی لیے ضروری ہوتا ہے۔

اس پلے کے بعض مرکزی خیالات نہایت احتیاط کے ساتھ وضع کیے گئے ہیں۔ مثلاً نسلی فاصلے، رقابت اور عزائم کی بنیاد، تشدد کے لیے احساس ندامت نیز مفاد پرست سیاست کے شکنجے سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ اور روحانی روایات میں ضم ہو جانے کی خواہش۔ تاریخ کے ابواب میں یہ جذبہ ہمایوں اور اکبر کی شخصیت میں تو پایا ہی جاتا تھا کسی حد تک جہانگیر میں بھی موجود تھا اور حیرت انگیز طور پر یہ جذبہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کی شخصیات میں بھی کسی نہ کسی طور پر کارفرما رہا۔ بہادر شاہ ظفر چوں کہ اس پلے کا مرکزی کردار ہیں یوں ان کی شخصیت میں یہ زاویہ مزید صیقل ہوگیا ہے۔

ایک اور دل چسپ معاصر پہلو بھی اس پلے میں موجود ہے۔ اس کا تعلق اقتدار میں عورت کے کردار سے ہے اور جسے علما نے دل سے پسند تو نہیں کیا مگر جب جب علما کے مفادات اقتدار سے وابستہ ہوئے تو انھوں نے عورتوں کے اس کردار کی حمایت ضرور کی۔ عہدِ جہانگیری میں حکومت اور انتظامیہ پر نور جہاں کے اثرات کو اس کی عمدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ماضی قریب میں قیامِ پاکستان کے بعد ابوالاعلیٰ مودودی نے فاطمہ جناح کے کیس میں عورت کی امارت کو اپنی تشریحات کی بنیاد پر اسلام کے عین مطابق قرار دیا تھا۔

ہندو اور مسلمان کا سوال، ایک ایسا مسئلہ تھا جس سے مغل حکمراں بھی نبرد آزما تو ہے مگر چوں کہ انھوں نے اپنے مفادات کے لیے اس مسئلے کو ہوا نہیں دی یوں اس مسئلے نے کبھی وہ تخریب کارانہ صورت اختیار نہیں کی جو معاصر زندگی میں روز کا معمول بن گئی ہے۔ مغلوں نے اقتدار کے معاملات کو اقتدار کے مفادات ہی کے نظریے سے دیکھا تھا اور پانی پت میں ایک مسلم حکمراں کو شکست دی۔

مغلوں کے ذریعے مذہبی تفریق و تقسیم پر قابو پانے کی ایک انتہائی کامیاب کوشش راج پوت شاہ زادیوں سے شادی کر کے ان کو مغلوں کی ملکہ کا درجہ دے کر کی گئی۔ یہاں یہ بات انتہائی دل چسپی کی حامل ہے کہ خود بہادر اور غیور راجپوت بھی، اپنی بیٹیوں کی مغل بادشاہوں سے شادی کر کے اس رشتے کو اور اس تعلق کو مستحکم بنانا چاہتے تھے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کے مورخین اس اہم ترین سوال کا تفصیلی تجزیہ کرنے سے بہ وجوہ قاصر رہے اور معاصر تاریخ کے ابواب حیرت انگیز طور پر اس محرک کے سنجیدہ تجزیوں سے خالی ہیں۔

معاصر تاریخ ہمیں یہ بھی نہیں بتاتی کہ آخر کن نفسیاتی محرکات اور اقتدار کی کس حکمت کے سبب مغل شاہ زادیاں تمام زندگی کنواری رہ کر درباری پابندیوں میں قید رہیں اور کبھی غیر مسلم راج پوت خاندانوں میں ان کی شادی کرنے کا خیال مغل بادشاہوں کو نہیں آیا۔ مغلوں کی ہندو مسلم دوستی کی ابھی کوئی توجیح موجود نہیں تھی کہ راج پوت شاہ زادیوں سے تو مغل شاہ زادوں کی شادی کی جائے مگر اپنی بیٹیاں ہندوؤں میں نہ بیاہی جائیں۔

اس کے باقیات معاصر زندگی میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ کوئی مسلم لڑکا اگر کسی ہندو لڑکی سے شادی کرلے تو مسلمانوں کو زیادہ طیش نہیں آتا لیکن مسلم لڑکی اگر ہندو لڑکے سے شادی کرلے تو قیامت بپا ہو جاتی ہے۔ مسلم لڑکا اگر ہندو لڑکی سے شادی کرلے تو بالعموم لڑکی کو مسلمان ہونا پڑتا ہے لیکن مسلم لڑکی ہندو لڑکے سے شادی کرنے کے بعد اپنے مذہب پر قائم رہتی ہے۔

مغلوں نے جن ہندو عورتوں سے شادیاں کیں، ان میں سے کسی کو مسلمان کیا، اس کی تفصیلات موجود نہیں۔ بہ ظاہر ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ مغلوں نے کسی ہندو رانی کو شادی کر کے اسے مسلمان کیا ہو۔ رد یہ ہندو معاشرے کی مجموعی حلیم الطبعی کا غماز ہے جو آج بھی ہمیں اس ہندو ذہن کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے جس نے آزادی کے بعد ہندستان کو ایک جمہوری ریاست کے طور پر تقسیم ہندستان اور پاکستان کے قیام کے باوجود قبول کیا اور اپنی تمام تر حد بندیوں کے ساتھ ہندستانی جمہوریت آج بھی جمہوری نظام سیاست ہی کے راستے پر عمل پیرا ہے۔

شاید یہی وہ پہلو ہے جس میں راجپوتوں کے ذریعے مغلوں کو صدقِ دل سے فرماں روا کے طور پر قبول کرنے کا جذبہ مضمر رہا ہوگا۔ راج پوتوں نے غالباً اس رمز کو سمجھ لیا تھا کہ وہ حکمرانوں کے وفادار رہ کر ہی ترقی کر سکتے ہیں، وہ خود کبھی حکمراں نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح مراٹھوں اور سکھوں نے بھی اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ مغل اقتدار کے تعاون کے بغیر وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ بے شک، راجپوتانے میں اور دیگر مقامات پر بہت سے طاقت ور ہندو راجہ بھی موجود تھے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے مغل اقتدار کی مخالفت بھی کی تھی لیکن ان میں کسی کو بھی ہندستان کا خود مختار شہنشاہ تصور نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف مغلوں کو عہد بابر ہی سے شہنشاہ کی حیثیت حاصل رہی۔ یہاں تک کہ قنوج کی جنگ میں شکست اور اپنا سب کچھ لٹ جانے کے 13 برس بعد کے

عرصے تک ہندستان سے دور رہنے کے باوجود، ہمایوں آسانی کے ساتھ فاتح بن کر ہندستان واپس آ گیا اور اسے مغل شہنشاہ کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی؛ شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد بھی ہمایوں کو تختِ شاہی کے دعویدار کی نہیں بلکہ شہنشاہ ہی کی حیثیت حاصل رہی۔

یہ تاریخی حقائق ہمیں ہندستانی ذہن کے متعدد تشنۂ التفات گوشوں کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہی وہ پہلو بھی ہے جس میں مغلوں کو ہندستان میں سچے فرماں روا کے طور پر قبول کرنے کا جذبہ مضمر تھا۔ کچھ لوگ مغلوں کو موجودہ سیاسی محاورے میں غیر ملکی اور حملہ آور قرار دے سکتے ہیں لیکن ایسا یہ سیاسی نعرے کے طور پر کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تاریخ کے مطالعے کے بعد ان کے بعض مفروضات درست ثابت ہوں مگر فی الحال تو یہ سیاست کے تابع اور تخیل کی پرواز کے سہارے کیا جا رہا ہے۔

ایک سچائی یہ بھی ہے کہ مراٹھوں اور سکھوں نے صرف اس لیے ایک مغل کو اقتدار پر متمکن کرنا ضروری سمجھا کیونکہ وہ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ مغل اقتدار کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ مغل حکمرانوں کا یہی وہ پہلو ہے جسے ان کے اس مزاج کی خودمختاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اسی سبب سے وہ ہندستان پر مکمل طور پر اتنے طویل عرصے تک حکومت کر سکے۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر جو برطانوی حکومت کی خواہشات کے اسیر تھے اور لال قلعے کی دیواروں سے باہر جن کی حکومت کا کوئی وجود نہ تھا، وہی بہادر شاہ ہندستان کی پہلی جنگِ آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف، ہندستان کی مزاحمت کی علامت اسی لیے بن سکے کیوں کہ مغل بادشاہت کو ہندستانی ذہن دل سے قبول کر چکا تھا۔

ہندستانی کی باغی فوج کے جوانوں نے — جن میں دور دراز کی بنگال رجمنٹ کے سپاہی بھی شامل تھے — میرٹھ سے دلّی کے لال قلعے تک اسی امید میں سفر کیا تھا کہ بہادر شاہ ظفر اس جنگ میں روحانی، نظریاتی، اخلاقی اور یہاں تک کہ جسمانی طور پر بھی ان کی قیادت کریں گے۔ عملاً یہ بات بہادر شاہ ظفر کے لیے کس قدر دشوار تھی اس کی عکاسی اس ڈرامے میں بڑی کامیابی سے کی گئی ہے۔ 1857 کی 150 ویں سالگرہ کے موقعے پر شائع ہونے والی دستاویزی تصانیف سے بھی ڈرامے کی تحریر میں استفادہ کر کے، حقائق کو مستند بنانے کی کوشش مصنف نے کی ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ سلطنت اور شہنشاہ کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا اور ان کی حیثیت ان کے شاندار ماضی کی شان و شوکت کے خیالی تصور سے زیادہ کچھ نہیں رہ گئی تھی، بہادر شاہ ظفر کی مغل شہنشاہ کی علامتی نوعیت کی حکمرانی بھی اس خیال کی تصدیق ہے کہ یہاں کے ہندو عوام نے انھیں دل سے اپنا حکمراں تسلیم کیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ مغل غیر ملکی تھے یا سرزمین ہندستان کے لیے اجنبی تھے معاصر سیاست کا محض سراب ہے۔ ایک سچائی یہ بھی ہے کہ پانی پت کی جنگ کسی غیر ملکی حملہ آور سے نہیں لڑی گئی تھی بلکہ یہ جنگ دو مسلم حکمرانوں بابر اور سکندر لودھی کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس جنگ کے اثرات نے مغلوں پر راج پوتانے کی مزاحمتوں کا اختتام کر کے تاریخ میں مغل راج پوت دوستی کے بے نظیر باب کا اضافہ کیا۔

اس کے بعد مغل افواج میں ہمیشہ ہی راج پوتوں کو کلیدی حیثیت حاصل رہی؛ مغل شہنشاہوں نے انھیں بڑے بڑے مناصب پر فائز کیا تھا۔ جیو اور جینے دو کے مغل سبق کو جسے ہم جدید اصلاح میں peaceful co-existence کہہ سکتے ہیں، ہندستانی مسلمان بھی مغل اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی بھول گئے۔ مذہبی طور پر یا یوں کہیں کہ مزاجاً اورنگ زیب جیسے شدت پسند بادشاہ نے ممکن حد تک ہندوؤں کے ساتھ Strategic relationship برقرار رکھی۔

شواجی جیسے سرداروں کی شکل میں مغل سلطنت کو زبردست مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن بہ حیثیت مجموعی مغلوں اور ان کی شہنشاہی کو ہندستان میں پوری طرح تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن شواجی اور اورنگ زیب کی فوجوں کے درمیان محاذ آرائی میں مغل فوج کے راج پوت یعنی ہندو سرداروں نے شواجی کے مسلم سرداروں سے ڈٹ کر لوہا لیا تھا۔ اس ڈرامے میں آر ایس ایس اور دیگر فسطائی قوتوں کے اس نظریۂ تاریخ کے استرداد کی بڑی کامیاب کوشش کی گئی ہے جو مغل دورِ اقتدار میں وجود میں آئی اور جو ہندستان کی مشترکہ ثقافت کو اپنے سیاسی وجود کے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے ہوئے تاریخ کے حقائق کو مسخ کرنے اور مسلسل جھوٹ بولنے کے روز نئے اور بے مثال طریقے تلاش کرتا رہا ہے۔

امید کی جانی چاہیے کہ یہ پلے ہم سب کے لیے قابلِ تعظیم سیکولر اور جدید ہندستان کے تصور کے خد و خال کے مثالی تصور پر نئے سرے سے غور و خوض کرنے کا ایک موقع فراہم کرے گا۔ زبردست چیلنجوں، اختلافات اور نظریاتی تکراروں اور مباحث کے باوجود، ہم سب ایک منفرد، جدید، جمہوری، سیکولر ہندستانی تہذیب کی وراثت کے حصول کے نہ صرف امین ہیں بلکہ مستقبل میں اس کے فروغ کے لیے پوری طرح کمربستہ بھی ہیں، اسی میں ہم سب کی بقا مضمر ہے۔

OO

ڈراما

بابر کی اولاد

سلمان خورشید

ترجمہ: اطہر فاروقی

حالیہ برسوں میں 1857 پر اردو میں کوئی پلے تخلیق نہیں کیا گیا. انگریزی میں حال ہی میں ایک اچھا پلے Sons of Babur کے عنوان سے سلمان خورشید نے لکھا ہے جو دراصل بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر مشتمل ہے. اس کا ہیرو یونی ورسٹی کا طالب علم ہے. اس کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کی گفتگو بیان کرنے کے لیے جو تکنیک اختیار کی گئی ہے،اس کی وضاحت تو کہیں نہیں کی گئی مگر گفتگو خواب جیسا کوئی عمل معلوم ہوتی ہے. یہ بس ایک ملاقات ہے جو کہانی کے مرکزی کردار اور بہادر شاہ ظفر کے درمیان بار بار ہوتی ہے اور اسی سے کہانی آگے بڑھتی ہے. ہیرو نہ صرف خود ایک نوجوان مارکسسٹ ہے بلکہ اس کا استاد بھی کسی زمانے میں انقلاب کے خواب دیکھا کرتا تھا جس نے بعد میں انقلاب کے لیے عملی راستہ اختیار کرنے کے بجائے یونی ورسٹی کی نوکری کرلی. مارکسسٹوں کے ذریعے یونی ورسٹی کی نوکری کو ہمارے عہد کا مجموعی المیہ قرار کیا جا سکتا ہے اور اس پنجرے میں حکومت بغیر کسی کوشش کے تقریباً ہر مارکسسٹ کو بند کر لیتی ہے؛ یونی ورسٹی کی نوکری کا سراب ان انقلابیوں کو بھیگی بلی بنا دیتا ہے.

'ادب ساز' کو ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اس پلے کے نہ صرف چند ابواب ترجمہ کر کے دیے بلکہ ہماری درخواست پر انھوں نے اپنا وہ مضمون بھی دیا جو اس پلے پر مترجم کے خیالات کے طور پر آپ پچھلے صفحات پر پڑھ آئے ہیں.

پہلا ایکٹ، دوسرا اسین

(رنگون کے ایک مکان نما چھوٹے سے ڈھانچے میں جو مرمت نہ ہونے کے سبب جھک سا گیا تھا، بوڑھے بہادر شاہ ظفر کمر جھکائے بیٹھے ہیں۔ جسمانی طور پر ناتواں ظفر چھوٹے سے پلنگ پر نیم دراز ہو جاتے ہیں۔ اس مکان میں پیچھے کی طرف ایک برآمدہ اور سامنے ایک صحن ہے۔ ہر طرف ہریالی ہے۔)

رودرانشو مترا: (کھنکارتے ہوئے)۔ ہیلو، کوئی ہے؟ ارے یہ میں کہاں آ گیا؟ کیا یہاں کوئی میری آواز سن رہا ہے؟ ہیلو براہ کرم جواب دیجیے! کوئی ہے؟ ہیلو، ہیلو...!

بہادر شاہ ظفر: کون ہے؟ کون ہمارے سکون کو درہم برہم کرنے یہاں آ گیا۔ طبیب، سپاہی، نگہبان۔

رودرانشو مترا: ہاں، ہاں، یہ میں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں ہوں...

بہادر شاہ ظفر: میں کون؟ یہاں آؤ۔ ہم تمھیں دیکھ نہیں سکتے۔ یہ کیا گستاخی ہے نوجوان؟ کیا اب ہم ایسے گئے گذرے ہو گئے ہیں کہ ہمارے غلام بھی اپنے آداب بھول گئے ہیں؟ جاؤ ان نامراد فرنگیوں سے کہو کہ ہمیں سونے دیں۔ انھوں نے ہر اس چیز پر قبضہ کرلیا ہے جو ہمارے پاس تھی یا ہمارے قبضۂ قدرت میں تھی۔ کیا اب یہ لوگ ہماری نیندیں بھی حرام کر دینا چاہتے ہیں؟ کیا یہی ان کے ملک کا قانون ہے؟ کیا ہماری جاں بخشی اسی لیے کی گئی تھی کہ ہمیں مسلسل ایذا پہنچائی جائے اور کبھی نہ ختم ہونے والے آزار میں مبتلا رکھا جائے؟

رودرانشو مترا: جنابِ عالی، بادشاہ سلامت! آخر میں، آپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ آپ ہی ہیں نا! شہنشاہ بہادر شاہ ظفر؟ میں آپ کو سلام کرتا ہوں۔

بہادر شاہ ظفر: خاموش! بہت ہو چکا! ڈگلس کیا یہ تم ہو یا پھر مٹکاف، تم؟ کیا تم ہماری سلطنت پر ڈاکہ ڈال کر وہاں سرداری کے خواہاں ہو؟ جاؤ ہم نے تمھیں اجازت دی۔ تم سردار بنو کہ شہنشاہ، مگر ہمیں اور ہماری میت کو خدارا بخش دو۔ کیا اذیت رسانی ہے؟ یہاں تم ہمیں پہلے ہی بہت سزائیں دے چکے ہو...

رودرانشو مترا: آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں شہنشاہِ ہندستان، اُف، مجھے افسوس ہے۔ (ندامت سے ہاتھ ملتے ہوئے) میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ

کو کس طرح مخاطب کروں؟ جہاں پناہ، میں ڈگلس نہیں ہوں، میں تو برطانیہ کا کوئی عام آدمی بھی نہیں۔
بہادر شاہ ظفر: لیکن ہمیں تو برطانیہ کا غلام ہی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مجھ جیسے کمزور اور مظلوم شخص پر انگریزوں کے نظم و ضبط میں خلل ڈالنے اور انگریزی حکومت کے خلاف سازش کا الزام لگایا۔ ہم نے اپنی مادرِ وطن سے غداری نہیں کی۔ اس کے باوجود یہ سزا؟ لعنت ہے اس پر اور اس سرزمین پر۔
رودرانشو مترا: جہاں پناہ، میں جانتا ہوں۔
بہادر شاہ ظفر: کیا جانتے ہو تم؟ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں۔ تمھیں کچھ نہیں معلوم۔ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ انھوں نے ہمارے بیٹوں کو ننگا کر کے ذلیل کیا، انھیں بے رحمانہ طریقے سے، شقاوت کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ وہ شاہ زادے اور شاہ زادیاں تھیں۔ وہ تیمورِ اعظم کی نسل اور بابر کے وارث تھے۔ انھیں سفاکی کے ساتھ قتل کر ڈالا گیا۔ مرزا مغل، خضر سلطان اور ہمارا پوتا ابوبکر... انگریز ان کے قتل کے بعد ان کے سر ہمارے پاس لائے، مقتولین کے والد کے پاس۔ یہ سفاکی کی انتہا ہے۔ (نیم غنودگی میں اپنے ہاتھوں کو سہلاتے ہیں)
رودرانشو مترا: براہِ کرم، جہاں پناہ، اعلیٰ حضرت، جنابِ عالی، یور میجسٹی، ایگزالٹڈ ہائی نیس!
(بہادر شاہ ظفر وقفے وقفے سے خراٹے لیتے ہیں اور جب نیند سے جاگتے ہیں تو اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ دریں اثنا رودرانشو اپنے چاروں طرف بے بسی سے دیکھتا ہے کہ اچانک بادشاہ ظفر بیدار ہو جاتے ہیں۔)
بہادر شاہ ظفر: یا خدا! ایک اور برطانوی جاسوس۔ اب ہمارے پاس کون سی خفیہ باتیں رہ گئی ہیں۔ ہم تو بس اب اپنی موت کے اس لمحے کے منتظر ہیں جب ہمارے حق میں قدرت انصاف کرے گی۔ ہماری منکسر المزاجی سے سب واقف ہیں۔ پھر بھی یہ فرنگی لوگ ہمارا اور ہماری بیگم کا مذاق اڑانے کے لیے اجنبیوں کو یہاں لاتے ہیں۔ للہ، یہاں سے جاؤ اور ہمیں مرنے کے لیے، گلنے سڑنے کے لیے تنہا چھوڑ دو۔ ہمیں ہمارے غموں کے ساتھ مل کر آہ و زاری کرنے دو۔ اف، ہمارا درد۔ ان گوری چمڑی اور بے رونق چہرے والے حملہ آوروں نے ہماری سرزمین ہم سے چھین لی، اپنے ناپاک وجود سے اسے آلودہ کر دیا۔
رودرانشو مترا: جہاں پناہ! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔
بہادر شاہ ظفر: پھر تمھیں ہم سے کیا کام ہے؟ تم کیوں ہماری حکومت میں مخل ہوئے ہو؟ یا بتاؤ یا پھر یہاں سے چلے جاؤ۔ بولو، نوجوان۔
رودرانشو مترا: مجھے افسوس ہے، میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ کو کیسے مخاطب کروں؟
بہادر شاہ ظفر: نوجوان، کیا تمھیں انھوں نے دربار کے آداب بھی نہیں سکھائے؟ اگر تم نہیں جانتے تو پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمھیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اب تم جاؤ (اپنے ناتواں ہاتھوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں)
رودرانشو مترا: حضورِ والا براہِ کرم مجھے وضاحت کرنے دیجیے، میں یقیناً آپ کی دنیا کا حصہ نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ...!
بہادر شاہ ظفر: کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی جاتی ہے۔ اب جب حکومت ہمارے ہاتھ سے چلی گئی تو سب لوگ یہی بات کہتے ہیں۔ حکیم احسن اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے کیا نہیں کیا؟ ہم نے تیمور کی سلطنت کا دربار طباق میں سجا کر انھیں پیش کر دیا۔ ہم نے انھیں اپنے شہنشاہ کے ضمیر کا درجہ دیا مگر وہ بھی اس وقت دوسروں سے مختلف نہیں نکلے جب ہمارے خلاف گواہی دینے کی نوبت آئی۔ کتنے لوگوں نے رنگون کے سفر میں ہمارے ساتھ آنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اب تم بھی ہم پر طنز کر رہے ہو؟ جاؤ یہاں سے۔ ہم دھوکہ کھانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اچھا! ہمیں بتاؤ تم کون ہو اور کس دنیا سے آئے ہو؟
رودرانشو مترا: مجھے ڈر ہے وقت کم پڑ جائے گا۔ براہِ کرم مجھے یہاں سے جانے سے پہلے کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔
بہادر شاہ ظفر: کیا؟ وقت کم پڑ جائے گا؟ یہاں تو وقت رینگتا بھی نہیں ہے۔ یہاں تو وقت بھی جمود میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ کسی شکستہ گھڑی کی ٹوٹی ہوئی سوئیوں کی طرح خاموش ہے۔ اگر تمھیں وقت کی فکر ہے تو پھر تم کہیں اور جاؤ۔ اُف ہم کس قدر تھک گئے ہیں۔ ہمارا وقار کیوں نہیں بحال کر دیا جاتا؟ ہمیں ہمارے خاندانی جواہرات کیوں نہیں واپس کر دیے جاتے؟ ہماری بیگم اور شاہ زادیاں بھی پریشان ہیں۔ وقت نے ہم سے سب کچھ چھین لیا ہے، وقت کو اب تو یقیناً غنی ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں یہ وقت اب بھی کسی شکستہ کھلونے کے سپاہی جیسا منجمد اور بے معنی نظر آتا ہے۔
رودرانشو مترا: حضورِ والا۔ میں آپ کو اس گذرے زمانے میں واپس لے جانا چاہتا ہوں جہاں دیگر چیزوں کے ساتھ وقت پر بھی آپ کی حکمرانی تھی۔ آپ یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ہم نے آپ کو فراموش کر دیا۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہم آپ کو جانتے ہیں۔ آپ کو وہاں واپس آ جانا چاہیے جہاں آپ کی ضرورت ہے، کیوں کہ آپ وہیں کے ہیں۔
بہادر شاہ ظفر: کیا تم میرٹھ کے باغی نہیں ہو، جو اپنے مذہب اور اپنے عقیدے کی بحالی کے لیے اس ماحول میں برسرِ جنگ تھے جسے عقیدے سے عاری، لادین معاشرے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے تمھیں شارعِ عام پر پھانسی دینے کے لیے گرفتار نہیں کیا؟ خدارا، تم لوگوں سے ہمیں پہلے ہی بہت ایذا پہنچ چکی ہے۔ تم سب کو خوش گمانیاں تھیں کہ مرزا جواں بخت

ہندستان پر پھر سے حکومت کریں گے۔ فرنگی جبروت کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ وقت کو پیچھے کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن ٹھہرو، اب تم کیا نئی خبر لائے ہو؟ تم نے بہت طویل مسافت طے کی ہے۔ رنگون، دلّی سے میرٹھ کی بہ نسبت کہیں طویل فاصلے پر ہے، مگر ہنوز دلّی دوراست۔ آؤ ہمیں بتاؤ کیا تم دلّی کو جانتے ہو؟ اب دلّی کیسی ہے؟ کیا دلّی میں پہلے جیسے حالات واپس آ سکتے ہیں؟ اس کی عظمتِ رفتہ کیا دوبارہ اہلِ دہلی کا مقدر بن سکتی ہے۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ، دلّی آج بھی زندہ ہے۔ ہم نے خود کو فرنگیوں کی غلامی سے آزاد کرا لیا ہے۔ اب سے تقریباً نصف صدی قبل ہم آزاد ہوئے تھے۔ اب ہم تاریخ کی غلطیوں کی تلافی کر سکتے ہیں۔ اب ہم آپ کو بہ صد عزت و احترام دلّی واپس لے جا سکتے ہیں۔ آپ کے تئیں عقیدت بھرے جذبات کا اظہار عوام کے سامنے کر سکتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: تو اب مرزا غالب کو دلّی کا مرثیہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیا مرزا غالب نے ہمارا قصیدہ مکمل کر لیا، کیا انھوں نے خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام ختم کر لیا؟ کیا یہ فردوسی کے شاہ نامے سے بہتر شاعرانہ شاہ کار ہے؟ دلّی اب ویران تو نہیں ہے؟ کیا مسلمانانِ دہلی اپنے گھروں کو واپس لوٹ چکے ہیں؟ کیا جامع مسجد اب مکمل طور پر محفوظ ہے؟ اور ہمارے قلعۂ معلا کا کیا ہوا؟ یہ بات میری سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر برطانوی حکمراں ہندستان سے واپس چلے گئے ہیں تو ہمارے درباری ہمیں تختِ شاہی تک واپس لے جانے کے لیے کیوں نہیں آئے؟ انھوں نے کسی اجنبی کو کیوں یہاں بھیجا؟ ہمارے خیال سے ہم نے تمھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم تو صرف نصف صدی کی بات کرتے ہو، ہم نے تو اذیت رسانی کا کہیں طویل فاصلہ طے کیا ہے۔

رودرانشو مترا: میں ساری تفصیل عرض کروں گا، ذرا سانس لے لوں، معاف کیجیے گا میں ایک الجھن میں مبتلا ہوں۔ میرا مطلب ہے وقت کے حوالے سے...!

بہادر شاہ ظفر: (کھانستے ہوئے) یا خدا! یہ کھانسی ہماری سلطنت کے خاتمے کا اشارہ کر رہی ہے۔ اس جگہ ہماری موت ہوگی۔ اگر ہم زندہ رہے تب ہی تو ہمیں تم اپنی کہانی سنا سکو گے؟ ہمیں ایک طبیب اور دواؤں کی ضرورت ہے۔ دیکھو یہاں کس قدر نمی ہے، بالکل کسی قبر کی سی۔ کس قدر اندھیرا ہے؟ یا خدا! یہاں آکر تو دنیا کی روشنی بھی تاریک ہو گئی ہے۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ، آپ کو اب بھی عزت و احترام دیا جائے گا۔ میں بھی آپ کی توجہ کا خواستگار ہوں۔ میں اپنے ساتھ خوش گوار خبریں لایا ہوں۔ میں ہندستانیوں کی آواز بن کر آیا ہوں۔

بہادر شاہ ظفر: تمھارا مطلب ہے ہماری رعایا؟ ہندستان کی رعایا، مغل سلطنت کی رعایا۔ وہ ہندستانی تو نہیں جن کے ذہن کی تعمیر برطانوی حکومت نے کی ہے؟

رودرانشو مترا: جہاں پناہ، جیسا آپ مناسب سمجھیں، آپ کی جنگ ناکام نہیں رہی۔ آپ کے خوابوں کو ان کی تعبیر مل گئی۔ کاش آپ یہ سب دیکھ سکتے۔ میرے ساتھ تشریف لے چلیے براو کرم وہاں تشریف لے چلیے آپ جس سرزمین کے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: چلوں؟ مگر کیسے؟ کہاں؟ کیا میں اس پرانے اور فرسودہ کفتان کو زیب تن کیے ہوئے چل سکتا ہوں؟ میرے لیے گھوڑا لاؤ۔ ایک شہنشاہ بیاسی برس کی عمر میں بھی گھوڑ سواری کر سکتا ہے (کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن لڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں) میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں ہوں۔ لیکن میں واپس جا ہی نہیں سکتا۔ اب کہیں میرا گھر نہیں رہا۔ کیا تمھیں مرزا غالب کی بات یاد نہیں، جو انھوں نے کہی تھی کہ دلّی میں اس قدر بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا ہے کہ مقتولین کے لیے سوگ کا اظہار کرنے کے لیے بھی کوئی نہیں بچا۔ انھوں نے میرے لیے مہرولی میں ایک قبر مخصوص کر دی ہے۔ پھول والوں کی سیر میری قبر تک یقیناً آئے گی۔ کیا وہاں ہندو مسلمان سب آئیں گے؟ اپنے بادشاہ کو خدا حافظ کہنے (اچانک روشنیاں ختم ہو جاتی ہیں)

پہلا ایکٹ تیسرا اسین

(سارہ، رودرا اور پربھات یونی ورسٹی پلازا میں ایک ساتھ ٹہل رہے ہیں)

سارہ: مجھے بتاؤ کہ تمھارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟ تم اس قدر الجھے الجھے سے کیوں لگ رہے ہو؟ ہم سب کو تاریخ سے بہت دل چسپی ہے مگر یہ بہر حال ایک مردہ شے ہے جو ہمارے اس ماضی کی یاد دلاتی ہے جسے واپس نہیں لایا جا سکتا! جسے دہرایا نہیں جا سکتا... حال میں جس کی کوئی افادیت نہیں۔ لیکن... یقیناً...

رودرانشو مترا: معاف کرنا سارہ، مجھے معلوم ہے کہ آج کل میرا رویّہ کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہر شے اجنبی اور الجھی سی محسوس ہوتی ہے۔

پربھات شرما: دوسرے دوست بتا رہے تھے کہ تم لائبریری میں بہت بدحواس اور پریشان نظر آ رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ تم نے کسی تکلیف دہ چیز کا تجربہ کر لیا ہو، کسی بھوت سے تمھاری ملاقات ہو گئی ہو اور وہ اس صاحب واقعی

بہت ناراض تھے کہ ان کے انتباہ کے باوجود تم ٹیوٹوریل سے چپت ہوگئے۔

رودرانشو مترا: ہاں میں جانتا ہوں۔ لیکن میں بے بس تھا۔ اچھا آؤ میں تمھیں بتاؤں۔ لیکن صرف تم دولوگوں کو۔ اگر تم نے اور لوگوں سے بتادیا تو میں مذاق کا موضوع بن جاؤں گا۔ درحقیقت میں ایک عجیب وغریب تجربہ سے دوچار ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بہادر شاہ ظفر سے بالکل اسی طرح گفتگو کرسکتا ہوں جس طرح کہ میں تم لوگوں سے کررہا ہوں۔

پربھات شرما: یعنی کہ تم آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی آخری آرام گاہ تک پہنچ گئے تھے؟ اب تمھیں شاید رنگون کے سفر کے لیے 'گرانٹ' کی ضرورت نہیں رہ گئی۔

رودرانشو مترا: اف میرے خدا، تم لوگ اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟ اگر ایسا ہے تو اب میں کوئی بات نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔

سارہ: ارے ہم بہت شرمندہ ہیں کیوں پربھات؟ واقعی مجھے بے حد افسوس ہے۔ ہمیں بتاؤ شاید اس سے ہمیں تمھارے جذبات کو سمجھنے میں مدد ملے۔ کیا یہ کچھ اس طرح تھا جیسے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ مردوں کو بلا سکتے ہیں اور ان سے گفتگو بھی کرسکتے ہیں۔

رودرانشو مترا: ان سے گفتگو کا جو ذریعہ تھا، یا وسیلہ بنایا اس کے لیے ہم واسطے کا لفظ استعمال کرسکتے ہیں، اس کی منطقی توجیہہ مشکل ہے لیکن مجھے ان کی موجودگی اور ان کے ساتھ رہنے کا عجیب وغریب تجربہ ہوا۔ یہ تجربہ اس زمانے سے متعلق ہے جب وہ زندہ تھے۔ اس تجربے یعنی ملاقات کی جگہ رنگون تھی۔ ایک میلا کچیلا، بدرنگ، بدوضع چھوٹا سا مقام۔

پربھات شرما: کیا یہ کوئی عام سا خواب نہیں معلوم ہوتا ہے؟ ایسا ہوسکتا ہے کہ تم لائبریری میں سو گئے ہو یا پھر کسی ایسے عالم خیال میں ہو جہاں تمھیں کسی غیر موجود شے کے وجود کا احساس یا وہم یا پھر یوں کہیں کہ فریب خیال...

رودرانشو مترا: نہیں یہ تجربہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ انتہائی خیرہ کن اور حقیقت سے نزدیک نظر آنے والا۔

سارہ: کہیں یہ کوئی نفسیاتی تجربہ تو نہیں تھا؟ پھر انھوں نے کیا کہا؟

رودرانشو مترا: یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہوگیا۔ لیکن وہ بہت بیزار اور مایوس نظر آرہے تھے۔ وہ مجھ سے اپنی گفتگو شروع ہی کرنے والے تھے کہ میں ان کے سامنے گیا۔ انھیں تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں کون ہوں؟ لیکن میں نے ان سے بالمشافہ گفتگو کی اور انھوں نے مجھ سے بات چیت کی۔ اُف! وہ بہت ہی مایوس اور کمزور اور حواس باختہ نظر آرہے تھے۔

پربھات شرما: ٹھیک ہے۔ اب آؤ سنجیدگی سے دیکھیں کہ تمھیں یہ تجربہ کیسے ہوا۔ لیکن کیا تم اس تجربے کو جاری رکھنا چاہتے ہو۔ یا تم سمجھتے ہو یہ تجربہ دوبارہ بھی ہوگا۔

رودرانشو مترا: یہ بات میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟ لیکن یہ بات میں یقیناً جانتا ہوں کہ وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہتے تھے۔ یہ گفتگو ماضی کی بازگشت کی طرح ہے، کسی قصہ گو کی ادھوری کہانی۔

سارہ: اور ان کی وہ ادھوری خواہش...! دو دن آرزو کے اور دو دن تجربے کے! وہ کیا آرزو تھی وہ کیا تجربہ تھا؟

پربھات شرما: عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

آفتاب: ہائے دوستو! یہ آرزو کی کیا کہانی ہے؟ کیا ہم اس کی تکمیل کے لیے کچھ کرسکتے ہیں؟ اگر سنیما دیکھنے چلیں تو کیسا رہے گا؟

سارہ: کیا مووی؟ کیوں نہ ہم 'برج' کے علاقے میں واقع آثار قدیمہ کی یادگاریں دیکھنے چلیں۔ وہاں قلعے کی فصیل پر ایک بڑا خوبصورت ڈرامہ کھیلا جارہا ہے۔ میں تم سب کو دعوت دیتی ہوں، آؤ چلیں۔ آؤ نا۔

رودرانشو مترا: شکریہ! بڑا لطف آئے گا، ہوسکتا ہے کہ مجھے خود اپنے ڈرامے کے لیے اس سے کچھ راستہ مل جائے۔ اگر آپ کچھ حقیقی باتیں نہیں کرسکتے تو کیوں نہ ماضی کی بازیافت کی جائے۔

آفتاب: چلو ہم... چلیں گے۔ سارہ اور رودرا، تم لوگ ڈرامے میں وقت سے پہنچ جانا اور اگر تم چاہو تو بہادر شاہ ظفر کو بھی اپنے ساتھ لیتے آنا۔ خدا حافظ۔

رودرانشو مترا: ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ آفتاب کبھی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ (سارہ کی طرف مڑکر) سارہ، تم یہ بتاؤ کہ تم واپس ہندستانی یونی ورسٹی میں پڑھنے کیوں آئیں؟ ہم سب لوگ تو بیرون ملک جانے کے لیے بے چین رہتے ہیں اور تم نے اس سے بالکل اُلٹی بات کی۔

سارہ: تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟

رودرانشو مترا: مجھے نہیں معلوم کہ یہ میں کیوں پوچھ رہا ہوں۔ تم گذشتہ کچھ وقت سے ہمارے ساتھ ہو لیکن میں اب بھی تمھارے بارے میں بہت کم جانتا ہوں۔ میرا مطلب کہ تم انتہائی خوش گوار شخصیت کی حامل ہو۔

سارہ: یہ ایک ذاتی سچائی ہے۔ یوروپ میں کسی مخلوط شادی کی اولاد ہوکر پروان چڑھنا اس لیے بہت دشوار ہوتا ہے کیوں کہ والدین بچوں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں ہی کی ثقافت کو اختیار کریں۔ اکثر والدین کے درمیان اس بات پر رسہ کشی ہوتی ہے کہ بچہ دونوں میں سے کس کا کلچر اپنائے۔ خوش قسمتی سے میرے والد بہت ہی دل چسپ واقع ہوئے ہیں۔ اب وہ مغربی

سے زیادہ ہندستانی ہو گئے ہیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں یہاں تعلیم حاصل کروں اور مجھے ہندستانی ہونے کی اصل حقیقت کا تجربہ حاصل ہو۔

رودرانشو مترا: اچھا تو یہ تم ان کے لیے کر رہی ہو؟

سارہ: اس بات کا جواب ہاں اور نا دونوں میں ہو سکتا ہے۔ میں اپنے طور پر بھی جاننا چاہتی تھی کہ میں حقیقتاً کیا ہوں؟ میں اس خیال سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی کہ میں ہندستانی ہوں۔ اپنی بازیافت کا یہ ایک بے حد اہم موقع ہے۔

رودرانشو مترا: اور بدلے میں تمھیں یہاں یونی ورسٹی کیمپس کے کچھ بے ڈھب لوگوں سے واسطہ پڑا۔

سارہ: اپنے بارے میں کیا خیال ہے، تم لوگوں کے لندن سے ہندستان کے سفر کو کامیاب کہا جا سکتا ہے۔

رودرانشو مترا: لیکن کیا تم اس بات سے پریشان ہوتی ہو کہ دوسری لڑکیوں کی بہ نسبت تم پر کچھ مختلف ہی قسم کی توجہ دی جاتی ہے۔

سارہ: بالکل نہیں۔ مجھے ایسا کبھی نہیں لگا۔ ویسے توجہ کسے اچھی نہیں لگتی؟

رودرانشو مترا: اچھا، سمجھ گیا۔ لیکن اب اس تجربے کے بعد تمھارا اگلا قدم کیا ہوگا۔ کیا تم یہاں اور رکنا چاہو گی۔

سارہ: سچائی یہ ہے کہ انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جس قسم کے رشتے بن چکے ہیں، وہ ایک ایسا پاگل پن ہے جس سے مجھے انتہائی مایوسی ہوتی ہے۔ لوگ جن چیزوں کو لے کر ایک دوسرے سے پریشان ہوتے ہیں حقیقتاً وہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ہندو مسلم تنازعے سے اس ملک کے اشراف کو سچ مچ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں نے ہندو مسلم مسئلے پر بہت غور کیا مگر وہ وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی جو ان دونوں مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے خلاف مسلسل نبرد آزما اور ذہنی ہیجان میں مبتلا رکھتی ہے۔ سچ پوچھو تو ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے کوئی پریشانی نہیں ہے: بہ ظاہر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہ خوبی نباہتے ہیں۔ میں آفتاب اور اپنے دیگر دوستوں کو دیکھتی ہوں: قطعی کوئی مسئلہ نہیں۔ پھر دوسرے بہت سے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ آخر کیا پریشانی ہے؟

رودرانشو مترا: یقیناً ہمیں کیک کے ایک ٹکڑے کے لیے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں ویسے ہی خاصا کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔

سارہ: جہاں تک ہندستان میں ہونے والے سیاسی جھگڑوں اور احتجاجوں کا معاملہ ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کافی ہو چکا۔ کسی کو ان چیزوں کی بہ ظاہر کوئی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں کے مسائل اٹھائے جانے چاہئیں وہ تو ہر سیاسی بحث اور احتجاج سے غائب رہتے ہیں۔

رودرانشو مترا: بدقسمتی سے یہی ہماری معاشی سچائی ہے کہ ہمارے ہاں سیاست صرف حصولِ اقتدار کے لیے کی جاتی ہے۔ لوگ اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ وہ اپنی غریبی کو تقدیر کا لکھا اور خدا کی مرضی تصور کر لیتے ہیں۔ انھیں شروع ہی سے یہ تربیت دی جاتی ہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہی ہوگا اور خدا کی مرضی کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ دوسری طرف معاصر سیاست صرف جوڑ توڑ اور غیر تربیت یافتہ ذہنوں کو بے وقوف بنانے کا عمل بن کر رہ گئی ہے۔ اقتدار کی بھوک تمام اصولوں کو فنا کر چکی ہے۔

سارہ: مذہب اور شناخت کے نام پر غریبوں کو باہم متصادم کرا کر انھیں بنیادی ضروریات کے مطالبے سے دور رکھنا کامیاب تخریب کارانہ سیاست ہے۔ اس کے نتائج ہندستان کے لیے بہت خوف ناک ہوں گے۔ ہندستان میں تو اب ایسا لگتا ہے کہ یہاں کوئی ہندستانی رہتا ہی نہیں۔ کوئی ہندو ہے تو کوئی مسلمان، کوئی خود کو اقتصادی طور پر پسماندہ کہتا ہے تو کوئی پچھڑی ذات کا۔ کوئی دلت ہے تو کوئی عیسائی یا پھر دلت عیسائی۔ اس بحث میں ہندستانی معدوم ہو گیا ہے۔

رودرانشو مترا: کارل مارکس نے اسی لیے تو مذہب کو لوگوں کے لیے افیم بتایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں لوگ اس افیم کے مستقل نشے میں ہیں۔ پورا ہندستانی معاشرہ مجموعی ترقی کے معاملے میں ایک قدم آگے تو دو قدم پیچھے کی روش پر چل رہا ہے۔

سارہ: مگر کیا یہ دانش ور طبقے کا فرض نہیں ہے کہ وہ ان خرابیوں کے خلاف عوام کو بیدار کرنے کی ذمہ داری نبھائیں! میرا تجربہ یہی ہے کہ ہندستانی دانش ور عمل کے نام پر جو کچھ کرتے ہیں اس کا مقصد شہرت دولت اور اعزاز حاصل کرنے کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گرامشی کے صحیح مفہوم میں inorganic intellectuals ہندستان ہی میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے اکثر پڑھے لکھے لوگ اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ شاید طویل غلامی کے اثرات ہیں جن کے زائل ہونے میں بہت وقت لگے گا۔

رودرانشو مترا: مجھے تمھاری بات سے مکمل اتفاق ہے۔ ہمارا ماضی ناانصافی کے ایک نئے دور کو جنم دے چکا ہے۔ مگر کون سمجھتا ہے؟ کوئی نہیں سمجھنا چاہتا۔

سارہ: میں سمجھتی ہوں۔ میں سمجھنا چاہتی ہوں۔

رودرانشو مترا: مجھے معلوم ہے۔ اس سے پہلے کہ ستیاگرہ شروع ہو جائے، ڈرامہ دیکھنے چلیں۔ وہ لوگ چیخ پکار شروع کر دیں گے۔ ہمیں حال کو بہتر بنانا چاہیے، مستقبل اپنے آپ بہتر ہو جائے گا۔

سارہ: خدا کا شکر ہے کہ تم 1857 سے نکل آئے۔ ماضی سے نکل کر حال کی باتیں کرنے لگے۔ تم ایسے ہی رہو گے یا پھر ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاؤ گے؟

پہلا ایکٹ، چوتھا سین

بہادر شاہ ظفر: ارے، خوش آمدید، میرے سورج کی ننھی سی کرن، تم آگئے؟ ہم نے تو تمھارے بارے میں امید ہی چھوڑ دی تھی۔ ہمیں لگا تھا کہ تم دوبارہ نہیں آؤ گے۔ اللہ رے یہ تنہائی۔ اب تم ہمیں یہ بتاؤ، تم کون ہو؟ ہمیں بڑی بے چینی ہے۔ تم ہمارے اس سونے کے پنجرے میں کیسے آگئے؟ یہ قید بافراغت تو ہمارے ہی لیے سوہانِ روح ہے۔ تمھاری اس میں کیا دل چسپی ہے؟

رودرانشو مترا: جہاں پناہ میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں اور میرا مقصد ماضی کی بازیافت کرنا ہے۔ میں بابر کے عہد کا مطالعہ کر رہا ہوں، اس عہد کے ان محرکات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں جن پر اب تک کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔

بہادر شاہ ظفر: اوہ، اچھا۔ تو تم ابوالفضل کی نسل میں سے ہو۔ تم تاریخی حقائق کی بازیافت تو کر سکتے ہو مگر ماضی کی غلطیوں کو اب درست نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بھلا ہمارے ان اجڑے ویران، نامراد، فلاکت زدہ ایام کی تاریخ میں کس کی دل چسپی ہوگی۔ لوگ شکست کی تاریخ پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ تاریخ تو دراصل فاتحین کی ہوتی ہے۔ فاتحین کے لیے ہوتی ہے اور فاتحین کے ذریعے ہی لکھی بھی جاتی ہے۔ اور ہم تو 1857 کے اس بدقسمت دن ہی تاریخ میں اپنے مقام سے اس وقت محروم ہو گئے تھے جب فرنگیوں نے دلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ، مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے لیکن پہلے میں آپ پر واضح کردوں کہ عظیم تاریخ عظیم واقعات سے مرتب ہوتی ہے۔ ابوالفضل کی حیثیت موجودہ تاریخ نویسی کے معماروں میں بس ایک وقائع نگار کی ہے۔ انھوں نے واقعات کی کھتونی مرتب کر دی ہے، ان کا تجزیہ نہیں کیا اور دربار سے وابستہ ہونے کے سبب وہ یہ کام کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک جدید مورخ کی حیثیت سے میرا کام یہ ہے کہ ماضی کے واقعات کو عہدِ حاضر کی تفہیم کے لیے صحیح تناظر میں مرتب کروں اور ان کے اسباب و اثرات نیز محرکات پر بھی غور کروں تا کہ مستقبل سے روبرو ہونے کی تیاری کی جا سکے۔ تاریخ سے سبق لیا جانا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے پاس درست تاریخ ہو، اس کو سمجھنے والی نظر ہو۔

بہادر شاہ ظفر: تم ضرور ایسا کرو۔ زندگی بہرحال اپنے نتائج خود اخذ کرتی ہے۔ زندگی یقیناً مورخین کے واہموں کے سہارے آگے نہیں بڑھتی۔ کوئی بے نتیجہ لوگوں کے بارے میں پڑھنا کیوں پسند کرے گا؟ تم ہی بتاؤ کیا تم ہمارے غلاموں اور ملازمین کے بارے میں لکھنا پسند کرو گے؟ یا غریب منگل پانڈے کے بارے میں جو بجلی کی چمک طرح کوند کر غائب ہو گیا، لکھنا پسند کرو گے؟

رودرانشو مترا: لیکن جہاں پناہ، منگل پانڈے کی تاریخ تو آپ کی اپنی ہی تاریخ ہے۔ 1857 تو ہندستان کی تاریخ میں دراصل ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ہمارے ہاں تاریخ نویسی میں بڑی گڑبڑ ہوئی۔ مورخین نے مطلوبہ محنت نہیں کی۔ اکثر تاریخیں انگریزی دستاویزوں کی بنیاد پر مرتب ہوئی ہیں۔ عہدِ وسطیٰ سے دل چسپی رکھنے والے ہمارے اکثر مورخین پر الزام ہے کہ وہ کاہل ہیں اور انھوں نے تاریخ نویسی بیگار کی طرح کی۔ میرا مطلب ہندستان سے ہے۔ ویسے اب ان سب لوگوں کی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں جنھوں نے تاریخی عوامل کی تشکیل میں کوئی رول ادا کیا۔ وہ لوگ خواہ معمولی کسان، گھریلو ملازم ہی کیوں نہ ہوں۔ معمولی اور غیر اہم لوگوں کی تاریخیں لکھنا تو اب ایک فیشن ہو گیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر: دل چسپ بات کہی کہ عہدِ وسطیٰ خصوصاً 1857 کی تاریخ لکھنے والے اکثر تمھارے مورخین کاہل ہیں۔ سنجیدہ تاریخ لکھنے کے لیے جس مطالعے اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے لیے تیار نہیں اس لیے انھوں نے ایسے لوگوں کی تاریخ نویسی کو فیشن بنا لیا جن پر لکھنے کے لیے تحقیق کی ضرورت ہی نہیں۔ بہرحال، جہاں تک 1857 کے واقعات کا تعلق ہے تو جس طرح جنگ کا خاتمہ ہوا اس سے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ جنگ شروع ہی نہیں ہوئی تھی جو ہوا اسے زیادہ سے زیادہ ایک کوشش کے ایسے انجام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کا صحیح معنوں میں آغاز ہی نہیں ہوا۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ، ٹھیک یہی میرا مطلب ہے۔ دراصل 1857 کا اختتام اس طرح نہیں ہوا جس طرح آپ نے سوچا تھا بلکہ اس طرح ہوا کہ اب ہم آزاد ہیں، ہندستان آزاد ہے اور ہمیں آزاد ہوئے پچاس برس سے زائد کی مدت گذر چکی ہے۔ اب یہ تو ہمارے تصور کی نارسائی ہے، مستقبل کے لیے وژن کا فقدان ہے جس نے ہمیں تاریخ کی اندھیری اور اجاڑ کال کوٹھری میں قید کر رکھا ہے اور ہم مستقبل کو سنوارنے کے بجائے صرف ماضی کی غیر ضروری تفصیلات سے الجھ رہے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: لیکن اب ہمارے پاس عظیم مغلیہ سلطنت کے متمم بالشان ماضی کا تصور ہی تو رہ گیا ہے۔ بھیانک غیر ملکی طوفانوں نے ہمیں نہ صرف بے مقصد ذہنی اذیت رسائی میں مبتلا کر کے تختِ شاہی سے بے دخل کر دیا بلکہ ہمیں اب اپنے ملک میں دو گز زمین ملنے کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ ایک شہنشاہ کے لیے فراہم کی جانے والی زمین بھی اپنی وہ زمین نہیں ہے جہاں اس کی تدفین ہو سکتی۔ اُف! یہ فراموش کیے جانے کا دکھ بھی بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ چشم زدن میں سب کچھ ختم ہو گیا اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ، براہِ کرم آپ مایوس نہ ہوں۔ آج ایک عظیم قوم آپ کو اپنا ہیرو مانتی ہے۔ آپ نے اس قوم کے ذہنوں میں آتش فشاں جگا دیے۔

آپ نے کروڑوں لوگوں کو جنگِ آزادی میں شریک ہونے کی تحریک دی۔ آپ کے الفاظ نے ہمارے دلوں کو چھو لیا۔ ہم آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

بہادر شاہ ظفر: نہیں اب کوئی پروا نہیں کرتا۔ خراجِ تحسین کے ایک یا دو لفظ اور بس۔ اس وقت بھی کسی نے ہماری بات پر توجہ نہیں دی۔ ہم نے اس وقت کے راجاؤں، نوابوں اور شرفا سے اپیل کی تھی کہ جنگ ایک پرچم کے تلے متحد ہو کر لڑی جائے لیکن ان میں کسی نے ہماری بات نہیں سنی۔ ہم نے اپنی رعایا سے بھی کہا کہ وہ خود کو ہندستانی سمجھیں، ہندو اور مسلم نہیں، لیکن کسی نے ہماری بات نہیں سنی۔ یہ تنہا ہماری جنگ نہیں تھی۔ ہم کون تھے؟ ہندو اور مسلمان دونوں کے مفادات کے محافظ۔ فرنگیوں نے ہندستانیوں کو مذہب کے نام پر آسانی سے بانٹ کر اسے مسلم بغاوت کا نام دے دیا جب کہ باغی سپاہیوں میں سے بیش تر ہندو بلکہ اعلا ذات کے ہندو تھے۔

رودرانشو مترا: اس کے باوجود آپ نے آزادی کی شمع روشن کی۔ آپ نے 15 اگست 1947 کے سورج کو اس کے شکوہ سے، عظمت و شوکت سے آراستہ کیا۔ اپنی شاعری میں ہمیں ہماری آزادی کی تصویر دکھائی دی۔

بہادر شاہ ظفر: ہندوؤں اور مسلمانوں کا متحد ہونا کچھ مشکل نہیں۔ ہندو مسلم تنازعات کی تاریخ دو سو برس سے پرانی نہیں اور قوموں کی زندگی میں سو دو سو برس کی مدت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ برطانوی اقتدار کے دورِ عروج میں کبھی کسی نے یہ سوچا نہ ہوگا کہ کبھی ہمارا بھی ذکر کیا جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کوئی اس وقت مدد کے لیے نہیں آیا تھا جب ہڈسن جواں سال شہزادوں کو بے رحمی سے قتل کرنے کے بعد ہماری بیگمات کے جواہرات بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہم نے اپنی بیگم کو سمجھایا کہ بیگم یہ سطحی، نمائشی زیورات، ہمیں اپنے باطن میں جھانکنے سے روکتے تھے۔ ہمارا خالق جانتا ہے کہ ہم کیا ہیں؟ محض گوشت اور ہڈیاں آخرش جنھیں مٹی ہی میں مل جانا ہے۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ! آپ ہم سب کے لیے زیورات سے کہیں زیادہ وقعت اور اہمیت رکھتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: نہیں وقت کا محض ایک وفادار ساتھی جو خاموشی کے ساتھ ہر اس زخم کو برداشت کرتا رہے جو وقت اسے دے۔ لیکن ارے ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟ ہمیں ہماری اپنی ہی سرزمین سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

رودرانشو مترا: حضور والا اب سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ برطانوی لوگ اب ہمارے دوست ہیں اور اب ہم سب لوگ دولتِ مشترکہ کا حصہ ہیں۔ یہ سب کچھ بھی وقت نے ہی کیا ہے۔ وقت نے ہم سے بہت کچھ چھین لیا مگر اسی وقت نے ہمیں بہت کچھ دیا بھی تو ہے۔

بہادر شاہ ظفر: لیکن کیا تم یہ بھول گئے کہ انھوں نے دلّی میں معصوم بچوں اور نرم و نازک خواتین کے ساتھ کیسا خطرناک سلوک کیا تھا؟ کس طرح انھوں نے کان پور اور غازی پور میں آزادی کے بہادر سپاہیوں کو سڑک کے کنارے کے پیڑوں پر عام چوروں کی طرح پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ تم یہ بھی بھول گئے کہ انھوں نے کس طرح تمھارے بادشاہ کو ہراساں اور پریشان کیا تھا؟ کس طرح پوری دلّی کو منہدم کر دیا گیا تھا؟ کیا تم یہ سب کچھ بھول گئے؟ یہ سب کرنے کے بعد انگریز آخر کس قسم کی دوستی کی بات کرتے ہیں۔

رودرانشو مترا: مجھے معاف فرمائیں جہاں پناہ! لیکن ہم نے بھی ان کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔ میرٹھ اور فتح گڑھ کے پریڈ میدانوں میں ہم نے بھی قتلِ عام کیا ہے۔ گرجا گھروں میں بدقسمت مجبور عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام۔ ہم نے بھی گنگا، ستی چورہ گھاٹ اور جونا گڈھ سے فرار ہونے والے خاندانوں پر حملے کیے ہیں۔ آخر لال قلعے میں بھی کیا کچھ نہیں ہوا؟ کس بے رحمی کے ساتھ مس جینکنس اور مس کلیفرڈ کے ساتھ زنا کر کے انھیں قتل کر دیا گیا۔ ہم ان سے کم زہریلے، موذی اور خون کے پیاسے نہیں تھے۔

بہادر شاہ ظفر: وہ ہندستان کے لیے جہاد تھا، انصاف کے لیے کی جانے والی ایسی مقدس جنگ جس میں مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ خدا ان پر رحم فرمائے۔ ہم نے قتلِ عام کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کسی نے ہماری بات سنی ہی نہیں۔ خدا ہمارا گواہ ہے۔ ہم نے دو بار یورپی قیدیوں کو بچایا۔ انقلاب کا چہرہ مشفق و مہربان نہیں ہوتا۔ لیکن انگریزوں نے بھی تو دلّی کے ساتھ کیا کیا؟ ایک عظیم روایت کے علم بردار اس شہر کو انھوں نے پوری طرح منہدم اور تباہ کر دیا اور شہر کے جس حصے کو وہ بہ وجوہ چھو نہیں سکے اسے بھی ذلیل کرنے میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انھوں نے فتح پوری کی مسجد کو ایک ہتھیار خانہ بنا دیا تھا۔

رودرانشو مترا: لیکن جہاں پناہ۔ آپ نے تو ابھی خود ہی فرمایا تھا کہ تاریخ تو فاتحین ہی لکھتے ہیں۔ وہ وقت ان کا تھا، یہ ہمارا ہے۔

بہادر شاہ ظفر: تو کیا ہندستان کو وہ آزادی مل گئی جس کی تم بات کر رہے ہو؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ ہمیں ملا ہوگا وہ فاتحین نے محض فیاضی کی نمائش کی خاطر دیا ہوگا۔ جہاں تک تاریخ نویسی کا سوال ہے تو میرے دوست، مورخ تو روشنائی سے تاریخ لکھتے ہیں۔ تاریخ نویسی ان کا کاروبار ہے۔ اصل تاریخ وہ ہوتی ہے جسے عوام اپنے خون سے لکھتے ہیں۔ ہم سے اس بات کی تصدیق اس شخص نے بھی کی تھی جو فرنگیوں کی طرح ہی جوتوں اور وردی میں ملبوس تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشرق سے اور دور دراز ملک جاپان سے آیا تھا۔

رودرانشو مترا: آپ کا مطلب ہے نیتا جی سبھاش چندر بوس۔ لیکن وہ بھی تو

کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ تو بہت بعد میں آئے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ سے بہت بعد میں۔

بہادر شاہ ظفر: بولتے رہو۔ ہم اب تک متعدد بار مر کر سڑتی ہوئی ایسی شاہی ہڈیوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں جن کی دیکھ بھال رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح کی جائے گی جس طرح ان نادار مفلس فقیروں کی کی جاتی ہے جو سڑک کے کنارے مر جاتے ہیں۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ! بڑی آسانی سے تاریخی آثار نے آپ کی راہیں ہموار اور گل پوش کر دیں۔ اس کے لیے تاریخ کی تردید کیوں کی جائے؟ آپ کسی پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے۔ میں یہاں ایمان داری سے آپ کے لیے آیا ہوں۔ جہاں پناہ! آپ تاریخی واقعات سے بہت جلدی ناراض ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کو ہدف تنقید بنانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ کسی پر بھی یقین کیوں نہیں کرتے۔ میں یہاں صرف آپ کے لیے آیا ہوں، صرف آپ کے لیے! جہاں پناہ۔

بہادر شاہ ظفر: یقین، ایسا شخص کیا یقین کرے جس کی پیدائش تو شہنشاہ شاہ جہاں کے محل میں ہوئی ہو لیکن اب وہ ایک اندھیری اور اجاڑ کوٹھری میں قید ہو؟ جب طاقت ور لوگ نرم خو ہو جاتے ہیں تو تاریخ ٹھوکریں کھانے لگتی ہے۔

رودرانشو مترا: مجھے افسوس ہے، میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وقت کی سوئیاں الٹی گھوم رہی ہیں۔ پھر بھلا میں کس طرح آپ سے تخاطب کی سعادت حاصل کر سکتا تھا، آپ سے ملاقات میرے لیے یقیناً بڑا اعزاز ہے لیکن آپ تو خود ہی تاریخ کا حصہ ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: (ہنستے ہوئے)۔ ہم یقیناً تاریخ ہیں۔ ہم لمحۂ موجود میں جیتے ہوئے بھی داستانِ ماضی کا پارینہ باب ہو گئے ہیں۔ ہم ایک شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی غدار کہے جاتے ہیں۔ ہم کچھ بھی نہیں ہیں لیکن پھر بھی تم جیسے لوگ ہماری مداخلت کے خواہاں رہتے ہیں۔ تم جب اس نادار شہنشاہ کے دربار میں آئے تھے تو تم نے اس کے ہولناک آداب کا بھی مشاہدہ کیا ہوگا۔ (دوبارہ ہنستے ہوئے) اب ہم بہت تھک چکے ہیں (جماہیاں لیتے ہوئے) ہماری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں۔ اب ہمیں سو جانا چاہیے اور اے میرے نوجوان مورخ اس وقت ہماری آج کی ملاقات کا اختتام ہوگا۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ براہِ کرم جائیں نہیں، مجھے ضرورت...

بہادر شاہ ظفر: کیا تم بہت کچھ نہیں سن چکے ہو اور کافی کچھ نہیں دیکھ چکے ہو؟

رودرانشو مترا: معذرت خواہ ہوں لیکن میں آپ سے ابھی اور بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

بہادر شاہ ظفر: ابھی نہیں، تمھیں انتظار کرنا ہوگا۔ تمھیں مجھ فقیر ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی کے لیے انتظار کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ ہم نے بھی تو انتظار کرنا سیکھ لیا ہے۔ پھر آنا تو ہم تمھیں بتائیں گے کہ انگریزوں نے کس طرح ہم پر مقدمے چلائے؟ اب جاؤ ہم واقعتاً بہت تھک چکے ہیں۔ وقت کافی ہو چکا ہے اور اب یہ ہمارے آرام کا وقت ہے۔ (بہادر شاہ ظفر اپنے بستر پر گرتے ہیں اور سو جاتے ہیں)

رودرانشو مترا: سو جائیے، عالی جاہ! سو جائیے۔ آپ کی رعایا اور مورخین انتظار کر سکتے ہیں کیوں کہ جو کچھ آپ کے دل میں ہے وہ آپ کی روح اور آپ کی پیاری سرزمین کے سکون کے لیے باہر آ جانا چاہیے۔ آپ کی وہ پیاری سرزمین جسے آپ کی زندگی کے سانحے نے بار بار اور بری طرح زخمی کر دیا ہے۔

(وہ آس پاس ٹہلنے لگتا ہے اور پھر بیٹھ کر خود بھی سو جاتا ہے)

تیسرا ایکٹ تیسرا اسین

(اکبر کا دربار۔ بادشاہ ایک صوفی کے ساتھ مصروف گفتگو ہے)

اکبر: بابا! مجھے وضاحت کرنے کی اجازت دیجیے: دینِ الٰہی ایک عمومی مذہب نہیں ہے۔ دراصل، اس کا مقصد، قادرِ مطلق کو راضی یا خوش کرنا نہیں ہے۔ یہ تو درونِ ذات میں سفر کی طرح ہے۔ خود کو پہچاننے کا راستہ ہے۔

بابا: لیکن جہاں پناہ! کیا اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندو مذہب کی علامتوں اور طریقوں کو اختیار کیا جائے؟ اپنے اندر جھانکنے کے متعدد طریقے اسلام میں پہلے سے موجود ہیں۔

اکبر: ہم جانتے ہیں بابا، اور ہم ان کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ ہماری سلطنت ہندستان کے آر پار دکن تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے لیے ایک سلطنت تو کھڑی کر لی ہے لیکن ہم اپنے اردگرد کے عیش و عشرت میں کھو کر رہ گئے ہیں، اندرونِ ذات کے نظاروں کے لیے جس ریاضت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے جو تنہائی درکار ہے، وہ ہمیں میسر نہیں۔ اپنی رعایا کے تجربات بانٹنا بھی ہماری ہی ذمے داری ہے۔ اس لیے ہم نے دینِ الٰہی کو تمام مذاہب کو مع اسلام کے ایک نکتے پر مرتکز کرنے کے لیے استعمال کیا۔

بابا: تو آپ اپنے آپ کو کس حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے مائی باپ، ایک حکمراں یا ان کی قسمتوں کے مالک؟

اکبر: بابا۔ سچ بتائیں بابا، ہمیں آپ کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ ایک درویش ہونے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟ زندگی میں عیش و عشرت اور کسی بھی قسم کے تکبر سے عاری ہونے کا احساس؟ آپ کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے۔

بابا: تو آپ کے دل کے کسی گوشے میں بھی، گوشہ نشینی کی تمنا موجود ہے؟ جب بھی آپ میرے پاس آئے میں نے یہ بات محسوس کی ہے۔ لیکن آپ ایک شہنشاہ ہیں، آپ اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ آپ تو حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اعلا فلسفے اور روحانیات کا اقتدار کے ساتھ اینٹ اور گھڑے جیسا رشتہ ہے۔

اکبر: ہم جانتے ہیں بابا، ہم جانتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی محض گوشہ نشینی کی بات کرنے سے ہی، ہماری روح کو ہر قسم کی کشیدگی اور فکروں سے نجات مل جاتی ہے۔

بابا: آپ اللہ پر یقین رکھتے ہیں؟ وہی لوگوں کو حکمراں بناتا ہے اور حکمرانوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

اکبر: یقیناً بابا۔ ہمیں اکثر یہ سوال پریشان کرتا رہتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ایک شہنشاہ کو اس کی رعایا سے مختلف بنا دیتی ہے۔ جسم سے روح کے جدا ہو جانے کے بعد، ہم سب ہی کو چھ فٹ گہری لحد میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ (سلیم درباریوں کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے) آؤ شیخو، ولی عہد سلطنت کو دیکھ کر ہمارے اندر محبت کا جذبہ موجیں مارنے لگتا ہے۔

اکبر (شیخو سے مخاطب ہو کر): شیخو! ہم نے تمھیں پانے کے لیے سیکری تک کا سفر کیا تھا۔ تمھاری ولادت ایک تحفۂ خداوندی تھی جو ہمارے لیے خاص تھا۔ تمھاری ماں نے کئی مہینے سیکری میں گذارے تا کہ تمھاری پیدائش وہاں ہو سکے۔ وہاں سے ہم نے اجمیر میں خواجہ غریب نواز کے آستانے پر حاضری دی۔ لیکن اب تم اپنے بزرگ باپ کی موت کا انتظار نہیں کر سکتے! ہم نے تمھاری پرورش اپنے ہاتھوں سے اس لیے کی کہ ہمیں اپنی زندگی میں ایک باپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ اس کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمھیں ناکام کر دیا؟

شیخو: نہیں، میرے شفیق پدر محترم۔ آپ نے میرے ارادوں کو غلط سمجھا۔ آپ کے مفاد پرست درباری، ہم باپ بیٹے کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دینا چاہتے ہیں۔

اکبر: ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے دوست ابوالفضل کو جان سے مار دیے جانے کا کیا جواز ہے؟ تم اس کے عوض ہماری جان لے سکتے تھے۔ اس نے انتہائی ایمان داری کے ساتھ ہماری خدمت کی تھی۔ تم شہنشاہ بننے کے لیے ہماری جان لے سکتے ہو۔

سلیم: خدا نہ کرے کہ ایسا کوئی خیال میرے ذہن میں آئے۔ ابوالفضل کے قتل کے لیے آپ مجھے الزام نہیں دے سکتے۔ ان کے دشمنوں کی تعداد کم نہیں تھی، ان کا قتل ان کی خواہشات نے کرایا۔

اکبر: افوہ، شیخو، کیا یہ کوئی اچھی بات ہے کہ اس ضعیف العمری میں ہمارے دوست، راجہ بیربل، ٹوڈرمل، راجا مان سنگھ، ہم سے جدا کر دیے جائیں اور اب ابوالفضل بھی ہم سے جدا کر دیے گئے۔ ہم اپنی تمام تر طاقت کے باوجود اپنے ان دوستوں کی حفاظت نہ کر سکے کیا کوئی شخص اتنا بھی بدنصیب ہو سکتا ہے؟

سلیم: جہاں پناہ! ایسا ہونا اللہ کی مرضی تھی۔ اب آپ کو کسی دوسرے پہلو سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اکبر: مرزا سلیم، تم ہمیں پاگل سمجھتے ہو؟ مت بھولو کہ تمھیں بھی بوڑھا ہونا ہے۔ خدا تمھیں بھی بیٹے عطا کرے گا۔ اُف! کس قدر خوشی اور دکھ ہوتا ہے، بادشاہ کو اپنے شہزادوں کے ساتھ رعایا جیسا ہی سلوک کرنا چاہیے۔ نورِ نظر کیا یہ ہماری شدید محبت ہے یا تمھاری دادی کی یادیں، ہمارے درمیان حائل ہو گئی ہیں کہ تم نے ایک دفعہ نہیں بلکہ دو بار شہنشاہ کے خلاف بغاوت کی اور ہم نے تمھارے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی۔

سلیم: تو پھر اگر آپ چاہتے ہیں تو میرے ساتھ رعایا جیسا ہی سلوک کیجیے۔ آپ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیجیے جیسا ایک باغی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اب تک آپ نے میرے لیے جو زندگی پسند کی، میں نے وہی بسر کی اب میری موت کے طریقے اور وقت کا تعین بھی کر دیجیے۔

اکبر: خدا نہ کرے! موت آئے تمھارے دشمنوں کو۔ افوہ! ہمارے لیے ہمارے والد کی سرپرستی کا عرصہ کتنا مختصر تھا؟ خدا ہم پر رحم فرمائے۔ ہم اپنے بیٹے کو باپ کی شفقت اور سرپرستی سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ (دونوں ہاتھ پھیلا کر) آؤ میرے لختِ جگر!

(سلیم کو تکلیف تو ہوتی ہے مگر وہ اکبر کے سینے سے لگ جاتا ہے)

سلیم: بادشاہ حضور! پچھلی مرتبہ جب آپ مجھ سے ناراض تھے تو مجھے یہاں بیڑیوں اور زنجیروں میں لایا گیا تھا، آج آپ نے میرا اس طرح استقبال کر کے، مجھے سرفراز فرمایا ہے۔ مگر میں زندگی کی 30 سے زیادہ بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ اب میں پنجرے میں قید رہ کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ میری زندگی آپ کی مملکت نہیں ہے۔

(اکبر سلیم کو ایک مرتبہ پھر سینے سے لگا لیتا ہے)

اکبر: لیکن میرے عزیز از جان مرزا، میرے ولی عہد! ہم نے تمھیں دنیا کی کون سی دولت فراہم نہیں کی۔ ہماری مادرِ مہربان تمھیں، جان سے زیادہ چاہتی تھیں، افسوس کہ آج وہ زندہ نہیں ہیں۔ میرے بیٹے ہم بھی کبھی کسی کے بیٹے تھے۔ تم مرزا خسرو اور خرم سے کیا برتاؤ کرو گے؟

سلیم: لیکن بیرم بابا کی بالادستی کے سبب آپ بھی خود کو کبھی پنجرے میں قید محسوس کرتے تھے۔ لیکن اب آپ یہ جذبہ نہیں سمجھ پاتے۔

اکبر: اے نورِ نظر! ولی عہد! ہم تمھیں یہ بات کیسے سمجھائیں کہ ولی عہدی اور تختِ شاہی کتنے بڑے جنجال ہیں۔ اس کا احساس ہمیں باتو کے جنگلوں میں شکار کے دوران ہوا تھا۔ اُف! وہ پراسرار آواز! جس نے ہمیں خوف زدہ بھی کر دیا تھا اور متجسس بھی۔ آج بھی وہ آواز ہمیں سنائی دیتی ہے۔

سلیم: واقعی وہ ایک پراسرار تجربہ تھا۔

اکبر: یہی ایک شہنشاہ کے پدر یا فرزند ہونے کا سانحہ ہے۔ ہم پوری سلطنت کے شہنشاہ ہونے کے باوجود، اپنے بیٹے سے اس وقت تک گفتگو نہیں کر پاتے جب تک کہ وہ میدانِ جنگ میں اپنی فوجوں کے ساتھ ہمارے مقابل نہ ہو۔ ہم نے بھی ایک ایسا ہی دن گزارا ہے۔ اس وقت تمھاری دادی جان نے تمھارے اوپر اٹھتا ہوا ہمارا ہاتھ روک دیا تھا۔ ہم بہ یک وقت تم دونوں سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ شیخو، تم میری بات سن رہے ہو؟ شیخو، کیا تم میری بات سن سکتے ہو؟

سلیم: (جواں سال شاہ جہاں کی طرف مڑ کر) مرزا خرم، کیا تم ہماری باتیں سن رہے ہو؟

شاہ جہاں: (اورنگ زیب کی طرف مڑ کر) مرزا اورنگ زیب کیا تم ہماری آواز سن سکتے ہو؟

اورنگ زیب: (اکبر ثانی کی طرف مڑ کر) کیا تم ہماری بات سن رہے ہو؟

اکبر ثانی: پدرِ محترم! (اورنگ زیب کی طرف مڑ کر) آپ ہم سے محبت نہیں کرتے۔

اورنگ زیب: (شاہ جہاں کی طرف مڑ کر) پدرِ بزرگوار۔ آپ ہم سے محبت نہیں کرتے۔ آپ اپنے تختِ شاہی سے محبت کرتے ہیں۔

(شاہ جہاں جہانگیر کی طرف مڑ کر)

شاہ جہاں: پدرِ محترم! آپ کو ہم سے محبت نہیں، صرف اپنے تختِ شاہی سے محبت ہے۔

سلیم: (اکبر کی طرف مڑ کر) پدرِ بزرگوار، آپ نے ہم سے محبت نہیں کی، تختِ شاہی سے محبت کی ہے۔

سب ایک ساتھ مل کر: تختِ شاہی سے محبت! تختِ شاہی سے محبت!

اکبر: یہ آخر ہمیں کیا ہو رہا ہے؟ کیا شہنشاہ ہونے کا یہی مطلب ہے؟

سلیم: کیا شہنشاہ یہی ہوتا ہے؟

شاہ جہاں: شہنشاہ کیا ہوتا ہے؟

اورنگ زیب: اسی کا نام شہنشاہ ہوتا ہے۔

اکبر ثانی: کیا شہنشاہ ہو کر یہی سب دیکھنا ہوتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر: یہ ہمیں کیا ہو رہا ہے؟ اُف یہ ہمارا سر کیوں چکرا رہا ہے؟ ہم بیٹھ جانا چاہتے ہیں۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ! آپ کا بدن لرز رہا ہے۔ براہِ کرم بیٹھ کر آرام کر لیجیے۔ اپنے حواس مجتمع کیجیے۔ ایک گہری سانس لیجیے اُف کس قدر گرمی اور امس ہے یہاں۔ جہاں پناہ! آپ ٹھیک تو ہیں؟

بہادر شاہ ظفر: نہیں، نہیں خاموش رہو۔ ہم نے تم سے کہا تھا کہ گفتگو سے باز رہو۔ یہ کچھ عجیب سا احساس ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ آؤ واپس چلیں۔

رودرانشو مترا: عالی جاہ! مجھے اپنے گھر جانے دیجیے، میرا مطلب ہے اپنے عہد میں۔ (بہادر شاہ ظفر اپنے دیوان پر جا کر، بڑی دیر تک اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھامے رہتے ہیں، رودرانشو مترا وہاں پہنچ کر کچھ بولنے کا انتظار کرتا ہے لیکن ہمت نہیں کر پاتا)

بہادر شاہ ظفر: (پرسکون ہوتے ہوئے) شکریہ میرے دوست، ہمیں اپنی طبیعت کے اس ناخوش گوار احساس پر انتہائی افسوس ہے۔ وہ کوئی یقیناً غلط بات تھی۔ ہم خود کو انتہائی خستہ حال اور تھکا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم کچھ دیر لیٹ کر اپنی بوسیدہ ہڈیوں کو آرام دیں۔

رودرانشو مترا: یقیناً جہاں پناہ! گفتگو تو ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: ہاں، ہاں، بعد میں ہو سکتی ہے گفتگو لیکن اگر ہم آج کے بعد زندہ رہ سکے، تبھی نا! (ان کے بدن میں لرزش شروع ہو جاتی ہے) ہمارا تو کوئی بیٹا بھی نہیں ہے، جو ہماری شفقت پر شک کر سکے۔ ہمارا تو کوئی ولی عہد بھی نہیں، جو بعد میں ہمارا وارث ہو سکے۔ کوئی بھی نہیں جو ہم پر دو آنسو بہا سکے۔ کوئی بھی نہیں جو ہمارا انتظار کر سکے۔ اب اور حکم نامے نہیں اب اور تاریخ نہیں۔ بس یہی تاریخ... ہوتی ہے۔

رودرانشو مترا: جہاں پناہ، عالی جاہ! آپ کی طبیعت کچھ ناساز محسوس ہوتی ہے۔ آپ کچھ دیر آرام کر لیجیے، سو جائیے۔

بہادر شاہ ظفر: نیند؟... آخری نیند... یہی سب کچھ ہے... ایک شہنشاہ ہونا... سو جانا۔

پانچواں ایکٹ، چوتھا سین

بہادر شاہ ظفر: ذرا میرے قریب آ جاؤ۔ میرا حلق مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تو دوست! ہم پر مقدمہ چلایا گیا تھا، کسی معمولی مجرم کی طرح۔ فرنگیوں نے قانونِ فطرت کو مذاق بنا کر رکھ دیا تھا۔ اُف کیا انسانیت تھی، کیا انصاف تھا؟

رودرانشو مترا: جہاں پناہ! اب وہ سب کچھ گزر چکا ہے۔ آنے والی صدیاں ان

کے ساتھ انصاف کریں گی جنھوں نے آپ پر مقدمہ چلایا تھا، وہ لوگ سفید چمڑی کے انصاف کے بارے میں لاف وگزاف کر سکتے ہیں لیکن تاریخ کی کتابیں آپ کی مدح خواں رہیں گی۔ وہ تاریخی کتابیں ہمیشہ پڑھی جاتی رہیں گی جن میں آپ کی عظمت کے بیان ہوں گے اور ان فرنگی ججوں کے نام دنیا فراموش کردے گی۔

بہادر شاہ ظفر: لیکن میرے دوست تم اب بھی کچھ بھول رہے ہو۔ ہم کچھ بھی تبدیل نہیں کر سکتے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور جو کچھ ہونا ہوگا، ہو جائے گا، ہم تم تو محض ماضی اور حال کے درمیان کا وقفہ ہیں اور کچھ نہیں۔ ہماری قسمتیں ہی ہمارے فیصلے کرتی ہیں۔

رودرانشو مترا: لیکن انھوں نے کہا تھا کہ وہ آپ کو قتل نہیں کریں گے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا اور انھوں نے اس وعدے کو فراموش نہیں کیا۔

بہادر شاہ ظفر: تقدیر کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔ موت کے مختلف چہرے ہیں۔ ہم پر انھوں نے ایک زندہ موت مسلط کر دی ہے۔ وہ ہندستان کی خاکسار مزاحمت اور آزادی کی تحریک کو تباہ کر دینا چاہتے تھے۔

رودرانشو مترا: ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ وہ اس سازش میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ میں آپ کا کیس تیار کروں گا۔ غیر ملکی شہنشاہ ہندستان پر مقدمہ چلانے کے اپنے مقصد میں محض اس لیے کامیاب ہوئے کہ ہمیں آپس میں ایک دوسرے پر بھروسہ نہ تھا۔ باپ، بیٹے، بھائی، بہن، پڑوسی اور دوست، سب ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ لیکن ہماری روح پر بالادستی قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ آپ کی حوصلہ افزائی بے نظیر تھی۔

بہادر شاہ ظفر: کاش، تم ہمارے وزیر یا ہماری افواج کے سردار ہوتے، تم نوجوان ہو، پھر بھی کس قدر ذہین اور عقل مند ہو۔ کیا تم چارج شیٹ پڑھنا چاہو گے؟

(کچھ دیر بعد بادشاہ ظفر کاغذوں کا ایک پلندہ لے کر آتے ہیں)

رودرانشو مترا: بہ آواز بلند پڑھنے کی زحمت فرمایئے، عالی جاہ یا میں پڑھ دوں۔

بہادر شاہ ظفر: خیر اب تمھاری یہی خواہش ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے لیکن وہ اذیت رساں الفاظ بالکل زہریلے تیروں کی طرح تھے۔

(بہادر شاہ ظفر بیٹھ جاتے ہیں اور رودرانشو مترا چارج شیٹ پڑھتا ہے)

رودرانشو مترا: اول یہ کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کے قیدی بہادر شاہ تم نے 10 مئی اور پہلی اکتوبر 1857 کی درمیانی مدت میں، فوج کے ایک رسالے کے سردار محمد بخت خاں، ہندستان کی رعایا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی افسران، اور سپاہیوں کو حکومت کے خلاف بغاوت اور سرکشی پر اکسایا تھا۔ دوئم یہ کہ تم نے 10 مئی اور پہلی اکتوبر 1857 کے درمیان دہلی میں رہتے ہوئے بھی ہندستان میں سرکار برطانیہ کے خلاف بغاوت اور سرکشی کی ہمت کی تھی۔ سوئم یہ کہ تم نے ہندستان میں برطانوی سرکار کی رعایا ہونے کے باوجود، 11 مئی 1857 کو سرکار کے خلاف غداری کر کے اور خود کو ہندستان کی خود مختار سلطنت کا حکمران قرار دے کر غیر قانونی طریقے سے دتی پر قبضہ کر لیا تھا۔ چہارم یہ کہ تم نے 16 مئی 1857 کے آس پاس کی تاریخوں میں دتی کے لال قلعے میں رہتے ہوئے، یوروپی اور مخلوط یوروپی نسل کے 49 افراد بہ شمول عورتوں اور بچوں کے قتل میں معاون ہونے کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ علاوہ ازیں تم نے 10 مئی اور یکم اکتوبر کی درمیانی مدت کے دوران لاتعداد فوجیوں کو، یوروپی افسران اور دیگر برطانوی رعایا بشمول خواتین اور بچوں کے قتل کے لیے اکسایا تھا اور ان قاتلوں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ مزید برآں تم نے مختلف مقامی حکمرانوں کو یہ حکم نامہ جاری کیا تھا کہ عیسائی اور برطانوی لوگوں کو جہاں بھی اور جس وقت بھی دیکھا جائے، قتل کر دیا جائے وغیرہ وغیرہ... تم پر یہی الزامات ہیں۔ دستخط۔ میجر ایف جے ہیریٹ۔ ڈپٹی جج، ایڈوکیٹ جنرل اور سرکاری استغاثہ...

بہادر شاہ ظفر: بس تو اس طرح شروع ہوا ایک شہنشاہ پر مقدمہ چلنے کا سلسلہ۔ جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے اپنی رعایا کے لیے آزادی طلب کی تھی۔

رودرانشو مترا: میرے نزدیک یہ ایک دل چسپ خیال ہے۔ ایک شہنشاہ کی سلطنت میں رعایا کی آزادی، کیا آپ کی رعایا آپ کی حکمرانی میں آزاد تھی؟ اور برطانویوں کے اقتدار میں غلام تھی؟

بہادر شاہ ظفر: تم اس پر شک کر رہے ہو؟

رودرانشو مترا: یقیناً۔ اگر مغل دور اقتدار میں رعایا آزاد ہوتی تو کیا مغلوں کا غلبہ ممکن تھا؟ سوال یہ ہے کہ کیا ہندستانیوں نے مغلوں کو قبول کر لیا تھا؟

بہادر شاہ ظفر: لیکن برطانویوں کو بالکل قبول نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی قبول کیا جانا چاہیے۔

رودرانشو مترا: عالی جاہ، میں تو یہ صرف ایک خیال کو پرکھنے کی بات کر رہا ہوں۔

بہادر شاہ ظفر: یہ خیال ہی بالکل نامعقول ہے۔ وہ لوگ غیر ملکی ہیں۔ وہ ہماری تمھاری طرح نہیں ہیں نہ ہی ہمارے ملک کے ہیں۔

رودرانشو مترا: بالکل بجا فرمایا۔ لیکن ٹھیک یہی بات تو کچھ جنونی لوگ شہنشاہ بابر کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے ملک کے نہیں تھے۔

بہادر شاہ ظفر: ہاں، ہاں ضرور کہتے ہوں گے اور یہ بات وہ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔

رودرانشو مترا: نہیں، وہ ایسا نہیں کہتے اور نہ ہی وہ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کے بارے میں اگر وہ ایسا کہنا بھی چاہیں تو بھی نہیں کہہ سکتے۔ آپ کی بات

دوسری ہے۔

بہادر شاہ ظفر: لیکن لوگ ہمیں سمجھ نہیں سکے۔ پٹیالہ، جند، دوجانہ، پٹودی، جھجر، لاہور، جے پور، الور، کوٹا، بوندی کی ریاستوں کو مراسلے بھیجے گئے۔ ہمارے مراسلوں کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ صرف دادری اور رانین کے نوابین ہی ہماری مدد کو آئے اور ان کی اس وفاداری کا انھیں کیا انعام ملا؟ پھانسی کی سزا!

رودرانشو مترا: مجھے یہ تجسس ہے کہ عالم پناہ اسے مسلم بغاوت کا نام کیوں دیا گیا؟

بہادر شاہ ظفر: یہ بھی ضرور کوئی سازش ہوگی۔ یہ مسلم بغاوت کہاں تھی؟ ہندستانی بغاوت تھی، جس میں بلاشبہ مسلمان بھی شامل تھے۔ بغاوت کرنے والے سپاہیوں میں اکثریت اودھ کے برہمنوں پوربی بھومیہاروں اور تلنگوں کی تھی۔ نانا فرنویس، تاتیا ٹوپے اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی، کیا یہ سب بھی مسلمان تھے؟

رودرانشو مترا: کہا جاتا ہے کہ ان کی بغاوت کے نجی اسباب تھے؟

بہادر شاہ ظفر: میرے ننھے سے مورخ، ان کی قربانیوں کی توہین نہ کرو۔ تاریخ کے کسی بھی بڑے واقعے کی کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی، مختلف سیاسی وسماجی محرکات اس کے پس منظر میں موجود رہتے ہیں۔

رودرانشو مترا: پھر یہ بغاوت آخر کامیاب کیوں نہیں ہوئی؟ ان لوگوں نے آپ کے خطوط کا جواب کیوں نہیں دیا؟ آپ کو نظر انداز کیوں کر دیا گیا؟

بہادر شاہ ظفر: وہ بہت سے اور بہت زیادہ الجھے ہوئے سوالات تھے۔ برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے والوں کو اپنے شہنشاہ کی مدد کی ضرورت تھی اور شہنشاہ بے بس تھا۔ اور جنھوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا وہ بھی ایک بے بس بادشاہ کے لیے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔

رودرانشو مترا: لیکن کیا آپ نے ان سے یہ کہا تھا کہ وہ آپ کے لیے جنگ کریں؟

بہادر شاہ ظفر: نہیں نہیں، بالکل نہیں، یہ جنگ ہندستان کی تھی اور رعایا نے ازخود شہنشاہ کو قومی وقار کی علامت تصور کیا تھا۔ یہ جنگ دین اور دھرم کے تحفظ کے لیے تھی، یہ مختلف مذاہب کے عقائد کی سلامتی کے لیے تھی۔ عوام کے لیے بادشاہ عظمت وشکوہ کا نشان تھا جب کہ فرنگیوں کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، وہ اسے بھی اپنی رعایا ہی تصور کرتے تھے۔

رودرانشو مترا: اور یہی خیال بعد میں بھی برقرار رہا۔

بہادر شاہ ظفر: کون سا خیال؟ کیا علامتِ شکست؟

رودرانشو مترا: نہیں بلکہ ایک نئے قومی مزاج کا آغاز اس فرسودگی کی موت کا اعلان جو قوم کے مزاج میں در آئی تھی۔

بہادر شاہ ظفر: لیکن اگر یہ قومی مزاج وجود میں آ گیا ہے، ایک نئی قوم پیدا ہو گئی ہے۔ پھر تو ہم سکون سے مر سکیں گے۔

رودرانشو مترا: عالی جاہ! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس مقدمے میں آپ کے ساتھ پیش نہیں ہوسکتا۔

بہادر شاہ ظفر: ہمارے مقدمے میں؟ ایک ہی وقت میں یہاں بھی اور وہاں بھی؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ ناممکن۔

رودرانشو مترا: لیکن عالی جاہ، کیا ہم نے اس سے پہلے بھی متعدد بار ناممکنات کی حدود اور نظریات کے تضادات کی مشکلات کو متعدد بار عبور نہیں کیا ہے؟

بہادر شاہ ظفر: نہیں نہیں، ذہن کی پرواز کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں۔

رودرانشو مترا: تو کیا یہ سب کچھ ذہنی اڑان سے زیادہ کچھ نہیں؟ میری آپ سے ملاقات محض ایک خواب اور ایک غیر حقیقی واقعہ ہے؟ ہندستان کے لیے آپ کی جدوجہد اور جنگ محض تصوراتی باتیں ہیں؟ یقیناً نہیں۔ پھر آخر اس تاسف کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ بھی غیر حقیقی ہے؟

بہادر شاہ ظفر: ہم نے یہاں اپنے بیان کی نقل حاصل کرلی ہے۔ ہم نے اپنا بیان اردو میں دیا تھا اور انھوں نے اس کا ترجمہ کیا تھا، یہ عمل دو ہفتوں تک جاری رہا۔ ترجمے میں الفاظ بتدریج بکھراؤ کا شکار ہوتے رہے۔ وہ لوگ جن پر ہم بھروسا کرتے تھے، جو ہمارے معتمد تھے، انھوں نے ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپا اور اس پر وہ پشیمان بھی نہیں ہوئے۔ ہم نے کچھ کہا تھا اور انھوں نے ترجمے میں اسے انگریزوں کی مرضی کے مطابق کچھ اور کردیا۔ لیکن ہم یہ کہانی سنانے کے لیے آج تک زندہ ہیں۔ کیا تم اسے بہ آواز بلند پڑھنا چاہو گے؟

رودرانشو مترا: نہیں، یہ تاریخ میں آپ کا عہد ہے۔ اسے آپ ہی پڑھیے، میں تو بس سنوں گا!

بہادر شاہ ظفر: یہ بہت مشکل اور دردناک ہے (باآوازِ بلند پڑھتے ہیں)

...اور اس طرح مقدمے کی سماعت کے 20ویں روز بادشاہ نے اردو میں اپنا دفاعی بیان دیا۔ اس کے بعد عدالت کی کارروائی پانچ روز تک ملتوی رہی تا کہ ایک مترجم کو تلاش کرکے اس بیان کا انگریزی میں ترجمہ کرایا جاسکے۔ بعد میں جب عدالت کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو اس بیان کو انگریزی میں پڑھا... گیا وہ کہاں ہے؟ (ورق الٹتے ہیں) اب بیان پھر شروع ہوتا ہے: بادشاہ خود اپنا دفاع نہیں کرتا، اس کا فرض تو اپنی رعایا کی حفاظت کرنا ہے؛ فوجی فتح یابیوں پر فخر کرنا تو ایک عام روایت ہے پھر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری شکست ہوئی اور تم (انگریز) جیت گئے؟ (قدرے توقف کے بعد) واقعہ یہ ہے کہ اس جدوجہد کے آغاز سے قبل ہمارے پاس سراغ رسانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صبح تقریباً آٹھ بجے اچانک باغی فوجیوں نے محل کی کھڑکیوں کے نیچے جمع ہو کر شور مچانا شروع کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ میرٹھ سے

بغاوت کر کے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنی بغاوت کا سبب یہ بتایا کہ انھیں ایسے کارتوسوں کو اپنے دانتوں سے کاٹنے کا حکم دیا گیا تھا جن میں گائے اور سور کی چربی لگی ہوئی تھی۔ جذباتی طور پر وہ لوگ انتہائی جوش و خروش میں تھے ساتھ ہی شورش زدہ بھی۔ ان میں سے کچھ کی وردیوں پر تو خون کے نشانات موجود تھے جو خشک ہو گئے تھے۔ ہمیں اس سے بے حد تشویش پیدا ہو گئی۔ ہم نے سوچا کہ محل کے دروازے بند کیے جانے چاہئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں سپاہیوں کا ایک زبردست مجمع اکٹھا ہو گیا۔ یہ لوگ دربار اور دیوان خاص میں جمع ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور پہرے پر سنتری تعینات کر دیے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ ہم نے ان کو وہاں سے چلے جانے کا مشورہ بھی دیا۔ انھوں نے ہم سے درخواست کی کہ ہم ان کی قیادت کریں۔ انھوں نے کہا کہ وہ لوگ جان کی بازی لگا کر اس مقام تک آ گئے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ چونکہ وہ لوگ بہت جوش میں تھے اور ہماری بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے اس لیے ہم اپنے محل میں آرام کرنے چلے آئے۔ ان باغی سپاہیوں نے یوروپی افسروں کو اپنی قید میں لے لیا تھا۔ بعد کے کم از کم دو مواقع پر ایسا محسوس ہوا کہ یہ لوگ ان قیدیوں کے قتل پر کمربستہ ہیں، ہم نے ان کو سمجھایا بجھایا اور اس طرح کم از کم دو بار ان قیدیوں کی جان بچائی۔ ہم نے بعد میں بھی کئی بار انھیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے ہماری بات نہیں سنی اور یورپین قیدیوں کو قتل کر ڈالا۔ (کچھ رکتے ہیں) ہم نے اس قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہم اس خدائے واحد کی قسم کھاتے ہیں جو ہمارا واحد گواہ ہے۔ ہم خدا کی قسم کھا کے کہتے ہیں کہ ہم نے ان قیدیوں کو قتل کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ ان باغی فوجیوں نے ہمارے خادموں پر یہ الزام لگایا کہ انگریزوں کو خفیہ مراسلے بھیجے جا رہے ہیں بالخصوص شاہی معالج احسان اللہ خاں، محبوب علی خاں اور ہماری بیگم زینت محل بیگم پر ان لوگوں کو شک تھا؛ انھیں قتل کر دینے کا فیصلہ انھوں نے کر لیا تھا۔ بالآخر ایک دن انھوں نے معالج شاہی کے محل کو لوٹ کر، انھیں قتل کرنے کے ارادے سے اپنا قیدی بنا لیا۔ اگر ہم اس وقت مکمل طور سے اقتدار میں ہوتے تو کیا انھیں ایسا کرنے کی اجازت دے سکتے تھے؟ باغی فوجیوں نے خود ہی ایک عدالت قائم کر لی تھی جہاں تمام معاملات فیصل کیے جاتے تھے اور غور و خوض کے بعد آئندہ کے اقدام کے لیے احکام بھی جاری ہوتے تھے۔ ہم نے ان کے ان افعال اور سرگرمیوں میں کبھی شرکت نہیں کی۔ یہ بات ہماری شاہی آن بان کے خلاف تھی۔ انھوں نے بغیر ہمارے علم اور حکم کے متعدد افراد کو شاہراہوں پر لوٹ لیا۔ انھیں قتل کر دیا یا انھیں اپنا قیدی بنا لیا۔ اس طرح جنگیں نہیں لڑی جاتیں؛ اس طرح تو جہاد بھی نہیں کیے جاتے۔ یہ معقول اور باعزت لوگوں کا طریق کار نہیں ہے۔ ان باغی فوجیوں نے کبھی ہمیں آداب نہیں کیا نہ ہی ہمیں عزت و احترام دیا۔ وہ دیوان خاص اور مسجد تک میں جوتے پہنے چلے آتے تھے۔ آخر ان لوگوں پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا تھا جنھوں نے خود اپنے آقاؤں کو بھی قتل کر ڈالا تھا۔ (قدرے توقف کے بعد) یہ یقیناً ہماری جنگ نہیں تھی لیکن ہم اس بات سے انکار بھی نہیں کر سکتے کہ یہ ہماری روح کی جنگ تھی۔ آپ لوگوں نے مغل شہنشاہوں کو اپنی اسامی بنا لیا تھا، محض اپنی طاقت اور دغابازی سے۔ آپ نے ہماری رعایا کی زندگیوں میں سے روح کو غائب کر دیا تھا۔ نواب اور راجہ ہندو مسلم کے جھگڑوں میں الجھ گئے تھے، ان کا شہنشاہ بہت ہی ضعیف، بوڑھا اور کمزور تھا۔ ہم نے ان کو بہت سمجھایا کہ آؤ اب ایک نیا نظام قائم کیا جائے۔ لیکن ہم ناکام رہے۔ تاہم ہمیں اس پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ کیوں کہ ہماری خواہش آزادی کی تھی۔ اور ہاں جب بخت خاں اور فوجیوں نے واپسی کی تیاریاں کیں تو وہ چاہتے تھے کہ ہم ان کے ساتھ جائیں لیکن اب اس کی کوئی افادیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ سو ہم خفیہ طریقے سے کھڑکیوں کے راستے محل سے نکل آئے اور نظام الدین اولیا کی درگاہ میں پناہ لی؛ بعد ازاں ہم نے شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں کچھ وقت گذارا۔ وہیں سے یہ کہہ کر ہمیں حراست میں لیا گیا تھا کہ اگر ہم خود کو کمپنی بہادر کے سپرد کر دیں ہماری جاں بخشی کر دی جائے گی۔ ایک ضعیف باپ کی تو جان بخش دی گئی لیکن اس کے جوان بیٹوں کو قتل کر ڈالا گیا! (قدرے توقف کے بعد) فوجی ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن ہم نہیں گئے۔ ہم اپنے محل اور تختِ شاہی سے دور جا بھی کہاں سکتے تھے۔ (کچھ توقف کے بعد) آپ لوگوں نے اپنی فوجی طاقت کے بل پر ہندستان کی تحریکِ بیداری کو کچل ڈالا۔ ہندستان نے ان انتشار پسند جذبات سے نجات پانے کی کوشش کی جنھوں نے ہمیں غلام بنا ڈالا تھا لیکن ہم پھر ناکام رہے۔ لیکن اب یاد رکھو کہ یہ آخری جنگ نہیں ہے۔ ہم رہیں نہ رہیں، ایک شہنشاہ رہے نہ رہے لیکن وہ تحریک جسے تم نے غداری کا نام دیا ہے، اس کا احیا ہوتا رہے گا۔ تم نے ہندستان کے شہنشاہ کو برباد کر ڈالا ہمیں اس کے لیے تمھارا شکرگزار ہونا چاہیے کیوں کہ اس طرح تم نے انقلاب کی اس چنگاری کو ہوا دے دی ہے جو خاک سے اس عظیم نظریہ انقلاب کو جنم دے گی جس پر قابو پانا تمھارے لیے ناممکن ہوگا۔ اس شکست کا درد، ایک ایسے ہندستان کی پیدائش کا پیغام ہے جو تمھارے عظیم بادشاہوں سے کہیں عظیم ہے۔ ہمارے لوگ ہمارے عوام تمھارے شکرگزار رہیں گے۔ وہ زمینیں جن سے ہم بے دخل کر

دیے گئے وہ دوبارہ حاصل کی جائیں گی، انشاءاللہ۔ ہمارا خدا جانتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف بہ حرف سچ ہے اور ہماری سچی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ اُف وہ ہمیں کس قدر تھکن محسوس ہو رہی ہے... اور پھر انھوں نے ہمیں خاموش کر دیا۔ صرف یہ کاغذات دیے جن پر ہم نے اپنی داستان تحریر کی ہے۔

ردرانشو مترا: آفریں، آفریں، یقیناً عظیم اور شان دار۔

بہادر شاہ ظفر: ہماری خوشامد بند کرو۔ اس وقت کے بعد سے گذرنے والا ہر لمحہ ہمارے لیے آزارِ مسلسل کی طرح تھا۔ ہم یقیناً خوف زدہ تھے اور اتنے ضعیف کہ ہمارے لیے تلوار اٹھانا بھی ممکن نہ تھا۔

ردرانشو مترا: بس اب اور نہیں، اور نہیں جہاں پناہ! عالم پناہ کیا میں کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اس وقت حالات ایسے ہو گئے تھے کہ 1857 ناگزیر تھا۔ جب آپ نے اقتدار سنبھالا تھا تو اس وقت سلطنت کا کوئی نام و نشان تک نہیں بچا تھا۔ میری گستاخی معاف فرمایئے۔ لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے حکمراں بہت زیادہ طاقت ور ہو گئے تھے اور وہ شہنشاہ کو اپنی شرائط ماننے پر مجبور کر رہے تھے۔ آپ کے پاس لال قلعہ تو تھا لیکن آپ کے قبضے میں بس اس کی عمارت ہی تھی۔ نیا نظام وجود میں نہیں آیا تھا اور پرانا نظام مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔

بہادر شاہ ظفر: یہ ایک بہت ہی سفاک سچائی ہے لیکن پھر بھی عوام کو ایک شہنشاہ کی ضرورت تھی جو ان پر حکم رانی کرے۔ حکم رانی کرنے والے شہنشاہ کی موجودگی ہندستانی عوام کی گھٹی میں تھی۔ اسی لیے تو انگریز یہاں کامیاب ہو گئے۔ شہنشاہ کا تصور حکومت کرنے اور نظام چلانے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ صرف شہنشاہ کے نام سے، خواہ وہ میری طرح بالکل ہی کمزور کیوں نہ ہو، وہ تمام کام ہو سکتے تھے جنھیں بڑی سے بڑی فوجیں نہیں کر سکتی تھیں۔ افغانستان جیسے ملک جہاں عوام کے ذہن ہندستان سے مختلف تھے وہاں انگریزوں نے خون تھوک دیا اور ایک انچ زمین پر بھی پوری طرح قابض نہ ہو سکے۔ ہندستان میں بادشاہ اور اس کی حکم رانی کا تصور اس وقت اتنا محکم تھا کہ نہ تو کوئی طاقت ور سے طاقت ور فوج اور نہ ہی کوئی دھار دار تلوار ختم کر سکتی تھی۔ ناقابلِ تسخیر بنے رہنے اور اپنے وجود کا جواز برقرار رکھنے کے لیے انھیں ایک علامت کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ آخری بے بس مغل تاجدار ہی کیوں نہ ہو۔

ردرانشو مترا: لیکن جہاں پناہ؟ افغان، مراٹھے اور برطانوی اپنے سلسلۂ حکم رانی کو کیوں نہیں فروغ دے سکے؟ میرا مطلب ہے 1857 تک ہی یا بہادر شاہ ظفر...

بہادر شاہ ظفر: تم نے دیکھا نہیں؟ شہنشاہ کی شخصیت کو نقصان تو پہنچایا جا سکتا تھا، اسے ہراساں بھی کیا جا سکتا تھا لیکن اس ذہنی رویے کو وہ چھو بھی نہیں سکے۔ دراصل شہنشاہ ہندستان کی روح تھا اور اسے قیدی بنا کر انگریز یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ انھوں نے ہندستان پر قبضہ کر لیا ہے مگر ایسا کیے بغیر مسلسل کوششوں کے باوجود وہ ہماری ایک انچ زمین پر بھی قابض نہیں ہو سکتے تھے، وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہتے۔ دراصل شہنشاہ ہندستان کو شکست دینا ہی انگریزوں کی سب سے بڑی فتح تھی۔ اس کے بعد عوام کے حوصلے مکمل طور پر پست ہو گئے۔ لیکن انگریز ہندستان میں ہمیشہ غیر ملکی ہی رہے۔ انھیں ہندستانی تصور کر لینا ہندستانی عوام کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا۔

ردرانشو مترا: اور وہ ہندستان میں ہمیشہ جدوجہد کرتے رہتے؟ یہ خاصی دلچسپ بات ہے۔ آپ کے اجداد تو ایک دور دراز مقام سے آئے تھے لیکن کم از کم مراٹھے تو مقامی ہی لوگ تھے، اس کے باوجود مراٹھے بھی متحدہ ہندستان اور اس کی خود مختاری کی علامت نہ بن پائے۔

بہادر شاہ ظفر: مغل متحدہ اور عظیم ہندستان کے تصور کی علامت ہی نہیں تھے، انھوں نے اس نظریے کو مجسم کر دیا تھا۔

ردرانشو مترا: عالی جاہ، یہی وہ نظریہ ہے مجھے جس کی ضرورت تھی، میں اسی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ اب اس نظریے کی ہندستان میں واپسی ہونی چاہیے۔

بہادر شاہ ظفر: (مسکراتے ہوئے) تمھارا مطلب ہے انڈیا؟

ردرانشو مترا: مجھے معاف فرمایئے، جہاں پناہ، لیکن میرا مطلب وہی ہے جو مغلوں کا تھا یعنی ہندستان، متحدہ ہندستان۔ نشانات اور نام کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ دراصل داخلی جذبہ ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہندستانیوں کا ہندستان، انڈینس کا انڈیا، بھارت واسیوں کا بھارت یہ سب ایک ہی جذبے کے مختلف نام ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: ہندستان کا مطلب ہے ایک نیا نظریہ۔ ماضی سے حال کی طرف ایک پراسرار لیکن حال سے ہم آہنگ پیش رفت۔ انگریزوں کی حکمرانی سے منسوب ماضی کو فراموش کیے جانے کی خواہش۔ ہندستان، انڈیا اور بھارت تین مختلف نام ہیں لیکن ہے ایک ملک جسے موجودہ صورت عطا کرنے میں ان مغلوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا جس کے وارث بہادر شاہ ظفر کو آہستہ آہستہ تنہائی میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ دراصل اچانک موت ہمیشہ یاد کی جاتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ جدید ہندستان ہمیں کس طرح یاد کرے گا۔

ردرانشو مترا: عالی جاہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو قائل کرنے کے لیے کیا کروں؟ براہِ کرم مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کو انڈیا لے جاؤں۔

بہادر شاہ ظفر: تم ایک مورخ ہوتے ہوئے بھی تاریخ سے اس طرح چھیڑ

چھاڑ کرتے ہو میرے عزیز! تم اس کی ترجمانی تو کر سکتے ہو لیکن اس کے عمل میں مداخلت نہیں۔ تم ہمیں انڈیا لے جاؤ گے لیکن ہماری شاعری کو قتل کر دو گے۔ ہم نے جس زبان میں یہ شاعری کی ہے اسے وہاں ختم کر دیا گیا ہے، اردو کو ہندستان میں اسی بے دردی سے حکومت نے قتل کیا جس سفاکی سے انگریزوں نے ہندستان کے سپاہیوں کے سر بیئے کے گھونسلوں کی طرح سڑکوں کے کنارے لٹکائے تھے۔ اب ہمارے پاس یہ شاعری ہی تو بچی رہ گئی ہے، ہندستان جا کر یہ بھی اقتدار کی ہوس اور وہاں کی سیاست کا شکار ہو جائے گی۔

رودرانشو مترا: اردو کی تباہی ہندستان کو اس کے ماضی سے بے خبر کر کے ہندستانی قوم کو نئی استعماری طاقتوں کا غلام بنا دے گی۔ یہ تباہی بھی انگریزوں کی بہت سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے جس کی آخرش شکست ہوگی۔

بہادر شاہ ظفر: ہندستانی جمہوریت اگر مغربی نظام سیاست کے معاشرتی رویوں اور سیاسی ضرورتوں کے نتیجے میں وجود میں آئی تو پھر تم ہمیں اس کا سبق کیوں پڑھانا چاہتے ہو؟ ہندستانی جمہوریت میں چھوٹے اور مفاد پرست لوگ حکومت کریں گے اور ہم ان کی تفریح کا وسیلہ بن جائیں گے۔

رودرانشو مترا: نہیں عالی جاہ، یہ بات نہیں۔ آپ کے اجداد نے پانی پت سے دکن تک کس قدر زبردست جنگیں لڑی تھیں۔ لیکن ان جنگوں میں صرف سپاہی شامل ہوئے، عام آدمی تو بس دیکھتا رہا اور وہ اقتدار کے کسی نظام کا حصہ نہ بن سکا: جو فاتح ہوا، عام آدمی اس کا محکوم ہو گیا۔ جمہوریت اس نظام سے تو ہر حال میں بہتر ہے۔ ایک طرح سے آپ نے اس سلسلے کو تبدیل کیا۔ عام لوگوں نے اس طویل اور عظیم جدوجہد میں حصہ لیا جس نے عوامی بغاوت کو آخرش جنگِ آزادی بنا دیا۔ دراصل وہی ہندستان میں جمہوریت کا آغاز تھا۔

بہادر شاہ ظفر: چلو کچھ دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ 1857 کی مزاحمت کا رنگ روپ ایسا ہی تھا۔ حکمراں اور رعایا کے درمیان تمیز باقی نہیں رہ گئی تھی اور تمھارے خیال میں وہ ہندستان میں جمہوریت کا آغاز تھا! مگر یہ رجحان سفاک بھی ہو سکتا تھا۔ قانونی فہم اور انتظامی صلاحیت کے بغیر حکمرانی نہیں کی جا سکتی۔

رودرانشو مترا: نہیں عالی جاہ، ایسا بالکل نہیں ہے آپ ذرا صوفیا کے طریق کار پر غور فرمایئے کہ جب ذات غائب ہو جاتی ہے تو وجود کی جگہ عدم وجود لے لیتا ہے اور امن اپنے آپ بحال ہو جاتا ہے۔ دراصل حکمرانی کا معاملہ بھی یہی ہے کہ جب لوگ خود پر حکمرانی کرتے ہیں تو حکمراں اور عوام کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ عوام ہی تو حکم راں ہوتے ہیں۔ یہ جمہوری عمل امن و آشتی کا ضامن ہوتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر: لیکن جمہوریت میں عوام بہ حیثیت حکمراں، سچائی کے راستے سے بھٹک بھی تو سکتے ہیں اور اگر ایسا ہو جائے تو انھیں کون روکے گا؟ مطلق العنانی کے اس منظر کا تو تصور ہی ہولناک ہے۔

رودرانشو مترا: یقیناً جمہوریت میں ایسا ہوا بھی ہے: نئے راجہ پیدا ہوتے ہیں، گھوڑے پر اور فوجی وردی میں لیکن ان کے وجود کا جواز نہیں ہوتا۔

بہادر شاہ ظفر: تو پھر جواز کا فیصلہ کون کرے گا؟ کچھ نظریات سوچنے میں تو اچھے لگتے ہیں لیکن بالآخر ان پر عمل ناممکن ہو جاتا ہے۔

پانچواں ایکٹ، پانچواں سین

(کالج پلازہ کا منظر — رودرا اپنے پلے کے اسکرپٹ
پر کام کر رہا ہے کہ ڈاکٹر داس اندر آتے ہیں۔)

ڈاکٹر داس: اوہ! رودرا، تم کہاں ہو۔ ہم نے تمھیں سب جگہ ڈھونڈا۔ تمھارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ بالآخر تمھیں رنگون جانے کے لیے ٹریول گرانٹ مل گئی۔ اب شاید تم سے ٹیوٹوریلس میں ملاقات ہو جایا کرے گی۔

رودرانشو مترا: ڈاکٹر داس، گڈ مورننگ۔ شکریہ کہ آپ نے میرے رنگون کے سفر خرچ کے لیے رقم کا انتظام کرا دیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں تو ہمت ہی ہار چکا تھا۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اگر میرے رویے پر آپ کو گستاخی کا شائبہ گزرا ہو۔

ڈاکٹر داس: مگر تم نے اپنا غصہ ٹیوٹوریلس پر کیوں اتارا؟ بہر حال، اب اسے بھول جاؤ۔ اب تمھارا رنگون جانے کا ارادہ کب ہے۔ میرے خیال میں یہ ٹریول گرانٹ منظور کر کے کمیٹی نے تمھارے ساتھ خاصی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

رودرانشو مترا: مگر اس گرانٹ کی منظوری کا سبب تو آپ ہی بنے ہیں۔ میرے عجیب و غریب رویے کے باوجود آپ نے مجھ پر کرم کیا۔ میں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں جلد ہی آپ کو اپنے سفر کی تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔ اغلب یہی ہے کہ میں مڈ ٹرم بریک میں یہ سفر کروں۔

ڈاکٹر داس: اچھا اب یہ تو بتاؤ کہ بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کے کس زاویے نے تمھیں سب سے زیادہ تجسس میں مبتلا کیا؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ظفر پر ایک پلے بھی لکھ رہے ہو۔

رودرانشو مترا: اس سے پہلے میں ظفر سے متعلق اپنے تجربے میں آپ کو شریک کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں میری جو ذہنی کیفیت رہی ہے اس پر ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ظفر میرے لیے ایک استعارہ بن گئے اور میں نے بہت سے سوالوں پر ظفر کی شخصیت میں تجسس پیدا ہو جانے کے بعد زیادہ گہرائی سے سوچا، ان تمام زاویوں کا کثیر الابعاد

جائزہ لیا جو اس وسیع تر نظریۂ ہندستان سے متعلق ہیں جس سے جدید ہندستان کی سیاسی تہذیب اور تکثیری ثقافت عبارت ہیں۔ آئیڈیا آف انڈیا کے کثیرالجہات زاویوں پر سوچنے کے لیے تاریخ کی جس فہم کی ضرورت ہے، مجھے ظفر ہی نے اس کی بصیرت عطا کی۔ ہندستان کی تاریخ کا سفر میں نے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کے تناظر میں کیا۔ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کی تفہیم کے مختلف زاویے ہو سکتے ہیں جن میں ایک اہم زاویہ یہ ہے کہ 1857 میں جب مغل سلطنت کا زوال تقریباً مکمل ہو چکا تھا خود آخری مغل اپنے اجداد کے رویوں کی تشریح کس طرح کرتا ہے، وہ ان کے بارے میں کس طرح سوچتا ہے؟ 1857 ہندستان کی تاریخ میں وہ پہلا نقطہ ہے جہاں عوام سیاسی عمل میں شریک ہوئے، نیشنلزم کے مختلف مکاتیب فکر کی بنیاد ان معنوں میں پڑی کہ عوام نے ان پر غور و فکر شروع کیا اور نیشنلزم کا نظریہ مغربی تصور ہونے کے باوجود ہندستانی سیاق و سباق میں پروان چڑھا۔ پاکستان بننے کے باوجود مسلمانوں کی بڑی تعداد اگر ہندستان میں رہ گئی تو یہ انڈین نیشنلزم کے نئے جہات کی بڑی فتح تھی۔

ڈاکٹر داس: تم بہت سنجیدہ باتیں کر رہے ہو۔ بس اپنے پلے کے اسکرپٹ میں داستان گوئی اور سخن سازی کو جگہ مت دینا، اسے رومانٹیزم سے آزاد رکھنا۔ 1857 کے واقعات میں مرکزی کردار عوام کا ہے۔ بغاوت کرنے والے سپاہیوں نے تو بس چنگاری کو ہوا دی، اسے شعلہ تو عوام نے بنایا جسے انھوں نے کسی نہ کسی شکل میں 1947 تک روشن رکھا۔ 1857 گاؤں کے عوام اور شہری آبادی کے درمیان اس براہِ راست رابطے کی پہلی کڑی ہے جو بعد میں ایک مسلسل عمل بن گیا اور ایک نیا ہندستانی شہری معاشرہ وجود میں آیا۔

رودرانشو مترا: اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میرے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ 1857 کے واقعات محض بغاوت نہیں تھے بلکہ یہ جدوجہدِ آزادی تھی؟

ڈاکٹر داس: یقیناً۔ مگر صرف جدوجہدِ آزادی کا فقرہ استعمال کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ 1857 کے واقعات ہندستان کی تاریخ میں ہندستان کی کئی اقتصادی پالیسیوں کا بھی آغاز ہیں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ اس وقت کوئی اصطلاحی اقتصادی انقلاب واقع نہیں ہوا مگر یہ بات بالکل درست ہے کہ اس انقلاب نے نئی اقتصادی پالیسیوں کی راہ ہموار کی ان نئی اقتصادی پالیسیوں کے سفر کا پہلا پڑاؤ 1947 تھا اور دوسرا 1991۔ مگر اقتصادی خود اعتمادی کی منزل ہندستان کے لیے ابھی بھی بہت دور ہے۔ اقتصادی رویوں میں عام ہندستانی ذہن اگر عہدِ وسطیٰ میں نہیں تو انیس ویں صدی میں ضرور جی رہا ہے۔ صحیح معنوں میں اقتصادی انقلاب کی ابتدا اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک پرولتاری عناصر ایک نئے معاشرے کی تشکیل شروع نہ کر دیں اور ہندستان میں یہ منزل ابھی دور ہے۔

رودرانشو مترا: مگر ہندستان میں یہ اقتصادی انقلاب آخر کیوں نہیں آیا، نہ تب نہ اب؟

ڈاکٹر داس: انقلاب کی شکلیں اور تعریفیں مختلف معاشروں کی ساخت کے مطابق مختلف ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہندستانی معاشرے کا کردار مختلف تاریخی وجوہ سے ایسا بن گیا ہے کہ یہاں ریڈیکل طاقتوں کا کردار بھی بالعموم فیوڈل ہی ہے۔ یہ بڑی کڑوی حقیقت ہے جسے ہمارے مارکسٹ یعنی فیوڈل دوست برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ ہندستان میں مارکسسٹوں کے فیوڈل ذہنی رویے کے سبب اس انقلاب کی کوئی توقع نہیں جس کا ذکر تم نے کتابوں میں پڑھا ہے یا جو مثالی حیثیت سے تمھارے ذہن میں ہے۔

رودرانشو مترا: تو پھر بائیں بازو کی طاقتوں کو اپنی شکست تسلیم کر لینا چاہیے۔

ڈاکٹر داس: نظریاتی شکست کو تسلیم کرنا دنیا میں سب سے مشکل کام ہے۔ نظریے جب تضاد کا شکار ہو جائیں تو آہستہ آہستہ وہ کتابی مباحث تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ وہی کیمپس ہے جس پر مارکسزم اور نکسلزم کا غلبہ رہا۔ ہر طرف ان ہی نظریات کی روشنی تھی اور انقلاب کے نعرے گونجتے تھے مگر انقلاب کے یہ داعی کہاں گئے؟ جواب تمھیں بھی معلوم ہے کہ وہ تمام انقلابی اپنے فیوڈل کفن میں لپٹ کر یونی ورسٹی میں لیکچرر ہو گئے۔ ان میں سے اکثر اب پروفیسر ہو چکے ہیں اور وائس چانسلر بننے سے لے کر حکومت کی غلامی کرنے تک کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ یونی ورسٹی کا لیکچرر ہوتا ہی کسی انقلابی کا سرکاری گواہ کی طرح چھوٹ جانا ہے اور جب وہ پروفیسر بننے سے لے کر ان دوسری انتظامی پوسٹوں کا خواب دیکھنے لگے جہاں انقلاب کے ہر نظریے کو دفن کرنے میں پوری تن دہی سے اس لیے لگ جاتا ہے کہ اس کی تمام تر ترقی انقلاب کی شکست ہی میں مضمر ہوتی ہے۔

رودرانشو مترا: کیا آپ بھی ان ہی میں سے ایک ہیں سر! اپنے زمانہ طالب علمی میں آپ بھی تو مارکسٹ تھے، نکسل واد کے حامی! سچ بتائیے سر کیا آپ لیکچررشپ کے انٹرویو میں اس وقت appear ہوئے جب آپ کو اس حقیقت کا عرفان ہو گیا تھا کہ آپ بھی اندر سے فیوڈل ہیں یا اس وقت آپ نے خود کو یہ فریب دیا کہ لیکچرر ہو کر بھی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ وہاں بھی انقلاب کی ضرورت ہے۔ آپ نے خود سے یہ جھوٹ بھی بولا ہوگا کہ آپ لیکچرر ہو کر طلبہ کی تربیت کریں گے، اپنے ساتھی استادوں کو انقلاب کے لیے منظم کریں گے؟ انھیں مارکسزم پڑھائیں گے؟ اسٹڈی سرکل شروع کریں گے۔

ڈاکٹر داس: میں نے تمھاری بات کا برا نہیں مانا۔ ویسے تم نے کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کہا۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی لوگوں کو دیر تک انقلاب کے راستے پر نہیں چلنے دیتی مگر سب لوگ ایسے بھی نہیں ہوتے کہ انتظامی عہدوں کو قبول کرنے سے ان کے ہاں عقیدے کی موت ہی ہو جائے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ آہستہ آہستہ مصلحتیں جوش اور انقلابی ولولوں پر پوری طرح غالب آجاتی ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ اپنی دانش ورانہ فہم کو طاق پر تو نہیں رکھتے مگر اس کا کوئی استعمال بھی نہیں کرتے اور ایک وقت کے بعد ہماری دانش وری صرف اپنے بچوں پر رعب جھاڑنے اور اخباروں میں بیان دینے کے کام آتی ہے۔

رودرانشو مترا: مارکسزم کی مشرقی یورپ اور روس میں شکست کی تشریح آپ کس طرح کرتے ہیں؟

ڈاکٹر داس: یہ اس نظام کی ناکامی تھی جس کی سرشت میں مارکسی فلسفہ سرایت نہیں کر سکا۔ ان ممالک کا تمام تر نظام مکمل طور پر سیاسی مفادات کے تابع تھا۔ یوں اس پسپائی کا مارکسی نظریے سے کچھ تعلق نہیں۔ مارکسی نظریہ کوئی عقیدہ نہیں کہ وہ شکست ہو جائے البتہ جہاں اسے کسی مفاد کے لیے عقیدہ بنا کر پیش کیا جائے گا وہاں اس کی ناکامی ہی نہیں بدنامی بھی لازمی ہے۔

رودرانشو مترا: تو کیا ابھی بھی آپ کا یہ خیال ہے کہ مارکسی نظریے کا مستقبل روشن اور تابناک ہے؟

ڈاکٹر داس: اس میں کیا شک ہے۔ استحصال کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا واحد ہتھیار مارکسی نظریہ ہے۔ ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جہاں سیاسی مسابقت کا جذبہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور اس کے لیے دنیا بھر میں مذہب کا تخریب کارانہ استعمال کیا جا رہا ہے، عجیب و غریب شکلوں میں مذہب بلکہ یوں کہیں کہ مذہبی شدت پسندی کی واپسی ہو رہی ہے۔ حب الوطنی کو فسطائی نظریے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نیشنلزم اور فاشزم ایک ہی سکے کے دو رخ بن کر رہ گئے ہیں۔ جدید دور میں گجرات 2002 مذہب کے تخریب کارانہ اور فسطائی استعمال کی واضح مثال ہے۔ ایسے میں مارکسزم کے سوا اور کوئی سیاسی نظریہ نہیں، جو سائنٹفک بنیادوں پر انسانی فطرت کو استحصال کی مختلف شکلوں کے خلاف ہوشیار، متحد اور برسر جنگ کر سکے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مارکسی نظریہ لوگوں کی فلاح کے لیے ہے اور نئے زمانے میں یہ کام اداروں کے ذریعے بھی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ہندستان میں ضرورت اداروں کے ایک ایسے نظام کے قیام کی ہے، جو سامراجی اور استعماری ذہنیت سے نجات دلا دے۔

رودرانشو مترا: ایک مارکسسٹ کے طور پر روحانیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر داس: میں نے اس پر کبھی سوچا نہیں ہے مگر وہ بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ خود کو پہچاننے اور اپنی غیر استعمال شدہ صلاحیتوں کے عرفان کا ایک ذریعہ روحانیت بھی ہے۔ ان معنوں میں تو ایک مارکسسٹ بھی صوفی ہی ہوتا ہے۔ ذات کے عرفان کے بہت سے راستے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ظفر کو سمجھنے کے عمل میں تم نے خود اپنی ذات کے عرفان اور زندگی کے مشاہدے کے لیے استعاراتی راستہ اختیار کیا۔ تمھارے برعکس میں نے اپنی جوانی میں انقلاب کا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں اب بھی پُر امید ہوں کہ انقلاب کی شکل خواہ کچھ ہو، اس کے استعارے، علامتیں اور نعرے ہمارے تصور سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر انقلاب آئے گا ضرور۔ چلو! علمی باتیں بہت ہو گئیں۔ برسر کے آفس سے اپنا چیک لے لو۔

رودرانشو مترا: میرے لیے یہ گرانٹ بہت مددگار ثابت ہوگی۔ ایک مرتبہ پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، پروفیسر داس! آپ کو جلد ہی میرے پلے کی ایک کاپی مل جائے گی۔

ڈاکٹر داس: پلے کی صرف کاپی ہی نہیں بلکہ اس میں مجھے ایک رول بھی چاہیے، جس کا تم نے وعدہ کیا تھا۔ بادشاہوں کو مارکسزم پڑھانے کا رول کیسا رہے گا؟

رودرانشو مترا: دیکھیے سر، ہم کیا کر پاتے ہیں، یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن اگر آپ نے بہادر شاہ ظفر کو مارکسزم پڑھانا شروع کر دیا تو وہ ہندستان آنے سے انکار کر دیں گے۔ خیر یہ تو تفریح کی بات ہے۔ ویسے آپ کے لیے اس چیف جج کا رول کیسا رہے گا، جس نے بہادر شاہ ظفر پر مقدمے کی سماعت کی۔

ڈاکٹر داس: شکریہ۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا مگر تم مجھے اپنے دوسرے پلے میں ایک رول دے دینا۔ یہ پلے چھٹی اور ساتویں دہائی کے انقلابیوں کے بارے میں ہونا چاہیے۔ سر دست تو میں ناظرین میں بیٹھ کر تمھارا پلے دیکھوں گا۔

رودرانشو مترا: میں آپ کا بہت ممنون ہوں، آپ میرے محسن ہیں۔

ڈاکٹر داس: یہ بات تم بہادر شاہ ظفر کو ضرور بتا دینا۔ گڈ لک، کیا تم رنگون تنہا جاؤ گے۔

رودرانشو مترا: سارہ بھی ساتھ جانا چاہتی ہے۔

ڈاکٹر داس: یہ بہت اچھا خیال ہے اور اس بات کی ضمانت کہ وہ تمھیں واپس ہندستان لے آئے گی۔ اس نے تمھارے اندر توازن پیدا کیا ہے۔

رودرانشو مترا: آپ مطمئن رہیے میں واپس ضرور آؤں گا۔

(دونوں آہستہ آہستہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں)

OO

تعارف

منجو قمر یدالٰہی کا ڈراما

محمد تاتار خان

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور اس کے بڑھتے رسوخ نے مغل سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں تھیں۔ حکومت کے کام کاج اور دیگر معاملات اسی کمپنی کے ہاتھوں چلے گئے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے آتے آتے مغل سلطنت کی شان وشوکت داؤ پر لگ چکی تھی۔ جب بہادر شاہ ظفر 1837 میں تخت نشین ہوئے تھے تو انگریزوں کی جانب سے ایک لاکھ روپے کی پنشن مقرر ہوئی اور باغات سے پچیس ہزار روپیہ ملا کرتے تھے جس سے شاہی محل کا کاروبار چلا کرتا تھا۔ یہ دور بہادر شاہ ظفر کے لئے مصائب سے بھرا ہوا تھا۔

شاعرانہ طبیعت اور نزاکت وسلیقہ مندی ظفر کے حصہ میں آئی تھی۔ شاعری، نجوم، خوش نویسی اور شکار کا شوق رکھتے تھے۔ خارجی حالات جو بھی ہوں، دربار ہمیشہ شعرا حضرات کے کلام سے گونجتا تھا۔ ادھر انگریز اپنی ریشہ دوانیوں سے سلاطین زادوں اور شہزادوں کے ساتھ ساتھ ظفر کے لئے بھی مشکلات کھڑا کر رہے تھے۔ اپنے بچوں کی طرف دیکھتے جن کی آنکھوں میں حکومت کے خواب پوشیدہ تھے۔ ظفر فرماتے ہیں ''میری اولاد ناحق آرزوئے سلطنت رکھتی ہے۔ یہ کارخانہ آگے کو چلنے والا نہیں۔''

لارڈ ڈلہوزی اپنے طرز عمل سے ہندوستانیوں کی حیات تنگ کر چکا تھا۔ رعایا بدحالی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ تشدد کی آگ ان کے سینوں میں جل رہی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی کے جاتے ہی یہ آگ چاروں طرف پھیل گئی۔ ہندوستانی فوج نے میرٹھ میں انگریزوں پر گولی چلادی۔ مغل سلطنت اور ظفر کے وفادار فوجی سپہ سالار نے اپنی سرکردگی میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ لکھنؤ اور کانپور میں بھی یہی صورت حال رہی۔ اندرونی رسہ کشی اور سازشوں کی وجہ سے ساتھ سو من بارود جل گیا جو انگریزوں کے خلاف استعمال کیا جانے والا تھا۔ اس طرح آزادی کے حصول کی ساری کوششیں رائیگاں

■

''ڈراما آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی الم ناک زندگی کی مکمل تصویر ہے۔ دہلی کے انقلاب سے لیکر رنگون کی قید اور ظفر کی آخری نزع کی ہچکی تک کے واقعات کو ڈرامے میں خوبی کے ساتھ سمویا ہے۔ تاریخی صداقتوں کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مکالمے موثر اور شستہ ورفتہ ہیں۔ یہ ایک مکمل ڈراما ہے جیسے اسٹیج پر پیش کیا جاسکتا ہے۔''

شاعر، بمبئی

''یہ ڈراما اردو کی ادبیات العالیہ میں مقام پیدا کرے گا اور جامعات کے نصاب میں اس کی جگہ ہوگی۔''

عبدالقادر سروری

■

گئیں۔ سمٹی ہوئی دہلی حکومت کے آخری تاج دار مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ کپتان ڈبلیو آر ہڈسن نے وعدہ کیا تھا کہ خاندان مغل پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ اس کے باوجود ظفر کے پانچ بیٹوں مرزا مغل، مرزا خضر، مرزا ابوبکر، مرزا قویش اور مرزا عبداللہ کے سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ ان کے محافظ خاص بخت یار شاہ اور شاہ سمند خان کو قتل کر دیا گیا۔ امرا اور رؤسا کی املاک ضبط ہو گئیں۔ بہادر شاہ ظفر، مفتی صدر الدین آزردہ، مصطفیٰ خان شیفتہ، مولانا فضل حق خیرآبادی پر مقدمے دائر کئے گئے۔ بہادر شاہ ظفر پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے اپنے سپہ سالار اعظم جنرل محمد بخت خان کی سرکردگی میں شہنشاہِ ہندوستان ہونے کا اعلان کیا تھا۔

مصطفیٰ خان شیفتہ کو سات سال کی قید ہوئی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کو کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔ انگریزوں نے ایک فوجی کمیشن بٹھایا کہ بہادر شاہ ظفر پر لگائے گئے الزام کا خلاصہ ہو۔ جھوٹا الزام، جھوٹی عدالت اور جھوٹا فیصلہ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی پر ختم ہوا۔ عظیم الشان مغلیہ سلطنت کے مجبور، بے بس، ہر دل عزیز، رعایا پرور بادشاہ کو رنگون بھیج دیا گیا۔

اسی پس منظر میں حیدرآباد کے کہنہ مشق ڈراما نگار منجو قمر یداللّٰہی مرحوم نے پنڈت جواہر لال نہرو کی ایما پر 1962 میں 'بہادر شاہ ظفر' نام سے ایک ڈراما لکھا۔ 1965 میں اسے ساہتیہ اکیڈمی نے بہترین ڈرامے کے اعزاز سے نوازا۔ یہ ڈراما تقریباً آٹھ بار حیدرآباد میں پیش ہو چکا ہے۔

منجو قمر یداللّٰہی نے 35 سال اردو ڈراما کی خدمت کی۔ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ انھوں نے آفتاب دمشق، پینے کے بعد، شبنم، اکیلی، ہنگری تمنا، ہمارا پرچم، بولتی لاش، جھانسی کی رانی، مرزا غالب، انوکھی ابلا اور عورت کا دل وغیرہ ڈرامے لکھے۔ ایک نئی تکنیک 'عکسانہ' (Photo play) پر بھی ان کے ڈرامے ملتے ہیں مثلاً چلتی جوانی، سستا خون مہنگا ساز، ڈھلتا سورج بڑھتا سایہ، ایک دھماکہ، دہکتی آگ، کچی پکی، تیز کرن، غریب کی جورو سب کی بھابی، بیگم ساحرہ، امیر علی ٹھگ، ابوالحسن تاناشاہ، نیل کی ناگن، کلاوتی کامنی اور شرمیلی شیلا۔

جہاں تک بہادر شاہ ظفر ڈرامے کا تعلق ہے 'شاعر' بمبئی نے لکھا تھا۔ ''ڈراما آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی المناک زندگی کی مکمل تصویر ہے۔ دہلی کے انقلاب سے لیکر رنگون کی قید اور ظفر کی آخری نزع کی ہچکی تک کے واقعات کو ڈرامے میں خوبی کے ساتھ سمویا ہے۔ تاریخی صداقتوں کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مکالمے موثر اور شستہ ورفتہ ہیں۔ یہ ایک مکمل ڈراما ہے جسے اسٹیج پر پیش کیا جاسکتا ہے۔'' عبدالقادر سروری نے لکھا تھا۔ ''یہ ڈراما اردو کی ادبیات العالیہ میں مقام پیدا کرے گا اور جامعات کے نصاب میں اس کی جگہ ہوگی'' پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا دہلوی اس ڈرامے کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں ''ماشاءاللہ خوب ناٹک لکھا ہے اور تاریخ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مکالمہ بھی لال قلعہ کی صحیح بولی میں ہے۔ جو مغلیہ معاشرہ کا رنگ ہے وہ بھی خوب چوکھا آیا ہے۔ میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ یہ کامیاب ثابت ہو۔ اس سے ناظرین کے سامنے صحیح صحیح حالات اس 1857 کے ہنگامے کے آجائیں گے۔''

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ منجو قمر صاحب نے اس ڈرامے کو 'شہیدانِ جنگِ آزادی کے نام' انتساب کیا ہے۔ OO

ڈرامہ

بہادر شاہ ظفر

منجو قمر

پہلی آواز:

قفس ہے میرا کہیں اور نہ آشیاں میرا
کہیں ملا نہ ملے برق کو نشاں میرا
یہی فلک جسے کہتا ہے تو ستم پرور
رہا ہے مدتوں اے دوست پاسباں میرا
نگاہ میری جھکے اس کے روبرو کیا خوب
جبیں تھیں جس کی کبھی اور آستاں میرا
جہانِ کہنہ کی وسعت سے کیا غرض ہے قمر
ٹھہر گیا میں جہاں بن گیا جہاں میرا

دوسری آواز:

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش سنگِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

پہلا باب

پہلا منظر: قلعہ معلی

عقب میں پھولوں کا جنگلہ، آسمان سے جھاڑ و تارا ٹوٹتا ہے پو پھٹتی ہے صبح کی توپ دغنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ قلعہ کی کنیزیں جنگلہ سے ہو کر دالان میں آتی ہیں۔

مہتاب: اے سبحان اللہ توپ کی آواز نے اہل دلی کو صبح کی آمد کا پیغام پہنچا دیا۔ ساری دلی جاگ اٹھی۔ دیکھو تو نخرے بی کشمیرن کنیز خاص اور بی شبراتن کے گرما کی صبح چادریں تان کر سو رہی ہیں۔

نسترن: اماں جہاں پناہ مرغانِ صحرائی کا شکار کرنے کی غرض سے تشریف لے گئے ہیں دو گھڑی دن چڑھے سواری مبارک حویلی آئے گی تب کہیں ان کی آنکھیں کھلیں گی۔

مہتاب: ویسے بھی کام ہی کون سا ادھورا رہ جاتا ہے جو یہ منہ اندھیرے سرانجام دیتیں۔ لے دے کے خمیرے کا تمبا کو کٹوری میں بھر بھنڈے پر رکھ ظل سبحانی کی خدمت میں سٹک پیش کرنا ہی تو بی کشمیرن کا کام ہے۔ رہیں شبراتن سیلا بچی آفتابہ سنبھال کیا لیتی ہیں پسینے پسینے ہو جاتی ہیں۔

نسترن: انھیں ہوشیار کرنے کی ایک تدبیر سوجھی ہے، دیکھنا کیسے بیدار ہوتی ہیں۔ قربان علی (قربان علی کے کان میں کچھ کہتی ہے)

قربان علی: جی ہاں! ابھی آواز دیتا ہوں۔ پیر و مرشد حضور عالی بادشاہ سلامت عمر دراز۔ باادب باملاحظہ نگاہ روبرو! (کشمیرن اور شبراتن داخل ہوتی ہیں۔ کشمیرن کے دراز گیسو کھلے ہوئے ہیں اس کا چہرہ جھکا ہوا ہے دونوں مجرا بجالاتی ہیں)

مہتاب: بھنڈ اتیار ہے؟ (نسترن کی آواز پہنچان لیتی ہے۔)

کشمیرن: اوئی بوا تم میں نے جانا سواری آن پہنچی جھٹ سے اٹھ پانی کا جھپکا منہ پر مار ہانپتی کانپتی چلی آئی۔ رات دیر سے خمیرہ آیا گلاب کا چھینٹا کیا دیا نیند اچاٹ ہو گئی۔

مہتاب: ذرا جوبن کا ابھار تو دیکھے کوئی ان دراز گیسوؤں کے صدقے۔ نیند بھی آتی ہے تمھیں؟ بات ہی بات ہے کہیں حسن کو بھی نیند آئی ہے؟ ہم نے سوتے میں بھی کھلی دیکھی ہیں۔

کشمیرن: یہ بات ہے تو موا سوتا ہی بھلا۔

مہتاب: کہتے ہیں نواب شیر علی خاں باغ کا دوبارہ ٹھیکہ لینا چاہتے ہیں۔
کشمیرن: لیا کریں مجھے اس سے کیا، من کے لڈو پھوڑنا تو خوب آتا ہے تمہیں، چاندنی چوک کے باغ میں سبھی تو تھیں لیکن چڑھ گیا نام بی کشمیرن کا جھنڈے پر، کیوں آپا میں نے بات بھی کی تھی کسی سے منہ جوڑ کر؟
نسترن: اے بلا سے یہ بھی کوئی بات ہوئی۔
سنگرام: سواری مبارک قلعہ آن پہنچی۔
مہتاب: اے یہ لو سواری آن پہنچی۔ (سب جاتی ہیں)
میرن: (داخل ہو کر رستم سے) کوئی دن ایسا بھی جاتا ہے جس دن ظل سبحانی نے کسی کو انعام واکرام سے نوازا نہ ہو۔ دوسرے دن وہی بات بلبل ہزار داستاں سنا دیتی ہے۔
رستم: استاد میرن نے جس بلبل ہزار داستاں کی پرداخت کی ہو اس کے کیا کہنے! لال حویلی کی بلبل جو ہے۔
قربان علی: حضور علی بادشاہ سلامت عمر دراز، باادب باملاحظہ ہوشیار (ظفر تخلخہ لئے ظہیر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)
ظفر: سبحان اللہ صبح دم کیا خوب قطعہ ہوا ہے، کیوں ظہیر؟
ظہیر: سبحان اللہ تعریف نہیں کی جا سکتی، ماشاء اللہ یہ قطعہ تو پیر و مرشد کے حصے کا تھا۔ مجھے ازبر ہو گیا، کیا خوب فرمایا ہے حضور نے:

کاٹتے دن ہیں جو ہم باعثِ غم گن گن کے
شب بھی کرتے ہیں بسر تاروں کو ہم گن گن کے
کوئے جاناں کی زمیں اپنے پکڑتی ہے پاؤں
ہم ظفر اس لئے رکھتے ہیں قدم گن گن کے

میرن: سبحان اللہ۔
ظفر: (جنگلے سے ادھر دیکھ کر) راقم الدولہ، لالہ شیو لال کے ساتھ جو ابھی گفتگو کر رہا تھا شاید شیر علی خاں تھا۔
ظہیر: خدا خیر سے (سائڈ میں) ہاں پیر و مرشد شیر علی خاں تھے۔
ظفر: اور کچھ پیش کر رہا تھا۔
ظہیر: شاید معروضہ ہوگا۔
ظفر: رستم بیگ لالہ شیو لال حاضر ہوں۔
قربان: لالہ شیو لال محرر دفتر خاص حاضر ہوں۔
لالہ: مہابلی بادشاہ سلامت (آداب بجا لاتے ہیں، ہاتھ میں عرضی ہے)
ظفر: لالہ شیو لال یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟
لالہ: مہابلی، نواب شیر علی خاں چوک کے باغ کا دوبارہ ٹھیکہ لینا چاہتے ہیں انھوں نے معروضہ پیش کیا ہے۔
ظفر: نہیں اس کا معروضہ پیش نہیں ہونا چاہئے۔
لالہ: جو حکم۔
ظفر: ظہیر بزرگوں کی کہی ہوئی بات تجربے سے خالی نہیں ہوتی، سچ ہے تنکا ہوا سے اڑ جاتا ہے۔ یہ جان کر کہ یہ نوجوان یتیم ہے اس کے اب وجد ہمارے بزرگوں کے بہی خواہ تھے اس کے برادر نواب سیف الدولہ غلام عباس ہمارے وکیل کی سفارش پر ہم نے اسے شاہی باغات کا ٹھیکہ دلوایا اسے فلک پر بٹھایا لیکن اس احسان فراموش نے نہ صرف باغ کی رعایا کا ناک میں دم کیا بلکہ ظفر محل کے احترام کو بھی نظر انداز کر دیا۔
ظہیر: ان کی مجال جو وہ...
ظفر: تم نہیں سمجھے۔ رستم بیگ چشم دید واقعہ کیوں رستم بیگ۔
رستم: عالم پناہ۔
ظفر: وہی بات جو تم نے ہمیں سنائی تھی راقم الدولہ کو بھی سناؤ۔
رستم: عالم پناہ وہ بات وہ بات تو وہ وہ...
ظفر: آفریں بادر رستم بیگ تم نے آداب کے معیار کو گرنے نہ دیا اس کا نام ہے آداب شاہی۔ ظہیر سنایا گیا کہ اس حرص و ہوس کے پتلے شیر علی خاں نے ظفر محل کی کنیز خاص سے چھیڑ کی۔ (سب چونک جاتے ہیں)
ظہیر: یہ جرأت رندانہ۔ یہ گستاخی! لیکن ظل الٰہی، گستاخی معاف ہو تو بندہ بھی کچھ عرض کرے۔
ظفر: ہاں ہاں کیوں نہیں۔ وہ تمہارا اہم محلّہ ہے، تم اسے خوب جانتے ہو، کہو اجازت ہے۔
ظہیر: ظل الٰہی تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔
ظفر: کیا بات کہی ہے ظہیر تم نے۔ سچ ہے تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ایک خطاوار ٹھہرا تو دوسرا سزاوار، ہم نے کہا رستم بیگ۔
رستم: عالم پناہ۔
ظفر: کنیز کشمیرن حاضر ہو۔
رستم: کشمیرن کنیز خاص (حلسوتی آواز دیتی ہے)
ظفر: نہیں... وہ ہمارے سامنے نہ آنے پائے۔ رستم بیگ جاؤ اور اس لونڈیا کا سر منڈوا دو۔ ابھی اور اسی وقت۔
ظہیر: بندہ پرور وہ ایک دوشیزہ ہے۔
ظفر: تعمیل ہو (بہ آواز بلند)
رستم: جو حکم (جاتا ہوا) نحو خاص تراش۔
قربان: احترام الملک حکیم احسن اللہ خاں ثابت جنگ وزیر اعظم۔
ظفر: اجازت ہے۔ استاد میرن دیکھنا۔ (میرن جاتے ہیں)

احسن: (داخل ہو کر آداب بجالاتے ہیں) خادم خیر خواہ جاہ وجلال کورنشات بجالاتا ہے۔
ظفر: احسن اللہ خاں کہو کیا بات ہے؟
احسن: پیرو مرشد مدت دراز کے بعد آج شاہی جلال نے لال حویلی کے درودیوار کو کپکپا دیا۔ خادمان حویلی کے دل دہل گئے ایسے میں ناممکن تھا کہ بندہ حاضر نہ ہوتا۔
ظفر: اماں اب وہ جلال کہاں۔ کب کا فرنگی چالوں نے ملیامیٹ کر دیا اس کو۔ تاہم کبھی کبھی نمک حراموں کی بے جا حرکات سے طبیعت تنگ آجاتی ہے۔
احسن: ظرف شاہی سب کو کہاں نصیب ہوتا ہے یہ تو شاہوں کے حصے میں آتا ہے۔
حلسوئی: حیات مزید (آواز دیتی ہے)
احسن: پیرو مرشد نے صبح کی یعقوتی اب تک نوش نہیں فرمائی؟
ظفر: دیر ہوگئی۔ سنا ہے، ہماری بھابی حسینی بیگم مرزا جہانگیر مرحوم کی بیوہ نے باغات کی آمدنی کی نسبت آگرہ کی عدالت میں ہمارے خلاف نالش کی ہے۔
احسن: اس سے ظاہر ہے آگ پر تیل ٹپکانے والوں کی کمی نہیں رہی۔
ظفر: اماں سوداگروں کے سوا اور کون ہوں گے۔ آشفتہ سری ایک اور سہی۔ فرنگی سیاست جو ٹھیری!
قربان: مرزا رجب علی ارسطو جاہ کارپرداز۔
ظفر: اجازت ہے۔
رجب: (داخل ہو کر آداب بجالاتے ہیں) ظل سبحانی۔
ظفر: رجب علی ہم نے راجہ رام موہن رائے کو طلب کیا ہے۔
رجب: لیکن عالم پناہ نواب سیف الدولہ وکیل سرکار آگرہ روانہ ہو چکے ہیں کہ عدالت میں پیروی کر سکیں۔
ظفر: ٹھیک ہے وزیر اعظم ہم ابھی آتے ہیں۔ (جاتے ہیں قربان پیچھے جاتا ہے) خدا دارم چہ غم دارم۔
قربان: باادب باملاحظہ نگاہ روبرو۔
رجب: عزت مآب شاہی مزاج میں تلون کی کارفرمائی نظر آرہی ہے۔ طبیعت شاہانہ کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے۔
احسن: کیوں نہ ہو، شاہی مزاج نہیں شاہانہ فطرت کہئے؟
ظہیر: حسینی بیگم نے دعویٰ جو دائر کیا ہے۔
احسن: جہاں گز ہوتا ہے وہاں مکھی ہوگی ہی۔
ظہیر: بجا کہا، شہزادہ مرزا جہانگیر کو اعلیٰ حضرت اکبر ثانی مرحوم نے چاہا تھا کہ دلی کے تخت و تاج کا وارث قرار دیں لیکن انگریزوں نے نہیں مانا، مرزا جہانگیر انتقال کر گئے تو ان کی بیوہ کی نظر باغات کی آمدنی پر اٹھی ہے۔
احسن: لیکن نواب زینت محل کا تار نظر اس کی کاٹ میں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔
رجب: یعنی جنم کی عادت جنازے تک؟
احسن: بات کچھ وہی جانے جو عورت کو پہچانے۔
رجب: جنت ہاتھ سے گئی تو کس کی خاطر تھی؟ بات طشت از بام ہو چکی ہے۔ سیف الدولہ کو سمجھا کر دولت کدہ پہنچا تو پتہ چلا حویلی ہیں، جب سے یہ بات سنی ہے دل میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔
ظہیر: دیکھئے سیف الدولہ آگرہ گئے ہیں شائد بات سلجھ جائے۔
احسن: باغات کی کیا بات ہے پس منظر کی بھی کہئے تو۔
ظہیر: نواب زینت محل چاہتی ہیں کہ ظل سبحانی ولی عہدی کی تقرری کی نسبت ان سے بھی مشورہ کریں۔
رجب: مرزا فخرو کے ہوتے، ایک اینٹ کے لئے مسجد کو ڈھانا گناہ کبیرہ مول لینا ہے۔
احسن: جب سے وہ بیمار ہیں محل میں کھلبلی سی مچی ہے۔
ظہیر: چاہے کچھ ہو عورت پر کالہ آفت، اپنا عورت پن دکھا کر رہے گی۔
رجب: کیوں نہ ہو حضور... ہاں میں ہاں ملائیں گے ہی کہ پیری کا سہارا سب سے پیارا لیکن کمشنر پنجاب ہوں کہ آگرہ کے افسر سب حسینی بیگم کی تائید کریں گے دیکھ لینا جب تک حویلی میں نازک بنسی بجتی رہے گی انگریز کی تال سم پر نہیں آئے گی۔
احسن: ایسے میں... نواب میر شیر علی خاں پر تان ٹوٹی ہے۔
سنگرام: شہزادہ مرزا جواں بخت عمر دراز۔
(شہزادہ داخل ہوتا ہے سب آداب بجالاتے ہیں)
جوان بخت: نواب ارسطو جاہ۔ (سلام لے کر)
رجب: والا تبار۔ (آداب بجالاتے ہیں)
جواں بخت: ظفر محل ہوتے ہوئے دلی تشریف لے جائیں تو اچھا ہوگا۔
رجب: ملکہ عالم نواب زینت محل کی خدمت عالیہ میں کورنشات بندہ ظفر محل ابھی حاضر ہوتا ہے۔
جواں بخت: ٹھیک ہے (جوان بخت جاتے ہیں)
رجب: عزت مآب ایک چنے کی دو دالیں ہیں کہیے کیا کریں؟
احسن: اپنی رکھیے پرائی چکھیے۔
رجب: تسلیمات (ظہیر اور احسن کو سلام کر کے جاتے ہیں)
قربان: باادب باملاحظہ ہوشیار (ظفر کا داخلہ)
ظفر: نواب یار خاں لال حویلی کے کوتوال کو حکم دیجو کہ شیر علی خاں پر کڑی نظر رکھیں۔ ہاں وزیر اعظم کیا چنوں کا وزن بڑھا دیا گیا ہے؟
احسن: ناممکن پیرو مرشد وہی دو تولے چنا اور دو ماسے یعقوتی۔

ظفر: ظہیر اس مہینے کے اخراجات کی تفصیل؟
ظہیر: ظل الٰہی ستر ہزار روپے نواب طامسن سفیر لندن کو روانہ کئے گئے۔
ترپن ہزار روپے شہزادگان اور سلاطین زادوں میں تقسیم ہوئے اور تین ہزار کی
رقم امرا اور عوام میں انعام و اکرام پر....
ظفر: قرضہ داری؟
ظہیر: نو لاکھ تک جا پہنچی ہے پیر و مرشد ملازمان نظارت مطالبہ کر بیٹھیں تو...
ظفر: اماں احسان اللہ خاں اب کہو عقل آرائی کیا ہو، پنشن ایک لاکھ، آمد
باغات پچیس ہزار جملہ سوا لاکھ میں کارخانہ شاہی کیا خاک چلے گا۔
احسن: بجا ارشاد ہے پیر و مرشد خادم آج ہی ایجنٹ بہادر نواب معظم الدولہ
کے گوش گذار کرے گا۔
ظفر: ٹھیک ہے کہو کہ ادائی کے سامان بہم مہیا ہوں۔
احسن: پیر و مرشد جوادلدولہ کے پوتے سید احمد خاں ستائیس سالہ نے بڑا نام
پیدا کیا ہے۔ وہ ان دنوں فتح پور سیکری میں منصف ہیں آج قدم بوسی کا شرف
حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
ظفر: کیوں نہیں، کیا وہ نشست میں حاضر ہیں؟
احسن: رستم بیگ (اشارہ کرتے ہیں کہ سید کو لے آئے)
سید: (داخل ہو کر) بندگان عالی (سلام کرتے ہیں)
ظفر: آیئے آیئے سید زادے بڑے عارف نکلے، سنا ہے تم نے اپنے بزرگوں
کے نام روشن کئے ہیں۔ کیوں نہ ہو ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ ہم
تمہیں جوادلدولہ عارف جنگ کے خطابات سے نوازتے ہیں۔
احسن: سبحان اللہ یہ قدردانی۔
سید: ذرہ نوازی۔ (سید جاتے ہیں)
ظفر: احسان اللہ خاں یہ ریش۔
احسن: پیر و مرشد جوادالدولہ کے گلے میں رسولی ہے۔
ظفر: یہ بات ہے، مابدولت نے انھیں کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا تھا، پھول
والوں کی سیر میں۔ ہاں راقم الدولہ پھول والوں کی سیر میں ہم نے تمام رعایا کے
طعام کا حکم دیا تھا لیکن پیش کار کی زبانی معلوم ہوا کہ اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی۔
ظہیر: ظل الٰہی قطب صاحب کے میلے میں رعایا کا کافی اژدحام ہوتا ہے۔
ایسے میں ساری رعایا کے لئے طعام کے انتظام کا خزانہ شاہی...
ظفر: ہاں ہاں ہم سمجھ گئے، شاہان مغلیہ میں اگر کسی کے نام کے ساتھ مجبور کا
لفظ چسپاں ہو سکتا ہے تو وہ ہمارا نام ہے۔
قربان: حضور عالی بادشاہ سلامت عمر دراز۔
ظفر: کیا گیارہ بج رہے ہیں۔ رستم بیگ رعایا کو کھانا بھجوایا گیا؟
رستم: حسب معمول سات من خمیر روٹی اور پانچ دیگ سالن داروغہ خاصہ
کلاں لے گئے ہیں۔
ظفر: سبحان اللہ جب ہی تو طعام جزو بدن ہوتا ہے۔
قربان: با ادب باملاحظہ نگاہ روبرو۔ (سب جاتے ہیں)

دوسرا منظر: دالان

میرن: جانے سواری آئی بھی کہ نہیں۔ رات شہزادہ مرزا مغل کے ہاں قوالی تھی۔
مہتاب: اے یہ دبے پاؤں کیوں دندناتے آتے ہو کوئی تمہیں ٹوکنے والا۔
میرن: اماں دلی بھر کی دھول سے دالان اٹا پڑا ہے تو پھونک پھونک کے پاؤں
رکھ رہا ہوں۔ کسی ٹوکنے والے سے یہاں ڈرتا کون ہے۔
مہتاب: کل سر مغرب میں نے کہہ دیا تھا کہ حویلی میں زنانی محفل ہے آپ
گھر میں رہیں لیکن مردوے ٹھہرے جب ہی تو رات گھر سے باہر رہے۔
میرن: کسی کونے پر رات تھوڑی ہی بسر کی ہے۔ مشاعرے سے چلے آرہے
ہیں۔ ادھر استاد ذوق نے مقطعہ پڑھا ادھر مؤذن نے آواز دی صبح ہوگئی۔
اے تم مہتاب تخلص کرتی ہو، پوچھا ہوتا کہ مشاعرہ کیسا رہا اور ہماری غزل۔
مہتاب: میری بلا کو کیا غرض جو پوچھتی آپ کی غزل۔ اے کبھی غزل بھی کہی
ہے آپ نے؟
میرن: مومن کے کلام پر ایمان گنواتی ہو اور اس سلجوقی کے ثقیل کلام پر جان
دیتی ہو۔ ہمارا کلام گویا کلام ہی نہیں؟ رات کا مشاعرہ تو تاریخی مشاعرہ تھا۔
اہل دلی کا وہ ہجوم کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ مونڈھے سے مونڈھا لگا ہوا؟
مہتاب: اے جوتیوں سمیت آنکھوں میں نہ گھسنا بھلا دیکھے بھی ہیں کسی نے
قلعہ کے مشاعرے؟
میرن: اماں رہنے بھی دو، خدا رکھے زین العابدین عارف کو مشاعرہ کیا کیا
اچھی خاصی تقریب کر ڈالی انھوں نے۔ حویلی کا مقام اور ان کا انتظام۔ لنتر
ہانڈیوں سے، جھاڑوں سے نور برستا ہوا۔ محفل میں بیچوں بیچ سبز مخمل کا
شامیانہ تنا ہوا اور کارچوبی مسند پر ٹھاٹھ سے بیٹھے ہوئے صاحب عالم!
مہتاب: مسند کے قریب چھوٹے سے زیرانداز پر خاصدان اگالدان رکھے ہوئے
میرن: بجا کہا۔ ہائیں کیا کہا تم بھی تھیں وہاں۔ زنان خانے کا بھی تو انتظام
کیا تھا عارف نے۔ میں نے جالی دیکھی تھی جس کی کور سے کلابتونی ڈوریوں
سے منقش کے گچھے لٹک رہے تھے۔ جہاں سے...
مہتاب: جناب کے کلام پر داد کا شور سنائی دے رہا تھا۔
میرن: واللہ بیگم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ جب چوبدار نے میرے
آگے شمع رکھی تو صاحب عالم نے فرمایا استاد میرن بیچ میں آکر پڑھئے۔

مہتاب: داد بھی خوب دی ہوگی صاحب عالم نے۔

میرن: اماں ان کی تو بھویں تن گئیں ہر مصرع پر داد دیے جا رہے تھے۔

مہتاب: اوئی اللہ! ہر مصرع پر داد اور وہ بھی بھویں تنا کر تو اس کا مطلب ہے داد ملی ہی نہیں بے داد رہے آپ۔

میرن: عجیب کہارن ہو۔

مہتاب: پھر تم نے کہارن کہا۔ الف کے نام بے نہیں معلوم چلے ہیں شاعری کرنے۔

میرن: تم کیا جانو میں کس پایہ کا شاعر ہوں۔ مومن کی بحر طویل سے بھی طویل بحر میں مطلع پڑھا تھا۔ کیا پڑھا تھا۔ ہاں:

ترازو بن گیا تیر نظر جب دل کے اندر تب نظر آیا وہ منظر کہ یہ اک طرفہ تماشا تھا

مہتاب: بس بس کلیجہ منہ کو آ گیا ختم بھی کچھ یہ مصرع ہے یا لمڈور۔

میرن: مذاق نہ کرنا بھلا۔ شاید تیسرے مصرع پر تمہارے سلجوقی مرزا نوشہ نے کہا تھا، بھائی میرن یہ مصرع تو ایک دیوان پر بھاری ہے۔

مہتاب: کس کے دیوان پر بھلا؟

میرن: تم نے تو بال کی کھال کھینچ لی۔

مہتاب: جب بات پلو میں باندھ کر لائے ہو تو بتاتے کیوں نہیں کہ جناب کا ایک مصرع کس کے دیوان پر بھاری تھا۔

میرن: پلو ہوتا تو بات بھی بندھی ہوتی جانے کس کے دیوان پر۔ مگر ہاں وہ موسیو جیمس فرانسیسی کا لڑکا الکو یندر، عارف کا شاگرد!

مہتاب: وہ آزاد تخلص کرتا ہے اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد ہے۔ جب بات کرنے کا شوق چراتا ہے تو ہر بات لمبی لمبی۔ سنو اس کا شعر ہے:

یہ درد لا دوا ہے نہ مجھ کو دوا پہ چھوڑ
ہمدم مریض عشق ہوں مجھ کو خدا پہ چھوڑ

میرن: ہاں وہی رات اس نے پڑھا تھا؟

یہ بزم پیر مغاں ہے ادب سے بیٹھا اے شیخ
جو ناچنا ہے تو جا کر کسی مزار پہ ناچ

مہتاب: کیا نچوایا ہے۔ واللہ...

میرن: اس ناچ کے نظر کرتے تمہارے سلجوقی کی غزل پھس پھس سی رہی، مطلع تھا:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مہتاب: واللہ کس قدر سلیس زبان ہے یہی مطلع حاصل مشاعرہ رہا ہوگا جب ہی تو جناب کی زبان پر چڑھ گیا۔

میرن: شہزادے تخت و تاج کی قسم کھایا کرتے ہیں، ہم اہل ذوق ہیں تمہارے سر کی قسم مشاعرہ حضرت ذوق کے ہاتھ رہا اور میرن نے میدان مار لیا۔

مہتاب: گھر کے میدان کی بھی کچھ خبر ہے۔ رات محفل میں نسترن نے منہ کی کھائی۔ تال جانے تو کیا سر بھی تو ہو تمہیں تو بلبل کی طرح چہکنا آیا لیکن آیا بھی کوئی استاد کہلانے والا؟

میرن: اتنی سی بات پر چراغ پا ہو رہی ہو۔ کل رات مشاعرہ میں جن میاں تصویر نے قطعی وعدہ کیا ہے کہ فجر دم لونڈے کو بھجوا دیں گے۔

مہتاب: اوئی لونڈا۔ کیا نام ہے اس کا؟

میرن: آوے تو پوچھ کر بتاؤں۔

ہُدہُد: بھائی میرن ہوت (ہُدہُد آواز دیتا ہے)

میرن: لو بیگم لونڈا آ گیا۔

ہُدہُد: میں منقار جنگ ہوں۔

مہتاب: لو اب سنو منقار جنگ کو لونڈا بنا دیا آپ نے۔

میرن: میاں ہُدہُد شہپر الملک آؤ آؤ منقار جنگ۔

ہُدہُد: آداب عرض ہے۔ بھابی تسلیم۔ یہ لینا کنجی گھر والی میکے گئی تھی نا۔

مہتاب: ہاں تو کیا بہن آ رہی ہیں؟

ہُدہُد: صبح ہی آ گئی اور صبح ہی عالم پناہ نے مجھے طلب فرمایا ہے۔ اگر وہ آ گئی تو مجھ خانہ خراب کو نہ پا کر تالا گھورنے لگے گی۔

میرن: تو کہو پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی۔ شاہان مغلیہ کے مشغلے خوش نویسی خطاطی اور نجوم تو تھے ہی اب ظل الٰہی نے شاعری کا اضافہ کر رکھا ہے ان میں۔

ہُدہُد: مجھے طلب کیا گیا ہے تو شاید شاعری ہوگی۔

میرن: کچھ لکھا بھی ہے۔

ہُدہُد: اجی وہ غزل سناؤں کہ طبیعت پھڑک جائے۔

میرن: کچھ اشعار یاد بھی ہیں؟

ہُدہُد: ابھی سناتا ہوں مطلع عرض کیا ہے:

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کر دوں
تو رشکِ باغ ارم اپنا گھونسلا کر دوں
جو آکے ریز کرے میرے آگے موسیقار
تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں
جو سرکشی کرے آگے مرے ہما آ کر!
تو اس کے نوچ کے پر شکلِ نیولا کر دوں

میرن: یہ نیولا کا قافیہ تو خوب باندھا ہے تم نے۔

جھمرو: میرن صاحب (آواز دیتا ہے)

میرن: ہائیں یہ میرن کون کہہ رہا ہے۔ میر صاحب کہنے سے جیب پر چھالے پڑ جائیں گے کیا۔ کون ہے۔

ہد ہد: کیا نام ہے؟

جھمرو: میرا نام اللہ دیا خاں جھمرو سین بن راگ رس خاں ستار زن۔

میرن: لو بیگم استاد آ گیا بڑی عمر پائی ہے کمبخت نے۔ آؤ آؤ استاد آ بھی جاؤ۔

ہد ہد: کوئی استاد آ رہا ہے تو میں چلا۔ (جانے لگتا ہے)

جھمرو: تسلیمات۔ ہائیں منقار جنگ ہد ہد الشعراء یہ آپ کا مکان ہے؟

ہد ہد: جی نہیں یہ آپ کے باپ کا مکان ہے، کیا ملکیت جتانے کے ارادے ہیں؟ آداب عرض ہے (ہد ہد جاتا ہے)

میرن: میاں کیا نام بتایا تم نے اپنا۔

جھمرو: جی میرا نام اللہ دیا خاں جھمرو سین۔

میرن: اللہ دیا، خیر سب کچھ اللہ ہی دیتا ہے۔ لیکن یہ جھمرو سین کیا ہے؟

جھمرو: جی جھمرا تال سے جھمرو، اور سین خاندانی خطاب ہے۔

میرن: کہاں تک تعلیم پائی ہے تم نے۔

جھمرو: پورے چھ راگ چھتیس راگنیوں پر حاوی ہوں۔

میرن: سورٹھ راگ بھی جانتے ہو۔ کل خواصی نے عالم پناہ کی غزل اسی راگ میں پڑھی تھی۔

جھمرو: جی یہ راگ نہیں راگنی ہے۔

میرن: ہم اسے راگ کہتے ہیں کہو مانتے ہو۔

جھمرو: جی ہاں۔

میرن: تو پھر تمہاری استادی کیا ہوئی؟

جھمرو: جی ایسی استادی کس کام کی جو بزرگوں کی بات کو جھٹلائے۔

میرن: واللہ برخوردار تم نے برخورداری کا خوب ثبوت دیا ہے اب ہی سے نسترن کے استاد مان لئے گئے۔ میاں گھونگرو۔

گھونگرو: فرمایئے میر صاحب۔

میرن: اماں بار ہا کہا ہے جب کوئی پاس ہو تو حضور کہو، لیکن تم اپنی ہی ہانکے جاتے ہو۔

گھونگرو: غضب کر دیا آپ نے۔ میں آپ کا نوکر تھوڑا ہی ہوں، شاہی باورچی ہوں۔ بیگم کا دودھ پیا ہے تو ان کے در پر حاضر ہو جایا کرتا ہوں۔

میرن: اماں اس اعتبار سے تو ہم تمہارے باپ ہی ٹھہرے۔ کہو کہاں مر گئے تھے۔

گھونگرو: مریں میرے دشمن۔ بیگم صاحبہ کا پاؤں چوہے دان میں پھنس گیا تو نکال دیا تھا۔

میرن: اے کاش ناک پھنسی ہوتی۔

گھونگرو: وہ دیکھئے بیگم صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔

میرن: آنے دے یہاں کسے ڈراتا ہے۔ دیکھا بھی ہے کسی نے اس بے مروت کو (لٹھ دکھاتے ہیں)

مہتاب: کیا کہا آپ نے (مہتاب داخل ہوتی ہے)

میرن: جی بیگم وہ اپنی بات تھی۔ مردوں کی۔

مہتاب: کیا استاد کے ماہوار کا تصفیہ کر لیا ہے آپ نے۔

میرن: تصفیہ کاہے کا بیگم۔ ہن میاں تصویر جو بھی مقرر کریں ہر مہینے دے دیا کریں گے۔

مہتاب: تو پھر دیر کاہے کی۔ آج ہی سے سبق شروع ہو جائے بیٹی نسترن۔

نسترن: جی آئی اماں۔

میرن: بیٹی یہ ہیں اللہ دیا جھمرو سین تمہارے استاد۔

نسترن: تسلیم (آداب بجالاتی ہے)

جھمرو: جی تسلیمات (گھورنے لگتا ہے)

میرن: ہاں تو سبق شروع کیجئے۔ چلو بیگم، میاں گھونگرو چلو۔

(گھونگرو مہتاب اور میرن جاتے ہیں)

جھمرو: ہاں جناب آپ کا سُر۔ خیر۔ میرا ساتھ دیجئے۔ آ (آواز)۔

نسترن: آ۔ (گانے میں جھمرو کا تتبع کرتی ہے)

جھمرو: آپ کے گلے سے گھونگرو کی آواز آتی ہے۔

گھونگرو: (داخل ہو کر) جی۔ میری آواز؟

نسترن: نہیں بھیا ادھر کی بات ہے۔

جھمرو: کہئے۔ میں تو توپہ جاؤں بلہار۔ (گاتا)

نسترن: میں تو توپہ جاؤں بلہار۔

جھمرو: میرے دلدار بار بار۔

گھونگرو: میں تو توپہ جاؤں بلہار میرے دلدار بار بار

(جاتا ہے میرن کو لے کر آتا ہے)

میرن: اماں جھمرو یہ کیا واہیات گاتا ہے۔

جھمرو: استادوں نے راگنیوں کے ایسے ہی بول باندھے ہیں۔

میرن: اماں ہم کب کسی استاد سے کم ہیں۔ ہمارا ہی ایک آدھ مصرع پڑھ لیتے۔ سنو چھوٹی بحر میں ہے:

غمِ جاناں میں گھل گھل کر کلیجہ ہو گیا پانی

جھمرو: مگر حضور ابھی کے ابھی طرز بٹھانا ٹھاٹھ باندھنا مشکل ہے۔

میرن: تم تو سینہ تانے تان سین والے بن کر آئے تھے نا؟

جھمرو: دیکھئے میر صاحب آپ تان سین کے گھرانے کی توہین کر رہے ہیں:

مہتاب: کس نے کس کی توہین کی ہے۔ (داخل ہو کر)

جھمرو: بیگم صاحبہ گانے کے بول تھے میں تو توپہ جاؤں بلہار لیکن میر صاحب

کے پسند نہیں آئے تو سمجھ بیٹھے ہم دونوں ایک دوسرے پر...

مہتاب: انھیں سمجھ کہاں!

میرن: پھر وہی کہارن کی سی بات!

مہتاب: پھر تم نے کہارن کہا؟

میرن: عمر بھر کہتا رہوں گا، غالب والیو اہل ذوق سے نہ ٹکراؤ کہار سے کہارن صحیح ہے۔

مہتاب: اوئی کہیں کہارن ہوتی بھی ہے؟ (گھونگرو اشارہ کرتا ہے کہ نہیں ہوتی)

میرن: دیکھا بھی ہے اس بے مروت کو (چھڑی گھما کر دکھاتے ہیں)

مہتاب: کہو یہاں تک نوبت آ پہنچی۔

میرن: جی تو کیا کر لوگی؟

مہتاب: لو کان کھول کر سنو، ہاں جھمرو میاں کس کا ڈر ہے بھلا ڈنکے کی چوٹ کہنا کہ ہاں یہی بات ہے۔

جھمرو: جی ہاں اب تو وہی بات ہے۔

نسترن: اوئی اماں (شرما جاتی ہے)

مہتاب: سن لیا تم نے۔ رہی کچھ حیا؟

میرن: تمہاری اس حرکت پر حیا خود منہ چھپا کر رو رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ مارو ایسی حیا کو ڈنڈا۔

(ڈنڈا اوپر کو اٹھاتا ہے گھونگرو کے سر پر مار پڑتی ہے)

گھونگرو: مر گیا میر صاحب۔

میرن: اماں میں نے نشانہ لگایا ادھر کو تھا۔

گھونگرو: اور خبر لے رہا بے مروت میرے سر کی۔ ہائیں۔ خون۔ چلئے میر صاحب حکیم مومن خاں کے مطب چلیں۔

میرن: ذرا سی چوٹ کیا لگ گئی ہنگامہ برپا کر دیا تم نے۔

مہتاب: کیا گہری چوٹ آئی ہے۔ یہ کیسا مذاق؟

میرن: جوانی یاد آ گئی تو جی میں آئی چلو، اٹکن پٹکن وہی چٹاخن ہو جائے کمبخت وہ بھی نہ ہوا۔

قربان: صدر کنیزان بی مہتاب پالکی آئی ہے ظفر محل چلئے۔

(داخل ہو کر آواز دیتا ہے)

مہتاب: سواری آئی ہے چلے چلو، چلنا گھونگرو حکیم اکمل خاں کے مطب ہوتے ہوئے چلیں۔

گھونگرو: چلیے۔

میرن: اٹھیے (گھونگرو کو جھنجھوڑتا ہے)

گھونگرو: جانے صبح صبح کسی فاختہ کی صورت دیکھی تھی شاہی باورچی نے کہ سر پھٹ گیا۔

میرن: چلو (چھڑی سے ٹھونسا دیتا ہے، مہتاب، میرن اور گھونگرو جاتے ہیں)

جھمرو: آدمی تک چڑھا معلوم ہوتا ہے۔

نسترن: جی نہیں دودھ بھیا جب بھی آتا ہے ہنسی کی پھول جھڑیاں چھوڑ جاتا ہے۔ ہاں تو آپ کا گانا اتنا ہی پور بھر کا تھا۔

جھمرو: جی نہیں گز بھر کا ہے۔ سناؤں؟

نسترن: مہربانی۔

جھمرو: بیٹیے، دیکھیے تال دینا اور اگر ہو سکے تو کچھ نرت کے ساتھ، اچھا

نسترن: جی بہت اچھا۔

جھمرو: (گاتا)

میں تو پہ جاؤں بلہار میری دلدار بار بار
اشکوں میں تری صورت لہرا سی گئی شائد
آنکھوں کی پتلیوں کو تھرا سی گئی شاید
بجلی میرے نینوں سے ٹکرا سی گئی شاید

نینا جو ہوئے چار من میں لگے کٹار
میں تو تو پہ جاؤں بلہار میرے دلدار بار بار

جب ہی تو ہر اک شے میں تیری ہی چمک سی ہے
ہر اور جدھر دیکھو تیری ہی جھلک سی ہے
کلیوں کی چٹک میں بھی کنگن کی کھنک سی ہے

سن سن پون پھوار، لہر لے گیو قرار
میں تو تو پہ جاؤں بلہار مرے دلدار بار بار

(گاتے ہوئے جاتے ہیں)

تیسرا منظر: ظفر محل

محراب دار زنانخانے کے عقب میں جالی لگی ہے جہاں بعد میں روشنی ہوتی ہے جالی سے جھلا جھل کے پردے لگے ہیں۔ دیوان میں سیدھی جانب سرخ مخمل کی مسند بچھی ہے جس کے قریب تین مونڈھے رکھے ہیں جن پر احسن اور نند کشور بیٹھے ہیں۔ قربان علی کی آواز کے ساتھ بہادر شاہ ظفر، ظہیر اور رستم بیگ داخل ہوتے ہیں۔ احسن اور نند کشور تعظیم کو اٹھتے ہیں۔

قربان: با ادب باملاحظہ ہوشیار۔

ظفر: (داخل ہوتے ہوئے) احسن اللہ خاں دیر ہو گئی۔ موتی مسجد سے لکھی باغ جانا ہوا کہ صبح سلونو کا تہوار تھا رانی بہمنی منتظر تھیں۔ یہ بہن اس خاندان کی جوتی ہے جس خاندان کے افراد نے ہمارے کہنے پر ستی کی رسم ختم کر دی۔ بہن رانی بہمنی نے جب راکھی باندھی تو تب کہیں واپسی ہوئی۔ واقعی لکھی باغ

کی بہار بھی کیا بہار ہوتی ہے کیوں ظہیر؟

ظہیر: بجا ارشاد ہے پیر و مرشد، جس طرح پھول والوں کی رنگا رنگی سے بادشاہ سلامت کی ایک چشم میں سرور پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح سلونو کے تہوار میں دوسری چشم مبارک میں خمار۔ لکھی باغ کی بہار کے کیا کہنے آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہر سو ہلکی ہلکی پھوار، آموں کے جھنڈ جامنوں سے ہوا کی اٹکھیلیاں، پپیہے کی پکار اور کوئل کی کوک ایسے میں نوخیز دوشیزاؤں کی پینگیں...

ظفر: بھئی واہ ہر واقعہ کو باغ و بہار سنا کر اسے اپنے والے انداز میں بیان کرنا سید ظہیر الدین دہلوی کو ہی آیا۔ (مسند پر بیٹھتے ہوئے) آپ سب بیٹھ جائیں، ہاں وزیر اعظم مابدولت چاہتے ہیں کہ مرزا جواں بخت کی شادی کے سلسلہ میں آپ سب سے مشورہ کیا جائے۔

احسن: جہاں پناہ شادی کا جشن شایانِ شان ہو، اور بارہ دن تک منایا جائے۔

ظفر: کیا خوب، بارہ دن کا جشن! ممکن ہے مابدولت کے لئے یہ بارہ دن زندگی کی حلاوت کے دن ثابت ہوں کیوں ظہیر۔

ظہیر: ظلِ الٰہی اس جشن میں گلوکارانِ فیض آباد محوِ سرود و ساز ہوں، لکھنؤ اور بنارس کے اعلیٰ نغمہ نواز ہوں اور ڈیرہ دار ٹھمکنے والیاں زمزمہ پرداز ہوں۔

ظفر: خوب۔ خوب۔ ایسے میں رستم بیگ

رستم: جہاں پناہ

ظفر: مابدولت چاہتے ہیں کہ حرم شاہی کے منشاء سے مجلس کو آگاہ کیا جائے۔

رستم: خلسونی، نگارِ عالم حاضر باش۔

(رستم کی آواز کے ساتھ عقبی جالی سے جھلا جھل کے پردے اٹھتے ہیں جالی سے روشنی چھنتی ہے۔ رامش گروں اور کنیزوں کے ساتھ نواب زینت محل داخل ہوتی اور مسند پر تشریف رکھتی نظر آتی ہیں۔ خلسونی (نسترن آواز دیتی ہے)

نسترن: ملکۂ دوراں نواب زینت محل برآمد محراب باد۔

مہتاب: ادب قاعدہ نگہدار۔

(سوائے ظفر کے سب استادہ ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔ چلمن سے نسترن نمودار ہوتی ہے)

قربان: چشم بد دور۔

نسترن: جہاں پناہ علیہ حضرت ملکۂ دوراں کی دلی تمنا ہے کہ شہزادہ والا تبار کی رسوم شادی شاہانہ اہتمام کے ساتھ سرانجام پائیں۔ طعام شادی کا انتظام برائے عام و خاص کیا جائے، نام بنام توڑے تقسیم ہوں۔ شہزادے، سلطان زادے امیر و غریب سب شریک جشن ہوں۔ لال حویلی، دیوان خاص و عام بارہ دری اور ظفر محل میں چراغاں کیا جائے۔

ظفر: انشا اللہ ایسا ہی ہوگا۔ ظہیر خلعت فاخرہ کے لئے بنارسی مشجر اور ریشمی پارچہ ڈھاکے کی ململ اور سنجاب کا انتظام کیا جائے اور ہاں۔ صہبائی، استاد ذوق اور مرزا نوشہ سے خواہش کی جائے کہ وہ سہرا لکھیں۔

ظہیر: جو حکم۔

ظفر: تخلیہ۔ نند کشور ٹھہرے رہیں۔

(محراب دار کی شمعیں گل کی جاتی ہیں۔ سب جاتے ہیں)

نند: مہابلی ان داتا سکھی بھو کہے بنا آپوش نہ لینے والے نند کے لئے کیا حکم ہے۔

ظفر: شہزادے کی شادی کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟

نند: ان داتا راکھی بندھن کی تہوار کی شبھ رات یوراج کے لگن کی بات ہے بھگوان کی دیا سے ساری راجدھانی میں جشن ہی جشن ہوگا۔ ویواہ کی شبھ گھڑیاں آنند اور آشتی کا سندیس لے کر آئیں گی۔

ظفر: سبحان اللہ! صحت کے بعد تم نے ہمارے ستارے بھی دیکھے ہیں؟

نند: ہاں مہابلی۔ میں نے آج ہی دیکھے ہیں۔ کرپے مہابلی کسی ایک پھول کا نام...

ظفر: ہم نے کہا چنبیلی۔

نند: چم چچ چنبیلی، چلن چلت، چاند چکور، چاند کے اوپر چکور۔ چال چلے چکر دھاری۔ چکا چوند چکا چوند۔ چکور چیپت چاندنی رات، چاند نہ آئے اپنے ہاتھ۔ ننا اسمھو! (پریشان ہوتا ہے)

ظفر: گھبراؤ نہیں پنڈت کہو کیا بات ہے؟

نند: آج نند کی بدھیا بھسم ہو چکی ان داتا نے کسی اور پھول کا نام لیا ہوگا۔

ظفر: ہم نے تو چنبیلی ہی کہا تھا۔

نند: اردھات، اس کا ارتھ ہے ان داتا نے کسی کومل ہردئے کو دکھی کیا ہے۔ کلی کو پھول جان کر توڑ لیا ہے، ایسی کٹھورتا اسمھو! ان داتا نے جب سے سنگھاسن سنبھالا ہے کسی شاگرد پیشہ کو بھی ارے کہہ کر خطاب نہیں فرمایا تو ایسے میں، یہ میری بدھیا جھوٹی ہے۔

ظفر: پنڈت تمہارے علم پر کیا حرف آئے جب کہ مابدولت کا ضمیر خود ملامت کر رہا ہے کہ پیوستہ سال ہم نے کشمیرن کا سر منڈوا کر ایک بھاری غلطی کی تھی۔ سنا ہے اس دن سے اس دوشیزہ نے حویلی سے باہر پاؤں نہیں رکھا۔

نند: کارن؟

ظفر: شبہ ہی شبہ میں ہم نے اس کا دل توڑ دیا۔

نند: ان داتا جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

ظفر: کہو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

نند: مہابلی اس نردوش ابلا سے معافی (نند جاتا ہے ظفر رستم کو آواز دیتے ہیں)

ظفر: رستم بیگ۔

رستم: جہاں پناہ (داخل ہو کر)

ظفر: کشمیرن حاضر ہو (رستم جاتا ہے) حیف ہم نے اس دوشیزہ پر ظلم کیا۔ ہمیں یہ بھی نہ سوجھی کہ وہ اپنی ہم جولیوں کو کیا منہ دکھائی گی ہم نے کشمیرن کو نہیں حسن کو رسوا کیا ہے۔ تو کیوں نہ حسن کے آگے اپنے جھوٹے طمطراق اور ناپائدار جاہ وجلال کو نیست ونابود کردیں۔

کشمیرن: جہاں پناہ (داخل ہوکر مجرا بجالاتی ہے)

ظفر: بیٹی ہماری بانہوں میں آجا۔

کشمیرن: ظل الٰہی (قریب جاتی ہے ظفر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں)

ظفر: مظلوم دوشیزہ ہمیں معاف کرنا کہ ایک نامحرم کے ہاتھوں ہم نے تیری روشن جبیں کو بے رونق کردیا تھا۔

کشمیرن: جہاں پناہ مجھے اس کا رتی برابر بھی رنج نہیں۔

ظفر: یہ تیری زبان کہہ رہی ہے تیرا دل نہیں، ممکن ہے یہ خلش دم آخر تک رہے۔

کشمیرن: یا میرے اللہ، جہاں پناہ اگر ذرّہ کو یہ حکم ہے کہ وہ آفتاب کو شرمائے تو سر آنکھوں پر، کنیز یہ جرأت کرگئی۔۔

ظفر: جزاک اللہ فی الدارین۔

کشمیرن: میرے حضور (قدموں میں سر جھکا دیتی ہے۔ ظفر اپنے گلے کا ہار اتار کر کشمیرن کو پہنا دیتا ہے۔ دونوں پر روشنی کا مہتابی حلقہ پڑتا ہے)

ظفر: کشمیرن

کشمیرن: اعلیٰ حضرت عمر دراز (قدموں میں دوزانو بیٹھے کئے دعا کو ہاتھ اٹھاتی ہے۔ روشنی کا حلقہ بدستور قائم ہے۔ ظفر آپے سے باہر ہوکر منظر سے نکل جاتے ہیں) غافل انسان مئے حکومت کے نشہ میں چور ناعاقبت اندیش سب کچھ کرگزر لیکن کسی کے دکھی دل کو مزید دکھی کرکے اس کی آہ نہ لے کیا جانے دکھی دل کی آہ کیا رنگ لائے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(کشمیرن پر روشنی کا حلقہ قائم ہے ساز وسرور کی آواز سنائی دیتی ہے)

گانا نمبر 1 الف

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی برائی پر جو نظر تو نگاہوں میں کوئی برا نہ رہا
ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(نزدیک آکر نسترن آواز دیتی ہے تو کشمیرن جو خوشی سے پھولے نہیں گا رہی تھی چونک پڑتی ہے۔ جب ملکہ پر نظر پڑتی ہے تو کورنش بجالاتی ہے۔ منظر پر روشنی پھیلتی ہے)

نسترن: ملکہ دوراں نواب زینت محل عمر دراز۔

کشمیرن: ملکہ عالم

زینت: دیکھی کشمیرن تو نے خدا کی کرنی دو برس کے صبر کا صلہ آج مل گیا۔

مہتاب: ظلِ الٰہی نے اپنے گلے کی مالا اُتار کر پہنا دی بیٹی سے خطاب کیا ہے۔

نسترن: دُرِّ یتیم کے گلے میں انمول موتیوں کا ہار۔ مبارک۔

مہتاب: دوشیزہ جس نے دو برس عورتوں سے تک پردہ کیا جس کی انگیا کے بند کسی عورت تک نے نہیں دیکھے اس پر تہمتوں نے تہمت باندھی۔

نسترن: جس کنیز کا لال حویلی میں جواب نہیں اس پر انگلیاں اٹھائیں شہد کی مکھیاں جو ہیں۔

مہتاب: بڑھی گوڑی لال لگام اپنے گریبان میں منہ کیا ڈالے ساری دلی جانے ہے کہ لال گائے محل میں آئی تو کالا بچھڑا ساتھ لے آئی۔

نسترن: اماں لگ گیو داغ دامن کے (کمر لچکا کر مٹکا کر کہتی ہے) گیلو بیٹے سہاگن کے۔۔۔

زینت: اللہ یہ خوشیاں، نسترن، کشمیرن، شہاب لاجورد کے شہابی دوشالہ عنایت کیا جاتا ہے۔

نسترن: میری سہیلی شہاب لاجورد کا خطاب مبارک (جاتی ہے اور دوشالہ لاکر کشمیرن کے اڑاتی ہے) دوشالے والی۔

سب: کشمیر کی کلی۔

نسترن: (ایک جانب کو دیکھ کر آواز دیتی ہے) فیروز مشکاف نواب فیروز جنگ۔

زینت: پردہ (سب ایک طرف کو ہٹ جاتی ہیں۔ نسترن اور مہتاب بیچ میں پردہ حائل کردیتی ہیں۔ ایجنٹ قلعہ داخل ہوتا ہے)

فیروز: یور مجسٹی۔ (سر جھکا کر آداب بجالاتا ہے)

زینت: بیگم فیروز جنگ نہیں آئیں؟

فیروز: شی از سفرنگ فرم ہکاف۔

زینت: ہکاف معنی؟

نسترن ہچکی۔ ملکۂ عالم کہتے ہیں بیگم فیروز کے ہچکی لگی ہے۔

زینت: پیاز کا سرکہ مفید ہوگا۔

فیروز: شکریہ۔

زینت: کشمیرن تحفہ (کشمیرن جاتی اور ایک صندوقچہ لاتی ہے)

فیروز: شکریہ۔

کشمیرن: (صندوقچہ کھول کر دکھاتی ہے) تحفۂ جواہرات۔

زینت: بگھی میں رکھوا دینا (کشمیرن تحفہ لے جاتی ہے)

کشمیرن: جو حکم۔
زینت: (ایجنٹ سے مخاطب ہوکر) کیا ہم یقین کرلیں کہ ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہیں۔
فیروز: وٹ ازدی لیٹر؟
زینت: عالم پناہ کے دستخط ہو چکے ہیں۔ مرزا جواں بخت کے پنجے کا نشان لگا کر جونہی بابو برج نارائن مختار عالم لاتے ہیں لالہ شیولال کے ذریعہ بھیج دیا جائے گا۔
فیروز: ٹھیک ہے۔
زینت: شقہ اور نشان بھجوادیں۔
فیروز: بہت اچھا۔ شکریہ یور مجسٹی (فیروز جاتا ہے)
کشمیرن: ملکۂ عالم آنکھیں چندھیانہ جائیں گی دیکھنے والوں کی۔ ایسے جواہرات کہاں نصیب ہوتے ہیں؟
نسترن: مرزا رجب علی ارسطو جاہ اور لالہ شیولال۔
زینت: اجازت ہے۔
رجب: ملکۂ عالم۔
لالہ: علیہ حضرت (دونوں آداب بجالاتے ہیں)
زینت: لالہ شیولال ہم نے فیروز جنگ کو ہموار کرلیا ہے۔ شقہ بابو برج نارائن نے تیار کیا ہے قلعہ لے جانا اور نواب فیروز جنگ کے حوالے کرنا۔ ہم نے انھیں کہہ دیا ہے۔
لالہ: جو حکم علیہ حضرت۔
زینت: ارسطو جاہ کمشنر پنجاب کی کچہری کی کوئی خبر؟
رجب: ملکۂ عالیہ شقہ امیر کبیر کی جانب سے اس سے کمتر کے نام لکھا جاتا ہے۔ کمشنر پنجاب اردو خوب جانتے ہیں اور فارسی بھی۔ جب کبھی لال حویلی سے شقہ آتا ہے جھلا جاتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے نام یا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز یا ملکۂ وکٹوریہ کی خدمت میں شقہ نہیں بلکہ معروضہ پیش ہونا چاہیے۔
زینت: سنا لالہ جی آپ نے۔
لالہ: کمپنی بہادر کے شجرِ نخوت کو ہندوستان پر چھائے پچاس برس بیت چکے ہیں۔ اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ کوئی انھیں اکھیڑ نہیں سکتا۔ رجواڑوں کے دن لد گئے حضور ان کے کنٹے کٹ کر رہیں گے۔
زینت: لالہ جی کچھ ہی ہو، ہمیں اپنا لال پیارا تو اس کا خیال پیارا اس لیے آج ہم اپنے جواہرات نواب فیروز جنگ کے حوالے کر چکے ہیں ان میں مرزا دارالشکوہ کا لاجوردی ہار بھی شامل ہے۔
لالہ: یہ میں کیا سن رہا ہوں ارسطو جاہ! سوداگر سرزمین ہند کے چپہ چپہ پر اپنی جعلسازی کے جھنڈے گاڑ ہی چکے تھے اور اب ہماری حویلیوں اور محلوں کے تہہ خانوں میں چھپے ہوئے ہیرے جواہرات پر بھی ان کی حریص نگاہیں اٹھ گئیں۔
رجب: مال جب مفت آتا ہے تو مفت کی شراب بھی قاضی کو حلال ہو جاتی ہے۔ یہ تو ہیرے جواہرات ہیں۔ لالہ تیر کمان سے نکل چکا ہے خدا کرے نشانہ پر لگے۔
زینت: ضرور لگے گا کہ منہ لگائے آنکھ لجائے۔ انگریز طوطا چشم نہیں ہوتا۔
گھونگرو: (داخل ہوکر آداب بجالاتا ہے اور کاغذات پیش کرتا ہے) ملکہ عالم یہ کاغذات بابو برج نارائن مختار عام نے دیئے ہیں۔
زینت: بڑی دیر کی تم نے آتے آتے۔ لالہ شیولال کو دینا۔
(کاغذات لالہ کے پیش کرتا ہے۔ رجب اور لالہ جاتے ہیں)
لالہ: علیہ حضرت۔
رجب: ملکۂ عالم۔
زینت: بگھی کا انتظام کیا جائے۔ ہم شاہ آباد جائیں گے۔ (سب جاتے ہیں)
نسترن: ہوشیار ادب قاعدہ نگہدار۔ (نسترن اور گھونگرو ٹھہر جاتے ہیں۔ گھونگرو نسترن کے کان میں کچھ کہتا ہے)
گھونگرو: آج اور ابھی۔
نسترن: جاؤ شیر علی خاں کو لے آؤ۔
گھونگرو: دو سال سے ظفر محل کے چکر کاٹتے ہیں تو آج بات بنی ہے۔ ابھی لے آیا۔
(نسترن جاتی ہے گھونگرو پلٹتا ہے تو سامنے برقعہ اوڑھے آنے والے کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے) کون؟
رابعہ: تمہاری ملکہ شاہ جہاں آباد روانہ ہو چکی ہیں؟
گھونگرو: سنائی نہیں دیتا ڈنکا جو بج رہا ہے۔ میں نے کہا یہ کون برقعہ کے اندر سے بول رہا ہے؟
رابعہ: پہچان نہ سکے ڈنکا بیگم کے وفادار (نقاب الٹتی ہے)
گھونگرو: مر گیا شہزادی رابعہ بیگم صاحبہ! کورنشات۔ لعنت ہے مجھ پر کہ جن کے پاؤں تلے میری جان ہے میں ان پاؤں کو پہچان نہ سکا۔
رابعہ: تمہاری جان ہمارے پاؤں تلے ہے؟
گھونگرو: بیشک۔ بیشک۔
رابعہ: اگر کچلی گئی تو؟
گھونگرو: زہے نصیب ایسی شہادت کے نصیب ہوتی ہے۔
رابعہ: جینا چاہتے ہو؟
گھونگرو: اگر مزاج یار کو بھائے۔
رابعہ: تو بتاؤ تمہارے ہاتھ میں کس کے پنجے کا نشان تھا؟
گھونگرو: واللہ مر گیا، وہ نشان عالی شان تو۔
رابعہ: بولو، بولو۔

نسترن: کہہ دینا (داخل ہو کر شہو کا دیتی ہے)

گھونگرو: جی نشان شہزادہ جواں بخت کا تھا، واللہ مر گیا۔ کسی سے کہئے نہیں شہزادی صاحبہ کہ شقہ اور نشان لندن بھجوائے جا رہے ہیں۔

رابعہ: شکریہ (جاتی ہے)

گھونگرو: صرف شکریہ! نہ شکر نہ شکرانہ چلی گئیں۔

نسترن: نواب شیر علی خاں کو لے آؤ میں کشمیرن کو بھیجتی ہوں۔

گھونگرو: جی ہاں (جاتا ہے)

نسترن: جی کشمیرن (اشارہ کر کے بلاتی ہے۔ جانب سے شیر داخل ہوتے ہیں)

شیر: یہاں کوئی ہے بھی۔ ظفر محل اس قدر سنسان یہ سناٹا۔

(نسترن کشمیرن کا دوپٹہ اسکرین پر اچھال دیتی ہے۔ کشمیرن پریشان ہوتی ہے۔ شیر دوپٹہ جھیل لیتا ہے۔)

کشمیرن: اوئی میرا دوپٹہ (سہم جاتی ہے)

نسترن: اے بڑے تعلقے کی خاتون بنی جا رہی ہے:

کیوں شرم سے جھکی ہیں نگاہیں شباب میں
ساقی کھڑا ہے مئے لئے تیری جناب میں
آنکھوں سے پینے اور پلانے کا وقت ہے
جائز ہے کہ ڈوبے ہیں دونوں شراب میں
مخمور نگاہوں کا اثر دیکھتے جانا
کس طرح سے لڑتی ہے نظر دیکھتے جانا
(نسترن جاتی ہے)

کشمیرن: میرا دوپٹہ آپ کے ہاتھ لگ گیا۔

شیر: اگر نظر لگ جائے تو؟

کشمیرن: جان پر بن جائے گی۔

شیر: دو سال بعد آج ملاقات ہوئی ہے۔ وہ دراز گیسو کدھر گئے۔ ہائیں ان غزالی آنکھوں میں آنسو۔

کشمیرن: یہ دو سال دو ہزار سال کے برابر تھے خان، لال حویلی سے باہر میں نے پاتوں نہیں رکھا۔ عورتوں سے بھی پردہ کیا ہے کہہ نہیں سکتی کہ سر پر کیسا پہاڑ ٹوٹا پڑا تھا آگ لگے ان کے تکلوں میں۔ ان پر تلوار برسے جو تہمت لگا بیٹھیں۔

شیر: مجھے پتہ ہے میں جانتا ہوں کہ کیا ہوا۔ کسی صاحب اقتدار کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی یسیر و یتیم دوشیزہ کی زندگی سے کھیلے میں بھی ان کی زندگی سے کھیل کر رہوں گا۔ اللہ اللہ رے اقتدار، حسن منظور نظر ہوتا ہے تو اس کی بیوی بن کر پابہ زنجیر ہو جاتا ہے اور اگر اقتدار بوڑھا ہو تو اس کو بیٹی بنا کر محل کی چہار دیواری میں بند کر دیتا ہے، یہ کچھ ہوا، ادھر کسی کو دھکا لگا ادھر کسی کی روح کو تڑپا کر رکھ دیا گیا۔ یہاں من مانا ستم روا، ظلم درست تو شیر علی خاں ایسے طاغوتی اقتدار کا قلع قمع کر دے گا اس کی قسمت نے تاتاری تلوار اور افلاطونی ڈھال سنبھال لی ہے۔ وہ اپنا حشر جانتا ہے۔ لے دے کر یہی ہوگا کہ نواب عطا رعبداللہ خاں کا دوسرا بیٹا پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جائے گا۔ چاہے سو ہو وہ آج ظفر محل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہے گا۔ (شیر خاں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کشمیرن دم بخود ہو جاتی ہے۔ ایسے میں یکے بعد دیگرے رستم، جھمرو اور گھونگرو داخل ہوتے ہیں اور شیر کو لتے لیتے ہیں)

رستم: نواب شیر علی خاں صاحب یہ آپ کا گھر نہیں کہ سر پر اٹھا لو۔ یہ ظفر محل ہے۔

جھمرو: اور آپ اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلے ہیں۔

گھونگرو: یہاں کا سناٹا ہمارا پیدا کیا ہوا ہے کہ دو دلوں کی بات بن جائے۔

جھمرو: اور آپ ہیں کہ آگ پر تیل ٹپکا رہے ہیں؟ یہ منہ اور مسور کی دال۔ آپ اس بادشاہ سے ٹکر لیں گے جس کی بہادری خود اس کے نام سے روشن ہے جس کی رحم دلی چار دانگ عالم میں مشہور ہے؟

گھونگرو: کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ آپ اس سے آنکھ ملانے چلے ہیں جس کے گھر سے ہر روز صبح سات من روٹی پانچ دیگ سالن جمنا کے کنارے کنگلوں کو دیا جاتا ہے جو ہزاروں کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ کیا معلم کیا ہندو سکھ تلنگے اور فرنگے سب اس کے تحفوں سے سرفراز ہوتے ہیں جو اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کا پیٹ بھرتا ہے۔ ایسے شاہ ذی جاہ پر تم نے یہ تو تیا باندھا۔

جھمرو: کہ اس نے تمہاری زندگی سے کھیلا ہے؟ شاہی باغات کی ٹھیکہ داری کیا ملی آنکھوں میں چربی چھا گئی۔ من موجی شاید سمجھ بیٹھے ہیں کہ قلعہ کی حور کشمیر کی کلی کے گویا یہی ایک حق دار ہیں۔ ہوش کے ناخن لو کہ لال حویلی کا ہر نوجوان اس پر جان چھڑک رہا ہے۔ وہ تو کہو کہ پھر بھی ہم تینوں نے مل کر اپنی والی کوشش کی کہ۔

گھونگرو: نہیں بادشاہ سلامت کی شان میں گستاخی کرنے والا اس قدر بڑھیا تحفہ کا حق دار نہیں ہو سکتا۔

شیر: بس چپ کرو۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا یہ خوشامدانہ انداز گفتگو یہ چکنی چپڑی باتیں کسی اور سے کرنا۔ آنکھوں کے اندھے نام شیخ روشن۔ دوستی نباہے جا رہے ہیں۔ تم کیا جانو، جس تن لگے وہی تن جانے۔ ظل سبحانی کی شان میں میں نے کچھ کہا ہے تو وہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کی بات ہے۔ منہ سے کیا پھوٹیں کہ زندگی اجیرن کر دی کرنے والوں نے۔ ایک ناکردہ گناہ کو یہ سزا کہ وہ ایک نامحرم کے ہاتھوں...

رستم: دوستو لگتا ہے ہم ایک شیر کی آنکھوں میں شبنم دیکھ رہے ہیں اس لئے فرمان...

گھونگرو: میرے ہاتھ میں ہے جب تک یہ ہمارے حضور معافی نہیں مانگ

لیتے، تو یہ نہیں کر پاتے فرمان پڑھ کر نہیں سنایا جائے گا۔
جھمرو: اور وہ بھی تازہ بہ تازہ جس کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی ہے۔
شیر: فرمان؟
گھونگرو: ہاں نواب یار خاں کوتوال قلعہ کے نام جسے ہم تینوں نے حاصل کیا ہے۔ مانگو معافی اپنی گستاخی کی۔
شیر: سناؤ تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔
جھمرو: ہاں یار پڑھ کر سنا دے کہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔
گھونگرو: تو سنو۔ ہوں۔ لہذا حکم دیا جاتا ہے کہ کل نور کے تڑکے کشمیرن خانم بنتِ ارمان علی بیگ کشمیرن کا نکاح نواب شیر علی خاں ٹھیکیدار شاہی باغات کے ساتھ پڑھوا دیا جائے۔
شیر: ایک جھلک دیکھوں تو۔
گھونگرو: بالکل نہیں۔ فرمان نواب یار خاں کو دیا جائے گا۔ نواب صاحب (انگوٹھا دکھاتا ہے۔ رستم، جھمرو اور گھونگرو جاتے ہیں۔)
کشمیرن: فرمان مبارک۔
شیر: فرمان! مجھے پتہ نہیں تھا کہ قسمت آناً فاناً یہ رنگ لائے گی۔ کشمیرن خانم بنتِ ارمان علی بیگ کشمیری۔ جانِ زندگی یہ خوشخبری۔ (کشمیرن کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے کشمیرن جھڑک دیتی ہے)
کشمیرن: اوئی اللہ یہ جرأت۔ تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے ہو خان لیکن یاد رکھو میری عصمت سے زیادہ پیارے نہیں ہو۔
شیر: زہے نصیب۔
کشمیرن: کورنش۔ (دونوں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں)

وقفہ

دوسرا باب

چوتھا منظر: دربار

تخت بچھا ہے شامیانہ تنا ہے۔ دونوں جانب سرخ کرسیاں رکھی ہیں (چودہ عدد) کامدانی مونڈھے رستم بیگ نگرانِ دربار داخل ہوتا ہے۔
رستم: اعیانِ دربار کی آمد آمد ہے۔ نقیب، چوبدار، جلسونی، نگار عالم حاضر باش (چنور لے کر جاتا ہے)
(سنگرام اور قربان علی اعضائے سلطنت لئے داخل ہوتے ہیں)
قربان: کہتے ہیں مرزا تو لیش خفا ہو کر شاہ جہاں آباد چلے گئے۔
(دونوں جانب استادہ ہو جاتے ہیں)
سنگرام: واللہ (جلسونی داخل ہوتی ہے)
قربان: استادِ تیغ میر امام الدین داروغہ کبوتر خانہ اور طائر الاراکین شہپر الملک منقار جنگ بہادر۔ (امرا کا داخلہ)
سنگرام: خاں بہادر مرزا رجب علی ارسطو جاہ کار پرداز اور مرزا الٰہی بخش ہدایت افزا مختار کار۔
قربان: لالہ شیولال محرر خاص و ناظر نظارت اور نواب راقم الدولہ ظہیر دہلوی۔
سنگرام: حکیم حبیب اللہ مومن خاں مومن اور نواب مرزا خاں داغ دہلوی۔
قربان: صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر اسد اللہ خاں غالب دہلوی۔
سنگرام: خاقانی ہند ملک الشعرا استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق اور احترام الدولہ معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ احسن اللہ خاں وزیر اعظم۔
قربان: شہزادہ والا تبار مرزا جواں بخت عمر دراز اور معظم الدولہ طامس منکاف نواب فیروز جنگ بہادر۔
سنگرام: ہوشیار ادب قاعدہ نگہدار۔
قربان: اعلیٰ حضرت، فریدوں سطوت، جمشید جاہ، فروغ خاندان عالی شان گورگانی، چراغ دودماں نشان صاحب قرآنی سلیماں نگیں، سلطنت مکیں سراج الدین محمد ابوظفر بہادر شاہ دہلی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ۔
فیروز جنگ: یور مجسٹی (صرف سر خم کرتا ہے)
ظفر: (تعجب سے) فرزند ارجمند بہ جان پیوند سلطانی آج یہ غیر معمولی انداز سلام کیسا؟ کیا آداب شاہی کے طور بدل دیئے گئے؟
فیروز جنگ: یور مجسٹی۔ گورنر بہادر نے حکم صادر فرمایا ہے کہ ہم جب بھی دربار قلعہ جائیں اسی طرح تعظیم بجالائیں جس طرح ملکہ وکٹوریہ کے دربار بجالائی جاتی ہے۔
ظفر: کیا خوب! چھوٹی بہن کے دربار کے آداب دولتِ انگلشیہ کے مروجہ ہیں۔ اسی طرح سینکڑوں سال سے دلّی دربار کے آداب شاہانِ مغلیہ کے مروجہ ہیں۔
فیروز: گورنر بہادر نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ حضور ملکہ وکٹوریہ کو چھوٹی بہن نہیں بلکہ بڑی بہن صاحبہ کے لقب سے یاد کریں۔
ظفر: اماں پچھلے زمانے میں حضرت شہنشاہ جلال الدین اکبر خلد آشیاں کو لندن کی ملکہ بڑے بھائی صاحب کے القاب لکھا کرتی تھیں اسی مناسبت سے ہم ملکہ وکٹوریہ کو چھوٹی بہن کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ طرز آداب شاہی کیوں بدل دیئے گئے اور کب؟
فیروز: یور مجسٹی۔ آج سے اور ابھی سے۔
ظفر: ٹھیک ہے انجم الدولہ آپ کے ساتھ صدر الدین آزردہ۔
(نشست پر بیٹھتے ہیں مزاج کی خفگی کا مظاہرہ)
قربان: ظلِ الٰہی برآمد محراب باد۔

ظفر: مرزا جواں بخت ادھر۔ فرزندار جمند ادھر تشریف رکھیں۔
(اشارہ کر کے فیروز کو بائیں جانب بٹھاتے ہیں)

احسن: پیرو مرشد مرزا جواں بخت شہزادہ بلند اقبال کی شادی میمنت آبادی کی ملازمان قلعہ معلی بصد ادب مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ہم سب دعا کرتے ہیں بقول مرزا نوشہ تم سلامت رہو ہزار برس۔

سب: ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔

ظفر: اہلیان دربار شادی کے جشن میں شعرا نے جتنے سہرے لکھے پڑھے وہ سب خوب تھے۔ لیکن مرزا نوشہ غالب دہلوی اور ملک الشعرا استاد ذوق دہلوی کے سہرے ہمارا خیال ہے رہتی دنیا تک زبان زد خاص و عام رہیں گے ۔ظہیر کیا ان سہروں کو دربار میں پڑھوانے کا انتظام ہے۔

ظہیر: ظل الٰہی حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ پہلے ٹیڑ موئی خانم نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی تازہ غزل پڑھتی ہیں (واضح باد کہ ایک گلوکارہ ٹیڑھا منھ کر کے گاتی تھی تو ظفر نے اسے ٹیڑموئی کا خطاب دیا تھا)۔ اس کے بعد نغمہ نوازان دربار سہرا پڑھیں گے۔

(ٹیڑھے منہ والی ٹیڑموئی خانم گاتی ہے)

سازیہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں
پوچھئے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاک باز کیا جانیں
داغ کے دل پہ جو گذرتی ہے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

ظفر: اماں داغ یہ عمر اور یہ باتیں۔

قربان: مرزا نوشہ غالب دہلوی کا لکھا سہرا استاد راگ رس خاں ستار زن کے فرزند اللہ دیا خاں جھمرو اور استاد ہمت خاں پکھاوجی کے فرزند خداداد خان گھونگرو سناتے ہیں:

خوش ہوا بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

ظفر: خوب خوب مرزا نوشہ نے غضب کر دکھایا ہے مقطعہ میں۔

غالب: لیکن ظل اللہ سچ تو یہ ہے کہ....

ظفر: ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہتے ہو سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں تمہیں۔

قربان: ملک الشعرا خاقانی ہند استاد ذوق دہلوی کا لکھا ہوا سہرا: گھونگرو جھمرو:

اے جواں بخت مبارک ترے سر پر سہرا
آج یہ یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغان نوا سنج نہ کیوں کر سہرا
جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ظفر: سبحان اللہ۔

قربان: باادب باملاحظہ ہوشیار۔

ضمنی منظر: ظفر محل

قربان علی ریوالور لئے کھڑا ہے۔ پنت نقاب اوڑھے داخل ہوتا اور ہاتھ کا پنجہ کچھ اس طرح دکھاتا ہے کہ قربان حسب ہدایت شاہانہ پنت کو آنے دیتا ہے۔ پنت کان میں کچھ کہہ کر واپس جاتا ہے۔ قربان بادشاہ کو مطلع کرنے اندر جاتا ہے۔ ظفر الٰہی بخش، احسان اللہ اور رجب علی داخل ہوتے ہیں۔

ظفر: وزیر اعظم تمہارے لئے پالک فرزند کے کان پر لال حویلی کی کوئی بات نہیں پڑنی چاہئے اور ہاں مرزا الٰہی بخش ہدایت افزا اور رجب علی کارپرداز یاد رکھو انگریز کسی کا وفادار نہیں ہوتا وہ صرف اپنی سرکار کے منصوبوں کا وفادار ہوتا ہے۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔

رجب: کبوتر با کبوتر باز با باز۔ عالی جاہ حالات کی نزاکت اعلیٰ تدبیر کی محتاج ہے۔

ظفر: رجب علی یہ نہ سمجھو کہ ما بدولت شاعری میں کھو گئے۔ زندہ رہنے کے لئے اسے وسیلہ بنایا ضرور ہے لیکن ہم قدرت کی عطا کردہ بصیرت سے محروم نہیں ہیں۔ تاہم اسے کیا کیجئے۔

داغ دل میں آگ لختِ دل میں چشم تر میں آگ
عشق کی سوزش سے ہے پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ

احسن: اللہ پناہ میں رکھے۔

ظفر: ہم ضعیف و ناتواں ایک طرف ہندی سپاہ کے چنگل میں جکڑے ہوئے اور دوسری طرف انگریز کا آہنی پنجہ تباہی پر تلا ہوا۔ بیس برس پہلے طلوع آفتاب کے ساتھ باسٹھ سال کی عمر میں ہم نے تخت سنبھالا تھا آج اسی صبح کی یہ رات آئی ہے۔ ایسی سیاہ رات شاید لال حویلی کی تاریخ میں کبھی نہیں آئی۔

رجب: تو عالی مرتبت کیوں نہ فراست سے کام لے کر میرٹھ کی سپاہ کو حکم دے دیا جائے کہ واپس ہو جائے۔

ظفر: مرزا مغل، مرزا خضر سلطان نے کل سر مغرب تخت و تاج ہمایونی کی

سوگند کھائی ہے کہ یا تو وہ کامران ہوں گے یا میدانِ جنگ میں شہید ہو جائیں گے۔ سو ہم نے اجازت دے دی کہ ہتھیار باندھ لیں۔
احسن: شہنشاہ غازی۔
سب: زندہ باد (بخت کا داخلہ)
بخت: اعلیٰ حضرت رات بہت بھیگ چکی ہے مجھے فوراً واپس ہونا ہے اب وقت آگیا ہے کہ انقلاب برپا کر دیا جائے۔ اس کے لئے میں نے سارے انتظامات کر لیے ہیں۔
ظفر: مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کی سرکردگی میں لال حویلی کی سپاہ دو گروہ میں بٹ چکی ہے۔ تاہم ہم کہتے ہیں جنرل بخت خاں سوداگروں سے نبرد آزما ہونا جوئے شیر لانا ہے۔
بخت: اعلیٰ حضرت زمین اپنے محور سے ہٹ چکی ہے۔ جہاں رات تھی وہاں دن اور جہاں دن تھا وہاں رات نظر آئے گی اسی رات اور اسی دن کے لئے میں نے فرنگی نظر میں اپنے آپ کو ایک ناخواندہ سپاہی ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اگر ہم کامیاب ہو گئے تو خدا گواہ اعلیٰ حضرت کے سر مبارک پر ہندوستان کی شہنشاہیت کا تاج ہوگا، ساری فوج میرے ساتھ ہے۔ (اشارہ) میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کل گیارہ بجے دن انقلاب برپا کردوں۔
ظفر: خدا دارم چہ غم دارم۔ جنرل بخت خاں، بسم اللہ ہم ابھی آتے ہیں۔ ان سے ملو یہ ہیں احسان اللہ خاں وزیراعظم۔ یہ مرزا الٰہی بخش ہدایت افزا سلطان زادے اور یہ ہیں مرزا رجب علی ارسطو جاہ کارپرداز۔
بخت: کیا ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟
ظفر: بالکل۔ (جاتے ہیں)
احسان: خدانخواستہ اگر یہ منصوبہ ناکام ہوگیا تو۔
بخت: بزدل ہی ایسی توقع کرسکتا ہے وزیراعظم وہ حکومت ہی کیا جس کا قلعہ سے باہر حکم نہ چلتا ہو کبھی کہا جاتا تھا ''عملداری شاہ عالم از دہلی تا پالم'' لیکن آج ''عملداری شاہ ظفر صرف قلعہ کے اندر'' بھلے یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ۔
رجب: عمل سے پہلے بدشگونی ٹھیک نہیں۔
احسن: جب آپ نے منصوبہ تیار کر ہی لیا ہے تو کس کی مجال ہے جو اس کے خلاف لب کشائی کرے۔ تم اپنا کام کئے جاؤ ہم اپنا کام کئے جاتے ہیں۔
بخت: کیا مطلب؟
احسن: آپ ایک جری سپاہی ہیں جنرل۔
رجب: سیاست آپ کے بس کی بات نہیں ہے ہر دور میں ہر ایک حکومت اپنے منصوبے کی کامیابی اور ناکامی پر نظر کر کے اس کے عمل اور ردعمل کا منصوبہ تیار کرتی ہے۔ آپ انقلاب برپا کر دیں خدا کامیاب کرے اور اگر ناکام ہوں تو ہم ملاپ کے گر سوچتے ہیں، بھلے غدار کیوں نہ کہلائیں۔ یہ طرۂ امتیاز دل والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ (ظفر کا داخلہ)
ظفر: جنرل بخت خاں فرزند ار جمند سپہ سالار اعظم نائب السلطنت یہ رہا تحفہ۔ خاص ولایتی ہے (پستول عنایت کرتے ہیں) خدا تمہیں ہوا کی طاقت اور پانی کا زور عطا کرے۔
بخت: شہنشاہ ہندوستان زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔

چلتے ہیں ناشناس زمانے کے ساتھ ساتھ
تم یوں چلو کہ ساتھ تمہارے جہاں چلے

(بخت جاتا ہے)
ظفر: خدا کامیاب کرے۔ آپ لوگ جاسکتے ہیں۔ (ظفر جاتے ہیں)
رجب: اب فرمایئے حضور۔
احسن: اماں ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ حیران ہوں کہ کیا کروں۔
رجب: ہونٹوں سے دودھ کی بو نہیں گئی۔ انھیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا، فرنگی انگوٹھا چوستا بچہ نہیں۔ دیکھ لینا... یہ مقدر کی گردش نہیں سر پھروں کی گردش ہے وزیراعظم ظلِ سبحانی نے مشعل اندھے کے ہاتھ میں تھما دی ہے۔
(تینوں جاتے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے)

پانچواں منظر: دالان

گھونگرو: تاہم حضور دودھ ماں کے کلام کی حکیم مومن خاں مومن نے بھی تعریف کی ہے۔
میرن: ہم نے کب مومن سے داد نہیں لی تھی۔ کوٹھے پر سے گرنے کے دو دن پہلے میں نے صرف دو اشعار سنائے تھے پھڑک گئے۔ کیا سنایا تھا:

سیکڑوں زخمی دلوں کے آج ٹانکے کھل گئے
آپ کی انگڑائی میں انداز ہے شمشیر کا
شعر سن کر میر کا کہنے لگا وہ پر جفا
واہ کس ترکش سے نکلا ہے یہ تکڑا تیر کا

گھونگرو: تکڑا تیر کا۔
میرن: نشانے پر بیٹھ کر ٹوٹ جاوے تو وہ کیا ہوگا۔
گھونگرو: تکڑا تیر کا، سبحان اللہ لیکن حضور وہ چھٹ گئے پھٹ گئے والا مضمون خوب ہے۔
میرن: اماں وہ مضمون نہیں میدان مار غزل ہے۔ ہاں:

وصل کا اقرار کر کے یک بیک وہ نٹ گئے
دم نہ مارا دل ہمارا ہم دبک کر گھٹ گئے

چھنّا کیونکر نہ دل الفت کے بندھن کٹ گئے
ہاتھ کے طوطے اڑ کانوں کے پردے پھٹ گئے

شعر ہے توجہ چاہتا ہوں۔

یک بیک وہ آگئے جو آئینے کے سامنے
آئینہ تکتا رہا وہ مسکرا کر ہٹ گئے

گھونگرو: ہٹ گئے۔ واللہ کیا چیز ہے حضور۔ مرزا نوشہ کو ضرور سنائیے۔
میرن: اماں تم بھی عجب الو کی دم فاختہ ہو۔ جب کوئی پاس نہیں تو حضور، حضور کی رٹ لگاتے ہو، اور جب کوئی ہوتا ہے تو...
گھونگرو: دودھ ماں آرہی ہیں۔
میرن: آنے دے۔ نامعقول بلبل کو۔
گھونگرو: یہ کیسا خطاب نامعقول بلبل۔
میرن: آغا جان عیش نے یہ نرالا نسخہ کھیلنے کو کہا ہے۔
گھونگرو: یعنی۔
میرن: جلاب انگارہ
گھونگرو: جلاب انگارہ یہ کیا ہوتا ہے حضور؟
میرن: اگر تمہاری گھر والی نے آنکھیں سامنے کیں تو آنکھیں نکال کر کہنا لو میں چلا
گھونگرو: کہاں؟
میرن: دوسرا بیاہ کرنے؟
گھونگرو: واللہ مار ڈالا کیا ہی نسخہ ہے جلاب انگارہ۔
مہتاب: یہ کس بلا کا نام ہے؟ (داخل ہو کر)
گھونگرو: کہہ دیجئے حضور ورنہ حکم دیجئے کہ میں عرض کر دوں۔
میرن: تو ہے ہی منہ چڑھا کہہ کر رہے گا کیوں نہ میں کھیل کر رہوں۔
مہتاب: کیسا کھیل، کیا عقل ماری گئی ہے؟
میرن: تم نے میری عقل پر حملہ کیا ہے اس لئے میں دے رہا ہوں، جلاب انگارہ۔ لو میں چلا۔
مہتاب: کہاں۔
گھونگرو: دوسرا بیاہ کرنے۔
مہتاب: اچھا تو یہ ہے جلاب انگارہ اور آپ چلے ہیں دوسری دولہن بیاہ لانے اے ملوں اس کی آنکھیں اپنے تلوؤں سے، پھر سے کہنا؟
میرن: یہ لو میں چلا۔ (گھونگرو پکڑ لیتا ہے)
گھونگرو: نہیں حضور ایسا نہ کیجئے اس چیل چلاتی دھوپ میں آپ کا دماغ پک جائے گا۔
میرن: اے چھوڑ مجھے جانے دے میں چلا۔ لو میں چلا۔

(بندوق اور توپ کے دغنے کی آواز)
گھونگرو: ہائیں (حیران ہوتا ہے)
میرن: ارے یہ آواز۔ کیا ہوا۔ دھماکہ (پریشانی کا اظہار)
گھونگرو: مسلسل گولیاں چل رہی ہیں جانے کیا ہو رہا ہے۔
میرن: ارے توپ پر توپ دغتی چلی ہے۔
مہتاب: یہ کیسا شور ہے؟ اجی سے دیکھو تو کیا ہو رہا ہے۔ ہائے اللہ۔ (بیٹھ جاتی ہے)
جھمرو: (داخل ہو کر) غضب ہو گیا میر صاحب۔
میرن: اماں جھمرو میاں جلدی کہو یہ کیا ہو رہا ہے۔ اے ہے ہے۔
جھمرو: کہتے ہیں راج گڑھ سے بخت خاں سپہ سالار کی سرکردگی میں پیدل اور گھڑ سوار دلی میں گھس آئے ہیں۔ اس گھس کھدرے جنرل نے یوروپین کا صفایا کر دیا۔ چاروں طرف آگ برس رہی ہے جیسے آتشیں جھالا۔
میرن: ہاں تو میرٹھ کی وبا دلّی میں پھوٹ پڑی۔ سنا تھا وہاں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ گوروں نے فوجیوں کو گائے اور سور کی چربی والے کارتوس دیے تو اس کے خلاف مولانا فضل حق خیر آبادی نے فتویٰ دیا تو سپاہ نے ہتھیار باندھنے سے انکار کر دیا۔
جھمرو: جدھر دیکھو فرنگی لاشیں پٹی پڑی ہیں گوروں کو میرٹھ کی سپاہ گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی ہے۔ قلعہ کی طرف گھمسان کا رن پڑا ہے۔ کپتان ڈگلس مارا گیا اور غضب خدا کا۔
میرن: کیا ہوا؟ (حیرانی)
جھمرو: ایجنٹ مارا گیا۔
میرن: جب تو دلّی کی تباہی یقینی ہے۔ دلّی میں لوہا برس کر رہے گا۔
مہتاب: ہائے میری بچی نسترن۔
جھمرو: کیا وہ گھر نہیں ہیں؟
مہتاب: نہیں بیٹا وہ لال حویلی میں ہے۔ ہائے یہ کان پڑی آواز۔
(بے ہوش ہو جاتی ہے)
جھمرو: اماں آپ فکر نہ کریں۔ میں لے آتا ہوں بی نسترن کو۔ (جاتا ہے)
میرن: بھائی اس جھلسا دینے والی آگ میں کہاں چلے۔ ارے وہ تو چلا گیا بیگم۔ گھونگرو بیٹے۔ لگا دے کن کن کن۔ چخ چخ چخ۔ چخنی۔
گھونگرو: یہ لیجئے لگا دی۔ ہائیں دودھ ماں۔ چلئے۔
میرن: اندر لے چلو۔ نڈھال ہو گئی ہیں۔ (بیگم کو سنبھالا دے کر لے جاتے ہیں)

چھٹا منظر: بارہ دری

(ظفر ہاتھ میں کاغذ لئے ٹہل رہے ہیں۔ رستم داخل ہوتا ہے)
رستم: ظلِ الٰہی خبر آئی ہے کہ جنرل بخت خاں کا پلّہ بھاری ہے۔

ظفر: یوروپین بیگمات کی حفاظت کا کیا انتظام ہے؟
رستم: ان لیڈیوں اور بوڑھوں کو لال حویلی میں پناہ دی گئی ہے۔ البتہ چند دو غلے مارے گئے۔ اور...
ظفر: کھورک کیوں گئے۔
رستم: سلاطین زادے نوکر چاکر اور کنیزیں بے پردہ ننگے سر شاہ جہاں آباد کی طرف بھاگ رہی ہیں ان میں سے چند گولیوں کا نشانہ بن گئیں۔
ظفر: معلوم ہے تاج محمد نے خبر دی تھی۔ اس خط سے ظاہر ہے کہ بخت خاں کو مزید کمک نہیں پہنچ سکتی۔
رستم: احسن اللہ خاں وزیر اعظم اور مولانا فضل خیر آبادی۔
ظفر: اجازت ہے۔
احسن: ظل الٰہی (دونوں داخل ہو کر آداب بجالاتے ہیں)
فضل: ظل سبحانی۔
ظفر: کیا خبر لے آئے۔ (پریشانی کے عالم میں)
احسن: بخت خاں کی پسپائی کے آثار ہیں ظل الٰہی بارہ دری چھوڑ کر نہ جائیں تو مناسب ہوگا۔
ظفر: احسن اللہ خاں ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تمہارا وجود ایک طرفہ تماشہ ہے۔
احسن: یہ اشارہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔
ظفر: تم نے دوطرفہ کھیل کھیلا ہے۔ ادھر چیف کمشنر اور گورنر سے ربط رکھے ہوئے ہو، اور ادھر ہمارے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے ہو۔
احسن: خدانخواستہ دشمن اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا تو ہم سب کا ٹھکانہ؟
ظفر: جہنم ہوگا جہنم، جو اس دوزخ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔
احسن: محمد بخت خاں کو سپہ سالار اعظم نائب السلطنت مقرر کر دیا گیا۔
ظفر: کیونکہ وہ ایک جری سپاہی ہے نمک حرام نہیں۔
احسن: لیکن والا تبار مرزا مغل اس کے خلاف ہیں نہ جانے باغی سپاہی کیا غضب ڈھائے۔
ظفر: خاموش، ان سورماؤں کو باغی نہ کہو اس مقدس جنگ آزادی کو بغاوت کا نام دیتے ہو اور ہمارے ہی روبرو، اگر دتی کا چراغ بجھا ہی چاہتا ہے تو بھلے بھڑک کر بجھے کیوں مولانا؟
فضل: ظل سبحانی کا فرمان آزادی کے متوالو کے لئے شہادت کا پیامِ جاوید ہے۔ شہسوار ہی میدان جنگ میں گرتے ہیں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو آزادی ان کے پاؤں چومے گی۔ ظل الٰہی نے جو بیڑہ اٹھایا ہے وہ کامران کر کے رہے گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو رہتی دنیا تک ظل سبحانی کی کارکردگی پر آنے والی نسل ناز کرے گی۔ اعلیٰ حضرت نے حریت کے متوالوں کے سینوں میں جو آگ لگائی ہے وہ مشعل راہ ثابت ہوگی۔
ظفر: آپ کا یہ خیال ہمارے لئے ایک دوسرے فتوئی کی سند ہے۔ احسن اللہ خاں۔
احسن: ظل الٰہی۔
ظفر: شہزادہ مرزا مغل کے نام حکم جاری کہو کہ پانی پت سے آنے والی کمک کا انتظار کئے بغیر ہلّہ بول دیں۔ جنرل بخت خاں کو حکم سنا دیا جائے کہ لال حویلی میں سوداگروں اور ان کی بیگمات کو پناہ دی جائے اور (دل ہلا دینے والی آواز) ہائیں یہ دل ہلا دینے والی آواز۔
احسن: ممکن ہے سوداگروں کا نیا توپ خانہ گولہ باری کر رہا ہو جو آنے والا تھا۔
ظفر: گویا تمہیں ان کے اس نئے توپ خانے کا علم ہے؟ احسن اللہ خاں...

(بخت کا داخلہ)

بخت: شہنشاہ غازی۔ (آداب بجالاتا ہے)
ظفر: جنرل بخت خاں میدان جنگ سے چلے آئے؟
بخت: ہم کہیں کے نہیں رہے۔ میں نے فوج کو چھاپہ ماروں کی طرح لڑنے کا حکم دیا ہے کہ میگزین کی تباہی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔
ظفر: میگزین جس پر ظفر کو ناز تھا۔
بخت: خاک تو وہ بن گیا۔ سمرو بیگم کی حویلی کو آگ لگادی گئی جس میں سات سو من بارود تھا۔ اب ہمارے آلات حرب بیکار ہیں۔
ظفر: افسوس مخزن کی تباہی نے فتح ظفر کو شکست کی صورت دے دی۔
بخت: ہماری بلند باگئیں جن سے چرخ گردوں کانپ رہا تھا گرد آلود دھواں بن گئیں۔ مجھے شبہ ہے میگزین کے جلانے میں ہمارے بہی خواہوں نے فقیر بخشی سے کام لیا ہے۔
پنت: اگر حکم ہو تو پنت ان غداروں کا پتہ چلائے گا۔
ظفر: یہ کون؟
بخت: میرا سید ھا بازو نانا صاحب کا بھائی دھونڈو پنت سراغ رساں۔
ظفر: دھونڈو پنت وفادار دوست تم نے میرٹھ میں کاظم علی کی مدد کی تھی۔
پنت: اَن داتا۔
بخت: اب حضور کا مقبرہ میں ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ میرے ساتھ لکھنؤ چلنے کی تیاری فرمائیں۔ وہاں جانِ عالم اور ان کی رعایا پر انگریزوں نے جو ستم ڈھائے تھے ان کا بدلہ لینے کے لئے وہاں کی سپاہ بے چین ہے ہم ان سب کو اپنے ساتھ لے کر فرنگی کے دانت کھٹے کر سکتے ہیں۔
احسن: میں اس تجویز کی سخت مخالفت کرتا ہوں۔
بخت: یہ نہ سمجھو کہ قلعہ کی وزارت قیامت تک قائم رہے گی۔ جب ہم ہی نہ ہوں گے تو تمہارا اطمطراق کہاں۔ ایک دن تمہیں اس کے دربار میں سر جھکانا

ہو گا جس نے تم جیسے کو چ کر بیلے کو وزیر اعظم بنا دیا۔
احسن: تم نے ہماری توہین کی ہے۔
بخت: بخت خاں توہین پر ہی اکتفا کر گیا اس کی خیر مناؤ۔
ظفر: جنرل بخت خاں اس وقت ہمارا دلّی چھوڑ کر کہیں اور جانا مناسب نہیں۔
قربان: جہاں پناہ خبر آئی ہے کہ وزیر اعظم کی حویلی کو آگ لگا دی گئی۔
احسن: اعلیٰ حضرت اجازت چاہتا ہوں۔ (پریشان ہوتے ہیں) دلّی بھیا تک آگ میں جل رہی ہے۔ جنرل بخت خاں جہاں تک ممکن ہو وزیر اعظم کی مدد کی جائے۔ شاید دھوکے میں احسان اللہ خاں کی حویلی کو آگ لگا دی گئی ہے۔
احسن: ظل الٰہی۔ (احسن جاتا ہے)
بخت: افسوس ریچھ ہاتھ سے نکل گیا۔ شاہی رحم دلی نے اہل دلّی کو بے دل بنا دیا۔ ہائے زمانے وائے قسمت تریاہٹ نے بخت خاں کی جوانی کو خاک میں ملا دیا اس نے میرٹھ کی راہ لی۔ سپہ گری نے جنگجو بنا دیا۔ وطن کی آزادی کے لئے تلوار اٹھائی تو راج ہٹ نے گمنامی کے گھور اندھیرے غار میں ڈھکیل دیا۔ خدا حافظ خادم کا آخری سلام قبول ہو۔
ظفر: کہاں کے ارادے ہیں بخت؟
بخت: غیور کے لئے زمین بہت بڑی ہے جہاں پناہ وطن کے لئے جان کی قربانی ہی سپاہی کے لئے عمر جاودانی ہے بخت کو جانے دیں بخت جا رہا ہے۔
(بخت اور دھونڈو پنت جاتے ہیں)
ظفر: جب بخت ساتھ چھوڑ دے تو تخت کی تمنا کون کرے۔
فضل: اے مجاہد ہندوستاں جنگ آزادی کے افسر اعلیٰ فقیر عزم شاہی کی داد دیتا ہے اور پیش گوئی کرتا ہے کہ ایک دن ہندوستان جنت نشان آزاد ہو کر رہے گا۔
ظفر: مولانا آپ تشریف لے جائیں۔
فضل: بظل سبحانی! (فضل حق جاتے ہیں)
رستم: مرزا رجب علی ارسطو جاہ۔ (آواز دیتا ہے)
ظفر: اجازت ہے (رجب علی کا داخلہ)
رجب: عالی جاہ قلعہ کی فوج پسپا ہو چکی ہے۔ مرزا الٰہی بخش ہدایت افزائے کمشنر بہادر سے حلفی وعدہ لیا ہے۔ کہ ہتھیار...
ظفر: یہ کیسے باور کر لیں کہ ہتھیار ڈال دینے کے بعد امن وامان قائم ہو جائیں گے؟
رجب: مرزا الٰہی بخش کے ساتھ کیپٹن ہڈسن بارہ دری کے باہر ٹھہرے ہیں وہ اندر آنے سے گھبراتے ہیں اگر اجازت ہو تو وہ اپنی زبان سے اقرار کریں گے۔
ظفر: ان سے کہو کہ وہ وعدہ کریں۔
رجب: میجر ہڈسن بہ آواز بلند حلفی بیان دیں تا کہ سپاہ بھی سن لے کہ ہتھیار ڈال دینے کے بعد امن قائم کر دیا جائے گا۔
آواز: یور مجسٹی کو معلوم ہو کہ ڈبلیو آر ہڈسن حلفی وعدہ کرتا ہے کہ اگر یور مجسٹی کی سپاہ برٹش سوپریمسی کے آگے ہتھیار ڈال دے تو نہ صرف شاہی خاندان بلکہ ساری رعایا برایا کی جان بخشی کی جائے گی اور کج کلاہ پر آنچ نہ آنے دی جائے گی۔ صلح نامہ مرتب کیا جائے گا۔
ظفر: ٹھیک ہے۔ تقدیر جب تدبیر کی ہنسی اڑا چکی تو پھر کیوں نہ تقدیر کا ساتھ دیں۔ ارسطو جاہ شہزادہ مرزا مغل اور شہزادہ خضر سلطان کو حکم سنا دو کہ میجر ہڈسن کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔
رستم: جہاں پناہ!
ظفر: یہی ہمارا اٹل فیصلہ ہے۔ یہ لو ہم خود اپنی تلوار (تلوار میان سے نکالتے ہیں صرف قبضہ ہاتھ آتا ہے) حیف غدارانِ وطن تم پر خدا کی مار۔ (قبضہ پھینک دیتے اور اندر جاتے ہیں)

ضمنی منظر: تاریک نگر

بخت: ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے تاریخ دانو، دلّی کا تختہ الٹ گیا اب کیا ہو گا، اس کا نقشہ سامنے ہے۔
پنت: جنرل وہ دیکھو پھانسی کے تختے تین لاشیں لٹک رہی ہیں۔
بخت: کیا یہی مقدرات تھے۔ نہیں مقدر سو نہیں سکتا کہ غم جاگ رہا ہے۔ آہ۔ وطن کی آزادی کے لئے بریلی، میرٹھ اور دلی کے باشندوں نے جو آگ لگائی تھی وہ کالا دھواں بن کر چھا گئی اور بخت خاں سیاہ بادلوں کی چھاؤں میں اپنی سیاہ بختی کو لے کر چھپ گیا۔ میدان میں جنگ آزادی کے شہیدوں کا خون کالا پڑ گیا۔ نہیں نہیں یہ خون ایک دن رنگ لائے گا۔ میں نے کہا سوداگروں کے مکروفریب کی ڈھال پر شہیدوں کے خون کی یہ پہلی چھاپ ہے۔
پنت: کمپنی کا دیوالیہ نکل کر رہے گا۔ یہ چھاپ کمپنی کی تباہی کا اولین نشان ثابت ہو گی۔
بخت: آزادی کے متوالوں نے ہند کے جیالوں نے وقت کی پکار سنی بخت کی للکار سنی، تلواریں سونت لیں سنگینیں تان لیں۔ مگر کیا کہوں ان سورماؤں کی جگرداری پر غداروں کی مکاری نے پانی پھیر دیا۔ ان کے منہ کالے کر دیئے کم بختوں نے اور الزام بخت پر؟ سنا تم نے پنت آخر کار بہادر شاہ ظفر نے بزدل سوداگروں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ حیف ہزاروں میل دور کے فرنگی باسیوں کو ہندوستان کے بختوں پر حکومت کرنے کی شہ دینے والے چرخ گرداں تف ہے۔ تف ہے۔
پنت: صبر جنرل صبر سے کام لیں۔
بخت: صبر، پنت صبر اب قبر میں جا کر ہی نصیب ہو گا بخت کو۔ آفریں، کیا ہی بہتر منصوبہ تھا سؤر اور گائے کی چربی والے کارتوس کا داؤ فوج کو ہوشیار کر گیا۔ میری

کاوش کام آگئی لیکن قوم بیدار نہ ہو سکی وہ سوتی رہی خاموش رہی اور نتیجہ؟ کشت خون کی گرم بازاری کے بعد ساری فضا خاموش ہو گئی جنگ کا میدان خاموش:

دشت خاموش ہوا عزم کا پیکر خاموش
ذرّے خاموش ہوئے عالم خوشتر خاموش
ارض خاموش ہوئی چرخ ستمگر خاموش
تارے خاموش ہوئے رات کا منظر خاموش

شور بردوش زباں اک دلِ مضطر ہوں میں
لذّتِ زخم ہوں او رسوزِ نشتر ہوں میں

پنت: جنرل آپ آپے سے باہر ہو رہے ہیں ہوش سے کام لیں۔
بخت: کہاں سے لاؤں کسی سے مانگوں۔ مانگنے کی چیز تو نہیں پنت۔ غلاموں کو ہوش آئے بھی تو کیوں کر جب کہ سوداگروں نے آزادی کے ساتھ ہمارے ہوش و حواس پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ جی میں آتا ہے خود کشی کر لوں کہ ہزاروں نوجوانوں کے خون کا ذمہ دار میں ہوں۔ میری بندوق؟
پنت: آپ نے کھڈ میں ڈال دی۔
بخت: تا کہ خود کشی نہ کر لوں۔ تو پھر یہ سور اور گائے کی چربی والے کارتوس کیوں میرے گلے کا ہار ہیں۔ میرا بچھوا؟
پنت: یہ رہا پٹکے میں اڑسا ہوا۔
بخت: اس کی دھار کسی کے خون کی پیاسی ہے۔ ڈھونڈو پنت میرے دوست ایک آخری احسان کر دے۔
پنت: ارشاد جنرل۔
بخت: لے یہ بچھوا میرے سینے کے پار کر دے تا کہ دل کے ٹکڑے اڑ جائیں۔
پنت: کیا آپ کی عقل ماری گئی ہے جو موت کو دعوت دے رہے ہیں؟
بخت: موت بن بلائے آئی ہے پنت اور جب تک آ نہیں جاتی، زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ کیا کروں کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔
پنت: دو دن سے آپ نے کچھ نہیں کھایا۔ یہ لو یہ سوکھی روٹی۔

(روٹی دیتا ہے)

بخت: غلامی کی روٹی! تھو ہے ایسی روٹی پر جو خون بن کر رگ رگ میں دوڑتی اور نس نس کو غلامی کی آگ میں جھونک دیتی ہے۔ نہیں ایسی روٹی نہیں چاہئے۔ تاہم زرق ہے لے لے کہیں پھینک نہ دوں۔ میرا بچھوا۔

(پنت روٹی دیتا ہوا بچھوا لے لیتا ہے)

پنت: نہیں دوں گا۔ نہ جانے آپ کیا کر بیٹھیں۔
بخت: رکھ لے تیری نذر ہے، لے یہ انگوٹھی۔ میری زندگی کا اثاثہ! وہ دیکھ پو پھٹنے کو ہے فوراً یہاں سے پونے روانہ ہو جاؤ ورنہ میرے دوست پکڑے جاؤ گے۔
پنت: آپ کہاں جائیں گے؟
بخت: میں وہاں جا رہا ہوں جہاں کوئی زندہ پہنچ نہیں سکتا۔ قیامت تک کوئی میرا پتہ لگا نہ سکے گا۔
پنت: جنرل۔ (آواز دیتا ہے بخت جو بے خیالی میں جا رہا تھا واپس پلٹتا ہے)
بخت: جانے والے کو تم نے آواز دی پنت۔
پنت: ہم دونوں نے ایک پٹنی میں بیٹھے ایک تھال میں کھانا کھایا ہے۔ میں نے جانا شاید مجھے گلے سے لگا کر وداع کرو گے۔
بخت: بھول گیا تھا میرے دوست (بغل گیر ہوتا ہے) ہائیں تیری آنکھوں میں آنسو!
پنت: اور تمہاری آنکھوں میں یہ کیا پانی ہے؟
بخت: جری سپاہی بھی کبھی روتا ہے؟ یہ تو اس کی آنکھ کا پسینہ ہے۔ جاؤ پنت خدا حافظ۔
پنت: ہر ہر مہادیو (بخت جاتا ہے) کہتے ہیں بخت خاں ناخواندہ ہے گھس کھدرا ہے۔ مگر نہیں میں نے اس جنرل کو نزدیک سے دیکھا ہے کمپنی بہادر کا تختہ الٹنے کے لئے فوج کو منظم کرنے والا جنرل گھس کھدرا نہیں ہو سکتا۔ ہائیں رام سہائے مل ادھر کو آ رہے ہیں۔ شاید ہماری کھوج میں نکلے ہیں کہ انھوں نے جنگ کے سورماؤں کی مدد کی تھی رام سہائے مل جی۔
سہائے مل: گھنو پیسے ہے گھنو پیسے (سہائے مل داخل ہوتا ہے اور چلا جاتا ہے)
پنت: رام رام... سیٹھ جی... سیٹھ رام سہائے مل جی، بے چارے کا دماغ چل گیا ہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مولانا تسلیم۔

(مولانا داخل ہوتے ہیں)

فضل: آداب پنت جی۔ کہئے بخت کہاں ہیں؟
پنت: مولانا اب شاید ہی وہ نظر آئیں ملاحظہ ہوں۔ ان کی انگوٹھی، ان کا بچھوا۔
فضل: ہائیں لاشیں۔ آہ یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔
قربان: پھانسی... مولانا۔ (داخل ہوتا ہے)
فضل: قربان علی۔
قربان: مرزا حیدر پھانسی... وہ۔ وہ۔ (گھبرایا ہوا)
فضل: شہزادہ مرزا جہانگیر کے داماد مرزا حیدر کی لاش۔ انھیں پھانسی دے دی گئی؟ ہائے فضل حق تو کیوں نہ واصل حق ہو گیا۔ زندہ رہا اور یہ منظر دیکھنے کے لئے! جہاد کا فتویٰ دینے والے ملا۔ شاہ ولی اللہ، مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ عبد العزیز کے نام لیوا تو نے فتوے تو دیئے لیکن یہ نہ جانا کہ ہتھیار کہاں سے آئیں گے؟
پنت: مولانا ہتھیار تو تھے لیکن توپ و تفنگ اور نئے نئے آلات حرب۔

فضل: ان کی بدولت انگریز کامیاب ہو گیا، قوم نکبت کا شکار ہو گئی۔ افلاس کی ماری تعیش پسند قوم بے بسی کے ہاتھوں آبرو کھو بیٹھے گی۔ کیا زندہ معاشرت مردہ ہو جائے گی؟

قربان: یہ لاشیں؟

فضل: کہوان زندہ لاشوں کا کیا ہوگا۔ کیا در بدر کی ٹھوکریں کھانے کو زندہ رہیں گی۔ کیا عورت کے سر سے آنچل ڈھل جائے گا کیا وہ کوٹھوں کو سجانے پر مجبور ہو جائے گی، آہ یورپین میم یہاں چھپی ہوئی ہے وہاں چھپی ہوئی ہے کہہ کر شرفا کے گھر بار لوٹنے والے ڈاکو سانڈرس! دلی کے انسان تو انسان ہاتھی گھوڑے جیسے جانوروں تک کو باغی قرار دے کر نیلام کرنے والے خبیث سانڈرس قیامت میں تیرا اور میرا سامنا ہوگا...

قربان: بارہ دری؟

فضل: وقت کے بدلتے دیر نہیں لگتی شاید بخت کے بدلنے میں دیر ہو۔ مظلوم کا رزق چھین کر اپنا پیٹ پالنے والا مکار عیار ایک دن اپنے داؤ کا شکار ہو جائے گا (قربان اور فضل جاتے ہیں) چلو میرے ساتھ...

پنت: ہر ہر مہادیو۔ یہ کیسا انقلاب۔

قربان: مولانا فضل حق خیر آبادی۔ (ایک چیخ)

پنت: کیا ہوا؟

قربان: (داخل ہو کر) مولانا پکڑے گئے۔

پنت: مارے جائیں گے یا کالے پانی کی سزا پائیں گے۔

(رام سہائے مل دوبارہ آتا ہے)

سہائے مل: گھنو پیسے۔ گھنو پیسے۔ گئے گئے۔

(قربان، سہائے مل کے پیچھے جاتے ہیں اس کے پیچھے پنت جاتا ہے)

ساز اور آواز

دیکھے سبھوں نے پھانسی کے منظر لگے ہوئے
زخموں سے جاں نثاروں کے خنجر لگے ہوئے
راوی کی آنکھوں سے تھے بہت دور اے قمر!
وہ گھاؤ جو تھے سینوں کے اندر لگے ہوئے

بارہ دری

(بہادر شاہ ظفر ٹہل رہے ہیں۔ رستم داخل ہوتا ہے اور زینت محل کی آمد کی اطلاع دیتا ہے۔)

رستم: ملکہ دوراں نواب زینت محل عمر دراز۔ (زینت اور کشمیرن آداب بجالاتی ہیں)

کشمیرن: ظل الٰہی۔

ظفر: بیگم تمہارے ساتھ؟

کشمیرن: عالم پناہ۔

ظفر: کشمیرن۔ تم اور یہاں جب کہ ساری کنیزیں فرار ہو چکی ہیں۔

کشمیرن: لیکن میرا ٹھکانہ اس آستانے کے سوا کہاں، عالیجاہ ان کی نسبت اگر کوئی ملال ہو تو یا اللہ میں کیسے کہوں۔

رستم: عالی جاہ نواب شیر علی خاں حاضر دو ر دولت ہیں۔

ظفر: در دولت اب کہاں؟ یہ تو بارہ دری ہے۔ آنے دو۔

شیر: عالم پناہ۔ (آداب بجالاتا ہے)

ظفر: اماں تمہاری طرف سے مابدولت کے دل میں کوئی ملال ہوتا تو تم دونوں کے نکاح کا حکم ہی کیوں دیتے؟ ویسے بھی اگر خطا نہ کی جائے تو کوئی معاف ہی کیا کرے گا اور اگر معاف نہ کرے تو پھر محبت ہی کیا ہوگی؟

شیر: بندہ پروری۔

ظفر: بیگم جواں بخت کہاں ہیں؟

شیر: ظل الٰہی میں نے صدر دروازہ پر والا تبار کو کپتان سے الجھتے ہوئے دیکھا ہے۔

ظفر: ان سے کہوان کا الجھاو اب کو ایک بڑی الجھن میں ڈال دے گا۔

شیر: جو حکم (شیر جاتا ہے)

زینت: سنا ہے دلسن نے ہمیں زینت باڑی بھجوانے کا حکم دیا ہے۔

ظفر: خدادادم چہ غم دارم بیگم احمد علی خاں کی بیٹی احمد شاہ درانی شاہ کابل کے خاندان کی شمع ہمارے شبستان زندگی کی شمع اب صبر سے کام لے گی۔

زینت: شمع کا کام ہر رنگ میں جلنا ہے وہ جلتی رہے گی صبر کے نام سے اس کا کیا واسطہ، لیکن دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اعلیٰ حضرت رحمت باری سے مایوس ہو چکے ہیں؟

ظفر: رحمت خداوندی خطا کاروں کا ساتھ نہیں دیتی انھیں سزا دیتی ہے۔

زینت: کس جرم کی سزا؟

ظفر: ہم نے بے سروسامانی کے عالم میں تلوار کمر سے باندھی تھی، ہم نے بارہا کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ ہماری اولاد بے وجہ آرزوئے سلطنت کرتی ہے یہ کارخانہ آگے کو چلنے کا نہیں۔ ہم پر ہی ختم ہوگا، ارباب نظر نے الطاف شاہی کو اسباب تباہی جانا ہے۔ اس لئے خوش فہمی سے گریز کرنا بہتر ہے۔

زینت: کیا کسی نے کھوئی ہوئی سلطانی نہیں پائی۔

ظفر: ہاں ہاں پیری میں زلیخا نے جوانی پائی۔

(دور یعنی آڈیٹوریم سے قربان علی اور ہڈسن داخل ہوتے ہیں۔ ہڈسن قربان علی کو اپنے پستول کا نشانہ بناتا ہے۔ قربان اسٹیج پر چڑھتا اور شاہ کے قدموں میں دم توڑ دیتا ہے۔)

ہڈسن: یو بلیک گارڈ۔ You Black Gaurd (فیر کرتا ہے)

قربان: عالم پناہ! آہ۔ یا اللہ۔
ظفر: لو بیگم تباہی پاؤں چومتی ہوئی آئی۔ سنگرام راج محمد۔
ہڈسن: سب مر چکے بس تم باقی ہیں You so called king of the RedFort
ظفر: ہڈسن تم۔
ہڈسن: ہاں میجر ڈبلیو آر ہڈسن۔ ہم گورنر کے حکم سے تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔
رستم: ہمارے ہوتے تو جہاں پناہ کو گرفتار کرے گا؟
ہڈسن: کیوں نہیں۔
رستم: جانتا ہے تو کس کے آگے کھڑا ہے؟ اس بادشاہ کے آگے جس کے بزرگوں نے کابل سے لے کر راس کماری تک اپنی حکمرانی کا سکہ بٹھایا تھا۔
ہڈسن: یوشٹ اپ۔ زبان بندر ہے۔
ظفر: ہڈسن ہمیں تمہیں معلوم تھا کہ انسانیت تجھ سے کوسوں دور ہے۔ تو نے جو وعدے کئے تھے وہ سب جھوٹے تھے؟
ہڈسن: اہاہا۔ وہ ہڈسن کی آواز تھی یہ کمشنر بہادر کا حکم ہے جو بجالایا جائے گا۔
ظفر: تم کس قدر سفاک ہو۔
ہڈسن: میں وہ سفاک ہوں جس نے قسم کھا رکھی ہے کہ بدکاروں کو قتل کر کے ان کی نحوست سے دلی کی سرزمین کو پاک کر دے۔ تم نے میری سفاکی دیکھی کہاں ہے اب دیکھو اور سینہ کوبی سے کام لو۔ میگڈ لنلڈ برنگ اٹ لٹ شو ٹو دی سو کالڈ کنگ۔ Bring it let us show to the so called king
میگڈ لنلڈ: یس میجر۔ (طشت لاکر رکھتا ہے)
ہڈسن: رعایا سے نذریں لینے والے معزول بادشاہ یہ رہا ہڈسن کی طرف سے تمہاری خدمت میں نذرانہ۔ (سرپوش ہٹاتا ہے)
کشمیرن: آہ جہاں پناہ طشت میں شہزادوں کے کٹے ہوئے سر لگے ہیں۔ صاحب عالم، مرزا قویش والا تبار۔ آہ (بیٹھ جاتی ہے)
زینت: شہزادے؟ پانچ شہزادوں کے سر لگے ہیں؟ جہاں پناہ۔ آہ...
ظفر: کہو کن کن کے سر لگے ہیں؟ رستم رستم۔
رستم: یہ خضر سلطان کا سر ہے۔ وہ مرزا مغل کا یہ ولی عہد مرزا قویش، یہ مرزا عبداللہ اور یہ مرزا ابوبکر۔ حضور۔
ظفر: مرزا مغل میرے بچے تیرا شہزادہ میرا پوتا بھی ہے۔ چار بیٹے اور ایک پوتا ایک ساتھ شہید ہو گئے۔
زینت: خضر سلطان، مرزا ابوبکر یہ کب کسی کی ماننے والے تھے بے تحاشہ میدان جنگ میں کود پڑے اور جانیں دیدیں۔ شاہان مغلیہ کے چشم و چراغ خون میں لت پت سروں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ عالی جاہ۔ ماں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔
کشمیرن: چھوٹے شہزادے ایسے چپ ہیں جیسے منہ میں زبان ہیں نہیں۔
زینت: بچو تمہاری وہ خوش بیانی کیا ہوئی، وہ گلفشانی کدھر گئی۔
ظفر: میری اولاد شہیدوں میں نام کر گئی۔ وطن پر سے قربان ہو گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ شاہی خاندان میں ایسے مناظر اکثر دیکھنے میں آئے ہیں کہ تیمور کی اولاد اسی طرح میدان جنگ میں سروں کو کٹا کر باپ کے سامنے سرخرو ہو کر آیا کرتی تھی۔ یہ ظفر کی بخت آوری ہے کہ آج اس آخری بادشاہ کے حضور اس کی اولاد اس طرح سرخرو ہو کر آئی ہے۔ کیا ہی چراغاں کا منظر ہے۔ بیگم۔
زینت: ان کی لاشیں جانے کہاں ٹھنڈی ہوئی ہیں۔ شاہوں کی اولاد اور یوں بے گور و کفن عالی جاہ۔
ظفر: زینت محل تمہاری آنکھوں میں آنسو۔ اچھا کیا تم نے ان انمول موتیوں کی مالا ان شہزادوں کے نذر کر دی لیکن ہم بادشاہ ہو کر بھی بہت مجبور ہیں کہ ایک آنسو بھی بہا نہیں سکتے کہ آنکھیں خشک ہو گئیں۔ ہم تو جشن منائیں گے جنگ آزادی کے سورماؤں کا جشن، جشن شہیداں چراغاں کرو، چراغاں کرو۔
زینت: ہائے اللہ اعلیٰ حضرت صبر کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ اپنے آپ کو سنبھالئے حضور۔
ظفر: میرے بچوں کو شہید کرنے والو کہو میں تاب نظارہ کہاں سے لاؤں۔ پروردگار تو نے ظفر کو دل دیا تو وہ بھی پژمردہ اور آنکھیں دیں تو ایسی خشک کہ ان میں ایک آنسو تک نہیں کہ ان شہزادوں کی نذر کرتا۔ خداوند! یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا، یا میرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا۔
زینت: جانے کس جرم کی سزا ہے۔
ظفر: ہم سے پوچھو ہم بتاتے ہیں کشمیرن، یہ کس کی سرد آہوں کا نتیجہ ہے؟
کشمیرن: ہائے اللہ یہ میں کیا سن رہی ہوں عالم پناہ کاش ان سروں کی بلا میرے سر آئی ہوتی۔
ہڈسن: اور بہت رو چکے بہادر شاہ ظفر اب چلنے کی تیاری کرو۔
کشمیرن: اے لنگے ان شہزادوں کے سروں کے بدلے میرا سر اتار لیا ہوتا۔ میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لئے ہوتے۔
ہڈسن: او... یو... تیرا خون اتنا قیمتی نہیں جتنا ان سفاکوں کا تھا جنھوں نے میرے ہم وطن یوروپین کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔
کشمیرن: شہیدان وطن کو سفاک کہتا ہے موئے میں تیرا کلیجہ چبا لوں گی (چھلانگ مارتی ہے۔ ہڈسن فیر کرتا ہے۔ کشمیرن شہید ہو جاتی ہے)

ہڈسن: یو پور گرل۔
کشمیرن: آہ... یا خدا (تڑپ کر گرتی اور دم توڑ دیتی ہے)
رستم: عورت کو قتل کرکے اپنی بہادری دکھا رہا ہے۔ بد معاش۔ (پل پڑتا ہے)
ہڈسن: یو فول (فائر کرتا ہے رستم وینگ میں جا کر گرتا ہے)
ظفر: ارے ظالم یہ تو نے کیا کر دیا۔
ہڈسن: خاموش بوڑھے۔ سورش زبان میں "ظالم" شاید بروٹ کہتا ہے۔
میگڈ لللڈ ریفر تو ہڈسے لے ڈکشنری گیوی دی مینگ آف دی ورڈ "ظالم"
میگڈ لللڈ: لیس میجر (کتاب جیب سے نکال کر ورق گردانی کرتا ہے۔)
زیڈ۔ ظا۔ ظالم۔ ظالم۔ لیس Zalim means, tyrant
ہڈسن: اوہ۔ He means, tyrant او بوڑھے اے کاش میں تیری ڈاڑھی نوچ سکتا۔ But no no order to touch you eyen,you mean i am tyrant I will prove my self tyrant

(جواں بخت داخل ہوا)

جواں بخت: عالم پناہ ہم گرفتار ہو چکے ہیں چاروں طرف سنتری۔ ہائیں اس طشت میں کس کے سر لگے ہیں۔ برادران من۔ آپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔
زینت: یہ رہا ان کا کفن۔ (اپنی اوڑھنی اڑا دیتی ہے)
جواں بخت: ملکہ دوراں (سکتہ طاری ہو جاتا ہے)
ہڈسن: میگڈ لللڈ انھیں زینت باڑی لے چلو۔ بہادر شاہ ظفر تیار۔ wait letus se the drop scene of the Moghal

ساز اور آواز

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش سنگِ در جانانہ بنایا ہوتا
روزہ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

دوسرا وقفہ

تیسرا باب

ساتواں منظر: فوجی عدالت

فوجی کمیشن ڈولرس بر سر اجلاس ہے۔ دونوں جانب میگڈ لللڈ اور آرنالڈ و منشی بیٹھے ہیں۔ میز کی دونوں جانب تین تین کرسیاں رکھی ہیں۔ منشی آواز دیتے ہیں اور متعلقہ افراد یکے بعد دیگرے داخل ہوتے ہیں۔

میگڈ لللڈ: مرزا الٰہی بخش ہدایت افزا گواہ سرکار۔ منشی خان بہادر رجب علی گواہ سرکار۔ حکیم احسان اللہ خاں دہلوی سابق وزیر اعظم گواہ سرکار۔
ارنالڈ: سیف الدولہ غلام عباس وکیل معزول بادشاہ ظفر از رعایائے سرکار۔
میگڈ لللڈ: کیس نمبر (Mutiny 1858) 9 مارچ 1858 بہ اجلاس لفٹننٹ جنرل ڈولرس (پریسیڈنٹ آف ملٹری کمیشن) صدر فوجی کمیشن۔
ڈولرس: آپ سب بیٹھ جائیں۔ مسٹر غلام عباس ہم نے تہیہ کیا ہے کہ آج 9 مارچ 1858 معزول بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیں۔ سر جان لارنس کمشنر پنجاب کی بھی یہی خواہش ہے کہ مقدمہ کو طول دینا ٹھیک نہیں۔ وکیل سرکار میجر جے ایف ہیرٹ ملٹری پروسیکیوٹر نے اپنی رپورٹ میں بہادر شاہ ظفر پر مندرجہ ذیل الزام لگائے ہیں۔ (ڈولرس اپنے تلفظ میں بولتا ہے) پہلا الزام: ملزم بہادر شاہ ظفر محمد سراج الدین معزول بادشاہ دہلی یکے از رعایائے سرکار نے برٹش گورنمنٹ کا پنشن خوار ہوتے ہوئے مولانا فضل حق خیر آبادی کے ورغلانے پر فوج کو بغاوت کرنے پر ابھارا اور باغی جنرل بخت خاں کی مدد کی اور دہلی میں غدر برپا کر کے شہر کے امن وامان میں خلل ڈالا۔ دوسرا الزام: اپنے فرزند مرزا مغل، مرزا خضر سلطان کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا۔ دو غلے اور (49) یوروپین کو ناحق و ناروا قتل کروا دیا۔ تیسرا الزام: دہلی پر غاصبانہ قبضہ کر کے خود کو شہنشاہ ہندوستان ہونے کا اعلان کیا۔ چوتھا الزام: نواب محبوب علی خاں، شدی قمبر مرزا آغا خاں اور مرزا نجف مرزا ابلاتی کو خفیہ طور پر فارس کو روانہ کیا اور کنگ آف پرشیا سے درخواست کروائی کہ وہ فوج اور رقم روانہ کریں۔ میجر ہیرٹ نے ان تمام الزامات کو درست ثابت کیا تو کمیشن نے معزول بادشاہ کو موت کی سزا تجویز کی ہے۔ اس بارے میں غلام عباس وکیل نے ایک اور درخواست پیش کر کے اڑچن ڈالی ہے۔ اس لئے ہم غلام عباس سے پوچھتے ہیں کہ انھیں کچھ کہنا ہے؟
غلام عباس: جناب صدر قبل اس کے کہ میں بحث کروں چاہتا ہوں کہ حکیم احسن اللہ خاں وزیر اعظم، مرزا الٰہی بخش اور معزز کار پرداز مرزا رجب علی یک چشم سے ایک ایک سوال کروں۔
صدر: آپ ان پر کئی بار جرح کر چکے ہیں اس نوبت پر جب کہ کمیشن مقدمہ کے نتیجہ پر پہنچ چکا ہے۔ بے وجہ آپ نے یہ مین میخ نکالی ہے۔
غلام عباس: جناب صدر، کافی غور کے بعد کل آپ نے ان گواہوں کو آج کمیشن میں طلب کرنے کا حکم دیا تھا کہ میں ان سے لکھنو کے کاغذ کے تعلق سے جو کل وصول ہوئے ہیں کچھ پوچھ سکوں اور اب بات سنگین موڑ اختیار کر چکی ہے کہ کمیشن نے بادشاہ سلامت کو سولی پر لٹکانے کا سوال پیدا کر دیا

ہے اور آپ نے آج ہی فیصلہ سنانے کی ٹھانی ہے۔ ایسی حالت میں ان مزید حقائق پر روشنی ڈالنی ضروری ہے تا کہ دار ورسن کا خدشہ دور ہو جائے۔

صدر: اجازت ہے۔

عباس: حکیم احسن اللہ خاں معزول وزیر اعظم آپ نے ظل سبحانی کے نذریں لینے کی رسم کی موقوفی، مرزا جواں بخت کو ولی عہد مقرر نہ کرنے کو بادشاہ سلامت کی خفگی کی بنیاد قرار دیا اور یہ باور کرایا کہ ظل سبحانی لال حویلی کی سپاہ اور بخت خاں سے فرمانے لگے کہ پہلے ہمیں مارو اور پھر یورو پین کو تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا کیا یہ سچ ہے؟

احسن: جی ہاں یہ میرا نظریہ تھا۔

عباس: اس نظریہ کے ساتھ کیا آپ کو یقین تھا کہ ظل سبحانی کے احکام کی تعمیل کی جائے گی؟

احسن: جی ہاں مجھے یقین تھا۔

عباس: ظاہر ہے شاہی حکیم ہونے کے ناطے آپ نہ صرف ظل سبحانی کے دل کی حرکت سے واقف تھے بلکہ مزاج شاہی میں دخیل بھی۔ جب ہی تو یہ سارا کھیل کھیلا گیا۔

احسن: اور اگر نہ کھیلا جاتا تو نہ یہ عدالت ہوتی اور نہ تم یہاں بحث کرتے نظر آتے۔

صدر: وقت کم ہے۔

عباس: دیکھیے بیگم سمرو کی حویلی کی بد بختانہ خاکستری کے بعد ہندی سپاہ نے آپ کی حویلی کو آگ لگادی اور جب یہ خبر ظل سبحانی کے حضور دی گئی تو اس وقت جہاں پناہ نے سپہ سالار محمد بخت خاں کو آپ کی موجودگی میں کیا حکم دیا تھا؟

احسن: تاکید کی گئی تھی کہ محمد بخت خاں باغی جہاں تک ممکن ہو میری مدد کرے۔

عباس: تو کیا بقول آپ کے اس باغی جنرل نے آپ کی مدد کی۔

احسن: نہیں۔

عباس: تعجب ہے۔

احسن: حکم شاہی کی تعمیل کرنی تو درکنار اس باغی سپاہی نے میری حویلی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

عباس: جناب صدر نوٹ فرمائیں آخر کار وزیر اعظم کی زبان سے صحیح بات نکلی تھی سو نکل کر رہی یہی بات ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھے گی۔ اس بیان سے ثابت ہے کہ ان دنوں جہاں پناہ برائے نام بادشاہ تھے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ وہ مجبور محض تھے غدر کی تمام تر ذمہ داریاں صرف بخت خاں پر ہیں۔

صدر: یہ تو آپ نے بارہا کہا ہے کہ بادشاہ مجبور تھا، معذور تھا احسن اللہ خاں بیٹھ جائیں۔ مسٹر عباس دوسرے گواہ سے نبٹیں۔

(مسٹر عباس مرزا سے مخاطب ہوتے ہیں)

عباس: مناسب۔ آپ ظل سبحانی کے سمدھی اور شہزادہ فخرو مرحوم کے خسر ہیں؟

مرزا: کتنی بار کہلوائیے گا کہ میں کون ہوں۔

عباس: سچ سچ بتائیے۔

مرزا: مجھے جھوٹ کی عادت نہیں۔

عباس: دریں چہ شک۔ شاہی خاندان سے منسلک جو ہو۔ فرمائیے کیا آپ نے منشی رجب علی یک چشم کو کہلوایا تھا کہ...

رجب: جناب صدر بھری عدالت میری توہین کی جارہی ہے۔

صدر: آپ بیٹھ جائیں۔ ہم نے کہا مسٹر عباس آپ اپنی زبان پر قابو رکھیں۔

عباس: جو حکم۔ سچی بات ہوتی ہی کڑوی ہے۔ آپ نے عالی جناب ارسطو جاہ رجب علی سے یہ خواہش کی تھی کہ اگر ظل سبحانی کو ہمایوں کے مقبرے میں چھ گھڑی دن چڑھے تک روک رکھیں تو باقی سب کام سرانجام دے لوں گا یعنی آپ تو بتائیے اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟

مرزا: جی۔ جی جناب صدر میں اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ اس کا تعلق میجر ہڈسن سے ہے وہ موجود نہیں ہیں میں اس سوال کو ایک ٹیڑھا سوال سمجھتا ہوں۔

صدر: یہ سوال آپ نے پہلے بھی کیا ہے۔

عباس: میں نے کبھی ایسا سوال نہیں کیا۔

صدر: 27 جنوری سے آج 9 مارچ 1858 کم وبیش تین مہینوں سے یہ مقدمہ چل رہا ہے کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ نے کون سوال کسی گواہ پر کیا تھا؟

عباس: ممکن ہے عالی جناب کو یاد ہو میں بھول رہا ہوں۔

صدر: تیسرے گواہ سے سوال کیجیے تا کہ وقت ضائع نہ ہو۔

عباس: ارسطو جاہ خان بہادر مرزا رجب علی یک چشم۔ معاف کرنا یہ نام مسلسل تین ماہ سے کچھ اس طرح میری زبان پر چڑھا ہوا ہے کہ... ہاں سنیے آپ نے ظل سبحانی کو ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار کروایا؟

رجب: جی احسن طریقہ تو یہی تھا۔

عباس: چاہے کچھ ہو میرے سوال کا جواب دو، ہاں یا نہیں؟

رجب: کہہ تو دیا کہ ہاں، مرزا سلطان زادے ہدایت افزا بھی تو تھے وہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔

صدر: آرڈر۔ آرڈر۔

عباس: اور ظل سبحانی کو اس بات کا یقین دلایا کہ اگر جہاں پناہ ہتھیار ڈال دیں تو میجر ہڈسن جو اس وقت مقبرے کے باہر ٹھہرے ہوئے تھے ظل سبحانی اور سلاطین زادوں اور شہزادوں کی نہ صرف جان بخشی کا وعدہ کرتے ہیں بلکہ

حسب سابق جملہ بطور طریق شاہانہ ماہی مراتب واعزاز بحال کردیئے جانے کی طمانیت دیتے ہیں۔

رجب: جی ہاں۔ میجر ہڈسن کی شرط اول یہی تھی کہ ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔

عباس: ظل سبحانی نے ہتھیار ڈال دیئے تو ان کو مع شہزادوں اور سلطان زادوں کے گرفتار کرلیا گیا۔ کیا یہی طمانیت تھی۔ شہزادوں اور سلاطین زادوں کو بیل گاڑی میں بٹھلایا گیا، پھر جہاں پناہ کو ہوادار میں سوار کرواکے قلعہ بھجوایا گیا۔ جب بیل گاڑی قید خانے کے قریب پہنچی تو انگریز سپاہ نے سنگینیں تان لیں میجر ہڈسن نے بندوق سے...

رجب: جو کچھ کیا اس کا میں ذمہ دار نہیں۔

عباس: کیوں؟

رجب: اس سوال کا جواب صرمیجر ہڈسن دے سکتے اگر وہ زندہ ہوتے۔

عباس: ان کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی تو کیا ہوا تاریخ کے اوراق کھلے پڑے ہیں اور آپ کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ آپ کی صرف آپ کی اور مرزا الٰہی بخش کی یقین دہانی پر ظل سبحانی نے ایک کثیر سپاہ کی موجودگی میں ہتھیار ڈال دیئے۔

رجب: جی ہاں میجر ہڈسن نے یقین دلایا تھا کہ کج کلاہ پر آنچ نہ آنے دیں گے۔

عباس: تو کیا ویسا ہی ہوا؟ نہیں! بلکہ ہوادار جانے کے بعد ہجوم میں سے تم نے، ہاں تم نے سلاطین زادوں اور شہزادوں کی شناخت کروائی۔

رجب: کیونکہ میجر ہڈسن جاننا چاہتے تھے کہ گرفتار ہونے والوں میں شہزادے اور سلطان زادے کون کون ہیں۔

عباس: چنانچہ چن چن کر شناخت کروائی گئی اور حق نمک ادا کیا گیا۔

رجب: میرا درماہ تو پنجاب سرکار سے ملتا ہے۔

عباس: گویا اعلیٰ حضرت ارسطو جاہ کے خطاب سے نوازا ہی نہیں۔

صدر: بات بڑھنے نہ پائے وقت کم ہے۔

عباس: جب شہزادوں کی بیل گاڑی خونی دروازہ پہنچی تو پانچ شہزادے بندوق کی گولیوں کا نشانہ بن گئے اور ان کے محافظ مرزا بخت یار شاہ اور شاہ سمند ڈھیر کردیئے گئے۔ ستم بالائے ستم مرزا خضر سلطان، مرزا مغل شہزادہ، مرزا قویش مرزا ابوبکر اور مرزا عبداللہ کے سرتن سے جدا کردیئے گئے۔

رجب: مگر میں... (پیچ وتاب کھاتے ہیں)

عباس: تمہارے مکان سے خوان اور سرپوش منگوائے گئے ان پانچوں سروں کو اس خوان میں لگوا کر سرپوش ڈھانپ کر حضور عالی کی خدمت میں خوان بطور تحفہ روانہ کیا گیا تا کہ اس خوان کو دیکھ کر شاہ کا کلیجہ ٹھنڈا ہوجائے۔

رجب: خوان اور سرپوش منگوائے گئے تو تھے لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ خوان میں شہزادوں کے سر لگوائے جائیں گے وہ تو میجر ہڈسن کی کارستانی تھی۔

عباس: کیا یہی کارستانی ہے کیا اسے ہی کہتے ہیں کارستانی؟

صدر: رہنے بھی دو اس بات کو ہڈسن کی اس نازیبا حرکت کی سبھوں نے برائی کی ہے۔ He has been condemned ملزم کے مقدمے سے سروں کا کیا تعلق ہے؟

عباس: شاید نہ ہو۔ لیکن جناب صدر اس خونچکاں واقعہ کے اظہار سے میرا مطلب اس امر کو واضح کرنا ہے کہ جاں بخشی کی طمانیت کے باوجود شہزادے قتل کردیئے گئے اور وہ سرپوشی کا واقعہ غداران وطن کے چہروں سے نقاب الٹ رہا ہے۔ حیف کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جہاں پناہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش سے ان کی صاحبزادی سیتی بیگم اپنے سہاگ کے لٹنے کا ذکر فرماتی ہیں تو یہی باپ ہاں یہی باپ اپنی بیٹی سے کہتا ہے جب باپ زندہ ہے تو بیٹی کا سہاگ کیسے لوٹ سکتا ہے۔ اللہ اللہ ایسوں کو سرکار نے عزت دی معزز گواہ قرار دیا ہے حالانکہ یہ وہ احسان فراموش ہیں جنھوں نے اپنے محسن کے گلے پر چھری پھیر دی یہ آج دلی کے غدار ہیں تو کل لندن کے غدار بھی ہوسکتے ہیں۔ ایسوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، ان کی گواہی معتبر نہیں ہوسکتی۔

صدر: بحث کی نوبت پر گواہ پر طعن ٹھیک نہیں۔ خان بہادر بیٹھ جائیں۔ مسٹر عباس تین منٹ دیئے جاتے ہیں بحث ختم کرلیں۔

رجب: جناب صدر ہم نے سر پر کالی ہانڈی رکھ ہی لی ہے تو ہزار الزام تراشیاں سہی، ہزاروں کی جانیں بچائی بھی ہیں۔ اس کی کون وکالت کرے گا؟

صدر: آرڈر... آرڈر... غلام عباس جلد بحث ختم کرلیں۔

عباس: بہت بہتر۔ ان تمام واقعات، مشاہدات سے ہٹ کر جن کا میں نے قبل ازیں ذکر کیا ہے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ڈبلیو آر ہڈسن کا اپنے دوست مسٹر کوپر کے نام لکھا ہوا خط جو مسل میں موجود ہے اور میجر کی ڈائری جو لکھنؤ سے منگوائی جاکر شامل مسل کی گئی ہے، ان دونوں دستاویزات سے صاف ظاہر ہے کہ میجر ہڈسن جنھوں نے شہزادوں کے گولی ماردی اگر چاہتے تو ظل سبحانی کو بھی قتل کرسکتے تھے جب کہ ظل الٰہی مجبور محض تھے۔ افسوس ہے کہ میجر کا لکھنؤ میں انتقال ہوگیا ورنہ وہ اس فوجی عدالت میں چاہے جائز ہو نا جائز، میری بحث کی تائید میں گواہی دیتے۔ تاہم میں نے ثابت کردیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر بے گناہ ہیں۔ انھیں کسی صورت مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی بات میجر ہڈسن نے اپنی ڈائری اور مسٹر کوپر کے نام خط میں صاف طور پر لکھ دی ہے۔ لہٰذا میں کمیشن سے بہ کمال ادب درخواست کرتا ہوں کہ ازروئے انصاف ہاں ازروئے انصاف اعلیٰ حضرت محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر کو باعزت رہا کرے۔

صدر: میگڈ لنلڈ مسل لے جاؤ اور کمیشن کے ارکان کو دو تاکہ وہ اپنی رائے دیں۔
میگڈ لنلڈ: یس سر۔ (مسل لے جاتا ہے)
صدر: مرزا رجب علی آپ بے چین کیوں ہیں۔ کیا کچھ کہنا ہے؟
رجب: جناب صدر ناشنیدہ طعنوں کی آنچ میں اس قدر جھلسے گئے کہ منہ کالے پڑ گئے، ناکردہ گناہ در پردہ جو خدمات انجام دے چکے ہیں وہ روز روشن کی طرح آج نہیں تو کل سامنے آئیں گی اور حکومت ان کا جائزہ لے کر رہے گی کہ حکومت کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔
عباس: کسی بھی حکومت کے لمبے ہاتھ اس وقت کام آتے ہیں جب اس کے انصاف کی ڈور بھی لمبی ہو۔
رجب: لیکن شخصی حکومت کے انصاف کے لمبے ہاتھ اپنے عزیز و اقارب کی حفاظت کرتے ہیں یہ نہ بھولو۔
عباس: تو اب کون سے انصاف کی مہاوٹ برس رہی ہے جو آپ چراغ پا ہو رہے ہیں اس کی ہمدردی میں۔
رجب: اس برسات کی بوند ہی تو آبِ حیات کا قطرہ بنی اور آپ زندہ ہیں۔
عباس: ایسی زندگی سے موت اچھی تھی اے کاش ہم بھی ان امرا عظام کی طرح جو پھانسی کے تختوں پر چڑھے، چڑھ جاتے۔ شہید ہو جاتے۔
رجب: زبان نہ کھلواؤ سیف الدولہ، بات کرنی آسان ہے وطن کی آزادی کے لئے بیرونی باشندوں یعنی فارس کی حکومت سے امداد طلب کرنی کون سی بہتر سیاست تھی؟
عباس: اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ بے پر کی اڑائی ہوئی بات کا سہارا نہ لو۔ مربی مرزا الٰہی بخش نواب ہدایت افزا کو مختار عام بنانے کے اور بھی راستے تھے۔ بادشاہ کو پابہ زنجیر بنانے والے خود ایک دن پابہ زنجیر ہو جائیں گے۔
رجب: ہدایت افزا ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں، سلطان زادے ہیں ان کی رگوں میں شاہی خون موجزن ہے۔ وہ بادشاہ تو نہیں بنا دیے گئے کہ شخصی حکومت کا لطف اٹھائیں۔
عباس: شخصی حکومت کی رٹ نہ لگاؤ۔ اس ایک شخصیت کا دبدبہ اس کا جلال ہی تو عوام پر حکومت کرنے کا ہتھیار تھا۔ اس کے برعکس اگر تم جیسے یک چشم دس پانچ ہوں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ ارسطو جاہ یہاں تو صرف پانچ شاہی سر کام آئے ہیں وہاں پانچ ہزار سر کٹیں گے۔ اقتدار کی ہوس میں کشت اور خون کا بازار گرم ہو جائے گا۔
رجب: اگر تدبر کا فقدان ہو۔ ورنہ پانچ سات میں سے فسادی کو کان پکڑ کر نکال دینا بہت آسان ہوتا ہے یہی تجویز ہم نے کمپنی بہادر کے آگے رکھی ہے کہ شخصی حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔

عباس: مگر یاد رہے یہ یک چشمی خوب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا کیسے تخت و تاج کے حریف؟
رجب: حیف! یہ عدالت ہے ورنہ سیف الدولہ، سیف الدولہ کا وجود۔
(سینہ کوبی کرنے لگتے ہیں)
عباس: ہشت۔ فوجی عدالت۔ غیر مجاز عدالت۔ من مانی عدالت جان کر جناب صدر یہ شخص جامے سے باہر ہو رہا ہے۔
صدر: آرڈر... آرڈر... (میگڈ لنلڈ مسل واپس لا کر رکھ دیتا ہے)
میگڈ لنلڈ: یور آنر۔ (صدر مسل پڑھتا ہے)
صدر: ٹھیک ہے جب کمیشن نے ہڈسن کے خیال کی تائید کی ہے تو ہمیں عذر نہیں۔ آپ سب جا سکتے ہیں۔ (سب گواہ اور وکیل جاتے ہیں)
عباس: شکریہ (جاتے ہیں)
صدر: میگڈ لنلڈ معزول بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو ظفر آواز دو۔
میگ: یس سر (مڑتا ہے تو اشارہ پا کر ٹھہر جاتا ہے)
صدر: ٹھہرو۔ جب بھی وہ آتے ہیں جو بھی نشست خالی پاتے ہیں اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس لئے یہاں سے یہ موںڈھے اور میز ہٹا دو۔ کہ کسی مجرم کو کرسی نہیں دی جاتی۔ آواز دو۔
میگ: معزول بادشاہ دہلی محمد سراج الدین ابوظفر از رعایائے سرکار۔
(ظفر کا داخلہ)
ظفر: بار ہا کہا ہے کہ اس طرح مخاطب کر کے ہماری توہین نہ کرو۔ لیکن صاحبی کرنے والوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہمارے نام کے ساتھ از رعایائے سرکار کا شوشہ ہماری نسل کو جھٹلانے کے مترادف ہے ہم کسی کی رعایا سے تھے نہ ہیں اور نہ قیامت تک ہوں گے۔
صدر: ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔
ظفر: ہم پوچھتے ہیں کیا ہمارے اب وجد بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اورنگ زیب، شاہ عالم اور اکبر ثانی خلد آشیانی کسی کی رعایا سے تھے؟ کیا ہماری رگوں میں ان کا خون نہیں دوڑ رہا؟ معلوم ہوتا ہے۔ کمیشن کا خون سفید ہو گیا ہے کہ ہٹ دھرمی کے سوا کچھ بھائی نہیں دیتا۔ کس لئے کہ روحانی اذیت پہنچانے پر کمر بستہ ہے اس پر قیامت کے دن رات دشمن سوئے نہ سونے دے۔
صدر: ملزم بادشاہ بہادر شاہ ظفر آپ پر جتنے الزام لگائے گئے تھے وہ کمیشن کے آگے صحیح ثابت ہو چکے ہیں اس لئے کمیشن آپ کو مجرم قرار دیتا ہے اور ان الزامات کی پاداش میں Exile یعنی کالے پانی کی سزا تجویز کرتا ہے اور تمہاری بیگم اور اولاد کو اختیار دیتا ہے کہ کلکتہ رہیں یا تمہارے ساتھ

رنگون جائیں۔
ظفر: گویا کمیشن نے ابوظفر کی جان بخشی کی ہے کہ وہ تھوڑی سی زندگی جو باقی رہ گئی ہے عذابِ تنہائی میں کاٹے۔ ہم پوچھتے ہیں یہ فوجی عدالت کس کے حکم سے بنی ہے جب کہ عدلیہ کا اختیار صرف بادشاہ دہلی کو حاصل ہے؟
صدر: تمھیں کچھ اور کہنا ہے؟
ظفر: ہم کہہ ہی کیا سکتے ہیں جب کہ تمہاری بن آئی ہے۔ جیسا چاہو فیصلہ صادر کردو۔ تمھیں پوچھے گا ہی کون؟ حیف رہ رہ کر راجہ رام موہن رائے کی یاد ستاتی ہے پھر بھی ہم نواب عطاء اللہ خاں کے فرزند سیف الدولہ غلام عباس کی داد دیتے ہیں کہ انھوں نے بہ طیب خاطر وکالت کی۔
صدر: تمھیں حکم سنا دیا گیا۔
ظفر: اور ہم سن چکے ہیں۔ دنیا جانتی ہے جاں نثارانِ وطن ہی وطن کے کام آتے ہیں وہ کام آچکے، افسوس ہم ان کے کام نہ آسکے۔ اچھا کیا تم نے جو ایک بڑے کام سے لگا دیا کہ عمر کی گھڑیاں ایک تاریک کمرے میں بیٹھ کر گنا کرو۔ کیا خوب۔ کیا خوب وائے صاحبی یہ تیری گمرہی؟
صدر: انھیں لے جاؤ۔
ظفر: جانے والا آپ ہی چلا جائے گا تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں لیکن جاتے جاتے جو کچھ کہہ جائے اسے پلو میں باندھ رکھیو۔ دنیا کے جھوٹے طمطراق کو ثبات کہاں؟ ہم پیشن گوئی کرتے ہیں کہ ایک دن ہندوستان جنت نشان آزاد ہو کر رہے گا، تمہارا دیس نکالا ہوگا۔ ہند کے بچے بچے کی زبان پر آزادی کا ترانہ ہوگا۔ وطن کی آزادی کی لگن کی جو مشعل ظفر نے جلائی ہے وہ بجھے گی نہیں ان شاء اللہ۔ بجھے گی نہیں۔ (سازوسرود)

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کہ روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

(پردہ اٹھتا ہے)

ضمنی منظر: سمندر کا کنارہ

ظفر: نواب واجد علی شاہ سلطان اودھ (واجد کو دیکھ کر مخاطب ہوتے ہیں)
واجد: جلال و جبروت گورگانیہ سلامت باد۔ (اکیس سلام)
ظفر: اماں جان عالم اب نہ وہ شاہی عالم رہا اور نہ وہ جلال ظفر خدا کا نام لو ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اسے کہتے ہیں انقلاب زمانہ۔ اختر...!!
واجد: تا ہم ظلِ سبحانی ایک دوسرے سے بہت دور۔ زہے نصیب آج دیدار نصیب ہوگیا۔
ظفر: شاید اس میں بھی سوداگروں کی چال ہو کہ دو معزول بادشاہوں کی شرمندہ آنکھیں دوچار ہوں۔ امید تھی کہ منجدھار سے کشتی نکل آئے گی لیکن تموج نے دبوچ لیا اس کو... اس لئے ہم نے اس کی ہر موج کو منزل قرار دے لیا ہے۔ واجد علی شاہ تمھیں بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔ اللہ نگہبان، جلال و جبروت گورگانیہ الوداع۔ (اکیس سلام کرتے ہیں)

آٹھواں منظر: دالان

مہتاب: دیکھا بیٹی تو نے صبح کے گئے اب تک نہیں لوٹے۔
نسترن: ابا جان گھونگرو بھیا کے کھوج میں گئے ہیں اماں آتے ہی ہوں گے۔
مہتاب: کیا پتہ کس کے کھوج میں گئے ہیں جب سے غدر مچا ہے پردہ نشینوں کی آنکھ کا پانی مر چکا ہے۔
نسترن: اماں یہ آپ کی کٹم کٹا مجھے اچھی نہیں لگتی، جھٹ پٹے میں آپ کی زبان سے ایسے کلمے؟
میرن: (داخل ہو کر) وائے دلّی ہائے تباہی، جنرل بخت خان نے حملہ کیا تو فرنگیوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے اور غائب ہوا تو پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔ انگریزوں کی باری آئی تو انھوں نے خون کے دریا بہا دیئے۔ دلّی لاشوں کا شہر بن گیا، گیارہ مہینے بیت چکے اب تک پکڑ دھکڑ جاری ہے۔
مہتاب: کہیں گھونگرو کا پتہ چلا؟
میرن: گھونگرو جھمرو جیسے نوجوان، آج کل تو دلّی میں بوڑھوں کا پتہ نہیں چل رہا۔ ٹکٹ لگا ہے شہر میں آنے جانے کا۔ لالہ شیولال نے بتایا کہ مفتی صدر الدین آزردہ کی جائیداد ضبط ہوئی۔ صہبائی کا خاندان توپ سے اڑا دیا گیا۔ وہ کیا نام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے سات سال کی سزا پائی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کالے پانی کے حوالے ہو گئے ہائے دوست میاں ہد ہد کا پتہ نہیں۔
مہتاب: کہتے ہیں جہاں پناہ کو...
میرن: جی ہاں بیاسی سال کی عمر میں عالم پناہ نے رنگون کی کال کوٹھری میں پناہ لی ہے۔ زینت محل اور مرزا جوان بخت ساتھ ہیں۔ (جھمرو کا داخلہ)
مہتاب: اے یہ آفتاب کدھر سے نکلا۔
جھمرو: اماں تسلیم حضور آداب۔
میرن: جیتے رہو۔ کدھر رہے۔
جھمرو: حضور کیا فارس ترکستان سے فوج آنے والی ہے؟
میرن: اماں اللہ کا نام لو۔ ترکستان قبرستان کہیں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ وہ تو وقت پڑا اپنے اپنے کشکول بہ انداز معصومیت ایک دوسرے کے آگے بڑھاتے ہیں۔ خیر کہو، کہاں تھے اس آپا دھاپی میں؟

جھمرو: سنا تھا قلعہ کا باشندہ جو ہو تو اسے پناہ ملے گی۔ آفت کا مارا میں جو گیا پکڑا گیا۔ یہ رجب علی کی چال تھی۔ مرزا الٰہی بخش مختار عام کی سفارش سے چھٹکارا ملا۔ حکم ہوا ٹکٹ خریدو۔ یہ دیکھئے ٹکٹ خرید کیا ہے۔ شہر میں آنے جانے کا۔

میرن: (ٹکٹ پڑھتے ہیں) ٹکٹ آبادی درون شہر بشرط ادخال جرمانہ اماں یہ کس جرم کا جرمانہ ہے اللہ اللہ اپنی گلیوں میں آزادی سے پھرنے پر بھی پابندی۔

جھمرو: کیا بتاؤں میر صاحب دلی بھر میں میری عمر کا کوئی جوان نظر نہیں آیا۔ جو نظر آیا بوڑھا اور وہ بھی ادھ موا۔ چہرے خیال چھوتی ہوئیں ہوائیاں اڑتی ہوئیں۔

میرن: اماں ہم نے ان گیارہ مہینوں میں کسی کو قہقہہ مار کر ہنستا ہوا نہیں پایا۔

نسترن: اماں ادھر دیکھنا ہوادار۔ (سب ویگن کی طرف دیکھتے ہیں)

مہتاب: ہائیں گھونگرو... یہ ساتھ کون ہے؟ اے شہزادی۔

نسترن: اماں شہزادی رابعہ بیگم ظل الٰہی کی صاحبزادی۔

گھونگرو: دودھ ماں، بہن نسترن میر صاحب اور جھمرو میاں تسلیمات۔ بلکہ کورنشات۔

نسترن: شہزادی رابعہ بیگم عمر دراز۔ (تسلیم بجالاتی ہے)

گھونگرو: میری شریک حیات۔

میرن: تیری شریک حیات۔ یہ لو بیگم سالم دل کے پرنچے اڑ گئے۔ چشم بینا اندھی، فاختہ کی چونچ میں انار کی کلی غضب خدا کا یہ ولایتی حقہ؟

مہتاب: اے نوج تم کیوں سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ خاک تمہاری ارواح اچھی بہو بن کر شہزادی گھر آئی ہے تو دشمنوں کے دیدے پٹم ہو گئے۔ چاہئے تھا بیر بہوٹی کو سونے کی ڈبیہ میں بند کر لیتے، خوش ہوتے۔

نسترن: میرا دودھ بھیا میری بھابی شہزادی اماں دیکھو تو سج دھج دولہنیا کی برقعہ کے اندر سے جوبن پھٹ پڑ رہا ہے۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا، ماتھے پر ٹیکا، چاند سا مکھڑا ہاتھوں میں مہندی رچائے اندر لال جوڑا مٹکائے، بھابی گھر آئی ہیں تو لگتا ہے جیسے خوشیوں کے مہینہ کا جھمکا لگا ہے۔

مہتاب: سنا تم نے بھابی کی شان میں کیسے پھول جھڑ رہے ہیں نند کے منہ سے جیسے مہاوٹ برس رہی ہو۔

میرن: اماں ہم تو انقلاب زمانہ کو رو رہے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی ہماری بہو کیسے بن گئی۔ یعنی شاہی باورچی کے حوالے ہو گئی۔ چشم بددور۔

رابعہ: ابا جانی بتائیے بی نسترن اور میاں جھمرو کی جوڑ کیسی رہے گی۔

میرن: ہاں شہزادی آپ کا ارشاد فرمان کے مماثل ہے۔

مہتاب: کیوں میاں جھمرو۔

جھمرو: میری مجال جو دم بھی مار سکوں آپ سب کے آگے۔

میرن: تو لاؤ ملاؤ ہاتھ قاسم جان کی گلی کے قاضی کو ابھی بلواتا ہوں۔

گھونگرو: حضور جب سے دلی میں نوجوانوں کا کال پڑا ہے قاضی صاحب جوان کو دیکھتے ہیں نہ بوڑھے کو، سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکے جا رہے ہیں۔

رابعہ: کیوں ابا جانی آپ آن کی آن میں راضی ہو گئے آپ ٹھیرے بخشی اور یہ گلوکار؟

میرن: اور کیا کرتے شہزادی سنا نہیں کیا کہہ رہا ہے جھمرو کہ نوجوانوں کا دلی میں کال پڑا ہے۔

رابعہ: تو ایسے میں میرا کوئی قصور۔

میرن: واللہ مار ڈالا شہزادی صاحبہ نے، ہم سے بھول ہو گئی، کہو تو جوتیوں سے توبہ کر لیں۔

رابعہ: نہیں ابا جانی میں یہ بتانا چاہتی تھی کہ انسان بڑا ہو کہ چھوٹا مجبوری اسے کس مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

مہتاب: آئی عقل ٹھکانے؟

میرن: جی ہاں مبارک باد۔

ساز اور آواز

دل بتوں سے لگا کے کیا پایا
دین دنیا گنوا کے کیا پایا
نہ بجھا سوز دل جب آنکھوں سے
ہم نے دریا بہا کے کیا پایا

(پردہ اٹھتا ہے)

نواں منظر: غربت کدہ رنگون

(سفید درودیوار پر کوئلے سے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ ظفر دیوار پر کچھ لکھتے ہیں)

بنگالن: (چولہا لا کر رکھتی ہے) بی بی جی، بی بی جی بچی کے نیند لگی ہے۔

زینت: جھٹ پٹے کا وقت، سر مغرب سو جاتی ہے۔

بنگالن: پھر کچھ دیوار پر کوئلے سے لکھے ہے سرکار۔

زینت: اور کیا لکھیں گے ذرا طبیعت سنبھلی کہ دیوار کے ہو رہتے ہیں۔ اردو زبان اور شاعری گھٹی میں پڑی ہیں پانچ اساتذہ سے اصلاح لی ہے، جس نے نوک قلم سے ہزاروں اشعار لکھے دواوین چھپوائے آج اسی بادشاہ کو قلم نصیب ہے اور نہ کاغذ، کوئلے سے غربت کدۂ رنگون کے درودیوار کالے کئے جاتے ہیں وہ جو کہتے ہیں۔

گھر کی جلی بن میں گئی بن میں لگی آگ
بن بے چارے کیا کرے جو ہیں ہمارے بھاگ

بنگالن: اے بی بی جی۔ وہ دیکھو۔

زینت: پیر لڑکھڑا گئے۔ (دوڑ کر سنبھالا دیتی ہے)

ظفر: سوزِ دل سے آگ بھڑک رہی ہے بیگم۔ آنکھیں خشک اندرونی اعضا پگھل رہے ہیں۔ وطن سے دوری پر دوست روتے ہیں تو دشمن ہنستے ہیں دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

زینت: جہاں پناہ آج یہ کیسی باتیں۔ یہ تڑپ کیسی؟

ظفر: رہ رہ کر دلّی کی یاد ستاتی ہے۔ وہ دیکھو پڑھو جو ہم نے لکھا ہے ابھی لکھا ہے:

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے کون نگر ہوتے من میں ہراسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا
کون آنند کر رہے واں رہتے کون اُداسے ہیں

زینت: جہاں پناہ یہ رہی دوائی، حیات مزید (دوا پیش کرتی ہیں)

ظفر: حیات مزید، بخشو اس کڑوی دوا کو، کون جیا ہے جو ہم جئیں گے سب مرے ہیں ہم بھی مرے ہیں ہم بھی مریں گے۔ آج نومبر کی کیا تاریخ ہے یہ سن اٹھارہ سو باسٹھ ہے؟

زینت: ساتویں نومبر۔ یہ رہا کباب چوس لیویں یہی تو غذا رہ گئی ہے حضور کی۔ مغرب ہونے کو آئی صبح سے کباب بھی نہیں کھایا عالی جاہ نے۔

ظفر: اب بخشو کباب کو بھئی شہزادہ جواں بخت کہاں ہیں؟

بنگالن: نماج پڑھے ہے سرکار چھوٹے۔

جھمرو: لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں۔ (جھمرو کے گانے کی آواز)

ظفر: یہ کون گا رہا ہے؟

زینت: کوئی فقیر ہوگا۔

ظفر: بیگم اس گانے والے کو بلانا۔ سنتری سے کہو اسے آنے دے۔

زینت: بنگالن بوا سنتری سے کہنا اس گانے والے کو آنے دے۔

(بنگالن جاتی ہے) جھمرو کا داخلہ

ظفر: آؤ آؤ اندر آجاؤ۔ کہاں کے باشندے ہو؟

جھمرو: میں اس دیار کا باشندہ ہوں جو اجڑ گیا۔

ظفر: کس کی غزل گا رہے تھے؟

جھمرو: یہ نہ پوچھیئے حضور نام لیتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

ظفر: آخر؟

جھمرو: ہمارے جہاں پناہ کا کلام ہے۔ سنا تھا رنگون میں ہیں تو دیدار کا مارا۔ (بادشاہ کی صورت گھورنے لگتا ہے)

ظفر: یوں کیا دیکھ رہے ہو گاؤ وہی غزل سناؤ۔

جھمرو: (گاتا ہے)

لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

ظفر: ادھر آؤ، یہ لو۔ بیگم دیکھا تم نے ہماری توانائی کا عالم (پیسوں کی تھیلی دیتے ہیں) دلّی کے باشندے نے لگتا ہے دف نہیں طبلِ قولنج بجایا ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے دربار میں بجایا جاتا تھا، جس سے قولنج کا بیمار اچھا ہو جایا کرتا تھا۔ ارے... آنکھوں میں یہ اندھیرا کیسا... ہم نے کہا مرزا جواں بخت۔

جوان بخت: عالم پناہ (جواں بخت داخل ہوتا ہے)

ظفر: شہزادے یہاں کی آب وہوا ناموافق ہے میری مصیبت میں عارضۂ قولنج نے اور اضافہ کر دیا۔ ارے مجھے سنبھالو۔

جھمرو: ظلِ الٰہی۔ شہزادے۔ (حیران ہوتا ہے)

ظفر: پسِ مرگ قبر پر اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں نے اڑا دیا

آہ خدایا۔ خدا دارم چہ غم دارم...

(دم توڑ دیتے ہیں)

بخت: جہاں پناہ...

جھمرو: ظلِ سبحانی... (آگے بڑھ کر چولہے میں عود اور لوبان ڈال دیتا ہے۔)

زینت: عالم پناہ، آج میرا سہاگ لٹ گیا، ہائے زینت! وائے تباہی۔

ہزاروں حسرتوں کی آج میت اٹھنے والی ہے
زمانے والو مرگِ نامرادی دیکھتے جاؤ
(قمر)

جھمرو: ہائے دلّی وائے اجڑے دیار، تیرا تاجدار رنگون میں پیوندِ زمین ہو گیا (منظر خوشبودار دھوئیں میں تحلیل ہونے لگتا ہے)

گھستے گھستے پاؤں کی زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی

(ساز اور آواز)

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(اختتام)

اٹھارہ سوستاون

• 1857 •

نوائے امروز

شعروسخن

رفعت سروش

شعلۂ آزادی
(مئی 1857)

تاریخ کے ایوان میں زندہ ہے وہ لمحہ
اک شعلہ لپکتا ہوا مشرق سے اٹھا تھا

منگل نے بغاوت کا بگل ایسا بجایا
سوئے ہوئے آزادی کے شیروں کو جگایا

کیا لوگ تھے جو کوہِ گراں بن کے اٹھے تھے
ٹیپو کی شجاعت کا نشاں بن کے اٹھے تھے

کیا فوج تھی جو ابرِ رواں بن کے چلی تھی
کیا آگ تھی جو برقِ تپاں بن کے چلی تھی

انگریز حکومت سے بغاوت کا تھا اعلان
ہم دوش و ہم آواز تھے سب ہندو مسلمان

بڑھتا گیا، بڑھتا گیا وہ قافلہ آگے
گاتا ہوا پرجوش بغاوت کے ترانے

دلّی میں وہ آپہنچا بہ عنوانِ قیامت
درکار تھی اس فوج بغاوت کو قیادت

ان شعلہ نواؤں نے چنا شاہ ظفر کو
''اس دور میں تم بابر و اکبر کا بدل ہو''

بوڑھا تھا شہنشاہ، مگر عزم جواں تھا
تیمور کا خون اس کی رگِ جاں میں رواں تھا

جاری کئے احکام شہنشاہ ظفر نے
''دلّی میں نمائندے ہیں ہم اہلِ وطن کے

ہر صوبے کو آزادی ہے، وہ خود کو سنوارے
محروم نہ ہوگا وہ تعاون سے ہمارے

ممنوع ہے اب گاؤکشی پورے وطن میں
آزادی سے ہر پھول کھلے اپنے چمن میں

ہر مذہب و ملت کا برابر کا ہے درجہ
آزادیٔ افکار ہے حق فردِ بشر کا

واں جھانسی کی رانی تھی ادھر تانتیا ٹوپے
آتش کدۂ حریتِ ہند میں اترے

سرگرم محبانِ وطن چار طرف تھے
سلگے تھے ہر اک سمت بغاوت کے یہ شعلے

انگریز تو فطرت ہی سے تھے شاطر و مکار
انسان کے ایمان و حمیت کے خریدار

دلّی میں بنا رکھے تھے غداروں کے ٹولے
تھا عیش میسر جنھیں انگریز کے دم سے

اس صورتِ حالات میں وہ ہوگئے سرگرم
مخبر بنے انگریز کے (آئی نہ انھیں شرم)

راجاؤں نے، نوابوں نے بھی ان کا دیا ساتھ
انگریز پیادوں نے شہنشاہ کو دی مات

آزادی کی ہر سعی جو ہونے لگی ناکام
قلعے کی فضا گرم ہوئی، مچ گیا کہرام

تاریخ نے پھر لکھی کہانی یہ پرانی
''خود غرضی تو اس قوم کی ہے فطرتِ ثانی''

بے چندوں کی اک نسل ہمیشہ رہی زندہ
غداروں کی اک فصل ہمیشہ رہی زندہ

تاریخ کے ناسور ہیں، صادق ہوں کہ جعفر
پیدا کئے اس خاک نے یہ کیسے ستم گر!

جب شاہِ ظفر نے کیا اعلان بغاوت
باقی نہ رہی، ٹوٹی نہ ہو ان پہ جو آفت

شہزادوں کو لٹکا دیا سولی پہ سرِ عام
مت پوچھئے، شہزادیوں کا کیا ہوا انجام

سولی پہ چڑھے وہ بھی نہ تھی جن کی خطا کچھ
دلی لٹی اس طرح، کہ باقی نہ رہا کچھ

غالب کے خطوں میں ہیں تباہی کے مرقعے
تاراج ہوئے کیسے محلے کے محلے

انجام شہنشاہ کا تھا باعثِ عبرت
انگریز بہادر کی عجب تھی یہ بغاوت

جاں بخش دی، پر بھیجا اسے دور وطن سے
محروم رہا خاکِ وطن کے بھی کفن سے

پھر ہند میں انگریز کے اس طرح جمے پاؤں
تھا زیرِ نگیں ان کے ہر اک شہر ہر اک گاؤں

OO

نوے برس تک آگ کے شعلے تھے اور ہم
انگریز سامراج کے نیزے تھے اور ہم

کشتی ہماری آگ کے دریا میں تھی رواں
آتش کدہ بنا تھا محبت کا گلستاں

تھا عرصۂ حیات جو اہلِ وطن پہ تنگ
اک لحہ کو نہ رک سکی آزادی کی یہ جنگ

ہے داستاں طویل، مگر قصہ مختصر
دار و رسن کی راہ سے پورا ہوا سفر

ایسی چلی شدید ہوا انقلاب کی
پھوٹی شبِ سیہ میں کرن آفتاب کی

قیدِ فرنگ سے ہوئے آزاد اہلِ ہند
آزاد ہو کے بھی رہے ناشاد اہلِ ہند

صیادِ قلبِ ہند کو دو نیم کر گیا
وہ جاتے جاتے ملک کو تقسیم کر گیا

اب ہم ہیں اور مسائلِ آزادیٔ حیات
مغرب کے دام سے ہمیں اب بھی نہیں نجات

آؤ نئی بساطِ محبت بچھائیں ہم
تقسیم کے جو داغ ہیں ان کو مٹائیں ہم

مل جل کے ہم منائیں نہ کیوں جشنِ انقلاب
چھیڑیں جو ہم ستار، وہ لیں ہاتھ میں رباب

برِصغیرِ ہند کی ہم آن بان ہیں
ہم امن کے نقیب ہیں مشرق کی شان ہیں

OO

رؤف خیر

آزادیٔ نفس

طلوعِ صبح سے پہلے اندھیری راتوں میں
نہ جانے بیٹھ کے یاروں نے کیا کیا سوچا تھا
وہ آفتاب جو تھا بے اسیریوں کا نقیب
لہو کے طشت سے ابھرا تو سر پہ چمکا تھا
سیاہیوں کی اکڑنے لگی تھی سانس بہت
ہر ایک شخص کے چہرے پہ نور اتنا تھا
جلو میں خواب سہانے لئے ہوئے وقفہ
ہزار جہدِ مسلسل کے بعد آیا تھا
سکونِ خواب کو آنکھیں ترس گئی تھیں بہت
کھلی جو آنکھ تو یاروں نے یہ بھی دیکھا تھا
ہر ایک شخص کی آنکھوں میں اجنبیت تھی
وہی ہوا کہ فقط اعتبار اپنا تھا
پڑی ہوئی تھیں دراڑیں کھنچے ہوئے تھے خطوط
خلوص، قرب، تعلق تو جیسے دھوکا تھا
وہ عہدِ کم نگہی لوٹ کر نہ پھر آئے
لہو کا نقش جسے لذتِ تماشہ تھا

مجھے یہ آرزو تہذیب تو میں ایسا ہو
کوئی کٹھور تو کوئی خدا ترس بھی ملے
کہ پھول پھول پہ بھنورا نہیں مگس بھی ملے
وہ جو بلند نظر ہے، کبھی نہ ایسا ہو
اسیرِ پنجۂ احساسِ پیش و پس بھی ملے
کہاں تلک کوئی گن گن کے سانس لیتا رہے
کہ جسم و جاں کے لئے بادِ بے قفس بھی ملے
رہے نہ کوئی بھی پابندی دست و بازو پر
ہر ایک شخص کو آزادیٔ نفس بھی ملے
گریباں گیر خرد ہے جنوں تو اتنا ہو
فقیہِ شہر کے دامن پہ دسترس بھی ملے

جنگِ آزادی
(تب سے اب تک)

چاپلوسی کی روایت نہیں رکھتے ہم لوگ
سال ہا سال سے انصاف کے طالب ہم ہیں
مخبری یاروں کی کرتے نہیں آقاؤں سے
دامنِ شاہ کی زینت ہیں نہ غالب ہم ہیں
وہ لیاقت ہوں کہ یحییٰ ہوں کہ صادق علا
سیدِ قوم شہید اور شہید اسمٰعیل"
نام کے خانوں سے بدباطنی سرداروں سے
جان کھوتے رہے قابیل کے ہاتھوں ہابیل
کانپوری وہ عزیزن ہو کہ بیگم حضرت
لکشمی گھر کی دل و ذہن کی رانی جھانسی
سانس آزادی سے لینے کی تمنا جب کی
بے گھری ان کے مقدر میں رہی یا پھانسی
بیج اس خاک میں آزادی کا بویا ہم نے
بار آور جو ہوا ہے تو شجر ہے سب کا
پھول پتے تو سبھی کھا گئے شاکاہاری
گوشت خوروں نے اسے بانٹ لیا ہے کب کا
حاکمیت کا سزاوار فقط اک حق ہے
مردِ مومن کبھی محکوم نہیں رہ سکتا
سر کبھی ظلم کے آگے نہ جھکا ہے نہ جھکے
وہ جو ظالم نہ ہو مظلوم نہیں رہ سکتا

عنبر بہرائچی

وہ بہارِ کاوشِ اوّلیں

وہ سبھی کی آنکھ کے نور ہیں
وہ سبھی کے دل کا قرار ہیں
جو وطن کی آن پہ مٹ گئے
جو دیارِ غیر میں سو گئے
وہ ظفر ہوں،ٹوپے کہ لکشمی
سبھی جاں نثار وطن کے تھے
وہ جواں ہوں پیر کہ طفل وزن
سبھی پاسبان چمن کے تھے
وہ سفید فام، کہ جن کے دل
تھے سیاہیوں سے بھرے ہوئے
وہ اخوتوں کی بہار سے
تھے ہر ایک لمحہ ڈرے ہوئے
انھیں فخر وناز تھا مکر پر
کئی لوگ دام میں آگئے
وہ ضعیف رہبرِ خوش نوا
بھی سراب زار میں کھو گیا
جو ملی شکست وہ آخرش
نئے ولولوں میں بدل گئی
کئی کہکشائیں چمک اٹھیں
سرِ چرخِ عالمِ حریت
وہ بہارِ کاوشِ اولیں
ہوئی تخم ریز جو اس طرح
تو نجات پائی ہے قوم نے
صفِ تیرگی کے طلسم سے

ابراہیم اشک

دس غزلیں 1857کے لئے

ایک

ستم رسیدوں کے قافلے سب اٹھے ہیں دل میں امنگ لے کر
تمام قاتل صفوں میں اپنی کھڑے ہیں ہاتھوں میں سنگ لے کر
ہجوم خنجر بکف ادھر ہے، ادھر دعاؤں میں ہاتھ سارے
فرشتے آنے لگے زمیں پر خدا کی رحمت کو سنگ لے کر
ہمارے سچ کے بیان پر وہ ہزاروں جھوٹے بیان دیں گے
مگر جو ٹپکا لہو زمیں پر جہاں میں چمکے گا رنگ لے کر
جو چپ تھے ان کے بھی لب کھلیں گے وہ داستاں ظلم کی کہیں گے
نہیں ڈریں گے کسی سے اب وہ چلے جو طرز ملنگ لے کر
لٹا چکے ہیں جو اپنے کنبے، وہ اپنی جانوں سے بے خبر ہیں
گناہ گاروں کے سامنے وہ کھڑے ہیں جوش و ترنگ لے کر
وفا کی راہوں سے چپ بھی گزرے، رہی ہے تہذیب یہ ہماری
فضا میں دلکش صدائیں گونجیں چلے ہیں نعرے و بنگ لے کر
جو عزم ہے وہ بکھر نہ جائے گواہ کوئی مکر نہ جائے
عدالتوں میں کھڑے ہیں ملزم سلگتی آنکھوں میں جنگ لے کر

دو

ظالم سے کوئی فریاد نہ کی یوں اہل وفا زنداں میں رہے
نبضوں میں جنوں کی آتش بھی بیدار شعور جاں میں رہے
ہر ایک ستم کو سہنے کا انداز نرالا تھا اپنا
زخموں کے گلاب کھلا کر ہم گلشن سے پرے ویراں میں رہے
تلوار اٹھانے والوں کو پیغام محبت دیتے ہیں
یہ عزم ہمارا ہے یارو، اس عزم سے ہم میداں میں رہے
کیا نام بتائیں ہم اپنا کیا اپنا ٹھکانہ بتلائیں
عاشق ہیں غزالی آنکھوں میں یا بزم دل خوباں میں رہے
ان شوخ مچلتی موجوں کو ساحل سے نہیں دیکھا ہم نے
الجھے ہیں بھنور سے ہم اکثر بے خوف و خطر طوفاں میں رہے
مت ہم کو سمجھنا تم سادہ ہم بھی تو اداؤں والے ہیں
شبنم کی طرح اک عمر تلک محبوب کی ہم مژگاں میں رہے
راس آئے نہ آئے یہ بستی اے اشک نہیں یہ چھوٹے گی
جس دن سے سنبھالا ہوش ہم نے بس شہر غم جاناں میں رہے

تین

ایک جھونکا ایسا آیا، لوگ حیراں ہوگئے
ظلم پیشہ جو بھی تھے وہ سب پریشاں ہوگئے
ایک لمحے میں نقاب رخ الٹ کر رہ گئی
دیکھتے ہی دیکھتے سب راز افشاں ہوگئے
جھوٹ کی بازگری کا سب بھرم کھلنے لگا
نقش سارے حق پرستی کے نمایاں ہوگئے
کل تلک تھی بھیڑ جن کے دفتروں کے آس پاس
مرکزِ اہل ستم وہ آج ویراں ہوگئے
جشن وحشت کی سجاتے تھے جو ہر دم محفلیں
کھو گیا ان کا جنوں بے ساز و ساماں ہوگئے
بے گناہوں کو ملے گی قید سے اپنی نجات
اب رہائی کے لئے آثارِ زنداں ہوگئے
اپنی نسلیں تو وفا کی راہ پر چلتی رہیں
بے وفا جو تھے ہمارے دشمن جاں ہوگئے
نورِ حق سے ہوگئے پرنور جسم و جاں سبھی
شیخ کیا جانے کہ ہم سچے مسلماں ہوگئے

چار

رسم انداز ستم توڑنے والے آئے
بزم قاتل کو خبر دو کہ جیالے آئے
تیغ پر خون شہیداں کے لگے ہیں چھینٹے
اب یہ منصف کی نگاہوں میں حوالے آئے
قتل گاہوں میں جو اک روز ہوئی تھی سازش
راز افشاں وہی کرنے کو گوالے آئے
دیکھ اٹھ کر تو دریچے سے ذرا باہر بھی
تیری گلیوں میں ترے چاہنے والے آئے
رقص کرتے رہے خوں چاٹنے والے وحشی
ملک میں اپنے یہ موسم بھی نرالے آئے
ڈس گئے شاخ پہ کھلتے ہوئے سب غنچوں کو
باغ ہستی میں کئی ناگ جو کالے آئے
لاکھ مظلوموں کی چیخوں کا ہوا شور بلند
مسجدیں آئیں بچانے نہ شوالے آئے

پانچ

صدائے حرف نیم کش اسے سنا کے رہ گئے
نظر سے جب نظر ملی تو مسکرا کے رہ گئے
عجیب رسم عشق ہے کہ دل ٹھہر ٹھہر گیا
نہ جانے کیا گزر گئی قدم بڑھا کے رہ گئے
زبان بے نیاز نے اسے پکار ہی لیا
پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ چپ لگا کے رہ گئے
جنوں بہ رنگ آسماں ہر ایک سمت چھا گیا
تمام فرش و عرش کا سراغ پا کے رہ گئے
اٹھی وہ موج بے خودی کہ کچھ پتہ نہیں رہا
چلے تھے کس مقام سے کہاں پہ جا کے رہ گئے
نوازش نگاہ نم سے دل فراز بام ہے
یہ کیسی ہیں بلندیاں جہاں ہم آ کے رہ گئے
قریب اتنے آئے وہ کہ لو بھڑک کے رہ گئی
چراغ عشق جاوداں جلا جلا کے رہ گئے
حیات خوشگوار نے سخن میں جب رکھا قدم
غزل کی اشک عظمتیں بڑھا بڑھا کے رہ گئے

چھ

جو اپنے دل پہ گزری ہے قیامت لکھتے جائیں گے
ہر اک زخم ستم کی ہم عبارت لکھتے جائیں گے
محافظ بن کے جو آئے وہ قاتل بن گئے سارے
ہوئی ہے کیسی بستی کی حفاظت لکھتے جائیں گے
وہ اپنے ظلم کی کرتے رہیں گے انتہا ہم پر
ادھر لوح جہاں پر ہم بغاوت لکھتے جائیں گے
انہیں رسم وفا پر بے وفائی کا گماں کیوں ہے
بجا ہے یہ شکایت ہم شکایت لکھتے جائیں گے
امیر شہر نے شہر وفا کو کس طرح لوٹا
جو دیکھا ہے نگاہوں نے، شہادت لکھتے جائیں گے
ہوا تھا رقص وحشت کا گلی کوچوں میں تھیں چیخیں
لٹی ہیں کیسے ماں بہنوں کی عصمت لکھتے جائیں گے
ہمیں اپنی زمیں کے ذرے ذرے سے محبت ہے
یہی آئندہ نسلوں کو وراثت لکھتے جائیں گے

سات

سن رہے ہیں اب علاج تشنگی ہونے کو ہے
مے کدے میں آج جشن مے کشی ہونے کو ہے
وہ در زنداں کھلا، ٹوٹی وہ زنجیر ستم
پھر در جاناں پہ رسم بے خودی ہونے کو ہے
جستجوئے جادۂ منزل کے موسم آگئے
عاشقوں کی دشت میں آوارگی ہونے کو ہے
ہے وداع شام ہجراں حاصل فصل بہار
چاند نکلے گا گھٹا سے چاندنی ہونے کو ہے
ہر نفس کھلنے لگا ہے غنچۂ گل کی طرح
سُرخ رو بیمار غم کی زندگی ہونے کو ہے
ٹانک دیں گے ہر شب تاریک میں ماہ و نجوم
محفلوں میں اہتمام روشنی ہونے کو ہے
شہر میں رقصاں نہ ہوں گے وحشتوں کے اب ہجوم
جو کوئی شیطان ہے وہ آدمی ہونے کو ہے
وہ جو شب خوں مارتے تھے ہو رہی ہے ان سے بات
اشک اپنے دشمنوں سے دوستی ہونے کو ہے

آٹھ

غرور توڑ دیا ہم نے بے وفاؤں کا
اثر یہ ٹوٹے ہوئے دل کی ہے صداؤں کا
وہ شرمسار کھڑے ہیں ستم گروں کے ہجوم
دعا نے بھر دیا دامن غریب ماؤں کا
ہمارے سینوں پہ تلواریں ٹوٹ جاتی ہیں
ذرا بھی خوف نہیں ہے ہمیں بلاؤں کا
زبان خلق سے ابھری ذرا جو موج صدا
طلسم ٹوٹ گیا وقت کے خداؤں کا
ہمارے سر نہیں جھکتے کبھو یزیدوں سے
لکھا ہے تازہ ورق ہم نے کربلاؤں کا
تڑپ کے کود گئے ہم مچلتے طوفاں میں
نہیں ہے قرض کوئی سر پہ ناخداؤں کا
چراغ خونِ شہیداں جو ہو گئے روشن
بدل گیا ہے زمانے میں رخ ہواؤں کا
وہ قاتلوں کی صفوں میں ہمیں نظر آئے
کیا تھا ہم نے بھروسہ جن آشناؤں کا

نو

یہی عزم لے کے چلے تھے ہم کہ ستم کے سر کو جھکائیں گے
لہو دیں گے خنجرِ ظلم کو، رگِ جاں کو ہنس کے کٹائیں گے
وہ جو فرض تھا، وہ جو قرض تھا وہ تو کب کا ہم نے چکا دیا
ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملا یہ جہاں کو کیسے بتائیں گے
کوئی لاکھ ہم کو فریب دے، کوئی چاہے تجھ سے جدا کرے
ترے ناز ہم نے اٹھائے ہیں، ترے ناز ہم ہی اٹھائیں گے
یہ رہی ہیں اپنی روایتیں، نہیں چھوڑیں ہم نے شرافتیں
وہ ہیں لاکھ دشمنِ جاں مگر، انہیں ہم وفائیں سکھائیں گے
اسی آرزو میں جئے ہیں ہم، اسی آرزو میں مریں گے ہم
کہ چراغِ خونِ وفا سے ہی تیری انجمن کو سجائیں گے
ہر اک امتحاں سے گذر گئے کہ گذر کے ہم تو سنور گئے
ذرا ان کا حال تو پوچھ لیں کبھی راہ پر جو نہ آئیں گے
ہمیں جسم و جاں کی نہ فکر ہے، سر دار تیرا ہی ذکر ہے
جو ہے پاس سب وہ لٹا کے ہم تری آبرو کو بچائیں گے
وہ جو پھول سارے مسل گئے جو کلی کلی کو کچل گئے
انہیں خوشبوؤں سے غرض نہیں یہ چمن تو ہم ہی سجائیں گے
در و بام جتنے بھی جل گئے یہ جو شہر جل کے بدل گئے
جو اجڑ گئی ہیں یہ بستیاں انہیں اشک ہم ہی بسائیں گے

دس

طلسمِ زخمِ وفا تو دیکھو کہ بزمِ قاتل میں کھلبلی ہے
اڑی ہے رنگت ستم گروں کی جنوں کی ایسی ہوا چلی ہے
وہ بے گناہوں کے قافلے ہیں اسیرِ زنداں جو ہو گئے ہیں
بلک رہے ہیں اب ان کے آنگن اداس ان کی ہر اک گلی ہے
جو داغ تم نے لگانا چاہے، لہو سے ہم نے وہ دھو دیے ہیں
ہوئے ہیں رخصت اندھیرے سارے جہاں بھی شمعِ وفا جلی ہے
لگی تھیں عرش بریں پہ آنکھیں دعا میں دستِ طلب اٹھے تھے
ہوئی سحر کی اذاں تو دیکھا، شبِ ستم جیسے ڈھل چلی ہے
یہ میں ہوں شاید، یہ تم ہو شاید، نہیں ہے وارث کوئی بھی جس کا
کفن پہ لفظِ 'وطن' لکھا ہے، یہ لاش کس کی جلی جلی ہے
یہ بستیاں ہیں کہ دشت و صحرا، صدائیں کیسی یہ آ رہی ہیں
کھڑے ہیں وحشت کے ناگ سر پر گھروں میں ماتم ہے بے کلی ہے
بجھی نہیں ہے ہوس کی آتش، مٹی نہیں ہے پرانی سازش
ابھی نہ سونا ستم رسیدو، ابھی قیامت نہیں ٹلی ہے
وہ بات کرتے ہیں خنجروں کی، کہاں حفاظت ہے مقبروں کی
کوئی مہذب نہیں ہے ان میں بری ہے نیت نہیں بھلی ہے
خلوص و عشق و وفا کے حامی کریں محبت کی ہم غلامی
ہمارا نعرہ ہے امنِ عالم، ہماری تہذیب مخملی ہے
قلندری ہے مزاج تیرا، ہے بے نیازی رواج تیرا
ہے اشکؔ تیری ادا نرالی، نہ میر و غالب نہ تو ولی ہے

ابراہیم اشک

آٹھ نظمیں 1857 کے نام

اوراقِ 1857

غلام ذہنوں میں
حریت کے چراغ روشن
ہوئے ہیں جب بھی
کئی برس کی اندھیری راتیں
نکھر گئی ہیں سنور گئی ہیں
سحر کی ایسی اذان گونجی
کہ سونے والے تمام جاگے
اٹھے وہ سر سے کفن کو باندھے
کہ جان لے کر ہتھیلیوں پر
نمازِ عشق و وفا کی خاطر
گھروں سے اپنے نکل پڑے سب

وہ سرفروشوں کی ٹولیاں تھیں
کہ جن سے دار و رسن کی عظمت
کے پھول رنگیں ہوئے ہمیشہ
جنوں سے جن کے فضائیں مہکیں
کبھی ستم سے نہیں ڈرے ہیں
کہ ان کے سینوں پہ جب لہو کے
کھلے ہیں غنچے
ہر ایک خنجر کو شرم آئی

جو تیغ ٹوٹی لرز رہی تھی
یہ قافلہ جو رواں دواں تھا
جو دشت و صحرا میں
موجِ دریا سا بہہ رہا تھا
زباں سے اپنی یہ کہہ رہا تھا
قفس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے اب ہم
ہر ایک زنداں کو توڑ دیں گے
کلائی ظالم کی موڑ دیں گے
ہمیں نہ منظور اب غلامی
ہوا میں نعرے بلند تھے سب
صدائیں کھیتوں سے آ رہی تھیں

ہر ایک برگد، ہر ایک پیپل
ہر ایک جامن کی آرزو تھی
بہار آئے بہار آئے
کہ ذرّے ذرّے پہ اب وطن کے
نکھار آئے نکھار آئے

ہر ایک مندر، ہر ایک مسجد سے
ہاتھ اٹھے جو دعا کی خاطر
خدا سے اپنے وہ مانگتے تھے
کہ بیڑیاں جو پڑی ہوئی ہیں
ہمارے پیروں میں، ٹوٹ جائیں
جو بندشیں ہیں غلامیوں کی
ہم ان کے پنجے سے چھوٹ جائیں
ستم گروں کے حواس گم تھے
وطن میں آندھی سی چل رہی تھی
دلوں میں طوفان اٹھ رہے تھے

صدائے حق پرستی کا تھا آغاز
شہیدوں نے لہو سے جب
اک آزادی کا ایسا باب لکھا ہے
کہ جس کی روشنی بڑھتی ہی جاتی ہے
وہ سب اوراق
اٹھارہ سو ستاون کے روشن ہیں
وقارِ غیرت ہندوستاں کا آئینہ ہیں وہ

بہادر شاہ ظفر کی یاد میں

وہ ایک شاعر
کہ جس کے فکر و خیال میں تھیں
وطن کی مٹی کی خوشبوئیں سب
چمن کے پھولوں کے رنگ سارے
کہ دشت و صحرا کے پنچھیوں کے
گداز نغمے حسیں ترانے
وہ جب محبت میں ڈوب جاتا
غزل کا اس پر نزول ہوتا
وہ مسکراتا، وہ گنگناتا
وہ اپنے فن کو بکھیر دیتا
ہر ایک موسم ہر اک فضا میں
ہوائیں اس کی غزل کو گاتیں
ہر ایک دل میں وفا جگاتیں
وہ ایک شاعر
جو اپنے پرکھوں کی آن والا
جہاں میں مغلوں کی شان والا
فلک کی اونچی اڑان والا
زبان والا، بیان والا
رگوں میں جس کی بلندیوں کا
لہو رواں تھا
بزرگوں جیسی تھی عمر لیکن
وہ دل تو اس کا ابھی جواں تھا

وطن کی غیرت کے واسطے وہ
فرنگیوں کے مقابلے پر کھڑا ہوا تھا
اٹھا کے تلوار مورچے پر اڑا ہوا تھا
کہ شاہ تھا وہ بہادروں کا
عظیم لشکر کے سامنے بھی
وہ آبروئے، وطن کی خاطر
لڑا جہاں تک بھی دم میں دم تھا
یہ حوصلہ کیا کسی سے کم تھا؟
جو وقت آیا تو
جان قربان کر دی اس نے
وطن کی خاطر
وہ ایک شاعر
وطن کی مٹی سے پیار جس کو
عجیب اس کا نصیب نکلا!
شہید ہونے کے بعد اس کو
ملی نہ دو گز زمین
جاں سے عزیز
کوچۂ جاناں میں آخر
مگر شہیدِ وطن کے جتنے ہیں
چاہنے والے
ہے ان کے دل میں
مزار اس کا
ہمارا دل ہے دیار اس کا

کاروانِ جنوں

شہادتوں کے علم اٹھا کر
وہ گھر سے نکلے
نہ کوئی ہندو، نہ کوئی مسلم
نہ کوئی سکھ تھا نہ پارسی تھا
بس ایک مذہب تھا ان سبھی کا
بس اک ارادہ بس ایک منزل
کہ راج بدلیں گے ظالموں کا
کہ تاج بدلیں گے حاکموں کا
صدائے حق تھی بلند ہر سو
ستم گروں میں مچی تھی ہلچل
ہر ایک زنداں میں
رقص کرنے لگے دوانے
ہر اک گلی میں، ہر ایک کوچے میں
شور برپا تھا حریت کا
وہ کارواں آگے بڑھ رہا تھا
غبار پھیلا تھا ہر دشا میں
تمام لشکر حکومتوں کے
لرز رہے تھے، بکھر رہے تھے
ستم کے چہرے اتر رہے تھے
جمی ہوئی تھی جو برف صدیوں سے
وہ برف ساری پگھل رہی تھی
ہر ایک صورت بدل رہی تھی

تاریخ

سماج سارا بدل رہا تھا
جوان بیٹوں کو موڑ پے پر
ہر ایک ماں نے لگا دیا تھا
لہو سے اپنے جو لکھ رہے تھے نئی کہانی
ہر ایک دار و رسن پہ جیسے
لگا تھا میلا شہادتوں کا
سروں کی کوئی کمی نہیں تھی
کہ سُرخرو ہو رہے تھے منظر
دھڑک رہے تھے زمیں کے پتھر
تمام دریا مچل رہے تھے
تمام پنچھی وطن کے نغمے
وفا کے راگوں میں گا رہے تھے
گھنے اندھیروں کی سب فضائیں
نقاب اپنے الٹ رہی تھیں
ستم گروں کی ہر ایک بازی
خود ان کے ہاتھوں پلٹ رہی تھی
کہ وقت اپنا قلم اٹھا کر
سنہری حرفوں میں مسکرا کر
وطن کی تاریخ لکھ رہا تھا
تمام لوحِ جہاں پہ جس کی
عبارتوں کے
گلاب کھلتے ہی جا رہے تھے...

ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی
اک داستاں ایسی بھی ہے
کہ جس کی ہر سحر میں
نور کی برسات ہوتی تھی
پرندے چہچہاتے تھے
خوشی کے گیت گاتے تھے
منڈیروں پر گھروں کے
دھوپ کی ریشم بکھرتی تھی
زمیں موتی اگلتی
آسماں رحمت کے پھولوں سے
ہر اک موسم سجا دیتا
چمکتے تھے کلش مندر کے
سنتوں کی صداؤں سے
گلی کوچے سجے رہتے
اذانیں گونجتی جب بھی فضاؤں میں
کوئی امرت سا گھل جاتا
محبت تھی ہر اک دل میں
چراغ عظمت آدم سے
روشن تھا جہاں سارا
سنہری دور تھا وہ بھی
جو اس دھرتی پہ گزرا ہے
نہ تھا مذہب کے کالے
بادلوں کا کوئی بھی ساون
لہو جس سے برستا ہو

نہ تھا کوئی تعصب کا گھنا جنگل
جہاں دو بوند چاہت کے لئے
انساں ترستا ہو
کوئی بھی ظلم کا حامی نہیں تھا
کوئی بھی جھوٹ کا ساتھی نہیں تھا
غریبِ شہر کو بھی
امیرِ شہر کے جیسا
یہاں انصاف ملتا تھا
خیال و فکر کی اونچی اڑانیں
سنورتی تھی زبانیں
رواں تھے علم کے دریا
وفا کے رنگ
دل کی ہر امنگ
اک دوسرے کے سنگ
کچھ ایسے جواں تھے
کہ اک جنت تھی یہ دنیا
پرانے یہ کھنڈر سارے
یہ عمارتیں یہ مینارے
آج بھی اس کی بلندی کے نشاں ہیں
یہ وہ تاریخ ہے
لوحِ جہاں پر اب بھی روشن ہے
کبھی یہ مٹ نہیں سکتی

چلو یوں ہی سہی

چلو یوں ہی سہی
جہانِ بے وفا میں
ہر اک دشوار منزل سے
گذرنا اپنی قسمت ہے
مگر پھر بھی یہ ہمت ہے
کہ جو دل میں ارادہ ہے
اسے پورا کریں گے ہم
چلو یوں ہی سہی
کہ آسمانوں کی اڑانوں کا
کوئی موقع نہیں ہم کو
کہ سب اڑنے سے پہلے
پر ہمارے کاٹ دیتے ہیں
مگر ہم چاند تارے
نوچنے کا عزم رکھتے ہیں
چلو یوں ہی سہی
کہ ظلم کی ہے انتہا ہم پر
مگر وہ صبر ہے دل میں
کہ ہم ہرگز نہ ٹوٹیں گے
نہ بکھریں گے ستم سے ہم
اگر سو بار بھی اجڑے
تو بس جائیں گے ہم پھر سے
چلو یوں ہی سہی
کہ یہ زمین و آسماں
اپنے نہیں ہیں
مگر ہم اپنے دل میں
اک جہاں آباد رکھتے ہیں
کہ جس پر بس ہماری ہی حکومت ہے
چلو یوں ہی سہی
بہاروں کا کوئی موسم
کوئی نغمہ کوئی جادو
نہیں اپنے لئے لیکن
ہم اپنے دل کی ویرانی کو
آبادی بنالیں گے
رگوں میں دوڑنے والا
لہو جب گونج اٹھے گا
تو دل کے تار پر
نغموں کی جھنکاریں جواں ہوں گی
طلسمِ زندگی میں
ڈوب جائے گی فضا ساری
ہمیں بیدار ہونے سے
جہاں کیا روک پائے گا؟

سیلاب

ڈوبنے والے ڈوب رہے تھے
سارا زمانہ دیکھ رہا تھا
ہاتھ بڑھا کر تھامنے والا کوئی نہیں تھا
شہر میں تھا سیلاب
پانی بڑھتا جاتا
ادھر عمارت گر جاتی تھی
ادھر جھونپڑے بہہ جاتے تھے
ساری عمر کا خون پسینہ لگا ہوا تھا وہ دیواریں
کانپ رہی تھیں
بستی بستی ڈر کے مارے ہانپ رہی تھی
برتن بھانڈے کپڑے لتے راشن واشن
بچوں کے سب کھیل کھلونے
موجوں کی بانہوں میں
سب ہی جھول رہے تھے
یہاں وہاں جو بھنور پڑے تھے
کتنی لاشوں کے ان میں
انبار لگے تھے
ہر اک لاش میں اک سپنا تھا
اک دنیا تھی
جو ڈوب گئی تھی
کتنے رشتے ٹوٹ گئے تھے
کتنے ساتھی چھوٹ گئے تھے
سارے شہر میں جیسے قیامت
رقص کناں تھی
بدحواس تھے
سارے پرندے
چوپائے سب سہمے سہمے
چاروں طرف
اک خاموشی تھی
دل کے اندر، دل کے باہر
کائنات تھی پھیلی ہوئی جو
لمحہ لمحہ لرز رہی تھی
بکھر رہی تھی ٹوٹ رہی تھی
سانس ادھوری چھوٹ رہی تھی
موت کی آندھی
گھروں میں گھس کر
انسانوں کو لوٹ رہی تھی

خرابات نشیں

ہم خرابات نشیں
جیسے مرجھائے ہوئے پھول ہوں گل دانوں میں
پتیاں بکھری ہوئیں رنگ ہیں پھیکے پھیکے
خوشبوؤں سے کوئی رشتہ ہی نہیں اب جن کا
جب بھی آتا ہے کوئی سرد ہوا کا جھونکا
نوچ لیتا ہے کسی سوکھی ہوئی پتی کو
کانپ اٹھتی ہے کوئی شاخِ تمنا جیسے
سارے عالم میں کوئی درد بکھر جاتا ہے
ہم خرابات نشیں
جیسے تصویر پرانی کوئی
ٹوٹی پھوٹی کسی دیوار کی اک کھونٹی پر
ایک بے نام حوالے کی طرح لٹکی ہو
جس کے ہونٹوں پہ ہے برسوں کی پرانی مسکان
جس کی آنکھوں میں ہے اجڑے خوابوں کا سماں
جس کے چہرے پہ خراشیں ہیں مگر
ان خراشوں کا لہو سوکھ گیا ہو جیسے
ہم خرابات نشیں
ٹوٹا پھوٹا سا کوئی جیسے چراغ
یوں بجھا ہے کہ جلے گا نہ کبھی محفل میں
روشنی اب نہ کبھی ہوگی وہ تاریکی ہے
زندگی ہم سے ہے شرمائی ہوئی
ہم خرابات نشیں
ایک ٹوٹے ہوئے پیمانے کے
بکھرے ہوئے ٹکڑے جیسے
اور ہر ٹکڑے میں احساس کے ہیں دشت کئی
کائناتیں ہیں سرابوں کی بہت پیاسے ہیں
ہم خرابات نشیں پھر بھی جیے جاتے ہیں

صبح نہیں آئی ہے

صبح آئی ہے
مگر صبح نہیں آئی ہے
صرف سورج کے چمکنے سے بھلا کیا ہوگا

یہ اجالا تو اندھیروں سے گھنا لگتا ہے
جاگتی آنکھوں کو ہر درد بڑا لگتا ہے
دل کے اندر جو اندھیرے کی سرنگ پھیلی ہے
اب تلک ایک کرن بھی نہ وہاں تک پہنچی
ظلم بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
عدل و انصاف کی آنکھوں پہ بندھی ہے پٹی
کوئی منظر بھی نہیں صاف کہ یہ جان سکیں
کس کے ہاتھوں سے لہو رنگ ہوئی ہے دنیا
کون مجرم ہے بھلا جرم کیا ہے کس نے
کتنے چوراہے بنے ہیں مقتل
کتنی آنکھوں میں ہوا ہے جل تھل
بستیاں کتنی جلیں راکھ ہوئیں
لوگ کہتے ہیں مگر کوئی گنہگار نہیں
بڑھتا جاتا ہے گناہوں کا اندھیرا ہر سو
دن بھی سب رات ہوئے جاتے ہیں
صبح بھی شام ہوئی جاتی ہے
دور تک ایک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
کالی آندھی کا ہے ماحول زمانے بھر میں
دوڑتی بھاگتی دہشت ہے ہر اک منظر میں
شہر میں جیسے بیابان چلا آیا ہے
ظلم ڈھانے کوئی شیطان چلا آیا ہے
اب نہ مندر ہی سلامت ہے نہ مسجد کوئی
ہر جگہ پر ہیں سیاست کے گھنیرے سائے
روشنی ماند ہوئی نور پہ یلغار ہوئی
بجھ گئے دیپ جو جلتے تھے خانقاہوں میں
اور ہم اندھی سرنگوں میں ڈرے سہمے سے
لمحے لمحے کو ترستے ہیں تڑپتے ہیں مگر
اپنے چہرے ہی سے انجان ہیں بیگانے ہیں
سامنے والے کی پہچان نہیں کر سکتے
ان سرنگوں میں نہ سورج سے اجالا ہوگا
جب تلک سارے ہی ماحول میں کالا ہوگا

صبح آئی ہے
مگر صبح نہیں آئی ہے
یہ اجالا تو اندھیروں سے گھنا لگتا ہے

پروین شیر

وہ جگنو ڈھونڈ لائیں گے

ہمارے امن کا ایواں تھا گھر اپنا
یہاں ہر رات کی مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے
اور ان کی روشنی ہر سمت پھیلی تھی
نہ سرحد تھی نہ دیواریں
یہاں ہر صبح کے رخسار سیمیں تھے
کھلے تھے رنگ برنگے پھول آنگن میں
فضا گھر کی معطر خوشبوؤں سے تھی
ہوا کی موج پر
قرآن و گیتا کے مدھر نغمے تھرکتے تھے
گھنیرے سائے بادل کے سروں پر سایہ افگن تھے
مگر اب تو
ہمارے گھر کا چہرہ اور ہی کچھ کر دیا تم نے
ہماری رات کی مٹھی ہے خالی جگنوؤں سے
چھا گئی ہے تیرگی ہر سو
ہماری صبح کے عارض پہ دھبے ہیں سیاہی کے
بکھرتی پتیاں پھولوں کی آنگن میں پڑی ہیں اور

گھنے بادل جو ٹھنڈی چھاؤں دیتے تھے
ہوا کے ساتھ اڑ کر بے نشاں ہیں اب
وہ نغمے گیتا و قرآن کے سب
سسکیوں میں ڈھل گئے ہیں اب

مگر سن لو!
کہ اب چھلکا ہے پیمانہ
شرارے اب دلوں میں سر اٹھاتے ہیں
کوئی زنجیر اب ان کو نہ جکڑے گی
ہماری محفلِ پندار میں اب اک چراغاں ہے
لٹیرو تم کفن سی لو
اب اپنے اس تشدد کا
ہماری رات کی مٹھی سے
جگمگ جگنوؤں کو تم نے چھینا ہے
مگر پھر سے انہیں ہم ڈھونڈ لائیں گے!

شاہد عزیز

بے نام ہوئے ہم

کرنے والے کر جاتے ہیں
مرنے والے مر جاتے ہیں
زندہ کیسے نام کروں میں
کوئی ایسا کام کروں میں
صبح نہیں تو شام کروں میں
تجھ پہ یہ الزام دھروں میں
تو نے بیچا خون ہمارا
ہم سے چھینا جون ہمارا
پانی سے بھی سستا نکلا
دیکھو تو یہ خون ہمارا
اب تو کچھ بھی پاس نہیں ہے
جینے کی بھی آس نہیں ہے

جیون دانی

میں نے دیکھا سوچا کب تھا
کیا دھرتی کے ساتھ ہوا تھا
کس نے کتنا ظلم کیا تھا
کس نے کتنا زہر پیا تھا
جیون پتھر آگ سمندر
سب ہی کچھ تھا میرے اندر
پھر بھی میں ناشاد رہا ہوں
اب ٹھیک تو برباد رہا ہوں
جیون تو کٹ ہی جائے گا
لیکن اک وہ درد پرانا
یاد ہمیشہ ہی آئے گا
گڈا گڑیا راجہ رانی
سارے ہی تھے جیون دانی
سب کی تھی بس ایک کہانی
سارے ہی تھے ہندوستانی

آدمی

شام ڈھلنے والی ہے
رات آنے والی ہے
چاند اور ستارے بھی
آسماں سجائیں گے
اور صبح تک یوں ہی
سارے جگمگائیں گے
رات جانے والی ہے
دن نکلنے والا ہے
سارے کام قدرت کے
اپنے ہی سلیقے سے
یوں ہی ہوتے رہتے ہیں
آدمی نہ ہوتا تو
کچھ کہیں نہیں ہوتا
آدمی کے ہونے سے
سارے کام ہوتے ہیں
آدمی کی عظمت کو
ہم سلام کرتے ہیں

شاہد عزیز

اے چاند کرن

اے چاند کرن
اے بادِ صبا
اے ساحل کی بے چین پون
اے موجِ بلا
کیوں غرق ہوا
وہ ایک ستارہ
آنکھوں کا
وہ نورِ رواں
وہ عکسِ جواں
وہ جس کا
کوئی نام نہیں
وہ جس کو
تجھ سے کام نہیں
اس پر ہے الزام بہت
جو نام ہوا
بدنام بہت
جو ریت پہ
لکھ کر بھول گئے
اور پھانسی پر
جھول گئے
وہ آج بھی زندہ ہیں دونو
آباد جہاں میں ہیں دونو

تمہارے ساتھ

ابھی میں سو نہیں سکتا
ابھی تو میری آنکھوں میں
مسلسل جاگتے رہنے کی
خواہش جگمگاتی ہے
ابھی وہ درد باقی ہے
جو میرے جسم کے اندر
نسوں کے ساتھ بہتا ہے
جسے میں بھول جاؤں تو
ذرا کچھ چین مل جائے
ابھی تو وقت کے تاریک
جنگل سے کوئی آواز دیتا ہے
اجالوں کی تمنا میں
کوئی سایہ بھٹکتا ہے
مگر سورج کبھی ان
اندھی گلیوں میں نہیں آتا

ابھی اک اور سیارہ
کسی بے نام انجانی
خلاؤں سے نکلتا ہے
تمہارے واسطے
وہ چاند لاتا ہے
زمیں پر رینگنے والے
سبھی تاریک سایوں کو مٹاتا ہے
تمہارے ساتھ جینا ہے
تمہارے ساتھ مرنا ہے

ظفر عدیم

جشن

بہت گھنیرے ہیں بادل مری عروس غزل
نمودِ دزدِ سحر میں، سحر تلاش نہ کر
ہٹا یہ آئینہ، حسنِ نظر تلاش نہ کر
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل

کہاں سے کون اٹھا، قافلہ کہاں چھوٹا
وہ سرخ سرخ فصیل طرب تجی کیسے
جرس کی دھن میں مدھر بانسری بجی کیسے
کہاں تھی آتشِ پا، آبلہ کہاں پھوٹا
چھلے ہیں پاؤں، مگر چل مری عروس غزل
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل

ورق ورق رہے کٹی ہوئی حکایت حق
لہو کی بوند چراغوں سی پور پور جلے
زباں کھلے بھی تو آہیں بھرے نہ سینۂ شق
جو تلخیاں بھی ہوں تو ڈر دلب بٹور چلے
بہے نہ آنکھ سے کاجل مری عروس غزل
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل

کہوں میں حالِ دلِ زار کیا غنچوں سے
گلوں کے نام پہ زخموں سے پیار کرتا ہوں
یہ سوچ کر نہ ہٹوں، نیم وا دریچوں سے
اٹھے گی انگلی کوئی ، انتظار کرتا رہوں
ابھی بجھی نہیں مشعل مری عروس غزل
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل

تجھے گلہ تو نہیں موسمِ بہاراں سے
خزاں کی زرد فشانی مجھے بھی یاد نہیں
تو اپنا نام پتہ، پوچھ بزمِ یاراں سے
سنی سنائی کہانی مجھے بھی یاد نہیں
ہے یادداشت بھی دلدل مری عروس غزل
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل

یہ گھورتی ہوئی آنکھیں یہ تولتے ہوئے لوگ
مری شناخت بھی مشکوک ہوگئی کیسے
دریدہ جیب وگریباں ٹٹولتے ہوئے لوگ
یہ سوچتا ہوں کہاں چوک ہوگئی کیسے
ثبوت کیا، کہ ہوں پاگل مری عروس غزل
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل

ہے داغ داغ بدن، اور جاں خراش خراش
کرن کی چوٹ سے ظلمت چھٹی تو ایسے چھٹی
لبِ طلب پہ لگی مہرِ احتیاجِ معاش
حیا کی لوٹ مچی، پھر کرم کی بھیک بٹی
سلا نہیں ترا آنچل مری عروس غزل
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل

منائیں جشن کہ اپنے ہی ہیں پرائے سے
منائیں جشن کہ پانی ہوا ہے خون اپنا
منائیں جشن کہ ہے مذہبی جنون اپنا
منائیں جشن کے ڈرتے ہیں اپنے سائے سے
ہے جشن گاہ میں مقتل مری عروس غزل
سنگار آج نہیں، کل مری عروس غزل
بہت گھنیرے ہیں بادل مری عروس غزل

محمد یحییٰ جمیل

تالی

دھوپ اچھی لگنے لگی تھی
لیکن سویٹر کے جزولباس ہونے میں
کچھ دن اور تھے
بچوں کے لئے ضروری
ہوجانے والے گرم کپڑوں کی فکر
آگے بڑھ کر کہہ رہی تھی
ویل کم ٹو گولکنڈا فورٹ سر
گائیڈ چاہیئے آپ کو...؟

متعدد مرتبہ قلعہ کے زینے چڑھتے اترتے
سچے جھوٹے واقعات کے تانے بانے سے
تاریخ بُن کر
تکرار کے
اکتادینے والے عمل سے اکتائے بغیر
وہ کامیاب ہوجاتا ہے
اپنے مسئلے بھر روپے کمانے میں

لیکن مسائل ختم بھی ہوتے ہیں کہیں
وہ تو محض شکل بدل کر
ختم ہوجانے کا دھوکہ دیتے ہیں بس

گولکنڈہ کے قلعے کی ایک یہ بھی خاصیت ہے جناب
کہ اس دروازے کے نیچے کھڑے ہوکر
تالی بجائیں
تو اوپر یہاں سنائی دیتی ہے تالی کی آواز
آپ یہیں ٹھہریں
میں جاکر تالی بجاتا ہوں
اور وہ
تیزی سے نیچے اتر گیا بہتے پانی کی طرح
اس نے تالی بجائی تو مجھے سنائی دی
سترہویں صدی کے کسی غلام حبشی کی صدا
یوں تو بہت تیز ہوا کرتی ہے آواز کی رفتار
لیکن کبھی کبھی
آواز کو کانوں تک پہنچتے پہنچتے
صدیاں لگ جاتی ہیں
اپنی ضرورت کے لئے بجائی گئی اس کی تالی
جانے کب سنائی دے

درد چاپدانوی

قصہ ڈیڑھ صدی کا

جو حشر خیز تھی ماضی میں وہ فضا دیکھو
فرنگیوں کی جفاؤں کا سلسلہ دیکھو
ہر ایک شہر میں اک تازہ کربلا دیکھو
پچاس سال سے پہلے کا آئینہ دیکھو

ہمارے ماتھے پہ تحریر تھی غلامی کی
وطن کے پاؤں میں زنجیر تھی غلامی کی

مجاہدین کا کردار یاد ہے کہ نہیں
وطن پرستوں کا ایثار یاد ہے کہ نہیں
قدم قدم رسن ودار یاد ہے کہ نہیں
جفائے حلقۂ اغیار یاد ہے کہ نہیں

یہی نہیں کہ ہوا کوئے یار کی نہ ملی
ظفر غریب کو دو گز زمین بھی نہ ملی

وطن کے واسطے ٹیپو کی تیغ لہرائی
شہید ہوگئی جھانسی کی لکشمی بائی
کئی مقام پہ حضرت محل بھی ٹکرائی
کسی کو اپنی جسارت نہ سازگار آئی

فرنگیوں کے وفادار سامنے آئے
ہر اک موڑ پہ غدار سامنے آئے

ہوئے وطن کے لئے ایک رہبرانِ وطن
غلط نہ ہو جو کہے کوئی ان کو جانِ وطن
یہ سب نے سوچا کہ جانے نہ پائے شانِ وطن
قریب تر ہوئے اربابِ کاروانِ وطن

ان ہی میں باپو تھے نہرو ابوالکلام بھی تھے
پٹیل و شوکت و جوہر سے نیک نام بھی تھے

سبھی کا نعرہ یہ تھا انقلاب زندہ باد
بہارِ شوق نے آکر کیا دلوں کو شاد
زہے نصیب غلامی سے ہم ہوئے آزاد
وطن سے چل دئے جتنے بھی تھے ستم ایجاد

فرنگیوں کو بالآخر یہاں سے جانا پڑا
ہم اہلِ ہند کے قدموں پہ سر جھکانا پڑا

خوشا کہ ختم ہوا انتظارِ آزادی
چمن چمن ہوا جشنِ بہارِ آزادی
نہ پوچھو رونقِ لیل ونہارِ آزادی
تھا سب کا عہد بپاسِ وقارِ آزادی

خوشی کی بزم سجانے کا وقت آپہنچا
حکومت اپنی بنانے کا وقت آپہنچا

کچھ اقتدار کے بھوکوں کا یہ تقاضا تھا
ہمارا نام وزیروں کی صف میں ہوتا تھا
یہاں کہاں کوئی قابل ہمارے جیسا تھا
بھری سبھا میں میں اپنا جواب تنہا تھا

صلاحیت ہے حکومت ہمیں چلانے کی
ہزار حیف نظر لگ گئی زمانے کی

میں اتحاد کی کڑیوں کو توڑ سکتا ہوں
خود اپنی پارٹی کا ساتھ چھوڑ سکتا ہوں
میں اپنے حق میں ہر اک ذہن موڑ سکتا ہوں
مخالفین کی گردن مروڑ سکتا ہوں

میں فرق ہندو و مسلم بھی خوب جانتا ہوں
کسی کا کیسے ہو سورج غروب جانتا ہوں

سکولرازم کا نعرہ ہے کھوکھلا میرا
کسی کا خون ہو اس میں زیاں ہے کیا میرا
سبھی کی نظروں میں اعلیٰ ہے مرتبہ میرا
حکومتوں کا گرانا ہے کھیل سا میرا

ہے م۔ہ میں تصادم مرے اشارے پر
انہیں ڈبو کے پہنچ جاؤں گا کنارے پر

وفا کی راہ سے راہِ خطا تک آپہنچے
یزیدی جتنے بھی تھے کربلا تک آپہنچے
سحر کے قافلے تپتی فضا تک آپہنچے
جو کانگریسی تھے وہ بھاجپا تک آپہنچے

یہ انقلاب حوالوں کے بعد آیا ہے
نہ جانے کتنے گھٹالوں کے بعد آیا ہے

جگدیش پرکاش

بانس کے پھول

کہتے ہیں
بانس میں ہر بارہ سال بعد پھول کھلتے ہیں
بانسوں کا پھولنا
کبھی خوش حالی کی علامت ہوتا ہے
کبھی بدحالی کی
ڈیڑھ سوسال پہلے بھی
اس سال بانس میں بور آیا تھا
بنگال کے سبزہ زاروں میں
بانسوں کے جھرمٹوں سے ایک مہک
پھوٹ پڑی تھی
لیکن اس مہک میں بارود کی بو تھی
جو بارک پور کی چھائی کے ایک سپاہی کی
بندوق سے نکل کر
سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی
وہ ادنا سپاہی تھے
جو محافظ بن گئے تھے ان قدروں کے
اس وقار کے
جسے ایک بیرونی طاقت
پامال کررہی تھی
ان ہی قدروں کا علم بردار بن گیا تھا
اس ملک کا ہر فرد
امیر، غریب، راجے زمیندار
اور دلّی کا لال قلعہ
ایک دوسرے کے شانہ بشانہ
یہ لوگ لڑ رہے تھے جنگ
ایمان اور ایثار کی بحالی کی جنگ

خودداری کی یہ لڑائی تھی
ظلم و جبر، مکر و فریب، نفرت اور تنگ نظری کی
فضا کے خلاف جنگ
جو آغاز بن گئی
سمندر پار کی اُس طاقت کے
تسلط کو ختم کرنے کا

بڑے آزمائش کے دن تھے وہ
گرمی کی لپیٹ میں زمین جھلس رہی تھی
آسمان آگ انڈیل رہا تھا
لیکن ایک جذبہ تھا
جو ہم جیسے عام انسانوں کو
ان بیرونی زنجیروں کو توڑ پھینکنے کا
حوصلہ دے رہا تھا

سوکھ گئے تھے درخت
کھیتوں کھلیانوں میں آگ پھیل گئی تھی
گلیوں، بازاروں، گول چوباروں
پر دہشت کا ماحول تھا
چوراہوں پر شہزادوں کے سر قلم کئے جا رہے تھے
ننگے درختوں پر انسانی لاشیں جھول رہی تھیں
لال قلعہ، خاموشی کی بساط پر سر جھکائے
دفنائی ہوئی مغلیہ تاریخ کی فاتحہ پڑھ رہا تھا
ہم اپنی جنگ ہار گئے تھے

اُس سال بھی شاید
بانسوں میں پھول کھلے تھے
جب لال قلعے کی فصیل پر
آزاد ہندوستان کا پرچم لہرایا تھا
جن میں ہم جیسے لوگ
گزری ہوئی صدی کے شہیدوں کے جانشین
تلاش کر رہے تھے ان پھولوں میں وہ خوشبو
جو زندگیوں میں
ایک خوبصورت احساس کا آغاز کرتی ہے
ہم ڈھونڈ رہے تھے انسانی قدروں میں
یک جہتی، ہم آہنگی اور محبت کی وہی خوشبو
جس کی تلاش کا آغاز
منگل پانڈے نے کیا تھا
بہادر شاہ ظفر نے جسے استحکام دیا تھا
ڈیڑھ سوسال پہلے!
آج 150 سال بعد بھی

ہم
اس گزرے ہوئے وقت کے جانشین
اس نسل کے علم بردار
کوشش کر رہے ہیں
بانس کے پھولوں کے پھر سے کھلنے کی
جن میں خوشبو ہو
ایک حسین شکل کی جو علامت بن جائے
اسی خوش حالی، یک جہتی، اعتماد اور قدروں کی
جن کا تصور ہم جیسے عام انسانوں نے کیا تھا
150 سال پہلے

جمال اویسی

ایک نظم

حقانی القاسمی کے نام

برادرم حقانی القاسمی مارچ 2007 میں دربھنگا آئے تھے۔ انہیں ایک سیمینار میں اپنا مقالہ پیش کرنا تھا۔ سیمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ یہ سیمینار 1857 کی ناکام بغاوت سے متعلق مختلف موضوعات پر مبنی تھا۔ حقانی القاسمی نے اپنا مقالہ جذباتی انداز سے پڑھا اور اسے پسند بھی کیا گیا۔ مقالہ کی روح یہی تھی کہ وہ 1857 میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کی نمود سن 1969 میں ہوئی۔ اس لئے ان کی روح اب تک کسی محبوس پرندے کی طرح چھٹپٹا رہی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کے سیاق وسباق میں بھی انھوں نے اپنے خاص طنزیہ اسلوب میں کارآمد باتیں کہی تھیں۔ میں نے ان کے تاثرات کو نظم کا جامہ پہنا کر ان ہی کے نام معنون کردیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے دیرینہ دوست اور بھائی حقانی القاسمی کو اس نظم کے ذریعہ صحیح داد وستائش مل جائے گی۔ جمال اویسی

اے مرے دوست تیری پیدائش
سن ستاون میں ہوگئی تھی، مگر
سن انہتر میں تیری آنکھ کھلی
تجھ کو اصرار ہے کہ تیرا وجود
زخم خوردہ ہے اور روح تری
اب بھی محبوس ہے غلامی میں
تجھ کو کیسے ملے گی آزادی
یہ سوال آج کی سیاست میں
کیسے پیدا کرے گی بے چینی
سن ستاون سے لے کر آج تلک
ہر پرستار قوم وملت کا
مقصدِ اولیں ہے زریابی
تجھ کو معلوم ہے کہ چرچل نے
یہ کہا تھا کہ اہلِ ہندستاں
ہوں گے آزاد جب غلامی سے
اپنی فطرت کے پھر سے ہوں گے غلام
یعنی پچاس سال بعد ان میں

قومی لیڈر بنیں گے غنڈہ گرد
تجھ کو معلوم ہو کہ چرچل کا
ایک ایک لفظ ہوگیا سچا
جتنے بے شرم ہیں سیاست داں
اتنے بے شرم رنڈی باز نہیں
آج کی زندگی گلوبل ہے
ارضِ ہندوستاں ہے اک بازار
ڈالر و پونڈ، درہم ودینار
پاس جس کے ہے وہ ہے عزت دار
اے مرے دوست سن ستاون میں
پھر سے واپس تو جا نہیں سکتا
خون اپنا بہا نہیں سکتا
اپنی محبوس روح ساتھ لئے
جیتے رہنا بھی اک اذیت ہے
تیری تحریر میں جو شدت ہے
اور تھوڑی سی جو بغاوت ہے
تیری تسخیر آدمیت ہے

شارق عدیل

رات کا جنگل

جگمگاتے ہوئے ہوٹل کے حسین کمرے میں
چند نوٹوں کے عوض
جشنِ جمہور کی رونق میں اضافہ کر کے
ایک موہوم اذیت سے گزر کر
رات کے تٹ پہ اترتے ہوئے
سناٹے میں
ایک مسمار بدن
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے پکارے کس کو
کوئی انسان نہیں
رات کے اس جنگل میں

عبدالسلام عاصم

غیر مشروط مشورہ

سنو! ایسا کرو
کچھ دیر چپ رہ کر
اب ان کو بولنے دو
جن سے اب تک تم مخاطب تھے

تمہاری سن چکی دنیا
سروں کو دھن چکی دنیا
مگر کچھ بھی نہیں بدلا
نہ تم خود ہوش میں آئے
نہ اپنے سننے والوں کی سماعت کو بچا پائے

مری مانو!
خدا کے واسطے خاموش ہو جاؤ
عجب کیا ہے
تمہیں بھی چین راس آجائے
ہم بھی دو گھڑی جی لیں

میرے خدا

نہ کربِ فقر نہ آزارِ بادشاہت سے
خدایا مجھ کو بچا عجز کی رعونت سے
لگی ہے آگ تری آخرت کی کھیتی میں
زمین کانپ رہی ہے وفورِ دہشت سے
تو خوب جان رہا ہے کہ چل رہی ہیں یہاں
کئی دکانیں ترے خوف کی تجارت سے
مہد سے تا بہ لحد جو تری امانت تھی
فدائی کھیل رہے ہیں اسی کی حرمت سے
اسے بھی خوار کئے جا رہے ہیں فرزانے
لقب میں جس کو نوازا تھا تو نے رحمتؐ سے
دلوں کے حال سے آگاہ کون ہے تجھ سا
ہمیں عبث ہیں ہراساں تری مشیت سے
مرے خدا میں تری مصلحت کا قائل ہوں
مگر ہوں پھر بھی پریشان اپنی فطرت سے
خطا معاف، مگر سن لے چھوٹے منہ کی بات
یہاں فسانے الگ ہیں تری حقیقت سے
خوشا جو دیتے نہیں تجھ پہ نفس کو ترجیح
وہ کامیاب زمانہ ہیں تیری حکمت سے

سوہن راہی

قاتل صدائیں

تخیل کی ننھی سی بنجر زمینیں
جہاں بوئے جاتے ہیں نفرت کے کانٹے
جہاں زنگ آلودہ کہنہ عقیدے
نمائش کی خاطر دو نالی سے نکلیں
جہاں رات دن کچھ پرانی کتابوں
کے باطن میں پلتی ہیں قاتل صدائیں
جہاں لمحے لمحے کے سود و زیاں میں
اجالے بھی تیرگی کے امیں ہیں
جہاں روپ کی دھوپ کے پل دو پل بھی
لہو کے تصور سے خالی نہیں ہیں
وجود بشر کے ہر اک حوصلے پر
سلگتے سے کا دھواں چھا گیا ہے
جہاں پھول پتوں کے نازک بدن کو
اگن لی برید ہ زباں چاٹ جائے
جہاں دندناتی ہوئی گولیوں سے
اجالوں بھری وادیاں ڈولتی ہیں
نگاہوں کے زندہ الاؤ کی لو میں
گھرانوں کی ویرانیاں بولتی ہیں

نظر آدمی کی پریشان ہو کر
سیہ کار دن کے اجالوں میں کھوئی
وہ شاداب و تنہا کھلے راستے جو
نئے وقت کے ساتھ قاتل بنے ہیں
حسیں مسکراتی ہر اک رہ گزر سے
کیوں بارود کہنہ
کی بو آرہی ہے
یہ تخریب کاری کی ڈائن جنوں میں
شراروں کی بارش میں لہرا رہی ہے
وہ پگڈنڈیوں سے گھنے سائے اکثر
جواں فکر لمحوں کے ماتم کو روئیں
وہ تنہائیوں کا بلکتا سا موسم
وہ ماتم کدے، وہ بہاروں کا مدفن
جہاں زندگی بھینٹ ہے سسکیوں کی
جہاں بن بلائی اجل قریہ قریہ
صدائے نفس منجمد چھوڑ جائے
جہاں ہر گھڑی بے وفا ہے، جو اپنے
پھٹے دامن دل کے تار الم سے
کفن چاہتوں کے سئے جا رہی ہے

لو! شعلوں کے غنچے اڑے پھر فلک میں
بساط خلا سے نئی چیخ ابھری
سیاہی کے سینے میں خنجر سے اترے
اجالے دماغوں کے گہنا گئے ہیں
کوئی چاند بن کر یہاں بھی تو دیکھے
اندھیرے شبوں کا بدن کھا گئے ہیں
کرن کوئی سورج کی رہ سے بھٹک کر
تشدد کے خوں رنگ صحرا میں اترے
کوئی پھول مہکے کوئی گیت کھنکے
کوئی بول میٹھا دلوں میں تو اترے
کوئی نقش ابھرے محبت کے غم کا
کوئی زندگانی کا مفہوم سمجھے
یہ اونچے، یہ تیکھے، نکیلے منارے
یہ دھرتی سے اٹھتی ستاروں کی جانب
پرستش کدوں کی سیہ رنگ قوسیں
تراشے ہوئے پتھروں کی یہ لاشیں
یہ پیڑوں کے تن جو مثلث کی صورت
اٹھائے ہوئے عہد ماضی کے قصے
مقدس صحیفے، مقدس کتابیں
کیا ان سے تو بیزار انساں نہیں ہے

OO

گلشن کھنہ

پیارے ہندوستان

رہے سلامت سایہ تیرا پیارے ہندوستان
تیرے نام سے روشن ہوگی ہم سب کی پہچان

ہندو مسلم سکھ عیسائی کوئی ہو انسان
بھارت ہے ہم سب کی ماتا ہم اُسکی سنتان
عزت تیری جان سے پیاری پیارے ہندوستان
تیرے نام سے روشن ہوگی ہم سب کی پہچان

میرے دیش کے دشمن لوگو کیسے ہو نادان
ہندوستاں کو کھا جاؤ گے؟ یہ کیسا امکان
رکشا تیری ہم کریں گے پیارے ہندوستان
تیرے نام سے روشن ہوگی ہم سب کی پہچان

کچھ بھی ہوں حالات ہمارے ہوں گے نہ دلگیر
ہم باپو کی راہ میں چل کر بدلیں گے تقدیر
تیری آن اور شان کی خاطر جان کریں قربان
تیرے نام سے روشن ہوگی ہم سب کی پہچان
رہے سلامت سایہ تیرا پیارے ہندوستان

آؤ سب مل کر...

آؤ سب مل کر اپنے دیش کو سورگ بنائیں
جہاں جہاں اندھیارا دیکھیں پیار کے دیپ جلائیں
اٹھو پیار کا بادل بن کر دنیا پر چھا جائیں
جیون کی ہر پگڈنڈی پر امرت رس برسائیں
آؤ سب مل کر اپنے دیش کو سورگ بنائیں

آج وطن کی دھرتی تم سے محنت مانگ رہی ہے
علم شرافت قربانی کی دولت مانگ رہی ہے
امن، خلوص محبت جیسی طاقت مانگ رہی ہے
چلو چلو اس دھرتی کے ہر ذرے کو مہکائیں
آؤ سب مل کر اپنے دیش کو سورگ بنائیں

دیکھو اپنے دیش میں ساتھی بھوک نہ رہنے پائے
اس دھرتی پر انسانوں کا خون نہ بہنے پائے
دیکھو اب تاریخ ہمیں غدار نہ کہنے پائے
روٹھے ہوئے ہیں جو ہم سے اُن کو گلے لگائیں
آؤ سب مل کر اپنے دیش کو سورگ بنائیں

اسی دیش میں نانک نے تھا امن کا نغمہ گایا
اس دیش میں گوتم نے اہنسا کو اپنایا
اس دیش میں باپو نے بھی پریم کا دیپ جلایا
نگر نگر میں چلو ہم بھی پریم کے دیپ جلائیں
آؤ سب مل کر اپنے دیش کو سورگ بنائیں

رئیس الدین رئیس

یادگار سال

ہے مبارک جنگِ آزادی کا سال
کیونکہ اس برس میں
جو تھی اک مظلوم قوم
سہہ رہی تھی پشت پر کوڑوں کی مار
اور وہ ظالم ستم گر
آئے انگلستان سے
ہند میں کس شان سے
رکھ کے اہلِ ہند کے شانوں پہ جُوا جبر کا
اور مان کر ہم کو غلام
کر رہے تھے ہم سے نفرت کا سلوک
اور مظلوم وطن
سینکڑوں سالوں سے جو سہتے رہے
ان کے ستم
آخرش ان کے خلاف
ایک ہوکر ڈٹ گئے
اور دانت کھٹے کر دیئے
غاصبوں کو کاٹ ڈالا
خون کے دریا بہا کر رکھ دیئے

وہ مگر اس کو غدر کہتے رہے
تھی جو آزادی کی جنگ
وقت نے پھر فیصلہ جو بھی کیا
مل نہ پائی کامیابی جنگ میں
بن گیا تھا شہر دتی قتل گاہ
جو ملا پھانسی چڑھا ڈالا اسے
آدھے لاکھ انسان مردہ کر دیئے
دتی اک شہرِ خموشاں بن گیا
شاہ قیدی بن گئے
اور کٹ گئے بیٹوں کے سر
ظلم سب کچھ سہہ کے بھی اہلِ وطن
فخر کرتے ہیں مبارک سال میں
جنگِ اوّل ہم نے ہی انگریز سے
حوصلے کے سنگ لڑی تھی
شان سے!!

منور احمد کنڈے

سال جنگ آزادی 1857

سارا ہندوستان جور و جبر و استبداد سے
تھا ہراساں وقت اور بے وقت کی بے داد سے
ڈھا رہی تھی قہر اہل ہند پر دشمن کی فوج
کچھ علاقہ ہی نہ تھا جس کو کسی فریاد سے
آخرش میرٹھ سے اٹھی اک صدائے احتجاج
توڑ ڈالے سب نے مل کر سارے انگریزی رواج
ایک ہوکر سب مجاہد جانبِ دتی بڑھے
تاجدار مغلیہ نے رکھ لیا پھر سر پہ تاج
سال اٹھارہ سو ستاون تھا آزادی کا سال
جنگِ آزادیٔ ہندوستان ہے اپنی مثال
اک بڑی طاقت سے بھڑ کر ہو گئے کتنے شہید
کب تلک بنتے مجاہد توپ کے گولوں کی ڈھال
جو فرنگی غرق ئے تھے محو تھے جو جنگ میں
مورچوں پر آ ڈٹے تھے پھر سے فوجی رنگ میں
آخرش جانباز پسپا ہو گئے اس جنگ میں
آخرش جانباز پسپا ہو گئے اس جنگ میں
پھانسیاں دیں اور شہیدوں کے لہو چاٹے گئے
شاہ کے بیٹوں کے سر تلوار سے کاٹے گئے
شاہ ملک بدر ہوکر قید تھے رنگوں میں
اور ادھر دتی میں لاشوں سے محل پاٹے گئے
گرچہ ناکامی ملی پھر بھی دکھایا حوصلہ
سرفروشانِ وطن کیا شے ہیں یہ جتلا دیا
سال اٹھارہ سو ستاون لکھا تاریخ میں
غاصبوں سے کتنی نفرت ہے ہمیں دکھلا دیا

جعفر ساہنی

صبحِ بہاراں زندہ تھی

ہر سمت تھی بے چینی
پتوں کی ہواؤں میں
آواز پریشاں تھی
پرواز پرندوں کی
بے ربط سی لگتی تھی
منہ موڑ کے پھولوں سے
خوشبو تھی کہیں غائب
شعلوں کا لئے لہجہ
سورج کی تمازت تھی
اور غیظِ فرنگی سے
تھا اہلِ وطن کا دل
ہر موڑ پہ لرزیدہ
ذلت و خواری سے
افسردہ و شرمندہ
پر جبر و تشدد کی
رہتی یہ فضا کب تک
آفت کی گھٹا کب تک
اک روز[1] بغاوت کا
طوفان اٹھا آخر
تیور لئے برہم
بارک پور کی چھاؤنی میں
جب ویر سپاہی منگل پانڈے نے
جھکنے سے انکار[2] کیا
انگریزی ظلم پہ اس نے
کھل کر وار کیا
خود کو قربان[3] کیا

قربانی پانڈے کی
دے کر کے پیغام گئی
''انگریزی طیش کے آگے
گھٹنے مت ٹیکو
غاصب کو تاراج کرو
ظالم کو ناس کرو
توڑو زنجیر غلامی کی
آزاد وطن کو دو آواز''
میرٹھ نے تب خم ٹھونک کے
دس مئی کو اعلان کیا
''بھارت کی دھرتی ہماری ہے
مالک ہیں ہمی اس کے
انگریزو یہاں سے بھاگو
چھوڑ کے بھاگو ہندوستاں!''
میرٹھ سے پھر
پُر جوش بغاوت
پہنچی دہلی کے آنگن تک
اور شہر دگر کو بھی
پیغام دیا اس نے
تیار کیا اس نے
دہلی کے بہادر شہ کی طرز پہ
نانا صاحب، لکشمی بائی
اور تانتیا ٹوپے بھی
آزادی کا سہانا موسم
دیکھ رہے تھے سپنوں میں
لہو کی چھینٹیں

کرنے لگی تھیں
روشن ایمان وفاؤں کا
انجام برا انگریزوں کا
تھے کنور سنگھ بھی آزردہ
فرنگی دہشت سے
ہوا کی دشمن یورش سے
فریبی رنگیں کرنوں سے
غداری کے لمحوں سے
ایسے میں آواز کہاں تک
جاتی انقلابوں کی
بیٹھی تاک میں جب تھی
شاطر چال فرنگی کی
لاشیں بچھی تھیں ہر جانب
آگ لگی تھی شہروں میں
لہو میں لپٹی سڑکیں تھیں
گلی میں تھا کہرام بپا
شیطانی ظلم سے یوں تو
ہم سب ہار گئے تھے لیکن
صبحِ بہاراں زندہ تھی
ہماری آنکھوں میں
سانسوں میں تھی خوشبو
آزاد گلستاں کی
خوشیاں دیتے
دلکش ہندوستان کی

1۔ 29 مارچ 2۔ چربی لگے کارتوس کے استعمال سے انکار
3۔ 8 اپریل کو پھانسی دے دی گئی

وسیم ملک

دھواں اب بھی بہت ہے

چراغ علم وفن روشن ہیں لیکن
افق احساس کا دھندلا رہا ہے
خدا جانے یہ کیسی روشنی ہے
اندھیرا جس پہ چھایا جارہا ہے
کہیں دہشت کہیں ہے قتل وغارت
کہیں ابلاؤں کی عصمت دری ہے
شریفوں کا یہاں میلا ہے لیکن
شرافت منہ چھپائے رو رہی ہے
لیاقت اب بھی ہے محتاجِ رشوت
بتاتی ہے جرائم کی یہ کثرت
کہاں ہے جانے گاندھی کی اہنسا
جدھر دیکھو ادھر ہے بربریّت
کہیں مندر کہیں مسجد کا جھگڑا
یہاں بندے خدائی کررہے ہیں
رذالت اور وحشت کی نمائش
بہ زعمِ پارسائی کررہے ہیں
زباں پر امنِ عالم کی ہیں باتیں
مگر انسانیت مفلوج سی ہے
نہیں ہیں آج چنگیز و ہلاکو
مگر چنگیزیت اب بھی وہی ہے
چراغ علم وفن روشن ہیں لیکن
جہالت کا نشاں اب بھی بہت ہے
جو زہریلا دھواں کل بھی بہت تھا
وہ زہریلا دھواں اب بھی بہت ہے

رفیق شاہین

'سالِ تاریخ ساز'
1857

سینکڑوں سالوں سے سہتے آئے تھے
ہم غلامی کے ستم انگریز سے
اور پھر اٹھارہ سوستاون میں
دشمن کے خلاف
ہم نے مل کر چھیڑ دی بھرپور جنگ
ہو کے بالاتر ہر اک انجام سے
سینکڑوں لاشیں بچھادیں ہم نے بھی
ان کی بنیادیں ہلادیں ہم نے بھی
کب تلک شمشیریں لہراتی ہوئی
توپ کے لوگوں پہ دکھلاتیں اثر
آخرش انجام کار
رہ گئے ہم ہار کر
جنگ آزادی کی خاطر قوم نے
آدھے لاکھ انسان قرباں کردیے
شہر دلّی بن گیا لاشوں کا شہر
شاہزادوں کے بھی سر کاٹے گئے
شاہ سے دوگز زمیں بھی چھین لی
الغرض انگریز نے
جو بھی ممکن تھے ستم ڈٹ کر کیے
اور جو کچھ بھی ہوا
تاریخ میں محفوظ ہے
مبارک سال ہے لیکن گواہ
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

خالد

ڈیڑھ سوواں جشنِ آزادی

ایک طوفاں دبا تھا سینوں میں
ایک آتش فشاں کا عالم تھا
ایک آندھی تھی گویا صرصر کی
اوراک امتحاں کا عالم تھا

ایک لاوا سا پک رہا تھا کہیں
اک جہنم دبا تھا سینے میں
پیاس بجھتی نہیں تھی پانی سے
تھا مزا خوں جگر کا پینے میں

کہ اچانک دلوں کی بستی میں
ایک چنگاری سی بھڑک اٹھی
چربی سور کی اور گائے کی
کارتوسوں میں جو پھڑک اٹھی

دفعتا چھاؤنی میں میرٹھ کی
بج اٹھا اک بگل بغاوت کا
ایسے اٹھے جواں کفن بردوش
جیسے دن آگیا قیامت کا

پہلے منگل نے یوں کیا انکار
ہم انہیں منہ نہیں لگائیں گے
یہ صدا پہلی حریت کی تھی
ہنستے ہنستے گل کٹائیں گے

اس پہ لبیک جب کہا سب نے
مادرِ ہند نے لی انگڑائی
کاٹ ڈالیں گے ساری زنجیریں
سب نے مل جل کے یہ قسم کھائی

لال قلعے پہ آئے سب غازی
اپنا قائد ظفر کو ٹھہرایا
سارا ہندوستان ایک ہوا
اپنا جھنڈا قلعہ پر پھیرایا

بخت خاں ہو کہ تاتیا ٹوپے
دونوں کا ایک ہی اشارہ تھا
ایسے موقعہ پہ پیچھے رہ جاتے
نانا صاحب کو کب گوارا تھا

سارے بھارت کے رہنے والوں نے
کھیلی اپنے ہی خون سے ہولی
جان دی سب نے آن کے بدلے
سب زبانوں پہ ایک تھی بولی

اپنے اندر ہمیں خبر ہی نہ تھی
میر جعفر تھے میر صادق تھے
کتنے بے چند تھے بکاؤ یہاں
دل سے انگریز کے موافق تھے

بادشاہ قید ہوگئے آخر
اور شہزادے دونوں کام آئے
کیا بتائیں کہ مرنے والوں میں
کتنے لوگوں کے لب پہ نام آئے

نیو آزادی کی مگر رکھ دی
مرنے والوں نے اپنی نعشوں پر
کب چلا زور زندگی تیرا
دنیا داری کے ان تماشوں پر

آخرش نوے سال کے اندر
جنگ آزادی جیت لی ہم نے
بیڑیاں کٹ گئیں غلامی کی
اپنی شہزادی جیت لی ہم نے

آؤ مل جل کے اب منائیں ہم
ڈیڑھ سوواں پہ جشن آزادی
ملک کو اپنے آگے جائیں
فرض اپنا یہی ہے بنیاد کی

OO

گلزار

کامن مین

تلاش ہے ایک گم شدہ کی
پچاس پچپن کی عمر ہوگی
قمیص کوئی نہیں بدن پر
اڑا اڑا رنگ زردی مائل
اداس آنکھیں ہیں، خشک رہتی ہیں اب ہمیشہ
بہت سے تل ہیں بدن پہ جیسے سلائیوں سے سیا گیا ہو
بھویں کئی بار آگ میں جل چکی ہیں اس کی
مرا پڑوسی تھا ہم سفر تھا...

وہ آدھے رستے تلک میرے ساتھ ہی تھا
پھر اس کا قد دھیرے دھیرے کم ہونے لگ گیا تھا
وہ دور تک جو افق نظر آتے تھے وہ دھندلانے لگ گئے تھے
نظر سے امید کی چمک بھی اتر رہی تھی
دلاسے دے کر
کبھی کبھی اس کو کندھوں پر لے کے بھی چلا پر
وہ اپنے پیروں پہ چلنے کی ضد نہ چھوڑتا تھا

کلائی میری گرفت سے چھٹ گئی ہے اس کی
وہ شہر کے اس ہجوم میں گم ہوا ہے شائد
تلاش ہے عام آدمی کی
تلاش ہے مجھ کو گم شدہ کی!!

اٹھارہ سوستاون

1857

نوائے امروز

افسانے

ناول

آزادی

فاطمہ تاج
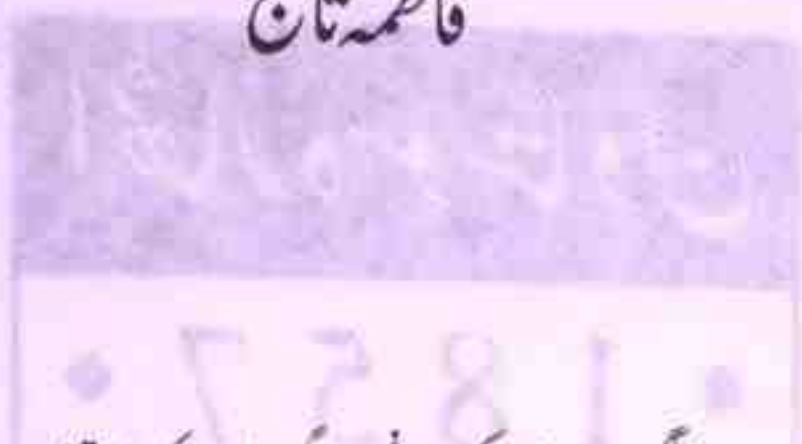
شکیلہ چھالیہ کاٹتے کاٹتے بے چین سی ہونے لگی۔ سامنے رکھے چراغ کی مدھم لو بتا رہی تھی کہ چراغ میں تیل کم ہے۔ شہر کے محلوں میں اندھیروں کے اجگر بل کھا رہے تھے۔

ننھا ببلو پاس ہی سویا پڑا تھا۔ حالات سے بالکل بے خبر۔

سناٹوں کے تنے ہوئے خیمے میں کرب اور خاموشی کا احساس لئے زندگی سہمی سہمی سی کسی انقلاب کی منتظر تھی۔

دوسرے گاؤں سے جا ملنے والے راستے کے درمیان کاکی کو شکیلہ کھیت میں اس وقت ملی جب شام کے رخسار تانبے کی طرح تمتما کر شعلہ نما ہو چلے تھے۔ ہر شئے پر سرخی نمایاں تھی۔ تیرہ، چودہ برس کی لڑکی منتشر سے لباس میں سوکھے کھیت کے درمیان ایک پتھر پر سر رکھے پڑی تھی۔ کاکی ویدجی کے پاس دوائی لینے گئیں، جب لوٹیں تو سسکیاں سن کر رک گئیں۔

لڑکی سے نام پوچھا تو اس نے کہا "شکیلہ" اس نے پوچھنے پر بتایا کہ یہاں سے کچھ دور ایک بستی میں فرنگی لوگوں نے دن دھاڑے کئی گھر جلا ڈالے کئی لوگوں کی گردنیں دھڑ سے الگ کر دیں (جن میں اس کے بابا بھی تھے) ماں تو کچھ پہلے ہی گم ہو گئیں تھیں لوگوں کا کہنا تھا کہ فرنگیوں نے انہیں کہیں لے جا کر مار ڈالا ہوگا۔ فرنگی سب سامان لوٹ کر لے گئے ایک فرنگی شکیلہ کے پیچھے لگ گیا اور اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر اسے زبردستی لاد کر اس کھیت میں لے آیا اور... وہ پھر زار زار رونے لگی۔

نگہباں تو سائبانوں میں ہوتے ہیں کھلے آسمان تلے بھلا کون کسی کی نگہبانی کر سکتا ہے؟ اور ایسے وقت میں جب کہ ملک بھر میں گھوڑوں کی ٹاپیں، گولیوں کی آوازیں، انقلابی نعروں میں دب رہی ہوں...

سلطنتیں ختم ہو رہی تھیں راجاؤں اور رانیوں کے 'مکٹ' فٹ بال بنائے جا رہے تھے، دستاریں ہوا میں اچھالی جا رہی تھیں، نسوانیت کے گریباں چاک اور تہذیب کے دامن تار تار ہونے لگے تو وقت نے انقلاب کا مطالبہ شروع کیا اور انقلاب آسانی سے تو نہیں آتا۔

بڑے انقلاب سے پہلے چھوٹے چھوٹے کئی انقلاب آتے ہیں، جس طرح زلزلے سے پہلے ہلکا سا ارتعاش اور گڑگڑاہٹ اور پھر فلک بوس عمارتوں کے ملبہ کا منظر... جیسے کہ طوفانی تند موجوں سے پہلے لہروں کا اضطراب اور پھر ڈوبتے ہوئے سروں کا ہجوم...

یہ انقلاب تو سارے ملک میں بپا ہو رہا تھا۔ نہ یہ زلزلہ تھا نہ طوفان۔ یہ انقلاب تھا جہاں ہر شخص اپنا سر کٹانے کے لئے خوشی سے آمادہ تھا۔ مسجدوں سے، مندروں اور گردواروں سے نکلنے والے ہند کی زمین کے شیدائی "ہند کی ایکتا" کے محافظوں نے برسوں سے حکمراں فرنگیوں کو نکال باہر کرنے کا عزم کرتے ہی عمل شروع کر دیا۔ جوان، بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں، غریب، امیر، ہندو، مسلمان سب اس جادۂ حیات کی طرف چل پڑے جہاں آزادی تھی یا موت...!

کاکی شکیلہ کو گھر لے آئیں۔ کاکی ودھوا تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر کا ایک کمرہ رشید کو دے رکھا تھا۔ رشید ہاتھ کا رکشا چلایا کرتا۔ اسے غربت نے شادی جیسے اقدام سے روکے رکھا تھا۔ کاکی نے رشید کی منت سماجت کر کے شکیلہ کا نکاح محلہ کے مولوی صاحب کو بلوا کر رشید سے کروا دیا... وقت کا پہیہ رشید کے رکشا کے پہیئے کی طرح گھومتا رہا۔ ٹھیک نو ماہ بعد رشید کے گھر اندھیرے کمرے میں چاند جگمگا اٹھا، شکیلہ نے ببلو کو جنم دیا۔ کاکی خوش ہو گئیں۔

"ہے بھگوان! تم بڑے دیالو ہو، بڑے ہی دیالو ہو، سچ مچ تم نے کایا پلٹ دی..." ببلو گورا چٹا نیلی آنکھیں، سنہرے بال، بالکل انگریز کی طرح تھا۔ اور پھر... جنگِ آزادی چھڑ گئی۔ ببلو کی طرح جنگ بھی بڑھنے لگی،

ویران دن، پریشان راتیں، کبھی سناٹے، کبھی دھماکے...

ایک دن

''کاکی! میں جارہا ہوں۔''

رشید نے کاکی کے آگے ہاتھ جوڑے۔

''کہاں، رشید؟''

کاکی نے پوچھا

''کاکی! میں آزادی لینے جارہا ہوں...''

''مگر، کس سے لوگے آزادی؟ کون دے گا تمہیں آزادی؟''

کاکی ہنس پڑیں...

''جب قیدیوں پر ظلم کیا جاتا ہے تو زنجیریں خود ٹوٹنے لگتی ہیں اور پھر آزادی مل جاتی ہے، شکیلہ اور ببلو کا دھیان رکھنا کاکی! خدا حافظ...''

رشید چلا گیا۔

آزادی کے لئے یہ عجیب جنگ تھی۔

زندگی اپنے سینے پر دانستہ گولیاں کھا رہی تھی۔ توپ کے آگے ہاتھ باندھے عمداً کھڑی تھی۔ فوجیوں کے گھوڑوں تلے زندگی خود ہی دبی جارہی تھی۔ کرفیو زدہ اندھیرے میں عزت آبرو کا دامن تار تار کیا جارہا تھا۔ گلی گلی قیامت کا منظر، دروازے، کھڑکیاں سبھی بند، نہ ہوا کو اندر آنے کی اجازت نہ روشنی کو باہر جانے کا موقع...

شکیلہ تخلیق کے کرب میں مبتلا، پریشان، و بے قرار... ہر جاتی ہوئی سانس فغاں، آتی ہوئی سانس دبی دبی سی چیخ... کاکی پچھواڑے کے دروازے سے دائی کو بلا لائیں۔

ببلو جاگ گیا تھا۔

''کاکی! امی کو کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں بیٹا کچھ نہیں، تو آنگن میں کھیل جا کر۔''

''نہیں، مجھے وہاں ڈر لگتا ہے، فرنگی نے دیکھ لیا تو مجھے پکڑ لے گا۔''

کاکی نے دل ہی دل میں کہا، فرنگی کا بیٹا ہو کر فرنگی سے ڈرتا ہے۔

کاکی ببلو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے آئیں۔

''کاکی! میرے ابو جی کب آئیں گے؟'' ببلو پوچھ رہا تھا۔

''بیٹا! وہ آزادی لینے گئے ہیں آزادی ملتے ہی آجائیں گے۔'' کاکی نے سمجھایا۔

''آزادی کا مطلب کیا ہے کاکی؟''

اسی لمحہ شکیلہ کے کمرے سے معصوم چیخ سنائی دی...

...ٹیاں، ٹیاں...

جیسے کوئی چابی کا کھلونا...

انسان قدرت کا کھلونا ہی تو ہے۔ شکیلہ کی روح اسی وقت پرواز کر گئی۔

ننھے ببلو نے صحن میں لکڑی کے بنے دروازے کے چھوٹے سے سوراخ سے باہر جھانک کر دیکھا بہت سارے لوگ ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔

وہ دوڑا دوڑا کمرے میں گیا۔ کاکی کے ہاتھ میں ننھی سی گڑیا ''ٹیاں ٹیاں'' کر رہی تھی۔

ببلو نے گڑیا کو دیکھ کر کاکی سے پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

کاکی نے آنسو بھری آنکھیں معصوم ببلو کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا... آزادی...

ڈاکٹر بابر رشید نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں آزادی کے تاریخی باب میں اپنے ماں باپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ''آزادی میری ماں کی دین ہے آزادی میری بہن ہے آزادی میرے ابو جی کی نشانی ہے میں اپنی آزادی کو کبھی...''

ڈاکٹر بابر رشید جن کا ہندوستان کے نامور ریسرچ اسکالرس میں شمار ہوتا ہے لندن یونیورسٹی میں اپنی تاریخ ساز علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اپنے ملک کی عزت کا پرچم ہاتھ میں لئے ان کی انگریز بیوی ہندوستانی لباس میں ان کے قدم سے قدم ملائے وفا کا ثبوت دے رہی ہے۔ ان کی بہن نے وکالت کے بعد ہندوستان ہی میں رہ کر 'انجمن آزادیٔ نسواں' کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے حکومت سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ عورت کی توہین کرنے والوں کے لئے سخت سے سخت سزا تجویز کی جائے...!!

OO

آخری کنگورہ

سلام بن رزاق

وہ اپنے نیشمن رئیل اسٹیٹ ایجنسی کے آفس میں بیٹھا کسی کسٹمر کی فائل اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ اُس کا نوکر بابو اسٹول پر بیٹھا اخبار کا معمہ حل کرنے میں منہمک تھا۔ اتنے میں ایک سیاہ رنگ کی کوالیس آفس کے سامنے آ کر رُکی۔ کار سے تین افراد اُترے۔ اُن کا لباس اور حلیہ بظاہر عام لوگوں جیسا ہی تھا مگر ان کے چہروں کا سپاٹ پن، ان کے سخت گیر رویئے کا غماز تھا۔ ان میں سے ایک کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ دوسرے کی بڑی سی مونچھ تھی اور تیسرے کے بائیں گال پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ اُنہوں نے گردن اٹھا کر آفس کے سائن بورڈ پر نگاہ ڈالی، مونچھوں والے نے چشمے والے کی طرف دیکھا، چشمے والے نے گردن کو خفیف سی جنبش دی اور دونوں دفتر میں داخل ہو گئے۔ وہ جس کے بائیں گال پر زخم کا گہرا نشان تھا، پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دائیں بائیں ایک اُچٹتی مگر چوکنی نگاہ ڈالتا ہوا باہر ہی رُک گیا۔ دونوں کے آفس میں داخل ہوتے ہی بابو ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں اس کے میز کے سامنے کھڑے اُسے گھورنے لگے۔

"یس...؟" اس نے فائل بند کر دی اور ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"محمد علی کون ہے؟" سیاہ چشمے والے نے استفسار کیا۔

"میں ہوں۔ مگر آپ لوگ؟"

"یہ آفس تمہارا ہے؟"

"جی... مگر آپ؟"

چشمے والے نے سرد لہجے میں کہا۔ "پولس"

پولس کا نام سنتے ہی محمد علی جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھئے"۔ اس نے سامنے پڑی خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" سیاہ چشمے والا اُسی خشک لہجے میں بولا۔

"کہاں؟"

"پولس چوکی"

"کیوں؟"

"چلو..." مونچھ والا میز کے پیچھے پہنچ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"مگر کیوں؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔

"انکوائری"

"کس سلسلے میں؟"

"بم بلاسٹ..."

"اوہو..." اس نے پُر تشویش لہجے میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"پوچھئے کیا پوچھنا ہے؟"

"یہاں نہیں... پولس چوکی میں"

"مگر یہ میرے دھندے کا ٹائم ہے۔ میں شام کو پولس چوکی آ جاؤں گا۔"

"چلو تھوڑی دیر میں واپس آ جانا۔" چشمے والا بولا۔

"مگر سر! اس وقت..." اس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ تبھی مونچھ والا اس کے کاندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالتا ہوا قدرے سختی سے بولا۔ "چلو۔"

محمد علی نے قدرے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"چلتا ہوں، آپ کاندھے پر سے ہاتھ ہٹائیے۔"

مونچھ والے نے چشمے والے کی طرف دیکھا۔ چشمے والے نے لمحے بھر کے توقف کے بعد گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔ مونچھ والے نے اس کے کاندھے پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا بابو کی طرف مڑا جو پریشان سا کھڑا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''اگر مسٹر عثمانی آئیں تو انہیں سلور پارک کا فلیٹ دکھا دینا۔''

بابو نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ منہ سے کچھ بولا نہیں۔

وہ اُن کے ساتھ آفس سے باہر آ گیا۔ اس نے کنکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کی دکان والے اپنی اپنی دکانوں کے دروازوں میں کھڑے انہیں تجسس آمیز دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ شاہین بک ڈپو والے سید صاحب کی آنکھوں میں تجسس کی پرت کے نیچے ہلکی سی خوف کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ کوالیس میں آ کر بیٹھ گیا۔ چشمے والا سامنے ڈرائیور کی بغل میں بیٹھ گیا۔ مونچھ والا اور وہ جس کے بائیں گال پر زخم کا گہرا نشان تھا دونوں پچھلی سیٹ پر اس کے دائیں بائیں اس سے سٹ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے اس طرح چپک کر بیٹھنے سے ان کے پسینے کی بُو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اُسے وحشت سی ہونے لگی۔ وہ اُن سے ذرا سرک کر بیٹھنے کے لئے کہنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں ہوئی۔ کار میں بیٹھنے تک اس کا ذہن کسی بھی وسوسے سے پاک تھا مگر اب اس بند کوالیس میں ان دو پولس والوں کے درمیان یوں سکڑ سمٹ کر بیٹھنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک موہوم سا اندیشہ کسی سنپولے کی طرح رینگنے لگا۔ کوالیس پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اس نے دائیں بائیں چور نگاہوں سے دیکھا۔ مونچھ والا اور گال پر زخم کے نشان والا دونوں سامنے نظریں جمائے ساکت و صامت بیٹھے تھے۔ اتنے میں اس کا موبائل بجا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا مگر اس سے پہلے کہ وہ موبائل پر بات کرتا۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھے چشمے والے نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ تم فی الحال موبائل پر بات نہیں کر سکتے۔''

چشمے والے کا جملہ پورا ہونے سے پہلے اس کے دائیں بیٹھے مونچھ والے نے اس کے ہاتھ سے موبائل اُچک لیا۔

''یہ غلط ہے۔'' اس نے مزاحمت کی۔ جواب میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ تینوں خاموش تھے۔ مونچھ والے نے اس کے موبائل کا سوئچ آف کر کے اپنے پاؤچ میں ڈال لیا، وہ پریشان ہو گیا۔ اسے صریحاً اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دبے لہجے میں خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''میں ایک عزت دار شہری ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ آپ مجھے پوچھ تاچھ کے لئے لے جا رہے ہیں۔ میں بنا حیل حجت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا آپ کے ساتھ پورا تعاون کر رہا ہوں۔ پھر اس طرح میرا موبائل چھین لینے کا مطلب؟ آپ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتے۔ مجھے اپنے گھر فون کرنا ہے۔ پتا نہیں چوکی میں کتنی دیر لگے۔ میرے گھر والے پریشان ہو سکتے ہیں۔''

اس نے دیکھا وہ تینوں اسی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ ان پر اس کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ ان کے چہرے اس قدر سپاٹ تھے کہ لگتا تھا انہوں نے اس کی تقریر کا ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ اس نے اپنی آواز میں قدرے اعتماد پیدا کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

''سن رہے ہیں آپ لوگ! میں اپنے گھر فون کرنا چاہتا ہوں۔''

گال پر زخم کے نشان والا غرّایا۔ ''اے! ایک بار کہہ دیا نا تو ابھی فون نہیں کر سکتا۔''

''مگر کیوں؟ میں فون کیوں نہیں کر سکتا؟ اب مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ آپ لوگ پولس والے ہیں بھی یا نہیں۔''

مونچھ والے نے اُسے گھور کر دیکھا اور نہایت حقارت سے بولا۔

''تو... تو اب ہم سے پولس والا ہونے کا ثبوت مانگے گا؟''

''کیا مجھے نہیں مانگنا چاہئے؟ مجھے اس کا پورا حق ہے۔ بتایئے آپ لوگ کون ہیں؟ اور مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

آگے بیٹھا چشمے والا دفعتاً مڑا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سخت لہجے میں بولا۔

''اے چپ! ایک دم چپ!! اب چوکی آنے تک تو ایک لفظ نہیں بولے گا۔''

وہ چپ ہو گیا۔ بلکہ اچھا خاصا سہم گیا۔ کیونکہ اب وہ لوگ تو تکار پر اتر آئے تھے۔ خفا ہونے پر ہاتھ بھی چھوڑ سکتے تھے۔ اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور چہرے سے کسی بھی قسم کا تاثر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ اب وہ چوکی آنے تک کچھ نہیں بولے گا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ ان لوگوں کے منہ لگنا، ذلت اٹھانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور سیٹ کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کار رُکی۔ وہ تینوں نیچے اترے۔ اسے بھی اترنے کو کہا گیا۔ وہ چپ چاپ نیچے اتر آیا۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ ان کی کوالیس ایک پرانی دو منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی تھی، جس پر دیوناگری میں نیشنل ہائے وے پولس چوکی لکھا تھا۔ پاس ہی ایک پولس وین اور ایک جیپ گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ عمارت کی بائیں جانب قبرستان تھا اور دائیں طرف فاصلے سے اکا دکا عمارت نظر آ جاتی تھی۔ چاروں طرف ایک منحوس سناٹا سا پھیلا تھا۔ قریب دور دور کوئی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ پولس اسٹیشن تو اس کے گھر سے بہت دور ہے۔ اس کے محلے میں بھی تو ایک پولس اسٹیشن تھا پھر اسے اس دور افتادہ پولس اسٹیشن کیوں لایا گیا؟ اس کے ذہن میں اب سوالات ڈراؤنی شکلیں اختیار کرتے جا رہے تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے متواتر نشر ہونے والی ٹی وی کی خبریں اور اخباروں کی سرخیاں اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کرنے لگیں۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی جو منظر اسے نظر آیا وہ اس کے ہوش اُڑانے کے لئے کافی تھا۔ یہ ایک ہال نما بڑا سا کمرہ تھا جس میں کم از کم پچیس تیس افراد، جن میں زیادہ تر نوجوان تھے فرش پر اُکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بدن قمیص کرتے سے بے نیاز تھے اور ان کی ننگی پیٹھیں پسینے سے تر تھیں۔ ایک پولس انسپکٹر اپنے سامنے میز پر ایک رجسٹر کھولے ایک ایک کا نام اور پتا پوچھ کر رجسٹر میں لکھتا جارہا تھا۔ چشمے والا سامنے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ مونچھ والا اور گال پر زخم کے گہرے نشان والا اسے گھیرے میں لئے ہوئے اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ زینہ طے کرنے کے بعد وہ لوگ ایک گلیارے سے گزرنے لگے جس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے دروازے باہر سے مقفل تھے مگر اس نے ان میں سے بیشتر کمروں میں کچھ آہٹیں محسوس کیں۔ شاید اندر کچھ لوگ بند تھے۔ کون تھے یہ لوگ؟ اس کے ذہن میں مختلف جرائم پیشہ افراد کی خوفناک شکلیں اُبھرنے لگیں۔

گلیارے کے اختتام پر وہ لوگ ایک کمرے کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ کمرے کے دروازے میں تالا نہیں تھا۔ مونچھوں والے نے دروازہ کھولا اور وہ لوگ کمرے میں داخل ہوگئے۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کر کوئی بٹن دبایا۔ 'چٹ' کی آواز آئی کمرے کی چھت میں لٹکا ہوا ایک زرد بلب روشن ہوگیا۔ اس نے بلب کی ملگجی روشنی میں دیکھا کمرہ تقریباً خالی تھا۔ البتہ کمرے کے بیچ میں دو کرسیاں رکھی تھیں۔ کمرے کی میلی غلیظ دیواریں ایک دم ننگی تھیں، جن کا پلاسٹر کسی جذامی کے بدن کی طرح جگہ جگہ سے جھڑ گیا تھا۔ کسی دیوار میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ بلب کی دُھندلی روشنی میں چھت سے لٹکتے ہوئے مکڑی کے جالے صاف نظر آرہے تھے۔ چشمے والا اس کی طرف مڑا اور کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ''بیٹھو۔''

وہ چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چشمے والا اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مونچھوں والا اور گال پر زخم کے نشان والا چشمے والے کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ چشمے والے نے اپنا چشمہ اتارا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ کمرے کی دھندلی روشنی میں بھی اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ اُسے چند لمحوں تک گھورتا رہا پھر سانپ ہی کی طرح پھنکارا۔

''ایک بات دھیان سے سنو! ہم لوگ کرائم برانچ والے ہیں۔ سچ اُگلوانا ہمارا پیشہ ہے۔ اس کے لئے ہم کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ اس لئے اچھا یہی ہے کہ ہمارے سوالوں کے صحیح صحیح جواب دو۔''

اُسے گھبراہٹ سی ہونے لگی مگر اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''پوچھئے۔''

''کیا محمد علی تمہارا اصلی نام ہے؟''

وہ اس عجیب سوال پر چونکا اور سوالیہ انداز میں بولا۔ ''کیا مطلب ہے؟''

''تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔ فالتو بات نہیں۔'' سانپ آنکھوں والا غرایا۔ اسے ہر بار نئے سرے سے ذلت کا احساس دلایا جارہا تھا۔ مگر ضبط کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بولا۔ ''ہاں۔ یہ میرا اصلی نام ہے۔''

''تم کہیں، کسی اور نام سے بھی کام کرتے ہو؟''

''میں سمجھا نہیں۔'' اس کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔

''ہاں یا نہیں۔''

''نہیں...'' اس نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تم 11 جولائی کی شام کو کہاں تھے؟''

وہ سمجھ گیا کہ اسے گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

''میں اپنے آفس میں تھا۔''

''سانپ آنکھوں والا تھوڑی دیر تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر گال پر زخم کے نشان والے کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''پاؤچ۔''

گال پر زخم کے نشان والے نے اپنے ہاتھ میں دبا پاؤچ اسے دے دیا۔ اس نے پاؤچ سے ایک شناختی کارڈ نکالا اور اسے دکھاتا ہوا بولا۔

''یہ آئی ڈینٹی ٹی کارڈ تمہارا ہے؟''

اس نے کارڈ کو غور سے دیکھا۔ اس پر اسی کی تصویر چسپاں تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

''ہاں... یہ کارڈ میرا ہی ہے۔ مگر یہ آپ کے پاس۔''

''یہ ہمیں اسی جگہ ملا ہے جہاں بلاسٹ ہوا تھا۔''

اسے لگا اس کا قد گھٹتے گھٹتے مٹھی بھر رہ گیا ہے اور وہ ایک جالی دار پنجرے میں کسی چوہے کی طرح پھنس گیا ہے۔ اور وہ تینوں جادو کے زور سے خونخوار بلوں کی شکل میں اسے گھیرے کھڑے ہیں اور ان کی تیز غراہٹوں سے اس کے لہو کی گردش تھم گئی ہے۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''اس روز دھماکے کی آواز سن کر سیکڑوں لوگ پٹریوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں بھی آفس بند کرکے پٹری کے پاس پہنچ گیا تھا۔''

کہتے کہتے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بھیانک منظر گھوم گیا۔ چرمرائے ہوئے فولادی ڈبے جن سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے خون میں لت پت انسانی اعضا لاشیں، زخمیوں کی کراہیں، لوگوں کی چیخ وپکار۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ سانپ آنکھوں والا کہہ رہا

تھا۔" آگے بولو۔"

"لوگ زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر ہاتھ گاڑیوں، آٹو رکشا اور ٹیکسیوں میں ڈال ڈال کر اسپتال کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ میں بھی اپنے آپ کو روک نہیں سکا اور زخمیوں کو اٹھانے میں لوگوں کی مدد کرنے لگا، اسی افراتفری میں شاید میرا پاکٹ وہیں کہیں گر گیا ہوگا۔ جس میں میرا آئی ڈینٹی ٹی کارڈ بھی تھا۔"

وہ دم لینے کو رُکا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "پانی۔"

اس کی درخواست پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ تینوں ایک ٹک اسے گھور رہے تھے۔ جیسے اس کے بیان کی صداقت کو نظروں کے ترازو میں تول رہے ہوں۔ پھر سانپ آنکھوں والے نے اسے ایک پاکٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا پاکٹ۔"

"ہاں۔ اس میں میرا ایسٹرن ٹکٹ بھی ہے۔"

"تم دبئی میں کتنے برس تھے؟" سانپ آنکھوں والا اس کی بات کی اَن سنی کرتا ہوا بولا۔

دبئی کے نام پر وہ چونکا۔ اس کا مطلب انہوں نے اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات اکٹھا کر لی ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"دس برس..."

"وہاں کیا کرتے تھے؟"

"سروس۔ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز منیجر تھا میں۔"

"وہاں تم اس سے ضرور ملے ہوں گے؟"

"کس سے؟"

"خیر۔ تم نے اسے وہاں کبھی دیکھا تو ہوگا؟"

"کس کو...؟" اس نے پھر اپنا سوال دوہرایا۔

"جانے دو۔ ویسے ایک بات بتا دوں۔ تم جتنا چالاک بننے کی کوشش کروگے، اتنا نقصان اٹھاؤ گے۔"

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"چھوڑو۔ تم دبئی سے کب لوٹے؟"

"پانچ برس ہو گئے۔"

"اس کا مطلب، ترانوے کے بم بلاسٹ کے موقع پر تم دُبئی میں تھے؟"

"ہاں تھا۔ وہیں ٹی وی پر میں نے وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر دیکھا تھا۔"

"یہ اسٹیٹ ایجنسی کب سے چلا رہے ہو؟"

"تین برس سے۔"

"پتا چلا ہے کہ تم یہاں اپنی ایجنسی کی آڑ میں حوالے کا دھندا بھی کرتے ہو؟"

"کیا حوالہ؟" دھیرے دھیرے جیسے اس کے گرد پھندا کستا جا رہا تھا۔

"دبئی سے تمہارے پاس روپیہ آتا ہے اور پھر تم وہ روپیہ یہاں کچھ لوگوں میں تقسیم کرتے ہو؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "میرے بارے میں کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔ میں نے دبئی میں نوکری کر کے جو روپے کمائے تھے اُنہی روپیوں سے یہ آفس خریدا ہے۔"

"اچھا بتاؤ تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟ سیمی سے؟ جیش محمد سے، لشکر طیبہ سے یا پھر سیدھے القاعدہ سے؟"

"میرا تعلق کسی سے بھی نہیں ہے۔" اس کی آواز روہانسی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، اس کے راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں اور اسے کسی وحشی جانور کی طرح مار گرانے کے لئے انہوں نے اپنی بندوقیں تان لی ہیں اور بندوقوں کی نالیاں اسی کی جانب اٹھی ہوئی ہیں، اس نے دھیرے دھیرے گردن اٹھائی۔ سرخ سرخ آنکھوں سے تینوں کو دیکھتا ہوا رُک رُک کر بولا۔

"آپ لوگ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ دھماکے کی آواز سن کر سیکڑوں لوگ وہاں پہنچے تھے، ان میں مَیں بھی تھا۔ اسے میری بدقسمتی سمجھئے کہ میرا پاکٹ وہاں گر گیا۔ صرف وہاں آئیڈینٹی ٹی کارڈ کے ملنے سے یہ کیسے ثابت ہو جاتا ہے کہ میں..."

بولتے بولتے وہ رُک گیا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ اس نے قدرے جوش سے کہا۔ "وہاں میں نے ایک آدمی کی جان بھی بچائی تھی۔ اسے اسپتال پہنچایا تھا۔ آپ چاہیں تو اس سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ وہ مہاتما گاندھی اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"پرمود سوناونے۔"

"دیکھا جائے گا۔" سانپ آنکھوں والا لاپرواہی سے بولا۔ اور کرسی سے اُٹھ گیا۔

پھر اچانک اس کی کلائی کی گھڑی کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "اسے اتارو۔"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اتارو۔ واپسی پر تمہیں تمہارا موبائل اور گھڑی مل جائے گی۔ چلو اتارو۔"

"اس نے چپ چاپ گھڑی اتار کر انہیں دے دی۔ موچھوں والے

نے اس سے گھڑی لے لی۔ پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوا بولا۔ ''دبئی کی لگتی ہے۔''
اس پر تینوں بے ڈھنگے پن سے ہنس دیئے۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ تینوں دروازے کی طرف مڑ گئے۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ سانپ آنکھوں والا اس کی طرف مڑا۔

''تم یہیں رُکو گے۔''

''کیوں؟''

ابھی تمہاری انکوائری پوری نہیں ہوئی۔''

تو پوری کر لیجئے نا۔ آپ مجھے اس طرح یہاں نہیں روک سکتے۔''

''ایسا کرنے سے ہمیں کون روک سکتا ہے۔'' سانپ آنکھوں والا سفاکی سے مسکراتا ہوا بولا۔

''یہ غیر قانونی ہے۔ میں کوئی چور اُچکا نہیں ہوں۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھئے اور مجھے اپنے گھر جانے دیجئے۔''

وہ تینوں کمرے سے باہر نکل چکے تھے۔ وہ ان کے پیچھے لپکا مگر تب تک دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے دروازے پر دو ہتھڑ مارے اور حلق کے بل چیخا۔ ''مجھے۔ کم سے کم اپنے گھر پر ایک فون تو کر لینے دیجئے۔ دیکھئے۔ میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' مگر باہر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ تینوں جا چکے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک دروازے کو یوں ہی پیٹتا رہا۔ پیٹتے پیٹتے اس کے ہاتھوں میں درد ہونے لگا۔ بالآخر اس نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ معاً اس کے پیٹ میں ایک گولا سا اٹھا۔ اس کے سینے میں غبار سا بھر گیا۔ وہ غبار کسی بپھری موج کی مانند اس کی آنکھوں کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ایک سسکاری سی نکلی۔ اس نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور مڑ کر دوبارہ اسی پرانی کرسی میں آ کر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے زندگی میں کبھی ایسی بے بسی محسوس نہیں کی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے گہرے کنویں میں پھینک دیا ہے اور وہ ڈوبتا جا رہا ہے گہرے اور گہرے۔ ہاتھ پیر مارنا چاہتا ہے مگر مار نہیں سکتا۔ شاید اب وہ کبھی سطح آب پر نہیں آ سکے گا۔ کیا یہی سیلن زدہ تاریک کمرہ اس کا مقبرہ بننے والا ہے؟ ہاں، بن بھی سکتا ہے۔ وہ چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے پورے اختیارات ہیں۔ یہ اختیارات انہیں کب ودیعت کئے گئے تھے کسی کو نہیں معلوم، کس نے ودیعت کئے تھے یہ بھی کسی کو نہیں معلوم۔ مگر یہ سچ ہے کہ یہ اختیارات ان کے پاس تھے۔ ان کے چہروں کی کرختگی سے۔ ان کی جارحانہ گفتگو سے، ان کی متکبرانہ حرکات و سکنات سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے پاس یہ اختیارات ہیں۔ ان ہی اختیارات کی بدولت انہوں نے اسے حراست میں لیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت، کسی بھی حال میں کسی بھی جگہ کسی کو بھی حراست میں لے سکتے تھے۔ جواز...؟ جواز تو وہ پیدا کر سکتے تھے۔ جواز پیدا کرنا ان کے لئے مشکل کام نہیں تھا۔ بلکہ جواز پیدا کرنا ایک طرح سے ان کی پیشہ ورانہ مہارت کی کسوٹی سمجھا جاتا تھا۔ ان سلسلہ وار بم دھماکوں کے بعد ایک جگہ انہیں اس کا شناختی کارڈ ملا تھا۔ اس سے بڑا جواز انہیں اور کیا چاہئے۔

یک بیک اسے اپنا گھر یاد آیا، گھر کے افراد یاد آئے، بوڑھی ماں کا جھریوں بھرا شفیق چہرہ، بیوی کی پیار بھری مسکراہٹ، اس پر جان چھڑکنے والی جوان بہن، ہمیشہ فرسٹ آنے والا اس کا ہونہار بیٹا۔ عزیز رشتے دار، دوست احباب، سب لوگ بے حد پریشان ہو گئے ہوں گے۔ شام تک انتظار کرنے کے بعد بابو نے دفتر بند کر دیا ہوگا اور دفتر کی چابی گھر پر لے جا کر دیتے ہوئے بتا دیا ہوگا کہ پولس اسے ساتھ لے گئی ہے۔ بیوی نے موبائل پر فوراً فون کیا ہوگا اور جواب نہ ملنے پر کس قدر پریشان ہوئی ہوگی؟ جب ماں کو معلوم ہوا ہوگا کہ پولس اسے لے گئی ہے تب اس کی حالت دگرگوں ہو گئی ہوگی۔ بہن کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے ہوں گے۔ شام کو بیٹا اسکول سے لوٹا ہوگا تو سب کو پریشان دیکھ کر بہت گھبرایا ہوگا۔ بیوی نے یقیناً اپنے بڑے بھائی کو فون پر بتایا ہوگا بیچارے دمے کے مریض دوڑے آئے ہوں گے۔ بہن کو تسلی دی ہوگی۔ ماں کی ڈھارس بندھائی ہوگی۔ کسی کو ساتھ لے کر انکوائری کے لئے پاس کی پولس چوکی بھی گئے ہوں گے۔ مگر جب وہاں کہا گیا ہوگا کہ ''ایسی کسی گرفتاری کا انہیں کوئی علم نہیں۔'' تب انہیں کس قدر مایوسی ہوئی ہوگی؟ واقعتاً اب یہ سوال اسے بھی بُری طرح ستانے لگا تھا کہ انکوائری کے لئے اسے اپنے ہی علاقے کی پولس چوکی کی بجائے اس دور افتادہ ویران پولس اسٹیشن کیوں لایا گیا ہے؟ آخر کیا ارادہ ہے ان کا؟ کیا کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ اس کے ساتھ؟ اس خیال سے بے شمار کن کھجورے اس کے دماغ میں رینگنے لگے اور اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔

اس نے ہتھیلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ کمرہ زرد مٹیالی روشنی سے بھرا ہوا تھا اور چاروں طرف ایک ہیبت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلاسٹر اُدھڑا ہوا تھا اور اس اُدھڑے ہوئے پلاسٹر کی جگہ عجیب عجیب شبیہیں نظر آ رہی تھیں۔ کہیں دو پہلوان نما شخص کسی مظلوم کو آرے سے چیر رہے تھے۔ کہیں کسی بل ڈوزر کے نیچے بے شمار انسان اس طرح دبے کچلے نظر آ رہے تھے کہ ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور زبانیں باہر نکل آئی تھیں۔ کہیں دو گدھ انسان کی لاش پر ٹھونگیں مار رہے تھے،

کوئی نیزہ بردار نیزے کی انی پر کسی مقتول کا سر اٹھائے دیوانہ وار رقص کر رہا تھا، کہیں ہڈیوں کا کوئی ڈھانچہ کاندھے پر صلیب اٹھائے گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا جہاں وہی گدلا سا بلب لٹک رہا تھا۔ اسے لگا بلب سے پھوٹتی یہ زرد روشنی ہی ہے، جو کمرے کی ویرانی کو مزید دہشت خیز بنا رہی ہے۔ اس نے دونوں پیر سکوڑ کر کرسی پر رکھ لئے، اور گھٹنوں میں منہ ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سوچا اسے اس طرح اپنا حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ یہ صرف لاک اپ ہے۔ وہ اُسے لاک اپ میں زیادہ دیر تک نہیں رکھ سکتے۔ اسے اپنا وکیل دوست انعام دار یاد آیا۔ وہ انعام دار کو اسی وقت فون کر کے بلائے گا۔ اس نے موبائل کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تبھی اسے دھچکا لگا۔ اس کا موبائل تو ان ہی لوگوں کے پاس ہے۔ اس نے مایوسی سے گردن ہلائی۔ تو کیا اب نجات کی کوئی صورت نہیں۔ اسے لگ رہا تھا وہ ایک ایسی سرنگ میں داخل ہو گیا ہے، جس کا دہانہ بتدریج تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یکا یک اس اندھی سُرنگ میں ایک جگنو سا چمکا۔ اسے پرمود سونا و نے یاد آیا۔ جس کی اس نے جان بچائی تھی۔

جب وہ زخمیوں کو اٹھانے میں لوگوں کی مدد کر رہا تھا۔ وہاں اسے پرمود بھی زخمی حالت میں دکھائی دیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک خون میں لت پت تھا۔ اس کے کپڑے جھلس کر چیتھڑوں کی شکل میں اس کے بدن پر جھول رہے تھے۔ وہ لپک کر اس کے قریب گیا اور اسے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے بعد میں دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ کر لٹک گئی تھی۔ دو آدمیوں کی مدد سے اس نے اسے اٹھا کر آٹو رکشا میں ڈالا اور ترنت اسپتال کی طرف بھاگا۔ اب وہ مہاتما گاندھی اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ وہ کوکن کا رہنے والا تھا مگر اس نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ایک ساؤتھ انڈین لڑکی سے شادی کر لی تھی اسی لئے وہ یہاں شانتی نگر میں ایک فلیٹ لے کر رہ رہا تھا۔ یہ فلیٹ اسی نے اسے دلایا تھا۔ اس نے اس کا لون بھی پاس کرا دیا تھا۔ پرمود اس کا بڑا احسان مند تھا۔ مکان لینے کے بعد بھی وہ اکثر اس سے ملنے اُس کے دفتر آ جاتا تھا۔ ابھی پچھلی بقرعید پر ہی تو وہ اس کے یہاں بریانی کھانے آیا تھا اور آنے والی دیوالی پر اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے گیا تھا۔ پرمود اس کی بے گناہی کی گواہی دے سکتا ہے اسے کسی بھی صورت میں پرمود سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ مگر کس طرح؟ اس کا موبائل چھین چکا ہے اور یہ لوگ اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔

وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے دونوں ہاتھ بغل میں دبا لیتا، کبھی پیچھے باندھ لیتا یا پھر اپنی انگلیوں کو چٹخانے کی کوشش کرتا جنہیں اس دوران وہ کئی بار چٹخا چکا تھا۔ جب ٹہلتے ٹہلتے تھک جاتا تو کرسی پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا تو پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک اسی کیفیت میں مبتلا رہا۔ ایک بار جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر کرسی پر بیٹھا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا کہ اسے کمرے کے باہر کچھ آہٹ سنائی دی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ متوحش نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ تبھی اچانک دروازہ کھلا۔ دروازے میں اسے ایک کالا بھجنگ شخص دکھائی دیا۔ وہ اس قدر سیاہ فام تھا کہ اس کا چہرہ اندھیرے کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا، البتہ اس کے بڑے بڑے سفید دانت اس کے ہونٹوں سے باہر جھانک رہے تھے اور ان دانتوں کی چمک ہی اس کے چہرے کے خدوخال کو نمایاں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''چلو! صاحب نے بلایا ہے۔''

وہ لپک کر باہر آ گیا جیسے اسے خدشہ ہو کہ ذرا سی بھی دیری ہوئی تو دروازہ دوبارہ بند ہو جائے گا۔

باہر نکلتے ہی ہوا کے ایک لطیف جھونکے نے اس کا استقبال کیا اور اسے قدرے راحت کا احساس ہوا۔ باہر اس تنگ راہداری میں بھی ایک زرد بلب روشن تھا جس کی روشنی اتنی کم تھی کہ بمشکل زینہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس سیاہ فام کے ساتھ ٹٹول ٹٹول کر زینہ اترنے لگا۔ سیاہ فام آگے تھا اور اسے بار بار تیز چلنے کی تاکید کر رہا تھا۔ وہ گرتا پڑتا سیاہ فام کے پیچھے چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں عمارت سے باہر آ گئے۔ سامنے تاروں کی چھاؤں میں اسے ایک کار کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ شاید صبح والی کوالیس تھی۔ وہ جوں ہی کار کے قریب پہنچے دروازہ کھلا اور ساتھ ہی سیاہ فام شخص نے پیچھے سے اس کی بانہہ پکڑ کر اسے کار میں تقریباً دھکیل دیا۔ کار میں اندھیرا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ساتھ ہی شراب کا ایک تیز بھبکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اندر کچھ پرچھائیاں سی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اندازاً ایک کونے میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے اس سے پوچھا۔ کیسے ہو؟'' اس نے فوراً پہچان لیا یہ سانپ آنکھوں والے کی آواز تھی۔ اس نے مری مری آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہوں سر!''

جوں ہی کار اسٹارٹ ہوئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

''سر! مجھے ہائی وے پر اتار دیجئے میں وہاں سے رکشا یا ٹیکسی لے لوں گا۔''

کوئی کچھ نہیں بولا، لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑا پانی مل جاتا تو...''

''یالا پانی پازا'' (اسے پانی پلاؤ) سانپ آنکھوں والے نے مرانھی

زبان میں کسی کو حکم دیا۔ اس کے بغل میں بیٹھے شخص نے پانی کی ایک بوتل اس کی طرف بڑھادی۔ اس نے بوتل دینے والے کو غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں بھی اس کی بڑی بڑی مونچھ کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک پرچھائیں اور نظر آئی۔ وہ یقیناً وہی ہوگا جس کے گال پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ بوتل ہاتھ میں لینے کے بعد وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ اسے پانی پینا چاہئے یا نہیں۔ مگر پیاس اتنی شدید تھی کہ اس نے بالآخر بوتل کو منہ سے لگالیا۔ اگر چہ پانی ٹھنڈا نہیں تھا مگر چند گھونٹ حلق سے اترتے ہی اسے قدرے طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کا خوف دھیرے دھیرے زائل ہو رہا تھا۔ جیسے غبار چھٹ رہا ہو۔ اس نے سانپ آنکھوں والے سے پوچھا۔

''اس وقت ٹائم کیا ہوا ہے سر!''

''اس وقت تمہارا ٹائم بہت خراب چل رہا ہے محمد علی!'' سانپ آنکھوں والے نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔ اس پر سب ہنسنے لگے۔ اسے سانپ آنکھوں والے کے جواب سے زیادہ ان سب کی ہنسی بُری لگی۔ مگر وہ چپ رہا۔ چپ رہنے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

''محمد علی! تمہاری فیملی میں کون کون ہے؟'' سانپ آنکھوں والا پوچھ رہا تھا۔ اس سوال پر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی فیملی کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟ اگر پوچھ رہا ہے تو اسے جواب دینا چاہئے یا نہیں؟ جواب دینا ہی ہو تو کیا جواب دے؟

اسے خاموش دیکھ کر سانپ آنکھوں والا بولا۔

''اچھا جانے دو۔ یہ بتاؤ اگر تمہیں کچھ ہو جائے تو تمہاری فیملی کی ذمہ داری کس کے سر ہوگی؟

اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ '' آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

جواب دینے کی بجائے اس سے پھر پوچھا گیا۔ ''تمہارا کوئی بیٹا وبیٹا ہے؟'' اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ ساتھ ہی آنکھوں میں بیٹے کی صورت گھوم گئی۔

''آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' اس نے پھر وہی سوال دوہرایا۔

''جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔'' سخت لہجے میں کہا گیا۔

''ہے۔''

''کیا عمر ہے؟''

''اس سال ایس ایس سی میں ہے۔''

''بھائی، باپ...؟''

''نہیں...''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی فیملی میں کمانے والے تم اکیلے ہو؟''

اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ مگر اس نے اپنے بکھرتے حواس کو ایک بار پھر مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے مجھے آپ کی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ آخر آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟ میں ایک سیدھا شریف آدمی ہوں۔ آپ میرے محلے میں کسی سے بھی میرے بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔ پڑوسیوں پر بھروسہ نہ ہو تو پرمود سے پوچھئے۔ میں نے اُس کی جان بچائی تھی، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ ذرا سوچیئے اگر بم بلاسٹ میں میرا ہاتھ ہوتا تو میں وہاں سے فرار ہونے کی بجائے پرمود کی جان کیوں بچاتا؟ اسے اسپتال لے کر کیوں جاتا؟'' بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اسے لگا وہ کچھ زیادہ جذباتی ہو گیا ہے۔ کار میں کچھ دیر سناٹا چھایا رہا۔ پھر سانپ آنکھوں والے کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔

''مسٹر علی! ہو سکتا ہے تم سچ بول رہے ہو۔ مگر۔''

''مگر کیا؟'' اس نے اُتاولے پن سے پوچھا۔

''ہم گاندھی اسپتال گئے تھے پرمود کا بیان لینے۔ مگر پرمود بیان دینے کے قابل نہیں ہے۔ وہ کوما میں ہے۔''

''کوما میں...'' اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے دانت پر دانت جما کر اُمڈتے طوفان کو روکا اور تقریباً ڈوبتی آواز میں بولا۔ ''پھر؟''

''پھر کیا۔ ہمیں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا ہوگا؟''

''ہوش میں آنے کا انتظار کرنا ہوگا'' اس نے دوہرایا پھر بولا۔ ''کب تک؟''

''ڈاکٹر کہتا ہے۔ کوما کے پیشنٹ کا کچھ ٹھیک نہیں۔ ہو سکتا ہے دو تین دن میں ہوش آجائے، دو تین مہینے بھی لگ سکتے ہیں یا دو تین برس بھی یا پھر اسی حالت میں اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔'' سانپ آنکھوں والا بول رہا تھا مگر اسے اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگا وہ گہرے پانیوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اب وہ آخری کنگورا بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا جس پر نظریں جمائے وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے تربمرے سے اُڑنے لگے۔ اس نے پوچھنا چاہا۔

ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟

مگر ایک اندیشہ ناک خیال نے اس کے گلے میں پھندا ڈال دیا اور الفاظ ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ OO

کاٹنے والے، جوڑنے والے

اقبال حسن آزاد

خبر اچھی نہیں تھی۔

سلسلہ وار دھماکوں نے بے شمار معصوم لوگوں کو ابدی نیند سلا دیا تھا اور شک کی سوئی مسلمانوں کی طرف گھما دی گئی تھی۔

اسلم میاں بھاری دل کے ساتھ اپنے گھر سے روانہ ہوئے۔

ان کا پوتا سلیم ان کا انتظار کر رہا ہوگا۔

یہ برسوں کا معمول تھا۔ گو اب وہ عملاً سبک دوش ہو چکے تھے مگر روز بعد نماز مغرب ایک گھنٹے کے لئے اپنی دکان پر بیٹھتے تھے۔ جس وقت وہ اپنے نئے طرز کے ٹیلرنگ شاپ میں داخل ہوئے، سارے کاریگر اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ اسلم میاں کو آتا دیکھ کر سبھوں نے انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ کتنا بدل گیا ہے ان ساٹھ برسوں میں۔ انہوں نے دکان کے باہر رواں دواں زندگی پر نگاہیں ڈالتے ہوئے سوچا۔ نہیں بدلی تو ہندوستانی مسلمانوں کی حالت۔ اب تو ان پر دہشت گرد کا لیبل بھی لگ گیا ہے۔

پھر وہ ماضی کی سیڑھیوں میں اُترتے چلے گئے۔

آزادی کے فوراً بعد ان کی بہن سکینہ کی شادی ہوئی اور پھر چند ماہ بعد ان کے سر بھی سہرا بندھ گیا تھا۔ ماہ و سال کے آئینے میں ان کے والدین کے چہرے دھندلا گئے۔ وہ ایک بچے کے باپ بن گئے۔ نسیم جوان ہوا تو انہوں نے اس کی شادی کر دی مگر وہ ایک ننھے بچے کو یادگار چھوڑ ایک سڑک حادثے کا شکار ہو گیا اور ان کی زندگی میں ایک نہ بھرنے والا خلا پیدا ہو گیا۔ اب وہ اپنی بیوی، بیوہ بہو اور پوتے اسلم کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ ان کے والد جمن میاں کی قائم کردہ دکان اب بھی موجود ہے البتہ ان کے وقت کے کاریگر اب نہیں رہے۔

انہیں ایک ایک کر کے سبھی یاد آتے گئے۔

شوکت میاں، رحمت میاں شکور میاں اور وہ نو عمر لڑکا بھلا سا نام تھا اس کا، اور پھر جمن میاں۔ جمن میاں گردن میں فیتہ لٹکائے رہتے۔ ان کا کام ناپ لینا تھا۔ شوکت میاں کپڑوں کو تراشتے، رحمت میاں آنکھوں پر موٹا چشمہ لگائے سوئی دھاگے سے دست کاری میں مشغول رہتے۔ شکور میاں مشین چلاتے تھے اور مشین کی موسیقی ریز آواز کے ساتھ ساتھ ان کا سر بھی ہلتا رہتا تھا۔ وہ ثریا کے عاشقوں میں تھے اور اس کے گائے ہوئے گیت گنگناتے رہتے۔ اسلم میاں دیکھتے کہ شوکت میاں چٹائی پر بیٹھے بیٹھے سرعت سے قینچی چلاتے اور پھر قینچی کو پیروں تلے داب کر کٹے ہوئے کپڑوں کو موڑتے اور جب سوئی دھاگے سے ٹانکے لگاتے لگاتے رحمت میاں کی انگلیاں درد کرنے لگتیں تو وہ سوئی کو اپنی ٹوپی میں اُڑس کر انگلیاں چٹخاتے۔ اس وقت اسلم میاں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شوکت میاں قینچی کو پیروں تلے کیوں رکھتے ہیں اور رحمت میاں سوئی کو سر کے اوپر کیوں۔

ایک دفعہ انہوں نے جمن میاں سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے کہ کاٹنے والوں کی جگہ پیر کے نیچے ہوتی ہے اور جوڑنے والوں کی سر کے اوپر۔''

اسلم میاں کو بچپن سے پڑھنے لکھنے سے لگاؤ تھا۔ پڑوس کے لالہ شمبھو ناتھ کا بڑا بیٹا پردیپ روز صبح بستہ اُٹھائے مدرسے کی جانب جاتا دکھائی دیتا۔ اسے دیکھ کر اسلم میاں کا شوق بھی جاگ اُٹھا۔ انہوں نے اماں سے کہہ سن کر اپنا نام بھی مدرسے میں لکھوا لیا۔ اب وہ اور پردیپ گلے میں باہیں ڈالے مدرسہ جاتے اور اسی طرح واپس آتے۔

وقت کسی سبک رو دریا کی طرح بہتا رہا اور اس طرح کئی سال گزر گئے۔

1946 کا سال چل رہا تھا۔ اب اسلم میاں بیس برس کے نوجوان تھے

اور مقامی کالج میں ایف اے، کے طالب علم۔ پردیپ ابھی بھی ان کا کلاس فیلو تھا۔ بھارت چھوڑ دو تحریک اپنے تکمیلی مرحلے میں تھی اور ہندوستان کا بٹوارا ہونا طے پا چکا تھا۔ پرجوش نعرے سن سن کر اسلم میاں کے جوان خون کی روانی اور بھی تیز ہو گئی۔ مسلمانوں میں خاندان کے خاندان ترک وطن کر رہے تھے۔ کئی مسلم لیگی آزادی سے قبل ہی کراچی منتقل ہو گئے تھے کیونکہ وہ قائد اعظم کو پاکستانی فوجوں کی سلامی لیتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسلم میاں نے اپنے والد سے کہنا شروع کیا۔

''ابا میاں! ہمارے سب دینی بھائی جا رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم لوگ بھی...''

جمن میاں بھڑک اُٹھے۔

''کہاں کا دین اور کیسے بھائی۔ یہ سب سنگ زمانہ ہیں۔ اپنی جان بچانے اور روزی روٹی کی تلاش میں اپنا ملک چھوڑے جا رہے ہیں۔''

''لیکن ابا میاں! ہجرت تو سنت ہے۔''

''ہاں! لیکن وہ ہجرت جو دین وایمان کی حفاظت کے لیے کی جائے، اپنے نفس کی تسکین کے لیے نہیں۔ اور یاد رکھو! ترک وطن کرنے والوں کو وطن کی مٹی بد دعا دیتی ہے۔''

اسلم میاں کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ کتنا سچ کہا تھا ابا میاں نے۔

پھر وہ اماں کو ٹٹولتے۔ مگر وہ تو اپنے شوہر کا سایہ تھیں۔ کہنے لگیں۔

''کیا تم اپنا شہر چھوڑ سکتے ہو، اپنے بچپن کے دوستوں کو چھوڑ سکتے ہو۔ ہمیں چھوڑ سکتے ہو؟ اگر ہاں! تو پھر جہاں جی چاہے جا سکتے ہو۔'' اسلم میاں خاموش رہ جاتے۔

ملی جلی آبادی والا یہ علاقہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور گنگا جمنی تہذیب کی جیتی جاگتی مثال تھا اس لئے جمن میاں کے دل میں کبھی بھی ترک وطن کی خواہش پیدا نہیں ہوئی مگر جیسے جیسے آزادی کی روشن صبح قریب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے فرقہ وارانہ فسادات کی سیاہی پھیلتی جاتی تھی۔ گرم ہوائیں اوپر اٹھ رہی تھیں۔ پنجاب کے شہروں سے ہوتی ہوئی خاک وخون کی داستاں جب بمبئی، نوا کھالی، کلکتہ، جموئی اور بہار شریف تک پہنچ گئی تو جمن میاں کے پائے استقامت میں بھی لغزش آ گئی۔ انہیں لگا جیسے ان کا بیٹا سچ ہی کہتا ہے۔ اس ملک میں مسلمان اب محفوظ نہیں رہے۔ ایک روز انہوں نے دکان کھولی تو معلوم ہوا کہ شوکت میاں مع اہل وعیال جلد ظہور پذیر ہونے والی مملکت خداداد کی طرف کوچ کر گئے۔ بقیہ کاریگر بھی پر تول رہے تھے۔ صرف رحمت میاں کا اب بھی یہی خیال تھا کہ وطن کی محبت جزو ایمان ہے۔

کئی روز سے شہر کی فضا مسموم تھی۔ اکا دکا ناخوشگوار واقعات رونما ہونے لگے تھے۔ ایک مسلمان رکشے والے کو ہندوؤں کے محلے میں پیٹ دیا گیا اور ایک ہندو حلوائی کی دکان پر چند شر پسند مسلمانوں نے ہنگامہ آرائی کی۔ گورے افسروں کی ٹکریاں شہر میں گشت کرنے لگیں۔ مگر جس جس علاقے میں یہ گورے پہنچتے وہاں کا ماحول مزید کشیدہ ہو جاتا۔ جمن میاں نے بھی چپکے چپکے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ حالانکہ اس کا فوری اثر سکینہ کی زندگی پر پڑتا کیونکہ اس کی نسبت اس کے خالہ زاد بھائی سے طے پا چکی تھی اور جہیز کا سارا سامان بھی تیار کیا جا چکا تھا مگر اس کے ہونے والے سسر نے ترک وطن کے خیال کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔

''خیر! جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اگر خدا نے چاہا تو وہاں اس کے لیے اور بہتر رشتہ مل جائے گا۔'' جمن میاں نے اپنی بیگم کو ڈھارس بندھائی۔

وہ لوگ اب تک نکل گئے ہوتے مگر جمن میاں کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ مکان اور دکان کا کوئی معتبر اور مستقل انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس گلی میں جمن میاں کے علاوہ صرف ایک اور گھر مسلمان کا تھا۔ ان کے بالکل سامنے نواب سید حشمت الدولہ کی عظیم الشان حویلی تھی جس کا بلند و بالا دروازہ عموماً بند رہتا تھا۔ حویلی میں نواب صاحب اپنے چند خادموں کے ساتھ سکونت پذیر تھے۔ کوئی اولاد ان کے پاس نہ تھی۔ جمعہ یا عیدین کی نماز ادا کرنے نواب صاحب دو گھوڑوں کی بگھی پر سوار، ململ کا کرتا اور تنگ مہری کا پائجامہ زیب تن کیے جامع مسجد جاتے۔ سر پر دوپلی ٹوپی اور پیروں میں سلیم شاہی جوتی ہوتی۔ سردیوں میں گرم شیروانی کا اضافہ ہو جاتا۔ محلے والوں سے ان کا کوئی ربط ضبط نہ تھا۔ البتہ ان کے دولت کدے پر شہر کے روسا اور انگریز افسران کی آمد ورفت رہا کرتی۔ فٹن اور موٹر گاڑیاں ان کے دروازے کی رونق میں اضافہ کرتیں۔ نواب صاحب کے کپڑے جمن میاں کی دکان پر ہی سلتے تھے۔ جب حویلی سے بلاوا آتا تو وہ فیتہ لے کر حاضر ہو جاتے۔ نواب صاحب مشین کی سلائی پسند نہیں فرماتے تھے۔ ہمیشہ ہاتھ کا سیا کپڑا پہنتے۔ گو اس کی مزدوری مشین کے مقابلے میں دوگنی تھی۔

ایک روز علی الصباح، جبکہ گلی میں لوگوں کی آمد ورفت شروع نہیں ہوئی تھی، شمبھوناتھ نے جمن میاں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''جمن میاں!'' انہوں نے سرگوشی کی۔

''سنا ہے آج حملہ ہونے والا ہے۔ باہر سے دنگائی بلائے گئے ہیں۔ کل رات کئی ٹکریاں پہنچی ہیں اور وہ بھی شہر کے بڑے لوگوں کے مہمان بنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ دن بھر آرام کریں گے اور آدھی رات کو 'کھا' 'پی' کر شب خون ماریں گے۔ بہتر ہوگا آپ لوگ کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں۔ ہم لوگ تو آپ کے

ساتھ ہیں مگر ان پاگل فسادیوں کے آگے بھلا...''

جمن میاں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ خواہ مخواہ مکان دکان کے چکر میں پڑے رہے۔ جان ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ انہیں اپنے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نواب صاحب کا ایک ملازم تیز تیز قدموں سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر شمبھو ناتھ اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔ ملازم نے قریب آ کر کہا۔

''جمن میاں! آپ کو نواب صاحب بلا رہے ہیں۔'' جمن میاں نے بیٹے کو آواز دی کہ وہ آ کر دروازہ اندر سے بند کر لے اور خود نواب صاحب کے ملازم کے ساتھ ہو لیے۔ نواب صاحب آرام کرسی پر دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے، کسی گہری سوچ میں گم نیم دراز تھے۔ انہوں نے وقت برباد کیے بغیر کہنا شروع کیا۔

''جمن میاں! آپ کو تو خبر لگ ہی چکی ہوگی۔ حالات خراب ہو گئے ہیں۔''

''جی حضور!'' جمن میاں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ نواب صاحب نے آگے کہنا شروع کیا۔

''میرے خیال میں محلے کے سارے مسلمان یہاں آ جائیں۔ عورتیں اور بچے زنان خانے میں اور مرد لوگ اوپری منزل پر۔ اللہ ہماری حفاظت کرے گا۔ آپ سب کو خبر کر دیں۔''

جمن میاں نے نواب صاحب کے بدلے ہوئے انداز کو حیرت و مسرت سے دیکھا اور اُلٹے قدموں لوٹ پڑے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے محلے کے سارے کلمہ گو نواب صاحب کی حویلی میں جمع ہو گئے۔ جمن میاں کی بیگم نے نقدی اور زیور تو اپنے پاس رکھ لیا اور سکینہ کے جہیز کی حفاظت اوپر والے کو سونپ دی۔ انہوں نے دروازے میں تالا لگایا اور پھر اپنے گھر کو یوں دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں۔ انہیں خیال آیا کہ کنجی لالہ کو دے دیں مگر دل نہ مانا۔ اس کے بعد وہ سبھی نواب صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئے، جس کا ذیلی دروازہ کھلا رکھا گیا تھا۔ جمن میاں نے ڈوبتے دل کے ساتھ اپنی بیگم اور سکینہ کو زنان خانے کے اندر جاتے دیکھا اور خود اسلم کے ساتھ اوپری منزل کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

سارا دن بے چینی کے عالم میں گزرا۔ نواب صاحب نے سبھوں کے خورد و نوش کا نظم کر رکھا تھا۔ شیر خوار بچوں کے لیے دودھ بھی مہیا تھا۔ اس قدر بھیڑ بھاڑ کے باوجود چہار جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اگر کبھی کسی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز اُٹھتی تو اسے فوراً چپ کرانے کی کوشش کی جاتی۔

اسلم میاں کو وہ خوفناک رات آج بھی یاد تھی۔

دن تو جیسے تیسے گزر گیا مگر رات اپنے ساتھ بھیانک اندیشے لے کر آئی۔ پوری حویلی کو اندھیرے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ رات یوں بھی تاریک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ارض ہستی سے روشنی کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اندر، باہر، اوپر، نیچے، دل و دماغ میں اور آنکھوں کے سامنے بھی۔ سبھی لوگ حویلی کی چھت پر دم سادھے پڑے تھے۔ جیسے جیسے رات بھیگتی گئی پورب کی جانب سے آنے والی ہوا نیند کے سندیسے لے کر آنے لگی لیکن جب آنکھوں میں خوف و دہشت کی پسی ہوئی مرچیں جھونک دی گئی ہوں تو بھلا ان میں نیند کیوں کر سماتی؟ دل لرز رہے تھے اور رگ و پے میں بے چینی کی لہریں رواں دواں تھیں۔ ایسے میں اگر کوئی شخص جذبۂ تجسس سے مجبور ہو کر منڈیرے سے جھانکنے کی کوشش کرتا تو فوراً کوئی دوسرا شخص پیچھے سے اس کا دامن کھینچتا اور پھر سرگوشیاں گشت کرنے لگتیں۔ محلے کے ایک بزرگ نے، جو نواب صاحب کے پہلو میں لیٹے ہوئے تھے، دھیمی آواز میں نواب صاحب سے کہا۔

''حضور! اگر آپ اپنی بندوق بھی...'' نواب صاحب نے خشمگیں نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا اور وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔

اچانک سامنے گلی سے کچھ آوازیں اُبھریں۔ دبی دبی سی اور بہت ہلکی سی روشنی بھی دکھائی دی۔ جمن میاں سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے جھانک کر دیکھا اور ان کا جی دھک سے ہو کر رہ گیا۔ چند سائے ان کے گھر کے پاس منڈلا رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا مرگھٹ سے مردے اُٹھ کر آ گئے ہوں۔ انہوں نے روشنی کی جانب نگاہیں جما کر دیکھا اور سن سے ہو کر رہ گئے۔ ان کے بچپن کا دوست، ان کا پڑوسی شمبھو ناتھ ایک ہاتھ میں لالٹین لیے کھڑا تھا اور اس کا بڑا بیٹا، سلیم کا دوست، پردیپ ہتھوڑے سے ان کے گھر کا تالا توڑ رہا تھا۔ باقی دونوں بیٹے بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ دم بخود رہ گئے۔ کسی نے ان کا دامن کھینچا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر دامن کھینچنے والے نے بھی جھانک کر دیکھا... اور دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد کئی گردنیں منڈیر پر ٹنگ گئیں۔ ادھر تالا ٹوٹ چکا تھا اور وہ چاروں گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد سبھوں نے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا کہ جمن میاں کے گھر کا سارا سامان شمبھو اور اس کے بیٹے لوٹ کر لیے جا رہے ہیں۔ جمن میاں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اتنا بڑا وشواس گھات؟ وہ بے بسی سے یہ سارا تماشا دیکھتے رہے۔ سچ کہا گیا ہے کہ مشرک پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

کالی اندھیری رات کسی بے کس مریض کی طرح جاگ رہی تھی۔ جب بارہ کا گجر بجا تو دور سے بہت تیز روشنی آتی دکھائی دی اور ساتھ ہی ساتھ ہر ہر مہادیو کی دل دہلانے والی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ چھت پر موجود سبھی لوگوں کے دل بیٹھ گئے اور وہ وہ سب کے سب زور زور سے آیۃ الکرسی پڑھنے لگے۔ روشنی قریب آتی گئی، آوازیں بلند ہوتی گئیں مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ نیچے جھانک

کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ گلی سے شعلوں کی لپٹ اٹھتی دکھائی دی تو سبھوں کی سمجھ میں آیا کے گھروں میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ ستر برس کے نواب صاحب اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹے تو ان کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی۔ انہوں نے سیدھے کھڑے ہو کر زوردار نعرۂ تکبیر بلند کیا اور بھیڑ کی جانب شست باندھ کر فائر کر دیا۔ فسادی، جن کے ہاتھوں میں بھالے، گڑاسے، ترشول اور مشعلیں تھیں، گولی کی آواز سن کر گھبرا گئے اور ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ نواب صاحب نے پے در پے کئی گولیاں داغ دیں۔ فسادیوں کے درمیان کئی چیخیں ابھریں اور ان کے پیر اکھڑ گئے۔ یہ دیکھ کر چھت پر موجود لوگوں کی ہمت بندھی اور وہ بھی زور زور سے نعرۂ تکبیر بلند کرنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پوری گلی خالی ہو گئی۔ اس کے بعد پولس کی گاڑیاں دندنانے لگیں۔ رات اسی طرح گزر گئی۔ صبح صادق طلوع ہوئی تو موذن صاحب لپکتے جھپکتے حویلی سے باہر نکلے اور کسی خطرے کی پرواہ کیے بغیر مسجد کے مینارے پر چڑھ کر اذان دینے لگے۔ اذان کی آواز سن کر تن مردہ میں گویا جان تازہ پڑ گئی ہو اور پھر سبھی لوگ مسجد کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس روز امام صاحب نے بڑی لمبی نماز پڑھائی اور دعائیں مانگتے وقت اس قدر روئے کہ ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ آج مصلّیوں نے بھی صدق دل سے نماز پڑھی تھی۔

دن چڑھ آیا تو سرکاری لاریاں آئیں اور سبھوں کو عارضی کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ لاری پر سوار ہونے سے قبل جمن میاں کی بیوی نے ایک نظر اپنے مکان کو دیکھنا چاہا مگر اس افراتفری میں ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کیمپ کی زندگی کسی جہنم سے کم نہ تھی۔ جمن میاں کو اپنی بیوی اور بیٹی کی بے پردگی کا خیال آتا تو ان کا کلیجہ کٹ جاتا۔ پردے میں رہنے والی بیبیاں آج در در کی ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔ غدر میں لال قلعہ کی شہزادیوں پر بھی شاید ایسا ہی سانحہ گزرا ہوگا۔ ادھر فسادی پورے شہر میں بے خوف و خطر دھند مچائے ہوئے تھے۔ ایک رات انہوں نے کیمپ پر بھی حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

امید و بیم کے ساتھ، موت و حیات کی کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ شہر میں دھیرے دھیرے امن و امان قائم ہونے لگا۔ فساد کا چڑھا ہوا بخار اترنے لگا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ جمن میاں کے لبوں پر جیسے تالا لگ گیا تھا۔ جب ان کی بیوی ان سے گھر چلنے کو کہتیں تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے۔

''گھر! کون سا گھر؟ وہ گھر جسے بچپن کے دوست نے لوٹ لیا اور بلوائیوں نے جس میں آگ لگا دی۔ اب تو ہمیں کہیں اور پناہ ڈھونڈنی ہوگی۔''

''پھر بھی۔ جانے سے پہلے ایک نظر اپنے گھر کو دیکھ لیتے۔'' بیوی کے التجا آمیز لہجے نے جمن میاں کو پگھلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو چلے چلتے ہیں مگر اب وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے اس پر اب کسی اور کا قبضہ ہو۔'' جمن میاں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسلم اور سکینہ پاس کھڑے ماں باپ کی گفتگو سنتے رہے۔ وہ دونوں بھی اب خاموش خاموش رہتے تھے۔

دن اچھی طرح نکل آیا تو جمن میاں بیوی بچوں کے ساتھ اپنے محلے میں داخل ہوئے۔ گلی میں ایسا سناٹا تھا کہ اسے محسوس کر کے ہول سا اٹھتا تھا۔ انہوں نے نمناک نگاہوں سے اپنے گھر کو دیکھا۔ اس گھر کو جہاں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ جس کے آنگن اور دالانوں میں انہوں نے قدم قدم چلنا سیکھا تھا اور جہاں برآمدے میں بیٹھ کر انہوں نے اپنے والد مرحوم سے سلائی پرائی کے ابتدائی سبق سیکھے تھے اور اور...'' انہوں نے دیکھا کہ دیواریں جلنے کے باعث سیاہ ہو چکی تھیں۔ صدر دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ مگر یہ وہ تالا تو نہ تھا جو وہ لگا کر گئے تھے۔ انہیں یاد آیا۔ اسے تو شمبھو نے...

وہ زیادہ دیر وہاں نہ رک سکے اور جانے کے لیے مڑے۔ اچانک ان کے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

''جمن میاں! آپ لوگ آ گئے۔ شکر ہے بھگوان کا۔'' شمبھو دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ان کے جی میں آیا کہ اس ولدالحرام کو کھڑے کھڑے گولی سے اڑا دیں مگر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اتنے میں پردیپ ہاتھوں میں کنجی لیے آتا دکھائی دیا۔

جمن میاں! آپ کے گھر کا تالا... میں نے اپنا تالا لگا دیا تھا۔ لیجیے اپنا گھر سنبھالیے۔''

جمن میاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے کنجی سنبھالی، گھر کا دروازہ کھولا اور گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ آگے آگے جمن میاں۔ ان کے پیچھے ان کی بیوی اور بچے۔

ان سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

گھر کا سارا سامان بالکل اسی طرح رکھا ہوا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔

انہوں نے حیرت زدہ نگاہوں سے شمبھو کی جانب دیکھا۔ وہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔

''جمن میاں! ہم لوگوں نے تمہارا سامان تو بچا لیا مگر افسوس! تمہارا گھر جلنے سے نہ بچا سکے۔ معاف کرنا۔''

جمن میاں کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اور بے اختیار ہو کر شمبھو ناتھ سے لپٹ گئے۔ OO

تلاش

سعید ریاض

وہ تعداد میں کئی تھے اور میں تنہا۔ پھر بھی میں ان کا مقابلہ کررہا تھا۔ وہ لوگ نہ کب سے میرا پیچھا کررہے تھے۔ ہزاروں سال سے، بے شمار صدیوں سے۔ وہ مجھے اپنی زنجیروں میں اسیر کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے میری سوچ کی زمین پر فکر کی گرم دہکتی ریت بچھادی تھی۔ جس سے میرے خیالات کے پاؤں زخمی ہوگئے تھے۔ میرے خوابوں پر ان کی گرفت اس قدر مضبوط ہوگئی تھی کہ مجھے خوابوں سے ڈر لگنے لگا تھا، اور میں خوابوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ بے شمار راتیں جاگ کر گذار دیں۔ میں ان سے فرار چاہتا تھا۔ مگر وہ ظالم مجھے ہر موڑ پر پکڑنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے فرار کے بہت سے راستے تلاش کئے مگر جس راہ سے گذرتا وہ میرے راستہ میں آکر کھڑے ہوجاتے۔ انھوں نے میری شخصیت کے چاروں سمت اس قدر مضبوط جال بُن دیا تھا کہ میری انا کا دم گھٹ رہا تھا۔

وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے میری سمجھ سے باہر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا۔ ''تم میرا پیچھا کیوں کررہے ہو۔ آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' ان کی لرزتی خوفناک آواز نے میرے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ ڈال دیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ''وہ میری موجودہ حالت سے مطمئن نہیں۔ انھیں میری بوسیدہ حالت اور ٹوٹی بکھری شخصیت پر رحم آتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی ان لوگوں کی طرح سوچوں جس طرح ہر سرمایہ دار سوچتا ہے۔''

میں نے ان سے کہا ''میں خود بھی چاہتا ہوں کہ مفلسی سے سسکتی زندگی کو آسودگی کا کفن لپیٹ کر خوشحالی کے کسی خوبصورت محل میں قید کردوں۔ مگر اس کے لئے مجھے سرمایہ کی ضرورت ہے جو میرے پاس نہیں۔''

''تمھیں سب کچھ ملے گا۔'' وہ ایک ساتھ بولے، ''مگر اس کے لئے تمھیں ہمارے ہر اشارے پر چلنا ہوگا۔ ہماری ہر بات تمہارے لئے حرف آخر ہوگی۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''تمھیں قتل کرنے ہوں گے۔ ایک نہیں دو قتل۔''

میں کانپ اٹھا۔ میرے اندر کا ''میں'' چیخ پڑا اور خوف کے پسینے میں ڈوب گیا۔ میرے کانوں میں بے شمار انسانوں کی چیخیں بھی گونجنے لگیں...

''میں ایسا نہیں کرسکتا۔ کبھی نہیں؟''

''تم بزدل ہو۔'' وہ سب نفرت سے بولے۔ ''تم بزدل ہو، بے حد بزدل اور تمہاری یہ بزدلی تمھیں کبھی اونچائی پر پہو نچنے ... ے گی۔ تم یوں ہی بھٹکتے رہوگے۔ لوگ اس قدر قد آور ہوجائیں گے کہ تمہاری شخصیت 'بونا' بن جائے گی اور ایک نہ ایک دن شاید تم ان کے قدموں میں آکر کچل جاؤ۔''

میں ان کی طویل گفتگو سے گھبرا گیا اور غصہ سے بولا۔

''آخر تمھیں مجھ سے اس قدر ہمدردی کیوں ہے۔ تم میری فکر میں کیوں پریشان ہو؟''

''اس لئے کہ تم ہم سے ہو اور ہم تم سے۔'' وہ فلسفیانہ انداز سے مخاطب ہوئے۔

''یہ غلط ہے۔ میں میں ہوں اور تم تم ہو۔ میں اور تم کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔'' میں نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کس لئے؟'' وہ تمام مجسم سوال بن گئے۔

''اس لئے کہ تمہارا 'میں' خود غرضی، مطلب پرستی کے خول میں لپٹا ہوا ہے اور میرا 'میں' الجھنوں کے جال میں پھنس کر اپنے آپ کو 'آپ' بھول چکا ہے اور جب تک میں اپنے 'میں' کو تلاش نہیں کرلیتا زندگی کے ہر موڑ پر بھٹکتے رہنا میرا مقدر ہے۔''

''ہم تمہارا 'میں' ہی تو یاد دلانا چاہتے ہیں۔''

''پھر مجھے کیسے یاد آئے گا؟''

''اس کے لئے تمہیں قتل کرنا ہوگا۔ ایک نہیں دو قتل۔''

''میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔''

''یہ تمہاری بزدلی اور نامردانگی ہے۔ کمال ہے تم دنیا کے حالات سے بھی بے خبر ہو۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس ملک میں غرض کی خاطر لوگ مذہب کے نام پر عبادت گاہوں کو مسمار کردیتے ہیں، مذہب کے نام پر ہی بے دریغ انسانوں کا خون بہانے سے نہیں چوکتے، عصمتوں کی دھجیاں اڑانے سے نہیں گھبراتے اور ایک تم ہو کہ اپنی زندگی کے راستے سے فکر کے کانٹے سمیٹنے کے لئے دو قتل نہیں کرسکتے۔ صرف دو قتل۔''

''ہاں میں کسی کا خون نہیں کرسکتا۔ میں اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے نہیں رنگنا چاہتا۔ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔'' میں گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا مگر وہ سب بھی میرے پیچھے بھاگنے لگے۔ کسی سائے کی طرح۔ میری ہر پناہ گاہ کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا تھا۔ میں جس راستہ سے گذرتا وہ مجھ سے پہلے وہاں پہونچ جاتے۔

وقت کے بدلتے ہوئے موسم، حالات کی گرد، کرب کی ریت اور سوچ کے پہاڑ۔ میں ان سب سے گذرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اپنے ہمدردوں سے، اپنے رفیقوں سے، فرار ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر وہ تو ہر مقام پر میرے ساتھ تھے۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا کہ انھوں نے میرے دل کی دھڑکن اور میری سانسوں پر بھی اپنی گرفت مضبوط کردی ہے۔

میں بھاگتے بھاگتے اس قدر تھک گیا تھا کہ سوچنے لگا یا تو ان کا کہنا مان لوں یا پھر خودکشی کرلوں۔ مگر میری انا کہتی ہے کہ آوارہ، خودغرضی کی دھول پر تم ان جذبات کا کہنا مان کر اپنے احساس، اپنے ضمیر کا قتل کردو گے تو پھر تمہارے پاس کیا رہ جائے گا۔ تمہارا آپ بھی تو ختم ہوجائے گا۔

اور میں سوچتا ہوں کہ جذبات کی بات مان کر میں اپنے ضمیر، اپنے احساس کا قتل کردوں یا پھر ان سے یوں ہی بھاگتا رہوں۔ بھاگتا رہوں...

میری زندگی اس موڑ پر آگئی ہے جہاں تنگ دستی، مایوسیاں، ناکامیاں میری زندگی کا احاطہ کئے ہیں اور میری شخصیت، میری انا کا دم گھٹ رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میں جذبات کی بات مان لیتا تو کیا ہوتا؟

OO

بے سمت مسافر

یوسف عارفی

اس بار جب وہ اپنی بستی جانے لگا تو اسے خیال گزرا کہ ریل کے ڈبوں میں ویسی ہی گندگی ہوگی جیسے پچھلے دس برسوں پہلے ہوا کرتی تھی، اور ریل کا انجن بھی ایسا ہی ہوگا جیسے بیمار حالت میں چلتا ہوا مریض۔ لیکن جب وہ ریل کے ڈبے میں داخل ہوا تو فرطِ مسرت سے گم صم کھڑا ریل کے ستھرے اور بے حد چمکیلے ڈبے کی چمک میں کھو گیا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ بستی پہنچنے کے لئے اب چودہ گھنٹے نہیں بلکہ صرف پانچ گھنٹے درکار ہیں۔ انجن میں خاصی تبدیلیاں لائی گئی ہیں، کوئلہ کی جگہ اب ڈیزل استعمال کیا جانے لگا ہے۔

اس نے بڑی عجلت سے چل کر کھڑکی کے قریب اپنی سیٹ محفوظ کر لی، پھر بڑے اطمینان سے جوتے کے فیتے کھولتا سوچنے لگا۔ پانچ گھنٹے کا مختصر سفر اخبار پڑھ کر یا باہر کے نظارے دیکھ کر با آسانی طے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نے سوچا، اخبار تو روز ہی پڑھا جاتا ہے۔ وہی واہیات قسم کی سنسنی خیز خبریں ہوں گی۔ دہشت پسندوں کی دہشت گردی اب اتنی عام ہوگئی ہے کہ لگتا ہے سو پچاس آدمیوں کی دردناک موت کوئی بڑا سانحہ یا کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہ گیا ہے۔ ریپ کے واقعات میں روز بروز اضافہ دیکھ کر ایسا لگتا ہے، اس نئے دور میں انسان کے مہذب بننے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ اب پوری ہونے جاری ہے اور...اور...

''اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں'' سامنے ایک نووارد کندھے پر ٹھیک اس جیسا بیگ لٹکائے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''ہوں!'' اس نے لاپرواہی سے ہنکار بھری اور ایک طویل وقفہ گزر جانے کے بعد بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ نووارد اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کس قدر اطمینان سے بیٹھا ہے اور اسے کن انکھیوں سے دیکھے جا رہا ہے۔

اخبار لپیٹ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ٹرین کے چل پڑنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ اس لحاظ سے پورے پانچ گھنٹوں کے بعد، یعنی دوپہر کے بارہ بجے وہ اسٹیشن پر اتر جائے گا۔ اسٹیشن کے خیال سے اسے جھرجھری سی آئی۔ گندہ، نامعقول سا اسٹیشن کا پلیٹ فارم، جس کی دیواریں، فرش یہاں تک کہ آتے جاتے مسافر بھی ٹوٹے پھوٹے لگتے ہیں۔ آخر سرکار ان چھوٹی چھوٹی جگہوں کو ترقی دینے اور صاف ستھرا رکھنے کے بارے میں کوئی پلان کیوں نہیں بناتی؟ کوئی عمدہ کام؟ کیا عمدگی آج کل صرف بڑے شہروں کا مقدر ہے۔ یکا یک آس پاس کے شور شرابے، دھکم پیل اور ریل گاڑی کے دھیرے دھیرے چھک چھک کر چلنے سے وہ بے چین سا ہو گیا۔

سامنے بیٹھا نووارد بدستور کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہا تھا۔ شاید وداع کرنے کے لئے آئے ہوئے ساتھیوں میں اسے اپنے کسی ساتھی کی تلاش تھی۔ لیکن ایسا کوئی تاثر اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ پلیٹ فارم جیسے ہی ختم ہوا ریل گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔ دونوں اپنی اپنی سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

''آپ؟''

''آپ؟''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ یکدم نووارد سے بے تعلق ہو کر سوچنے لگا۔ ریل سے اتر کر گاؤں جانے والی بس میں سوار ہونا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ دس سال پہلے کا واقعہ وہ بھولا نہیں تھا، جب وہ ایک بے حد میلی، دھول میں اٹی اور جگہ جگہ سے ادھڑی بس کے سامنے کھڑا سماعت پر گراں گزرنے والی آوازوں سے گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔

''کیا یہ بس کرنکوٹ جاتی ہے؟''

بس میں شور مچاتے اور ایک دوسرے کو ریلتے پیلتے مسافر اس سے اس قدر لاپرواہ تھے کہ نہ تو کسی نے جواب دینے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کی طرف دیکھنا گوارا کیا۔ کس قدر غیر اہم آدمی ہے وہ! وہ اپنے آپ پر جھلا اٹھا

تھا کہ بڑی سی پگڑی باندھے سامنے آتے ایک بوڑھے نے اسے اپنی میلی مونچھوں میں مسکرا کر دیکھا تھا اور یوں اس کی جانب لپکا تھا جیسے برسوں کا شناسا ہے۔ وہ قریب آیا تو اس نے پہچان کر تڑ سے کہا۔

''یار خواجہ میاں! تم میری عمر سے چھوٹے ہو کر بھی بڑھے لگتے ہو!''

بوڑھے خواجہ میاں نے کہا کچھ نہیں، بس اپنی میلی مونچھوں سے مسکراتا رہا اور اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے منہ میں بھرا تمباکو تھوکا اور سامنے بس کی جانب اشارہ کرکے بتایا۔ ''یہی بس کرنگوٹ جاتی ہے''

یکا یک اس نے سوچا ان دس برسوں میں کیا کچھ بدل گیا ہوگا اور اب ریل سے اترنے کے بعد شاید ہی کوئی جان پہچان والا مل جائے کہ پچھلے دس برسوں سے اموات کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ اخبار دیکھ لوں'' سامنے بیٹھا نووارد اس کے کھوئے ہوئے چہرے کو دیکھتا اس کی جانب جھک آیا۔ اس نے بڑی ناگواری سے نووارد کو دیکھا اور اخبار بڑھا دیا۔

''اقوام متحدہ کی دوغلی پالیسی نے کمزور ممالک کے معلوم لوگوں کے ساتھ...'' نووارد نے اخبار پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ اس نے مداخلت کی:

''اقوام متحدہ کا دوغلا پن اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اقوام متحدہ۔''

اس بار نووارد نے اندازہ لگایا کہ سامنے بیٹھا شخص بالکل بکھرا بکھرا سا ہے۔ اس نے اخبار پڑھنا چھوڑ کر عام مسافروں کی طرح اس سے پوچھا۔

''کہاں تک جائیں گے آپ؟''

''اپنی بستی تک۔''

''بستی؟'' نووارد کی سوالیہ نظریں ویسے بھی بری طرح الجھن کا شکار ہو رہی تھیں۔

''جی ہاں! پورے دس برسوں بعد اپنی بستی جا رہا ہوں۔ سنا ہے اور دیکھا بھی ہے گزرتے وقت کے ساتھ ہر چیز میں تبدیلی آجاتی ہے لیکن میں چند اشیا کو ان کی صحیح حالت میں دیکھنا پسند کرتا ہوں کہ ان سے وابستہ یادوں کے منظر نامے میں ایک جہان پاتا ہوں۔''

نووارد نے اندازہ لگایا سامنے بیٹھے مسافر کی سوچ کی رفتار ریل گاڑی کی رفتار سے زیادہ تیز ہے۔ ایسے میں اس سے کسی ایک موضوع پر بات چیت کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس نے کریدنے کے سے انداز میں پوچھا۔

''شاید آپ؟''

''جی ہاں میں اسی اسٹیشن پر اترنے والا ہوں جس اسٹیشن پر اردو کے ناول نگار عزیز احمد یہ سمجھ کر ریل سے اتر پڑے تھے کہ بشیر الدولہ کا بسایا ہوا شہر آگیا ہے۔''

''جی کیا کیا آپ نے؟'' اس بار نووارد یکدم بوکھلا گیا اور سیٹ چھوڑ کر جانے لگا۔

''سنئے!'' اس نے آواز دی۔ ''شاید آپ کو میری باتیں عجیب وغریب سی لگی ہوں گی، اپنی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھ جائیے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ باتیں جو دوسروں کو سناتا ہوں خود کو سناتا رہوں گا کہ اس میں میرا اپنا کچھ بگڑتا تو نہیں ہے۔ ہاں یہ جان کر مجھے بڑی آسودگی ملتی ہے کہ میں نے اپنے اندر ایک نہ بھولنے والا جہان آباد کر رکھا ہے۔''

اس کے بعد وہ نووارد سے بے تعلق ہو کر ریل کی کھڑکی کے باہر تیزی سے دوڑتے بھاگتے درختوں، چٹانوں اور کہیں کہیں سبزہ زاروں کو دیکھتا ہوا سوچنے لگا۔ ماں باپ کے گذرنے کے بعد ہم تین بچ رہے تھے، دو بھائی ایک بہن۔ ان میں ایک بھائی جو ہمیشہ بے آسرا ہونے کا رونا روتا تھا، قبائلیوں اور مزدور پیشہ لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا، اپنے اعلیٰ نسب خاندان سے کچھ ایسا دور ہوا کہ اپنی شناخت ہی کھو بیٹھا۔ اپنے پرائے کھو بیٹھا اور آخر میں ان جیسے درختوں یا چٹانوں کی مٹی میں ابد تک کے لئے سو گیا۔ اب معلوم نہیں کس چٹان کے سائے میں اس کی تدفین ہوئی یا کس درخت کی چھاؤں میں اسے دفن کرنے کے بعد تربت جیسی شے تعمیر کردی گئی۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ بڑا پہنچا ہوا آدمی تھا۔ جب کسی کو دکھائی دیتا دیکھنے والا اپنا سرنگوں کر لیتا۔ جب گھر میں داخل ہوتا خیر و برکت بھی اس کے ہمراہ داخل ہو جاتی اور جب گفتگو کرتا تو لوگ گھنٹوں اس کی باتوں کی حلاوت میں ڈوبے رہتے۔ اس کے نہ ہونے سے گھر کے پچھواڑے کا وہ خوبصورت باغیچہ اب تک بالکل تاراج ہو چکا ہوگا، اجڑ چکا ہوگا۔ اسے اس باغیچہ میں اگائی جانے والی دنیا جہاں کی جڑی بوٹیوں کے بارے میں بڑی اچھی جانکاری تھی۔ اپنے والد کی تحریر کردہ حکمت کی ضخیم قلمی کتابوں کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا کہ اس میں درج شدہ نسخے بزرگوں سے سینہ بہ سینہ ہو کر اس تک پہنچے تھے۔ لیکن اب جبکہ باغ ہی اجڑ چکا ہے تو ان جڑی بوٹیوں کے نام اور کام دونوں ہی بھلائے جا چکے ہیں۔

''کھٹ!'' اچانک ہی اس کا سر کھڑکی کی سلاخوں سے جا ٹکرایا۔ تیز رفتار ریل اس وقت کوئی بڑا موڑ مڑ رہی تھی اور ریل کے ڈبے ایک دوسرے سے علاحدہ ہو کر بھی ایک دوسرے کو تھامے چھک چھک دوڑے جا رہے تھے۔ اس نے اپنی نیند سے بوجھل پلکیں اٹھا کر سر ہلایا اور خجالت آمیز انداز میں ڈبے کے مسافروں کو دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

سامنے بیٹھے نووارد کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ نووارد

کو جگائے اور باتیں کرنا شروع کردے۔ دنیا جہان کی باتیں، گزرتے دنوں کی باتیں، تہذیبی اور ثقافتی یادوں کی باتیں وہ نووارد کو جگانے کے خیال سے قدرے پس و پیش میں پڑ گیا اور سوچنے لگا بھلا اس اجنبی کو اس کی ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ سب کچھ تو میرے سر میں سماتی ہوئی دھول، کوڑا کرکٹ اور گرد و غبار ہے اور ایک قسم کی دقیانوسیت ہے کہ میں ان سب سے اب بھی بے ربط سا الجھتا چلا جاتا ہوں۔

''اگر آپ پسند کریں تو ایک کپ چائے پی جائے؟'' اس نے چونک کر نووارد کی طرف دیکھا۔ نووارد کبھی کا جاگ چکا تھا اور اس کے چہرے پر آتے جاتے وہ سارے رنگ بھی اس نے دیکھ لئے تھے۔ وہ رنگ پھیکے، بے کیف اور بے جان رنگ۔

''چلتے چلاتے اپنی ضرورت کی چیزیں ساتھ ہوں تو منزل تک پہنچنے کا سفر فرحت بخش ہو جاتا ہے۔''

''اطمینان بخش!'' اس نے تصحیح کی۔ لیکن نووارد اچانک بول پڑا۔

''اطمینان؟'' موجودہ دور میں اب یہ چیزیں بہت کم لوگوں کو میسر ہیں کہ دن اور رات کا تضاد، بھلے اور برے کی پہچان، گالی اور دعا کا فرق۔ یہ سب کچھ اب مٹ رہا ہے۔''

دونوں نے آخری بڑا گھونٹ لے کر چائے ختم کی اور کھڑکی سے باہر بڑی تیزی سے دوڑتے بھاگتے اشجار، پہاڑ اور سرسبز میدانوں پر نظریں جمائے سوچا۔ ہم جو ایک دوسرے کے مقابل دو علاحدہ علاحدہ سیٹوں پر بیٹھے ہیں اور دونوں کی منزل بھی جدا ہے ایک دوسرے سے کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔

ریل گاڑی دو متوازی پٹریوں پر تیزی سے دوڑی جارہی تھی۔ سفر، مدام سفر، آنے والے دنوں کے بارے میں کوئی مستقل بات، کوئی اٹل فیصلہ ممکن نہیں۔ اس نے سوچا، منظر بدلتے ہیں، منظر بدلتے رہیں گے، مغلیہ دور نے دلی میں اردو بازار بسایا، آصفی دور نے حیدرآباد میں بیگم بازار بسایا، لیکن آج ان بازاروں میں کسی شان سے دھول اڑتی ہے کہ کمزور صحت والی معصوم نسل کے پھیپھڑے، سانس کی بے عیب نالیاں اور سفید چمکیلی آنکھیں یوں ہی دھول میں برباد ہوتی جارہی ہیں۔

اب اس پیشین گوئی پر کوئی شک بھی نہ رہا کہ 2025 میں چالیس فیصد آبادی کینسر کا شکار ہوگی۔

''اکیسویں صدی کی اس پیشن گوئی کے بارے میں مجھے بھی معلوم ہے'' نووارد اچانک بول پڑا۔ ''لیکن یہ اتنی تشویش ناک یا دھماکہ خیز خبر نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ہی اسے مسئلہ بنایا جائے کہ آج کل نئی اور مہلک بیماری کے دفاع کے لئے نت نئے تجربے بھی ہو رہے ہیں، نئی دریافتیں بھی''

''شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو موت آتی ہے پر نہیں آتی'' اس نے نووارد کو بلاوجہ مسکرا کر دیکھا۔ ''ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ علاج کے نت نئے طریقوں اور دریافتوں کے باوجود ہم سب کی منزل، ہم سب کا مقدر، ہم سب کا آخری پڑاؤ ایک ہی ہے، ممکن ہے میں تم سے پہلے آخری منزل پر پہنچ جاؤں۔''

''ممکن ہے'' اچانک نووارد نے حامی بھری اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ چند ہی لمحوں میں ریل گاڑی مہاندی کے اس پل پر سے گزرنے والی تھی جس کے طول کا تصور کرتے ہوئے پورے بدن میں جھرجھری سی آجاتی ہے۔ ندی کے میلوں پھیلے وسیع و عریض، ریتیلے پاٹ کو دیکھ کر لگتا تھا کہ سینے میں آتی جاتی سانسیں بھی گھٹ جائیں گی۔ نووارد نے برق رفتار دوڑتی ریل کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے، بہت نیچے ندی کے شانت بہتے پانی کو دیکھا اور اسے لگا تیز رفتار دوڑتی ریل کے شور کے ساتھ پل میں لگے لوہے کے بھاری بھرکم شہتیر بڑا بھیانک شور مچانے لگے ہیں۔ اور یوں اس شور سے ندی کا شانت پانی بھی گھبرا اٹھا ہے اور کانپنے لگا ہے۔ نووارد نے بڑی عقیدت کے ساتھ اپنی پلکیں بند کرلیں اور ہاتھ جوڑ کر مہاندی کو پرنام کرنے لگا۔

''مہاندی کے بعد آنے والا اسٹیشن ہی میری منزل ہے'' اس نے نووارد کو بتایا۔ پھر پوچھا ''تم شاید آگے جاؤ گے؟''

''نہیں! میں بھی اس اسٹیشن پر اترنے والا ہوں۔'' نووارد کے جواب پر اسے قدرے حیرت ہوئی، یعنی پانچ گھنٹوں کی طویل قربت کے باوجود ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی منزل کا اتہ پتہ بھی نہیں بتاسکے اور یہ بھی کہ نام... کام... گھر... بیوی، بچے... یہ سب کچھ ان کے بارے میں کہ...

''غیر ضروری... بالکل غیر ضروری''

''فضول... بالکل فضول''

نہ جانے کس نے کس کو کہا۔

یکا یک دونوں نے محسوس کیا ریل گاڑی کی رفتار دھیرے دھیرے کم ہونے لگی ہے۔ آؤٹر سگنل گزرنے سے قبل ہی دونوں نے جوتے کے فیتے باندھے، کھلے ہوئے سفری بیگ کی زپ درست کی، پھر دونوں نے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی اہم سوال پوچھنا رہ گیا ہو۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی نہ پوچھ پائے۔

ریل گاڑی سیٹی بجاتی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی۔ مسافر اپنا اپنا سامان اٹھائے ریل سے اترنے لگے۔ اس نے اٹھنے سے قبل نووارد کو دیکھا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ جگہ جس پر نووارد بیٹھا تھا، بالکل خالی تھی۔

OO

گڈ بوائے

یٰسین احمد

اس نے اپنی زندگی کے 26 برس کنوارے پن میں گذار دیئے۔ کبھی کسی عورت کو چھوا اور نہ چکھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کوئی خامی تھی۔ وہ تو ایک بھرپور مرد تھا۔ توانا صحت مند، گبرو اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ اسے کسی عورت کے قرب کے مواقع میسر نہیں ہوئے تھے وہ تو جیسے عورتوں کے سمندر میں رہتا تھا لیکن کیا مجال کہ کبھی گیلا ہوا ہو۔ آگے عورت، پیچھے عورت، دائیں جانب عورت، بائیں جانب عورت...اور عورتیں بھی ایسی جو ذات پات، زبان، علاقہ اور رنگ و نسل کے تعصبات سے بالاتر...جو بڑی بڑی اعلیٰ درس گاہوں سے کندن بن کر نکلی تھیں۔ سائنس، کمپیوٹر، ٹکنالوجی، بزنس، مینجمنٹ، ڈیزائننگ، بینکنگ، انشورنس، اسٹاک ایکسچینج اور دوسرے کئی عہد حاضر سے جڑے ہوئے شعبوں پر اتھارٹی رکھنے والی...ایک سینئر پروجیکٹ لیڈر ہونے کی وجہ سے اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی تھیں۔ حالانکہ ان کی آنکھوں میں ہوس کی رتی برابر بھی جھلک نہیں ہوتی لیکن اس کی شخصیت سے بے حد متاثر...اگر غلطی سے بھی کبھی اشارہ کر دیتا تو اپنے سینے سے دل نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دیتیں۔

سافٹ وئیر کی دنیا میں اس کمپنی کی حیثیت بہت اونچی اور نمایاں تھی جہاں وہ کام کرتا تھا۔ بڑے بڑے ملکوں اور شہروں میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہانگ کانگ، ملیشیا، سنگاپور، دوبئی، لندن، روم، پیرس، لاس اینجلس، شکاگو، نیویارک اور پھر کلکتہ، دہلی، ممبئی اور بنگلور.... یہاں دو شفٹیں چلتی تھیں۔ رات اور دن کی۔ ہر شفٹ میں تقریباً دو ہزار افراد کام کرتے تھے۔ کام کی تقسیم مختلف ٹیموں میں کی گئی تھی۔ ہر ٹیم اٹھارہ تا بیس افراد پر مشتمل ہوتی اور ہر ٹیم کا ایک سینئر پروجیکٹ لیڈر ہوتا۔ ان ٹیموں میں ساٹھ فیصد عورتیں کام کرتی تھیں، جن کی ڈیوٹی ایک ماہ، دو ماہ اور کبھی چھ ماہ میں تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ تبدیلی کا انحصار کام کی نوعیت اور تکمیل پر ہوتا تھا۔

کون کب آ رہا ہے اور کب جا رہا ہے اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں سے آیا اور کب تک اس ٹیم میں رہے گا، اس کی فکر بھی نہیں رہتی تھی۔ جو بھی آتا اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتا، رسمی تعاون کے بعد سب کام میں جٹ جاتے۔ اس کے ذمے عالمی بینکوں کو مالیاتی (Financial) خدمات اور (Soluition) فراہم کرنا تھا۔

تین ساڑھے تین سال کی قلیل مدت میں اس نے کام میں غیر معمولی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مہینوں کا کام ہفتوں میں ہفتوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا کام گھنٹوں میں انجام دیتا۔ ڈیوٹی رات کی ہو یا دن کی کبھی عذر لنگ پیش نہیں کرتا اور نہ کام کی رفتار میں انحطاط دکھائی دیتا۔ کمپنی کے سینئر عہدے دارے اس کے کام کو سراہتے اور احترام کرتے تھے۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کمپنی نے دو بار اس کو دوبئی اور ہانگ کانگ کے دورے پر بھجوایا تھا۔ وہاں بھی اس نے اپنی لیاقت کے جوہر دکھائے تھے۔ جب وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر کام میں جٹ جاتا تو احساس نہیں ہوتا کہ وہ بھی ایک گوشت پوست کا چلتا پھرتا انسان ہے۔ اس کا وجود کمپیوٹر کا ایک جز بن جاتا اور دماغ کمپیوٹر سے بھی تیز بھاگنے لگتا۔

ایسے نوجوان دوسروں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے ہیں لیکن وہ تھا کسی بند تالے کی طرح جس کی چابی کسی کے ہاتھ لگتی ہی نہیں تھی۔

اس دن اس کے ڈویژنل منیجر نے ایک عورت سے اس کا تعارف کرایا جو مقامی نہیں تھی۔ سفید فام تھی۔ عورت کا نام بھی بتایا تھا جو اس نے سنا، لیکن ایسا لگا کہ عین اسی لمحے میں ایک زبردست زلزلہ آ گیا ہے اور حواس کے مضبوط قلعے میں سینکڑوں رخنے پڑ گئے ہیں۔ عورت کا نام ذہن سے محو ہوا اور ساتھ ہی ساتھ بصارت، سماعت، گویائی اور ادراک بھی مفلوج ہو گیا۔ عورت کی شخصیت ایسی ہی سحر انگیز تھی کہ اس کو اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر عورت کے ملکوتی

حسن کا جائزہ لینا پڑا تھا۔

اس دن Full Formal Day تھا یعنی ہر کوئی ایک ہی رنگ ایک ہی وضع قطع کے لباس میں نظر آرہا تھا۔ جونیئر، سینئر کا امتیاز مٹ گیا تھا۔ اب پتہ نہیں کہ محض یہ اتفاق تھا یا قصداً عورت نے بھی اسی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ جب کہ وزیٹرس پر لباس کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ لباس چست نہیں تھا، خاصہ ڈھیلا ڈھالا تھا۔ لیکن... جسم کے ان خطوط پر قابو نہیں رکھ سکا تھا جو مزاحمت پر اتر آئے تھے۔ وہ ایک عالمی بینک کے نمائندہ کی حیثیت دبئی اور ہانگ کانگ ہوتی ہوئی یہاں پہونچی تھی۔ منیجر اس سے مخاطب ہوا۔ ''میڈم کا قیام یہاں ایک ماہ تک رہے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا پروجیکٹ آپ کتنے دنوں میں مکمل کر سکتے ہیں۔''

وہ متانت سے بولا۔ ''آج سے ہی کام شروع کریں۔''

میڈم اور منیجر دونوں مسکرائے۔ منیجر بولا ''میڈم آج ہی آئی ہیں، وہ آج آرام کریں گی۔ کام کل سے شروع ہوگا۔''

لنچ بریک ہو چکا تھا۔ وہ لنچ کے لئے منیجر کے ساتھ ڈیننگ ہال کی طرف جا رہی تھی۔ جاتے جاتے وہ پلٹی اور اسے مخاطب ہوئی۔ ''کیا آپ لنچ پر ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟''

وہ لنچ سے فارغ ہو چکا تھا۔ خندہ پیشانی سے اس نے معذرت چاہی۔ ان دونوں کے جاتے ہی وہ ذہن پر زور دینے لگا کہ منیجر نے عورت کا کیا نام بتایا تھا۔ پچھلے دنوں اس نے ٹی وی پر ایک ڈاکومنٹری فلم دیکھی تھی جو قلوپطرہ کی زندگی پر مبنی تھی۔ دریائے نیل کے کنارے قلوپطرہ کا عظیم الشان محل، قلوپطرہ کا شاہی طمطراق، اس کی شب و روز کی مصروفیتوں کا احوال اور اس کے حسن کے کارناموں کو دیکھ کر وہ متحیر رہ گیا تھا۔ قلوپطرہ کا پیکر اس کے دماغ سے چمٹ گیا تھا۔ ابھی ابھی جس عورت سے ملا وہ قلوپطرہ سے بہت ملتی جلتی تھی۔ وہی سرو قامتی، وہی بڑی بڑی نیلی آنکھیں جیسے دریائے نیل کا پانی آنکھوں میں اتر گیا ہو۔ وہی تابناک چہرہ، وہی تراشیدہ جسم... قلوپطرہ یقیناً ایسی ہی رہی ہوگی۔ اس نے سوچا عورت کا نام خواہ کچھ ہو وہ اسے قلوپطرہ کے نام سے مخاطب کرے گا۔

دوسرے دن وہ آفس آئی، نہایت ہی وقار اور تمکنت کے ساتھ۔ تھوڑی دیر تک رسمی تعارف ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے بارے میں اس کے کام کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ پروجیکٹ پر تفصیلی گفتگو کے بعد وہ دونوں کام میں جٹ گئے۔ اسی کی طرح وہ بھی کام کی دھنی تھی۔ کام میں ڈوب جاتی تو سدھ بدھ نہیں رہتی تھی۔ لیکن ٹی بریک میں، لنچ بریک میں وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے جن کا تعلق کام سے قطعاً نہیں ہوتا۔

تین چار دن متواتر ملاقاتیں ہوتی رہیں تو تکلفات کے پردے خود بخود اٹھنے لگے اور دل کی نرم نرم زمین پر دوستی کی کونپلیں پھوٹیں۔ وہ خوش پوش تھی، خوش اخلاق تھی، خوش گفتار تھی، خوش طبع تھی، جتنی حسین تھی اتنی ہی ذہین تھی۔ صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک اس کا ساتھ رہتا تھا۔ یہ ان کی ڈیوٹی تھی۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ ڈیوٹی کے بعد بھی وہ ساتھ رہے۔ شہر میں گھومے، بڑے بڑے بازار شاپنگ کامپلکس اور تفریحی مقامات پر اس کا ساتھ دے۔ وہ اس قسم کی مصروفیتوں سے گھبراتا تھا لیکن اب اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ایک عجیب قسم کی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

وہ فطرتاً تنہائی پسند تھا۔ ڈیوٹی ختم ہوتے ہی فلیٹ پر چلا جاتا۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد ماں باپ سے فون پر گفتگو کرتا اور پھر کمپیوٹر کھول کر اپنی منگیتر سے چیٹنگ کرتا جو اس سے کوسوں دور تھی۔ جس کے نام اس نے اپنے سارے حقوق محفوظ کر رکھے تھے۔ لیکن اب ڈیوٹی کے بعد روزانہ چار پانچ گھنٹے اس کے ساتھ گذارنا پڑ رہا تھا جس کی وجہ سے روزمرہ کے پروگرام میں اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔

اس دن کمپنی کی جانب سے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اسے بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر شرکت نہیں کی تھی۔ گھر پر رہ کر ماں باپ سے فون پر گفتگو کی۔ کھانا کھایا اور پھر کمپیوٹر کھول کر اپنی منگیتر سے چیٹنگ جو شروع کی تو یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا۔ بستر پر لیٹا تو رات کافی گذر چکی تھی۔ آنکھوں پر نیند کا غلبہ چھا رہا تھا کہ یکایک فون کی گھنٹی بجی۔ فون ماں نے نہیں کیا تھا منگیتر نے بھی نہیں کیا تھا۔ فون تھا اس بلائے جان کا... آواز پہچان کر اس نے کہا ''میں نے سوچا کہ اتنی رات کو فون گھر سے آیا ہوگا۔''

''ماں باپ آدھی رات کو اپنی اولاد کی نیند حرام نہیں کرتے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''فون تو وہی کرتا ہے جس کی اپنی نیند اڑ چکی ہو۔ پارٹی میں میں نے تمہیں کتنا مس کیا جانتے ہو؟''

قبل اس کے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا یکایک اس کا لہجہ بدل گیا اور ترش لہجے میں بولی ''میں سمجھ رہی ہوں، سب سمجھ رہی ہوں، تم اپنا ریپوٹیشن برقرار رکھنے کے لئے ایک ماہ کا کام بیس اکیس دن میں ختم کر کے مجھ کو یہاں سے ٹرخانا چاہتے ہو۔ لیکن میں مختلف ہوں، جب تک میری مرضی ہے میں یہیں رہوں گی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا ارادہ...!!'' اس نے وضاحت

کرنا چاہا مگر موقع ملتا تو وضاحت کرتا۔ دوسری طرف سے فون کا سلسلہ منقطع تو نہیں ہوا تھا لیکن تیز تیز سانس لینے اور خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ ریسیور کو کریڈل پر رکھے بغیر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اس پر نیند کا غلبہ طاری تھا یا پھر کوئی اور بات...!!

صبح آفس میں آمنا سامنا ہوا تو اس میں رتی برابر بھی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ چہرے پر شرمندگی تھی اور نہ غصہ جیسے رات میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ لنچ میں اس نے منیجر سے فون پر گفتگو کی تاکہ اس کی واپسی کی تاریخ کنفرم کرا دے۔ وہ شیڈول کے مطابق لوٹ جانا چاہتی تھی۔ وہ دن بھر اس کی مصروفیتوں کو دیکھتا رہا اور چپ رہا۔ اندر ہی اندر ایک عجیب قسم کی بے چینی پھیل گئی تھی۔ جب تک وہ یہاں رہی وہ دور دور بھاگتا رہا۔ اس کی واپسی کے دن قریب آئے تو ایک بے نام سی کسک دل میں جاگ گئی تھی۔

شام کو ایک دوست کے ساتھ باہر نکلا۔ پروگرام تھا کہ منی رتنم کی فلم دیکھی جائے جس کا شہر میں کافی چرچا ہو رہا تھا۔ وہ منی رتنم کی ہدایت کاری کو پسند کرتا تھا، لیکن آفس پارکنگ میں وہ نظر آئی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ اسے دیکھتے ہی تھوڑا سا جھک کر کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے باوردی ڈرائیور بیٹھا تھا، جس کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ وہ جز بز ہو گیا۔ ایسے موقع پر اس کی سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا اقدام کرے؟

اس نے دوست سے معذرت چاہی اور کار میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی تھی۔ وہ بولی "میرے جانے میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ کیوں نہ ہم زیادہ سے زیادہ وقت اکٹھے گزاریں۔"

اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کار سڑک پر دوڑ رہی تھی لیکن کہاں جا رہی تھی اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ مترنم آواز میں بولی۔ "پہلی بار جب میں نے تم کو دیکھا تھا تو ایک نام تمہارے لئے سوچا تھا۔ جانتے ہو وہ نام کیا ہے؟" وہ اسے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ "گڈ بوائے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ دونوں اب 'آپ' کے حصار سے نکل آئے تھے۔ ایک دوسرے کو تم سے مخاطب کرتے تو اپنائیت کا شریں احساس رگوں میں دوڑ جاتا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اور میں نے سوچا تھا کہ تمہارا نام قلوپطرہ ہونا چاہئے۔"

"یہ نام تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟ کیا میں تم کو خطرناک لگتی ہوں۔"

"نہیں بلکہ تمہارے ملکوتی حسن کو دیکھ کر میں نے یہ نام سوچا تھا۔"

"اوہ!" وہ ہنسی۔ اس کا چہرہ کس قدر سرخ ہو گیا تھا۔ باہر قمقمے روشن ہونے لگے تھے۔ مختلف قسم کی روشنیوں میں ڈھیرے ڈھیرے نہاتا ہوا شہر جگمگ کرنے لگا تھا۔ وہ دیر تک ادھر ادھر بے مقصد گھومتے رہے۔ اس نے ایک بک اسٹال سے کتابیں اور کچھ رسالے خریدیں۔ KFC کی دکان سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں پارسل کرائیں۔ اس کو گیسٹ ہاؤس جانا تھا، اس کا فلیٹ گیسٹ ہاؤس جانے سے پہلے درمیان میں پڑتا تھا۔ اس نے وہاں کار رکوائی تو وہ بولی۔ "اپنا فلیٹ نہیں دکھاؤ گے؟"

وہ لاپرواہی سے بولا "ایک مجرد کے فلیٹ میں کیا ہوتا ہے؟ گندگی، بے ترتیبی، بدسلیقگی اور سناٹوں کے سوا وہاں تمہیں کیا ملے گا۔"

"یہی تو میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

فرار کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ کار سے اترا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھما کر اسے رخصت کیا اور دونوں فلیٹ کی طرف چل پڑے۔ رات ہو چکی تھی لیکن آسمان ستاروں سے خالی تھا۔ موسم ٹھنڈا تھا لیکن ٹھنڈک ناگوار نہیں تھی۔ اطراف واکناف لوگوں کی چہل پہل تھی لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ دونوں فلیٹ میں داخل ہوئے۔ اندر داخل ہوتے ہی سجا سجایا ہوا فلیٹ دیکھ کر اس نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا۔

"اوہ۔ تمہارا فلیٹ تو غیر معمولی خوبصورت ہے۔"

اس نے اپنا پرس اور دوسرا سامان میز پر رکھا اور اس کے فلیٹ کا جائزہ لینے لگی۔ خواب گاہ، ہال، کچن اور باتھ روم، ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی چھوتی اور تعریف کے پل باندھتے جاتی۔ "یقین نہیں آتا کہ فلیٹ کی اتنی عمدہ سجاوٹ میں کسی عورت کا ہاتھ نہیں ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، لباس تبدیل کرنے کے لئے خواب گاہ میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو وہ کمپیوٹر کے روبرو بیٹھی تھی۔ اس نے کمپیوٹر آن کر دیا اور پھر اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ کمپیوٹر کے چھوٹے سے اسکرین پر اس کی منگیتر کا حسین چہرہ روشن ہو گیا تھا وہ اس کی منگیتر کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"بہت خوبصورت ہے۔ تمہاری بیوی ہے؟"

"نہیں منگیتر۔" اس نے جواب دیا، "اس سال کے اواخر تک بیوی بن جائے گی۔"

وہ ایک لمحہ خاموش رہی پھر گمبھیر لہجے میں بولی۔ "شادی کے بعد ہنی مون کے لئے میرے پاس آنا۔ میرے مہمان رہنا، میں تم دونوں کو امریکہ دکھاؤں گی۔"

وہ کھانے پینے کی چیزوں کا پارسل کھول کر پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھی اور فریج کھول کر اندر دیکھنے لگی۔ فریج کھانے پینے کی اشیا اور پھلوں سے بھرا ہوا تھا۔ مشروب میں کوک کے علاوہ اور کچھ نہ

تھا۔ کوک کی ایک بوتل فریج سے نکالتے ہوئے وہ مسکرائی اور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''صرف کوک پیتے ہو، گڈ بوائے!''

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فون رسیو کرنے کے لئے گیا جہاں فون رکھا ہوا تھا۔ فون ماں کا تھا۔ حسب معمول ماں نے دیر تک اس سے بات کی۔ فون بند ہونے کے بعد کمرے سے باہر نکلا تو وہ ایک لمحے کے لئے جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن کی رفتار تیز ہوتی گئی اور کانوں میں سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ نہیں سیٹیاں نہیں۔ خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔ ایسا ہی جیسے کئی عمارت میں اچانک آگ لگ جانے سے الارم بج اٹھتا ہے...

جتنی دیر تک وہ فون میں مشغول رہا تھا اتنی دیر تک وہ اپنا لباس تبدیل کر چکی تھی۔ اس کا نائٹ سوٹ پہن کر بیٹھی کوک کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھتا رہا۔ شرٹ کے اوپری دو تین بٹن کھلے ہوئے تھے۔ انجانے میں ایسا ہوا تھا یا قصداً... یہ اب کون بتائے۔ کوک سے بھرا ہوا گلاس اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ بولی۔ ''ایسا کیا دیکھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ ایک ثانیہ کے لئے ڈگمگایا اور پھر سنبھل گیا۔

''کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچانک سارا کمرہ روشن کیوں ہو گیا؟''

وہ وہاں سے اٹھی اور اس کے قریب آئی۔ قریب، اتنا قریب کہ اس کی سانسوں کی تپش کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً ایک ہی سانس میں کوک کا آدھا گلاس خالی کر دیا اور کوک جیسے ہی حلق میں اترا، اس کو محسوس ہوا جیسے کسی نشے کی دھند میں اس کا وجود گم ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ نشہ نہیں تھا۔ بے ہوشی بھی نہیں تھی۔ غنودگی بھی نہیں تھی۔

وہ تو ایک ایسا سرور تھا جو سرعت سے اس پر چھاتا جا رہا تھا اور پھر خطرے کا الارم بجنے لگا... آگ ساری عمارت میں پھیلتی جا رہی تھی۔

صبح وہ اس وقت جاگا تھا جب سورج کی تیز کرنیں کھڑکی کے آئینوں سے چھن کر اس کے نیم برہنہ جسم کو جھلسانے لگی تھی۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کمرہ خالی تھا، وہ جا چکی تھی۔ لیکن اس کے جسم کی خوشبو تکیوں میں، بستر میں اور اس کے وجود میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

بستر کے سرہانے ایک مختصر سی تحریر ملی اور ساتھ ہی ہزار ہزار کے چار نوٹ۔ یعنی چار ہزار ڈالر۔ فلیٹ کی چابی پیپر ویٹ کا فرض انجام دے رہی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''میں تم سے تمہارے وجود کا بہت سارا حصہ سمیٹ کر لے جا رہی ہوں جو آئندہ زندگی میں مجھ کو سہارا دے گا۔ چار ہزار ڈالر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تمہاری قیمت لگائی ہے۔ میں تم کو کچھ نہیں دے سکی۔ ان پیسوں سے ایسی سوغات خریدنا جو تم کو ہمیشہ میری یاد دلاتی رہے۔

گڈ بائی۔ گڈ بوائے۔ تمہاری قلوپطرہ۔''

OO

رقاصہ

یوگیش چندر شرما

ہندی سے ترجمہ: ڈاکٹر خان حفیظ

1857 کی جنگ آزادی کے تمام سلگتے منظروں میں اسے ایک منظر۔ اپنی عظیم طاقت کے بل پر انگریزوں نے کانپور کی جنگ جیت لی تھی۔ کانپور پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن عوام کے دلوں کو جیت نہ سکے۔ آزادی کے متوالے بدلے کی آگ کو اپنے دلوں میں چھپائے کانپور شہر سے باہر نکل گئے اور ادھر ادھر جنگلوں میں چھپ کر جب تب انگریزوں پر حملہ کر کے انھیں نقصان پہونچانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔ ایک طرح کی چھاپہ مار جنگ چل رہی تھی۔ کئی انگریز ٹکڑیاں ان چھاپا ماروں کا صفایا کرنے کے مقصد سے کانپور کے جنگلوں میں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ اس طرح کی ایک ٹکڑی میں سے دو انگریز سپاہی بچھڑ کر دوسرے طرف کے جنگلوں میں آ نکلے۔ دونوں کے پاس بھری ہوئی بندوقیں تھیں، مگر پھر بھی وہ خوف زدہ تھے۔ ان میں سے ایک تھا واٹسن اور دوسرا تھا ہیری۔

راستے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے دن ڈھلنے لگا۔ انھیں اس وقت بڑے زوروں کی پیاس لگ رہی تھی مگر دور دور تک کہیں پانی کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ انھیں لگ رہا تھا جیسے پیاسے ہی کانپور کے اس جنگل میں انھیں اپنے دم توڑنے پڑیں گے۔ یکا یک سامنے کھلی جگہ پر ایک کنواں اور اس کے کنارے پر رکھے ایک مٹکے کو دیکھ کر، ان کے چہرے پہ مسکان چھا گئی۔ انھیں گمان ہوا کہ کہیں کسی نے ان کے لئے جال تو نہیں بچھا رکھا۔ ادھر ادھر انھوں نے محتاط انداز میں نظریں دوڑائیں۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ سوچا شاید کسی دودھ والے نے اپنے لئے پانی بھر کر رکھا ہوگا اور کہیں دوسری جانب اپنے جانوروں کے ساتھ چلا گیا ہوگا۔ انگریز سپاہی نہایت محتاط انداز میں آگے بڑھے۔ پیاس انھیں آگے دھکیل رہی تھی، مگر خوف ان کے بڑھتے قدموں کو روک رہا تھا۔

واٹسن تھوڑا آگے تھا اور ہیری اس کے پیچھے۔ ابھی وہ پانی کے مٹکے کے پاس پہنچے بھی نہیں تھے کہ سنسناتی ہوئی ایک گولی واٹسن کے کان کے پاس سے نکل گئی۔ واٹسن اور ہیری دونوں فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی لگاتار دو اور گولیاں ان کے اوپر سے سنسناتی نکل گئیں۔ اونچی اونچی گھاس نے انھیں بچنے میں مدد کی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ پیچھے کی جانب کھسک چلے۔ بعد ازاں گولیاں نہیں آئیں۔ انھوں نے قیاس لگایا کہ گولی چلانے والا شخص شاید اکیلا ہے۔ جس طرف سے گولیاں آئی تھیں اس کا بھی انھوں نے اندازہ لگایا۔ مگر اس طرف کوئی آدمی انھیں نظر نہیں آیا۔ لہٰذا اپنی بندوقوں کا استعمال کرنا انھیں فی الحال فضول لگا۔

حفاظتی جگہ پر پہونچ کر وہ دونوں ایک آڑ لے کر کھڑے ہو گئے۔ خواہش ہوئی کہ وہاں سے بھاگ نکلیں۔ مگر پیاس زوروں سے لگی ہوئی تھی۔ پھر ان کا گمان کہ گولی والا شخص ایک ہی ہے انھیں ہمت دلا رہا تھا۔ واٹسن کے پاس دوربین تھی۔ اس نے اسے نکالا اور گولی چلانے والے آدمی کی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ واٹسن اور ہیری نے مل کر پلان بنایا۔ اس پلان کے مطابق وہ اس جگہ سے تھوڑا اور پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد جس جگہ سے ان پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ وہ دبے پاؤں دھیرے دھیرے اس کے پیچھے کی طرف بڑھنے لگے۔ گولی چلانے والا ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ ایک درخت کی آڑ لئے وہ محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا جس سے اس نے انگریز سپاہیوں پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں سامنے کی طرف تھیں اور ان انگریز سپاہیوں کو تلاش رہی تھیں جو رینگتے ہوئے لیٹے تھے۔ لہٰذا وہ اپنے پیچھے کے خطرے کو نہیں سمجھ پایا جہاں وہ دونوں انگریز سپاہی دبے پاؤں آ کر کھڑے ہو گئے اور اب اس نوجوان کو زندہ پکڑنے کا پلان بنا رہے تھے۔

واٹسن نے اس نوجوان پر اچانک ہی جست لگائی اور اسے زمین پر پٹخ دیا۔ ہیری اپنی بندوق تانے کسی بھی اچانک حملے کے لئے تیار تھا۔ نوجوان کے ہاتھ کا پستول اچانک حملہ سے جھٹک کر ایک طرف گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نوجوان کے سر کا صافا کھل گیا اور اس میں سے اس کے لہراتے لمبے خوبصورت بال کھل کر بکھر گئے۔ اب وہ نوجوان نہیں ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ واٹسن اور ہیری حیرت و استعجاب میں پڑ گئے۔ ان کے منہ سے تقریباً ایک ساتھ نکل پڑا ''اوہ گاڈ''

واٹسن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہیری نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے بھی اپنی تنی ہوئی بندوق کو نہیں چھوڑا۔ واٹسن نے اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے دریافت کیا

''کون ہو تم؟''

وہ عورت نئے حالات کا سامنا کرنے کے لئے شائد اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر خوف و ہراس کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر کچھ دور پڑی اپنی پستول پر ڈالی اور پھر اپنے اوپر تنی دو دو بندوقوں کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس عورت کو خاموشی سے مسکراتے دیکھ کر وانسن غصے سے بھر گیا۔ اس نے اپنی آواز کو کرخت بناتے ہوئے پوچھا۔ ''جلدی بتاؤ، تم کون ہو؟ نہیں تو گولی مار دوں گا۔''

اس عورت نے اس بار وانسن پر مدہوش نظریں ڈالیں۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے سوال کا کیا جواب ہے میں کون ہوں؟ یہ تو اب صاف ہی ہو چکا ہے کہ میں ایک عورت ہوں۔'' اس کے ہونٹوں کی مسکان اب اور زیادہ گہری ہو رہی تھی۔ وانسن کو لگا جیسے عورت کی نظریں اور شوخ مسکراہٹ اس کو بے چین کئے دے رہی ہیں۔ اسے لگ رہا تھا شاید وہ غلط جگہ پر آ پہنچا ہے مگر اس عورت کے ہاتھوں کا وہ پستول جواب دور پڑا تھا اس کو نظر انداز کر کے ہیری لگا تار اس عورت کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے اس نے اس عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے مگر کہاں دیکھا ہے۔ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ہی اسے یاد آیا۔ ایک عورت جس نے کانپور میں عورتوں کی ایک سینا بنائی تھی۔ اس فوج نے انگریز فوج سے باقاعدہ ٹکر لی تھی اور جب کانپور کی شکست ہوئی تو وہ عورت اکیلی ہی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے تیر کی طرح انگریز فوج کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس وقت انگریز سپاہی اس عورت کی خوبصورتی کو دیکھتے رہ گئے۔ کسی نے بھی اسے روکنے کے بارے میں یا اس پر گولی چلانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ جب یہ بات اس کے دماغ میں آئی تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ان سپاہیوں کی پکڑ سے بہت دور ہو چکی تھی دوسرے سپاہیوں کی طرح ہیری بھی اس وقت اسے دیکھ کر اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس عورت کا نام عزیزن ہے۔ کانپور میں رقص کرتی ہے۔ ''رقاصہ اور جنگ؟'' دیگر سپاہیوں کی طرح ہیری بھی اس وقت یہ سوچ کر متحیر تھا۔ وانسن کے سوال پر عورت کچھ سوچ رہی تھی کہ ہیری بول اٹھا ''تمہارا نام عزیزن ہی ہے...'' اس عورت نے بلا گھبرائے جواب دیا ''ہاں میں عزیزن ہی ہوں۔''

سنتے ہی وانسن حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے عزیزن کو پہلے دیکھا تو نہیں تھا لیکن کانپور کی جنگ میں، اس کی بہادری کے بارے میں اس نے کافی کچھ سنا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے سامنے مجبور سی کھڑی عورت عزیزن ہے مگر ہیری اسے پہلے دیکھ چکا تھا اس لئے اسے یقین کرنا پڑا۔ ہیری نے انگریزی بولتے ہوئے صلاح دی کہ عزیزن کو فوراً گولی مار دو۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ وانسن اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس عورت کو ہم اپنے کمانڈر کو سونپیں گے اور وہی اس کے لئے مناسب سزا تجویز کریں گے۔ اسے امید تھی کہ اس کا کمانڈر ضرور ہی اس کے لئے انعام سے سرفراز کرے گا۔

وانسن نے ہیری سے کہا کہ وہ جلدی جا کر پانی پی آئے تب تک وہ از خود عزیزن کی نگرانی رکھے گا۔ وانسن کا خیال تھا کہ جب ہیری لوٹ کر آ جائے گا تو وانسن پانی پینے چلا جائے گا اور ہیری عزیزن کی نگرانی کرے گا۔ بعد ازاں عزیزن کی مدد سے راستہ ڈھونڈھ کر یا اپنی ٹکڑی سے جا ملے گا۔ اسے یقین تھا کہ موت کے ڈر سے عزیزن راستہ ڈھونڈھنے میں اس کی مدد کرے گی۔

ہیری وانسن کو خبردار رہنے کی صلاح دیتے ہوئے ادھر چل دیا جہاں پانی کا گھڑا رکھا تھا۔ ہیری کے جاتے ہی عزیزن نے وانسن کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں کھڑی ہو جاؤں، پڑے پڑے پیر اکڑنے لگے ہیں۔ عزیزن ابھی تک زمین پر ہی پڑی تھی۔ وانسن کو اس کے کھڑے ہونے میں اعتراض کی بات نظر نہیں آئی۔ وہ اپنے ہاتھ میں بندوق سنبھالے ہوئے تھا۔ مگر اسے لگ رہا تھا کہ عزیزن بھی ویسے ہی ایک عورت ہے جیسے اکثر ہوتی ہیں۔ اس نے عزیزن کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی۔ ویسے وہ چاہ تو یہی رہا تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دے تا کہ اس بہانے اس کا لمس محسوس کرلے۔ وانسن دل ہی دل میں اسے ''بیوٹی کوئین'' مان چکا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے عزیزن کو چھونے کی اپنی خواہش کو روک سکا۔ عزیزن بڑی شوخ ادا سے اٹھی مگر جلدی ایک جھٹکے کے ساتھ واپس گر گئی۔ عزیزن واپس جب گری تو اس جگہ پر نہیں تھی۔ جہاں وہ پہلے تھی۔ بڑی احتیاط سے لڑکھڑاتے ہوئے وہ ایک دو قدم اس طرح جا کر سیدھی گری جہاں اس کا پستول پڑا ہوا تھا۔ عزیزن کے حسن کے جادو بھرے جال میں کھو کر وانسن تو پستول کے بارے میں بھول ہی گیا تھا۔ اب بھی اس کا دھیان پستول پر نہیں تھا۔ جسے عزیزن نے جلدی سے اپنے جسم کے نیچے چھپا لیا تھا۔

عزیزن کو گرتے دیکھ کر وانسن تیزی سے اس کے پاس آیا بڑی ملائمیت سے بولا۔ ''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' عزیزن نے کراہتے ہوئے کہا ''لگتا ہے پیر میں موچ آ گئی ہے کچھ مدد کیجئے نا۔''

وانسن تو یہی چاہتا تھا۔ اس نے جلدی سے بندوق ایک جانب رکھ دی اور عزیزن کو اٹھانے کے لئے اس کے کندھوں کی جانب جھکنے لگا مگر عزیزن نے مسکرا کر وانسن سے کہا۔ ''موچ اوپر نہیں، نیچے پیر میں ہے۔''

وانسن ہڑبڑا گیا۔ اس نے سوچا کہ عزیزن کے شانوں پر جھک کر شاید کوئی جرم کیا ہے۔ وہ تیزی سے مڑ کر اس کے پیروں کو دیکھنے لگا۔ عزیزن کے لئے یہی مناسب وقت تھا۔ ہیری اسے ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ عزیزن نے معاً پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک ہی گولی میں وانسن کی لاش زمین پر تڑپنے لگی۔ اس سے قبل کہ ہیری گولی کی آواز سن کر کچھ سمجھ پاتا یا عزیزن کی پستول

سے دوسری گولی اس کی پسلیوں کو توڑتی ہوئی اندر گھس گئی۔ عزیزن کا نشانہ اچوک تھا۔ عزیزن ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اس وقت وہ خوبصورت عورت نہیں ایک نہایت بہادر اور چالاک عورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے پاس پڑے وانسن کی لاش کو حقارت سے دیکھا اور پھر اپنی پستول کھولی۔ گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اب اسے فکر نہیں تھی۔ اس کے دونوں دشمن ختم ہو چکے تھے۔ اس نے خالی پستول اپنے کپڑوں میں ایک طرف رکھ لیا۔ خواہش ہوئی کہ وقت ضرورت وانسن کی بندوق اور کارتوس لے لئے جائیں۔ وہ وانسن کی لاش کے پاس گئی لیکن اسے فوراً رک جانا پڑا۔ اس کے سامنے ایک نہیں کئی بندوقیں تنی ہوئی تھیں اور ایک دبنگ آواز اسے حکم دے رہی تھی۔ ''ہینڈز اپ!''

عزیزن نے پیچھے مڑکر دیکھا وہاں بھی کئی بندوقیں تانے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ چاروں طرف سے دشمنوں سے گھر چکی تھی۔ دشمن کم سے کم بیس پچیس کی گنتی میں تھے۔ عزیزن یہ سب دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ یہ دراصل وانسن اور ہیری والی وہ ٹکڑی تھی جو انھیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آپہونچے تھے۔ عزیزن کو اپنے بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا لیکن وہ جیتے جی دشمنوں کے ہاتھوں میں جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھانے کے لئے اوپر کئے اور سرعت سے اپنی طرف تنی ایک بندوق کی نال پکڑ کر جھٹکے سے اسے سپاہی کے ہاتھوں سے چھین لیا، اور کے بتھے سے ہی لگاتار سپاہیوں پر چوٹ کرنے لگی۔ بندوق سیدھی کرنے اور گولی چلانے کا وقت ہی کیا تھا؟ کچھ وقت کے لئے سپاہی بھی بوکھلا گئے۔ وہ اس عجیب و غریب عورت کو زندہ پکڑنا چاہتے تھے تاکہ راز کو سمجھا جا سکے۔ لہٰذا وہ اس پر گولیاں بھی نہیں چلا سکتے تھے۔ کچھ لمحے بعد جب حالات سمجھ میں آئے تو وہ سب عزیزن پر ٹوٹ پڑے اور اسے گرفتار کر لیا۔

عزیزن کو جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ عزیزن کے کارناموں کے بارے میں جنرل ہیولاک کافی سن چکا تھا۔ مگر جب اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ ''باؤ بیوٹی فل!'' اس کے منہ سے نکلا۔ جو کمانڈر عزیزن کو پکڑ کر لایا تھا وہ پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے جنرل کے لفظ سنے تو بولا ''بیوٹی فل ہونے کے ساتھ ساتھ ہی بہت بہادر بھی ہے سر! اس نے ہمارے سیکڑوں جوانوں کو کانپور مورچہ پر مارا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس کو فوراً گولی سے اڑا دیا جائے۔'' جنرل ہیولاک کو کمانڈر کی یہ بن مانگی صلاح اچھی نہیں لگی۔ اس نے نفرت و حقارت سے کمانڈر کی طرف دیکھتے ہوئے عزیزن سے کہا۔ ''ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں ہم تمہاری بھی قدر کرتے ہیں۔ مگر میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان میں اتنے سپاہیوں کے ہوتے ہوئے تم جیسی خوبصورت عورتوں کو ہاتھوں میں ہتھیار کیوں اٹھانے پڑے۔''

جنرل کے اس سوال پر عزیزن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جنگ کی بات صرف سپاہیوں تک تو تب رہتی ہے جب آپ کے سپاہی بھی صرف سپاہیوں سے لڑتے۔ اس کے خلاف انھوں نے ہندوستان کے پورے عوام پر ظلم و استعداد کیا ہے ایسے راکھشسوں سے ہونے والی جنگ صرف سپاہیوں تک کیسے محدود رہ سکتی ہے؟ یہ جنگ تو بھارت کے ہر باشندہ کو کرنی ہے۔ آپ کے سپاہیوں سے آپ سے اور آپ کی سرکار سے۔'' کہتے کہتے عزیزن کی آنکھیں غصے سے شعلہ ہو گئیں۔ جنرل ہیولاک کے پاس عزیزن کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا پھر بھی اس نے عزیزن کو خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تمہارے ساتھ ہمدردی ہے، عزیزن مگر پھر بھی انگریز فوجیوں کے ساتھ جنگ کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔ فوجیوں کے قانون کے مطابق اس گناہ کی سزا صرف موت ہے۔''

ہیولاک کی اس بات پر عزیزن مسکرا دی بولی۔ ''کیا آپ مجھے موت سے ڈرانا چاہتے ہیں۔'' جنرل ہیولاک ہڑبڑا کر بولا۔ ''نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تم جیسی خوبصورت عورت کو موت سے بچایا جا سکے۔ ہم تمہیں بچا بھی سکتے ہیں۔ صرف ایک شرط پر۔''

کیا ہے وہ شرط، عزیزن نے مسکراتے ہوئے طنز سے پوچھا۔ جنرل ہیولاک بولا۔ ''صرف یہی کہ تم اپنے غلط کارناموں کے لئے ہمیں معافی نامہ لکھ کر دو اور یہ عزم کرو کہ مستقبل میں پھر کبھی ایسا کام نہیں کرو گی۔''

عزیزن یہ بات سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں لال ڈورے کھنچنے لگے۔ انتہائی غصے سے بولی۔ ''میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑنا چور لٹیروں کو اپنے گھر سے باہر نکالنے کے لئے کوشش کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ جرم تو آپ نے کئے ہیں، ہمارے دیش میں آ کر یہاں کی بھولی بھالی جنتا پر ظلم کرنا، بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا۔ ہمارے ملک کی آزادی اور عصمت پر ڈاکہ ڈالنا۔ آپ لوگوں کے جرموں کی کیا کوئی فہرست بن سکتی ہے؟ کیا کوئی جواب ہے آپ کے پاس اپنے ان کالے کارناموں کا؟ جانتی ہوں کہ میں آپ کو جواب دینے کے لئے مجبور نہیں کر سکی مگر ایک دن خود کے یہاں آپ کو اپنے کالے کارناموں کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔ اس وقت آپ لوگوں کو جو سزا ملے گی اس کے لئے تیار رہنا جنرل۔''

عزیزن کی اس بات پر جنرل ہیولاک غصے سے بھر گیا۔ اس نے عزیزن کو روکتے ہوئے کہا۔ ''خاموش رہو، ہم تمہیں بچانا چاہتے ہیں لیکن اب ہمارا ارادہ بدل گیا ہے۔ آگ اگلنے والا خوبصورت ہو ہی نہیں سکتا بلکہ خطرناک ہوتا ہے اور ہمیں خطروں کو پالنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' اس کے بعد جنرل نے کمانڈر کی طرف اشارہ کیا اور کمانڈر کی بندوق گرج اٹھی۔ عزیزن کا جسم ''ہندوستان زندہ آباد'' کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور جنرل ہیولاک کے چہرے سے لگتا تھا جیسے اس پر کسی نے سیاہی مل دی ہو۔ OO

زیرِ تصنیف بے نام ناول کا ایک باب

وہ جو مارے گئے

ساجد رشید

جہاں تک نگاہ جاتی تھی، ٹوپیوں اور رومالوں سے ڈھکے سر ہی سر نظر آتے تھے۔ ایک لاکھ سے زیادہ کی آبادی والے اس شہر کی سب سے قدیم عیدگاہ میں تقریباً پچاس ہزار نمازی رہے ہوں گے، جن میں ایک چوتھائی بچے تھے۔ نمازِ عید کے لیے شہر کے علاوہ اطراف ہی نہیں دور دراز کے دیہات سے بھی لوگ عیدگاہ کا رخ کرتے تھے۔ عیدگاہ میں داخل ہونے یا باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جو چھ یا سات فٹ چوڑا تھا۔ عیدگاہ کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی قدیم مسجد تھی، جسے ایک رات والی مسجد کہا جاتا تھا، اس مسجد کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک رات میں تعمیر کی گئی تھی۔ نماز اور خطبے تک تو لوگ بڑے سکون سے بیٹھے رہتے تھے لیکن دعا کے بعد انہیں گھر جانے کی اتنی عجلت ہوتی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو ابھی کچھ دیر پہلے کسی رضا کار کی مدد کے بغیر ایک قطار میں نماز پڑھنے کے زبردست نظم وضبط کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اگرچہ آسمان ابر آلود تھا لیکن موسم صبح آٹھ بجے سے ہی گرم ہو چلا تھا اور اگست کے مہینے کا حبس اُس کی حدت میں اضافہ کرنے لگا تھا۔ رات میں ہلکی بوندا باندی بھی ہوئی تھی لیکن اب بارش کے آثار نہیں تھے۔ عیدگاہ کی کچی زمین اتنی گیلی ہو چکی تھی کہ اس پر بچھی چادریں اور دریاں نم ہو گئی تھیں۔ فضا میں مختلف قسم کے عطریات کی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر اس کی نظریں دور اس جانب اٹھی ہوئی تھیں جہاں پکے منبر پر امام صاحب کھڑے خطبہ دے رہے تھے لیکن اس کا دھیان باہر ان ریڑھی اور خوانچے والوں میں اٹکا ہوا تھا جو خاص عید کے بازار کے لیے مٹھائیاں اور خوش رنگ کھلونے لے کر صبح سویرے ہی عیدگاہ کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں بیشتر ہندو تھے لیکن آج وہ بھی صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کے چہرے بھی تہوار کی خوشی سے دمک رہے تھے۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو کرتے کی جیب میں ڈال کر پانچ روپے کے اس نوٹ کو چھو کر یہ اطمینان کر لیا کہ وہ محفوظ ہے، جسے نمازِ عید کے لیے گھر سے نکلتے وقت امی جان نے اس کے کرتے کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا تھا:

''ببو بیٹا کچھ الم غلم مت کھائیو اور ہاں احمد علی بھیا کا ہاتھ مت چھوڑنا۔''

ببو نے سوچا آج وہ چابی سے چلنے والی دو منزلہ سرخ رنگ کی بس خریدے گا جسے دوکاندار 'بمبئی کی بس' کہہ کر آواز لگا رہا تھا۔ سچ مچ اس نے دو منزلہ بس آج تک نہیں دیکھی تھی۔

''بے شک ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی منتخب مخلوق ہیں لیکن ہم تمام غلامانِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نجات آخرت میں اسی صورت میں ہوگی جب ہم آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ایک مثالی مومن ہونے کا ثبوت پیش کریں گے۔ ہمیں خدائے بزرگ وبرتر نے اس کرۂ ارض پر امن و آشتی کا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے...''

امام صاحب کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونج رہی تھی۔ ببو نے اپنی توجہ خطبے پر مرکوز کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ امی جان کہتی ہیں نماز میں من کو اور خطبے میں دماغ کو نہیں بھٹکنا چاہیے ورنہ گناہ پڑتا ہے۔ بند آنکھوں میں چند لمحوں کے لیے اندھیرا ابھر گیا پھر اس اندھیرے میں سے وہ سرخ رنگ والی بس چلتی ہوئی بالکل سامنے آ گئی اتنی سامنے کہ اس کی کھڑکیوں سے اندر کی چھوٹی چھوٹی سبز رنگ کی سیٹیں بھی نظر آنے لگیں۔ وہ بے چین ہو اٹھا۔ امام صاحب کتنا بولتے ہیں، کب ختم ہوگا خطبہ، ایسا نہ ہو کہ نماز کے لیے آنے والے جناتوں کے بچے نماز ختم ہوتے ہی ساری مٹھائیاں اور کھلونے خرید لے جائیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

امام صاحب کی آواز گونج رہی تھی:

''طائف کی وہ شام ساری کائنات پر بھاری تھی جب اللہ کے سب سے محبوب رسول کو شر پسند لڑکے پتھر مار مار کر شہر سے باہر لے جا رہے تھے۔ آپ

مکہ سے پچاس میل کا سفر پیدل طے کر کے طائف تشریف لے گیے تھے کہ وہاں کے رئیسوں کو دین اسلام کی دعوت دیں۔ رئیسوں نے دعوت حق سننے کے بجائے آپ کے پیچھے نادان لڑکوں کو لگا دیا جو آپ پر پھبتیاں کستے اور پتھر برساتے ہوئے آپ کو لہولہان کر رہے تھے۔ آپ کا جسم زخموں سے چور تھا اور آپ خون میں نہائے ہوئے تھے۔ مگر آپ کے منہ سے طائف کے لوگوں کے لیے کوئی بد دعا نہ نکلی اور آپ نے فرمایا۔ خدا ان کو صحیح راستہ دکھا، کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اللہ کے رسول کا یہی اخلاق...''

''بند کرو نماز! ناپاک ہو گئی ہے!'' کوئی بہت دور سے چیخا تھا۔

''سؤر گھس آئے ہیں نماز میں...'' یہ دوسری آواز تھی جو پہلی کے مقابلے میں زیادہ بلند اور کرخت تھی۔

''مالک دو جہاں رسول اکرم ساری دنیا کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے اور ہجرت سے فتح مکہ تک صبر و شکر اور نظم و ضبط کی جو بے مثال زندگی پیش کی اس نے دشمنوں کو بھی آپ کے حضور اقدس میں احترام سے سر جھکانے پر مجبور...'' امام صاحب کی آواز ایک بے ہنگم شور میں ڈوب گئی۔

پچھلی صفوں کے نمازی اٹھ اٹھ کر کھڑے ہونے لگے۔ ''بیٹھو بیٹھو ...معاملہ کیا ہے؟ ...کہاں سے آگیے سؤر؟ ...ارے بھاگ کیوں رہے ہو۔'' مختلف گوشوں سے آوازیں ابھرنے لگیں۔ لوگ گردن گھما گھما کر پیچھے دیکھنے لگے جہاں سے کسی نے چیخ کر سؤروں کے گھسنے کی اطلاع دی تھی، البتہ صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا تھا اور لوگ اٹھ اٹھ کر بنچوں پر کھڑے ہو کر پیچھے دیکھنے لگے تھے۔ امام صاحب خطبہ بیچ ہی میں چھوڑ کر مضطرب نمازیوں سے چیخ چیخ کر اپیل کرنے لگے:

''بیٹھ جائیے۔ بیٹھ جائیے۔ افواہوں پر دھیان مت دیجیے۔ تکبیر پڑھیے۔'' اور پھر وہ خود ہی بلند آواز سے تکبیر پڑھنے لگے۔ ''اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر و للہ الحمد۔''

امام صاحب کی آواز اور اللہ کی حمد و ثنا اُس شور میں ڈوب گئی جو اچانک پیچھے سے اٹھا تھا۔ اچانک ہی صفیں ٹوٹ گئیں اور لوگ بدحواس سے گرتے پڑتے صدر دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ ان کے پیچھے سر نیہوڑھائے اپنی تھوتھنیوں سے سوں سوں کرتے ہوئے مٹ میلے رنگ کے چار پانچ کریہہ جثہ سؤر دوڑ رہے تھے!... ایک شور اٹھا اور لاؤڈ اسپیکر سے اچانک ہی امام صاحب کی آواز آنی بند ہو گئی۔ شاید بجلی کا کنکشن کٹ گیا تھا۔ صرف چند لمحوں میں تقریباً پون کیلو میٹر تک دراز صفیں دیکھتے ہی دیکھتے پہلے تو بے ترتیب ہوئیں اور اس کے بعد ایسی بھگدڑ مچی کہ جو لوگ بڑے صبر و سکون اور نظم و ضبط کے ساتھ رکوع میں بیٹھے خطبہ سن رہے تھے وہ آس پاس کے لوگوں کو کہنیوں سے ٹھیلتے اور پیروں کے پنجوں کی پوری قوت سے بینچے کے زور سے سامنے والے کو ڈھکیلتے ہوئے آگے نکل جانے کی بے رحم کوشش کرنے لگے۔ ایچ ایس بی کالج کے گیٹ کے قریب نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے، پولس اور پی اے سی کے پنڈال کے ساتھ بلدیہ اور مسلم لیگ کی مقامی شاخ کا پنڈال بھی تھا۔ ان ہی پنڈالوں کے قریب تعینات پولس اور پی اے سی کے جوانوں سے عید گاہ کے کچھ رضا کار اور مقامی مسلم لیگ کے لیڈر الجھ پڑے تھے۔ کوئی غیض و غضب سے چیخ رہا تھا:

''کیا آپ لوگوں کو پتہ نہیں ہے عید کی نماز ہو رہی ہے اور آپ لوگوں کے ہوتے، عید گاہ میں سؤر گھس جاتے ہیں! کیا کر رہے ہیں آپ لوگ یہاں؟ کس کام کے لیے رکھا گیا ہے آپ کو؟''

''ڈاکٹر صاحب ہمیں کیا پتہ سؤر کہاں سے آگیے؟''

''پتہ ہونا چاہیے۔ اگر نہیں پتہ تھا تو آپ کو سؤروں کو کھدیڑنا چاہیے تھا۔ تنخواہ کس بات کی لیتے ہیں آپ؟'' مسلم لیگ کے صدر ڈاکٹر شمیم احمد نے چیخ کر کہا۔

''ڈاکٹر صاحب، ہم سؤر کھدیڑنے کی تنخواہ نہیں لیتے ہیں۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔''

''میں اس معاملے میں چپ نہیں بیٹھوں گا۔ کیا سمجھ رکھا ہے۔ اُس روز بھنگیوں نے اپنی بارات میں مسجد کے سامنے گھوڑی چڑھ کر تاشہ نگاڑہ بجایا ہم چپ رہ گیے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنی بڑی گھٹنا پر بھی خاموش رہ جائیں گے۔'' ڈاکٹر شمیم احمد آپے سے باہر ہو گیے۔

''آپ سے جو بن پڑے کر لیجیے گا...'' پی اے سی کے ایک افسر نے، جس کے منہ میں سگریٹ دبی ہوئی تھی، رعونت سے کہا۔

''نعرۂ تکبیر ...اللہ اکبر!'' بہت بلند نعرہ تھا یہ۔ اس کے بعد پر جوش نعرے لگنے لگے اور پولس سے کہا سنی ہاتھا پائی میں بدل گئی۔

''مارو بھی چودوں کو۔'' کسی نے للکارا تھا۔ کس نے کس کے لیے اکسایا تھا، یہ پتہ نہیں چل سکا۔ خاکی وردی پوشوں اور نمازیوں کی بھیڑ میں خاکی وردیاں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ سفید ٹوپیوں کے ہلکورے لیتے ہجوم میں خاکی ٹوپیاں بہت نمایاں تھیں۔ دفعتاً 'ٹھائیں ٹھائیں' کی آوازیں گونجنے لگیں۔

بندوقیں چلنے کی آواز نے نمازیوں کو حواس باختہ کر دیا اور وہ ایک بے قابو ہجوم میں بدل گیے، جس نے اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو روندنا شروع کر دیا... فائرنگ جاری تھی، لوگ دوڑ رہے تھے، گر رہے تھے۔ گاڑھا

گاڑھا انسانی خون نماز کے لیے بچھی چادروں پر پھیل رہا تھا اور پیروں سے روندا جا رہا تھا۔ چیخوں اور کراہوں کے درمیان نہتے لوگ اپنے ساتھ کے بچوں کو بچانے کی کوشش میں بولائے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ تو آٹھ دس سال کے بچوں کو بھی گود میں لٹکا کر دوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کے نام لے لے کر وہ دہشت زدہ آوازوں میں اتنی قوت سے پکار رہے تھے کہ ان کی آواز پھٹ جاتی تھی یا پھر بے بس رُلائی میں بدل جاتی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے بدحواس لوگ پہلے ہی سے کھچا کھچ بھری عیدگاہ سے متصل ایک رات والی مسجد میں گھسے پڑ رہے تھے۔ احمد علی نے ببو کا ہاتھ مظبوطی سے پکڑ لیا اور دھکا دیتے اور دھکا کھاتے ہوئے دوڑنے لگا۔ ببو اپنے کرتے کی جیب میں رکھے نوٹ کو مٹھی سے بھینچے دوڑ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی بڑے بھائی کو دیکھتا تو کبھی اپنے پیروں کے نیچے آ جانے والے جوتے چپلوں اور بچوں اور بوڑھوں کے ان جسموں کو دیکھتا، جو گر کر پھر اٹھ نہ سکے تھے... اچانک پتھراؤ شروع ہو گیا۔ عیدگاہ کی پرانی چار دیواری میں سے اینٹیں کھینچ کھینچ کر نکالی جانے لگیں اور گولیوں کا جواب اینٹوں اور پتھروں سے دیا جانے لگا۔ جو جوان اور صحت مند تھے وہ عیدگاہ کی دیواروں کو پھاند کر دوسری طرف کود کر تنگ گلیوں میں بے تحاشہ دوڑ پڑتے۔ گلیوں کی دُکانیں اور گھروں کے دروازے دھڑا دھڑ بند ہونے لگے۔ سنسان گلیوں میں پھولتی اکھڑتی سانسوں اور دوڑتے قدموں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

احمد علی نے عیدگاہ کی دیوار پر ببو کو چڑھایا اور اسے دوسری طرف دھکیل دیا۔ ببو دھپ سے پکی سڑک پر گرا، کہنیوں اور گھٹنوں میں چوٹ لگی لیکن وہ سسکاری لے کر رہ گیا۔ احمد علی بھی پھرتی سے دیوار پھاند گیا تھا۔ چیختے پکارتے اور روتے ہوئے لوگ دوڑ رہے تھے، جیسے کوئی جنونی بھینسا انہیں پیچھے سے کھدیڑ رہا ہو۔ احمد علی اسکاؤٹ میں رہ چکا تھا اور کالج میں بھی این سی سی میں شامل تھا۔ اُسے خود تو دوڑنے کی مشق تھی لیکن ببو کو ساتھ لے کر دوڑنا دوبھر ہو رہا تھا۔ پکی سڑک کے دائیں طرف دو شاخہ گلیوں میں سے اسے جو سنسان نظر آئی وہ اسی تنگ گلی میں ببو کو کھینچتے ہوئے دوڑنے لگا۔

ببو دہشت بھری نظروں سے پلٹ پلٹ کر پیچھے ایسے دیکھتا جیسے اسے کسی کے تعاقب میں آنے کا اندیشہ ہو۔ دورویہ پرانے مکانوں والی اس گلی میں دُکانوں اور مکانوں کے کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ گلی اتنی ویران تھی جیسے آس پاس کے مکانوں میں کسی انسان کا وجود ہی نہ ہو۔ ببو اس کے پیچھے گھسٹ رہا تھا اور وہ ببو کی وجہ سے تیز دوڑ نہیں پا رہا تھا۔ فائرنگ رہ رہ کر ہو رہی تھی۔ وہ پوری قوت سے دوڑا اور ببو کا ہاتھ اس کی گرفت سے چھوٹ گیا اور وہ لال اینٹوں والی سڑک پر گر کر اپنی بڑی بڑی خوفزدہ آنکھوں سے بھائی کو دیکھنے لگا۔

''اے لونڈے ادھر، ادھر آ جاؤ'' کسی نے زور سے لیکن سرگوشی والے انداز میں پکارا تھا۔

احمد علی نے جھپٹ کر ببو کو اٹھایا۔ ٹھائیں ٹھائیں! بندوق کے فائر گونج رہے تھے۔ احمد علی بدحواسی میں سمتوں کو بھول بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہر کے کس علاقے کی کس گلی میں کھڑا ہے اور راستہ آگے کہاں جاتا ہے۔

''اندر آ جاؤ'' نیم تاریک دروازے کے پیچھے کھڑے کسی شخص نے اس سے کہا۔

'کون ہے یہ شخص؟ کس کا مکان ہے؟ کوئی ہندو تو نہیں؟ ایسے موقعوں پر کسی پر اعتبار... ٹھائیں ٹھائیں... کئی فائر ہوئے اور اس کی ریڑھ کے منکوں میں سلسلاہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں بکھرے جوتے، چپلوں اور سلیپروں پر ایک نظر ڈالی اور ببو کو کھینچتا ہوا اُس دروازے میں داخل ہو گیا، جہاں سے انہیں پکارا گیا تھا۔ دو مظبوط ہاتھوں نے اسے اندر کھینچ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ دروازے کے دونوں طرف شاید کمرے تھے جن کی وجہ سے سامنے دکھائی دینے والے آنگن تک پہنچنے کے لیے ایک گلی سی بن گئی تھی۔ آنگن میں پہنچ کر آگے چلنے والے شخص کو اس نے دیکھا اور چونک پڑا۔

''آپ!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

درمیانہ قد دوہرا بدن، گورا رنگ، گول بھرا بھرا چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن پر موٹے فریم کی عینک تھی، نیم گنجا سر اور کنپٹی اور گدی کے بال سفید ہو چلے تھے۔ احمد علی اپنے سامنے ایک ایسے شخص کو کھڑا دیکھ رہا تھا جسے اس نے تقریباً تیرہ چودہ سال قبل اس وقت دیکھا تھا جب ان کے سر پر بال کم تھے لیکن بالکل سیاہ تھے، جسم اس وقت بھی دوہرا تھا البتہ آنکھوں پر چشمہ نہیں تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے تخت پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور عینک اتار کر اپنے کرتے کے دامن سے عینک کے شیشوں کو صاف کرنے لگے۔ احمد علی تخت پر بے دلی سے بیٹھ گیا۔ اس کی نظر ان کے کرتے کی آستین پر پڑی جس پر تازہ خون کا بڑا سا دھبہ تھا۔ ان کی سفید تہمد پر بھی کالے، ہرے اور خشک کیچڑ کے داغ تھے۔ ببو بھی غور سے انہیں اور خون کے اس دھبے کو دیکھ رہا تھا۔

'شاید یہ ہم سے پہلے عیدگاہ سے بھاگ نکلے تھے۔ انہیں بھی چوٹ لگی ہے کہیں گرے ہوں گے۔' احمد علی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''بیٹھ جاؤ میاں۔'' انہوں نے عینک پہنتے ہوئے کہا۔

دور کہیں دو فائر ہوئے تھے۔ بو سہم کر تخت کے کنارے پر بیٹھ کر ہتھیلیاں ملنے لگا۔ احمد علی نے سوچا 'اگر پتہ ہوتا کہ یہ گھر ان کا ہے تو میں یہاں نہ آتا۔' اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، آنگن کے اطراف بنے کمروں کے دروازوں کی اوٹ سے دوپٹے اور رنگین قمیضوں کے کنارے نظر آ رہے تھے۔ وہ بید کا ایک مونڈھا کھینچ کر تخت کے قریب بیٹھ گئے۔ اب ان کے درمیان گہری خاموشی تھی... کچھ دیر بعد ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا، جو اپنے پہناوے سے گھر کا ملازم نظر آتا تھا، پیتل کی ٹرے میں چینی کی تین پیالیاں لے کر ان کے سامنے آ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''تمیز نہیں ہے مہمان کو پہلے دیا جاتا ہے۔'' انہوں نے تیز لہجے میں ڈانٹا۔

''شکریہ اب میں چلوں گا۔'' کہہ کر احمد علی اٹھ کھڑا ہو گیا۔ بو نے بھی اس کی تقلید کی۔ باہر ایک ساتھ کئی فائر ہوئے تھے آواز سے لگتا تھا کہ قریب ہی میں کہیں گولیاں چلی ہیں۔ کسی کمرے سے ایک چالیس بیالیس سال کی صحت مند عورت جھپاک سے باہر آئی اور اپنے ڈھلکتے آنچل کو سر پر سنبھالتے ہوئے احمد علی کے سامنے سر اٹھا کر غصے سے بولی:

''کہاں جاؤ گے؟ باہر گولیاں چل رہی ہیں، کیا یہ دشمنوں کا گھر ہے؟''

اس نے غور سے سامنے غصے سے تن کر کھڑی اس پستہ قد گوری چٹی خاتون کو دیکھا جو پورے جسم سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے سوچا 'ان کا بدن اب کچھ بھاری ہو گیا ہے لیکن آواز میں اب بھی وہی چیخنا پن ہے۔'

''یہ کس کا لونڈا ہے؟'' انہوں نے بو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''اسے نہیں دیکھا تھا۔''

''احمد عمر ہے، میرا چھوٹا بھائی۔'' احمد علی نے دھیرے سے کہا۔ ملازم بچہ اب بھی پیالیوں کی کشتی ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ پستہ قد خاتون نے بڑھ کر بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم لہجے میں بولیں:

''لے لو، سیوئیاں ہیں زہر نہیں''۔ احمد علی نے خجل ہو کر پیالی اٹھا کر بو کی طرف بڑھائی اور دوسری خود لے لی۔ عینک والے آدمی نے بھی پیالی اٹھا لی اور تینوں خاموشی سے سیوئیاں کھانے لگے۔ اس درمیان کسی نے عینک والے کا حقہ بھر کر تازہ کر دیا تھا۔ انہوں نے پیالی خالی کر کے حقے کی پیتل کی نے کو اپنے رومال سے پونچھا اور کش کھینچتے ہوئے کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ حقے کے میٹھے تمباکو کی مہک آنگن میں دھوئیں کے ساتھ تیرنے لگی تھی۔ ابر چھٹنے لگا تھا اور دھوپ نکل آئی تھی۔ پستہ قد خاتون تخت کے نیچے سے ایک کھٹولی کو کھینچ کر بیٹھ گئیں اور تخت پر رکھے بڑے سے چاندی کے پاندان کو کھول کر سروتے سے چھالیہ کترنے لگیں۔ احمد علی کو اس وقت عیدگاہ کے واقعے سے زیادہ یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ وہ گھر پر کیا بتائے گا کہ اتنی دیر دونوں بھائی کہاں تھے؟ عیدگاہ سے بچ نکلنے کے بعد انہوں نے کہاں پناہ لی تھی؟ عورت کے ہاتھ جتنی تیزی سے سروتے سے چھالیہ کتر رہے تھے زبان بھی اتنی ہی تیزی سے چل رہی تھی۔

''اللہ کا قہر ٹوٹے ان سؤروں پر''۔

''سؤروں کو کیوں کوس رہی ہو۔ جانوروں کا کیا قصور، انہیں کیا پتہ نماز ہو رہی ہے یا کیرتن ہو رہا ہے۔'' عینک والے نے ڈپٹ کر کہا۔

''میں اُن سؤروں کو نہیں ان وردی والے سؤروں کی بات کر رہی ہوں۔ کیسی بے دردی سے گولیاں داغی ہیں۔ اللہ انہیں غارت کرے ہزار بارہ سو تو مرے ہی ہوں گے۔'' وہ بولے جا رہی تھیں۔ ''وہ تو اچھا ہوا کہ یہ دروازے کے قریب کی صف میں تھے بچ کر بھاگ نکلے ورنہ اللہ جانے کیا ہو جاتا! تین چار سو لاشیں تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں، کیوں جی؟'' انہوں نے شوہر کی طرف دیکھ کر پوچھا جو خاموشی سے حقے کا کش لے رہے تھے۔ ''مجھے تو ساری شرارت ان بھنگیوں کی لگتی ہے۔ پچھلے مہینے بد ذاتوں نے ٹھیک افطار کے وقت دولھے کو گھوڑی چڑھائی اور مسجد کے سامنے باجہ بجانے لگے۔ منع کرنے پر تاؤ دکھانے لگے کہ دیکھتے ہیں اس بار کیسے عید مناتے ہو؟ ان ہی کا کام ہے یہ۔ سؤروں کو عیدگاہ میں انہوں نے ہی ہانکا ہو گا۔ بہت ہمت بڑھ گئی ہے ان بھنگیوں کی کانگریس کے راج میں۔'' وہ بولے چلی جا رہی تھیں اور بار بار ہزار بارہ سو لاشوں کا ذکر بھی کرتی جاتی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ پیچھے نکلنے والوں میں تو میں تھا۔ میں نے اتنی لاشیں نہیں دیکھیں اور انہوں نے کہاں سے دیکھ لیں! باہر پولس کی کوئی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی گزری۔ سائرن کی آواز سنتے ہی سب کے چہروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

'ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے ورنہ گھر میں تو قیامت گذر رہی ہو گی۔ ویسے بھی اس گھر میں رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ خیر انجانے میں چلا آیا تھا، کوئی بات نہیں لیکن اب تو پتہ چل گیا ہے۔ اس لیے یہاں کسی قیمت پر بھی نہیں رکا جا سکتا۔' وہ سوچ رہا تھا اور باہر سکون قائم ہونے کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا... اچانک اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اسے گھور رہا ہے۔ اس نے کنکھیوں سے سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا، جس کے دروازے کے ایک پٹ کو ایک گورے مہندی رچے ہاتھ نے تھام رکھا تھا جس کی کلائیوں میں بنفشی چوڑیاں تھیں، کوئی لڑکی تھی جو انہیں جھانک کر دیکھ رہی تھی لیکن اس کی شبیہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا جسم دروازے کی اوٹ میں تھا البتہ گلابی دوپٹے کا ایک کونا لہراتا سا نظر آ رہا تھا۔ احمد علی نے سامنے بیٹھے عینک والے

کی طرف دیکھا جو نئے ہاتھ میں پکڑے آنکھیں بند کیے اب بھی کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ عورت نے پان کی گلوریاں بنا کر انہیں کشتی میں رکھ کر پاندان کو بند کیا تو دھوپ کے رخ پر رکھے چاندی کے چمچماتے پاندان کے اوپر پڑنے والی دھوپ کے ایک ٹکڑے کا انعکاس برآمدے کے دوسری طرف کے دروازے تک پہنچ گیا اور دروازے کے پٹ کو تھامے کھڑی مبہم سی شبیہہ ایک دم سے روشن ہوگئی۔ گول چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ... وہ بس اتنا ہی دیکھ سکا تھا اور جو دیکھا وہ ناقابل یقین ہی نہیں بلکہ بے حد خوشگوار بھی تھا۔ اس نے اپنے سینے کے نیچے ہیجان انگیز ارتعاش محسوس کیا۔

"یا اللہ یہ اور یہاں!" بس وہ اس سے زیادہ کچھ سوچ ہی نہ سکا۔

گولیاں چلنے کی آواز ختم ہو گئی تھی۔ گھر کے اندر اور باہر گہری خاموشی پھیل گئی تھی۔

"میرے خیال میں تمھیں اب گھر کے لیے نکل جانا چاہیے۔" عینک والے نے حقے کا ایک لمبا کش لے کر اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"کرفیو کا لگنا پکا سمجھو۔"

"اے پروردگار رحم کیجو" پستہ قد خاتون نے آنچل درست کرتے ہوئے سراسیمہ نظروں سے احمد علی اور ببو کی طرف دیکھا اور شوہر سے مخاطب ہوئیں:

"ایسے میں یہ کیسے جاویں گے گھر؟" ان کی آواز کپکپا گئی۔

"بیوقوفی کی باتیں نہ کیا کرو۔ پولس گرفتاریاں بھی کر سکتی ہے۔ ہمارا مکان عیدگاہ سے قریب ہے۔ ایسے میں ان کا اپنے گھر میں ہونا ٹھیک رہے گا۔"

ابھی کچھ دیر پہلے تک احمد علی کے لیے اس گھر میں ایک ایک لمحہ گراں گذر رہا تھا اور اب وہ وہاں سے اتنی جلدی جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں اسے بنفشئی چوڑیوں والا گورا ہاتھ نظر آیا تھا۔ وہ چونک پڑا۔ دروازے میں ایک چھریرے بدن کی لڑکی کھڑی اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے اسی کو تک رہی تھی۔

ببو اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو بھائی جان۔" وہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"ہاں ہاں چلتے ہیں۔" کہتے ہوئے احمد علی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں میاں بیوی انہیں چھوڑنے دروازے تک آئے۔ عینک والے نے دروازہ کھول کر کواڑ کی ایک جھری سی بنا کر باہر جھانکا۔ گلی میں گہرا سناٹا تھا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے باہر نکل جانے کو کہا۔ پستہ قد عورت لپک کر احمد علی کے قریب آئیں اور اس کے چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر لرزتی آواز میں کہا۔ "اللہ کی امان میں دیا! خدا حافظ۔"

اور جب وہ ببو کے ماتھے کو چوم رہی تھیں تو ان کی آنکھ سے آنسو کا ایک گرم قطرہ اس کے گال پر آ گرا تھا۔ ببو نے محسوس کیا ان کا ہاتھ اس کے کرتے کی جیب میں رینگ رہا ہے۔ وہ ایکدم سے پلٹی تھیں اور تیز تیز قدموں سے آنگن میں چلی گئی تھیں۔ احمد علی نے پلٹ کر انہیں جاتے ہوئے دیکھا، ان کی پیٹھ اور کندھے بُری طرح ہل رہے تھے۔

گلی میں ہولناک سناٹا تھا۔ وہ دونوں گلی کی دیوار سے لگ کر تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ ببو اس کے برابر میں چلنے کے لیے تقریباً دوڑ رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا آج عید کا دن ہے۔ اس نے عید کے دن کا ایسا تصور کبھی نہیں کیا تھا۔ احمد علی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی سحر میں چل رہا ہو۔ وہ کس محلے میں سے گذر رہا ہے؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا...

۲

دروازے پر ہونے والی بے تحاشہ دستک نے مکان کی عورتوں، بچوں اور واحد مرد کو بری طرح چونکا دیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ ایسے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ 'کون ہوسکتا ہے؟' سبھی کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ خضاب لگی خشخشی داڑھی اور سرخ و سپید رنگت والے ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑی پر جسم کا توازن قائم رکھ کر لکڑی کی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی تو ان کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ ان کے سامنے چوکی پر بیٹھی ایک خوش شکل دبلی پتلی عورت نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"رہنے دو میں دیکھ لیتی ہوں"۔

جب تک عورت نے چٹخنی کو ہٹا کر دروازے کو نہیں کھولا باہر سے دروازہ پیٹا جاتا رہا۔ دروازہ کھلتے ہی احمد علی اور ببو کسی بگولے کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر کے سارے افراد دوڑ کر ان کے قریب آ گئے۔ دروازہ کھولنے والی عورت نے لپک کر ببو کو بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ دو بیٹوں کے بعد بیٹی کے لیے اللہ کے حضور میں ساری دعائیں نامقبول ثابت ہوئیں اور احمد علی کی پیدائش کے سات سال بعد جب پختہ عمر میں بیٹی کے بجائے بیٹا ہوا تھا تو گھر میں کسی کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ میاں بیوی نے سارے نام تو بیٹی کے لیے سوچ رکھے تھے اس لیے کئی دنوں تک تو یہی طے نہ ہو سکا تھا کہ نومولود کا کیا نام ہوگا۔ ایک روز اباجی شبلی نعمانی کی کتاب فاروق اعظم کا مطالعہ کر رہے تھے کہ بچہ روئے چلا جا رہا تھا چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اباجی کے مطالعے میں خلل پڑ رہا تھا۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا "فاروق... احمد اخلاق، احمد علی اور احمد فاروق!" تھوڑے ہی دنوں بعد یہ بن بلایا مہمان احمد عمر ایسا گول گوتھنا ہوا کہ سب کا لاڈلا ببو بن گیا تھا... امی اسی ببو کو چمٹائے سسک رہی تھیں۔

"کیا معاملہ ہے؟" ادھیڑ عمر کے آدمی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کیا ہندو مسلمان دنگا ہو گیا ہے؟'' بہو کا سر سہلاتے ہوئے امی نے پوچھا۔

''کہاں چلی ہیں گولیاں بھیا؟'' گھر کی ادھیڑ ملازمہ زیتون نے پوچھا۔

''تم کہاں پھنسے رہ گیے تھے۔'' بھابی نے پوچھا۔

''اچھا ہوا جو ابا جان نہیں آئے۔'' احمد علی نے بھابی کے سوال کو درگذر کرنے کے لیے فوراً ہی، ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف دیکھ کر کہا، جو گھٹیا سے سوجے اپنے گھٹنے کو سہلا رہے تھے۔ وہ ایک مونڈھے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ زیتون کے ہاتھوں سے پانی کا گلاس لے کر اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ ''عید گاہ میں کسی نے سؤروں کو نمازیوں پر چھوڑ دیا تھا۔ بھگدڑ مچی اور پولس گولیاں چلانے لگی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آئے ہیں۔ پتہ نہیں کتنے مارے گیے ہوں گے۔''

احمد علی کا جواب سنتے ہی سب کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ ابا جی اور امی کے گورے چہرے کا پیلا پن صاف نظر آنے لگا تھا۔

''سیدھے نمازیوں پر گولیاں چلا دیں! ارے نہتے نمازیوں پر!'' ابا جی کی آواز کپکپانے لگی۔ ''غضب کر دیا۔ نمازیوں کا مارا جانا معمولی بات نہ ہے۔ ارے سسروں نے یہ تک نہ دیکھا کہ عید کا موقع ہے۔ عید گاہ میں بچے بھی ہوں گے۔ کوئی بات ہو ہی گئی تھی تو معاملے کو سنبھال لیتے۔ اب نہ سنبھلنے کا یہ معاملہ۔ پورے ملک میں آگ لگ جائے گی۔ سنبھل اور علی گڈھ میں جنتا پارٹی والوں نے مسلمانوں کے خلاف کیسی آگ لگائی تھی۔ حکومت میں آتے ہی جن سنگھ نے اپنا اصلی چہرہ دکھا دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک فساد ہو رہے تھے۔ شاہ کمیشن کے شکنجے میں پھنسی اندرا گاندھی نے ہار نہیں مانی تھی کیسی خبر لی تھی ان جن سنگھیوں کی جو جنتا پارٹی کا نقاب پہن کر دہلی کے تخت پر جا بیٹھے تھے۔ ننگا کر دیا تھا اندرا نے ان پاکھنڈیوں کی مسلم دشمنی کو عوام کے سامنے۔ اب نہیں بچے گی وشوناتھ پرتاپ کی یہ حکومت۔ اندرا بہت سخت جواب طلب کریں گی ان سے۔ جنتا راج میں سلگتے رہنے والے اتر پردیش کا انہیں کچھ سوچ کر ہی تو مکھیہ منتری بنایا ہوگا اور ان کی حکومت میں کیا ہوا؟ نہتے نمازیوں پر پولس کی گولیاں چل گئیں! ارے یہ جناح ٹوپی پہننے والا مانڈا کا راجہ مجھے تو پورا فراڈ لگے ہے...''

ابا جی بولے چلے جا رہے تھے اور احمد علی حیرت سے انہیں تک رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی ابا جی ہیں جو ابھی سال بھر پہلے تک کانگریس کے نام ہی سے نفرت کرتے تھے۔ دراصل وہ کسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی مسلم مجلس کے زبردست حامی تھے۔ ایک بار جب ڈاکٹر فریدی اپنی پارٹی کے نوجوان اور پرجوش آرگنائزر الیاس اعظمی کے ساتھ مراد آباد میں پارٹی کی یونٹ قائم کرنے آئے تھے تو ابا جی نے اپنے مکان پر ان کی ایک پر تکلف دعوت رکھی تھی۔ ایمرجنسی کے دنوں میں کانگریس سے ان کی سیاسی مخالفت اس وقت نفرت میں بدل گئی تھی، جب ایمرجنسی میں سنجے گاندھی کے دس نکاتی پروگرام کے تحت نس بندی کی ایسی مہم شروع کی گئی تھی جس نے بالراست ان کے اپنے بڑے بیٹے کے روزگار کو متاثر کیا تھا۔ احمد علی کے بڑے بھائی اخلاق احمد نے چوک میں تانبے پیتل کی اپنی آبائی دکان کو سنبھالنے کے بجائے گریجویشن کے بعد سرکاری نوکری کو ترجیح دی تھی اور ضلع میں ولیج ڈیولپمنٹ آفیسر ہو گیے تھے۔ انہیں اس ملازمت میں دو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ سرکاری ملازموں پر نس بندی کا عذاب نازل ہو گیا تھا۔ تمام سرکاری ملازموں پر لازم تھا کہ وہ پانچ مردوں کی نس بندی کروائیں اور اگر یہ تعداد پوری نہیں ہوتی ہے تو وہ اپنی نس بندی کروائیں۔ اخلاق احمد کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لہٰذا انہوں نے نوکری سے استعفا دینے میں ہی عافیت جانی اور تلاش معاش میں بمبئی چلے گیے تھے اور مراد آبادی برتنوں کا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ ابتدا میں انہوں نے بمبئی میں قدم جمانے کے لیے بڑی تگ و دو کی تھی۔ لیکن ان کے بچپن کے دوست دنو دیڈ حانے کاروبار کو پٹری پر لانے میں ان کی کافی مدد کی۔ اس طرح وہ اب کاروبار کو اس سطح تک لے آئے تھے کہ کرلا میں ایک کمرہ بطور آفس کرائے پر لے لیا تھا جو ان کی رہائش کے بھی کام آتا تھا۔

''کافی گولیاں چلی ہیں۔ یہاں تک آواز آ رہی تھی۔'' ابا جان کی آواز میں گھبراہٹ تھا۔ ''بہت لوگ مرے ہوں گے۔''

جواب میں احمد علی نے سر ہلا دیا اور رومال سے پسینہ پونچھنے لگا۔ پرہول سناٹے میں دور کہیں پولس جیپ کے سائرن کی آواز کو اس نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سیہرن پیدا کرتا ہوا محسوس کیا۔

''رات میں مرنے والوں کی صحیح تعداد ریڈیو بی بی سی بتائے گا۔'' ابا جی نے کہا۔ ''ان کے سرکاری آنکڑے تو جھوٹ کا پلندہ ہوتے ہیں۔ یہ دس بتائیں تو بیس مانو۔''

''ارے تم نے تو بتایا نہیں کہ تم دونوں عید گاہ سے کیسے نکل پائے۔'' امی نے پوچھا۔

''میں بتاؤں امی؟'' بہو نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بہت گولیاں چل رہی تھیں۔ بھائی جان میرا ہاتھ پکڑ کر ایک گلی میں گھس گیے تھے۔ وہاں کسی نے ہمیں اپنے مکان میں بلا لیا تھا۔ انہوں نے ہمیں سیویاں کھلائیں اور منع کر رہے تھے کہ ابھی نہ جاؤ اور دیکھو مجھے عیدی بھی

دی ہے۔'' کہتے ہوئے بہو نے پانچ روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر ساں کو دکھایا۔ احمد علی نے حیرت سے بہو کے ہاتھ میں دبے نوٹ کو دیکھا۔

''کون تھا بیٹا؟'' امی نے اشتیاق سے احمد علی کی طرف دیکھا۔

احمد علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ اپنی اس مختصر سی جائے پناہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بہو کی بیوقوفی نے اسے مجبور کر دیا تھا۔

''وہ کیا ہے کہ جب ہم عیدگاہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیے تھے، تو پتہ نہیں کس گلی میں جا گھسے تھے۔ گلی میں ایکدم سناٹا تھا سارے مکانوں اور دوکانوں کے دروازے کھڑکیاں بند تھیں۔ ہم گولیوں کی آوازیں سن رہے تھے، بہو بہت ڈر گیا تھا۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ ہم بھی کسی گولی کا شکار نہ ہو جائیں۔ بس موت سامنے دکھائی پڑ رہی تھی۔''

''اللہ نہ کرے!'' بے ساختہ امی کے منہ سے نکلا اور انہوں نے بہو کو پھر سے لپٹا لیا۔

''ایسے میں کسی نے ہمیں پکار کے اپنے مکان میں بلا لیا...'' اتنا کہہ کر احمد علی خاموش ہو گیا اب اسے اپنی بات کہنے کے لیے مناسب لفظ نہیں مل رہے تھے۔

''اللہ نے خیر کی۔'' ابا جی جو بہت توجہ سے سن رہے تھے بولے۔

''کون اللہ کا نیک بندہ تھا بیٹا؟'' امی نے نم ہوتی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

''گورے سے تھے آنکھوں پر موٹا سا چشمہ تھا ان کے اور جنہوں نے مجھے عیدی دی تھی، وہ بھی خوب گوری تھیں بالکل ابا جی کی طرح سرخ۔'' بہو نے بڑے بھائی کو خاموش دیکھ کر جلدی سے کہا۔

''اچھا!... بھئی کوئی میرے جاننے والے رہے ہوں گے۔'' ابا جی مسکرائے پھر قیاس لگا کر بولے۔ ''قاضی صاحب والی گلی میں تو نہیں چلے گیے تھے؟ لیکن تم تو انہیں جانتے ہو۔''

''میں بتاتا ہوں امی۔'' بہو نے پھر ہمک کر کہا۔ ''وہ جو تھیں نا جنہوں نے مجھے عیدی دی وہ چلتے وقت مجھے پیار کرتے ہوئے رو پڑی تھیں۔'' بہو نے جلدی سے کہا۔

یہ سن کر ابا جی کی پیشانی پر بل پڑ گیے۔ ''کون تھا احمد میاں؟''

''جی وہ پ پ پھوپھی جان...'' احمد علی کے منہ سے بمشکل نکلا اور ابا جی کی چھڑی ان کی کپکپاتی مٹھی میں گھوم کر رہ گئی۔ امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بھابی کو لگا جیسے گھر کا سارا منظر ٹھہر گیا ہے۔ ٹھائیں، ٹھائیں، دور کہیں پھر گولیاں چلی تھیں۔ سبھی سہم گیے تھے۔ بھابی حیرت سے باری باری سب کے چہروں کو دیکھ رہی تھیں۔

''مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ اُن کا مکان ہے۔'' احمد علی نے صفائی دینے والے انداز میں کہا۔ ''دروازے پر اندھیرا سا تھا میں پھوپھا جان کو پہچان نہیں سکا تھا۔ شاید دس بارہ برسوں بعد میں نے انہیں دیکھا تھا اور اگر مجھے پتہ...''

ابا جی نے احمد علی کی آنکھوں میں دیکھا اور چھڑی کی موٹھ پر رکھی ہتھیلی کو اٹھا کر خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ امی سر جھکائے بہو کے بالوں کو سہلاتی رہیں۔ ٹھیک ان کے مکان کے باہر کوئی پولس کی جیپ سائرن بجاتی ہوئی گذر گئی۔ باہر کرفیو لگا تھا یا نہیں اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں تھا لیکن گھر میں اچانک چھا جانے والا سناٹا بتا رہا تھا کہ یہاں کرفیو ضرور لگ گیا ہے۔

''لگتا ہے کرفیو لگا دیا ہے۔'' امی نے بات کا رخ بدلنے کے ارادے سے کہا۔ ابا کراہتے ہوئے اٹھے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے دیوان خانے کی طرف چل دیے۔ بھابی نے سوچا، باہر کا ماحول جتنا ہولناک ہوگا گھر کے اندر کی فضا اب اس سے کچھ کم نہیں ہے!

۳

سارے شہر پر تمام دن ایسی اداسی چھائی رہی لگتا ہی نہیں تھا کہ آج عید سعید ہو۔ اس خوفناک اداسی کو عاشورے کی ماتمی اداسی سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ عاشورے کے روز ماتمی نوحوں اور مجلسوں کے باوجود اس اداسی پر تہوار کی رونق ضرور قائم رہتی تھی جو غمناک ماحول کے باوجود اسے خوفناک نہیں بناتی تھی۔ عید کی نماز، مصافحے، معانقے، شیرینی اور رونقیں، ان سب کو محلوں، گلیوں، مکانوں اور آنگنوں سے اٹھنے والی کربناک سسکیوں، کراہوں اور رونے کی دبی دبی آوازوں نے کسی گاڑھی دھند کی طرح لپیٹ لیا تھا۔

511 کیلو میٹر لمبے اور 83 کیلو میٹر چوڑے ضلع مراد آباد کی آبادی میں ہندو اور مسلمانوں کا تناسب بالترتیب 40۔50 فیصد ہے۔ پیتل کے برتنوں کے لیے مشہور اس شہر سے ان ظروف کی برامدات کافی منافع بخش کاروبار ہے۔ مراد آباد جن اشیا کی برآمدات کے لیے پورے ملک میں ہی نہیں مغربی ممالک میں بھی اپنی شہرت رکھتا ہے، ان کو بنانے والے نوے فیصد کاری گر پسماندہ برادری کے مفلس مسلمان ہیں جو تنگ اور گندی گلیوں میں کچے مکانوں میں رہتے ہیں۔ بڑے تاجران کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔ غریب اور ان پڑھ کاری گروں کا استحصال کرنے والے تاجر اور کارخانے دار پنجابی ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ عام حالات میں اپنے ہم مذہب کاری گروں کے جسم سے خون اور پسینے کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینے میں ایک دوسرے سے کم نہیں ہیں لیکن جب بھی فرقہ وارانہ تناو پیدا ہوتا ہے یہ فوراً ہی ہندو اور مسلمان مالکوں میں بدل

جاتے ہیں۔ پیتل کے برتنوں اور ظروف کے اس کاروبار پر اپنی اپنی بالادستی قائم کرنے کی جنگ ہی اکثر یہاں کے فرقہ وارانہ تناؤ کا سبب بنتی رہتی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت والے اس شہر نے وقت کے گہرے زخم اٹھائے تھے، لیکن کچھ وقت گذر جانے کے بعد وہ اپنے زخموں کی کھرنڈ خود ہی پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور وہ دراڑ، جسے تاریخ بنانے اور بگاڑنے والے ہاتھوں نے دلوں پر ڈالنے کی کوشش کی تھی، کبھی بھی دیرپا تو نہیں رہی لیکن اس کی کھرونچ کبھی کبھی یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ضرور ٹیس دے اٹھتی ہے۔

1105 تک مرادآباد پر تومروں کی حکمرانی تھی پرتھوی راج چوہان نے اپنے بھائی کھنڈے راؤ کو بھیج کر مراد آباد پر فوج کشی کی تھی اور اسے تومروں سے جیت کر سنبھل میں شامل کر لیا تھا آج بھی یہاں کے ہندؤں کو اس بات پر فخر ہے کہ سنبھل پرتھوی راج چوہان کی راجدھانی تھی۔ شاندار ماضی میں جینے والے مسلمانوں کو بھی کم غرور نہیں ہے کہ سنبھل اور مراد آباد کو پرتھوی راج چوہان سے مسلمان حکمرانوں نے جیتا تھا سنبھل کی مسجدکو وہ بابر کی فتح کی یادگار ہی مانتے ہیں، جسے بابر نے پرتھوی راج چوہان کے شیو مندر کو مسمار کر کے تعمیر کیا تھا. مراد آباد اور سنبھل کے ہندو اس علاقے کو پرتھوی راج کی سرزمین اور پورے شمالی ہند کے رزمیہ ہیرؤں آلھا اور اودل کی رن بھومی کا درجہ دیتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں جب بھی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے تو دونوں طرف کے فرقوں میں بابر غوری اورپرتھوی راج کی عظمت اور شجاعت کے جھوٹے سچے قصے گشت کرنے لگتے ہیں

انھارویں صدی میں مراد آباد اودھ سلطنت کے زیر نگیں آگیا تھا لیکن لومڑی کی طرح مکاری سے گھات لگا کر شکار کرنے والی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مراد آباد کو ریاست اودھ سے چھین کر اپنی عملداری میں شامل کر لیا تھا 1805 میں سنبھل کے امیر خاں پنڈاری نے اسے دو بار لوٹا تھا. مراد آباد یہ زخم بھی سہہ گیا تھا 1807 میں نواب مجو خاں نے اس علاقے میں انگریز بہادر سے بغاوت کی کمان سنبھالی تھی. مجو خاں کے سپاہیوں نے انگریزوں کے خزانے سے تقریباً تین لاکھ روپے لوٹ کرمراد آباد کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا. تب ہندو ساہو کار بھی مجو خاں کے ساتھ تھے انگریزوں کی سب سے بڑی طاقت عام ہندستانیوں کی حرص اور راجاؤں اور نوابین کی آپسی حسد تھی جسے ہوا دینے میں انگریزوں کو مہارت حاصل تھی. مجو خاں کے حاسد ساہو کاروں اور نوابوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور مجو خاں کی مخبری کر دی اور 30 اپریل 1858 کو انگریز مراد آباد پر پھر قابض ہو گیے تھے سفاک انگریز کلکٹر ولسن نے باغیوں کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک کیا لیکن اس سے بھی زیادہ سفاکی اس نے مجو خاں کے ساتھ دکھائی انہیں ہاتھی کی دُم سے باندھ کر پورے شہر میں گھما کرخوار کیا گیا اس کے بعد انہیں جس چوک میں دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا اسے آج گل شہید کہا جاتا ہے ،جہاں 1857 کے سینکڑوں باغیوں کو پھانسی دی گئی تھی

آج سے ایک سو بائیس سال قبل مجو خاں کی موت پر پورا مرادآباد اسی طرح رویا تھا، جیسے آج اپنوں کی میتوں پر ہچکیاں لے لے کر رویا ہے۔ اپنے جری نواب کی میت پر فاتحہ تک نہ پڑھ سکنے کا درد لے کر سسکتا رہا تھا پورا مراد آباد!... آج پھر اسی شہر کے گھروں میں آنکھوں، پولس تھانے اور سرکاری اسپتال میں اکڑی ہوئی لاشوں کو دیکھنے پر لگتا تھا کہ ان کی نیم وا آنکھیں اپنے رشتے داروں کی آمد کی منتظر ہوں۔ احمد علی کے گھر پر سب خیریت تھی لیکن جب شہر ہی میں عافیت نہ ہو تو کھانا پینا کسے اچھا لگتا۔ یہاں بھی چولھا نہیں جلا تھا۔ گھر کی پلی بھینس کا دودھ وافر مقدار میں تھا۔ سب نے دودھ پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اباجی دالان ہی میں اپنے اس پرانے ٹرانزسٹر پر ریڈیو بی بی سی سنتے سنتے سو گیے تھے، جو وہ حج سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ بو سرِ شام ہی کچھ کھائے بغیر سو گیا تھا۔ احمد علی کشادہ دیوان خانے میں بچھے جہازی تخت پر کچھ بچھائے بغیر ہی لیٹ کر چھت کی کڑیوں کو دیکھ رہا تھا جو لالٹین کی ناکافی پیلی روشنی میں ایک دوسرے پر اپنا سایہ ڈال رہی تھیں۔ بجلی صبح ہی سے ندارد تھی۔ لوڈ شیڈنگ تو ہوتی ہی رہتی ہے لیکن تیج تہواروں پر بجلی وبھاگ ضرور فیاضی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ آج تہوار کہاں تھا، آج تو ماتم کا دن تھا... احمد علی کی آنکھوں میں عیدگاہ کے فرش پر روندے جاتے اور خون میں سنے جسم گھوم رہے تھے۔ خون اور مٹی سے لتھڑے چہروں میں اسے رہ رہ کر، ایک گورا معصوم نسوانی چہرہ روشن ہو جاتا۔ اسے لگتا یہ سب ایک خواب سا ہے۔ ایک خواب جو وہ دیکھ رہا ہے اور اسی خواب میں سوچ بھی رہا ہے کہ یہ محض ایک خواب ہے!...

''کچھ کھاؤ گے نہیں احمد؟'' بھابی کی آواز پر اس نے چونک کر کروٹ لی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''دن میں بھی کچھ نہیں کھایا تم نے۔'' کہتے ہوئے بھابی تخت کے قریب بچھے بید کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''تے ہو جائے گی بھابی۔'' احمد علی نے دھیرے سے کہا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' بھابی نے تھوڑے توقف سے کہا۔ احمد علی کو لگا جیسے بھابی اس کے خواب میں داخل ہو کر اس معصوم سے چہرے کی بابت پوچھنے والی ہیں۔ وہ اٹھ کر گاؤ تکیے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا اور ان کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تم اور بہو نے کس کے گھر میں پناہ لی تھی؟'' بھابی کے اس سوال نے اسے یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ وہ اس کے خواب میں نہیں داخل ہو سکی ہیں لیکن وہ جو جاننا چاہتی تھیں اسے بتانا اس کے لیے مشکل تھا۔

''یہ پھوپھی کون ہیں، جن کا نام آتے ہی گھر میں سناٹا کھنچ گیا؟'' بھابی صوفہ کھینچ کر قریب آ گئیں۔

''اس سے کیا پوچھتی ہو مجھ سے پوچھو۔'' امی چہرے کے اطراف لپٹے دوپٹے کو کھولتی ہوئی دیوان خانے میں داخل ہوئیں۔ وہ شاید نماز اور وظیفہ پڑھ کر آ رہی تھیں۔ ان کی آواز کی تلخی کو بھابی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکیں۔ امی تخت پر بیٹھ کر احمد علی کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں ''وہ تمھارے ابا جی کی اکلوتی چھوٹی بہن ہے طاہرہ! ہم نے پندرہ سال سے اس کے مکان میں قدم نہ رکھا اور وہ بھی اپنے بھیا سے اتنی ہی دور رہ رہی ہے۔''

''امی اکلوتی بہن تو بھیا کو بڑی پیاری ہوتی ہے۔'' بھابی نے نرمی سے کہا۔

''ہاں، بہن ہو گی تب نا۔ اس نے بھائی کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کوئی دشمن بھی نہ کرے۔'' امی زور زور سے بولنے لگیں۔ ''ایسا بھائی جس نے پرورش کی۔ دھوم دھام سے شادی کی۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دیا۔ سسرال کیا گئی حصے کی دعوے دار بن گئی۔ تم ہی بتاؤ باپ کی جائداد میں لونڈیا کا کیسا حصہ؟ بہت سمجھایا بجھایا سب نے نہیں مانی کہنے لگی شریعت کے مطابق دو آنے حصہ ہوتا ہے بیٹی کا۔ ان کی اماں زندہ تھیں تب انہوں نے بھی سمجھایا کہ بٹیا بھیا نے قرض لے کر تمھاری شادی کی ہے یہ حصے کی ضد نہ کر دیکھ، ہم کون سا حصہ لے کر آئے تھے۔ مجال ہے جو اس نے کسی کی سنی ہو کہنے لگی۔ تم نے نہ لیا تمھاری غلطی تھی میں کیوں نہ لوں۔ میرے میاں کا کاروبار ٹھپ پڑا ہوا ہے اسے پیسوں کی سخت ضرورت ہے میاں نے بنک سے قرض لیا تھا اُسے ادا کرنا ہے اگر نہ کیا تو قرقی آ جاوے گی۔ بھیا نے کہا اچھا تو بنک کا قرض چکانے کے لیے مجھ سے قرض لے لے میں کوئی بیاج تھوڑے ہی لینے کا، دے دینا تھوڑا تھوڑا کر کے۔ نہ ماننے کی تھی نہ مانی منہ در منہ کہنے لگی خود کو مقروض کہتے ہو تو ہمیں قرض دینے کے لیے کہاں سے روپے آ گئے؟۔ اگر حصہ نہ دیا تو برادری کی پنچایت کراؤں گی۔ تمھارے ابا نے سوچا بڑی جگ ہنسائی ہو گی۔ یوں سمجھو کہ فکر سے بستر پکڑ لیا لیکن اس کا دل نہ پسیجا۔''

''ارے وہ اتنا آگے چلی گئیں!'' بھابی کو سچ مچ حیرت ہوئی۔

''ارے بیٹی وہ ایسی نہ تھی، پتہ نہیں اسے کیا گھول کے کھلا پلا دیا تھا کہ اس نے بالکل آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اس کی ساس قبر بجو ہے۔ ہندستان کی کون سی درگاہ ہو گی جس کی چوکھٹ اس سے بچی ہو۔ ہم تو دعا گنڈے جانتے نہ ہیں اور یقین بھی نہ کرے ہیں لیکن اس لونڈیا کے بدلے لچھن دیکھ کر اب ماننے لگے ہیں کہ اچھا بُرا علم بھی ہووے ہے۔ وہ ضد پر ایسی اڑی کہ تمھارے ابا نے بازار والی پشتینی دوکان اونے پونے بیچ کر اس کا منہ بھرا تب جا کے اس کے کلیجے کو ٹھنڈک ہوئی۔ بس تب سے جو رشتہ ٹوٹا ہے تو بھائی بہن نے ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھی۔''

''کب کی بات ہے امی؟'' بھابی کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اس گھر میں آئے دو سال ہو رہے ہیں، کبھی طاہرہ پھوپی کا نام نہیں سنا۔

''یوں سمجھو کہ بہو کی پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔''

'' ان کے بڑے بھائی جان نے بھی مجھ سے کبھی ذکر نہ کیا!'' بھابی نے احمد علی کی طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''تمھارے میاں اتّے سے تھے تو جان چھڑکتی تھی اس پر اور اسے تو دن بھر گود میں لٹکائے رہتی تھی۔'' امی نے احمد علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''امی ان کے کتنے بچے ہیں؟'' احمد علی نے اپنے اشتیاق کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''سنا ہے ایک ہی بیٹی ہے۔ تم سے دو تین سال چھوٹی ہو گی۔''

''آپ نے نہیں دیکھا اُسے؟'' احمد علی نے امی کی منشا کو جاننے کے لیے پوچھا۔

''دشمنوں کی آل اولاد سے ہمارا کیا لینا دینا۔'' امی کا لہجہ ایک دم سے سخت ہو گیا تھا۔ پھر وہ بہو سے مخاطب ہوئیں۔ ''چلو بہو کا بستر لگا دو میں اسے اٹھا لیتی ہوں۔ میرا بچہ بھوکا ہی سو گیا۔''

بھابی اور امی احمد علی کو سوچتا ہوا چھوڑ گئیں۔ امی کی باتیں اسے ایک عجیب طرح کے شش و پنج میں ڈال رہی تھیں۔ امی نے پھوپھی اور ان کی آل اولاد کے لیے جس ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا وہ اسے مستقبل کے انجانے خطروں کا اشارہ دے رہی تھیں۔ لالٹین اچانک بھبکنے لگی تھی۔ شاید تیل ختم ہو گیا تھا۔ وہ جب تک اٹھتا لالٹین بجھ گئی اور دیوان خانے میں اچانک آنکھوں میں بھر جانے والا اندھیرا پھیل گیا۔ احمد علی نے پہلی بار محسوس کیا کہ خوف کا رنگ گھپ اندھیرے جیسا ہوتا ہے!

OO

تذکرے

آزادی و خودداری

بیگم حضرت محل

نیر مسعود

1857 میں آزادی کی پہلی جنگ میں اودھ نے انگریزوں کی سخت مزاحمت کی۔ یہ اتنے تعجب کی بات نہیں، جتنی یہ بات کہ یہ مزاحمت معزول واجد علی شاہ کی ایک پردہ نشین بیگم کی سرکردگی میں ہوئی، جنھوں نے سپاہیوں میں ایسا جوش بھر دیا کہ اودھ کی چھنی ہوئی سلطنت ایک بار پھر ہندوستانیوں کے قبضے میں آگئی۔ (اگرچہ عارضی طور پر)

ان بیگم کی مختصر روداد یہ ہے:

دہلی میں مغل بادشاہوں کی سلطنت کمزور پڑ جانے کے بعد سے ہندوستان میں انگریزوں کی طاقت بڑھتی جارہی تھی۔ انگریز ہندوستان میں تجارت کرنے آئے تھے لیکن اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی آڑ میں وہ سارے ملک پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور دہلی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی ہر ریاست پر ان کی للچائی ہوئی نظریں پڑ رہی تھیں، ان میں سب سے اہم اودھ کی ریاست تھی، جس کا دارالسلطنت لکھنؤ تہذیب کے علاوہ تجارت کا بھی بہت بڑا مرکز تھا۔ یہ ریاست کہنے کو آزاد تھی مگر یہاں کی سیاست پر بھی انگریز چھائے ہوئے تھے۔ ان کا ایک ریزیڈنٹ لکھنؤ میں موجود رہتا تھا اور اس ریزیڈنٹ کی مرضی کے خلاف اودھ کے حاکم کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ انگریزوں سے ٹکر لے سکیں۔ صرف اودھ کے تیسرے نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا اور جنگ کے میدان میں ان کا مقابلہ کیا۔ شجاع الدولہ بہت بہادر اور طاقت ور تھے۔ وہ نہایت عمدہ سپاہی اور لائق سپہ سالار تھے، لیکن وہ بھی انگریزوں سے نہیں جیت سکے اور بالآخر انھیں بھی انگریزوں کے آگے جھک جانا پڑا۔ شجاع الدولہ کے بعد اودھ کے تخت پر سات حاکم اور آئے مگر کسی کی انگریزوں سے ٹکرانے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ کٹھ پتلیوں کی طرح انگریزوں کے اشاروں پر چلتے رہے۔

انگریزوں کو یقین اور اطمینان ہو چکا تھا کہ اب اودھ ان کے پیروں

■

حضرت محل دیکھ رہی تھیں کہ بغاوت کے شعلے میرٹھ، دہلی وغیرہ سے ہوتے ہوئے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لکھنؤ میں انگریز جنگ کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ قریب ہے کہ لکھنؤ بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن وہ ابھی خاموشی کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ آخر 30 مئی 1857 کو لکھنؤ میں بھی جنگ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ بھی میدان میں اتر آئے اور ہندوستانی فوج نے انگریزی فوج کو دبانا شروع کیا۔ لیکن اس فوج کے پاس کوئی بادشاہ نہ تھا اس لئے کہ واجد علی شاہ کو انگریزوں نے کلکتہ کے قلعہ میں نظر بند کر رکھا تھا۔ طے ہوا کہ شاہی خاندان میں سے کسی کو بادشاہ بنایا جائے۔

■

کے نیچے ہے اور اب کوئی شجاع الدولہ کی طرح ان کو للکارنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ پھر بھی وہ اودھ کے دربار پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ کہیں کوئی ایسا تو نہیں جو ان کی مخالفت کر سکے اور اگر انھیں کہیں پر مخالفت کی کوئی چنگاری بھی نظر آتی تھی تو اسے فوراً بجھا دیتے تھے۔

لیکن لکھنؤ کے شاہی محلوں میں ایک لڑکی پر ان کی نظر نہیں پڑی اور اگر ان کی نظر پڑتی تو بھی وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ یہ معمولی لڑکی ان کے راستے میں بھی دیوار بن کر کھڑی ہو جائے گی۔ شجاع الدولہ کی طرح ان کا مقابلہ کرے گی، شجاع الدولہ کی طرح ہار بھی جائے گی لیکن شجاع الدولہ کی طرح ان کے آگے سر کبھی نہ جھکائے گی۔

اس لڑکی کو کئی نام دیئے گئے۔ محمدی خانم، مہک پری، افتخار النسا، راج ماتا، جناب عالیہ، لیکن اس کا سب سے مشہور نام ہے بیگم حضرت محل۔

اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ سے پہلے ان کے باپ امجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے۔ شہزادہ واجد علی کو پڑھنے لکھنے کے علاوہ ناچ گانے سے بھی دل چسپی تھی۔ انھوں نے 'پری خانہ' کے نام سے ایک طرح کا اسکول قائم کیا تھا جس میں ناچ گانے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پری خانے میں تعلیم پانے والی لڑکیاں پریاں کہلاتی تھیں۔

ایک دن اٹھارہ انیس سال کی ایک لڑکی محمدی خانم اس اسکول میں داخل ہوئی۔ شہزادے نے اس کا نام مہک پری رکھا۔ کچھ دن تک مہک پری ناچنا گانا سیکھتی رہی۔ لیکن شہزادے نے اسے بیوی بنا کر پری خانے سے ہٹا لیا۔ اس کا نام افتخار النسا رکھا۔ ان سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ باپ نے اس کا نام رمضان علی مرزا رکھا اور دادا نے اس کو برجیس قدر خطاب دیا۔

باپ کے مرنے کے بعد جب 1847 میں واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے تو انھوں نے افتخار النسا خانم کو حضرت محل کا خطاب دیا۔ واجد علی شاہ کی بہت سی بیگمیں تھیں۔ یہ بیگمیں آپس میں الجھتی رہتی تھیں اور بادشاہ کو بھی پریشان کرتی تھیں۔ بادشاہ نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ ان بیگموں کی شکایتیں کی ہیں لیکن ان شکایتوں میں حضرت محل کا نام نہیں آتا۔

حضرت محل بیگموں کے جھگڑوں سے الگ تھلگ ننھے برجیس قدر کی پرورش میں لگی رہتی تھیں۔ لیکن شاید وہ دوسری بیگموں کی طرح محل کے باہر کی دنیا سے بے خبر نہیں تھیں اور خوب جانتی تھیں کہ واجد علی شاہ اور اودھ کی حکومت کس خطرے میں گھری ہوئی ہے۔

یہ خطرہ انگریزوں کا تھا۔ اودھ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح واجد علی شاہ بھی انگریزوں کے سامنے بے بس تھے۔ انھوں نے انگریزوں کی مرضی کے خلاف حتی الامکان کوئی بات نہیں کی، لیکن اب انگریز چاہتے تھے کھلم کھلا اودھ پر قبضہ کر لیں۔ اس غرض سے انھوں نے واجد علی شاہ کے خلاف الزاموں کی ایک لمبی فہرست تیار کی اور فروری 1856 میں بادشاہ سے کہہ دیا کہ آپ حکومت کا انتظام نہیں کر سکتے اس لئے اب اودھ کی حکومت ہم اپنے ہاتھ میں لینے جا رہے ہیں۔ واجد علی شاہ نے ان الزامات کے بہت اچھے جواب دیئے۔ لیکن انگریز اودھ پر قبضہ کا فیصلہ کر چکے تھے۔ واجد علی شاہ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت وہ تخت چھوڑنے سے انکار کریں گے تو لڑائی کی نوبت آ جائے گی اور لڑائی میں وہ انگریزوں سے جیت نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر لڑائی ہوئی تو ان کا لکھنؤ تباہ ہو جائے گا اس لئے انھوں نے تخت چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اودھ پر انگریزوں کی حکومت ہو گئی۔ واجد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لندن جا کر انگریزی پارلیمنٹ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کر کے سلطنت کی واپسی کی کوشش کریں۔ اس غرض سے وہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ بادشاہ کے ساتھ اس ناانصافی اور لکھنؤ سے ان کے چلے جانے کا رعایا نے بڑا غم منایا اور بہت دنوں تک نظموں اور گیتوں میں ان کی واپسی کی دعائیں کی گئیں۔ لیکن سلطان عالم واجد علی شاہ کو پھر کبھی لکھنؤ آنا نصیب نہ ہوا۔

لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت بادشاہ نے اپنی بیگموں کو عام اجازت دے دی تھی کہ وہ محل چھوڑ کر جا سکتی ہیں چنانچہ بہت سی بیگمیں چلی گئیں، لیکن کئی بیگموں نے محل سے جانا وفاداری کے خلاف سمجھا اور کہیں نہیں گئیں۔ ان میں بیگم حضرت محل بھی تھیں۔

واجد علی شاہ کلکتہ میں جا کر ٹھہرے۔ ادھر لکھنؤ میں انگریزوں کی حکومت تو ہو گئی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر بھر میں اندر ہی اندر ایک آگ سی سلگ رہی ہے اور لکھنؤ ہی میں نہیں یہ آگ ہندوستان بھر میں سلگ رہی تھی۔ یہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو استعمار کی زنجیروں میں جکڑ رہی تھی اور ہندوستان ان زنجیروں کو توڑنا چاہتا تھا۔ یہ اس کش مکش کی آگ تھی جو دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی اور آخر میرٹھ میں یہ آگ شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ میرٹھ کے ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے انگریز آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس طرح 1857 کی جنگ آزادی شروع ہوئی جس کے سورماؤں میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی طرح اودھ کی بیگم حضرت محل کا نام بھی روشن ہوتا تھا۔

حضرت محل دیکھ رہی تھیں کہ 1857 کے شعلے میرٹھ، دہلی وغیرہ سے ہوتے ہوئے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لکھنؤ میں انگریز جنگ کی تیاریوں میں لگے

ہوئے ہیں۔ قریب ہے کہ لکھنؤ بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن وہ ابھی خاموشی کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ آخر 30 مئی 1857 کو لکھنؤ میں بھی جنگ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ بھی میدان میں اتر آئے اور ہندوستانی فوج نے انگریزی فوج کو دبانا شروع کیا۔ لیکن اس فوج کے پاس کوئی بادشاہ نہ تھا اس لئے کہ واجد علی شاہ کو انگریزوں نے کلکتہ کے قلعہ میں نظر بند کر رکھا تھا۔ طے ہوا کہ شاہی خاندان میں سے کسی کو بادشاہ بنایا جائے۔

اس وقت بادشاہ بننا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ اودھ کا شاہی تخت کانٹوں کی سیج بنا ہوا تھا اور اس سیج پر کوئی بیٹھنے والا نہیں ملتا تھا۔ آخر برجیس قدر پر آکر نظریں ٹھہریں اور بیگم حضرت محل اس پر تیار ہو گئیں کہ آزادی کی اس خطرناک جنگ میں اپنے چھوٹے سے لڑکے کو سب سے آگے کر دیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نام برجیس قدر کا رہے گا مگر کام خود انھیں کرنا ہوگا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے کندھوں پر ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ آپڑا ہے۔ اس وقت شاید کسی کو خیال نہ ہوگا کہ حضرت محل اس بوجھ کو اٹھا سکیں گی۔ لیکن سب نے دیکھ لیا کہ جس لڑکی نے محل میں پردے کے اندر سے زندگی شروع کی تھی وہی اب راج ماتا بن کر لڑائی کے میدان میں اس طرح کھڑی ہے جیسے اس کی ساری زندگی تلواروں سے کھیلتے گزری ہو۔

برجیس قدر کی طرف سے منادی کرائی گئی کہ ہم نے اپنی حکومت واپس لے لی ہے اور اب انگریزوں کو یہاں سے نکال دینا ضروری ہے۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں شاہی فوج اور دوسرے محکموں کے جن ملازموں کو نکال دیا تھا وہ سب واپس آجائیں۔ اودھ کے زمینداروں اور تعلقہ داروں کو بھی مدد کے لئے بلایا گیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک بڑی فوج تیار ہوگئی۔ ریزیڈنٹ کے رہنے کی عمارت کو جو بیلی گارد کہلاتی تھی، گھیر لیا گیا۔ نئے جوش کے ساتھ جنگ جاری ہوئی اور اب بیگم حضرت محل کے جوہر کھلنا شروع ہوئے۔

حضرت محل جنگ کے میدان میں خود موجود رہتیں اور کبھی ہمت نہیں ہارتی تھیں۔ محل کی دوسری بیگمیں ان کو دیکھتی تھیں اور حیران تھیں۔ کچھ ان سے جلتی تھیں، کچھ ان کی تعریف کرتی تھیں، لیکن ان کی بہادری کی سب قائل تھیں۔ ایک بیگم نے واجد علی شاہ کو خط میں لکھا:

"میں نہیں سمجھتی تھی کہ حضرت محل ایسی آفت کی پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ آنکھ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔"

مگر دوسری بیگم نے بادشاہ کو لکھا:

"حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر دیا کہ جس کی عورت ایسی ہو جو مردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہو تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہوگا۔"

حضرت محل کی فوج نے بڑی تیزی سے کامیابیاں حاصل کرنا شروع کیں۔ تاریخ بتاتی ہے:

"صرف گیارہ دن میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عمل داری خواب معلوم ہوتی تھی۔"

اور یہی بات ایک انگریز افسر سر ہنری لارنس نے لفٹنٹ گورنر کو خط میں اس طرح لکھی:

"تمام ضلعوں میں حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور روز بروز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقہ داروں نے ہتھیار اٹھا لئے ہیں اور بعضوں نے دیہاتوں پر قبضہ کر لیا ہے۔"

دراصل حضرت محل کو دو لڑائیاں لڑنا پڑ رہی تھیں۔ ایک محل کے باہر انگریزوں سے اور دوسری لڑائی محل کے اندر دوسری بیگموں سے، جن کا کہنا تھا کہ اگر بیلی گارد کے انگریزوں کی جان لی گئی تو کلکتہ میں واجد علی شاہ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ محل کے اندر کی عورتوں میں سے کچھ کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں اور یہاں کی خبریں وہاں پہونچاتی ہیں۔ مگر حضرت محل دونوں میدانوں میں بڑی بہادری کے ساتھ جمی رہیں۔

کچھ دن بعد دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے پاس اودھ کی طرف سے سفیر بھیجا گیا اور برجیس قدر نے بادشاہ کو عرضداشت لکھی:

"حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی، خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ اس خاکسار عقیدت نہاد نے کافران فرنگ کو تہ تیغ بے دریغ کیا۔ چند کفار بد نہاد بیلی گارد میں باقی ہیں، وہ بھی مارے جاتے ہیں۔ مگر امیدوار عنایت خسروانہ کا ہوں کہ جو مہربانی سرکار حضور سے میرے بزرگوں کے ساتھ رہی تھی وہی پرورش حضور کو میرے حق میں بھی چاہئے..."

اور بہادر شاہ ظفر نے جواب میں اس طرح ان کا حوصلہ بڑھایا:

"فرزند ارجمند مرزا برجیس قدر بہادر، شاہ اودھ آفریں ہو کہ چھوٹے سے سن میں تم نے بڑا کام نام کیا... تمہارے واسطے مہر خطاب بھیجی جائے گی۔ خاطر جمع رکھو۔ جو ملک قدیم تمہارا تھا، اس سے زیادہ عطا ہوگا۔"

یہ سفیر ابھی وہیں تھا کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ سفیر بڑی مشکل سے جان بچا کر لکھنؤ واپس آیا اور اس نے حضرت محل کو بتایا کہ دہلی کا خاتمہ ہو چکا۔ پھر خبر آئی کہ کان پور میں ہندوستانیوں کی فوج انگریزوں سے شکست کھا کر لکھنؤ کی طرف چلی آرہی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے انگریزی فوج ہے۔ یہاں بیلی گارد گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا لیکن اس پر ہندوستانی فوج کا

قبضہ نہیں ہو پایا تھا۔

انگریزوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے بیلی گارد کو لینے کے لئے اس پر ایک اور بھرپور حملہ کیا گیا۔ قیصر باغ میں حضرت محل رات بھر جاگتی رہیں اور اب جھوٹی سچی خبریں پھیلنا شروع ہوئیں۔

ایک خبر یہ بھی آئی کہ بیلی گارد پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر یہ خبر غلط نکلی اور نئی خبر آئی کہ کان پور سے بھاگ کر آتی ہوئی فوج میں انگریزوں نے اپنی فوج ملا دی۔ پھر خبر آئی کہ کان پور کی انگریزی فوج سر پر چلی آ رہی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خبر پھیلی کہ انگریزوں نے بیلی گارد سے باہر نکل کر ہندوستانی فوج کو شکست دے دی ہے اور اب وہ قیصر باغ کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی قیصر باغ میں بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن حضرت محل نے قیصر باغ کے تمام پھاٹک بند کرا دیئے کہ کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔

اب جنگ کا نقشہ بگڑ چکا تھا۔ انگریز جنرلوں اوٹرام اور ہیولاک کی فوجیں ہندوستانی فوجوں کو ہٹاتی ہوئی بیلی گارد میں داخل ہو گئیں اور اب انھوں نے پلٹ کر قیصر باغ پر حملہ کر دیا۔ باغ کی ایک دیوار پھٹ گئی اور دوسری بیگموں نے حضرت محل کو کوسنا شروع کر دیا۔

دھیرے دھیرے پورے لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا چلا گیا اور آخر انگریزی فوجیں قیصر باغ میں داخل ہو گئیں۔ اسی وقت ہندوستانی فوج کا بھی ایک دستہ آپہونچا اور قیصر باغ کے اندر زبردست لڑائی چھڑ گئی۔ باغ کی کیاریوں میں خون بہنے لگا اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے لیکن آخر یہاں بھی انگریز جیتے۔ اب حضرت محل قیصر باغ کو خالی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ وہ گھسیاری منڈی کی طرف والے پھاٹک سے عورتوں کے ایک قافلے کے ساتھ باہر نکلیں۔

راستے میں لوگ اس قافلے کو دیکھ کر روتے تھے۔ حضرت محل حسین آباد میں جا کر ٹھہریں اور ایک بار پھر انھوں نے بچی کھچی فوج کو اکٹھا کر کے انگریزوں سے ٹکر لی لیکن ان کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

حضرت محل لڑائی ہار گئی تھیں مگر ہمت نہیں ہاری تھیں۔ اس وقت جب ان کے جیتنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی، انھیں انگریزوں کی طرف سے پیام ملا کہ آپ کا ملک آپ کو واپس کر دیا جائے گا، آپ لڑائی بند کر دیجئے، لیکن حضرت محل نے اس پیغام کو اور ایسے ہی کئی پیغاموں کو ٹھکرا دیا۔ وہ انگریزوں کی دی ہوئی نہیں بلکہ اپنے بازوؤں کے زور سے لی ہوئی حکومت چاہتی تھیں۔ وہ اسی کے لئے میدان میں اتری تھیں۔ جب ان کی کوششیں ناکام ہوئیں تو انگریزوں کی پیش کی ہوئی کوئی رعایت قبول کرنے کے بجائے انھوں نے ہندوستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور نیپال روانہ ہو گئیں۔

راستے میں بہرائچ کے قریب بونڈی کے مقام پر انھوں نے پڑاؤ ڈالا۔ لکھنؤ کے ہارے ہوئے فوجی دستے جو ادھر ادھر بکھر گئے تھے بونڈی میں آ کر جمع ہو گئے اور کچھ دن کے لئے بونڈی چھوٹا سا لکھنؤ معلوم ہونے لگا۔ حضرت محل بونڈی ہی میں تھیں جب انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کا فرمان ہندوستان پہنچا جس میں ہندوستانیوں سے بہت اچھے اچھے وعدے کئے گئے تھے۔ اس فرمان کے پہنچنے پر بہت سے لوگ واپس چلے گئے مگر حضرت محل نے اس کے جواب میں ایک فرمان جاری کیا، جس میں شروع سے اب تک انگریزوں کی زیادتیوں کا پردہ کھول دیا گیا تھا۔

حضرت محل نے اس فرمان میں ایک سوال بھی کیا تھا کہ انگریزوں نے اس بہانے سے کہ ہمارا انتظام اچھا نہیں تھا اور ہماری رعایا ہم سے خوش نہیں تھی، ہمارے ہاتھوں سے ہماری حکومت لے لی۔ اگر ایسا تھا تو رعایا نے اتنی وفاداری سے ہمارا ساتھ کیوں دیا اور ہماری خاطر اپنی جانیں کیوں قربان کیں؟ یہ وہ سوال تھا جس کا آج تک جواب نہیں مل سکا۔

بونڈی میں بھی حضرت محل کی فوجوں نے ایک دفعہ پھر انگریزی فوجوں سے زبردست ٹکر لی، مگر ایک بار پھر انھیں ہارنا پڑا۔ اب حضرت محل بالکل مایوس ہو گئیں اور برجیس قدر اور کچھ دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ نیپال کی سرحد میں داخل ہو گئیں۔ انھیں بڑی مشکل سے نیپال میں قیام کی اجازت ملی۔

ہندوستان میں انگریزی کی حکومت جم گئی اور حضرت محل نیپال میں زندگی گزارتی رہیں۔ بہت دنوں بعد انگریزی حکومت کی طرف سے ایک آدمی برجیس قدر کی تصویر کھینچنے نیپال بھیجا گیا۔ اس نے حضرت محل کو حکومت کا یہ پیغام دیا کہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہندوستان واپس آ کر عیش و آرام کے ساتھ جہاں چاہے رہیے۔ آپ کا آنا ہم اپنے لئے فخر کی بات سمجھیں گے۔ آپ کی شان کے مطابق آپ کا وظیفہ مقرر کیا جائیگا اور آپ کا شاہی احترام ہوگا۔

حضرت محل نے یہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس ملک میں وہ راج ماتا تھیں، جہاں انھوں نے آزادی کی جنگ کی سرداری کی تھی، اب وہاں دشمن کے مہمان کی طرح رہ کر وہ کیا کرتیں۔ انھوں نے آزاد ہند کے خواب دیکھے تھے۔ غلام ہندوستان میں رہنا انھیں کیونکر گوارا ہوتا؟

اس لئے بیگم حضرت محل پھر کبھی ہندوستان نہیں آئیں بلکہ وہ نیپال میں خاموشی کے ساتھ زندہ رہیں اور وہیں ایک دن خاموشی کے ساتھ مر گئیں۔ لیکن شاید مرتے وقت بھی وہ آزاد ہندوستان کا خواب دیکھ رہی ہوں۔ OO

آنکھن دیکھی تن من بیتی

غالب اور اٹھارہ سوستاون

جاوید رحمانی

■

"...واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں... مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور بازپرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں... اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے؛ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں"

غالب 5 دسمبر 1857

■

انیسویں صدی

کو پروفیسر شمیم حنفی نے تخلیقی طور پر اضمحلال کی صدی کہا ہے۔ اور یہ واقعتاً ہندستان کی تمام زبانوں کے لیے اضمحلال/زوال کی صدی ہے۔ اس صدی میں غالب کی شخصیت ایک روشن نقطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

"انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ ہندستانی معاشرے پر بتدریج ایک غیر دل چسپ قسم کی نثریت کا غلبہ بڑھتا گیا۔ اردو میں تو حالت پھر بھی غنیمت کہی جا سکتی ہے کہ معاملہ افادی ادب کے تصور تک پہنچ کر ٹھہر گیا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس صدی کے پورے شعری منظر نامے پر غالب کا سایہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن دوسری زبانوں میں رفتہ رفتہ شعر و ادب کے نام پر ایک مستقل سستا پن حاوی ہوتا گیا۔ چنانچہ ہندستانی ادبیات کی تاریخ میں، مغرب سے ماخوذ اسالیب، اصناف اور تصورات کی چمک دمک کے باوجود، مغربی افکار کے سایے میں سانس لیتی ہوئی انیسویں صدی تخلیقی قوتوں کے اضمحلال اور زوال کی صدی ہے۔"[1]

غالب کی شخصیت کئی لحاظ سے اس صدی کی سب سے نمائندہ شخصیت ہے۔ حالی نے یوں ہی غالب کے مرنے کو دلّی کے مرنے سے تعبیر نہ کیا تھا! سجاد باقر رضوی نے لکھا ہے کہ "غالب برصغیر کی تقریباً ہزار سالہ مسلم تہذیب کا استعارہ ہیں ایسا ہی استعارہ جیسا کہ امیر خسرو تھے۔ امیر خسرو کا تعلق دورِ عروج سے تھا مرزا غالب کا دور زوال ہے۔"[2] اور عروج و زوال کا یہ کھیل دلّی کے میدان میں کھیلا گیا اس کا مرکز و محور دلّی تھی۔ اس لیے اس پوری کہانی کے نشیب و فراز کو دلّی کے حوالے ہی سے سمجھا جا سکتا ہے اور غالب کی ذات اس دلّی کا ایسا اہم حصہ تھی کہ حالی نے اس کے مرنے کو دلّی کے مرنے سے تعبیر کیا ہے۔

غالب کو وہ زمانہ ملا کہ مغلوں کی تلوار ٹوٹ چکی تھی اور ان کی ساری توجہ کھیل تماشے اور تفریحات و تقریبات پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اسی زمانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہاں آٹھ دن نو میلے تھے۔ زندگی کا کوئی نصب العین نہ تھا۔

سید ضمیر حسن دہلوی نے صحیح لکھا ہے کہ ''اس زمانے کی دلی کا یہ عالم تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا 'اکبر شاہ ثانی چولہے آگ نہ گھڑے پانی' بچے بچے کی زبان پر تھا مگر وہ جو اگلی دولت کی فراوانی نے بزم آرائی کے خط و خال میں نفاست اور نزاکت بھر رکھی تھی وہ البتہ ضرور قائم تھی... مذہبی رسوم موسمی تہواروں اور شادی و غمی کو تقریبات کا بہانہ بنا لیا گیا تھا۔''[3]

اور مغل تہذیب تو یوں بھی نفاست و نزاکت اور حسن و جمال کی تہذیب تھی۔ جب اس سے جلال رخصت ہوا تو ساری توجہ جمال پر مرکوز ہونی ہی تھی چنانچہ مرزا کے عہد میں ایسا ہی ہوا اور لال قلعہ کی مرکزیت یوں تو پارہ پارہ ہو چکی تھی لیکن ایک ادبی و تہذیبی ادارے کی حیثیت اسے اب بھی حاصل تھی۔ اگرچہ کتنی دیر؟ یہ کہنا مشکل تھا قاضی عبدالجمیل کو غالب نے لکھا کہ ''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں وہاں کے مصرعہ طرح کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں کیا معلوم ہے ابھی نہ ہو اب کی ہو تو آئندہ نہ ہو۔''[4]

غرض ایسی غیر یقینی صورتِ حال تھی کہ کچھ بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ صورت اچانک نہیں پیدا ہوئی تھی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے ''غالب نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت مغلیہ حواس باختہ ہو چکی تھی اور مرہٹوں جاٹوں یا سکھوں کی طاقت بھی کوئی ایسی بنیاد نہیں رکھتی تھی جو مغلیہ حکومت کا متبادل فراہم کر سکے۔ ایک نئی غیر ملکی طاقت کمپنی بہادر کی البتہ اپنی جڑیں گہرائی میں جما چکی تھی اور مشرق سے شمال مغرب کی طرف بڑھتی چلی آتی تھی۔''[5]

یہاں پر اس قدر اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں اور جاٹوں نے ہی انگریزوں کے تسلط کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مغلوں کی حواس باختگی میں ان کا جو حصہ رہا ہے، اسے بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ بہر حال یہ صرف دو گروہ یا دو جماعتوں کی سیاسی شکست و فتح کا کھیل نہیں تھا بلکہ دو تہذیبوں کی آویزش تھی جس کے عینی شاہد غالب تھے جو یہ شعور رکھتے تھے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور غالب کی زندگی میں ہی یہ آویزش مکمل بھی ہوئی اور اس کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا جو ایک طرح سے نئے نظام کی فتح ہے پرانے نظام پر۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کم و بیش ان ہی زمانوں میں قدیم و جدید کی آویزش عالمی منظر نامے پر بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا یہاں ذکر ہمیں اپنے موضوع سے دور لے جائے گا اور قدرے غیر ضروری بھی ہے۔

دلّی کا سیاسی اثر بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا اور اس کا حال یہاں کے موسموں جیسا بڑی مدت سے تھا۔ کہتے ہیں دلّی کا اپنا کوئی موسم نہیں۔ تو مسلسل حملوں نے کم و بیش ایسی ہی صورت سیاسی سطح پر پیدا کر دی کہ دکن سے کوئی آندھی اٹھی تو اس کی زد میں لال قلعہ، پنجاب سے کوئی ہوا چلی تو دلّی کا حال دگرگوں۔ لیکن انگریزوں کی مداخلت نے پوری بساط ہی الٹ دی۔ کوئی آندھی آتی تو گزر جاتی تھی، کوئی ہوا چلتی تو تھمتی بھی تھی 1803 کے بعد تو مغل بادشاہت نہیں اس کا بھرم باقی رہا جو کچھ تو انگریزوں نے اپنی حکمت عملی کے تحت قائم رکھا اور کچھ مغلوں نے اپنی خود فریبی سے۔ شاہجہانی جاہ و جلال رخصت ہو چکا تھا اس کے سائے لرزاں تھے۔ ان کی روایات قائم تھیں جو تلخ حقیقت پر پردہ ڈال دیتی تھیں۔

اسی لیے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے قلعہ کو ایک ایسے سراب سے تعبیر کیا ہے جس نے مدتوں حقیقت کا احساس نہ ہونے دیا۔ غالب کو حقیقت کا احساس تھا لیکن وہ مجبور محض تھے۔ مغلوں کے سیاسی زوال کا مرقع پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک دلچسپ استعارے کی مدد سے اس طرح پیش کیا ہے کہ ''جس جمنا کے کنارے کبھی ہاتھیوں کی لڑائیاں دیکھی جاتی تھیں وہاں اب ظل سبحانی بٹیروں کی لڑائیاں اور پتنگوں کے معرکے دیکھتے تھے''۔[6] اور ڈاکٹر پرسیول اسپیر کے خیال میں اس زمانے کے ادبی معرکوں کی بھی کیفیت یہی تھی۔ یہ بھی مغل فرماں رواؤں کی خود فریبی کا بہانہ تھے جس میں بہادر شاہ چونکہ خود بھی شاعر تھے تو ایک فریق کی حیثیت سے بھی شامل تھے اور ان بہانوں سے ادبی و تہذیبی مرکزیت قائم تھی۔ حالی نے لکھا ہے:

> ''تیرھویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے حسنِ اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گیے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں... اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلّی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلّی سے باہر چلے گیے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلّی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا''۔[7]

اس پر پروفیسر تنویر احمد علوی کا یہ تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں "اصل میں مولانا حالی اس وقت کی دہلی کے سیاسی زوال اور اقتصادی کم مائیگی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ورنہ جہاں تک علمی کمالات اور ادبی فتوحات کا سوال ہے یہ دور خود مغل تاریخ کا ایک اہم عہد ہے اور اس شان دار عہد کے اہل علم ارباب زہد و ورع اور اصحاب فکر و فن میں ایسے ایسے منتخب روزگار افراد موجود ہیں کہ ان میں سے ہر فرد گویا اپنی ذات میں ایک انجمن ہے... یہ تھی عہد غالب کی دتی جس کی محراب زندگی قوس قزح کی طرح ہفت رنگ تھی اور جس کے افقی دائرے میں غالب کے فکر و فن کو نمو پذیر ہونے اور فروغ پانے کا موقع ملا۔"[8]

اس دتی میں امرا کے دیوان خانے آج کل کی طرح نہیں تھے۔ وہ اعلی علمی و ادبی ذوق و معیار کی نمائندگی کرتے تھے اسی لیے سرسید انھیں حسرت سے یاد کرتے ہیں اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ہر عالم اور امیر کے گھر کو ایک علمی مرکز قرار دیا ہے اور شبیر احمد خاں غوری شاہ عبدالعزیز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس میں اتنے مدارس ہیں کہ کوئی گشت لگائے تو اس کو ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی۔ اس زمانے کی دتی نہ صرف علمی بلکہ ثقافتی رنگارنگی کی بھی نادر الوجود مثال تھی۔ اس میں کیسے کیسے مختلف اور متضاد رنگ سما گیے تھے اس کا اندازہ آسان نہیں اور اس کی بڑی حد تک نمائندگی غالب کے حلقۂ احباب سے بھی ہوتی ہے جس میں رند اور صوفی سبھی شامل ہیں۔

اس دتی میں ایک طرف مدارس اور خانقاہوں کا حال بچھا ہے تو دوسری طرف رقص و سرود، عیش و انبساط اور ہنگامہ ہائے ناؤ نوش بھی ہے اور ایک کی اخلاقیات دوسرے کو زیر نہیں کرتی۔ ایسی ایسی خانقاہیں، جہاں بیرونی ممالک سے بھی عقیدت مند آتے ہیں اور فیض حاصل کر کے لوٹ جاتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی نے ندوۃ العلما کے بانی مولانا محمد علی مونگیری سے کہا کہ "ہم نے عشق کی دو دکانیں دیکھی ہیں ایک شاہ غلام علی کی اور دوسری حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی، کہ اس دکان میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا" (بحوالہ خلیق احمد نظامی) اور ایسی متعدد دکانیں موجود تھیں گو اتنی بڑی نہیں۔ ان ہی میں کالے صاحب کی خانقاہ بھی شامل تھی جن سے غالب بھی عقیدت و محبت کا رشتہ رکھتے تھے۔

غالب نے ان دکانوں سے سودا نہیں خریدا اور اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے تاہم اس بازار میں ان کی عمر تو گزری۔ اسی کے ساتھ متعدد علمی و اصلاحی تحریکیں بھی سرگرمِ عمل تھیں بے شمار کلب پتنگ اڑانے کے، تیرنے کے اور تیر اندازی کے۔ اور اس بازار، ان تحریکات اور ان کلبوں کا دائرۂ اثر اتنا وسیع تھا کہ ان میں شریک ہونے والے ہندو بھی دکھائی دیتے ہیں جنھیں اللہ غنی، اللہ اکبر، بسم اللہ اور یا علی کہنے میں عار نہ تھا اور ایسے مسلمان بھی جو ہندوانہ رسموں کو ادا کرتے شرماتے نہیں تھے اور اسی لیے مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی کتاب 'رسوم دہلی' شروع ہی ان الفاظ سے کی ہے "مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر رسمیں مروج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندوانی رسمیں ہیں جن میں بہت سی رسمیں تو جوں کی توں ہیں۔ بعض کے نام تو وہی ہیں مگر طریقے بدل گیے ہیں بعض میں برائے نام فرق کر دیا ہے۔ بعض کو مذہبی امور میں بہ تغیر نام شامل کر لیا ہے۔"[9]

اکبر کے عہد تک آتے آتے شاہی خاندان کے مذہبی معاملات میں اتنی لچک آ گئی کہ جو شاہزادہ تخت کا حقدار سمجھا جاتا وہ ختنہ نہیں کراتا۔ اس طرح کی ثقافتی رنگارنگی کے بے شمار مظاہر اور انھیں فروغ دینے والے ادارے بکھرے پڑے تھے جن کا قدرے تفصیل سے ذکر خلیق احمد نظامی نے کیا ہے جو غالب کی دتی کے رنگ و آہنگ کو ظاہر کرتے ہیں اور کسی کا اس سے بیگانہ محض رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ مولانا حالی نے سرسید کی جرأت اور بے باکی کا سرچشمہ وہابی علما کی تحریر اور طرز فکر کو بتایا تھا تو خواجہ احمد فاروقی نے لکھا کہ "وہابی علما اور مرزا غالب کے راستے الگ الگ تھے۔ لیکن جس آزادی اور بے باکی سے ان علما نے مذہب رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا اور اصنامِ خیالی کو توڑا۔ اسی آزادی سے مرزا غالب نے فنِ لغت اور فنِ شعر میں بڑے بڑے استادوں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہہ گیے ہیں وہ وحی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہر پرانی لکیر صراط مستقیم ہے۔"[10] اور یہ بات بہر حال جی کو لگتی ہے کہ غالب میں تقلید سے بے زاری اور روایت شکنی کا جو مادہ تھا اسے وہابی تحریک کا فیض کیوں نہیں کہا جا سکتا! حالانکہ غالب بذات خود کہاں تک صراط مستقیم پر تھے خصوصاً فنِ لغت کے سلسلے میں یہ ایک الگ اور لمبی بحث کا موضوع ہے جس پر قاضی عبد الودود اور پروفیسر نذیر احمد صاحبان نے تفصیل سے لکھا ہے، جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔

وہ دتی جس کو یاد کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں "بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں دتی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دتی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلم رو ہند میں اس نام کا تھا۔" تو بیک وقت ہمارا ذہن دتی کے شاندار ماضی اور عبرت ناک حال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

1857 کی بغاوت نے وہ تہذیبی بساط ہی الٹ دی۔ 1857 کی

بغاوت جتنی تیزی سے پھیلی اتنی ہی تیزی سے ٹھنڈی بھی پڑ گئی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یہ رائے درست ہے:

''ہندستان کی ایک بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ پوری تحریک کو کسی ایک مرکزی تنظیم کے ماتحت نہ لایا جا سکے۔ مقامی اور انفرادی کوششوں نے ملک میں ابتری تو پیدا کر دی لیکن اس ابتری کو غیر ملکی اقتدار کے خلاف ایک منظم کوشش کے طور پر استعمال کرنا ممکن نہ ہوا۔ چار ماہ کی مدت میں دہلی میں کوئی ایسا نظام ترتیب نہ دیا جا سکا جو ایک کل ہند نظام کو اپنے اندر جذب کر لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس بدنظمی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ تقریباً دو صدیوں سے ملک میں انتشار و ابتری کا دور دورہ تھا۔ جاٹ گردی، مرہٹہ گردی، نادر گردی اور نہ معلوم کن کن آفتوں نے سماجی زندگی کا توازن بگاڑ کر سیاسی نظام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔''[11]

خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ انگریزوں نے جس سفاکی اور بے دردی سے خون بہایا تھا اس سے دلوں پر خوف طاری ہو گیا اور کسی کو اس قیامتِ صغریٰ کی داستان مرتب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

کسی نے زیادہ جرأت سے کام لیا تو ڈائریاں اور روزنامچے مرتب کر دیے لیکن انگریز کے جبر و تشدد کی جو اَن مٹ کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کے آثار یہاں بھی نمایاں رہے اور تحریک کے جرأت مندانہ تجزیہ کی ہمت تو کیا، اپنے جذبات کے اظہار تک کی جرأت نہ ہوئی۔''[12]

وہ بتاتے ہیں کہ حقیقی جذبات وقتی مصلحتوں کے بوجھ میں اس طرح دب گئے کہ ان میں کافور و کفن کی بو تو سونگھی جا سکتی ہے لیکن کسی کے دل کی بے چین دھڑکنیں نہیں سنی جا سکتیں۔[13] تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے لیکن ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ ہم تک وہ ڈائریاں اور روزنامچے پہنچے ہیں، جن میں خوشامد کی لے بہت تیز ہے، وہ طبقۂ اشراف کے ہیں اور اشرافیہ طبقے کے مفادات انگریزوں سے اس طرح وابستہ تھے کہ ان سے انگریزوں کے مظالم کی سچی تعبیر و تشریح کی امید بہت کم کی جا سکتی ہے۔ ان کے لیے یہ بغاوت واقعتاً ''رستخیز بے جا'' ہی تھی جو ان کے اور ان کے مربی کے درمیان شکوک و شبہات کی گہری خلیج حائل کرنے والی تھی۔

کچھ روزنامچے اور ڈائریاں تو صرف اس لیے لکھی گئیں کہ ان سے اس خلیج کو پاٹنے میں مدد مل سکے۔ 13 جون 1857 کے سخت پریس ایکٹ کی روشنی میں یہ قیاس بھی غلط نہ ہوگا کہ کچھ منصفانہ روزنامچے اور ڈائریاں اگر لکھی بھی گئی ہوں تو انھیں اشاعت کا منھ دیکھنا نصیب نہ ہوا ہوگا۔ جو روزنامچے اور ڈائریاں دستیاب ہو سکیں ان کا بے حد عمدہ تجزیہ خلیق احمد نظامی نے '1857 کا تاریخی روزنامچہ' کے مقدمے میں کیا ہے۔

غالب نے دستنبو کے نام سے جو روزنامچہ لکھا اس کی نوعیت کا اندازہ ان کے اس خط سے کیا جا سکتا ہے جو تفتہ کے نام ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

''چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی؟ اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا؟''

اتنا ہی نہیں مجروح کے نام اکتوبر 1858 کا ایک خط ہے جس میں غالب بتاتے ہیں کہ ''صاحب مطبع نے... آگرہ کے حکام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دے دی۔''[14]

آگرہ کے حکام کا بہ کمال خوشی اجازت دے دینا اور وہ بھی 13 جون 1857 کے پریس ایکٹ کے بعد یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ دستنبو کس نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھی۔ کبیر احمد جائسی غالب کے خط بنام حکیم غلام نجف خاں مکتوبہ 9 جنوری 1858 سے ایک اقتباس نقل کیا اور لکھا ہے کہ:

''جب نج کے خط میں غالب کا یہ عالم ہے کہ لکھنا تو بہت چاہتے ہیں مگر حالات اور وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر لکھ نہیں سکتے تو پھر اس کتاب میں سب حالات صاف صاف اور راست انداز میں کیسے بیان کر سکیں گے... غالب نے یہ کتاب صرف اس لیے تصنیف کی ہے کہ باغیوں کی مذمت اور انگریز مقتولوں پر نوحہ خوانی کر کے وہ خود کو انگریزوں کے بہی خواہوں میں شمار کرا لیں تا کہ ان کو وہ موروثی جائداد واپس مل سکے، جس کو وہ مدتوں پہلے رو پیٹ کر صبر کر چکے تھے اور اس کے علاوہ حکامِ اعلیٰ تک ان کی رسائی ہو جائے تا کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں بھی دلّی میں ویسے ہی معزز رہیں جیسے مغلیہ عہدِ حکومت میں تھے۔ لیکن اگر اس کتاب میں وہ صرف انگریز مقتولوں کی نوحہ گری تک ہی خود کو محدود کر دیتے تو اس کا اثر رائے عامہ پر اچھا نہ پڑتا اور حکام کی دوستی کے باوجود اہلِ دہلی کی نظروں سے وہ اتر جاتے اس لیے انھوں نے جستہ جستہ بربادیٔ دہلی کا بھی تذکرہ کر دیا ہے تا کہ وہ الزام سے بچ سکیں کہ یہ

کتاب انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔"[15]

1961 میں دستنبو کے دو تراجم سامنے آئے ایک رسالہ تحریک (اپریل مئی 1961) میں شائع ہوا یہ ترجمہ مخمور سعیدی کا تھا اور دوسرا اردوئے معلّٰی (فروری 1961 میں) شائع ہوا جو رشید حسن خاں نے کیا۔ غالب نے یہ کتاب چونکہ ایک خاص مقصد کے تحت لکھی تھی اس لیے اس میں باغیوں کو تو درندہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کی درندگی پر پردے بھی ڈالے اور ان کے مظالم کو کم کر کے پیش کیا۔ ان کے ردِعمل کو فطری تک ٹھہرانے کی کوشش کی۔ غالب لکھتے ہیں کہ:

"انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی کا (بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اٹھے، اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چونکہ وہ شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے، (لیکن انھوں نے) ضبط کیا (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"[16]

سید معین الرحمٰن نے اس زمانے کے بعض غیر جانب دار انگریز مؤرخین کی تاریخوں سے ان اقتباسات کو نقل کیا ہے جن میں منظر نامہ بالکل برعکس ہے۔[17] ان کا یہ خیال بھی درست ہے کہ:

"غالب نے یہ سرگذشت متعارفہ اور مروجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے فارسیِ قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسیٔ قدیم کہ جس کا ہندستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہلِ ہند کے لیے سربستہ راز رہیں۔"[18]

چنانچہ دستنبو کے مندرجات کو 1857 کی بغاوت کے مطالعے کے سلسلے میں بہت قابلِ اعتبار نہیں کہہ سکتے بلکہ ان پر بہت احتیاط کے ساتھ اعتبار کرنا چاہیے۔ غالب کے خطوط میں اس قیامتِ صغریٰ کے نقوش زیادہ واضح ہیں اور زیادہ معتبر بھی۔ خصوصاً دہلی کی تباہی کا جیسا اندوہناک بیان غالب کے خطوں میں ملتا ہے، کہیں اور نہیں ملتا۔ مخمور سعیدی نے دستنبو کا جو ترجمہ 1961 میں کیا تھا اس کو کتابی شکل میں نیشنل بک ٹرسٹ نے 2007 میں 1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں مخمور سعیدی لکھتے ہیں:

"1857 کے واقعات نے مرزا غالب کے دل و دماغ پر کتنا گہرا اثر ڈالا تھا... اس کا زیادہ واضح اظہار ان کے خطوں میں ہوا ہے۔ یہ خط جب وہ اپنے دوستوں یا شاگردوں یا قدر شناسوں کو لکھ رہے تھے اس وقت یہ بات ان کے ذہن میں نہیں تھی کہ انھیں شائع بھی ہونا ہے۔ اس لیے ان میں انھوں نے زیادہ کھل کر شہر اور اہلِ شہر پر ٹوٹنے والی مصیبتوں کا بیان کیا ہے اور اپنا ردِعمل بھی زیادہ دل شگاف لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔"[19]

انگریزوں کے تانڈو کا سب سے زیادہ شکار دلّی ہوئی۔ اس دلّی کی ہر کروٹ مرزا کے خطوں میں اس طرح محفوظ ہو گئی ہے کہ ہم غالب کے خطوں میں دہلی کی پسپائی کی متحرک تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ دہلی کی تباہی کا اندوہناک بیان صرف غالب کے خطوں میں ملتا ہے۔ 1857 کی بغاوت نے پوری بساط ہی الٹ دی تھی۔ اور سارے مہرے بکھر گیے خواہ ان کا بادشاہ سے تعلق ہو نہ ہو، کوئی قلبی وابستگی رکھتے ہوں نہ رکھتے ہوں۔ غالب بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی جب 1857 کے بعد کے غالب کو پہلے کے غالب سے یکسر مختلف بتاتے ہیں تو ہمیں تسلیم کر لینے میں قطعی تامل نہیں ہوتا۔

یہ ایک بڑا تہذیبی مقاطعہ تھا۔ دلّی تاراج تو پہلے بھی ہوئی تھی لیکن وہ تہذیبی تسلسل ٹوٹا نہیں تھا، جو مغلوں کی ہندوستان میں آمد سے شروع ہوا اور اپنی وسیع المشربی سے گزشتگاں کی تہذیبی روایات کو جذب کرتا اور ان میں نئے رنگوں کا اضافہ کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ دلّی کے یہ تمام رنگ مرزا کی تحریروں میں محفوظ ہیں خصوصاً ان مکتوبات میں جن کو لکھنے کا مشغلہ مرزا نے بقول ڈاکٹر خلیق انجم "پہاڑ سا دن کاٹنے" کے لئے اختیار کیا تھا۔ مرزا نے ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھا بھی ہے کہ "انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی معلوم نہیں کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط آنے کی توقع۔ اس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو" (19 جون، 1858)

اور شاید اسی لیے غالب کے خطوط میں ان کی ذات اور وہ کائنات، جس کا وہ حصہ تھے اس طرح نمایاں ہو گئی ہے کہ ہر شخص اس میں ان دونوں کے اسرار پا لیتا ہے اور اسی لیے مرزا کے خطوط نے ان کی شہرت و مقبولیت میں مسلسل اضافہ کیا ہے۔ جس کا اعتراف حالی نے بھی کیا ہے۔ انھوں نے لکھا

کہ ”جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ویسی نظم اردو سے نہیں ہوئی“ اور مرزا میں عوام کی دل چسپی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان خطوں میں مرزا کی ذات اور کائنات کا بے تکلف اظہار ہوا ہے۔ خصوصاً دلّی کی ویرانی کی جیسی متحرک اور جان دار تصویریں ان خطوں میں ملتی ہیں کہیں اور نہیں مل سکتیں اور اسی لیے ہمیں مولانا غلام رسول مہر کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ ”اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان خطوں میں کثرت سے موجود ہیں... انھوں نے غدر کے نتائج وعواقب پر بیسیوں خطوں میں بحث کی ہے اور جو نقشہ پیش کیا ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔“[20]

ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط میں دلّی کی ویرانی اور اپنی تنہائی وافسردگی کی کیسی تصویر کھینچی ہے لکھتے ہیں: ”کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں: انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز دوست کچھ شاگرد کچھ معشوق؛ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گیے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔“[21]

اس خط کے لفظ لفظ سے جو دردمندی اور بے کسی ٹپکتی ہے وہ کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔ وہ غالب جس کا دعویٰ تھا کہ اگر شاعری دین ہوتی تو اس کا دیوان کتاب الٰہی ہوتا، اس کی الہامی کتاب ہوتا اور جس پر عبدالرحمٰن بجنوری نے مہر تصدیق بھی ثبت کر دی، وہ کتنی مجبوری وبے کسی کے عالم میں اپنا آپ تماشائی ہے۔ مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو لکھتا ہے۔ ”یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔“ (غالب کے خطوط جلد دوم)

یہ بیگانگی وابستگی وشکستِ ذات کی انتہائی منزل پر پہنچ کر جنم لیتی ہے۔ یہ اپنے کو اپنا غیر تصور کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے اور یہی ٹھہرا ہے اب فن ہمارا۔ غالب کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ ”اس فتنہ وآشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا“ اور اس پر ذاتی ناکامیوں اور الم ناکیوں نے تیزابی اثر ڈال دیا تھا۔ ان کی پریشانی یہ نہ تھی کہ مغلوں کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور یہ آفتاب غروب ہونے کو تھا بلکہ یہ تھی کہ مغلوں کی جگہ لینے والا بھی کوئی نہ تھا اور انگریزی حکومت غالب کی قدر دان نہ ہو سکتی تھی اس لیے کہ اس کے فنی وتہذیبی اقدار جدا گانہ تھے۔ اگر چہ غالب نے ان سے بھی دادِ سخنوری پانے کی کوشش کی اور کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے تاہم وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ ان کا نظامِ اقدار یکسر مختلف ہے کیا فنی، کیا تہذیبی اور کیا معاشرتی۔ اور اس میں ان کے لئے وہ گنجائش نہیں نکل سکتی جس کے وہ خواہاں تھے۔ اس میں وہ اپنے ترک نژاد ہونے کی دھونس جما سکتے تھے اور نہ اپنے کسی حریف پر سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کی پھبتی کس سکتے تھے۔ گویا وہ بنیادی طور پر اپنی شناخت کے، اپنے تشخص کے مسئلے سے دوچار تھے۔ ان کی کوئی جذباتی وابستگی مغلیہ سلطنت سے نہ تھی۔

انھوں نے جو مرزا حاتم علی بیگ کو لکھا کہ ”ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ... کھاؤ پیو مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے“ اس کو محض سخن آرائی یا تمسخر نہیں سمجھنا چاہیے یہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت بہادر شاہ ظفر کے انتقال پر غالب کا وہ بیان ہے جو میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں ملتا ہے۔ وہ میر مہدی مجروح کو اس بہادر شاہ کے انتقال کی خبر جو ان کا مربی ومحسن تھا، اس لہجے میں دیتے ہیں جو ہر طرح کے جذبے سے عاری ہے۔ وہ بہادر شاہ جو غالب کے کئی عدد قصیدوں کا سزاوار رہا، جس نے غالب کی رہائی کے لئے سفارشی خط لکھا تھا، اس کے انتقال کی خبر غالب یوں دیتے ہیں: ”7 نومبر، 14 جمادی الاول سال حال جمعے کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ وقیدِ جسم سے رہا ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون“ (16 دسمبر 1862)

غالب بنیادی طور پر اپنی تباہی کے نوحہ خواں ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس کے سرے کہیں دلّی کی تباہی سے تو کہیں ہمارے تہذیبی اقدار کی پسپائی اور شکست سے جا ملتے ہیں اور اس حد تک کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ ”1857 کے انقلاب کی تصویر ہمارے ذہنوں میں وہ ہے جو غالب نے پیش کی ہے۔“ 1850 کے بعد کی غالب کی مشہور غزل میں یہ شعر ملتا ہے:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ”غالب کی واردات دلّی کی بھی واردات ہے رنگارنگ بزم آرائیاں اب دونوں کے لئے یادِ رفتہ بن چکی ہیں۔“[22] اس سے دکھانا مقصود یہ ہے کہ دلّی اور غالب پر ایک

ساوقت پڑا تھا اور غالب کو اس کا شدید احساس تھا جو موقع بموقع اظہار کے سانچے میں ڈھلتا رہتا تھا۔ شیخ محمد اکرام نے آثار غالب میں یہ تاثر دیا کہ مغل نفاست پسندی خوش معاشی عیش کوشی اور ہموار طبعی کے قائل ہوتے ہیں اور غالب ان اقدار کے بہترین ترجمان تھے۔ اس بنیاد کو مستحکم کیا خواجہ احمد فاروقی نے۔ انھوں نے لکھا ''قدیم ترکوں میں ایک قسم کی دنیاداری، عقلِ معاش، عیش پسندی اور پرکاری بھی ملتی ہے...اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے...غالب مغل تھے...ان کی رگوں میں وہی خون موجزن تھا جو مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا ان ہی لوگوں کی طرح ان کو زندگی کی اچھی چیزوں سے محبت تھی اچھا کھانا، اچھا پینا، اچھا رہن سہن۔'' 23

اور اسی محبت محرومی اور حسرت کی داستان غالب کی زندگی اور شاعری ہے۔ اسی نے نظم و نثر کا وہ نگار خانہ سجایا ہے جو ہماری تہذیب کا گراں قدر حصہ ہے، ہمارا عظیم تہذیبی ورثہ ہے۔ اور ہمارے پورے تہذیبی سفر کی داستان سناتا ہے۔ جس کے تمام تر سروکار اگر چہ مادی ہیں جس کو ہم پروفیسر نثار احمد فاروقی کے لفظوں میں چاہیں تو ''تاریخ کے دوراہے پر کھڑے...(ایک فن کار کا)...تاریخی شعور...یا اسے تاریخی وجدان'' کہہ لیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ان تاروں کو رونے میں یقین نہیں رکھتے تھے پل بھر جو چمک کر ٹوٹ گیے۔ خواہ ان میں کوئی تار اسلطنت تیموریہ کے نام سے ہی کیوں نہ جانا جاتا ہو۔

ڈاکٹر پرسیول اسپیر نے اپنے مقالے میں، جس کا ترجمہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کیا تھا، لکھا ہے ''غالب کی یہ خواہش تھی کہ وہ بہادر شاہ کے درباری شاعر اور ملک الشعرا کا رتبہ حاصل کریں...بدقسمتی سے غالب نے پہلے اپنی عرضداشتیں مرزا سلیم کے آگے گزرانی تھیں جنھیں جانشینی کے لیے اکبر شاہ ثانی کی حمایت حاصل تھی اور اس طرح وہ بہادر شاہ کے حریف تھے۔ غالب کو یہ داغ دھونے میں تیرہ سال لگے اور پندرہ قصیدے لکھنے پڑے تب جا کر انھیں 1850 میں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات، خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا منصب اور پچاس روپے ماہوار کی تنخواہ میسر آئی۔ اس کے بعد بہادر شاہ کے ولی عہد مرزا فخر الدین جیسا سر پرست انھیں مل گیا جن کی وجہ سے چار سو روپیے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی...مگر یہ کامرانیاں بڑی کم مہلت تھیں کیونکہ 1856 میں مرزا فخر الدین کا انتقال ہو گیا اور اسی کے ایک سال بعد غدر ہوا۔''

تو غالب کی غدر سے برگشتگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی جو سراسر ذاتی تھی۔ پھر دہلی کی تباہی بھی۔ اس لیے کہ دہلی سیاسی سطح پر لاکھ بے اثر سہی، تھی تو دلی۔ وہ ایک طلسماتی فضا رکھتی تھی جو کچھ تو سلاطین تیموریہ کی خود فریبی نے پیدا کی تھی کچھ ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کی دین تھی اور بادشاہ شطرنج کا ہی کیوں نہ ہو اس کے گرد جو مہرے رقص کرتے ہیں اس سے انجمن آباد تو بہر حال رہتی ہے۔

ڈاکٹر پرسیول اسپیر نے بھی لکھا ہے کہ ''دہلی ایک بہت خوش حال شہر تھا کیونکہ یہ ایک ایسا تجارتی مرکز تھا جہاں سے جنوب اور مشرق کی طرف سامان پہنچایا جاتا تھا۔ 1852 میں اس کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ اس آبادی میں تاجر، مہاجن عالم فاضل لوگ اور مغل دربار کے حلقہ بگوش لوگ شامل تھے...غدر سے پہلے مغلوں کی زرق برق زندگی پر نظر ڈالیے تو ایک خواب کا سا عالم تھا اور یقین نہیں آتا تھا کہ دنیا میں ان چیزوں کا وجود بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اس گروہ کا پیدا کیا ہوا تھا جو یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ جیسے ان کا ماضی ابھی تک باقی ہے...جب تک یہ جادو قائم رہا یہ لوگوں کی تفریح اور ذہنی تعیش کا سبب بنا رہا ہے...شاہی دربار میں کچھ بھی خرابیاں ہوں مگر اس کی حیثیت محض نمائش کی نہیں تھی۔ اس کا اثر بہت صحت مندانہ اور سہ طرفہ تھا۔ یہ آداب تہذیب کا سر چشمہ تھا جس میں خود بہادر شاہ ظفر بہت دل چسپی رکھتا تھا...دہلی جب اپنی مرکز اقتدار کی حیثیت کھو چکی تھی۔ اس کے کافی عرصے بعد تک اس کی تہذیب کے منبع کی حیثیت باقی رہی دوسرے اس نے فنون کی سرپرستی کی شاہانہ روایت کو باقی رکھا...اس زمانے میں جس طرف سب سے زیادہ توجہ کی گئی وہ تھی اردو اور فارسی شاعری۔ یہ دہلی کے لوگوں کا سب سے اہم ذہنی مشغلہ تھا۔ مشاعرے جن کی صدارت اکثر بادشاہ خود کیا کرتا تھا شہر کی سماجی زندگی کے اہم ترین مواقع ہوا کرتے تھے...سیاسی معرکہ آرائیوں کی جگہ شاعرانہ معرکہ آرائیوں نے لے لی تھی۔'' 24

یہ موہنی اور خواب ناک فضا اس دلی کی تھی جو انحطاطی دور سے گزر رہی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک طرف انگریزوں کے قیدی تھے تو دوسری طرف شاہان تیموریہ کی شاندار روایات کے۔ اور یہ دوسری قید زیادہ سخت اور جان لیوا تھی اور اسی سے دلی کی رونق بھی قائم تھی اور 1857 کی بغاوت نے یہ پورا منظر نامہ بدل دیا تھا۔

اگرچہ پہلے بھی جو کچھ تھا وہ بہت حوصلہ افزا نہ تھا بلکہ رو بہ زوال ہی تھا اور افق پر غروب آفتاب کی سرخی پھیل چکی تھی اور غالب جیسا سیاسی شعور رکھنے والا شخص اس حقیقت سے بے خبر رہا ہو گا ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اندھیرے کی حکمرانی قائم نہ ہوئی تھی اور بغاوت اور اس کے رد عمل نے جس طرح یہ بساط پل میں الٹ دی وہ قطعی ناقابل برداشت صورت حال تھی اور ''دہلی کے

شہریوں کے لیے بڑا سخت وقت تھا۔" میرے خیال میں کیا ہونے والا ہے اس کا احساس غالب کو بہت پہلے سے تھا۔ 1803 کے بعد سے ہی بادشاہ کی حیثیت محض ایک ملازم کی رہ گئی تھی تو کل کی تصویر کیا ہوگی اس سے اہل نظر واقف ضرور تھے لیکن اس طرح سے ہوگا یہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مرزا کے کلام میں بھی اس احساس کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

غالب کو اس تہذیبی آویزش کا اور سلطنت تیموریہ کے مستقبل کا اندازہ بہت پہلے سے تھا جس کو مسلسل تقویت پہنچائی گرد و پیش کی بے ثباتی، ماحول کے جبر اور ذاتی زندگی کی المناکیوں نے۔ بلکہ میں تو غالب کی شوخی کو بھی ردِ عمل خیال کرتا ہوں حالات کے جبر اور ذاتی ناکامیوں کا۔ اور کچھ مرزا کی محزونیِ طبع بھی جو ان سب کے نتیجے میں ان کی سرشت کا حصہ بن چکی تھی اس احساس کو شدید کردیتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں گلِ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

1816

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

1821

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

1826

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

1833

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

1852

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

1853

ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں، میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

1857 کے بعد

ان اشعار میں وہ کشمکش کتنی واضح ہے جو اس عہد کے باشعور فرد کا مقدر تھی۔ ان میں آنے والے کل کی آہٹ صاف سنی جاسکتی ہے۔ یہاں ذات غیر ذات میں تحلیل ہوگئی ہے اور ذات کا مرثیہ کائنات کا مرثیہ بن گیا ہے اور سلطنت تیموریہ کے ڈھلتے آفتاب کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے غیر شعوری کہہ سکتے ہیں حالانکہ حالات کے تیور اور غالب کی سوجھ بوجھ کے جو شواہد موجود ہیں وہ کچھ اور ہی کہتے ہیں۔

غالب زمانہ شناس بھی تھے اور زمانہ سازی کی کوششیں بھی ان سے وابستہ دکھائی دیتی ہیں۔ ہاں ان کی کامیابی اور ناکامی کے مسئلے پر بحث کی جا سکتی ہے۔ ان اوصاف کی موجودگی میں ان اشعار کو محض اتفاق کہہ کے ٹالنا مناسب نہیں۔ غالب کو اس قیامت سے گزرنا پڑا جس کا انھیں کچھ اندازہ تو تھا لیکن اس کی صورت غیر واضح تھی اور ان شدائد کا بھی اندازہ نہ تھا جن سے غدر/بغاوت نے دلّی اور دلّی کے افراد کو دوچار کیا، جن میں غالب بھی شامل تھے اور ان کی شخصیت بھی پارہ پارہ ہوئی۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔ "آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہوجاتا ہے عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجومِ غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔" اور اس ہجومِ غم کی تفصیلات بھی غالب کی زبانی سنیے: "پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت، غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور

بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا؟ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غمِ فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔
''(28 نومبر 1859)۔ غالب کے خطوط جلد دوم

اور احباب پر ہی کیا موقوف۔ میرزا کا دیوانہ بھائی بھی اس ہنگامے کی نذر ہوا اور وہ بھی گوروں کی گولی سے جاں بحق ہوا۔ اگر چہ مرزا نے مصلحتاً اس کا ذکر نہیں کیا اور لکھا کہ ''حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا'' پھر مرزا کی معاشی بدحالی اور پسپائی کے شدید احساس نے ان کی افسردگی میں اور اضافہ کر دیا تھا، شدید احساسِ زیاں نے انھیں گھیر اتھا جس نے کہیں کہیں تو عجیب حسرت ناک شکل اختیار کر لی ہے اور کہیں طنز و استہزا کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

عبدالغفور سرور کو اپنی آپ بیتی اس طرح لکھی ہے کہ ایک ایک لفظ نوحہ معلوم ہوتا ہے: ''بعد ایک زمانے کے بادشاہِ دہلی نے پچاس روپے مہینا مقرر کیا، ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس کے بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پان سو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگر چہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی: ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب جو میں والیٔ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیٔ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔''(نومبر، 1860)، غالب کے خطوط جلد دوم ص ص 610-609

یہ یاسیت، بے حوصلگی یہ افسردگی اور پسپائی کا یہ شدید احساس اس اسد اللہ خاں غالب کی تحریر سے جھلکتا ہے جو اس طرح کے اشعار کہہ چکا ہے:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

1833

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

1852

ایک خط میں لکھتے ہیں: ''یہاں شہر ڈھے رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے؟'' ستمبر 1860، بنام چودھری عبدالغفور سرور

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں: '' آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا پارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دکانیں، بھیلیو کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ امو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھینے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟'' (28 جولائی، 1859) ص ص۔ 72-771 جلد دوم غالب کے خطوط۔

اور میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں: ''مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے جو ڈھیر پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ فصیل کے کنگوڑے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گیے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گی... قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد، ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلّی کہاں، واللہ، اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔'' (1860)، ص 524 غالب کے خطوط جلد دوم۔

ایک اور خط میں مجروح کو ہی لکھتے ہیں: ''او میاں سید زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھیے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے۔ حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلّی؟ وائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔'' (محررہ 23 مئی 1861) ص 525 ایضاً۔

کیسا سپاٹ لیکن کتنا زہرناک بیان ہے کتنی نشتریت ہے ایک ایک لفظ میں۔ ایسا ہی ایک اور مختصر سپاٹ لیکن زہرناکی کی حدود میں داخل بیان ملاحظہ فرمائیں جو دلّی کی عمارتوں سے تعلق رکھتا ہے: ''شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے؟... جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ 'دارالبقا' فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔'' 8 نومبر 1859 ص۔ 513 جلد دوم غالب کے خطوط۔

یہ آخری ٹکڑا خیر و عافیت کی کیسی زبردست نفی کرتا ہے گویا کثرت غم سے غم اور خوشی کا مفہوم ہی بدل گیا ہو۔ ایک خط میں عزیز الدین کو دلّی کی ویرانی کا حال یوں لکھا ہے: ''دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسے آگے تھی؟ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں... لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے آدمی کا نام نہیں... لکھمی کی دکان میں کتے لوٹتے ہیں'' ص۔ 1444 جلد چہارم، ایضاً۔

اور ہر گوپال تفتہ کے نام یہ خط ایک مکمل تصویر ہے اس قیامت کی جو بنام غدر ٹوٹی اور اس شخص کی جس پر ٹوٹی: ''صاحب! تم جانتے ہو یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے دیوان جمع کیے... ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلّی ہے اور اس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ آباد ہو گیے ہیں... مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں... میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں؛ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے؛ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی... غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے؛ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں'' ص 268، 5 دسمبر 1857

یہاں پر اگر غالب اور تفتہ کے الگ الگ مذہب کو بھی ذہن میں رکھیں اور غدر سے پہلے ان میں جو یگانگت تھی اور غدر کے بعد جو خلیج حائل ہوتی گئی تو اس کی رمزیت دوبالا ہو جاتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ گوروں نے جو امتیازی سلوک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان روا رکھا اس سے غالب کو کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان میں وہ ہم آہنگی اور خلوص کی فضا باقی نہ رہے گی۔ اس خط کے کئی جملے اس کا احساس دلاتے ہیں۔ مثلاً ''ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا'' اور کئی دوسرے جملے۔ لیکن فی الحال میں اس بحث سے گریز کر رہا ہوں۔

مرزا علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں ''اے میری جان، یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے... وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں ہیں اور جوانیں کسبیاں'' (16 فروری، 1862، ص 384، جلد اول، غالب کے خطوط)

شاہی خاندان پر جو بپتا پڑی وہ غالب کے حافظے میں ایک عبرت

ناک مرقعے کی طرح نقش ہوگئی تھی۔ اسی لیے جب تفتہ کی سنبلستاں چھپی اور غالب کو اس کی چھپائی پسند نہ آئی تو لکھتے ہیں: ''اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے؛ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستاں ایک معشوقِ خوبرو ہے، بدلباس ہے'' (اپریل 1861) ص۔326 غالب کے خطوط۔

ان خطوط میں جس طرح دلّی کے اجڑنے کی داستان ملتی ہے اور جس طرح غالب اسے الگ الگ بہانوں سے چھیڑتے ہیں خواہ موقع ومحل متقاضی ہو نہ ہو۔ اس کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ یہ کدال اور پھاوڑے دلّی کی عمارات پر نہیں غالب کے دل پر چل رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ انہدام ان کے شکستِ آرزو کے احساس کو شدید کرتا تھا۔

غالب کے ان خطوں پر دلّی کے نقوش اس لیے بھی ابھر آئے ہیں کہ وہ مجلسی مزاج رکھتے تھے اور جب مجلس اجڑ گئی اور انھیں شدید تنہائیوں نے گھیرا تو انھوں نے اس خلوت کو انجمن بنالینا چاہا اور یہ انجمن دیر تک سجی رہے اس کے لیے دلّی کے ذکر سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں: ''تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیراہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا... وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنتے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا... سنو غالب روتا پیٹتا کیا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو'' ص 762 ایضاً

یہی اختلاط کی باتیں ہیں جن میں غالب کی دلّی محفوظ ہے اور اس پر جو قیامت ٹوٹی اس کا افسانہ بھی۔ وہ قیامت جس کی زد میں آنے والا حساس اور باشعور شخص جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ابتدا سے ہی مغلیہ جاہ وجلال کا مرثیہ رقم کرتا رہا ہے ہمیں بتاتا ہے کہ:

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

اور یہ حسرتِ تعمیر ہی اس کا ورثہ ہے جو وہ اپنے بعد والی نسلوں کو دے جاتا ہے اور اسی نے اسے ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ بنادیا ہے۔

OO

حواشی:

1۔ شمیم حنفی، غالب کا طرزِ احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ: غالب کی تخلیقی حسیت، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔140
2۔ سجاد باقر رضوی: 'غالب فردوس گمشدہ سے گلشن نا آفریدہ تک' غالب نامہ جولائی 1982 دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ
3۔ سید ضمیر حسن دہلوی: 'عہد غالب میں لال قلعے کی معاشرتی زندگی' غالب نامہ جنوری 1985 دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ
4۔ ڈاکٹر خلیق انجم: 'غالب کے خطوط' جلد چہارم 1993 دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ ص 1490
5۔ نثار احمد فاروقی: 'غالب تاریخ کے دوراہے پر' غالب نامہ جولائی 1981 دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ
6۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی: 'غالب کی دلّی' غالب نامہ جولائی 1982، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ
7۔ خواجہ الطاف حسین حالی: 'یادگارِ غالب' ص ص۔1-2، 1982، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی
8۔ پروفیسر تنویر احمد علوی: 'غالب کے فارسی قصائد' غالب نامہ جولائی 1982، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ
9۔ سید احمد دہلوی: 'رسوم دہلی' مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم 1986 دہلی: اردو اکادمی، ص 85
10۔ خواجہ احمد فاروقی: 'غالب کی دلّی، یادو بود غالب' 1993 دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔
11۔ خلیق احمد نظامی: '1857 کا تاریخی روزنامچہ' دہلی: الجمعیۃ پریس اکتوبر 1958 ص۔34
12۔ ایضاً ص۔39
13۔ ایضاً ص ص۔ 39-40
14۔ بحوالہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: 'غالب اور انقلاب ستاون' دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ 2007، ص۔33
15۔ کبیر احمد جائسی: 'دستنبو پر ایک نظر' علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) 1969 ص ص۔82-181
16۔ رشید حسن خاں: ترجمۂ دستنبو مشمولہ غالب اور انقلاب ستاون، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ 2007 ص۔125
17۔ سید معین الرحمٰن: غالب اور اٹھارہ سو ستاون، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، 2007 ص۔77
18۔ ایضاً ص ص۔66-65
19۔ محمود سعیدی: '1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی' دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 2007۔
20۔ غلام رسول مہر: 'خطوط غالب کی اہم خصوصیات، احوال ونقدِ غالب' مرتبہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال۔ 1967، لاہور: نذر سنز۔
21۔ ڈاکٹر خلیق انجم: غالب کے خطوط جلد اول 1984 دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ۔
22۔ پروفیسر مسعود حسین خاں: تجزیہ، نقد و نظر شناسی۔1979، علی گڑھ۔
23۔ خواجہ احمد فاروقی: 'غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی وایرانی عناصر' اردوئے معلی غالب نمبر 1969 دہلی یونیورسٹی: شعبۂ اردو۔
24۔ ڈاکٹر پرسیول اسپیر: 'غالب کی دلّی' ترجمہ: صدیق الرحمٰن قدوائی' اردوئے معلی فروری 1969 دہلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔

...بے خودی و ہشیاری

غالب: 1857 کے چشم دید گواہ

مناظر عاشق ہرگانوی

■

اہل شہر... ہتھیار سے بیگانہ، تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں تیر رکھتے تھے، نہ شمشیر۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کریں۔ اس گون کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ وجدل کے واسطے کمربستہ ہوں۔ ان غریبوں نے اپنے آپ کو اس آفت ناگہانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا۔ اس لئے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی ان ہی ماتم زدگان میں سے ہے...

'دستنبو' سے

■

غالب زندگی اور زمانہ کا انکشاف کرتے ہیں۔ خارجی سطح پر ان کے عہد میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی وہ دہلی کی دم توڑتی تہذیب کی چیخ ضرور تھی۔ انہوں نے وھند کے جس کرب کا سامنا کیا اس کا نوحہ ان کے یہاں ملتا ہے۔ 1857 کے غدر کی تباہ کاریوں کے وہ چشم دید تھے اسی لئے قتل وخوں، سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کے عروج کو انہوں نے منظر در منظر پیش کیا ہے۔ اشعار میں اور خطوط میں جس شکست و ریخت کو قلم بند کیا گیا ہے وہ متحرک حقیقتیں ہیں۔ ان کی غزل کا مصرعہ ہے:

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

1857 کے تماشہ کو غالب نے الگ الگ انداز سے بیان کیا ہے۔ کبھی حالت ایسی بھی ہوئی ہے:

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

قتل عام کے بعد انگریزوں کے ذریعہ لاشوں کو گلیوں میں گھسیٹے جانے کی دستاویز ملاحظہ کیجئے:

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

اپنے ملک کے لئے اور اپنے اقتدار و ناموس کے لئے مرمٹنے والوں کو قتل گاہ میں لے جانے کا منظر دیکھئے کہ کس بہادری اور جی داری سے موت کو گلے لگایا ہے:

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

شوقِ شہادت میں مسرور اور خودرفتہ ہوکر سزا سے نہیں ڈرنے والوں کو غالب نے یوں شعر بند کیا ہے:

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پانوں سے ہے دو قدم آگے

ہر لمحہ موت کی حکمرانی میں ڈر فطری ہے، دیکھئے:

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

اسی ڈر اور موت کے خوف کو غالب نے دوسرے انداز میں بھی بیان کیا ہے:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

1857 میں اقتدار اور آزادی چھن جانے کی بے بسی کو غالب نے بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے:

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

1857 کی فکری انفرادیت اور مشاہدہ کو غالب نے اپنے خطوط میں تاریخی درجہ عطا کیا ہے۔ دہلی شہر کے جس محلے میں وہ رہتے تھے۔ اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی اور اس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔" اردوئے معلی، صفحہ 72

اسی دلی کی داستانِ رقت انگریز غالب کی زبانی سنئے:

"16 رمضان 1273ھ مطابق 11 مئی 1857 کو علی الصباح یکا یک دلی کی شہر پناہ اور قلعے کی در و دیوار میں زلزلہ پیدا ہوا۔ یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دلی آئے۔ سب کے سب بغاوت پر کمربستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر پناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے، پہلے سے ان کے ساتھ عہد و پیماں بھی کر چکے ہوں، دروازے کھول دیے اور حق نمک اور حفاظتِ شہر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخواندہ یا خواندہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان سبک عنان سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کھلا ہوا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے، اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا، اور ان کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی۔ اہل شہر کو، جو سرکار انگریزی کے نمک خوار تھے اور حکومت انگریزی کے سائے میں امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، ہتھیار سے بیگانہ، تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں تیر رکھتے تھے، نہ شمشیر۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کریں۔ اس گوں کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ و جدل کے واسطے کمربستہ ہوں۔ ان غریبوں نے اپنے آپ کو اس آفت ناگہانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا۔ اس لئے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی ان ہی ماتم زدگان میں سے ہے۔ چشم زدن میں صاحب ریزیڈنٹ بہادر کے قلعے میں مارے جانے کی خبر آئی۔ معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے ہر گلی کوچے میں گشت لگا رہے ہیں۔ پھر تو کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو گل اندا موں کے خون سے رنگین نہ ہو۔ انگریزوں کے پاس علاوہ دلی میں سوائے اس پہاڑی کے جو شہر میں واقع ہے۔ اور کچھ باقی نہ رہا۔ چنانچہ ان اہل دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور ان پر زبردست توپیں لگائیں۔ دیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین سے اڑائی تھیں، ان کو لے جا کر قلعے میں نصب کیا اور دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔" دستنبو، ترجمہ

1857 کے ایک اور محشر کو غالب نے یوں بیان کیا ہے:

"14 ستمبر 1857 کو انگریزی سپاہ نے اس شد و مد کے ساتھ کشمیری دروازے پر گولہ باری کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھاگڑ پڑ گئی۔ اگرچہ گیارہ مئی سے چودھویں ستمبر چار ماہ اور چار روز کا وقفہ تھا۔ لیکن چونکہ شہر دوشنبہ ہی کے روز ہاتھ سے نکلا اور دوشنبہ ہی کو پھر قبضے میں آ گیا۔" دستنبو، ترجمہ

بدلتی ہوئی کیفیتوں کو، محشر خیال کو اور دست و گریباں حالات کو غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں اس طرح رقم کیا ہے:

"واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ، میں حکیم حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب کیا، بلکہ دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبانِ عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقتِ غارت دلی میں بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا، امیر و غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس۔ دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں، میں غریب شاعر دس برس

سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر۔ شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔"

یہاں مرزا غالب سے مبالغہ ہوا ہے۔ وہ خود ایک خط میں نواب محمد یوسف علی خاں والی رامپور کو لکھتے ہیں "دریں ہنگامہ (غدر) خود را بکنار و کشیدم وبد میں اندیشہ کہ مبادا اگر یک قلم ترک آمیزش کنم خانۂ من بتاراج رود و جان در معرض تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔" مکاتیب غالب۔ صفحہ 9

اس کے علاوہ بعض اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب قلعہ میں بھی جایا کرتے تھے۔ چونکہ باغیوں نے بہادر شاہ ظفر کے "شہنشاہ ہندوستان" ہونے کا اعلان کردیا تھا اور مرزا نہیں جانتے تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس لئے انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ یکا یک تعلقات منقطع نہ کئے جائیں۔ ذکر غالب۔ از مالک رام۔ صفحہ 70

غالب نے ذہن کے اندر بھڑکتے ہوئے تشکیک کے شعلے کی عکاسی یوں کی ہے:

"رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ ہو رہے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857 تک بدستور ہے۔" اردوئے معلی صفحہ 60۔ گلستان نثر۔ صفحہ 5 تا 6

قلزم خوں کے شناور غالب نے ڈھکی چھپی باتیں بھی عیاں کی ہیں، اور تاریخی انکشاف بھی کیا ہے:

"اس وقت تک میں مع عیال واطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔ لیکن بیگم صاحبہ نے بغیر مجھ سے کہے ہوئے قیمتی اشیا مثلاً زیور، کپڑے جو کچھ تھے، چھپا کر کالے صاحب پیرزادہ کے مکان بھجوادئے تا کہ وہاں تہہ خانے میں محفوظ رہیں، اور دروازہ مٹی سے بند کردیا۔ جب لشکر کشوں نے شہر فتح کرلیا اور سپاہیوں کو لوٹ کا حکم ملا تو اس راز کے رازداں نے مجھے بتلایا، مگر اب وہ ہاتھ سے جاچکا تھا۔ میں نے افسوس کیا اور یوں تسلی دی کہ جانے والی چیز تھی، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئی۔" اردوئے معلی۔ صفحہ 61

نواب امین الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو کے نام غالب نے 1857 کی المناکی کی، بہتوں کے مارے جانے کی اور محتاج ہوجانے کی تفصیل بیان کی ہے:

"دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں۔ میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلّی نہیں ہے، جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود، معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا۔ سو روپیہ روز کا پنشن دار، سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ۔ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہوچکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کر مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو۔ ناظر حسین مرزا۔ جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگر چہ رہنے کا مل گیا ہے، مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہوجائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بنی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیا الدولہ کے پاس پانسو روپیہ کرایہ کے املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی۔ تباہ، خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔" گلستان نثر۔ صفحہ 22

چودھری عبدالغفور کے نام غالب نے 1857 کی تباہی اور مہنگائی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ، دکانیں نہیں بتاسکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ غلہ گراں

ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال 8 سیر، باجرہ 12 سیر، گیہوں 13 سیر، چنے 16 سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔''

دکان، مکان اور باغ کی تباہی کے ساتھ غالب نے اپنی اور اردو زبان کی زبوں حالی اور پریشانی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ میر مہدی مجروح کے نام لکھتے ہیں:

''مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ آخر کھاری ہی پانی پیتے ہیں۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجدِ جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق ودق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا عالم ہوجائے۔ یاد کرو۔ مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھل رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروزے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی کٹرہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بیوی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہوجائے گا۔ اللہ اللہ دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد! ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلّی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر اورالور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ لیکن سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گولی۔ مگر اب کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزارے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انہوں نے دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سنے ہیں۔ اوران کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گذرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہیں آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام ونشانِ خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اس کا گلہ کیا:

چوں جنبش سپہر بفرمانِ داور ست
بیداد ہنود آنچہ بما آسماں دہد

میں نے سکہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں، اور اگر گناہ بھی ہے تو ایسا کیا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بینک گھر اور میگزین کو لوٹنا معاف ہوجائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔''

اردوئے معلی۔ صفحہ 108 اور 276

اصل قصہ یوں ہے کہ غدر کے ایام میں ایک جاسوس گوری شنکر نے انگریزوں کو خفیہ اطلاع دی کہ 18 جولائی 1857 کو جب بہادر شاہ ظفر نے دربار کیا تو مرزا غالب نے یہ سکہ کہہ کر ایک پرچہ پر لکھا اور حضور میں گذرانا:

بزرز د سکۂ کشورستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

غدر کے بعد جب مرزا غالب، کمشنر بہادر کی ملاقات کو گئے تو انہوں نے ان سے اس سے متعلق پوچھا۔ غالب نے جواب دیا۔ ''یہ شخص غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزارا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گذرتا۔''

بعد میں انہیں ایک دوست نے بتایا کہ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو یہ سکہ ذوق نے کہہ کر پیش کیا تھا، اور نہ صرف یہی بلکہ ایک اور بھی سکہ غالباً یہ تھا:

بہ سیم وزر زدہ شد سکہ بفضل اللہ
سراج دین ابوظفر شہہ بہادر شاہ

بہادر شاہ ظفر 30 ستمبر 1837 کو تخت پر بیٹھے تھے اسی لئے وہ دوستوں سے 1837 کا اخبار خصوصاً مولوی محمد باقر (والد مولانا محمد حسین آزاد) کا اخبار مسمّیٰ بہ 'دہلی اردو اخبار' مانگتے تھے، کیونکہ ذوق اور مولوی محمد باقر دوست تھے اور یہ سکّے ان کے اخبار میں شائع ہوئے تھے۔ (بحوالہ اردوئے معلی۔ صفحہ 199 اور 102)
مگر نہ یہ اخبار ملا نہ وہ اس الزام سے اپنی بریت ثابت کرسکے۔

غالب نے 1857 کو دیکھا اور بھوگا تھا اسی لئے ان کے خطوط میں سیاسی، تہذیبی اور جغرافیائی تاریخ ملتی ہے، اوران کے ذہنی رویے کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر روزنامچے 'دستنبو' میں 11 مئی 1857 سے ستمبر 1857 تک حالات وواقعات کا اندراج ہے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے کرم فرماؤں۔ دوستوں۔ شاگردوں اور عزیزوں کے نام خطوط بھی 1857 کی مسلح مزاحمت، شورش اور بغاوت کی جڑوں میں پیوست ہیں۔ جس کے چشم دید غالب بھی تھے۔

OO

اردو صحافت

مولوی محمد باقر: تازہ تحقیق کی روشنی میں

جی ڈی چندن

■

ان دنوں کوئی باضابطہ خبر رساں ایجنسی موجود نہیں تھی لیکن ہندوستان میں نورس صحافیوں کے طبقے نے جو زیادہ اردو حمایتیوں پر مشتمل تھا، آتے ہی وقائع نگاروں کی طرف رجوع کیا۔ قدیم مغل حکمرانوں کے زمانے میں اطلاعات کی حکومتی ضرورتوں کے لئے فارسی وقائع نگاروں کے جو سلسلے قائم ہوئے تھے ان کے جانشینوں کا ایک طبقہ اب بھی فعال تھا۔ مولوی محمد باقر نے اپنے اثر رسوخ سے ایسے ذرائع سے رابطہ قائم کیا اور اپنے اخبار میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں کی خبریں شائع کیں۔

■

اردو صحافت کی تاریخ میں مولوی محمد باقر ایک ایسا نام ہے جن کے مقام اور کردار کا اندازہ ان کے اپنے کام کے ساتھ ساتھ ماضی قریب کے حوالے سے بہتر ہوسکتا ہے۔ دراصل یہ مطالعہ ایک واحد شخص کا نہیں بلکہ ایک پورے عہد کا ہے جو قریب قریب ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ عہد ہے کہ جس میں قریب 350 سالہ عالی طاقت اور عالی شان مغل سلطنت کا زوال ڈھلا اور اردو کی پیش رو فارسی کو نوزائیدہ نجی قلمی صحافت کے وقائع نگاروں نے ملک کی آزادی کے غاصب فرنگی تاجروں کے خلاف 1857 کو عوامی بغاوت کی زمین تیار کی پھر ان کی حکایت کو آگے بڑھاتے ہوئے دہلی کے نامی عالم دین اور معلم قرآن مولوی محمد باقر نے مستقبل کی اردو صحافت کو وطنی کردار سے سرفراز کیا۔

یوں تو ہندوستان کی طول طویل تاریخ پے در پے اہم اور دقیق واقعات کی حامل رہی ہے لیکن عہد باقر وطن کی داستان کا وہ باب ہے جس میں کسی سیاسی جماعت یا پختہ قیادت کی یکسر غیر موجودگی میں اس عہد کے دانشوروں نے نووارد فرنگیوں کی ملک کے طلائی اور نقرئی اثاثوں کو ہتھیانے کی کوششوں کا توڑ کیا۔ بعض اہلِ فکر نے تو غالباً دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان میں بادشاہت کا قدیم دور سر کیا ہے اور ان کی آئندہ نسلوں کی بقا اور ترقی اپنی سرزمین کی آزادی اور توقیر میں مضمر ہے۔ کسی فرنگی راج سے ان کا بھلا نہیں ہوسکتا۔ اسی حلقہ کے فعال افراد نے جو اپنی دھرتی کی آزادی کے تصور سے سرگرم تھے وہ منزل وار تیار کیا جس کی جلالی سے فرنگیوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قلعہ بند اور مستحکم سامراج کی چولیں ہل گئیں اور اس حلقہ کے غازیوں کی شہادت نے کمپنی کا بستر اٹھوا دیا اور یہاں تاج برطانیہ کی مشیر برطانوی پارلیمنٹ کا کنٹرول ہوگیا۔ مولوی محمد باقر اس انقلاب کی تعمیر کے راج مستری تھے۔ اس ہراول دستے کی مساعی نے آنے والے وقت کی علمی سیاسی اور ثقافتی کوششوں

کو گھریلو فضاؤں میں پہنچنے کا رخ دیا۔ زیر ذکر عرصے میں وقت کی تبدیلی کی رفتار تیز رہی۔ دراصل برطانوی تاجروں نے تجارت کی آڑ میں ایسے حصار قائم کئے جو مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان کے کمزور جانشینوں کی سازشی تاک جھانک میں مصروف ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پالیسی ساز مغرب کے اس مقولے کے معتقد تھے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ اس کی پیروی میں انہوں نے اپنے نفس اور وطن دونوں کے کیسے بھرے چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے اپنے وطن میں نباب (نواب) کمپنی کی طنزیہ عرفیت پائی۔ ہمارے 18ویں صدی کے ایک شاعر غلام ہمدانی مصحفی نے کہا تھا۔

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

انگلستان کے پہلو بہ پہلو پرتگال، فرانس اور ہالینڈ نے یہاں اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کی تھیں لیکن اپنی فراست اور مہارت سے برٹش کمپنی سب سے زیادہ قسمت کی دھنی رہی۔ دولت اور مشاہدے کی قوت نے اس کے نبابوں کو مداخلت کاری کی جرأت دی۔ اس جرأت کا وافر استعمال کرتے ہوئے کمپنی کے اولین گورنر لارڈ کلائیو نے سازشوں اور عہد شکنیوں سے بنگال کے آخری مغل حکمراں نواب سراج الدولہ سے پلاسی کی جنگ جیتی۔ قلمی اخباروں کے گمنام لیکن بالغ نظر، وقائع نگار اس منظر کے اولین گواہ تھے جن کے جانشین مولوی محمد باقر نے اردو صحافت کی مشینی طباعت کے نئے وسیلے سے اس نئی علمی صنف کے کردار کی صورت اور سیرت دونوں کی تعمیر کی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں نیا معاشرہ جنم لے رہا تھا۔ بادشاہت کا قدیم سلسلہ دم توڑ چکا تھا۔ مغلیہ سلطنت مفلوج ہو چکی تھی۔ طاقتور اورنگ زیب کی وفات کے بعد گھریلو آویزشوں اور باہر حریفوں کی جنگوں کا دور دورہ رہا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے چست و چوکس نودولتیے اس منظر کے مواقع کو آڑے ہاتھوں لیتے رہے۔

دیکھا جائے تو مغلیہ سلطنت پر یہ برا وقت ہی پڑا ہوا تھا۔ زوال کا سلسلہ شاہ بشاہ گرتا رہا۔ اس کے سربراہ اب نام کے ہی بادشاہ تھے یہاں تک کہ کل تک کی عظیم اور سطوت بردار سلطنت کے جانشین شاہ عالم کی عملداری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ 'حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم' اور پھر آخری مغل بہادر شاہ ظفر تک آتے آتے یہ حدود مزید سمٹ کر لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود ہو گئیں۔ دو سو سال سے روز افزوں تجارتی منافع جات اور حسب مواقع سیاسی پیش رفت حاصل کرنے والی برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے نو حاصل شدہ رعب داب کو ہر سمت میں توسیع دے رہی تھی۔ اس کی پشت پر پختہ محرکات تھے۔ مثلاً اسے اپنی لیبر، محتسب اور قانون ساز پارلیمنٹ کی منظوری حاصل تھی جو حوصلہ افزا قومی اتفاق کی ضمانت تھی۔

کمپنی کی ذی فہم چوکڑی نے اپنی پذیرائی کے لئے یہاں وہاں اپنے اثر و رسوخ کے بیج بکھیر دیئے، جنھیں گھر کے بعض زور آور آشناؤں نے اپنا دانہ پانی بنالیا۔

زائد از ایک صدی قبل اس کے اپنے ملک میں بادشاہت قانوناً ختم ہو جانے سے اسے کسی اعلا فرمان کا ڈر نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے سربراہ جب چاہا سرپٹ دوڑے اور جہاں چاہا چیلوں کی طرح گرے۔ یوں ہندوستان کی زمین میں سازگاری سونگھتے ہی اس نے یہاں وہاں قربت کے خیمے لگا دئے۔ اس سلسلہ میں اس نے یہاں کی مقبول زبانوں کی تازہ کاری کی تدبیریں کیں چنانچہ 1830 یعنی اقتدار سازی کے اپنے تشکیلی زمانہ میں فارسی کی عدالتی زبان کی سابقہ حیثیت ختم کردی گئی اور اس کی جگہ صورت میں اس سے ملتی جلتی نوخیز اردو زبان کو عدالتی زبان بنادیا گیا۔ اس میں اردو سے محبت یا عقیدت کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا یہ صرف سابق اقتدار کی قدرت کو زائل کرنے کی اہلیت دکھانا تھا۔

عوام کی بول چال میں اردو پہلے سے رائج تھی جو عوام کی باہمی قدرت کا فطری اظہار تھی اب قدرے غائبانہ اس کی ترقی اور وقعت کی نئی راہیں کھل گئیں۔ 1825 میں یہاں لیتھوگرافی کی نئی ایجاد مروج ہوگئی تھی۔ 1835 میں گورنر جنرل سرچارلس مٹکاف کے نئے پریس ایکٹ سے نئے اخبار نکالنے کی آزادی دے دی گئی۔

ایسے ماحول میں دہلی کے ایک اعلیٰ دینی اور علمی خاندان کا چشم و چراغ منظر عام پر آیا اس کا نام محمد باقر تھا۔ ان کے والد مولانا محمد اکبر دہلی کے نامی گرامی عالم دین اور مجتہد تھے۔ ان کے اجداد عہد نادری میں ایران سے ہندوستان آئے تھے یہاں پہلے ریاست کشمیر اور پھر علاقہ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب آنحضرتؐ کے جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسی سے ملتا تھا۔ (امداد صابری، تاریخ صحافت اردو جلد اول ص202)

محمد باقر اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان ہی کی طرح علوم مذہبی کی ترویج سے وابستہ ہو لیکن ہونہار محمد باقر کی، جنھیں ان کے والد نے علوم عصری سے خوب خوب بہرہ ور کیا تھا طبیعت تنوع پسند تھی، مزاج ادبی تھا اور شوق وافر۔ اپنے دلی مقصد کی راہ نکالنے سے قبل وہ دہلی کالج جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی دلچسپی سے مشرق و مغرب

کے علوم کی تدریس کے لئے 1825 میں شروع ہوا تھا، پہلے طالب علم اور پھر اپنی ذہانت کی بدولت مدرس رہے۔ پھر کلکٹری کے محکمہ میں، جو اس زمانے میں بڑے اکرام کی بات تھی، تحصیلدار اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدوں پر فائز رہے۔ اس دفتر کے حالات، بالخصوص ہندوستانی ملازموں کے مشاہرے سے وہ بہت ناخوش ہوئے۔ چنانچہ از خود سرکاری ملازمت سے علاحدہ ہوگئے۔ (امداد صابری۔ ایضاً 209)

وہ انگریزی ملازمت کے اکثر طور طریقوں سے بے زار تھے۔ انہیں حکومت کے ہم قوم عیسائیوں کے مذہبی پروپیگنڈے اور تبلیغی حوصلوں سے بہت رنج تھا۔ انہوں نے روزمرہ میں اور دلّی کالج کے ایک ناظم مسٹر ٹیلر کی جو دہلی کے ایک صدر پادری تھے عیسائیت کی اشاعت کا ایک چھکتا منظر دیکھا اور ان حالات کی اصلاح کی طرف راغب ہوئے۔

1834 میں مولوی محمد باقر نے دلّی کالج سے اس کا ایک فاضل لیتھو پریس خریدا اور پہلے مطبع جعفریہ اور پھر مطبع اثنا عشری کے نام سے اس سے طباعت کا کام کیا۔ پھر جب نئے اخبار نکالنے کی آزادی ملی تو 1837 میں انہوں نے 'دہلی اخبار' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو اردو کا اولین مطبوعہ اخبار ہونے کی حیثیت سے اپنے وقت کا عجوبۂ عظیم تھا۔ اسے اس کھوجی سماج میں نہ صرف پڑھنا بلکہ دیکھنا بھی ایک شوق مقبول تھا۔ اس کا ناشر خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے والا تھا۔ چنانچہ اخبار کے نام کی دو تین بار تبدیلی ہوئی لیکن زیادہ تر اس کا نام 'دہلی اردو اخبار' رہا۔ اس نام میں لفظ اردو کا اضافہ سماج میں لوگ باگ کی زبان اردو سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کا مظہر تھا۔ مولوی محمد باقر دینی تربیت کے پروردہ اور شیعی عقائد کے امام تھے۔ ساتھ ہی زمانے کا جس کے نئے پرانے رنگ کا انہیں شخصی تجربہ تھا اچھا شعور رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے دینی عقیدوں کے فروغ کے لئے بعد میں 'مظہر الحق' کے نام سے ایک الگ اخبار جاری کیا لیکن 'دہلی اردو اخبار' اس تاریخی شہر کے روایتی معاشرہ میں نئے موضوعات اور نئے خیالات، بالخصوص سیاسی نکات میں دلچسپی لینے والا مخصوص اخبار رہا۔

اس اخبار کا ادبی پہلو بھی دلچسپ اور دلفریب تھا۔ اس میں ذوق، بہادر شاہ ظفر، غالب، حافظ غلام رسول، مرزا محمد علی بخت، مرزا حیدر شکوہ، مرزا جیون بخت اور مرزا نور الدین کے کلام کے علاوہ دہلی کے ادبی گروہوں بالخصوص استاد ذوق اور مرزا غالب کے حلقوں کی نوک جھونک کی خبریں چھپتی رہتی تھیں لیکن اس کا سیاسی پہلو خاص طور پر جاندار اور توانا تھا۔ مولوی محمد باقر انگریزی کی غلامی کو بہت ناپسند کرتے تھے اور ملک کی آزادی کے بڑے شدت سے آرزومند تھے۔

موصوف صحافت میں قدروں کے فروغ کے حامی تھے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران کلکٹر کے دفتر کا کام کاج دیکھ چکے تھے لہٰذا وہ اس کی خرابیوں اور بدعتوں کی اصلاح کے خواہاں تھے۔ ان کے اخبار میں جیلوں کے دگرگوں حالات، سرکاری حکام اور پولیس کی زیادتیوں، اقتصادی بدحالی، جرائم کے ارتکاب اور عوامی فلاح کی عام خبریں چھپتی رہیں۔ اداریے کا ان دنوں رواج نہیں تھا لیکن خبروں کی ترتیب و تدوین اس طرح کی جاتی تھیں کہ اصلاح کی ضرورت نمایاں ہو۔ مزید ان خبروں میں انسان دوستی اور حب الوطنی کی شعاعیں بھی کوندتی تھیں۔ مولوی محمد باقر کے احباب میں ہندو مسلمان عیسائی سب تھے۔ ان میں دلی کالج معلم اور صحافی ماسٹر رام چندر (مدیر فوائد الناظرین، خیر خواہ ہند اور محب ہند) قانون داں اور صحافی پر بھودیال (ناشر و ایڈیٹر فوائد الشائقین) اور دلی کالج کے ہیڈ ماسٹر جے ایچ ٹیلر شامل تھے۔ ان دونوں مدیروں کے اخبارات محمد باقر کے مطبع میں چھپتے رہے۔ مزید یہ کہ ماسٹر رام چندر ایک اچھے مفکر تھے جو نظریہ قوم کے ترجمان تھے اور پر بھودیال نے قانون کی وضاحت اور افادیت کے مفسر تھے۔ ماسٹر رام چندر نے قوم کے تصور کی پر مغز نمائندگی کی اور اس کی ترقی و بلندی کو اپنی صحافت کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا۔ اگرچہ یہ کوئی نیا اصول نہیں تھا لیکن اس تشکیلی دور کی بنیادی ضرورت کی خاطر اور معاملات کو بارآور بنانے کے لئے انہوں نے اس کی اہمیت کو ایک موجدانہ رخ دیا۔ ہندوستان کی نئی سیاست کے تناظر میں یہ نظریہ سب سے پہلے ایک اردو مدیر ہی کے قلم سے نکلا۔ تحریک آزادی کی اول کاریوں میں جان عزیز کی قربانی سے بھی قریب دس سال قبل یہ پیش کش اردو صحافت نے ہی کی۔ 1845 میں اپنے نئے رسالہ خیر خواہ ہند کے افتتاحی شمارے کے سرورق پر ماسٹر رام چندر نے اسے اپنی صحافت کا ایک بنیادی مقصد قرار دیا (بحوالہ خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ، ماسٹر رام چندر ایک مانوگراف ص 48 از پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، دہلی یونیورسٹی)

حیف صد حیف کہ آزادی کے مورخوں نے اردو صحافت کی اس تاریخی دستاویز کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ بغاوت کے بعد اس کے مشتبہین پر کمپنی سرکار کے بھاری جبر و استبداد کے خلاف ماسٹر رام چندر نے گہرا احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ عیسائیت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ خود بغاوت سے قبل عیسائیت قبول کر چکے تھے۔

مولوی محمد باقر کی صحافت میں بھی اپنے رفیق عصر کے متذکرہ خیالات کا تاثر ہوا تھا۔ 1857 کی بغاوت میں جو روز اول ہی سے فرنگی اخراج کے

لئے عوامی عزم کی حامل جنگ وطن تھی، انہوں نے اپنے اخبار کو ایک مجاہد وطن بنا دیا تھا۔ اس کے آغاز کی رپورٹنگ کا اخبار کا 16 مئی 1857 کا شمارہ اس کے مہتم مولوی محمد باقر کی آنکھوں دیکھی روداد تھی جو ایک کیمرہ کی تصویر کی طرح ہو بہو تھی۔ تاریخ آزادی کے مورخین کے لئے یہ ایک نہایت نادر دستاویز ہے لیکن افسوس کہ واقعات کے ان نام نہاد حسابیوں نے اسے حاصل کرنے کی غالباً کوشش بھی نہیں کی۔ اپنی تحریروں کے لئے ان کا واقعات نگاری کا دعوا سراسر چراغ تلے اندھیرا کے مصداق ہے۔ اس باب میں برطانوی مورخوں کی تاریخیں تو جنھیں ہمارے بعض مورخ وحی کے برابر سمجھتے ہیں بالخصوص اس اندھیرے کے رسیا ہیں۔ یہ مورخ اس بغاوت کو ایک 'غدر' قرار دے کر، چند سپاہیوں کی ایک وقتی شورش کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ دہلی اردو اخبار سے جو واقعات کا عینی شاہد تھا، سامنے آنے والے حقائق مظہر ہیں کہ کمپنی سرکار اس مبینہ وقتی شورش سے اس قدر بوکھلا گئی تھی کہ اس نے اسے توڑنے کے لئے ایک مذمتی اور دھمکی آمیز اشتہار چھاپا اور اسے جامع مسجد کے دروازوں اور کئی اور مقامات پر چسپاں کروایا۔ یہ اوائل جون 1857 کی بات ہے جب ہندوستان میں کوئی سیاسی جماعت یا قیادت لوگوں کے کسی گروہ کو ترغیب نہیں دے رہی تھی۔ لوگ خود ہی اپنے وطن کی غیرت کی حفاظت کے لئے میدان میں آ گئے تھے۔ یہ سب لوگ اردو اخباروں کے قارئین یا سامعین تھے اور برضا و رغبت سرفروشی کے لئے آمادہ تھے۔ کیا فرنگی کے اقتدار کے خلاف طبعی اور فوری ناپسندیدگی کے کسی اور ثبوت کی ضرورت تھی؟

ان دنوں کوئی باضابطہ خبر رساں ایجنسی موجود نہیں تھی لیکن ہندوستان میں نو رس صحافیوں کے طبقے نے جو زیادہ تر اردو صحافیوں پر مشتمل تھا، آتے ہی وقائع نگاروں کی طرف رجوع کیا۔ قدیم مغل حکمرانوں کے زمانے میں اطلاعات کی حکومتی ضرورتوں کے لئے فارسی وقائع نگاروں کے جو سلسلے قائم ہوئے تھے ان کے جانشینوں کا ایک طبقہ اب بھی فعال تھا۔ مولوی محمد باقر نے اپنے اثر رسوخ سے ایسے ذرائع سے رابطہ قائم کیا اور اپنے اخبار میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں کی خبریں شائع کیں۔

ماضی قریب میں ان وقائع نگاروں کی بدولت سلطنت کی بالائی سطح پر فارسی میں خبر رسانی کا ایک نظام رائج تھا جو حکمراں اور اس کے مقررہ عملہ میں بڑی وقیقہ سنجی سے کام کرتا تھا۔ ان وقائع نگاروں کی کارکردگی کی بڑی شہرت تھی۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد واقع ہونے والے زوال میں جب یہ سلسلہ موقوف ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہوشیار حکام نے اس کے افراد سے اپنا کام لینے کا راستہ بنا لیا۔ انہیں یہاں کی ریاستوں اور درباروں سے اپنے روابط بڑھانے کے لئے مختلف علاقوں کے واقف کار اور فارسی داں عملے کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کی حد تک انہوں نے انہیں اچھی تنخواہوں پر ملازم رکھ لیا۔ یوں وقائع نگاروں کا ایک حصہ جلد ہی برسر روزگار ہو گیا لیکن ان کی زیادہ تعداد آزاد اور حالات کی مشاہد رہی۔ انہوں نے دیکھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض افراد یہاں وہاں پوچھ تاچھ کر رہے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ جنوبی ہند کے کرناٹک کے علاقے میں فرانس اور برطانیہ کی تجارتی کمپنیوں کی رقابت سیاسی راہوں پر چل رہی تھی۔ ان کے پہلو بہ پہلو پرتگال اور ہالینڈ کی کمپنیاں بھی فعال تھیں۔ پرتگالی سب سے پہلے یہاں آئے تھے اور ان کے ایک دلیر ملاح واسکوڈی گاما نے یورپ سے ہندوستان کا نیا راستہ بھی دریافت کیا تھا لیکن برطانیہ کے سوا باقی سب ممالک کی کمپنیاں کچھ عرصہ بعد جزواً یا کلیتاً واپس اپنے گھر چلی گئی تھیں صرف برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ہوس کو مزید پھیلاتی رہی۔[1]

ان تجارتی کمپنیوں کی سیاسی رقابت اورنگ زیب کی وفات کے قریب 40 سال بعد زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔ کشاکش ان کی افواج کی جنگ تک پہونچ گئی تھی اور سمندر پار بیٹھی ان تجارتی کمپنیوں کی حکومتیں اپنی اپنی فوجوں کی خاطر خواہ پشت پناہی کر رہی تھیں۔

ظاہر ہے کہ وطن خواہ وقائع نگار اس طریقۂ تجارت کو پسندیدہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ بھانپ گئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے 'شہاب' کچھ زیادہ ہی ہوا پر اڑ رہے تھے۔ 1717 میں کمپنی کے ایک ڈاکٹر نے اورنگ زیب کے ایک جانشین فرخ سیر کو ان کی ایک بیماری سے شفا کروا دی تھی اس کے جواب میں فرخ سیر نے اپنی کم گستری سے کمپنی کو بنگال کی تجارت کا محصول معاف کر دیا تھا۔ یہ بخشش برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظمین تک محدود تھی لیکن جنوبی ہند میں کرناٹک کی حال ہی کی تین جنگوں میں فرانس پر فتح پانے کے بعد اس کمپنی نے اپنے تکبر میں اس محدود رعائت کو اپنا اختیار کل بنا لیا اور بزعم خود اپنی قوم کے نئے تاجروں کو پیشے کے اجازت نامے جاری کر دئے۔ اس سے مغل خزانے کو بہت نقصان پہونچا۔ اسی مرحلے پر جاریہ کشاکش میں بنگال میں برطانیہ اور فرانس کی تجارتی کمپنیوں نے صوبے کے ماحول کو خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ چنانچہ بنگال کے حاکم نواب سراج الدولہ نے انہیں جنگ و جدل سے باز رہنے کے لئے کہا۔ فرانس تو مان گیا لیکن برٹش انڈیا کمپنی نے غرور بھرا انکار کیا اور مصالحت کے امکان کے سائے میں ایک لشکری رویہ اختیار کیا اور سیاسی معاملات میں غالباً پہلی بار ہندو مسلم

کارڈ کھیلا۔ صوبے کی رعایا میں باہمی بیگانگی استوار کرتے ہوئے ہندوؤں کو مسلم حکومت کے خلاف اکسایا اور بات بات پر نوجوان نواب سراج الدولہ کو پریشان اور زچ کیا۔ طیش میں آکر نواب نے 20 جون 1756 کو انگریزوں کو کلکتہ سے بے دخل کر دیا اور اسے واپس اپنے اختیار میں لے لیا۔ اس پر ایسٹ انڈیا کمپنی آپے سے باہر ہوگئی اور مدراس سے اپنے فوج کپتان رابرٹ کلائیو کو بلایا جس نے حال ہی میں کرناٹک کی جنگوں میں اپنی چابک دستی سے فرانس کو ہرایا تھا۔ کلائیو نے بنگال پہونچتے ہی اپنی فوجی کمک سے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ گویا کرایہ دار نے مالک مکان سے مکان چھین لیا۔ اس کے فوراً بعد ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے نواب سے صلح کر لی اور سب معاملات حسب سابق بحال کرالئے۔ یہ صلح ایک چھلاوہ ہی رہی۔ کمپنی کے گورنر لارڈ کلائیو نے نواب پر فرانس سے خفیہ معاہدہ کا الزام لگا کر پہلے بنگال میں فرانسیسی کالونی چندر نگر پر فوجی حملہ کر دیا پھر نواب کی افواج کے سپہ سالار میر جعفر سے ایک ہندو ساہوکار رچن چندر کے ذریعہ سازباز کی اور اسے بنگال کا نواب بنانے کا لقمہ دیا۔ میر جعفر کا اقرار مل جانے پر نواب سراج الدولہ پر ایک اور الزام لگایا کہ وہ آپسی معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور خفیہ طور پر فرانس سے مل گیا ہے۔ اس الزام کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے بنگال کے علاوہ مرشد آباد پر چڑھائی کر دی۔ اس کے فوراً بعد کلکتہ سے 20 میل دور پلاسی میں دونوں کی جنگ ہوئی۔ عین میدان میں سپہ سالار اور میر جعفر اپنے منصب کا گلا گھونٹ کر اپنی افواج کے ساتھ کوئی کان دئے بغیر بے حس وحرکت کھڑا رہا۔ اپنے فوجی سردار کی یہ خودکشی دیکھ کر سراج الدولہ نے روپوش ہونے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا اور میر جعفر کے بیٹے میران نے اسے قتل کر دیا۔ یوں میر جعفر کی غداری سے تاجر انگریز ہندوستان کے مشرق کے پھاٹک بنگال کا صاحب اختیار ہوگیا۔[2]

قیاس اغلب ہے کہ اس امر کا علم ہوتے ہی آزاد وقائع نگاروں کے ایک دلیر حصہ نے نجی اخبار نویسی اختیار کی اور شمالی ہند میں مطبوعہ صحافت کی آمد سے قریب چار دہے قبل آزادی وطن کے لئے وقف نجی قلمی صحافت کا آغاز ہوگیا۔ گو اس سے صدیوں قبل ہی اس صحافت کے وقائع نگار اپنے شاہ کو کونے کونے سے خلاف ملک سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کرتے تھے۔ ان کے مراسلات کو حسب ضابطہ 'اخبار' ہی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ دستور باقی دنیا میں کسی بھی زبان میں مطبوعہ طاقت کے آغاز سے قبل ہی موجود تھا۔

نجی قلمی صحافت کے وقائع نگار اپنے 'اخبار' کے جو اکثر و بیشتر یک ورقی اور دیہاتی تھے خود ہی ناشر رپورٹر، ایڈیٹر نقیب سب کچھ ہوتے تھے اور اپنے اشاعتی امور کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ راقم السطور کو اس قلمی صحافت کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں مل سکی لیکن ہندوستان میں برٹش حکومت کے کئی سربراہوں کی رپورٹوں اور دیگر تحریروں میں ان اخباروں کا ذکر بار بار ملتا ہے جہاں انہیں جذبہ 'آزادی کے تیز مزاج بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً گورنر جنرل کے کونسل کے رکن قانون لارڈ ٹی بی میکالے نے ان کی صحافت پر اپنے ایک نوٹ میں لکھا:

"اس اخبار کو مرتب کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے جو ہر کچہری اور دیسی راجوں کے درباروں کے اردگرد خبروں کی تلاش میں متواتر گھومتے رہتے ہیں۔ دہلی کے (شاہی) محل اور ریزیڈنسی کے مقامات پر بیس تا تیس وقائع نگار موجود رہتے ہیں۔ مقامی باشندوں کے بہت سارے امیروں میں ہر وقائع نگار کے خریدار ہیں جنھیں یہ وقائع نگار ہر روز کچہری اور شہر کی تمام گرم خبریں اور افواہیں مہیا کرتے ہیں۔ دہلی سے ہر روز جو قلمی اخبار باہر بھیجے جاتے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہوسکتی لیکن جانکار لوگوں کا اندازہ ہے کہ یہ 120 ہے۔ یہ اخبار چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل سے اٹے ہوئے ہیں... اکثر ان میں حکومت اور اس کے ملازمین کو رسوا کیا جاتا ہے اور ہمارے (برطانوی) کردار اور اطوار پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں۔"[3]

لارڈ میکالے کی نیشن زنی سے قطع نظر یہ حقیقت آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے کہ نجی قلمی اخبار وقت کی خبروں سے لبریز ہوتے تھے اور انہیں امرا اور رؤسا کی مالی سرپرستی حاصل تھی اور یہ قلندری طبقہ فرنگی سرکار کے وظیفہ خوار وقائع نگاروں سے حیثیت اور وقعت میں کم نہیں تھا۔ مزید یہ اندازہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے حلقہ اشراف میں فرنگی حکومت کے کردار واطوار سے وسیع بے اطمینانی تھی جس کا تاثر مولوی محمد باقر کے مطبوعہ اخبار اور 1857 کی وسیع وعریض بغاوت میں نمایاں ہوا۔

میکالے سے قبل اسی سال اس کے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے بھی اپنے نوٹ میں لکھا تھا کہ "راجوں اور رئیسوں نے اپنے وقائع نگار رکھے ہوئے ہیں... غالباً ہر بڑے شہر میں ایسے وقائع نگار موجود ہیں۔ (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ ایضاً ص 88)

ان سے تین سال قبل کمپنی کے ایک اور ایگزیکٹو سر جان مالکم نے 1833 میں لکھا تھا:

"یہاں اشتعال انگیز اخبار نکل رہے ہیں جن کے ذریعے بے چینی اور بغاوت کے جذبات کو اکسایا جارہا ہے۔" (ایضاً ص 85)

اس تحریر کے قریب ربع صدی بعد متوقع بغاوت پھوٹ پڑی جس میں مولوی محمد باقر نے اپنی صحافت اور جان عزیز دونوں کی قربانی دی۔

متذکرہ تبصرے سے برطانوی مورخین کے اس مفروضے کی تردید ہوجاتی ہے کہ 1857 کی عوامی بغاوت ایک غدر تھا اور یہ چند گمراہ سپاہ کی بے ادبی کا شاخسانہ تھا۔

ماضی میں یہ وقائع نگار حکمراں کے شعبۂ سراغ رساں کے مخبر تھے۔ اپنی آجر بادشاہت کے تنزل کے بعد یہ اپنے صوابدید سے عوام کے مخبر ہوگئے۔ ان جہاندیدہ رپورٹروں کو برطانوی سیاست میں قدم قدم پر شاطری اور عوام کی سبکی نظر آئی۔ ملکی مفاد کو زک پہونچانے والوں سے انہیں کوفت ہوتی تھی اور یہ فرنگی راج کے اخراج کے طالب تھے۔ اعلا برطانوی دستاویزوں میں اس کا ثبوت اوپر پیش کیا گیا ہے۔

یہ 'اشتعال انگیز' اخبار صرف شمالی ہند یا دہلی ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند میں بھی کئی دہے پہلے نکل رہے تھے۔ معاملات کمپنی کے ایک نامور مبصر ایس سی سانیال کے ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند میں سناوا پریدا نام کے ایک دلاور نے 1800 میں اپنے علاقے کے تقریباً ہر گاؤں میں اپنا آزادی پسند قلمی اخبار بانٹا جس میں علاقہ کے باشندوں سے یہ اپیل کی گئی کہ:

''وہ یورپ کے ان نیچ لوگوں کے خلاف متحد ہوجائیں جنھوں نے ہمارے ملک کی آزادی پر چھاپا مارا ہے'' اس اپیل میں برہمنوں، کشتریوں، مسلمانوں اور دیگر فرقوں اور پیشوں کے لوگوں کو مخاطب کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ:

''دلیری سے کام لیتے ہوئے ان ذلیل اور بے شرم لوگوں (فرنگیوں) کا خاتمہ کردیں اور جب تک یہ ختم نہ ہوں اپنا عمل (جہاد) جاری رکھیں۔''

اس قلمی اپیل کے قریب 57 سال بعد جنوبی ہند سے ہزاروں میل دور دہلی کے مولوی محمد باقر نے اپنے مطبوعہ 'دہلی اردو اخبار' میں ایسی ہی اپیل شائع کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے کہا کہ وہ بہادری کی اپنی قدیم روایات سے کام لیتے ہوئے اب اس جنگ میں انگریزوں کا خاتمہ کردیں۔

ہماری قلمی اور مطبوعہ صحافت کی اس مطابقت پر غالباً ابھی تک کوئی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی لیکن 'دہلی اردو اخبار' کی بیس سال کی عمر کے بہت سارے شمارے اس موضوع کے خوشہ چیں ہیں۔ اس کے بانی ایڈیٹر مولوی محمد باقر نے گمنام طور پر اس کے کالم رقم کئے۔ وہ فطری صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ وطن کی حریت کے بھی مجاہد تھے۔ حریت کے لئے انہوں نے مختلف فرقوں کے اتحاد کو اپنے مسلک کا جزولاینفک تصور کیا۔ 1857 کی بغاوت جس کی کاشت میں ان کے اخبار نے ہراول دستے کا کام کیا جب اچھی پیش رفت کرچکی تھی تو جون 1857 میں انہوں نے لکھا:

''اے سپاہ دلیرانِ تلنگان، بیشتر تاریخوں میں جس طرح سے سلطنت ہائے سابقہ میں کارنامہ ہائے شجاعان زماں گذشتہ یادگار ہیں کہ تاریخ قدیمہ ہند میں خاندان یدونبشی میں بھیم وارجن وغیرہ بہادری میں یادگار ہیں اور علی ہذا القیاس تواریخ فارسی میں شجاعت رستم وسام اور سلطنت اہل اسلام میں فتوحات حضرت صاحب قراں امیر تیمور گاں اور دلیران فوج چنگیز خاں اور بہادران ہلاکو خاں وافواج نادر یہ تواریخوں میں لکھے چلے آتے ہیں اور آخر زمانے کے لوگوں کی ہمت کو بڑھاتے ہیں اور جرأت کو ترقی دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ معرکہ تمہارا ابھی تواریخوں میں لکھا جائے گا اور صفحہ عالم پر کار رستمانہ تمہارا یادگار رہے گا کہ اس بہادری اور جواں مردی سے تم نے ایسے اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کروغرور کو توڑا ہے اور ان کی نخوت فرعونی اور غرور شدادی کو یکسر خاک میں ملادیا ہے...''

جب یہ بغاوت 10 مئی کو کھلم کھلا شروع ہوگئی تو مولوی محمد باقر نے اپنی ذات اور اپنے اخبار دونوں کو اس کے لئے وقف کردیا۔ اخبار کا 17 مئی کا پورا شمارہ انہوں نے بغاوت نمبر کی شکل میں شائع کیا۔ اس میں دہلی شہر، دہلی چھاؤنی، انبالہ، میرٹھ، سہارنپور اور روڑکی کے حالات احتجاج بیان کیے گئے۔ مولوی محمد باقر نے حسب معمول رپورٹر کا کام پردے میں کیا اور راقم آثم کے نام سے ایک طویل روداد شائع کی جو اس عظیم جنگ آزادی کی چشم دید رپورٹ کی تاریخی یادگار ہے۔ اس کے مطالعہ کے بغیر آزادی کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ بغاوت کے واقعات، ذاتی حاضری سے رقم کرنے کے علاوہ مولوی محمد باقر محباب وطن کی ہمت بنانے کے لئے قومی اپیلیں نصیحتیں، دلیلیں اور بزرگوں کے برکاتی خواب اور شرعی اقوال بھی شائع کرتے تھے۔ 6 مئی 1857 کے شمارے میں ان کے صاحب علم وادب فرزند مولوی محمد حسین آزاد کی معرکہ آلارا نظم 'تاریخ انقلاب عبرت افزا' بھی شائع ہوئی جس کے چند اشعار حسب ذیل تھے:

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال وجہاں بخش وجہاں دار

تھی صاحب علم وہنر وحکمت وفطرت
تھی صاحب جاہ وحشم ولشکر جرار

اللہ ہی اللہ وہ جس وقت کہ نکلے
آفاق میں تیغ غضب حضرت جبار
سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے
سب ناخن تدبیر و خرد ہوگئے بے کار
کام آیا نہ علم وہنر و حکمت وفطرت
یورپ کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گروش گردوں بھی عجب گردش دوار
نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجئے تو عیاں ہے
ہر شعبدۂ تازہ میں صدبازی عیار
ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل
ہیں رند یہاں اہل زباں کے لب گفتار
عزت کے لئے خلق میں یہ سانحہ بس ہے
گردیوے خدا عقل سلیم ودل ہشیار

(بحوالہ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، ص 383)

والد کی طرح بیٹے نے بھی بغاوت کے آغاز اور باغیوں کی فوری کامیابی کا منظر بچشم خود دیکھا تھا چنانچہ ان کے مشاہدے اور احساس کی قوت بڑی عمدگی سے نظم میں اتر آئی۔ اس انقلابی تخلیق کا یہ شاعر جو اس وقت اخبار کا ایڈیٹر بھی تھا مولوی محمد باقر سے آگے دوسری نسل کا باشعور نمائندہ تھا۔ اس کی عمر اس وقت 27 سال تھی۔ وہ نظم کے ذریعہ کمپنی کے بزرگوں کو سمجھا رہا تھا کہ ''ابھی کل تک آپ کی قوم صاحب اقبال اور جہاں دار'' تھی لیکن ''گردش گردوں'' سے یک چشم زدن کچھ سے کچھ ہوگیا۔ ''یورپ کے تلنگے اپنی شعبدہ تازہ سے صیاد کی بازی'' لے گئے۔ اب خلق میں عزت کے لئے عقل سلیم سے کام لو۔ ظاہر ہے کہ نئی عقل بھی ''عقل سلیم'' کی صدا لگا رہی تھی۔ اس کی پیش رو نسل کے دانشور بھی جن کی نمائندگی مولوی محمود باقر کر رہے تھے، کمپنی کو حکومت کے کام کاج میں انجان اور کم نظر تصور کرتے تھے۔ تاجروں کے اس گروہ میں کوئی یکسوئی نہ تھی۔ یہ اپنے کاروباری بورڈ آف ڈائرکٹرس کے تصورات کا کھلونا تھی جو اپنے زعم میں ہندوستان کے حقائق کو جانتے ہوئے بھی ان کا احترام نہیں کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ کمپنی ایک سہ عملی نظام کا ٹولہ تھی۔ 'خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔ (محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، ص 410) اس میں 'ملک بادشاہ کا' کو اہل کمپنی دبے پاؤں نظر انداز کردیتے تھے اور اس کے حکم کی ایک رقت انگریز تصویر ان

اشتہاروں میں نمایاں ہوئی جو بغاوت کے دوران پہلے اس کے انسداد کے لئے کمپنی کے حکام اور بعد میں اس کی ماہیت کی بے نقابی کی خاطر 'دہلی اردو اخبار' نے شائع کئے۔

مولوی محمد باقر اور ان کے ارباب کا خیال تھا کہ بغاوت کے اسباب خود کمپنی نے ہی پیدا کئے۔ فوجی سپاہ کے کارتوسوں پر سور اور گائے کی چربی کا سبب تو اونٹ کی پیٹھ پر تنکے کی مانند تھا۔ کمپنی کا فعل وعمل تجارت کے دائرے سے باربار باہر نکل جاتا تھا۔ کبھی مغل حکمرانوں کی مروت کا استحصال، کبھی اپنی ترنگوں کے لئے مقامی صوبیداروں پر دباؤ، کبھی سرکاری نوکری کے لئے انگریزی خوانی یا بائبل خوانی کا لزوم جس سے معاش کے کئی ضرورت مندوں کو اپنے دین کے خلاف جانا پڑتا تھا ایسی علتیں تھیں جن سے کمپنی دن بدن بدنام اور ناگوار ہوتی رہی۔

1757 کی ایک صوبائی جنگ میں اپنی سازشی جیت کے بعد یہ بزعم خود سارے ہندوستان کی حاکم بن گئی تھی اور ملک کے کمزور علاقوں کو اپنی ہوس کا مرکز بنا رہی تھی۔ یہ کیفیت کمپنی کے اس اشتہار میں کھل کھل کر نمایاں ہوگئی جو اس نے محمد حسین آزاد کی متذکرہ نظم کی اشاعت کے بعد۔ دو ہی ہفتے بعد دہلی کی جامع مسجد کے دروازوں اور دیگر منتخبہ مقامات پر بڑے اہتمام سے چسپاں کروایا۔ اس کا مقصد رعب اور دھمکیوں سے بغاوت کا انسداد کرنا تھا۔ اس میں برملا یہ اعتراف کیا گیا کہ فوج کے سپاہ کو جو کارتوس مہیا کئے گئے ان پر چربی تو ضرور تھی۔ لیکن وہ صرف گائے کی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کا بغاوت میں شامل ہونا غلط ہے۔ پھر اس سرکاری اشتہار میں ایک اور پھوہڑپن یہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ خوک خوری نہ تو گناہ کبیرہ ہے نہ اس سے کوئی اسلام سے خارج ہوتا ہے۔

سارا پوسٹر اسی طرح اشتعال انگیز تھا جس کی ہر دلیل میں کوئی نزاعی یا شکایتی پہلو اختیار کیا گیا تھا۔ دراصل اکیلا یہ اشتہار ہی کمپنی حکومت کی نااہلیت اور کم نظری کے ثبوت کے لئے کافی تھا۔

مولوی محمد باقر اس کے مضمون اور منطق دونوں کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کمپنی نے اپنی صفائی میں جلتی پر تیل ڈالا ہے چنانچہ انہوں نے فوراً اشتہار کے مضمون کو شق بہ شق لیتے ہوئے اپنا دنداں شکن جواب اپنے اخبار میں چھاپ دیا۔ اس میں انہوں نے چند ایسے انکشافات بھی کئے جس میں کمپنی کی رہی سہی عزت بھی مٹی میں مل گئی۔ مثلاً سپاہ کارتوس پر چربی کی حقیقت جانتے ہوئے بھی کمپنی نے دوران بغاوت ہر روز شہر پر گولہ باری کی جس سے لامحالہ ان گنت معصوم لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مزید

ملک کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے مہمانوں کی آمد ورفت، شخصی نقل وحرکت اور راہ ورسم کے بنیادی انسانی حقوق چھین لئے گئے تھے اور انہیں ان کی چار دیواری میں طرح طرح کی پابندیوں میں باندھ دیا گیا تھا۔ ان کے روضہ لال بنگلہ میں جس میں سلاطین عظام واہل خاندان شاہی مدفون تھے مردوں کی قبریں بھی اکھاڑی گئی تھیں۔ پھر ہزارہا لوگوں کی جاگیریں بے حیلہ ضبط کرلی گئی تھیں اور ہندوستان کے ہزارہا آدمیوں کو نان شبینہ کا محتاج بنادیا گیا تھا۔ (امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو۔ جلد اول۔ ص184 تا 186)

کمپنی حکومت نے اپنے اشتہار میں کارتوسوں کی چربی کو صرف لگائے تک محدود کرنے کی منطق سے مسلمانوں کی خوشنودی کی کوشش کی تھی۔ لیکن مولوی محمد باقر نے چھوٹ کی اس تدبیر کے بخئے ادھیڑتے ہوئے کہا "کوئی پوچھے کہ کیا اس سے دین ہندو کا نہیں بگڑتا۔ اب ان کی (انگریز) کس بات کا اعتبار کیا جائے... بہر کیف سپاہ اسلام عین عاقبت اندیشی کے سمجھ گئے کہ آج یہ ظلم ہنود پر ہے۔ کل ہم پر ہے۔" (امداد صابری۔ ایضاً ص185)

گویا مولوی محمد باقر نے اپنی طرف سے اور مسلم سپاہ کی طرف سے بھی انگریز کے ہندو مسلم نفاق کا خود ساختہ عقیدہ بہ یک جنبش قلم رد کردیا اور اردو صحافت کی یک جہتی اور ہم آہنگی کی ارادت مندی کی تصدیق کردی۔

پورے چار ماہ کی تمازت اور تمکنت کے بعد 1857 کی بغاوت بالادست فرنگی کی حکمت وعیاری، دیسی ریاستوں کی حربی کمزوری اور اندرونی نزاع کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد انگریزوں نے بغاوت کے مجاہدوں، حامیوں اور دیگر مشتبہ لوگوں کی اندھا دھند گرفتاری اور گولیوں سے ہلاکت شروع کردی جو ان کے اطمینان تک جاری رہی۔

مولوی محمد باقر کی شہادت کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ باغیوں کو دلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کے جو عیسائیت کا زبردست مبلغ تھا قتل کی ترغیب دینے کے شبہ میں فرنگی حکام نے مولوی محمد باقر کو گولی ماردی۔

ایک اور خاندانی روایت جو محمد حسین آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر نے بیان کی یہ ہے کہ وسیع وعریض گرفتاریوں کے ایام میں انگریز حاکموں نے 16 ستمبر 1857 کو مولوی محمد باقر کو بھی گرفتار کرلیا تھا اور 17 ستمبر کو انہیں کیپٹن ہڈسن کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کے حکم سے انہیں اسی دن دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے سامنے میدان میں گولی سے شہید کردیا گیا۔ جس دن انہیں دیگر عمائدین شہر کے ساتھ گولی ماری جانے والی تھی ان کے فرزند محمد حسین آزاد اپنے والد کے ایک دوست کرنل سردار سکندر سنگھ کی مدد سے بھیس بدل کر اور ان کا سائیس بن کر دہلی دروازے کے باہر کے میدان کے کنارے سے ان کے آخری دیدار کے لئے گئے۔ وہاں چاروں طرف فوجی پہرہ تھا۔ مولوی محمد باقر نماز پڑھ رہے تھے۔ آزاد گھوڑے کی باگ تھامے فاصلہ پر کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ کب آنکھیں چار ہوں۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کرکے نظر اٹھائی تو سامنے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھا دونوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مولوی محمد باقر نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور ساتھ ہی اشارہ کیا کہ بس آخری ملاقات ہوچکی۔ اب رخصت۔ محمد حسین خود بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں تھے ان کے والد کا اشارہ پاتے ہی کرنل سکندر سنگھ نے اپنا گھوڑا موڑ لیا، اور دونوں وہاں سے واپس چلے آئے۔ (امداد صابری۔ ایضاً ص219)

شہادت کا وقت ہوگیا تھا فرنگی کپتان نے توپ کا گھوڑا دبایا اور 77 سالہ مولوی محمد باقر حق تعالیٰ سے جاملے۔

مولوی محمد باقر کا عہد شہادت کا عہد تھا۔ ان کی رفاقت میں سرکردہ اردو صحافی جذبہ سرفروشی سے سامراجیت کے سرپرست فرنگی کی شاطری کے خلاف مستعد رہے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد فرنگی کا افسوں تیز تر ہوگیا۔ مولوی محمد باقر اس کی حکمتوں کے اچھے پارکھ تھے ان کا سماج ان کا معتقد تھا۔ اس نے حالات کے نئے موڑ کو اپنے اعتقاد کی سان پر چڑھایا۔ اس کے صحافیوں نے علم کی اس نئی صنف کو ایثار کا ضابطہ بنایا اور خراماں خراماں فدائیت کی منزل کی طرف رواں ہوئے۔ انہیں منزل کی طہارت کا یقین تھا۔ کاروان سالار مولوی محمد باقر نے منزل پر پہونچنے کے اپنے ہر قدم کو وطنی ظرف سے سرفراز کیا۔ بغاوت کے نازک ترین مرحلہ پر انہوں نے جذبۂ تشکر سے تختۂ دار کو چوما۔ وہ ایثار پیشہ وقائع نگاروں کی قریب ایک صدی کی روایت کے امین تھے اور اپنے عہد کی آواز کے منتظر تھے۔

ایسا عہد اور ایسا شخص روز روز نہیں آتا۔ البتہ اس کے صادقین کی سعادت کے اثرات رواں دواں رہتے ہیں۔ ان کے ملک ہندوستان میں یہی ہوا۔ حصول آزادی کا ولولہ دبا بہ دبا تجدید کی طرف بڑھتا رہا۔ قریب نصف صدی بعد دہلی کے پڑوسی صوبہ متحدہ سے مولانا افضل الحسن حسرت موہانی نے پھر جہاد آزادی کا شہادت آفریں چراغ روشن کیا۔ اس کے فیضان سے نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں ملک کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا اور فرنگی جس کی سلطنت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا دوستی اور رفاقت مانگتے ہوئے رخصت ہوگیا۔ اس رخصتی کی تہہ میں مولوی محمد باقر کی شہادت کی لو رقصاں ہے۔

OO

اردو صحافت

آئینۂ صحافت

بغاوت کی کہانی اردو اخبارات کی زبانی

سلمان علی خان

■

یہ زمانہ وہ تھا جب انگریز پرست ہندوستانیوں کے دل میں بھی ملک کی آزادی کی تڑپ اور چاہ بدرجہ اتم موجود تھی۔ دہلی کالج کے استاد اور اسی کالج کے تعلیم یافتہ ماسٹر رام چندر کو ہی لیجئے۔ انگریز پرستی کا جذبہ ان کے دل و دماغ میں اس درجہ طاری ہوا کہ انھوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ لیکن جب انہوں نے 1845 میں دہلی سے اپنا پندرہ روزہ اخبار 'فوائد مناظرین' جاری کیا تو ان کے دل میں جاگزیں وطن پرستی کا جذبہ قرطاس ابیض پر رقم ہوتا ہی چلا گیا...

■

ہندوستان میں صحافت کا جب آغاز ہوا تو وہ اپنے دامن میں انگریز مخالفت کو بھی ساتھ ہی ساتھ لائی۔ سب سے پہلے انگریز صحافیوں میں ولیم بولٹس، جیمس اگسٹس ہکی، ولیم ڈوان، ڈاکٹر چارلس میکلین، مسٹر فیئر، اور جیمس سلک بکنگھم وغیرہ کو انگریز حکام کی نکتہ چینی کرنے پر ملک بدر کیا گیا، جب کہ اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما جب کلکتہ سے 27 مارچ 1822 کو معرض وجود میں آیا تو ابتداءً اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت اور سرپرستی حاصل رہی لیکن ایک بار حکومت پنجاب کے سربراہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں ایک متنازعہ مضمون شائع کرنے پر اسے سرکاری اعانت سے محروم ہونا پڑا۔ اسی طرح راجہ رام موہن رائے نے ہندوستان میں 12 اپریل 1822 کو فارسی زبان کا سب سے پہلا اخبار، 'مراۃ الاخبار' جب جاری کیا تو ابھی اس کی اشاعت کا ایک سال بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ گورنر جنرل جان ایڈم نے ہندوستان میں 14 مارچ 1822 کو دیسی اخبارات پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی غرض سے پریس آرڈی ننس جاری کردیا۔ راجہ رام موہن رائے نے اس کی زبردست مخالفت کی اور قانونی چارہ جوئی بھی کی لیکن ناکامی کے بعد انھوں نے آرڈی ننس کے اجرا کو حکومت کی مطلق العنانی قرار دیتے ہوئے مراۃ الاخبار کو احتجاجاً بند کردیا۔[1]

اس کے بعد رجب علی لکھنوی حسینی کی ادارت میں 2 اگست 1835 کو فارسی اخبار سلطان الاخبار جب شائع ہوا تو ملک میں اس کی دھوم مچ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کمپنی بہادر کے عہدیداروں اور انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن رجب علی لکھنوی حسینی نے سب سے بڑی بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ ایک انگریز کے کسی ہندو دوشیزہ سے بدسلوکی کرنے اور بعد میں پولیس سے ساز باز کر کے لڑکی کے پورے خاندان کو چوری کے الزام میں جیل میں قید کرانے کی خبر شائع کرتے ہوئے آخر میں

انگریز احکام پر یوں طنز کیا۔'ایں است ظلم انگریز بر رعیت'[2]

اس کے علاوہ 'سلطان الاخبار' میں عدالت کے منشور کی چیرہ دستیوں اور ڈاک خانے کے ملازمین کی خیانت کو اجاگر کرتے ہوئے ایک اور خبر شائع کی۔ اس میں مدیر کی دیانت داری اور انصاف پسندی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس سلسلہ میں صحافت کے معتبر محقق محمد عتیق صدیقی 'سلطان الاخبار' کے مدیر کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

''رجب علی لکھنوی یقیناً بڑے باہمت آدمی تھے۔ ان کے اخبار کی خبریں اور ان خبروں پر ان کا دل کش تبصرہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ کمپنی انگریز بہادر کے دارالسلطنت کلکتہ میں بیٹھ کر وہ اخبار نہیں نکالتے تھے بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی چھاتی پر کودوں دلتے تھے۔ سلطان الاخبار کا کوئی نمبر مشکل ہی سے ملے گا جس میں انگریزوں کی زیادتیاں اور انگریزی عدالتوں کی ناانصافیاں اور بدعنوانیاں کھلے اور واضح لفظوں میں نہ بیان کی گئی ہوں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مدیر حسینی اعلانیہ یہ لکھنے کی ہمت بھی رکھتے تھے کہ 'بازار رشوت در ہر عدالت انگریزی گرم است۔' یہ وہ اخبار ہے جس نے 1857 کی جنگ آزادی میں بھی اپنی حریت پسندی اور سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ نتیجتاً 1857 کی بغاوت کے سلسلہ میں سلطان الاخبار پر مقدمہ چلایا گیا۔[3]

سلطان الاخبار کے مدیر رجب علی حسینی کی انگریزی حکومت کی مخالفت کا اندازہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے درج ذیل اقتباسات بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''سلطان الاخبار اس دور کی صحافت میں ایک منفرد حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے بے دھڑک اصلاحات قارئین تک پہونچائے اور جس حد تک ممکن تھا حالات پر تبصرہ بھی کیا حکومت وقت کے ہتھکنڈوں پر نکتہ چینی بھی کی۔ غرض ثابت کر دکھایا کہ برے سے برے حالات میں بھی جرأت رندانہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔ سلطان الاخبار پہلا اخبار تھا جس نے اودھ کی نوابی حکومت کا مقابلہ برطانوی علاقہ کے نظم و نسق سے کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ مملکت انگریزی میں لوگ زیادہ پریشان حال ہیں۔ 9 اگست 1835 کے پرچے میں درج کیا۔

''اگر انصاف و تعصب را راہ نہ دہم زمینداران مملکت انگریزی پریشان حال و رعیت مملکت اودھ فارغ البال قتل نفوس بنی آدم در یک شہر کلکتہ بیشتر و در قلمرو اودھ کمتر۔''[4]

اس حریت پسند قوم پرور اور وطن پرست اخبار کے جانباز بے باک مدیر نے انگریزوں کے خلاف اپنی شعلہ بیانی کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس کی مثال مفقود ہے۔ یہ اخبار انگریز حکمرانوں کو جس تیز و تند اور تلخ لب و لہجہ میں مخاطب کرتا تھا اس کے لئے سلطان الاخبار کا یہ اقتباس کافی ہے۔

''ان دنوں جتنے راجہ ہیں، سب نے بالاتفاق چٹھی اس مضمون کی تحریر کی ہے جرأت کی تقریر کی ہے اور جو سرکار کمپنی خلاف عہد و خواہش رؤسائے ہندوستان کی ریاست بہ جبر لیتی ہی (تو اس کے سبب) ایک تو خلقت بے کاری سے مرتی ہے دوسرے بسی بسائی بستیاں سرکار ویران کئے دیتی ہے اس باعث سے ہم لوگوں نے باہم ہر ایک کو فساد (جہاد آزادی) پر آمادہ کیا ہے۔ ہمارا ملک اگر لیں گے تو جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلاف عہد و پیان اگر ریاست لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی ہر میدان پر ایک جان دینے کو تیار ہے۔ جس دم معرکہ کارزار کی گرم بازاری ہوگی، دیکھ لینا کمپنی کی ذلت و خواری ہوگی۔ بادشاہ اولوالعزم کو پاس تحریر اور خیال تقریر ضروری ہے۔ بد عہدی میں بلڑ (ہنگامہ) مچے گا۔ ایک عالم مستعد فتور ہے۔''[5]

دراصل سلطان الاخبار محض ایک اخبار نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے محبان وطن کے دل و دماغ میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ جس کے کلمہ حق کے سبب بالآخر 1857 کی پہلی جنگ آزادی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ سلطان الاخبار کے اس کلمہ حق کے بارے میں محمد افتخار کھوکھر رقم طراز ہیں۔

''اس دور میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف معمولی خبر شائع کرنا بھی بڑے دل گردے کی بات تھی۔ سلطان الاخبار بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ انگریزوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف کلمہ حق بلند کرتا رہا۔''[6]

اسی طرح جب شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اردو اخبار 'دہلی اردو اخبار' مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے 28 فروری 1837 کو دہلی سے شائع کیا تو اس میں دو کالمی صفحۂ اول پر 'حضور والا' کے عنوان سے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں روزنامچہ چھپتا تھا جب کہ دوسرے کالم میں 'صاحب کلاں' کے عنوان سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے متعلق خبریں اور اعلانات شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار ابتداءً مغلیہ دربار اور کمپنی بہادر سے متعلق خبروں اور دیگر امور کی اشاعت کو یکساں طور پر جمع کر دیتا تھا لیکن چند برسوں میں ہی انگریز حکام کی بڑھتی ہوئی ناانصافی اور ملک دشمن کو دیکھ کر اس نے انگریزوں کے تئیں نرم پالیسی میں نمایاں تبدیلی کر دی۔ ایک بار چوری کے واقعات شہر میں زیادہ بڑھ گئے تو مولوی باقر نے پولیس حکام پر غفلت اور چوروں سے ساز باز کا الزام لگاتے ہوئے لکھا:

''ظاہر ہے چوروں سے سازش رکھتے ہیں ورنہ ممکن نہیں کہ ہر شب بے سازش پاسبان اور ارباب پولیس کے (چور) چوری کی ہمت کر سکیں۔''[7]

اس زمانہ میں حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ گھر میں چوری

ہو جانے پر پولیس میں رپورٹ لکھوانے کے لئے کوئی شخص پولیس تھانے پر جاتا تھا تو اس کے خلاف ہی مقدمہ قائم کرنے کی دھمکی دی جاتی تھی۔ اس پر اخبار میں لکھا گیا۔

"اب نوبت (یہ) ہے کہ لوگ ڈر کے مارے زبان پر حرف چوری کا نہیں لاتے اور حکام کچھ نہیں کرتے۔"[8]

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ اخبار انگریز مخالفت میں پیش پیش نظر آنے لگا۔ یہاں تک کہ 1857 کے انقلاب میں انگریزوں کے خلاف اس اخبار کی شعلہ بیانی آسمان پر پہونچ گئی۔ اس بات کا اندازہ دہلی اودھ اخبار کے 17 مئی 1857 کے شمارہ میں شائع شدہ میرٹھ کی باغی پلٹن کی اس خبر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"11 مئی 57 مسیحائی کو کہ بباعث موسم گرما اول وقت کچہری ہو رہی تھی صاحب مجسٹریٹ محکمہ عدالت میں سرگرم حکمرانی تھے اور سب حکام اپنے اپنے محکموں میں سرگرم اجرائے احکام تھے... سات بجے کے بعد میر بحری یعنی داروغہ پل نے آن کر خبر دی کہ صبح کو چند ترک سوار چھاؤنی میرٹھ کے پل سے اتر کر آئے اور ہم لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنے لگے... تمام کچہری اور عملہ میں کھلبلی پڑ گئی۔ صاحب مجسٹریٹ معلوم ہوا کہ کمشنر کے پاس گئے اسی اثنا میں سنا گیا کہ وہ ترک سوار زیر قلعہ مبارک پیش جھروکہ جمع ہیں اور حضور والا حضرت ظل سبحانی سے مستدعی خواستگار ہیں کہ ارک معلی میں بار پاویں... تھوڑی دیر میں سنا کہ انگریز قلعہ دار و بڑے صاحب و ڈاکٹر صاحب و میم وغیرہ دروازے میں مارے گئے اور سوار قلعہ میں چلے آئے۔ حضور اقدس بھی دستار مبارک زیب سر اور شمشیر ولایتی زیب کمر فرما کر تشریف فرمائے دربار ہوئے۔ شہر میں غل ہو گیا کہ فلاں انگریز وہاں مارا گیا اور فلاں انگریز وہاں پڑا ہے... حقیر بہ جانب میدان نصیر گنج چلا۔ وہاں پہونچا تو دیکھا کہ فخر المساجد کے آگے بیس پچیس تلنگہ منفرد کھڑے ہیں اور لوگ ان کو طرف مسجد کے اشارہ کرتے ہیں۔ غرض دیکھا کہ چند تلنگہ مسجد میں گئے اور پیہم بندوقیں مار کر سب کو وہاں بندوق کی راہ سے سید ھا ملک عدم پہونچا دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد حقیر بر طرف میگزین گیا تو مسجد نواب حامد علی خاں سے آگے بڑھ کر دیکھا کہ نکسن صاحب سر دفتر کمشنری کا لاشہ پڑا ہے۔ سنا گیا کہ ٹیلر صاحب پرنسپل مدرسہ بھی یہیں بند تھے۔ اس دن تک کچھ آب و دانہ باقی تھا اور کوئی دن دنیا کی ہوا کھانی تھی کہ دوسرے دن یوم سہ شنبہ قریب دو پہر اسی تھانے کے علاقے میں مارے گئے۔ یہ شخص مذہب عیسوی میں نہایت متعصب تھا۔

اس کے بعد دہلی اردو اخبار میں سور کی چربی کے کارتوس استعمال نہ کرنے پر میرٹھ کے زیر عنوان سپاہیوں کی بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی باقر نے لکھا ہے۔

"بجرم انکار 85 شعر اس میں سے قید ہوئے کہ یوم یکشنبہ کو حمیت دینی اور حمیت مذہبی نے جوش کیا اور دفعتاً تمام اہل پلٹن و رسالہ جو شخص جس حال میں تھا ہتھیار سنبھال کر اول جیل خانہ سے اپنے برادران اسلامی کو چھڑا لائے اور معہ پلٹن درپے انگریزوں اور گوروں کے ہوئے اور جہاں ملے تہ تیغ کیا۔ حتی کہ سب انگریز اور گورے مضطر و مدمہ میگزین میں محصور ہوئے اور غازیان نامی راہی دہلی ہوئے۔"

اسی سلسلہ میں دہلی اردو اخبار میں روڑکی میں باغی سپاہیوں کے ہاتھوں انگریزوں کی ہلاکت کی بھی خبر اسی شمارہ میں شائع ہوئی۔

"روڑکی سے ایک پلٹن وہاں کے انگریزوں کو مار کر اس طرف آئی تھی کہ میرٹھ میں ان سے گوروں کا سامنا ہوا۔ تائید الٰہی و اقبال شہنشاہی پلٹن نے ان لوگوں کو پسپا کر کے شکست دے دی وہ لوگ پھر اپنے دمدمہ میں گھس گئے اور دو سو گورے مارے گئے۔"

اس کے علاوہ دہلی اردو اخبار کے 24 مئی 1857 کے شمارہ میں مولانا محمد حسین آزاد کی درج ذیل نظم 'تاریخ انقلاب عبرت افزا' کے زیر عنوان شائع ہوئی جس کے یہ اشعار کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاندار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے
آفاق میں تیغ غضب حضرت قہار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار
اس واقعہ کی چاہی جو آزاد نے تاریخ
دل نے کہا 'فل فاعتبر وایا اولی الابصار'

اس کے بعد دہلی اردو اخبار میں اتر پردیش کے مختلف اضلاع کی خبریں شائع ہوئیں جن کی اجمالی تفصیل یہ ہے۔

کول (علی گڑھ)

سنا گیا ہے کہ چار کمپنیاں کول کی بھی انگریزوں کا کالا منہ کر کے حضور سلطانی میں آ حاضر ہوئیں۔ یعنی جو انگریز پایا اوسے موت کے گھر پہونچایا اور خزانہ خوب لٹایا۔ تمام رعایا نے وہاں خوب لوٹا۔

بلند شہر

(اس شہر) میں بھی سنا کہ سپاہ نے انگریزوں کو مار ڈالا... قیدی جیل خانہ کے تمام چھوٹ گئے اور کوٹھیاں انگریزوں کی تباہ و برباد ہوئیں۔

کانپور

کانپور کا حال بھی مثل سب جگہ سنا گیا جہاں انگریزوں کو پایا جاتا ہے مارا جاتا ہے۔

لکھنؤ

سنا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں انگریزوں کا وہی حال ہوا جو کہ یہاں دہلی میں دیکھا گیا۔

آگرہ

آج کل یہ افواہ ہے کہ محل جنابہ بیجابائی کا آگرہ میں آزاد ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ خود انگریزوں نے ان کو سونپ دیا۔ امید ہے غازی وقت مد پانے غازیوں کی بہ عنایت الٰہی گوروں کو دم بھر میں چھانٹ ڈالیں گے۔

سکندرہ

وہاں کا خزانہ بھی لٹ گیا۔ انگریز مارے گئے دفتر جلا دیا گیا۔

غازی آباد

گوجروں نے کسی طرح ایک دو توپ قبضہ میں کر کے غازی آباد کو اڑا دیا اور خوب لوٹ کی۔

میرٹھ

انگریزوں پر غضب الٰہی ہے۔ کل بن مارے وہ خود بخود مر جائیں گے یا مارے جائیں گے۔

یہ اخبار ابتدائی مرحلہ پر دہلی اخبار کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن 10 مئی 1840 کو اس کا نام تبدیل کر کے 'دہلی اردو اخبار' رکھا گیا جبکہ مغلیہ حکومت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی خواہش اور اجازت سے مولوی باقر نے اپنے اس اخبار کا نام آخر میں 'اخبار الظفر' رکھ دیا جو 1857 جنگ آزادی تک مسلسل جاری رہا۔ لیکن اس اخبار کی انگریز دشمن پالیسی میں مطلق تبدیلی رونما ہوئی۔ اخبار الظفر کے نویں شمارہ میں الٰہ آباد کے بارے میں یہ خبر شائع ہوئی۔

الٰہ آباد

'رعایا اور سپاہ موجود الٰہ آباد نے بالکل صفائی نصاریٰ کی خس و خاشاک کفرستان میں کر ڈالی اور اصلاً کچھ خدشہ اور خرخشہ باقی نہیں رہا یعنی ایک گوری رنگت یا کالی رنگت کا کرستان تک خورد و کلاں ہلاکت سے نہیں بچا۔

الغرض مولوی محمد باقر 16 ستمبر 1857 کو انقلاب کی ناکامیوں کے بعد اشتعال انگریز مخالف صحافتی سرگرمیوں کے سبب محض اس الزام میں جا کر شہادت پینا پڑا کہ انھوں نے دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کو اپنے گھر یا امام باڑے میں انقلاب کے دوران پناہ نہیں دی۔ اس سلسلہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تصنیف مرحوم دہلی کالج اور آغا محمد باقر کے نقوش لاہور کے شخصیات نمبر 1955 میں شائع شدہ مضمون محمد حسین آزاد کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی محمد باقر کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ ان کا گھر بحق سرکار ضبط کیا گیا اور لوٹ لیا گیا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔

اس واقعۂ جانگداز کے بارے میں جہاں آرا بیگم نے حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ ٹیلر کس طرح مولوی محمد باقر کے گھر پہونچا اور باغی سپاہیوں اور مجاہدین آزادی کو جیسے ہی اس کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً ہی ان کا گھر گھیر لیا اور زبردست ہنگامہ برپا کر دیا تبھی بقول جہاں آرا بیگم:

''ٹیلر صاحب باہر نکل آئے اور ایک لاکھ پچھتر ہزار کے نوٹ مولوی صاحب کو دے دئے اور ان نوٹوں پر اپنے دستخط کر دیے اور یہ لکھ دیا کہ یہ رقم میں نے بطیب خاطر مولوی صاحب کو نذر کی ہے یہ سب کچھ ہوا۔ مسٹر ٹیلر جوں ہی باہر نکلے ان کو قتل کر دیا گیا۔ جب غدر کی فتنہ انگریزی ختم ہوئی تو مولوی صاحب نے اپنی دیانتداری کا ثبوت دیا اور وہ تحریر اور دستخط شدہ نوٹ ہڈسن صاحب کے پاس لے گئے اور ان کی زبان سے تمام واقعات نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ فوراً ہڈسن نے سوال کیا ٹیلر کہاں ہے؟ اس کا صاف اور سچا جواب ملنے پر (وہ) چراغ پا ہو گیا اور فوراً حکم دیا کہ گولی مار دو۔ حکم کی دیر تھی کہ مولوی باقر کی لاش وہیں تڑپنے لگی اور جاں بحق ہو گئے۔''[9]

اس کے برعکس سر عبدالقادر نے مولوی محمد باقر کے شہادت کے واقعہ پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

''ٹیلر نے مولانا کے مکان سے نکلنے سے پہلے انھیں کاغذات کا ایک بنڈل دے کر کہا اگر دہلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو جائے تو انگریز جو پہلے ملے یہ بنڈل اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جب مولانا باقر نے یہ بنڈل انگریز کرنل کے سپرد کیا تو کرنل نے بنڈل پر لاطینی زبان میں ٹیلر کی لکھی ہوئی سطور دیکھیں۔ مولوی محمد باقر نے پہلے پہل مجھے اپنے مکان میں پناہ دی لیکن پھر حوصلہ ہار بیٹھے اور میری زندگی بچانے کی کوشش نہیں کی۔ اس پر کرنل نے فوراً مولانا کو گولی سے اڑا دیا۔''[10]

اس کے بعد دہلی سے 1841 میں ہفتہ وار فارسی اخبار سراج الاخبار جاری ہوا۔ جو بہادر شاہ ظفر کے محل سے ہی شائع ہوتا تھا۔ اسے مغلیہ دربار کے روزنامچہ یا سرکاری گزٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ اخبار 1857 کی جنگ آزادی کے دوران برابر شائع ہوتا رہا۔ اس سے ہندوستان کے اس پُر آشوب زمانہ کے نامساعد اور دگرگوں حالات کی پوری تصویر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ 9 اور 10 مئی 1857 کی بات ہے جب میرٹھ (اتر پردیش) میں تعینات کمپنی بہادر کی

گیارہویں اور بیسویں پیدل رجمنٹ کے ساتھ ہی تیسری رجمنٹ کے دیسی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردیا اور پھر رات بھر پیدل چلتے اور انگریز حکام کو قتل کرتے ہوئے میرٹھ سے دہلی جا پہونچے جہاں جمنا کے کنارے لال قلعہ کی مشرقی دیوار کے پیچھے ڈیرے ڈال کر آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کے لئے بڑی بے صبری اور بے قراری سے انتظار کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں سراج الاخبار نے اس واقعہ جانکاہ پر روشنی ڈالتے ہوئے 11 مئی 1857 کے شمارہ میں تفصیل سے لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ یوں ہے۔

'' آٹھ بجے کے بعد خبر ملی کہ ضلع میرٹھ کی انگریزی فوج کے سوار اور پیادوں نے وہاں کے حکام وقت سے سرتابی کی ہے اور اپنے افسروں کو قتل کرنے کے بعد جوق در جوق جھروکہ کے نیچے حاضر ہوئے ہیں اور ہورہے ہیں اور جھروکوں کے پیچھے در کھولنے کے لئے آوازیں لگا رہے ہیں۔''

یہ خبر سنتے ہی بادشاہ نے شرف الدولہ بہادر کو یاد فرما کر لکھ دیا کہ قلعہ بہادر (کیپٹن ڈگلس) کو اس ماجرے کی اطلاع دی جائے۔ قلعہ دار انگریز بہادر نے (بادشاہ سے) اجازت چاہی کہ جھروکہ کے نیچے جا کر اس گروہ کثیر کو روکے لیکن حضور پرنور نے جو حکمت پناہ بھی ہیں اسے اس ارادہ سے باز رکھا اور گھر واپس جانے کے لئے فرمایا۔ اس تردد میں دو ایک ترک سواران سپاہیوں کی سازش سے اندر گھس آئے جو دروازے کے پہرے میں متعین تھے۔ اس کے بعد ان تلنگوں نے جو پہرے پر متعین تھے۔ قلعہ مبارک کے دونوں دروازے بلکہ شہر پناہ کے دروازے بھی کھول دئے۔ پھر تو (باغی سپاہیوں کے) اس گروہ کے لوگ دروازے سے قلعہ کے اندر گھس آئے اور (تبھی سپاہیوں کے حملہ سے) قلعہ دار اور میمیں خاک وخون میں تڑپنے لگیں۔ بلکہ تمام انگریز، خواہ اہل سیف تھے یا اہل قلم موت کے گھاٹ اتار کر ان کے مکانوں کو آگ لگادی۔ دوپہر کے قریب گروہ (در) گروہ حضور (کی خدمت میں) حاضر ہو کر التماس کی کہ فرزندان والا تبار کو ہمارا افسر مقرر کیا جائے تا کہ ان کی مدد سے شہر کا انتظام ہوسکے (اتنا سنتے ہی) شہنشاہ دین پناہ نے ہر چند، بحر حیرت میں ڈوب کر فکر کی، غواصی کو مگر بجز اس کے اور کوئی در شہوار ہاتھ نہ آیا کہ نظم ونسق شہر کی خاطر برخورداران کامگار کو فوج کا افسر بنایا جائے۔ کوچہ اور بازار کا خاطر خواہ بندوبست کرنے کی یہی ایک صورت نظر آئی کیونکہ ڈر تھا کہ اس گروہ نے دانش کے ہاتھوں رعایا و برایا کے خرابی لگے گی۔ اس امر سے پہلو تہی کرتا اور دامن کو بچاتا شہر اور شہر کے باہر کی غریب رعایا کو خرمن ہستی کو جلاتا تھا۔''

یہ زمانہ وہ تھا جب انگریز پرست ہندوستانیوں کے دل میں بھی ملک کی آزادی کی تڑپ اور چاہ بدرجہ اتم موجود تھی۔ دہلی کالج کے استاد اور اسی کالج کے تعلیم یافتہ ماسٹر رام چندر کو ہی لیجئے۔ انگریز پرستی کا جذبہ ان کے دل ودماغ میں اس درجہ طاری ہوا کہ انھوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا لیکن انھوں نے 1845 میں دہلی سے جب اپنا پندرہ روزہ اخبار 'فوائد مناظرین' جاری کیا تو ان کے دل میں جاگزیں وطن پرستی کا جذبہ بہرحال قرطاس ابیض پر یوں رقم ہوتا ہی گیا۔

'' کم ہمتی جو اہل ہند کا خاصہ ہے اور اس کے باعث وہ ہمیشہ غلامی میں رہتے ہیں اور دیکھئے کب تک رہیں گے ان کو آزاد گورنمنٹ کا تصور ہی نہیں... (اس لئے اہل وطن کے لئے) مطالعہ تاریخ آزاد قوموں کا سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ان کی عالی ہمت اور حب الوطنی کو دیکھ کر انھیں بھی عزم (لاحق ہو) اور داغ غلامی سے بری ہوں۔ دیکھئے ہندوستان کے دن کب پھرتے ہیں۔''[11]

دہلی سے ہی اس کے بعد 'صادق الاخبار' کے نام سے پانچ اخبار شائع ہوئے جن میں سید جمیل الدین خاں کے صادق الاخبار کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ اخبار جنوری 1854 میں جاری ہوا تھا جس کے شمارے نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ ہیں۔ یہ اخبار وہ ہے جس نے اپنی شعلہ بیانی سے تحریک آزادی کو کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور دیسی سپاہیوں اور مجاہدین آزادی کے جوش جہاد میں غیر معمولی شدت پیدا کردی۔ اس اخبار کی جلد 4 کے شمارۂ اول میں شاہ ایران کا یہ اعلان شائع ہوا تھا۔

شاہ نصیرالدین والی ایران نے ایک اعلان جاری کیا ہے مضمون اس کا یہ ہے کہ تمام سپاہ فارس جمع ہوکر سرحدات ملک ایران میں برائے مقابلہ ومقاتلہ دشمنان مذہب یعنی انگریزان... اب چاہئے کہ تمام پیرو جوان خورد وکلاں، عقلمند اور جاہل، کسان اور سپاہی بغیر از تامل تائید کریں اپنے ہم مذہبوں کی اور ہتھیاروں سے جسم کو آراستہ رکھیں اور ایک ''جھنڈا محمدی'' گاڑ دیں اور تمام ہم قوموں کو جہاد کی اطلاع دیں۔ تا اضلاع افغانستان کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھیں اور زیر حکم سردار سلطان احمد خاں اور سردار شاہ دولہ خاں اور سردار سلطان علی خاں ہندوستان کو جائیں۔ خدانے چاہا تو فتح مند ہوں گے اور انگریزوں کا ٹھکانہ لندن سے ورے نہ رکھیں گے۔ امیر دوست محمد خاں کہا کرتا تھا کہ اگر سپاہ ایران انگریزوں پر چڑھائی کرے گی تو میں بھی زور زور سے اس کا شریک ہوں گا۔ اب وہ وقت آن پہونچا ہے کہ اگر مر جائے تو شہادت پائے اور اگر زندہ بچے تو غازی کہلائے۔ بہرحال جہاد اچھی چیز ہے۔ شاہ ایران نے ایک نامہ بھی امیر دوست محمد خاں کے نام اس مضمون کا بھیجا۔

نامہ

اے امیر تو انگریزوں سے شریک ہوکر بے ایمان ہوگیا مگر ہم از راہ مسلمانی تجھ کو فہمائش کرتے ہیں کہ اس قوم سے علاحدہ ہو اور ہم سے مل کر

تدبیر غارت کرنے انگریزوں کی کر اور کل اہل اسلام بھی کہتے ہیں کہ امیر (دوست محمد خاں) نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کا نام ڈبو یا۔ اگر تجھ کو طمع زر ہے تو ہم سے دو چند لے اور کیا تو نے نہیں سنا کہ اس قوم (فرہنگ) نے ہندوستانی مغل شہزادوں سے کیا کیا بدعہدیاں ظاہر کیں۔ امیر (دوست محمد خاں) نے اس نامہ کی بڑی تعظیم کی اور آپ ادھر آنے کا قصد کیا۔ اور شاہ ایران ہرات میں داخل ہو گیا اور سپاہ قندھار نے فوج انگریزی کو جو آگے بڑھی تھی ہلاک کر دیا۔ کئی ہزار سپاہ نے (پشاور میں) انگریزوں کو قتل کیا۔ سپاہ اہل اسلام جا بجا تھانہ بادشاہی تا بہ لاہور بٹھاتی چلی آئی ہے اور ارادہ رکھتی ہے کہ بعد فتح لاہور مقام پٹیالہ اور دیگر مقامات دشمنان شاہی کو زیر و زبر کر (دہلی پہونچ) کر قدم بوسی حضور انور (بہادر شاہ ظفر) حاصل کرے۔ سنا گیا ہے کہ اب گورے اور انگریز تمام پنجاب میں باقی نہیں رہے۔"[12]

اس کے بعد اسی شمارے میں 'اخبار مقامات مختلفہ' کے زیر عنوان اتر پردیش کے بعض اضلاع بالخصوص وارانسی، الہ آباد، لکھنؤ، میرٹھ اور آگرہ وغیرہ کے حالات بہت ہی تفصیل سے درج کیے ہیں۔ اس اخبار کے مدیر نے بتایا کہ انگریزوں پر دیسی سپاہیوں کا اتنا زیادہ خوف طاری ہوا کہ شمالی ہند کے لفٹنٹ گورنر نے اپنی فوج میں کالا آدمی ایک بھی نہیں رکھا۔ سو اس کو گورنر کلکتہ نے اس کے عہدہ سے برطرف کیا۔ اس اخبار کے جانباز مدیر کی بے باکی وحریت پسندی کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس وقت اتر پردیش میں انقلابی وسیاسی حالات کیا تھے۔

"بنارس (وارانسی) میں وہاں کے راجہ کا انتظام دور دور تک بہ خوبی ہو گیا اور کانپور میں نواب محمد علی خاں بہادر عرف ننھے نواب نے دو پلٹنوں تلنگانہ سے اپنا بندوبست کر لیا اور سپاہ (انقلاب) سے وعدہ کیا کہ ہم بعد نظم دہلی کو برائے مشرف ملازمت حضور اقدس چلیں گے اور الہ آباد میں جب سے انگریز مارے گئے کوئی حاکم مقرر نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ تمام یورپ میں دین دار لوگوں نے فرنگیوں اور ان کے زن و بچہ کو چن چن کر قتل کیا اور ایک انگریز نام کو بھی باقی نہ رکھا۔ لکھنؤ میں درمیان مچھی بھون کے انگریزوں نے یہ بہانے سنائے۔ مژدۂ لندن جمیع مدعیان سلطنت اور اعیان ریاست کو بلا کر مقید کر لیا اور آپ بھی اس میں قید ہیں۔ باہر گوروں کا پہرہ ہے۔ کوئی شہر کا کالا آدمی اندر جانے نہیں پاتا لیکن باشندے وہاں کے اس تدبیر میں ہیں کہ جس طرح بنے ان لوگوں کو منگوا (رہا کروا) لیجیے اور مصطفیٰ شاہ برادر شاہ (واجد علی) اودھ کو بادشاہ یہاں کا بنا دیجیے۔ میرٹھ میں کل تین سو گورے معہ چند افسران انگریزی بمقام دمدمہ محفوظ ہیں۔ کوئی متنفس شہر میں نہیں نکلتا اور کچہری دربار کا کیا ذکر... آگرہ میں گورہ اور فرنگی اور کرستان قلعہ کے اندر گھرے ہوئے ہیں۔"

صادق الاخبار کے جانباز مدیر نے 'خبر دہلی' کے عنوان سے دہلی کو تباہی و بربادی کا ذکر کرنے کے بعد اپنے اسی شمارہ میں مزید تحریر کیا۔

"سولہویں رمضان المبارک 1273ھ کو پانچ ترک سواران فرشتہ منش نے انگریزوں کا راج پاٹ ہند سے اٹھا دیا۔ گویا تختہ حکومت الٹ دیا اور ہمارے حضرت قدر رقدرت (بہادر شاہ ظفر) بہ یاوری طالع از سر نو تخت شاہی پر بیٹھے۔ آخر کار گورہ بھاگ نکلے۔ لشکر مظفر جب کوئی مقابل نہ پایا تو تین سو گھوڑے اور کچھ چھکڑے رسد وغیرہ اپنے قبضہ میں کر قصد باز گزشت کیا۔ سنا گیا ہے کہ گورہ اس لڑائی میں بہت مارے تھے۔"[13]

اس سے قبل صادق الاخبار میں جانباز مجاہدین اور سرفروشان وطن کی انگریزوں کے خلاف زبردست معرکہ آرائی کی خبر انتہائی دلیری اور جواں مردی کے ساتھ درج ذیل عنوان سے شائع کی تھی۔

خبر فتح لکھنؤ

"لکھنؤ کے جمیع انگریزوں کو وہاں کی فوج نے تہ تیغ بیدریغ کیا۔ اور مچھی بھون وغیرہ مکانات اودھ میں قبضہ اپنا کر لیا۔"[15]

"ان دنوں لکھنؤ قوم نصاریٰ سے بالکل خالی ہے اور بندوبست وہاں مصطفیٰ علی شاہ برادر حقیقی (نواب واجد علی شاہ) اودھ کا ہے۔"

مصطفیٰ علی شاہ دراصل نواب واجد علی شاہ کے حقیقی بڑے بھائی تھے جنھیں ان کے والد نے فاتر العقل ہونے کے سبب جانشینی کے حق سے محروم کر دیا تھا۔ انقلاب کے دوران انگریزوں نے دیگر حضرات کے ساتھ مصطفیٰ علی شاہ کو بھی مچھی بھون میں قید کر رکھا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انگریزوں نے اودھ کے آخری حکمراں نواب واجد علی شاہ کو بارک پور میرٹھ میں برپا ہونے والے انقلاب میں ان کے ہم نواؤں کے ملوث ہونے کے شک میں فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا تھا جنھیں انقلاب کی ناکامی کے بعد ہی رہائی ملی۔ صادق الاخبار کے مدیر سید جمیل الدین کو انگریز دشمن تحریروں کے سبب بغاوت کے الزام میں تین سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

اس زمانے میں نواب واجد علی شاہ کے سچے پرستاروں اور ہم نواؤں میں فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی محمد یعقوب انصاری کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ انھوں نے نواب واجد علی شاہ کو اودھ کی حکمرانی سے 1856 میں معزولی کے خلاف پوری قوت سے صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے لکھنؤ سے 25 جولائی 1856 کو ایک اخبار 'طلسم لکھنؤ' جاری کیا۔ اس اخبار میں انگریز حکام کے خلاف شائع ہونے والی تیز تند اور ترش تحریروں کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

''جس دن سے نواب واجد علی شاہ کی سلطنت نہ رہی۔ شہر بگڑا، چوروں کی بن آئی۔ کسی میں حالت نہ رہی... اس اندھیر پر ایک مثال یاد آئی ہے کہ اندھے کی جورو کا خدا ہی رکھوالا۔ اس نابینائی پر یہ حکومت اندھیر ہے۔ صاف اندھے کے ہاتھ بٹیر ہے۔ روز باتیں عجائب ہیں۔''[16]

نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ میں قیصر باغ میں واقع چینی بازار کی شاہی عمارتوں سے محلات کو بے دخل کرنے کے لئے انگریز کمشنر نے حکم دے دیا۔ ان شاہی محلات کی بے دخلی کے معاملات کو مولوی محمد یعقوب انصاری نے طلسم لکھنؤ میں جس دردناک اور کرب ناک انداز میں جس دلیری اور بے خوفی سے شائع کیا اس کی مثال مفقود ہے۔

''شاباش مع اسباب (شاہی محلات کو) اٹھایا۔ رات کے سبب سے جو کاٹھ کباڑ باقی رہا وہ چینی بازار کے تھانہ دار کی تاکید سے اٹھا۔''

اس واقعہ جانکاہ کو سن کر اہل لکھنؤ کو اس قدر صدمہ ہوا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اخبار میں آگے لکھا۔

''زمانہ کی گردش نے عجب ویرانی دکھائی۔ تمام خلق کورقت تھی۔ یہ حیرانی دیکھ کر حسرت تھی۔ دیکھنے والوں کا دل کڑھتا تھا مگر کیا ہوسکتا تھا۔ ایک دوسرے کا منہ تکتا روتا بلکتا تھا۔''[17]

یہ 4 جولائی 1856 کی بات ہے کہ لکھنؤ کے بعض باشندوں کے کچھ خام و پختہ مکانات جو گڑھیا کے پہلو میں واقع تھے زمین دوز کرنے کا انگریز حکام نے حکم دے دیا۔ اس ناانصافی اور زیادتی کے خلاف مولوی محمد یعقوب انصاری نے اپنے اخبار میں آگے لکھا۔

''وہاں کھودنے کا حکم دیا اور مہلت ایک ساعت کی رعایا کو نہ دی۔ ان کی زاری پر التفات نہ کیا۔ ایک پٹ ہوئی بلند مسجد کو انگریز افسر پلٹن نے اپنی سکونت کا مکان ٹھہرا کر تینوں دروں میں دروازے لگائے... دوسری قناتی مسجد... بالکل... پٹ گئی۔ فقط پشت کی جانب سے نشان معلوم ہوتا ہے۔''[18]

نواب واجد علی شاہ کی اودھ کی حکومت سے معزولی کا معاملہ برطانوی پارلیمنٹ میں جب زیر بحث آیا تو ''طلسم لکھنؤ'' میں اس کی روداد بھی شائع کی گئی۔

''ایک صاحب عالی شان ممبر دربار پارلیمنٹ نے سروقد کھڑے ہو کر یہ سوال کیا کہ انتزاع ملک اودھ سرکار کمپنی سے بجا ہوا یا بیجا۔ سب اہالیان پارلیمنٹ نے متفق اللفظ جواب دیا کہ کوئی اس ضبطی کو نہ اچھا کہتا ہے اور نہ کہے گا... جب (شاہ لکھنؤ اور شہنشاہ انگلستان کے درمیان ہوئے) عہد نامے پڑھے جاتے ہیں۔ دانا و دوربین انگشت حیرت دانتوں میں دباتے تھے۔ اتنے میں ممبران پارلیمنٹ نے کہا اے صاحبو! لارڈ ڈلہوسی کی کاروائی ضبطی ملک لکھنؤ کے باب میں قابل منظوری ہے یا نہیں؟ سکھوں نے جواب دیا کہ جب تک تعمیل عہد نامہ جات کی تحقیقات قرار واقعی نہ ہو، اس باب میں حکم ناطق نہیں ہوسکتا۔ سرکار کمپنی نے ملک لکھنؤ کو بے وجہ ضبط کرلیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اس کاروائی ناجائز کو جائز نہ ہونے دیں اور انصاف پر متوجہ ہوں۔''[19]

طلسم لکھنؤ میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر، ان کے ولی عہد، قلعہ معلی میں ولی عہدی کے تنازعہ کے ساتھ ہی پھول والوں کی سیر کے میلہ اور دہلی سے متعلق دیگر فوجی اور سیاسی خبریں برابر شائع ہوئی رہتی تھیں۔ ہندوستان میں جب انقلاب برپا ہوا تو طلسم لکھنؤ کے مدیر نے مجاہدین آزادی کی انقلابی سرگرمیوں کی اشاعت کو اولین ترجیح دی۔ اس طرح انگریزوں کے خلاف ان کے جوش وجذبہ کو برانگیختہ کرنے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے جنگ آزادی میں صحافت کے رول کا اجمالی تجزیہ کرتے ہوئے طلسم لکھنؤ کے بارے میں لکھا ہے۔

''اس ہفتہ وار اخبار میں لکھنؤ اور ہندوستان اور غیر ممالک کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جہاں تک لکھنؤ کا تعلق تھا وہاں کی خبریں چشم دید کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس اخبار میں اودھ کے خاص عام پر اور لکھنؤ کی آبادی پر خصوصاً واجد علی شاہ کی معزولی کے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے بآسانی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔''

اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ 1857 سے قبل ہی انگریزوں کے خلاف فارسی اور اردو کے قلمی اخبارات سے لے کر مطبوعہ اخبارات تک نے بلا تفریق مذہب ومسلک پوری طاقت سے متحد ہو کر ایسی زبردست تحریک چلائی کہ جس نے محبان وطن کے دلوں میں 'آزادی ہند' کا ایسا جذبہ پیدا کردیا کہ ہندوستان کو بالآخر آزادی حاصل ہوہی گئی۔

حواشی: 1۔ ہندوستان میں فارسی صحافت کے بانی۔ راجہ رام موہن رائے سلمان علی خاں، ماہنامہ آجکل نئی دہلی۔ مئی 1998 صفحہ 12 تا 19: 2۔ سلطان الاخبار، شمارہ نمبر 1۔ 12 اگست 1833: 3۔ ہندوستانی اخبار نویس (کمپنی کے عہد میں) محمد عتیق صدیقی 1957 صفحہ 247 تا 252: 4۔ صحافت، پاکستان وہند میں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صفحہ 45: 5۔ سلطان الاخبار، بحوالہ طلسم لکھنؤ، 16 جنوری 1857: 6۔ تاریخ صحافت، محمد افتخار کھوکھر 1998 صفحہ 50: 7۔ دہلی اردو اخبار، دہلی، 19 اپریل 1841: 8۔ ایضاً 12 دسمبر 1841: 9۔ محمد حسین آزاد، جہاں آرا بیگم صفحہ 17، بحوالہ تاریخ صحافت اردو، جلد اول، امداد صابری۔ صفحہ 318-319: 10۔ Famous Urdu Pets And Wirters: Sir Abdul Qadir: 11۔ دلی کالج میگزین، دہلی (قدیم دلی کالج نمبر) صفحہ 64: 12۔ صادق الاخبار دہلی، 14 ذی الحجہ 1273ھ: 13۔ صادق الاخبار، جلد 4 شمارہ 1، 14 ذی الحجہ 1273ھ: 14۔ صادق الاخبار، جلد 4 شمارہ 4، 5 ذی الحجہ 1273ھ: 15۔ طلسم لکھنؤ، لکھنؤ، 16 جنوری 1856: 16۔ طلسم لکھنؤ، لکھنؤ 25 دسمبر 1856: 17۔ 18۔ ایضاً۔ شمارہ 1، جلد 1: 19۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ 1976 صفحہ 273۔

OO

صحافت

دہلی اردو اخبار

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

■

اس اخبار کی ادبی اہمیت بھی ہے۔ اول تو یہ کہ مولوی محمد باقر اور مولوی محمد حسین آزاد اس کے دامن سے وابستہ تھے جن کی علمی حیثیت مسلم ہے۔ دوسرے غالب، ظفر، ذوق، حافظ غلام رسول ویران، مرزا انور الدین خلف مرزا سلیمان شکوہ، مرزا جیون بخت، مرزا حیدر شکوہ اور نواب زینت محل کے متعلق اس میں بے مثل مواد ملتا ہے۔ اس میں ہم غالب کی زندگی کو سماج کے ایک بڑے نقشے میں دیکھ سکتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وہ بشری کمزوریاں جو غالب شکنی کے سلسلے میں گنائی جاتی ہیں، وہ دراصل ان کے طبقے اور سماج کی عام کمزوریاں تھیں...

■

دہلی اردو اخبار شاہ جہاں آباد دہلی کا پہلا اردو اخبار ہے جس کے مطالعے سے مومن و غالب، شیفتہ و آرزو اور ذوق و ظفر کا سارا ماحول اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ہم اس جامِ جم میں دو دنیاؤں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ جس میں ایک ابھرتی ہوئی ہے، دوسری ڈوبتی ہوئی۔ یہ اخبار کب جاری ہوا، اس کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ مارگریٹا بارنس نے لکھا ہے کہ وہ 1838 میں شروع ہوا۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی نے اس کی تاریخ اجرا 1837 قرار دی ہے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔ "1835 سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہوگئی۔ اس سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔

"1836 میں اردو اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔ محمد حسین

آزاد: آب حیات ص 26 طبع لاہور 1950

مولانا محمد حسین آزاد کے والا مولوی محمد باقر، دہلی اردو اخبار کے اڈیٹر تھے اور وہ خود بھی اس سے وابستہ رہ چکے تھے، اس لئے ان کا بیان اہم ہے۔ لیکن اس کا دوسرا ٹکڑا کہ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا، صحیح نہیں۔ 'جامِ جہاں نما' کی موجودگی میں یہ شرف دہلی اردو اخبار کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ یوں گارساں دتاسی نے سراج الاخبار کو دہلی کا پہلا اخبار قرار دیا ہے۔ (خطبات گارساں دتاسی: اورنگ آباد 1935 ص 31) حالانکہ وہ 1841 میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اسی طرح ذکاءاللہ نے سید الاخبار دہلی کو اوّلیت کا درجہ دیا ہے اور اس کا سالِ آغاز 1838 ٹھہرایا ہے۔ یہ بیان بھی ساقط الاعتبار ہے۔ اس بحث سے قطعِ نظر، مرزا غالب کے ایک خط سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ دہلی اردو اخبار 1837 میں ضرور نکل رہا تھا۔ وہ چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

''جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے۔
یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ مولوی محمد باقر دہلوی کے مطبع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا ہے مسمّیٰ بہ اردو اخبار۔ بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا آپ کے کسی دوست کے یہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر 1837 سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں جن میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا بجنسہ میرے پاس بھیج دیجئے۔''

مولانا محمد حسین آزاد کے اس بیان کی تائید کہ دہلی اردو اخبار 1836 سے نکلنا شروع ہوا، قاسم علی سجن لال [Islamic Culture, Jan. 1950 (Vol. 24, No. 1) P. 16] ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: صحافت پاکستان و ہند میں مطبوعہ لاہور 1963 ص 103۔) اور مولانا امداد صابری (امداد صابری: تاریخ صحافت اردو ج 2 حصہ اول مطبوعہ دہلی ص 28۔) نے بھی کی ہے۔

یہ ہفتہ وار اخبار 4/20x30 کے سائز پر چھپتا تھا۔ قیمت ماہ وار دو روپے اور سالانہ بیس روپے تھی۔ اس کا پہلا نام اخبار دہلی تھا لیکن یکشنبہ 10 مئی 1840 (نمبر 168۔ جلد 3) سے اس کا نام دہلی اردو اخبار ہوگیا۔ کاغذ قدرے سفید اور کتابت قدرے جلی اور کشادہ ہوگئی۔ 12 جولائی 1857 نمبر 28 جلد 19 سے اس کا نام اخبار الظفر ہوگیا۔ اخبار کا نمبر اور جلد کا شمار وہی رہا جو دہلی اردو اخبار کا تھا۔ اور یہ کھل کر انگریزوں کی مخالفت اور بہادر شاہ ظفر کی حمایت کرنے لگا۔ لیکن جہادِ آزادی کی ناکامی اور سلطنتِ مغلیہ کی تباہی کے ساتھ بالآخر اس اخبار کی زندگی بھی 13 ستمبر 1857 کو ختم ہوگئی۔

دہلی اردو اخبار کے مالک و مدیر مجتہد العصر مولانا محمد باقر، خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ وہ علم و فضل ہی میں بڑا پایہ نہیں رکھتے تھے بلکہ دربار شاہی میں بھی ان کو بڑا درخور حاصل تھا۔ میں نے جیون لال کے روزنامچہ 1837 کا اصل نسخہ لندن میں پڑھا ہے۔ اس میں کئی جگہ مولوی محمد باقر کی باریابی حضور کا ذکر ہے اور ان ہدایات کی صراحت ہے جو انہوں نے بادشاہ کے دستوں کو خزانہ شاہی کی حفاظت کے سلسلے میں دی تھیں۔

مولوی محمد باقر، دہلی کالج میں استاد رہ چکے تھے۔ انھوں نے پرنسپل ٹیلر کو فارسی پڑھائی تھی اور وہ ان کی مسیحی سرگرمیوں سے واقف تھے۔ دہلی اردو اخبار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سر رشتہ داری اور تحصیل داری کے علاوہ محکمۂ بندوبست میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر بھی کام کر چکے تھے۔ 1857 کی بغاوت سے قبل اس اخبار کا رویہ انگریزوں کے خلاف معاندانہ نہیں، متحیرانہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی حیرت، مخالفت میں بدل گئی۔ ہم نے دہلی کالج میگزین کا قدیم دہلی کالج نمبر 1953 میں شائع کیا تھا اور اس میں پہلی دفعہ مولوی حسین آزاد کی نظم تاریخ انقلاب افزا دہلی اردو اخبار سے لے کر چھاپی تھی۔ اس کے آخری شعر یہ ہیں:

کو ملکِ سلیمان و کجا حکمِ سکندر
شاہانِ اولی العزم وسلاطین جہاں دار
کو سطوتِ حجاج و کجا صولتِ چنگیز
کو خانِ ہلاکو و کجا نادرِ خوں خوار
نہ شوکت وحشمت ہے نہ وہ حکم نہ حاصل
کس جا ہے جہاں اور کہاں ہیں وہ جہاں دار
کو رستم وسہراب وکجا سام و نریماں
اس معرکے میں کند ہے ایک ایک کی تلوار
کو حکمتِ لقمان وکجا علمِ فلاطوں
خیلِ حکما و علمائے اولی الابصار
ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحبِ ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قومِ نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش وجہاں دار
تھی صاحبِ علم وہنر وحکمت وفطرت
تھی صاحبِ جاہ و حشم و لشکرِ جرار
اللہ ہی اللہ ہے، جس وقت کہ نکلی
آفاق میں تیغ غضبِ حضرتِ قہار
سب جوہرِ عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے
سب ناخنِ تدبیر و خرد ہوگئے بیکار
کام آئے نہ علم و ہنر وحکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردشِ گردوں بھی عجب گردشِ دوّار
نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجئے تو عیاں ہے
ہر شعبدۂ تازہ میں صدا بازیِ عیّار
ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل
ہیں بند یہاں اہلِ زباں کے لبِ گفتار

آنکھیں ہوں تو سب کھل گئی دنیا کی حقیقت
مت کیجو دلا اس کا بھروسا کبھی زنہار
عبرت کے لئے خلق کی یہ سانحہ بس ہے
گر دیوے خدا عقلِ سلیم و دلِ ہشیار
کیا کہیے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے
حیراں ہیں سب آئینہ صفت پشت بدیوار
حکامِ نصاریٰ کابدیں دانش و بینش
مٹ جائے فشاں خلق میں اس طرح سے یک بار
اس واقعے کی چاہی جو آزاد نے تاریخ
دل نے کہا: قل فاعتبروایا اولی الابصار

1273ھ

(دہلی اردو اخبار مورخہ 24 مئی 1857)

یہ لے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ 31 مئی 1857 کے اخبار میں لکھتے ہیں:

"(انگریزوں) کے تکبر نے ان کو قہر الٰہی میں مبتلا کیا۔ انا اللہ لایحب المتکبرین۔ اب کہاں ہیں انگلش مین اور فرینڈ آف انڈیا... اور وہ لن ترانیاں۔ حکمت وحکومت داناؤں انگلستانیوں کی... آیا نہیں جانتے تھے کہ للّٰہ الحکمۃ البالغۃ ولہ الحکم ولہ الملک وہوالعزیز القدیر الملک المقتدر العلی الکبیر:

مراد را رسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

مولوی محمد باقر کی شہادت کن حالات میں واقع ہوئی؟ اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے، 1857 کے ہنگامہ و آشوب میں" یہ ہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آئے اور اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے۔ اس نے انھیں مولوی محمد حسین آزاد کے والد کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی، انھوں نے ایک رات تو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑے کے تہ خانے میں رکھا لیکن دوسرے دن جب ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام ہوگئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ مگر ان کا بڑا افسوسناک حشر ہوا۔ غریب بیرام خاں کی کھڑکی کے قریب جب اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور اتنے لٹھ برسائے کہ بچارے نے وہیں دم دے دیا۔ بعد میں مولوی محمد باقر صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی چڑھا دیئے گئے اور ان کا کوئی عذر نہ چلا۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا۔ مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی اور ان پر بھی تو شبہ تھا مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سرزمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے۔" (ڈاکٹر عبدالحق: مرحوم دہلی کالج دوسرا ایڈیشن 1945، ص 61)

مولوی ذکا اللہ، آغا محمد باقر اور جہاں بانو نقوی (جہاں بانو نقوی: محمد حسین آزاد ص 7) کے بیانات اس سے قدرے مختلف ہیں۔ لیکن سب اس پر متفق ہیں کہ مولوی محمد باقر کو پرنسپل ٹیلر کے قتل کے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔

سیاست سے قطع نظر دہلی اردو اخبار کی ادبی اہمیت بھی ہے۔ اول تو یہ کہ مولوی محمد باقر اور مولوی محمد حسین آزاد اس کے دامن سے وابستہ تھے جن کی علمی حیثیت مسلّم ہے۔ دوسرے غالب، ظفر، ذوق، حافظ غلام رسول ویران، مرزا انور الدین خلف مرزا سلیمان شکوہ، مرزا جیون بخت، مرزا حیدر شکوہ اور نواب زینت محل کے متعلق اس میں بے مثل مواد ملتا ہے۔ ان اوراق کے مطالعے سے ہم غالب کی زندگی کو سماج کے ایک بڑے نقشے میں دیکھ سکتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وہ بشری کمزوریاں جو غالب شکنی کے سلسلے میں گنائی جاتی ہیں، وہ دراصل ان کے طبقے اور سماج کی عام کمزوریاں تھیں۔ جن میں ان کی ذاتی مجبوریوں اور اقتصادی دشواریوں نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ مے و قمار سے ان کا تعلق کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں۔ وہ جوئے کے الزام میں ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ معتوب ہوئے تھے۔ 15 اگست 1841 کے دہلی اردو اخبار میں لکھا ہے:

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے... کہتے ہیں کہ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب اور کثرتِ مرواں کے یا کسی طرح سے، کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہوسکتا تھا، اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانے دار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا۔ بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمعداری میں بھی یہ بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے۔ بہت بے طمع ہے۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس، بہت رئیسوں کی سعی اور سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے نہ ادا کریں تو چار مہینہ قید۔ لیکن ان تھانے دار کی خدا خیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن اس

علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھوٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو چاہئے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔'' (دہلی اردو اخبار مورخہ 15 اگست 1841 نیشنل آرکائیوز آف انڈیا)

مئی 1847 کا واقعہ اسیری اس کے بعد کا ہے جس کے متعلق منشی کریم الدین نے لکھا ہے:

''ان ایام میں یعنی درمیان 1847 کے ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے بڑا پڑا۔ جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر ان کی اس میں قریب ساٹھ برس کے ہوگی۔'' (تذکرہ کریم الدین ص 378)

لیکن اس سے غالب کی شاعرانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کی عظمت کے گوشے وہاں روشن ہوتے ہیں جہاں وہ شخصیت اور گرد و پیش سے اٹھ کر کائنات کی وسعتوں میں پہنچ جاتے ہیں اور یہی وہ منزل ہے جہاں ان کے اشعار تیر نیم کش بن جاتے ہیں۔

8 ستمبر 1852 کے دہلی اردو اخبار میں اس مشاعرے کا ذکر ہے جو مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے مرزا نورالدین نے اگست 1852 میں منعقد کیا تھا۔ اس مشاعرے میں غالب نے اپنی مشہور غزل 'سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں' سنائی تھی جو آج بھی زباں زد خلائق ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے طرح میں یہ غزل پیش کی تھی:

چار آنکھیں تیری اپنی آفت جاں ہوگئیں
تیر سی اس کی جگر سے پار مژگاں ہوگئیں

دہلی اردو اخبار کا ذکر غالب کے خطوں میں، بہادر شاہ کے مقدمے میں اور گارساں دتاسی کے لیکچروں میں موجود ہے، جو اس کی اہمیت کے شاہد ہیں۔ اس سے زبان و ادب کی رفتار معلوم ہوتی ہے اور تاریخ کے بہت سے گوشے ایک ڈائری کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

دہلی اردو اخبار کے ...تمام پرچے... نیشنل آرکائیوز یا ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کن یا ذخیرۂ قاسم علی سجن لال عثمانیہ یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔ اس وقت... 26 جنوری 1840 سے 20 دسمبر 1840 کے پرچے پیش نظر ہیں جو نیشنل آرکائیوز نئی دہلی سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان میں پہلا پرچہ سید معین الدین کے اور آخری موتی لال پرنٹر اور پبلشر کے اہتمام میں شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اس فائل سے مندرجہ ذیل پرچے غیر حاضر ہیں، لیکن نا تمام بھی الله آمین کر کے رکھنے کے قابل ہیں: -174-182-176-198-188 167-166-164-163

1840 کی جلد میں قرآن مجید ترجمۂ مولانا عبدالقادر اور شیفتہ کے تذکرۂ گلشن بے خار کا اشتہار ہے۔ اس جلد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر میں بے شمار لفظ انگریزی کے داخل ہوگئے تھے۔ ذیل میں ایک مختصر سی فہرست پیش کی جاتی ہے:

آکزلری، ڈکشنری، اجنٹ، مجسٹریٹ، جنٹ، ڈپوٹی، سارٹی فکٹ، کارسپانڈنٹ، پارلیمنٹ، سرکلر، اسکال، اجنٹی، رجمنٹ، سپرنٹنڈنٹ، پولیس، اسٹانپ، پولیٹی کل ڈیپارٹمنٹ، پلاٹن، روبی، لفٹنٹ، سلمنٹ، اسسٹنٹ، کپتان، ایمرلد، رویٹو، پنشن، کلکٹر، سکرتر، کمینڈر، جوری، ایسر، کسریٹ، سیشن، برگٹ۔

بعض ناموں اور لفظوں کا املا آج سے مختلف ہے:

مہرٹہ، بمبئی، مندراس، اوریسہ، گوآ، گورکھہ (Gorkha) باروت۔

جمع اور اضافت کے بارے میں آزادی تھی مثلاً اتواپ (توپ کی جمع) 'چٹھیات صدر، کمیدانانِ پلاٹن، امورات، نوٹ ہائے جعلی، صاحب چٹھی، بابوئے مذکور، کثرتِ بھیٹریہ، برہمنانِ مذکورین۔

ابھی اردو نثر فارسی کے غلبے سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

جب نوبت بہ نالش ہوئی۔ تماشائے رقص رقصانِ پری پیکر۔ اگر وہ دست آویز غیر کامل القیمت پر لکھی گئی ہوتی۔ نظر بر وجوہات چند در چند۔ خصومت بحدے تھی۔ بباعث انقضائے مدتِ مقرری گورنری ہندوستان۔ درباب امتحان متوقعین عہدہ ہائے منصفی کے۔

1840 کی جلد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا ایشیا مغربی استحصال کی وجہ سے اقتصادی کرب میں مبتلا تھا۔ قلعۂ مبارک میں تنخواہیں بہت دیر میں تقسیم ہوتی تھیں اور لوگ اس کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ دہلی اردو اخبار کی 1840 کی جلد 3 میں لکھا ہے:

''بسبب الغیاث اور فریاد تنخواہ داروں کے مرزا شاہرخ بہادر کو تاکید ہوئی کہ تنخواہ تقسیم کی جاوے۔ سو کچھ لوگوں کو تقسیم ہوئی اور بعضے بے چارے پھر باقی رہے۔ مختار کو لوگ بہت دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ نواب تاج الدین حسین خاں کو از راہ مرحمت سلطانی ایک جریب عنایت ہوئی۔ قرض خواہوں نے جو رستے میں گھیرا تھا سو مرزا شاہرخ بہادر نے حکم دیا کہ قلعہ کے دروازے کے اندر گھسنے نہ پاویں اور بلکہ نیاز علی کے واسطے بھی لیکن حضور سے

ارشاد ہوا کہ قرض خواہوں کو ممانعت قلعہ کی نہ کرنی چاہئے اور درستی ان کی کرنی چاہئے۔''

سیاسی بحران کی یہی کیفیت ایران میں بھی تھی۔ اسی جلد میں ایک جگہ ایران کے بارے میں لکھا ہے:

''وہاں کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اموراتِ اندرونی اور بیرونی ممالکِ ایران بہت خراب حالت میں ہیں۔ شاہِ ایران نے مجرد پہنچنے کے اصفہان میں، چار سو آدمیوں کو گرفتار کیا۔ چنانچہ اون میں ایک پیرزادہ بھی ہے اور جب کہ بادشاہ ہرات میں تھے تو یہ پیرزادہ بھی سرکشوں کے ساتھ تھا اور بسبب اس سرکشی کے ناظم اصفہان نکال دیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ان آدمیوں کے واسطے سزائے سخت تجویز ہوگی۔''

اس اخبار میں مقامی بدانتظامی اور چوریوں کا بھی ذکر ہے۔ 19 اپریل 1840 کے اردو اخبار نے کلکتہ کے بارے میں لکھا ہے:

''دریافت ہوتا ہے کہ ان دنوں میں ہنگامہ چوری کا وہاں ایسا گرم ہے کہ شہریوں نے رات کو سونا ترک کر دیا ہے، ہر شب چور دولتمندوں کے گھروں میں آ کے جو کچھ نقد جنس پاتے ہیں لے جاتے ہیں اور اربابِ پولیس سے کچھ تدارک اوس کا نہیں ہوسکتا، ظاہر چوروں سے سازش رکھتے ہیں وگرنہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شب بے سازش پاسبانوں اور ارباب پولیس کے چوری کرنے میں جرأت کرسکیں۔''

17 مئی کا اردو اخبار قندھار کی بدانتظامی کے بارے میں لکھتا ہے:

''وہاں کے خطوط سے دریافت ہوتا ہے کہ مابین قندھار اور کابل کے کئی ہفتوں سے راہِ آمد و رفت مسدود ہے۔ شاہ عالیجاہ شجاع الملک ماہ جولائی میں ارادہ جانے قندھار کا رکھتے ہیں۔ اس جگہ نرخ غلہ بہت گراں ہے لیکن توقع ہے کہ یہ فصل بہت خوب ہووے۔ شرابیں وغیرہ اسباب انگریزی یہاں بہت کم بہم پہونچتا ہے اور باعث یہ ہے کہ بباعث بے انتظامی راہ اور خوف لٹ جانے کے کوئی سوداگر اسباب نہیں لے جاتا۔''

دہلی اردو اخبار مندرجہ ذیل اخباروں سے خبریں اخذ کرتا تھا:

اخبار لدھیانہ، زبدۃ الاخبار، اخبار الکبیر، آگرہ اخبار، سماچار درپن، جامِ جہاں نما، آئینہ سکندر، اور اس میں بہت سلیقہ برتتا تھا۔ کئی جگہ اس کا ذکر ہے کہ:

''باشندگان خیوا اکثر آدمیوں کو روسیوں میں سے، ساتھ تحریص و ترغیب اپنے ملک میں لاکر بہ تقریب غلاموں کے بیچ ڈالتے ہیں۔''

2 فروری 1840 کے اردو اخبار میں لکھا ہے:

''عرصہ ایک سال کا گزرتا ہے کہ ترکانِ جنگجو نے قریب دس ہزار آدمیوں کے جمع ہو کر اور متوطنانِ روس پر حملہ کر کے کئی ہزار لڑکے اور لڑکیوں کو مع عورتوں کے بطور قیدیوں کے اپنے ملکجی دماوی میں لے جا کر بطور غلاموں کے بیچ ڈالا۔ شاہِ روس نے مجرد سننے اس خبر کے والیٔ بخارا کو لکھا کہ اپنی رعایا کو اس کام سے باز رکھو۔ والیٔ بخارا نے جواب میں لکھا کہ اکثر پرگنہ جات کوہستان ہمارے علاقے سے خارج ہیں اور قدیم سے بردہ فروشی ان کا پیشہ ہے۔''

دہلی اردو اخبار میں حضور والا کے عنوان سے بہادر شاہ ظفر، ان کے خاندان اور قلعہ معلّٰی کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ان خبروں کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز روز بروز دخیل ہوتے جاتے تھے اور بادشاہ کو طرح طرح سے ذلیل کرتے تھے۔

9 فروری 1840 کے اردو اخبار میں لکھا ہے:

''مرزا شاہرخ نے عرض کی کہ صاحب سکرتر بہادر بابت پیشکش حضور والا کے پچاس ہزار روپیہ نقد اور پچاس ہزار روپے کی اٹھنیاں دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ صاحب کلاں بہادر اور صاحب سکرتر بہادر کے نام شقہ جاوے کہ مابدولت کو اٹھانیاں لینی منظور نہیں ہیں۔''

بادشاہ نے حکیم احسن اللہ خاں کو خطاب عنایت فرمایا۔ اس پر دہلی اردو اخبار رائے زنی کرتا ہے:

''حکیم احسن اللہ خاں کو خلعت چھ پارچہ کا تین رقم جواہر معہ خطاب عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ مرحمت ہوا اور حکیم مذکور بجائے حکیم شرف الدین خاں کے واسطے خاص... حضور والا کے سرفراز ہوئے۔ کہتے ہیں کہ حکمائے ہندوستان میں یہ حکیم بہت تیز ذہن اور سلیم الطبع تجربہ کار ہیں۔ پہلے دائی جھجر کے وہاں تھے۔ وہاں ان کا بہت اعتماد تھا لیکن ایک ظریف نے بطور ظرافت یوں بیان کیا کہ تذکار عمدگی حکمت اور حذاقت اور اعتماد جو خطاب میں مفہوم ہوتا ہے یہ تو مطابقت ظاہر ہے مگر بہادری اور ثبوت جنگ کا ثبوت نہیں معلوم، صرف

وزن شعر ہے یا یہ کہ المعنی فی بطن الشاعر کہا چاہئے۔ ظاہر حال میں تو یہ امر وضع الشی علی غیر محلہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اور محاسن متعلقہ طبابت جو کہیے سو اس شخص کے حق میں بجا ہیں لیکن یہ ظرافت اون ظریف کی فراخ حوصلگی اور علو ظرافت سے باہر معلوم ہوتی ہے۔ اول تو یہ عنایات شاہانہ ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ مخاطب خطاب بہ جمیع الفاظ حرفاً حرفاً مطابق واقع ہی ہووے، دوسرے محتمل کہ ایسا ہی واقع میں بھی ہووے۔ ثبوت اس کے خلاف کا بھی تو نہیں ہے اور تناسب بہادری اور جنگ واسطے حکیم کے کچھ ممنوع نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص بصفات متعددہ موصوف ہووے۔ اور علاوہ اس کے یہ بات کیا بہادری اور ثابت قدمی سے باہر ہے کہ حکیم قدیمی سالہائے سال کا جو مدت ہائے مدید سے مزاج داں حضور والا کا ہو، وہ پس پا ہو جاوے اور ماضی پڑے اور یہ شخص غالب آوے اور اس شخص کا غلبہ ہو۔"

دہلی اردو اخبار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ ہندوستانی جو نئی تعلیم سے بہرہ ور ہیں، وہ انگریزوں سے بہتر کام کر کے دکھاتے ہیں:

"ہندوستانی عملہ ناحق بدنام ہے۔ اگر ان کی تنخواہ بھی قرار واقعی ہو جاوے، اختیار ٹھہر جاوے مثل عملگان انگریزی کے موقوفی بحالی ان کی منحصر ہو حاکمان ذی اقتدار پر، نہ ہر ایک کلکٹر، مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹران نو آموز جواں عمروں پر، تو جو اوصاف انگریز لوگ انگریزوں کے بیان کرتے ہیں وہ انھیں ہندوستانیوں میں ظہور پکڑیں۔ دیکھو کہ صدر امینان اعلیٰ جو متصف ہیں ان باتوں سے جو کہ اوپر بیان کی گئیں، وہ کس دیانت سے نیک نامی سے کام کرتے ہیں اور کارگذاری اکثروں کی اس میں شک نہیں کہ بدرجہا فائق پائی جاتی ہے بہتیرے انگریزان ہیولیٰ صورت سے۔"

دہلی اردو اخبار کا انتخابی ذہن تھا اور وہ مغرب کی اچھی چیزوں کے خیر مقدم کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس نے مغربی طب کو مشرقی طب پر ترجیح دی ہے۔ 20 ستمبر 1840 کے اخبار میں ایک خط شائع ہوا ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں نے ایک مریض کا حال دیکھا کہ کوئی شخص دیکھنے والا اوس کو نہ کہتا تھا کہ یہ شخص جیتا رہے گا اور ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا، فوراً اچھا ہو گیا۔ مفصل حال اس کا یہ ہے کہ ایک غریب مفلس سا آدمی اچھا صحیح سالم بازار میں دیکھا کہ دفعتہً قریب ہلاکت کے ہو گیا۔ یکایک منہ سے کف جاری ہونے لگے۔ توقع اوس کی زندگی کی کسی کو نہ تھی، مردہ میں اور اس میں کوئی فرق نہ تھا اور پھر تحقیق ہوا کہ کوئی مرض مثل صرع وغیرہ پہلے سے بھی اوسے نہ تھا، تھانے دار نے فوراً اوس کو ڈاکٹر صاحب کے پاس جو اسپتال سرکاری میں علاج کرتے ہیں، پہونچایا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اوس کی فصد کی، بمجرد فصد کے اوس نے آنکھیں کھول دیں اور بات چیت کرنے لگا۔ پھر اور دوا بمقتضائے مصلحتِ وقت جو مناسب جانی، ڈاکٹر صاحب نے اوسے دی، غرض وہ مریض اچھا ہو گیا۔ اب موجود ہے۔ الحاصل کہ ہر چند زندگی اور موت خدا کے اختیار ہے لیکن اگر اس مریض کی اجل پہونچی ہوتی تو کسی ہندوستانی طبیب صاحب کے ہاتھ پڑتا، وہ پنڈول سونگھاتے، لخلخہ بنواتے کیوڑہ گلاب پلاتے اور جو قرابادین وشفا میں واسطے ظاہر ہونے ایسی علامتوں کے لکھا ہوتا عمل میں لاتے۔ ایک گھڑی بھر میں مریض کو عقوبات دنیاوی سے چھڑا دیتے۔"

اس اخبار سے مغلوں کے آخری دور کی تمدنی زندگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ 19 اپریل کا اردو اخبار رقم طراز ہے:

"واضح ہوتا ہے کہ بابو گور چرن نامی ایک شخص ہیں اور موری میں کہ متصل اندول کے واقع ہے رہتے ہیں سو انھوں نے شرادا اپنی والدہ مرحومہ کا بڑی دھوم دھام سے کیا۔ قریب سولہ ہزار روپیہ کے انٹھیاں اور چونیاں فقیروں اور محتاجوں کو تقسیم کیں۔ قصہ کوتاہ بہ تحقیق دریافت... قریب پچاس ہزار روپیہ کے اس کار دھرم میں صرف کئے۔"

24 مئی 1840 کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"آرائش محل بیگم صاحبہ اب تک بدستور بیمار ہیں۔ معالجہ بطور اطبا کے ہوتا ہے، صدہا ملانوں اور مشائخوں کو کھانا کھلایا گیا اور بہت سا چاندی سونا اور لوہا اور ست نجا اور گاؤ میش اور مادہ گاؤ سیاہ وغیرہ حیوانات اور اجناس واقمشں خیرات کئے گئے مگر کچھ تخفیف اور فائدہ متصور نہیں ہوتا۔"

31 مئی کے اخبار میں فرزند تولد ہونے کی رسم ملاحظہ ہو:

"عرض ہوئی کہ مرزا شاہرخ کے گھر میں فرزند پیدا ہوا، حضور انور نے گیارہ کشتیاں پارچہ پوشا کی اور دو سو پچاس روپیہ نقد واسطے فرزند موصوف اور اس کی والدہ کے مرحمت کئے اور داروغہ توشک خانہ کو حکم ہوا کہ ایک جوڑا زنانہ واسطے بیگم صاحبہ کے اور پانچ جوڑے معہ دوسہرہ مقیشی کے واسطے اون کے فرزند کو بھیج دو۔

26 تاریخ ماہ مذکور کو مرزا شاہرخ کے ہاں تشریف لے جا کر

بتقریب تولد فرزند رقص طوائف کا ملاحظہ فرمایا۔ مرزائے موصوف نے گیارہ خوان بن سپاری کے نذر گزارے۔''

لیکن اقتصادی بے چینی روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی جس میں انگریزوں کی پالیسی کو بڑا دخل تھا۔ یکم مارچ 1840 کا اردو اخبار کٹک کے بارے میں لکھتا ہے:

''ایک خط اوس سمت کے سے واضح ہوتا ہے کہ بسبب کمی بارش کے وہاں قحط غلہ ہو رہا ہے اور ہزار ہا آدمی طعمۂ اجل ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں اور علاوہ ازیں چیچک اور وبائے ہیضہ اور تپ غارت باشندوں میں کمی نہیں کرتا اور بہت خلقت مرتی جاتی ہے۔''

یہی اخبار آگے چل کر اوڑیسہ کا حال بیان کرتا ہے:

''ازروئے خط ایک دوست کے دریافت ہوتا ہے کہ بسبب قحط غلہ کے وہاں کے غریب غربا نے پیشہ غارتگری اور راہ زنی کا اختیار کیا ہے اور زیادہ تر ظلم یہ ہے کہ جس کو لوٹتے ہیں اوسے جان سے بھی ہلاک کرتے ہیں اور یہ حال بلاسور سے پوری تک ہے اور ایسے مقامات میں جہاں آمد و رفت کم ہے۔''

17 مئی کا اخبار آگرہ کی گرانی کے بارے میں لکھتا ہے:

''پیشتر یہاں کے لوگوں کو امید قوی تھی کہ غلہ ارزاں ہو جاوے گا لیکن خلاف قیاس وتوقع وقوع میں آیا۔ یعنی نرخ غلہ روز بروز گراں ہوتا جاتا ہے اور دو ہفتہ سے وبائی ہیضہ بھی جاری ہے چنانچہ کئی آدمی اس اثنا میں مر گئے، بھیڑیوں کا اس جگہ پر غلبہ ہے اگرچہ زمانِ حال میں کسی لڑکے بالے کو نہیں لے گئے ہیں مگر راتوں کو گرد و نواح میں چھاؤنی اور شہر کے چلاتے پھرتے ہیں۔''

اقتصادی بدحالی کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے ہندو مسلمانوں اور شیعہ سنیوں میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی اور کئی جگہ فسادات بھی ہوئے جن کی تفصیل دہلی اردو اخبار میں درج ہے۔ ان اخباروں کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمانہ قطعی طور پر زوال اور انحطاط کا نہیں تھا۔ سیاسی زوال کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں انصاف، بہادری، غیرت و حمیت، رعایا پروری، ادب نوازی کی صدہا مثالیں مل جاتی ہیں۔

31 مئی کا اردو اخبار لکھتا ہے:

''خوش خبری ہووے محتاج معافی داران دس بیگھہ یا کم دس بیگھ زمین والوں کو کہ صدائے مظلومیہ ان مظلوموں کی، حاکمان با انصاف کے کان میں پہنچی اور اثر پذیر ہوئی۔ ان حضرات کی رائے اور فہمید اور کوشش کا حال تو معلوم، جیسی ان کی عقل ہے پیشتر لکھا گیا، لیکن یہ صرف اثر ہمت ہے اون رحم دلوں کا جنہوں نے سرکار کے گوش زد کیا اس ظلم کو، اور سرکار نے رحم کیا۔''

20 دسمبر کا اردو اخبار لکھتا ہے:

''اخبار سے دریافت ہوتا ہے کہ ان دنوں بعلت کثرت مریضوں کے طبیب لوگ معالجے اور مداوا سے ان کے بہ تنگ آگئے ہیں اور فرصت دم لینے کی نہیں رکھتے اس لئے پیش گاہ ارباب کونسل سے یہ ایما ہوا ہے کہ ایک دار الشفا اور اٹاراو چیت پور میں تعمیر کریں اور وہاں طبیب مقرر کئے جاویں۔

اون صاحبوں نے جن سے کہ کام مدرسوں کا تعلق رکھتا ہے حضور ارباب گورنمنٹ میں درخواست کی ہے کہ لاکھ روپے سالیانہ جو کہ واسطے مصارف مدرسوں کے ملتا ہے اکتفا نہیں کرتا۔ اگر دو لاکھ روپیہ مرحمت ہوا کریں تو ارباب مدارس کو فارغبالی حاصل ہووے، سو درخواست مذکور واسطے منظوری کے گئی ہے۔''

29 مارچ کا اردو اخبار مراد آباد کے بارے میں لکھتا ہے:

''ایک دوست کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں سے دس کوس کے فاصلے پر ایک مقام ہے اس کا نام ہے امروہہ، اب کے عشرۂ محرم میں وہاں بہت شہرہ تھا کہ دنگہ فساد قرار واقعی ہووے اس واسطے کہ وہاں مولوی سعادت نامی ایک صاحب ہیں پیش نماز شیعہ مذہب، سو گروہ اہل سنت جماعت نے قصد فساد کا اون سے کیا تھا اور مستعد فساد کے ہوئے تھے لیکن صاحب مجسٹریٹ اور اسسٹنٹ مجسٹریٹ عشرۂ محرم میں خود امروہہ میں گئے اور اس طرح کا انتظام کیا کہ بسبب حسن انتظام اون کے شعلہ فساد اوٹھنے نہ پایا اور امن رہا... کہتے ہیں کہ صاحب مجسٹریٹ اور اسسٹنٹ وہاں کے بہت مستعد اور انصاف دوست ہیں۔''

مسٹر ٹن راجن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ 1844 سے 1848 کے درمیانی عرصہ میں دہلی اردو اخبار کی اشاعت 69 سے 79 تک پہنچ گئی تھی۔ جو اس زمانہ میں جبکہ لاکھوں کروڑوں کی بات کی جاتی ہے عجیب معلوم ہوتی ہے۔

سرکاری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یہ اخبار اپنے مخالفوں کے خلاف بھی لکھتا ہے اور ان معزز دیسی شرفا پر ذاتی حملے کرتا ہے جو اس کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں۔ تاہم اس کو موجودہ زمانے کے صحافی نقطۂ نظر سے جانچنا غلط ہوگا۔ اس کی پوری تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ دہلی اردو اخبار نے نہ صرف اردو صحافت میں بلکہ جہادِ آزادی میں بڑا حصہ لیا ہے۔ (15 اگست 1972)

OO

تحقیق و تجزیہ

1857 اور اردو اخبارات

مودود صدیقی

اخبارات نے ہمیں مسائل پر سوچنا، اور لکھنا سکھایا۔ علم و ادب، تاریخ و تہذیب، مذہب و معاشرت، سیاست، قانون اور ضوابط کون سا ایسا پہلو تھا جس پر اخبارات نے قلم نہیں اٹھایا۔ اخبارات کے وجود میں آنے سے پہلے اردو ادب کا تعلق دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد اور کلکتہ جیسے مرکزی شہروں تک تھا۔ اخبارات نے ادب کو ملک گیر بنادیا اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں بہت سے لکھنے اور پڑھنے والے پیدا کئے۔ زیر نظر مقالہ آغاز سے 1857 تک نکلنے والے اردو اخبارات تک محدود ہے۔

آج اردو صحافت کو وجود میں آئے 184 برس ہوگئے ہیں۔ اس مدت میں اردو صحافت نے ہندوستانی سماج کی تعمیر میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو اخبارات ملک میں شائع ہونے والے تمام زبانوں کے اخبارات کے مقابلہ میں سب سے آگے تھے۔ ان پر برطانوی حکومت نے پابندیاں عائد کیں، ضمانتیں ضبط ہوئیں اور مدیروں کو باغیانہ تحریروں کے جرم میں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے باوجود انہوں نے سامراجی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تحریک آزادی میں ہراول دستے کا کام کیا۔

پہلی جنگ آزادی سے پہلے شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف عوام میں جذبات بھڑکے تو اردو اخبارات نے ہوادی اور برطانوی سرکار کے خلاف خبریں اور مواد شائع کیے۔ اردو اخبارات کے اس رویہ پر انگریزی اخبارات نے ان کے خلاف لکھنا شروع کیا کہ "اردو اخبارات نفرت اور بغاوت پھیلا رہے ہیں" چنانچہ 1857 میں اُن پر سخت پابندیاں عائد کردی گئیں اور بہت سے اخبارات بند ہوگئے۔ اس دوران کلکتہ سے 1857 کے بعد اردو کا پہلا روزنامہ 'اردو گائڈ' اور دوسرا 'روزنامہ

■

پریس ایکٹ کے نفاذ کے بعد جو اخبارات انگریز سرکار پر نکتہ چینی کرتے تھے یا مجاہدین آزادی کی حمایت میں مضامین اور خبریں شائع کرتے تھے ان پر مقدمات قائم کئے گئے، پریس ضبط کئے گئے، گرفتاریاں ہوئیں، دفتروں پر چھاپے مارے گئے۔ یہ برطانوی تانا شاہی ایکٹ آج سے 140 سال قبل 1867 میں نافذ کیا گیا تھا۔ آج وہی ایکٹ جمہوری ہندوستان میں آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی جوں کا توں برقرار ہے۔ چنانچہ جمہوری ہندوستان کے علاوہ دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں ایسی مثال نہیں ملے گی کہ پریس پولس محکمہ کے دست نگر ہو!

■

پنجاب' لاہور سے شائع ہوا۔

فروری 1785 میں پہلی بار اخبارات کے لئے ضابطے وضع کیے گئے۔
مئی 1799 میں اخبارات پر سینسر لگایا گیا اور چار ضابطے طے کیے گئے۔
1811 میں سینسر شپ کے لئے نیا قانون بنایا گیا۔ 1818 میں اس قانون کے ضابطوں کو مزید سخت کیا گیا۔

اس کے بعد 1823 میں برطانوی پارلیمنٹ سے نیا قانون پاس ہوا جس میں سرکاری اجازت کے بغیر اخبار نکالنے پر پابندی تھی۔ 1835 میں پُرانا قانون رد کرکے نیا قانون نافذ کیا گیا۔ 1857 تک اسی قانون پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ اسی دوران جون 1857 میں ہی کچھ ترمیم کے ساتھ نیا پریس ایکٹ لاگو کیا گیا۔ اس کے بعد 1867 میں ایک مربوط پریس ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس میں باضابطہ طور پر اخبارات کو محکمہ پولیس کے تحت کر دیا گیا۔ یہ محکمہ ہی ٹائٹل کی تصدیق کرنے اور ڈکلریشن داخل کرنے کے بعد اخبار شائع کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ اس طرح انگریز سامراج نے مکمل طور پر اخبارات پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد جو اخبارات انگریز سرکار پر نکتہ چینی کرتے تھے یا مجاہدین آزادی کی حمایت میں مضامین اور خبریں شائع کرتے تھے ان پر مقدمات قائم کئے گئے، پریس ضبط کئے گئے۔ گرفتاریاں ہوئیں، دفتروں پر چھاپے مارے گئے۔ اس طرح بے باک اور نڈر اخبارات پر پولیس کی زیادتیاں بڑھتی چلی گئیں۔ عہد غلامی میں اخبارات کی آواز کو دبانے والا برطانوی تاناشاہی ایکٹ آج سے 140 سال قبل 1867 میں نافذ کیا گیا تھا۔ آج وہی ایکٹ جمہوری ہندوستان میں آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی جوں کا توں برقرار ہے۔ دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں ایسی مثال نہیں ملے گی کہ پریس پولس محکمہ کے دست نگر ہو۔

برطانوی سرکار نے اپنے جابرانہ مقصد کے لئے اس ایکٹ کو پولیس محکمہ کے تحت کر دیا تھا۔ لیکن آج ساٹھ سال سے ہماری جمہوری سرکار اسے جوں کا توں جاری رکھ کر کون سے مقصد کی تکمیل کر رہی ہے؟ بنیادی طور پر یہ بات درست ہے کہ ملک وسماج دشمن مواد کو شائع کرنے سے روکنے یا چیک کرنے کی ذمہ داری سرکار کی ہوتی ہے۔

لیکن اس ایکٹ کے تحت ہر ضلع اور ہر ریاست میں 'اسٹیٹ پریس آفیسر' ہوتا ہے۔ جس کی ذمہ داری ایسے مواد پر نگرانی کرنا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اخبار کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لئے پولیس کی مدد لے سکتا ہے۔ 1976 میں ایمرجنسی کے دوران پریس پر جو سنسر لگایا گیا تھا اسے پولیس نہیں بلکہ یہی پریس آفیسرز چیک کر کے اشاعت کی منظوری دیتے تھے۔

آج کوئی نیا اخبار نکالنے کے لئے سب سے پہلے ٹائٹل (نام) حاصل کرنے کا فارم پولیس محکمہ میں داخل کرنا ہوتا ہے۔ پولیس محکمہ یہ فارم تصدیق کے لئے رجسٹرار آف نیوز پیپرز کو روانہ کر دیتا ہے۔ رجسٹرار آفس ٹائٹل کی منظوری کی اطلاع براہ راست درخواست کنندہ کو دیتا ہے (پولیس محکمہ کو نہیں) اس کے بعد پولس محکمہ سے ڈکلریشن داخل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اخبار نکالا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس محکمہ کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر آپ ریوائز ڈکلریشن داخل کرنے دوبارہ اس محکمہ میں جائیں گے تو آپ کے اخبار سے متعلق کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہوگا بلکہ اپنے سابقہ ڈکلریشن کو دکھا کر آپ ریوائز ڈکلریشن داخل کر سکیں گے۔

پریس ایکٹ میں پولیس کی دراندازی آج کے جمہوری دور میں غیر ضروری ہے۔ اس ایکٹ میں ترمیم وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ ہندوستانی آئین میں ایک سو سے زائد ترامیم ہو چکی ہیں لہٰذا اس میں ترمیم کر کے اور پولس کی دخل اندازی کو ختم کر کے اسٹیٹ پریس آفیسر کے اختیارات میں اضافہ کیا جانا چاہئے۔ یہی آفیسر ٹائٹل کے لئے فارم اور ڈکلریشن لینے کا مجاز ہو اور ضرورت پڑنے پر ہی کسی بھی اخبار میں چھپے قابل اعتراض مضامین کے خلاف پولس میں شکایت درج کرا سکے۔

ہمارے ملک میں پریس کی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے۔ آج پریس کو بجا طور پر عوام میں مقبولیت حاصل ہے اور یہ جمہوریت کا چوتھا ستون مانا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کو مزید باوقار مقام دلانے کے لئے سرکار اور ممبران پارلیمنٹ پریس ایکٹ میں ترمیم کرنے کی جانب مؤثر قدم اٹھائیں۔ میں اس سلسلہ میں ملک کے تمام صحافیوں سے اپیل کروں گا کہ وہ اس ترمیم کے لئے سرکار پر دباؤ ڈالیں۔

اس ضمنی گزارش کے بعد آمدم برسر مطلب!

1830 میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کے بعد اخباروں کو شائع کرنے کے لئے کچھ ادارے اور انجمنیں سامنے آئیں اور 1835 میں اخبارات شائع کرنے کی سرکاری اجازت دی گئی۔

اردو صحافت پر پہلی کتاب 'اختر شہنشاہی' 1888 میں شائع ہوئی۔

ہندوستان میں صحافت کا آغاز 1780 میں کلکتہ میں جیمس آگسٹس ہکی کے انگریزی ہفت روزہ اخبار 'ہکیز بنگالی گزٹ' سے ہوا۔ یہ ملک کا سب سے پہلا اخبار تھا دوسرے نمبر پر بنگالی زبان کا اخبار 'بنگال گزٹ' آتا ہے جو

1816 میں کلکتہ سے شائع ہوا، تیسرے نمبر پر اردو کا اخبار 'جام جہاں نما' ہے جو 1823 میں شائع ہوا۔ بعض صحافیوں نے اس کے اجرا کا سن 1822 تحریر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ 'جام جہاں نما' مئی 1822 میں صرف فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایک سال بعد اپریل 1823 میں اس میں اردو کے چار صفحات بطور ضمیمہ شائع ہونا شروع ہوئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آغاز صحافت میں اردو اخبارات کا تیسرا نمبر تھا۔ آج بھی یہ تعداد کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آج نمبر دو پر بنگلہ زبان کے نہیں بلکہ ہندی اخبارات ہیں۔

1823 سے 1857 تک اُردو میں صرف 122 اخبارات شائع ہونے کا سرکاری ریکارڈ ہے۔ 1857 میں صرف چوبیس اخبارات شائع ہوتے تھے، باقی بند ہو چکے تھے۔ پہلی جنگ آزادی کی تحریک 1857 کی ناکامی کے بعد 1858 سے 1900 تک چار سو سے زائد اردو اخبارات وجود میں آئے۔ انیسویں صدی میں شائع ہونے والے بیشتر اخبارات کی اشاعت 50 سے 250 کاپیوں تک محدود تھی۔ 1857 سے پہلے شائع ہونے والے اخبارات کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ انگریزی سرکاران کی اشاعت کا تقریباً نصف حصہ لائبریریوں اور تحصیلوں کے لئے خریدتی تھی۔ اس لئے اس دوران شائع ہونے والے اخبارات صرف معلومات اور اعلانات شائع کرنے تک محدود تھے۔ بلکہ بعض اخبارات تو برطانوی افسران کی ایما پر شائع کئے گئے۔ مدیران بھی مصلحت پسندی سے کام لیتے تھے۔ 1823 سے 1900 تک شائع ہونے والے تقریباً 25 فی صد اردو اخبارات کے مالک ہندو تھے۔ قارئین میں بھی ہندو پڑھنے والوں کی تعداد 25 سے 60 فیصد تک تھی۔

فرنگیوں کے خلاف ہندوستانی عوام میں جو بے چینی پائی جاتی تھی، اسے اس وقت کے بیشتر اخبارات کسی نہ کسی شکل میں شائع کر دیا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1857 میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو 'دہلی اردو اخبار'، 'صادق الاخبار' دہلی، 'گلشن نو بہار' کلکتہ، 'سلطان الاخبار' کلکتہ، 'حبیب الاخبار' بدایوں اور 'عمدۃ الاخبار' بریلی نے نمایاں طور پر سرگرم حصہ لیا۔ جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں، پر جوش و ولولہ انگیز باغیانہ مضامین شائع کئے جانے لگے۔ کونے کونے سے مجاہدین آزادی کا آنا اور ان کے جنگی اور بہادرانہ کارناموں کا ذکر تفصیل سے کیا جاتا تھا اور بتایا جاتا تھا کہ فلاں فلاں مقابلہ پر انگریزی فوجوں نے مجاہدین کو شہید کر دیا یا مجاہدین نے انگریزی فوجوں کو کتنا نقصان پہنچایا۔ دہلی میں بغاوت کے پہلے دن مجاہدین نے انگریزوں پر حملہ کیا۔ قتل و غارت گری ہوئی۔ اس روز کی کارروائی 'دہلی اردو اخبار' میں اس انداز سے شائع ہوئی ہے جیسے کہ ایڈیٹر اس کو لکھنے کے لئے عرصہ سے تیار بیٹھا تھا۔

1823 سے 1857 تک شائع ہونے والے اردو اخبارات گو کہ برطانوی سرپرستی میں نکلتے تھے اور اس کی بیشتر کاپیاں برطانوی سرکار خود خریدتی تھی لیکن پہلی جنگ آزادی کا شعلہ جب بھڑکا تو ان ہی اخبارات نے نہ صرف انگریزوں کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی بلکہ انقلابیوں کو اپنی تحریروں کے ذریعہ توانائی فراہم کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ جواب میں برطانوی حکومت نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی شروع کی جن کی تفصیل اختصار کے ساتھ پیش ہے:

صدر الاخبار، آگرہ

یہ قلعہ معلی اور انگریزی سرکار کی خبروں تک محدود تھا۔

سلطان الاخبار، کلکتہ

1857 کی پہلی جنگ آزادی کی خبریں شائع کرنے پر اس پر مقدمہ چلایا گیا اور سزا کے طور پر پریس ضبط کیا گیا۔

گلشن نو بہار، کلکتہ

اس اخبار میں جہادیوں کی خبریں نمایاں طور پر شائع کی جاتی تھیں۔ آزادی کے حق میں آواز بلند کرنے پر پریس پر چھاپا مارا گیا اور پریس ضبط کیا گیا۔

عمدۃ الاخبار (فتح الاخبار)، ممبئی و بریلی

یہ اخبار بریلی اور ممبئی سے ایک ساتھ شائع ہوتا تھا۔ روہیل کھنڈ کے باغیوں، قائد خان بہادر خاں وغیرہ کی حمایت میں مضامین شائع کرنے پر اس کے مدیر کو سزا ہوئی، اور پریس ضبط کیا گیا۔ اس کے بعد مدیر موصوف نے اخبار کا نام بدل کر 'فتح الاخبار' کے نام سے نیا اخبار نکالا اور آزادی کی حمایت میں خبریں شائع کیں۔

حبیب الاخبار، بدایوں

مجاہدین آزادی کی خبریں شائع کرنے پر اس کے مدیر کو سزا ہوئی اور پریس ضبط کیا گیا۔

خیر خواہ ہند، مراد پور

1857 کی جنگ آزادی کے دوران یہ اخبار بند ہو گیا اور اس کا پریس باغیوں نے جلا ڈالا لیکن از سر نو انگریزی راج قائم ہونے پر دوبارہ شائع ہوا۔

نور الابصار، الہ آباد

1852 میں یہ آگرہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس کی صرف 200 کاپیاں

چھپتی تھیں۔ اسے عوامی حمایت حاصل نہیں تھی۔

ترجمانِ شوق

سکندر آفندی جو 66-1865 میں ہندوستان آئے اور ان کا بیشتر وقت دہلی اور لکھنؤ میں گزرا، انہوں نے 1857 کی جنگ آزادی کے بارے میں جو کچھ سنا اور بربادی وتباہی کے جو مناظر دیکھے ان کو قسط وار 'ترجمانِ شوق' میں شائع کیا۔ یہ اخبار مسلم ممالک میں کافی پڑھا جاتا تھا۔ بعد کو برطانوی سرکار نے اس پر پابندی عائد کردی۔

تاریخ بغاوت ہند، آگرہ

1859 میں آگرہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں 1857 میں رونما ہونے والے ہولناک واقعات چار سال تک قسطوں میں شائع ہوئے جن سے اس تحریک کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔

کریم الاخبار، دہلی

اسے مولوی کریم الدین نکالتے تھے۔ یہ قلعہ کی اندرونی نقل وحرکت کی خبریں اور ان پر تبصرہ شائع کرتا تھا۔

کوہ نور، لاہور

1850 میں منشی ہرسکھ لال کی ادارت میں یہ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ آزادی کی تحریک کے زمانے میں انگریزی سرکار کی حمایت تو کرتا تھا۔ لیکن ملک میں ہونے والے معرکوں، مجاہدین آزادی کی پکڑ دھکڑ، املاک کی ضبطی، مقدمات اور سزاؤں کی خبریں بڑی تفصیل سے شائع کرتا تھا۔ جس سے عام حالات کا علم قدرے مفصل معلوم ہوجاتا تھا، جو آزادی کی تحریک کے بعد کی تاریخ کا بڑا سرچشمہ ہیں۔ بعد میں ہرسکھ لال جی نے پالیسی سے اتفاق نہ کرتے ہوئے ادارت سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنا ایک حریت پسند اخبار انگریز سرکار کی مخالفت میں نکالا۔ گرفتار ہوئے اور سزا ہوئی۔

طلسم لکھنؤ، لکھنؤ

واجد علی شاہ کی معزولی کے وقت 'طلسمِ لکھنؤ' نے اپنی ایک اشاعت میں لکھا:

> ''...زمانہ کی گردش نے عجیب ویرانی دکھائی، تمام خلقت کو رقت تھی، یہ حیرانی دیکھ کر حسرت تھی، دیکھنے والوں کا دل کڑھتا تھا، مگر کیا ہوسکتا تھا، شاہی خاندان کے لوگوں اور وظیفہ داروں کے ساتھ بے تمیزی کا برتاؤ کیا گیا۔ وظائف روک دیئے جانے سے ان کا حال پتلا ہوگیا...''

آفتاب ہند، بنارس

اُس دور کے شائع ہونے والے اخبارات سے مختلف تھا۔ انگریزی سرکار کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا اگر کوئی موقع ملتا تو اُسے احتیاط سے شائع کیا جاتا۔

صادق الاخبار، دہلی

یہ اخبار تندوتیز اور انگریز دشمن تھا۔ اس کے مدیر سید جمیل الدین تھے۔ اسی اخبار کو بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ ایک سرکاری گواہ چنی لال کے بیان کے مطابق ...''یہ دہلی کا منہ زور اخبار تھا اور شہر کے تمام طبقوں میں مقبول تھا۔'' مولوی ذکا اللہ کے بیان کے مطابق بغاوت پھیلانے کے الزام میں سید جمیل الدین کو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

دہلی اُردو اخبار، دہلی

1836 میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے اس اخبار کا اجرا کیا۔ پہلی جنگ آزادی کے آغاز تک اس کا انداز امن پسندانہ تھا۔ بغاوت کے دو ماہ بعد اس کا نام بدل کر 'اخبار الظفر' رکھ دیا گیا۔ مولانا محمد باقر ایک آزاد خیال، خود دار، حق گو صحافی تھے۔ صحافت کا جو اعلیٰ معیار انہوں نے قائم کیا وہ اور جگہ کم نظر آتا ہے۔ یہ اخبار پولیس حکام اور ریاستوں کی بدنظمی پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس میں لال قلعہ کی خبروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔

18 مئی 1857 کے شمارے میں شائع ہوا ہے:

> ''رسالہ ترک سواران غازی کا اور پلٹن نام پہلے سے برسر پرخاش تھی اور ان سے بابت کارتوس کے کہ چربی اور جھلی وغیرہ اس پر منڈھی ہوئی ہے۔ مثل پلٹن مقامات دیگر حسب مندرجہ اخبار سابق تکرار درپیش تھی کہ انجام کو، بجرم انکار 85 سوار اس میں سے قید ہوئے کہ یوم یکشنبہ حمیت دینی اور حمایت مذہبی نے جوش کیا اور دفعتاً تمام اہل پلٹن اور رسالہ جو شخص جس حال میں تھا ہتھیار سنبھال کر اول جیل خانہ سے اپنے برادرانِ اسلامی کو چھڑا لائے اور مع پلٹن درپے انگریزوں اور گوروں کے ہوئے۔''

24 مئی 1857 کے شمارے میں چھپا ہے۔

> ''بلند شہر میں بھی سنا ہے کہ سپاہ نے انگریزوں کو مارڈالا جو کوئی قسمت سے بھاگ گیا سو بھاگ گیا۔ باقی سب مارے گئے قیدی جیل خانہ کے تمام چھوٹ گئے اور کوٹھیاں انگریزوں کی تباہ

وبرباد ہوئیں۔''

اسی زمانے میں ایک اپیل بھی اس اخبار میں شائع ہوئی کہ:

''ہندو، مسلمان متحد ہو کر جان کی بازی لگادو اور مجاہدانہ شان سے انگریزوں کا خاتمہ کرو۔''

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی مخالفت اور جہاد آزادی کی حمایت کرنے کی پاداش میں یہ شہید کردیے گئے۔ حق کی راہ میں جان دینے والے وہ پہلے اردو صحافی تھے۔ ان کی تحریروں نے فرنگی راج کے خلاف 1857 کی پہلی آزادی کی تحریک کے لئے راہیں ہموار کیں۔ ستمبر 1857 میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

1823 سے 1857 تک سن وار جن اخبارات کی اشاعت عمل میں آئی اُس کی تفصیل پیش ہے۔

1	1823
1	1836
2	1837
1	1842
1	1843
6	1845
3	1846
11	1847
5	1848
14	1849
8	1850
10	1851
10	1852
9	1853
11	1854
8	1855
14	1856
7	1857
کل تعداد	122

1823 سے 1857 تک جن شہروں سے اردو اخبارات شائع ہوئے ان کی شہروار تفصیل بھی پیش ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اُس دور میں اردو اخبارات کی اشاعت میں آگرہ سب سے آگے تھا اور آج میرے خیال میں وہاں سے اردو کا کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا۔

آگرہ	18
دہلی	14
کلکتہ	10
بنارس	10
نامعلوم	8
لکھنؤ	7
مدراس	7
لاہور	6
بمبئی	5
سیالکوٹ	5
میرٹھ	3
ملتان	3
پشاور	3
لدھیانہ	2
گوالیار	2
آرہ	2
مرادپور	1
بریلی	1
بھوپال	1
اندور	1
بدایوں	1
گجرانوالہ	1
بھرت پور	1
الہ آباد	1
راولپنڈی	1
کراچی	1
شاہ جہاں پور	1
گجرات	1
گیا	1
سورت	1

رامپور	1
علی گڑھ	1
بٹالہ	1
کل تعداد	122

1823 سے 1857 تک جن اردو اخبارات کی اشاعت عمل میں آئی ان کی تفصیل بھی پیش ہے۔ یہ تفصیل حاصل کرنے کے لئے میں نے نیشنل آرکائیوز، لائبریریوں اور اردو صحافت کے موضوع پر شائع ہونے والی تقریباً 27 کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

جام جہاں نما (کلکتہ)، دہلی اردو اخبار (دہلی)، سید الاخبار، خیر خواہ ہند (مراد پور)، مخزن الادویہ (کلکتہ) مظہر الحق (دہلی)، گل رعنا (دہلی)، بنارس گزٹ (بنارس)، خبر دہلی (دہلی)، کریم الاخبار (دہلی)، قران السعدین (دہلی)، فوائد الناظرین (دہلی)، صدرالاخبار، سلطان الاخبار (آگرہ)، فوائد الشائقین (دہلی) مدرسہ (آگرہ)، مفتاح الاخبار (میرٹھ) محبّ ہند (کلکتہ)، جام جمشید (میرٹھ)، جام جمشید (کلکتہ)، مراۃ الاخبار (کلکتہ)، خلاصۂ اطراف (دہلی)، لکھنؤ اخبار (لکھنؤ)، آئینہ گیتی نما (کلکتہ)، اسعد الاخبار (آگرہ)، مطلع الاخبار (آگرہ) معیار الشعرا (آگرہ) مراۃ العلوم (بنارس)، اعظم الاخبار (مدراس)، مجمع الاخبار (بمبئی)، آستانۂ حکمت عمدۃ الاخبار (بریلی)، اخبار الحقائق (آگرہ)، آفتاب عالم تاب (مدراس)، نزہت الارواح (آگرہ) اخبار النواح (آگرہ)، باغ و بہار (بنارس)، مجمع الاخبار (دہلی)، اخبار دہلی (دہلی)، بھوپال اخبار (بھوپال)، تعلیم الاخلاق، مالوہ اخبار (اندور)، بسیر الاخبار (مدراس)، گلزار ہمیشہ بہار (بنارس)، حبیب الاخبار (بدایوں)، دریائے نور (لدھیانہ)، زائرین ہند (بنارس)، گلزار پنجاب (گجرانوالہ)، خورشید عالم (سیالکوٹ)، ترجمان شوق، کوہ نور (لاہور)، محبوب ہند، دور بین (کلکتہ)، اخبار لکھنؤ (لکھنؤ)، تقویم ہندی (بنارس)، اخبار بمبئی (بمبئی)، زائرین ہند (بنارس)، بنارس ہر کارہ (بنارس)، مراۃ الخیال (کلکتہ)، انجمن آرا (کلکتہ)، دریائے نور (لاہور)، نور علی نور (لدھیانہ)، جام جہاں نما (میرٹھ)، گورنمنٹ گزٹ (آگرہ) قیصر الاخبار (مدراس)، مظہر السرور (بھرت پور)، گوالیار گزٹ (گوالیار)، وحید الاخبار (دہلی)، نور الاخبار (آگرہ) ریاض النور (ملتان)، جامع الاخبار (مدراس)، قطب الاخبار (آگرہ)، نور الابصار (الہ آباد)، مفاد ہند (بنارس)، نور الانوار (آرہ)، چشمۂ فیض (سیالکوٹ)، گوالیار اخبار (گوالیار)، نور الاخبار (آرہ)، شعاع شمس (ملتان)، ہمائے بے بہا (لاہور)، وکٹوریہ پیپر (سیالکوٹ)، صادق الاخبار (دہلی)، آفتاب ہند (بنارس)، گلشن نو بہار (کلکتہ)، کشف الاخبار (بمبئی)، خوش بہار (پشاور)، رفاہ خلائق (شاہ جہاں پور)، باغ نور، مطلع الانوار (گجرات)، معلم ہند (لاہور)، نیر اعظم (سیالکوٹ)، عمدۃ الاخبار (بمبئی)، عمدۃ الاخبار (سورت)، اخبار بہار، ریاض النور (ملتان)، کاشف الاسرار (بمبئی)، مرتضائی (پشاور)، مذاق (رامپور) فتح الاخبار (کول، علی گڑھ)، نیر اعظم (بٹالہ)، لاہور گزٹ (پشاور)، مفرح القلوب، مطلع خورشید ہند (کراچی)، تفریح الناظرین (آگرہ)، ویکلی رپورٹ (گیا)، معلم العلما (آگرہ)، معدن القوانین (آگرہ)، سہیل پنجاب (راولپنڈی)، اخبار مطبع پنجاب (لاہور)، طلسم لکھنؤ (لکھنؤ)، سحر سامری (لکھنؤ)، سفیر (آگرہ) مفید الخلائق (آگرہ)، مخزن الاخبار (لکھنؤ)، مظہر الاخبار (مدراس)، اعجاز (لکھنؤ)، چشمۂ خورشید (سیالکوٹ)، تاج الاخبار (لکھنؤ) اخبار الظفر (دہلی)، سفیر پنجاب (لاہور)، طلسم حیرت (مدراس)، تاریخ بغاوت ہند (آگرہ)

1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی نے جہاں ہندوستانیوں کو زندگی کے دوسرے میدانوں میں پست ہمت بنادیا تھا وہیں صحافیوں کو میدان صحافت میں بے دخل کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں، لیکن ان دشواریوں کے باوجود کسی نہ کسی طرح پرچم صحافت بلند رہا۔ فرنگیوں کے بے پناہ اور انسانیت سوز مظالم کے باعث دو، تین سال تک تو اردو صحافیوں کو ہوش نہ رہا، لیکن بڑی حکمت عملی سے اس سلسلے میں از سر نو جدوجہد کا آغاز کیا گیا۔ 1900 کے اختتام تک چار سو سے زائد اخبارات کا اجرا ہوا اور عوام نے ہر محاذ پر مستقبل کی آزادی کے لئے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

انیسویں صدی کے بیشتر اخبارات دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے، اور جو ہندوستان اور یورپ کے سرکاری کتب خانوں میں باقی بھی ہیں وہ اوراق پریشاں کی طرح منتشر اور گوشۂ گمنامی میں ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اب تک ان کا جائزہ لینے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کی گئیں کہ ہماری صحافتی تاریخ کے لئے یہ نادر شہ پارے کہاں ہیں اور آئندہ نسلوں کے لئے انہیں کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ تحقیق کرنے والوں کی بہت کم رسائی ان خزانوں تک ہو سکی ہے۔ راقم الحروف نے اس مضمون کی تیاری میں ہندو پاک میں صحافت پر شائع ہونے والی تقریباً 27 کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے مواد اور تاریخوں میں تضاد ہے۔ اگر صحت نے اجازت دی اور عمر نے وفا کی تو اس اہم اور تاریخی ذخیرہ کے بارے میں معتبر معلومات آپ تک پہونچانے کی کوشش کروں گا۔

OO

कौमी काउंसिल बराए फ़रोग़े-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/0 HRD, Dept. of Higher Education, Govt. of India

West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066. Ph. : 6109746, 6169416 Fax: 6108159 E-mail: urducoun@ndf.vsnl.net.in

قومی اردو کونسل کی چند نئی مطبوعات

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

"بحر الفصاحت" شعری ونثری اصناف کے معائب ومحاسن پر ایک جامع کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی تھی۔ پہلی جلد میں حقیقت شاعری، بحروں کی ترکیب وتشریح، علم قافیہ وردیف، فصاحت وبلاغت، علم معنی، مسند ومسند الیہ، متعلقات فعل، بیان قصر، انشا اور استفہام وغیرہ اور دوسری جلد میں جملوں میں فصل ووصل، ایجاز واطناب ومساوات، علم بیان، تشبیہات، استعارے، مجاز مرسل، کنائے، علم بدیع، صنائع لفظی، صنائع معنوی، اقسام نثر باعتبار الفاظ، باعتبار معنی، عیوب کلام وغیرہ شامل ہیں۔ کونسل کا یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے جس میں مطالعے کی سہولت کے لئے تعلیقات اور اشاریے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

صفحات - پہلی جلد - 821، دوسری جلد - 799

قیمت - پہلی جلد - 370، دوسری جلد - 360 روپے

ابن الوقت

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کا نام اردو ناول کے بنیاد گزار کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت، نوبل صاحب اور حجۃ الاسلام جیسے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے جو ایک عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ قومی اردو کونسل نے نہایت ہی اہتمام اور صحیح متن کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔

صفحات - 225

قیمت - 91 روپے

آزادی کی نظمیں

مرتب: سبط حسن

آزادی کی جدوجہد سے متعلق اردو ادب کی اشاعت قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کے تحت جاری ہے۔ "آزادی کی نظمیں" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار، دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں مرحوم رفیع احمد قدوائی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی تھی لیکن حکومت نے اسے ضبط کر لیا تھا۔ یہ مجموعہ محض نظموں کا مجموعہ نہیں بلکہ جدوجہد آزادی کی تاریخ بھی ہے۔ کتاب میں غالب، آزاد اور حالی سے لے کر اکبرالٰہ آبادی، رضا نقوی واہی اور علی سردار جعفری تک 38 شعرا کی نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت اور بازار میں عدم دستیابی کے پیش نظر کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات - 143

قیمت - 80 روپے

جامع التذکرہ (دو جلدوں میں)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

"جامع التذکرہ" دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال وکوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر وقیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کی دونوں جلدوں میں 1837 تک کے شاعروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں 1800 عیسوی تک کے شعرا اور دوسری جلد میں 1801 سے 1837 تک کے شعرا کے تذکرے حروف تہجی کے اعتبار سے شامل ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو فارسی تذکروں میں موجود مواد کو آسان اردو میں اختصار کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔

صفحات - پہلی جلد - 384، دوسری جلد - 679

قیمت - پہلی جلد - 140، دوسری جلد - 255 روپے

انقلاب - 1857

مرتب: پی سی جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دور رس اثرات مرتسم ہوئے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لئے یہ پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات پر اس کے اثرات کا ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں نے بھی جائزہ لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قومی بغاوت کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات - 359

قیمت - 75 روپے

آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب)

مرتبین: شمیم حنفی، مظہر مہدی

"آزادی کے بعد اردو نظم" آزادی کے بعد کی اردو نظموں کا ایک جامع انتخاب ہے جس میں 67 نمائندہ نظم نگاروں کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں پیش کی گئی ہیں اور فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ وتراکیب کے معنی بھی دے دیے گئے ہیں جن سے ہندی اردو کے قارئین ایک ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات - 758

قیمت - 384 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لئے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

ادارہ

اٹھارہ سو ستّاون

1857

فنونِ لطیفہ

موسیقی کا سفر

ہندوستانی سنگیت کا سُر سنسار

شہاب سرمدی

■

...سونے پر سہاگا یہ کہ غزل کے رسیا مسلمانوں نے آتے ہی یہاں کی دیسی بھاکھائیں اس طرح سیکھ لی تھیں کہ انہیں غزل کو لوک گیت سے بے تکلف بنانے میں کوئی تکلف نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاقائی لوک گیتوں کے بہت سے اسلوب غزل کی محفلوں میں دھومیں مچانے لگے۔ ان میں ہم کچھ ملتانی اور پنجاب کی کافی گجرات کی جھگری (جکری؟) پنجاب کا ٹپہ اور ماہیا، بنگال کا باؤل اور اودھ کی پوربی کے نام تو وثوق سے لے سکتے ہیں، ویسے ہماری تلاش جاری ہے اور امید ہے کہ وہ جسے امیر خسرو تلنگی، معبری اور دھور سمندری یا لاہوری، ڈوگری اور کشمیری کہتے ہیں ان کی گنگناہٹ بھی انہیں کے ساتھ سننے میں آسکے گی...

■

اودھی کہاوت ہے:

''تل آنکھ کا بھی، تل ٹھوڑی کا بھی لیکن وہ دیکھنے کا یہ دکھانے کا۔'' یہی حال سُر کا بھی ہے: سُر بولنے کا بھی سُر گانے کا بھی مگر اس میں صرف اونچ نیچ، اس میں ساتھ ساتھ اتار چڑھاؤ بھی۔ ہماری موسیقی نے اس نازک فرق کو (یعنی صرف اونچ نیچ اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ اونچ نیچ کے فرق کو) شروع ہی میں سمجھ لیا تھا اس لئے اسے نت نت نباہا اور جگ جگ برتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور تو اور سام وید کے جیسے مقدس منتروں کو بھی سُر اور لے کے ہاتھوں کچھ کا کچھ ہو جاتے دیکھا اور اسے ضروری اور جائز ہی نہیں پر لطف اور بامقصد قرار دیا۔ حتیٰ کہ یہی ہمارا اغنائی خاصہ بنتا گیا اور جب اپ ویدوں تک بات پہنچی اور اپ نشدوں کا دور آیا تو ہمارا سُر شاستری پکار اٹھا:

''یہ صورت مبارک! اس کا سدا بول بالا رہے۔

یہی پانچواں وید ہے...[1]

اس طلوع شعور کی روشنی میں از منہ وسطیٰ تک نظر دوڑا جائیے گیت اور گان کی پاون بھوم پر سُر ہی کا راج ملے گا، بولوں کا نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ سام گانے کیلئے بھی ہمارے پرکھوں نے عوام سے ان کی من موہک دھنیں ہی لی تھیں، ان کے بول نہیں۔

اسی طرح صدیوں بعد[2] جب لوک گیتوں کو انگ انگ سجا کر راگ کا روپ نکھارا جانے لگا تب بھی راگ، سُر پردھان رہا۔ بولوں کا پٹ چوکھا ہونے نہیں پایا اور ہو گیا تو اسے راگ نہیں راگانگ، بھاشا اور اپانگ کی پدوی دی گئی۔[3]

پھر جب آواز کا یہ سبھاؤ رہا تو ساز کا کیوں نہ رہتا۔ لہٰذا اپنا ساز مرلی۔ ہمارے ہی منہ سے ہماری ہی طرح بولنے والی[4] مرلی کرشن کی چہیتی، مایوں کی دلاری، رادھا کی من ہر، گوپیوں کی گان پریہ۔ وید، اپ وید، کاویہ، مہا کاویہ،

دھرم اور ورش، سب میں اس کی گونج۔ اتر، دکھن، پورب، پچھم چاروں طرف اس کے چرچے۔ اس نے ہمارے سُر چھینے، ہم نے اس کے بول چرائے۔ صدیوں یہی رہس لیلا چلتی رہی۔

اس کا سُر صاف ستھرا، نکھرا نکھرا یا گلے کا ساتھ دے تو یک دل، یک جگر ہو جائے، دوسرے سازوں سے آواز ملائے تو سب پر چھا کر رہے۔ دھیما بجائے تو ہر سُر سے رس ٹپکے، تیز چلئے تو کوئی سُر دوسرے سے الجھے نہ اس کا دامن کھینچے۔ آپ چاہئے تو ساتھ سُر ہی نہیں بائیسوں سُرتیاں گن لیجئے، دھڑکتی نبض اور نفس رواں کی طرح۔ تبھی تو جو ہماری آواز کا دم خم وہی اس کا، جو مزاج و کردار اس کا وہی اس کا۔

ایک وقت میں ایک سُر سے دونوں کو سروکار، ڈھائی سپتک سے اونچے چڑھنا نہ اس کو پسند نہ اُس کو۔ کوئی سُر کتنا ہی نیچا کیوں نہ بولے، کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو جائے کیا مجال کہ بھرائے یا چنچنائے۔ یہ یک رنگی جسے سادہ پرکاری کہئے دونوں کی وضع داری میں شامل۔

حکما کہتے ہیں یہ مرلی ہی تھی جس نے ہماری آواز کو لانبے قدم چلنا سکھایا، ایک جگہ قائم ہونا بتایا۔ سُروں کے ذریعے آواز کے جزیرے بسانا نہیں سُروں سے ساون بھادوں برسانا نکش کیا۔ کون کہے یہی مول کارن نہ بنا ہو ہر سُر کو سم بھاؤ سے ادا کرنے کا۔ کھلے گلے سے بھرپور سُر کہنے کا، گلے کو حرکت دینے کے بجائے گمک سے کام لینے کا۔ گمک جسے ہماری پراچین گان شیلی کا 'لہجہ اولین' کہنا چاہئے۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے:

ایک سُر کا دوسرے سُر پر
سایہ ڈالتے گذر جانا گمک ہے"[5]

یعنی ایک سُر کا اپنے اگلے سُر کے ہاتھ میں جلتی شمع دینا اور خود بھی روشن رہنا۔

اس سے لازم آتا ہے کہ گمک کو آرائش لحن کا ایک طریقہ بن کے رہنا چاہئے تھا مگر ہوا یہ کہ وہ ہمارا غنائی لہجہ بن گیا۔ چنانچہ جب ہم نے تار کے سازوں کو چھیڑنا شروع کیا اور بات شت تنتری وینا[6] تک پہنچ گئی۔ تب بھی یکتارہ اصول اور اٹل رہا، اس لئے کہ اس میں ہمارے گلے کا پورا ابھراؤ تھا، وہ چیز تھی جسے استاد لوگ کبھی کبھی گمک کہہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک تار سے ہر سُر اور ہر سُر کے لئے ایک تار ہمارے لئے ایک فنی کلیے کی حیثیت اختیار کر گیا۔

شاستروں سے پوچھ دیکھئے نارد کا یکتارہ سب سے پہلے، بھرت اپنے دو وِیناؤں کے ساتھ ان کے بعد: ایک چترا جس میں سات تار اور سات سُر، دوسُرا وِپنچی[7] اس میں اس کے تار نو اور سُر بھی نو۔ سات شدھ اور دو ذیلی (سادھارن) مآل کار یہ کہ ہر سُر کی پوری گونج سننا ہمارا سماعی خاصہ بن گیا اور جب یہ ہوا تو سُر کو ہلانا، یا کسی سُر کو ہلکا بھاری لگانا، یا اس کی جھلک ہی دکھانا گمک کی صورت میں اور اسی حد تک ممکن ہو سکا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ تار کے باجوں کا چلن بعد کو اور ان پر پردوں یا سارکاؤں کا سادھن اور بھی بعد کا۔ یعنی ہمارا سارا سنسکار کھلے گلے اور مرلی کے کھلے مُندے سُروں کے ہاتھوں ہوا اور مرلی تو آپ جانتے ہی ہیں ابجد وہاں سے کرتی ہے جہاں انسانی گلے کا مدھیم بولتا ہے۔ نتیجہ ظاہر: مدھیم پر قائم ہو کر گانا بجانا ہمارا مزاج بن گیا، اور جب اتنے اونچے سے شروع ہوں گے تو زیادہ اونچے ضرورت پڑنے ہی پر جائیں گے اور گنے بھی تو سات سُروں کی بات رکھنے کے لئے۔ اصل کھیل پہلے پانچ سُروں کا ہوگا۔ یہی اصطلاحاً پورو آنگ کی گائکی تھی۔ ویسے بھی دیکھئے تو سات سُروں کی کھپت کا تقاضا ہی یہ تھا اس لئے کہ اگر ساتواں اور آخری سُر نکھاد تو نہ اس کو بار بار دکھانے کی گنجائش نہ اس پر زیادہ دیر ٹھہرنے میں کوئی لطف۔ سموادیعنی توافق بین النغم کی بات جو آن پڑتی ہے۔

تو یوں ہوئی ہمارے گان کے پرم گن کی استھاپنا۔ اس میں سُر کا اچارن[8] بھی شامل تھا اور اس کا سوندریہ بھی یعنی سارا صوتی جلال و جمال۔ آپ نے دُھرپد گائکی کی مردانہ وشی کا ذکر اکثر سنا ہوگا۔ وہ بھی اسی اکار[9] پسندی کی ساختہ پرداختہ تھی۔ بلمپت لے کا ہماری شانت نے اور دھیرج پریہ طبیعت کے مطابق ہونے کا اندازہ بھی لگایا گیا ہوگا، یہ بھی انہی حالات کی دین تھا۔ اس بنا پر ایسے اصول کا مرتب اور مسلم ہو جانا بھی سمجھ میں آجاتا ہے جن کا نباہ لکاس ممکن ہو بھی تو آسان نہیں۔ مثلاً جو سُر سمو ہے لگیں وہی شدھ یعنی پاک صاف اور سچے، جو ہلکے اور ملائم لگیں وہ سادھارن یعنی اپنے سہارے نہیں، پرائے سہارے۔ سنکیرن یعنی ملاوٹ والے یہاں تک کہ وِکرت یعنی ٹوٹے پھوٹے اور بدنسل بھی۔ عجب نہیں یہ اصول بھی اسی کا آوردہ ہو کہ گانے میں فریاد[10] کا شائبہ نہ پیدا ہونا چاہئے۔ اسی طرح گانے کے ایک عیب کو اصطلاحی نام سانُ ناسک[11] دیا گیا جس سے عملاً غنہ کی آواز مکروہ قرار پا گئی حالانکہ بہ الفاظ پروفیسر شیرانی اسی میں "موسیقیت اور خوش آہنگی کا ایک بڑا عنصر مضمر تھا۔

بہر حال آواز کی مٹھاس پر سُر کے بے میل ہونے کو ترجیح دینا ہماری نظر میں امر بالمعروف ٹھہرا۔ اچھا گانا نہیں سچا گانا اولی یہ ہمارا فنی فیصلہ۔ اس لئے ایک سُر ہی کیا، لے، تال، ساز، سنگیت، سب پر اس کا اثر پڑا۔ اس سے

نقصانات کیا کیا ہوئے ان کا یہاں کیا ذکر، لیکن ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تو اپنی دولت کو سینت کے رکھا دوسرے اگر کسی سے کچھ لیا بھی تو اسے دھو مانجھ کر اپنا جیسا بنا لیا۔

یہ تہذیبی مزاج ہماری تاریخ کی رگ وپے میں ساری ہے، اس لئے اور بھی کہ سُر سادھن ایک سادھنا بھی تھا اور جب جہاں تہذیب پر مذہب کی گرفت سخت ہوتی ہے، اس کا ایک مثبت پہلو یہ ضرور ہوتا ہے کہ جاندار روایات وقت کے ساتھ زندہ تر ہوتی جاتی ہیں، چنانچہ اور چیزوں کو جانے دیجئے ایک راگ ہی کو لیجئے جسے ہمارے موسیقی کی مانگ کا سیندور کہا گیا ہے اور جس کا تعارف راگ کے معرف اول متنگ نے یوں کرایا۔

راگ نام ہے سُروں کی ایک ترکیب کا: ایسی ترکیب کا ''جس میں گھٹ بڑھ ہو'' اتار چڑھاؤ ہو، جو ساری غنائی قدروں سے لیس ہو اور جس میں قلب انسانی کو کیف واثر میں شرابور کر دینے کی صلاحیت ہو۔''[12]

ظاہر ہے کہ راگ کی یہ تعریف اس کی ترقی یافتہ صورت کی آئینہ دار ہے۔ شروع میں تو وہ سُروں کا ایک بے ڈول ڈھانچہ تھا، لوک جیون کی کھدان سے نکلا ہوا۔ اس میں یہ تراش خراش آتے ہی آتے آئی ہے۔ مگر جب ایک بار اس کا چہرہ چمک اٹھا تو وہ شاستروں کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ اب شک آئے تو، ہون آئے تو، عرب وعراق، سیستان وایران یا خراسان وتوران والے آئے تو، اگر وہ اپنے ساتھ اپنا راگ لائے تو راگ راگ سب برابر۔ ہم نے جسے ایک بار سر پر بٹھایا اسے پھر آنکھوں سے نہیں گرایا۔ یہ ضرور کیا کہ اسے اپنے گون کا اپنا لیا، مثال کے طور پر شاستروں کا نشان دادہ سب سے پہلا راگ ٹکٹ ہے۔ اسی کو لیجئے:

ٹکٹ ایک قبیلے کا نام تھا جسے کہیں کہیں تنک بھی کہا گیا ہے یہ لوگ شروع شروع کہیں باہر سے آئے تھے۔ ان کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ بہت پڑھے لکھے تھے اور اپنا رسم الخط اپنے ساتھ لائے تھے۔ ٹکشلا شاید انہیں کا تہذیبی مرکز رہا ہو۔ ٹکٹ راگ، گیت بھی ان ہی کا تھا۔ ہندوستانی موسیقی کی راگنی [13]ٹنکیشری اور کرناٹک کا راگ ٹوتک دونوں انہیں کی یادگاریں ہیں۔

اسی طرح سرزمین حجاز کا عطیہ، ہجّج، ایران کا تحفہ نوروچکا جو باربد کی منظور طبع دھن نوروچ[14] (نوروز) کا چربہ تھا، توڈی/ توڑی جسے ترکوں سے تمام تر نسبت رہی ہے، یا کاموجی جو افغانوں کے دیس کا موج سے آئی تھی اور گاندھاری جسے اہل قندھار اپنا کہہ سکتے ہیں۔

پھر جب بہت ہی قریب سے آواز اٹھی ''اللہ ایک ہے ایمان ایک ہے'' تو یہ عمل اور بھی تُندرو ہو گیا، اس لئے کہ جو نسلیں آٹھویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک یہاں آتی رہیں، ان سے اکثر یہاں پہلے سے بھی آباد تھیں۔ دوسرے آتے ہی انہیں یہاں زبان روزمرہ کو علاقہ بہ علاقہ سیکھنا پڑا، تیسرے ان کے جمہور کا عقیدہ مذہب اسلام اور اس کے سلامتی کے پیغام پر راسخ اس لئے مذہب کے مطالبات اور سیاست کی سخت گیریاں اپنی جگہ تہذیب کی ماںتا کو کوئی ٹھیس نہ پہنچا سکے۔

بات راگ کی چل رہی تھی اس لئے اسی کو جاری رکھئے۔ پروفیسر کوسامبی کا اندازہ ہے:

''ریت رسم کی تسمیہ پائی کو ختم کرنے اور ورزش فن کے نئے طریقوں کو حاصل کرنے اور رواج دینے میں جو کام کبھی آریوں نے کیا تھا وہی دو ہزار سال بعد مسلمانوں نے کیا۔''[15]

ہمارا زور نئے طریقوں کو حاصل کرنے اور رواج دینے کے فقرے پر زیادہ ہوگا اس لئے کہ مسلمان جو مقامات اور شعبے یا گوشے توشۂ سفر کے طور پر ساتھ لائے تھے انہیں یہاں اسی عمل سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ خود غور فرمائیے۔ دوازدہ مقامات[16] میں صرف دو یعنی حسینی اور زنگولہ ہی ایسے ہیں جو حیثیت عرفی کو برقرار رکھ سکے، وہ بھی کانہڑا اور پیلو کو اپنا مزاجداں اور شریک کار بنا کر۔ بقیہ سب کو بقول شاعر ''اپنی ہستی کو مٹانا پڑا۔'' مگر اسی طرح جیسے ''دانہ خاک میں ملتا ہے۔'' چنانچہ جو ''گل وگلزار'' اب لہلہائے ان کے لئے پود باہر ہی سے کیوں نہ آئی ہو رنگ یہیں کا چڑھا۔

یمن، کافی، عارا، زیلف، سُر پردہ ساز گری[17] آپ ان الفاظ کے ترکتاز پر نہ جائیے، یہ سب ان ہی اہل تمیز کے وضع کردہ اور عطا فرمودہ ہیں جنہوں نے آگے پیچھے کچھ اور قلمیں بھی لگائیں۔ مثلاً باخرز، مخالف، آہنگ، فرغانہ، زاول، نوازاں، غزال[18] اور انہیں کے ساتھ وہ گل دستے بھی سجائے جن کی مہک کو ہم آج بھی بہار، شہانہ، پیلو، ملتانی، سوہا، سوہنی، سگھرائی، پرج[19] بروا، اساوری، جونپوری، درباری، وغیرہم کے نام سے یاد کرتے ہیں[20] ان کے مکھڑے اس قدر کیونکر چمکے، ان پر ست رنگی دھنک کا رنگ کیسے چڑھا، یہ بڑے لطف کی بات ہے، حالانکہ کہنے میں کم ہی آتی ہے۔

بات وہی سُروں کی ہے، ان کے برت کی ہے، ان کے مزاج وکردار کی ہے۔ اب تک جیسا کہ ہم شروع ہی میں عرض کر چکے ہیں، سات سُروں کی سپتک ہوتی تھی، جس کا ہر سُر ایک سیدھے سادے تند وتوانا لہجے میں بولتا تھا۔ ان میں پہلا سُر کھرج اور چوتھا سُر مدھم یک جان دو قالب[21] عرب وعراق ایران وتوران والے آئے تو سپتک کو آشفتک ہونا پڑا[22] اور چوتھے سُر مدھم کی جگہ پانچواں سُر پنچم سنگھاسن پر براجمان نظر آنے لگا۔[23] یہی نہیں سُروں کی

بول۔ بانٹ میں فرق آیا۔ سب سے بڑا فرق دوسرے سُر رکھب اور چھٹے سُر دھیوت کی طبیعت میں آیا کہ وہ شدھ سے کومل اور کومل سے اتی کومل لہجے میں بھی بولنے لگے یہاں تک کہ بہ الفاظ مرزا نوشہ:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

غزل خواں صحیح معنوں میں ہوئیں، اس لئے کہ قول رباعی، غزل، ترانہ میں سب سے زیادہ سُر بلندیاں غزل ہی کو حاصل ہوئیں اور وہ بلاشبہ اس لئے کہ عہد خسرو وصامت[24] میں غزل ہی کی مقبولیت سُر پَت کی آگ جیسی پھیلی۔ برنی کا کہنا ہے کہ ایک طرف تو دہلی کے گلی کوچے گونجے اور دوسری طرف ہندی گیت اور نرت پر پے بہ پے احسان کرنے والے نٹ طبقے کے استادوں نے:

دختران خوبرو با تنگ وشنگ وناز وکرشمہ وشوخ وزہ دیدہ...رائر وگفتن ورباب زدن، وغزل خواندن وآمدہ ولطیفہ گفتن ونرد وشطرنج باختن آموختہ بودند...(برنی)

اسی میں یہ بھی شامل کر لیجئے کہ غزل نے قول ورباعی کی وساطت سے محفل سماع تک رسائی حاصل کر لی تھی تو اسے متنگ کی اصطلاح میں دیسی گیت کہنا بجا ہوگا[25] پھر چونکہ غزل کے گلے میں قرأت سبعہ کی پاکیزگی لحن، کتاب خوانی کا طرز ترنم، قول کی قلب افروزی، ترانے یعنی پربندھ گیت اور ایرانی ترانے کی سبک گفتاری تھی، اس لئے اس کے منہ سے جو بول بھی نکلے ان میں ہر ایک کا لہجہ جھلکتا تھا۔

غزل میں گلا ہلتا بھی تھا، شدھ اکارے سے بھی لطف لیا جاتا تھا، نکی سُر بھی لگتے تھے، مگر نہ وہ جو یہاں بدنام تھے۔ ایک فریاد[26] ہی کیا حرف وندا، آہ ونالہ، گلہ وشکوہ، سوال وجواب، عشوہ وغمزہ، ادا وکرشمہ، شکایت وحکایت سب کا انداز پایا جاتا تھا اور سخت تر معرکہ تو یہ تھا کہ ہندی موسیقی جو سُر اور ساہتیہ کے معاملے میں کب کا فیصلہ دے چکی تھی، اب ایک ایسی ادبی صنف سے ربط وضبط بڑھا رہی تھی، جس میں سارا چٹکارہ ہی الفاظ کا تھا۔ جس کا ہر دوسرا لفظ ایک علامت ہوتا تھا؛ جس میں الفاظ اصوات و معانی کے علاوہ نسبات ورعایات، صنائع وبدائع کے ریشمیں بندھنوں میں بھی گندھے ہوتے تھے۔ پھر یہ تو رہی صرف سُر کی بات، سُر سے لپٹی ہوئی لے بھی عجوبہ تھی۔ اس لئے اور بھی کہ بحر اور تال میں بہناپا تھا۔ کہیں کہیں تو ان کے نام بھی ایک جیسے تھے۔[27] ٹھیکے کے بولوں کی طرح بحروں کے ارکان تھے، لے کی گت سے ملتا جلتا وزن ضروری تھا۔ مگر بحر ووزن سے مصرعوں میں وہ کساؤ پیدا ہو جاتا تھا کہ کوئی حرف، کوئی حرکت ٹس سے مس نہیں ہو سکتی تھی۔

سونے پر سہاگا یہ کہ غزل کے رسیا مسلمانوں نے آتے ہی یہاں کی دیسی بھاکھائیں اس طرح سیکھ لی تھیں کہ انہیں غزل کو لوک گیت سے بے تکلف بنانے میں کوئی تکلف نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاقائی لوک گیتوں کے بہت سے اسلوب غزل کی محفلوں میں دھومیں مچانے لگے۔ ان میں ہم کچھ ملتانی اور پنجاب کی کافی[28] گجرات کی جھگری (جکری؟) پنجاب کا ٹپہ اور ماہیا، بنگال کا باؤل اور اودھ کی پوربی[29] کے نام تو وثوق سے لے سکتے ہیں، ویسے ہماری تلاش جاری ہے اور امید ہے کہ وہ جسے امیر خسرو تلنگی، معبری اور دھور سمندری یا لاہوری، ڈوگری اور کشمیری کہتے ہیں ان کی گنگناہٹ بھی انہیں کے ساتھ سننے میں آسکے گی۔

کچھ بھی ہو غزل اور عوامی گیت کی دھنوں کو خواص پسند بنانے کے لئے جو شرن کیا گیا، جس طرح راگ اور مقام، راگانگ اور شعبے، اپانگ اور گوشے حتیٰ کہ دھونی اور آوازے یک دل، یک جگر کئے گئے۔ سُر اور تال پر ان گنت نئے تجربے ہوئے جن کے ہوتے کھرج، رکھب، مدھم، پنچم، دھیوت اور نکھاد کے چڑھے، اترے سارے بارہ روپ پردوں کی زبان بولنا جان گئے، تالوں کے نقار خانے میں فرودست چہار ضرب، سواری، پشتو، ذوبحر، داستان، خمسہ، پہلوان، اصول فاختہ، قوالی وغیرہم کا طوطی بولنے لگا۔ اسی کے ساتھ چنگ اور بیئر[30] طنبورہ اور وینا، کمانچہ اور کنتری کچھپی اور رباب، دف اور ڈمرو، ڈھلک اور مردنگ، ناد اور مرلی میں بھائی چارہ بڑھا۔ گائکی اور سُر اینڈگی میں جو ہوڑ چلی اس تہذیبی منتھن سے امرت نکلنا ہی تھا۔ امرت کے غیر مجازی معنی ہیں زندہ وزیندہ۔ ہمارا ایما یہ ہے کہ ساز وآواز کی جو قدریں تمام تر زندہ ثابت ہوئیں، وہی موسیقی وسطی کے بیس کا ٹکٹ بنیں۔

ان قدروں کو مجموعی طور پر کچھ کہا بھی جا سکے گا یا نہیں، اسے تاریخ کو طے کرنے دیجئے۔ البتہ وہ جسے عہد اکبری سے پہلے ہی گنی پنڈتوں نے لکشیہ کہا اور اسی کو مدعائے علم وفن جاننا شروع کر دیا تھا[31] ہمیں اسے ایک وضعی اصطلاح ''رومانی گائکی'' کے تحت لانے دیجئے اس لئے کہ یہ بے ضرر بھی ہے اور جامع بھی۔

گائیکی میں یہ رومان رنگ لایا گوپیوں والے کرشن کی شخصیت کے موضوع شعر ونغمہ بن جانے سے[32] دوسرے اس موضوع کے ماجرائے حسن وعشق پر محیط ہو جانے سے، تیسرے سادھنا کے ساتھ ایک نئی مقصدیت یعنی التزام وجد وکیف اور سرور وسوز کے عمل دخل سے: غرض سُر اور تال، رس اور بھاؤ کے گن ڈھنگ بدل جانے سے۔

سُر اب بھی سَر و سمان[33] تھا مگر سچا سُر اچھا بھی ہو اس کی شرط تھی۔ شبد اب بھی ناد[34] کی جگہ نہ لے سکا تھا مگر اس کا مزہ ایک بار پھر سب کے منہ کو لگ چکا تھا۔ کبیر کی وانی اور نانک کے شبد کو کون بھلا سکتا ہے۔ پھر کون یہ یاد رکھنا چاہے گا کہ ان سے بھی پہلے وہ اولیائے کرام گذرے ہیں[35] جنہیں ''حال و ذوق'' صرف الفاظ سے فراہم آتا رہا ہے۔

یہ الفاظ فارسی کے تھے یا مقامی بھاکھا کے۔ فارسی میں یہ ترکیب در ترکیب ہوتے تھے، بھاکھا میں سڈول، مگر غزل فارسی ہی میں ہو سکتی تھی اور گیت بھاکھا میں۔ اس لئے دونوں کو ایک کر دیا گیا اور وہ البیلا ایک نکاتی سمجھوتا عمل میں آیا جس کا نام ریختہ تھا۔ نکتہ یہ تھا کہ غزل کا لب و لہجہ نہ جانے پائے اور گیت کا سارا رس سمٹ کر آجائے۔ مرحلہ سخت تھا مگر طے ہوا۔ فارسی الفاظ عطف و اضافت سمیت اور بھاکھا کے بول اپنے الہڑ پن کے باوجود نئے سانچوں میں ڈھل گئے۔ ایک نیا صوتیاتی نظام اس زبان کو نصیب ہوا جو صرف گانے کے لئے ساخت ہوئی تھی۔ ترانہ اس کی زندہ مثال ہے۔ اس کے بے معنی بول عربی، فارسی اور ہندی بھاکھا کے کچھ بامعنی الفاظ بھی ہیں، مگر جو اس طرح ہم آمیز کر دئے گئے ہیں کہ ایک معلوم ہوتے ہیں اور سننے میں سُر اور لَے کے شکر پارے لگتے ہیں[36]۔

پھر ترانہ اصلاً ریختہ نہ تھا۔ وہ وضع بھی ہوا تھا پر بندھ گان کے نعم البدل کے طور پر، اس لئے شروع شروع سیدھی پلٹی اور شدھ وانی میں گایا جاتا تھا لیکن قول اور قلبانہ، نقش اور گل یا ساوا اور سوہلہ ان سب کو آگے پیچھے ریختہ سے ساز باز کرنا پڑا۔[37]

یہاں تک کہ جب قول ایک حد تک فارسی غزل کا دوسرا نام ہو گیا تب بھی ریختہ کے غنائی عناصر کی چاشنی برابر دی جاتی رہی۔ کبھی بھاکھا کے ٹکڑے لگا کر، کبھی لوک گیت کے مخصوص تالوں[38] سے لے کو رنگا رنگ بنا کر، کبھی عجمی، ہندی راگوں میں معروف زمانہ لوک دھنوں کا پُٹ دے کر اور ہمیشہ اس کا لحاظ رکھ کے غزل کی بحر دیسی تال سے دور نہ جا پڑے۔ چنانچہ خسرو کی چہیتی بحر، بحر مضارع مثمن اخبر، کا نام ہی ریختہ[39] پڑ جانا اس پر دال ہے۔

ایسے میں جب نئے غنائی امکانات کھل کھیلے تھے، نئے غنائی اعتبارات کو سر پر چڑھ کر بولنا ہی تھا۔ ایک سُر کے تلفظ ہی کو لیجیے (اس لئے کہ یہ بہت ہی بنیادی چیز ہوتی ہے) شاستروں نے اکار کی حکمت کو سراہا تھا مگر اب گلے کو چھوٹ دے دی گئی کہ سُر چاہے ناف سے نکلے چاہے یا ناک سے اسے بھرپور اور رسیلا ہونا چاہئے۔ اسی طرح سُروں کو سجانے کا مسئلہ تھا۔ اب تک گائیکی ٹھمک سے نک سک بجتی آئی تھی۔ اب گٹ کری نے اس کے لئے پھولوں کے گہنے تیار کئے جو اتنے بھاری نہ سہی مگر ان کی مہک لہک ہی اور تھی۔

گٹ کری نیٹ دیسی اصطلاح ہے مگر اس سے مراد ہے تان پلٹے کا وہ بانکا پن جو تمام تر باہر سے آیا۔ اس لئے اگر یہ متعین کیا جا سکے کہ گٹ کری اپ بھرنش ہے گیت کری یا[40] کا تو غزل یا اس کی دیسی غنائی شکل ریختہ کا عرف عام میں گیت ہو جانا مسلّم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ سُروں سے چھوٹ لڑنے کی گنجائش سب سے زیادہ غزل ہی میں تھی[41]

اور یہ فرض محال ایسا نہ بھی ہو تو حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ تان پلٹے، مرکی پھندے، شوشہ اور دانہ، گشت اور گرہ، تحریر اور زمزمہ، کٹکا، پھرکی، پھرت، چوچلا، تڑپ، یا پھر مینڈ، سونت، گھسیٹ، آس گن، لاگ، ڈانٹ، اُرپ، تُرپ جیسی غیر سنسکرت اصطلاحیں جنہیں ہر چند شاستروں نے پذیرائی نہ دی، مگر جو علم سینہ بن کر ان گائک گھرانوں میں زندہ و تابندہ رہیں جو ان کی ٹکسال بھی تھے، یہ سب عینی شاہد ہیں اس شلپ، اس کلا، اس ہنر، اس سلیقے کی جس نے آواز میں گنبد جیسی گونج، محراب کا ساخم، جالیوں جیسا بول باٹ، پھول پتیوں کی سی لوچ لچک اور مینار کی طرح ''مرغ از ہوا فرود آوردن'' کا انداز پیدا کرنے کا فن اختیار بھی کیا اور اختراع بھی۔

یہی نہیں انہوں نے اپنے فن میں اس دھرتی کا سارا روپ رنگ: چھ رُت اور بارہ ماس[42] رنگا رنگی ساون کی پھوار اور بھادوں کی موسلادھار، کنوار کارتک کی چاندنی اور بسنت کی بہار، پھاگن کے ہر ہرے اور ہولی کی دھومیں یہ بھی سمو دیں۔ ہر تیاگ کا پھل ملتا ہے، ہر انو راگ میں پراپت ہوتی ہے۔ ان گھرانوں کے استاد نے اپنی زندگیاں اور ان کے ہندو مسلمان شاگردوں کے سلسلوں نے صدیاں صرف کر دیں کہ ان کے فن کا سنگار برقرار رہے۔

غور فرمایئے: اس وشال دیش میں اتنی بولیاں بولی جاتی ہیں، اتنی ادبی زبانیں اپنا کلمہ پڑھوا رہی ہیں مگر اب قرابت ہوتے ہوئے بھی ''ایک دو'' بھی ایک طرح نہیں بول سکتیں۔ یہاں تک کہ ہاں نہیں بھی ایک طرح نہیں بولتیں۔ لیکن کھرج بھروا کے دیکھئے کشمیر سے کام روپ تک اور ہمالہ سے ہنومان سیتو تک اس کی بولی ایک، زبان ایک ہوگی۔

اسی طرح گھٹ۔ بڑھ میں آواز کو سولہ سنگار کرتے سنئے۔ کرناٹک اور ہندوستانی گائکی کا ظاہرہ فرق بھی بتائے گا کہ ہمارا جغرافیہ الگ مگر تاریخ ایک ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری طبیعت ایک ہے۔

حواشی:

1 سنگیت بھاشیہ۔

2 نویں صدی کے آس پاس۔

3 یعنی سب ذیلی۔

4 مرلی کو عرف عام حاصل ہے اس لئے، ورنہ اسم جنس دراصل، بنس اور جنسی ہے۔ تقدم بین (سپیرے کی بین) کو حاصل ہے اس لئے رگوید میں وین (بین) کا ذکر آتا ہے۔

5 سنگیت سے سار۔

6 وہ وینا جس کے ایک سو تار بتائے جاتے ہیں۔

7 چترا انگلیوں سے چھیڑا جاتا تھا اور ونچی زخمہ سے بجتا تھا۔ ہجرت کے بعد بھی یہی دونوں صدیوں مقبول ومروج ہے۔

8 سُر کی ادائیگی مگر مدنظر رہے کہ ابتداً Voice product پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا Note Production پر۔ سُر صحیح مخرج سے نکلے۔ یہ مقدم تھا باقی سب مؤخر۔

9 آکار: اتصالِ حلق سے نکلی ہوئی آواز جس کا تشکل، مدید اور متین ہونا فطری تھا۔

10 ملاحظہ ہو معدن الموسیقی، مولفہ اکرم امام خاں، صفحہ 119۔

11 سنگیت رتنا کر (3-38)۔

12 متنگ کے ایک قول کا ترجمہ۔

13 راگنی کو راگ سے ممیز کرنے کا کوئی فنی جواز نہیں، یہاں فصیح سمجھ کر استعمال کیا گیا ہے۔

14 یہ دھن ایسا لگتا ہے کہ اسی زمانے میں ہندوستان پہونچی جب ایران میں نوروز کی نوروج بولا جاتا تھا۔ اسی طرح حجاز بہ صورت مالہ تجیز تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہی صورت یہاں رواں پاکر حجیج یا ہج بن گئی ہو۔

15 مطالعہ تاریخ ہند کا مقدمہ۔

16 بوعلی سینا نے اس سلسلے سے نامزد کیا ہے۔ راست، اصفہان، عراق، کوچک، بزرگ، حجاز، بوسلیک، نوا، حسینی، زنگولہ، رہاوی، عشاق۔

17 ان کا ذکر عرب وعجم کے تذکرہ نگار نہیں کرتے۔ سنسکرت کے گرنتھ کار البتہ کرتے ہیں۔

18 یہ وہ شعبے گوشے، لحن اور آوازے ہیں جن کا ذکر امیر خسرو فرماتے ہیں۔ یہ یہاں کی کن مقامی دھنوں سے متاثر ہو کر صورت پذیر ہوئے ایک دلچسپ بحث ہے۔

19 صحیح پرج ہی معلوم ہوتا ہے ویسے میں نے استادوں کو پرج بولتے زیادہ سنا ہے۔

20 یہ فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں چند مروج ترین کی نامزدگی پر اکتفا کی گئی۔

21 سنسکرت کے ایک مشہور مقولے کی روشنی میں "لازمہ صوت" اور "اشرف"۔

22 اس انقلاب کا صحیح اندازہ ہماری موسیقی وسطی میں تہذیبی یکجہتی کی معرفت کے مترادف ہوگا۔

23 اس کا نتیجہ ہوا عجم کا کھرج کی طرح اچل ہوجانا اور نئی تو افقی قدروں کا اجرا۔

24 صامت جسے اس کا ہم عصر سورج برنی موسیقی میں حامل "علم معانی" بتاتا ہے۔

25 موازنہ فرمایئے "جسے عورت، مرد، امیر غریب، ہی نہیں اس دیس کے بچے بھی گا سکیں۔ دیشی ہے۔

26 'فریاد' کا انداز معیوب سمجھا گیا تھا۔ قیاساً اس لئے کہ گداگری کی چھاپ پڑتی تھی۔ واللہ اعلم.....

27 مثلاً ذو بحر، ہزج، خفیف، طویل، رمل، مجتث، مضارع وغیرہ۔ طویل تو اب تک ٹونگی میں رائج ہے۔

28 کافی جیسا کہ آج بھی ہے، ایک شعری موضوع تھا، جسے ہر علاقہ اپنی لوک دھن میں گاتا چلا آیا ہے۔ اس کے راگ بن جانے کا ماجرا اور ہے۔

29 یاد کیجئے سلطان المشائخ کا پوربی کو "ندائے الست" فرمانا۔

30 کرناٹک یعنی سرزمین دکن میں چنگ کو یشر کہا گیا۔

31 مثلاً راما مائیہ پنڈرک وٹھل وغیرہ۔ انہوں نے نظری کی مقابلے میں عملی موسیقی کو موثر قرار دیا اور گانے بجانے کی ہمہ جہتی کی طرف مائل کیا۔

32 رلبہ مان تومر نے نائک صاحبان بخشو، چرجو وغیرہ اور اپنی شریک حیات وصفات مرگ نئی کے تعاون سے یہ رنگ اور بھی بکھیرا۔

33 شو کا ایک لقب سرو بھی ہے۔ فارسی کی ابتدائی سے ابتدائی تحریر بھی ہندی موسیقی کی بات مہادیو اور سیشر ہی سے شروع کرتی ہے۔

34 شبد کی اولیت جیسے سامی مذاہب کی خصوصیت ہے، ویسے ہی ہندی فلسفے میں ناداناد ہے۔ 35 مثلاً حضرت فرید گنج شکرؒ (سیر الاولیا)۔

36 یہ حقیقت بھی خاصی معنی خیز ہے کہ ترانہ کے قدیم ترین نقش وہی ہیں جن میں عربی فقروں خاص کر فارسی اشعار کا پایا جانا لازمی سا ہے۔ یہی وجہ رہی ہوگی کہ ترانہ کو ابتداً فارسی کہا گیا۔

37 ملاحظہ ہوں وہ تصانیف مثلاً جو تحقیقات امیر خسرو کے ضمن میں شروانی ایڈیشن آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہیں، چنانچہ دھمال بسنت کا فقرہ پیش خواجہ تم بن ٹھن آئے، حضرت رسول صاحب جمال.....

38 مثلاً مغلئی یعنی روپک، دادرا، کہروا، ہکلا وغیرہ۔

39 کبیر کے ریختے مثال کے طور پر۔ یہ سب اسی بحر میں ہیں۔

40 بر سبیل مثل کریا، رام کریا وغیرہ۔ یوں بھی "ہم ریختہ ہم گیت" مشہور فقرہ ہے۔ (سعدی کاکوروی)۔

41 قول آداب سماع کا تابع تھا، ترانہ کلاسیکی پر بندھ کا، اس لئے اور بھی۔

42 لطف سے یاد رکھنے کی بات ہے کہ بارہ ماسہ (دوازدہ ماہ) کو ادبی آؤ بھگت سے اپنا بنانے کا شرف ہندنژاد مسلمان شعراہی کو حاصل ہوا۔

OO

1857 کے زمانے میں رقص

کتھک: ہندو مسلم تہذیبی اشتراک کی نشانی

مدھو ترویدی

> ... کتھک ہی ہندوستان کا وہ واحد طرزِ رقص ہے جس میں کولہا ہلانا یا مٹکانا خارج از رقص سمجھا گیا ہے ... یہی سبب تھا کہ خالصتاً سنگار رس میں ڈوبے ہونے کے باوجود کتھک کہیں بھی سطحی، سوقیانہ یا عامیانہ اور فحش نہ ہو پایا ...
>
> ■
>
> ... بندادین ایک بار میر انیس کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ گھڑا کچا ہے اس کا بھاؤ کیسے درشایا جائے میر انیس نے کہا کہ دو تین بار گھڑے کو پانی میں پھرائے کا بھاؤ درشاؤ اور پھر چٹکی سے بجانے کا۔ بندادین نے یہی کیا اور یہ بھاؤ از حد پسند کیا گیا ...

کتھک ہندوستان ناچ کی وہ طرز ہے، جو ہندو مسلم تہذیب کے سنگم کی زندہ مثال ہے۔ اس کی جڑیں جہاں ہندو مذہب و تہذیب میں بہت گہری ڈوبی ہوئی ہیں، وہاں اس کی نشو و نما ہندو مسلم یک جہتی کے بڑے انوکھے ماحول میں ہوئی۔ اس کا ہندوؤں کی عام زندگی سے براہِ راست تعلق رہا اور یہ ایک علمی طرز کی صورت میں اودھ کے دربار میں پہنچا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کا شاستر ک روپ زیادہ تر سرزمین اودھ کے گنگا جمنی ماحول میں ابھرا۔

کرشن کنھیا اس ناچ کے اہم ترین کردار ہیں۔ یہ ہندوستان کے ہر دلعزیز دیوتا بھی ہیں۔ عہدِ وسطیٰ میں رام کرشن کی بھگتی کے شدید جذبات کا رنگ شمال اور جنوب پر یکساں چڑھ گیا تھا۔ بندرابن کرشن بھگتی کا مرکز تھا، جہاں کے چوراسی شعرا نے کرشن بھگتی کے نغمے گائے۔ کتھک کو بھی اسی دھرتی کی پیداوار ہونا چاہئے تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ برج کے بجائے کتھک نے اودھ کی دھرتی کو پسند کیا۔ دلّی کے حکمراں طبقے یا امرا نے اس کو منہ نہیں لگایا۔

اس کی جو تاریخی وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ نوابین اودھ، جنھوں نے ہر تہذیبی معاملے، کیا پوشاک و لباس، آداب و اطوار، نشست و برخاست، درباری رکھ رکھاؤ یہاں تک کہ آداب مجرا و سلام تک میں یا تو مغلوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی، یا اپنی راہ الگ قائم کرنے کی سعی کی۔ انھوں نے کتھک کے طرزِ رقص کی اور زیادہ پذیرائی اس لئے کی کہ مغلوں نے اس سے بے توجہی برتی تھی۔

مقبولِ عام روایات یہ ہیں کہ مہاراج کال کا بندادین کا گھرانا اصلاً الہ آباد ضلع میں ہنڈیا صدر مقام کا رہنے والا تھا۔ اس کے اب و جد پنڈت لکشمی نرائن گزرے ہیں۔ ان کے بارے میں عام طور پر یہ بیان

کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ بھگوان کرشن آئے ہیں۔ اور ان کو یہ حکم فرما رہے ہیں کہ جاؤ! کتھک کے روپ میں میری لیلا کو سنوارو۔ پنڈت جی نے اس آدیش کا پالن کیا اور اس دن سے گویا کتھک کے ناچ کی نئی بنیاد پڑی۔

افسوس ہے کہ پنڈت نارائن کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں معلوم ہوسکا۔ البتہ ان ہی کی اولاد میں جدید کتھک کے استاد اعظم پرکاش جی مہاراج تھے۔ فارسی تذکروں کے پرکاش یہی ہیں۔ یہی سب سے پہلے آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوئے اور کتھک کے نئے روپ کی یہیں سے ابتدا ہوئی۔ ان کے ناچ کی دھوم مچ گئی۔

مورخوں کا کہنا ہے کہ یہ تلوار کی دھار پر بھی ناچ لیتے تھے۔ انھوں نے کتھک جو کہ ایک سیدھی سادی داستان کو ناچ کر بیان کرنے کا نام تھا فن کی خراد پر اتار کر وہ بنا دیا جو وہ آج ہے۔ اس لئے اس کا نام کتھک کے بجائے ''کتھک نٹ دری نرتیہ'' رکھا۔

کتھک جیسا کہ اس اصطلاح سے واضح ہوجاتا ہے کرشن لیلا سے نسبت خاص رکھتا ہے، یعنی یہ وہ ناچ تھا جس کے وسیلے سے کرشن جی اور گوپیاں راس لیلا کیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہی وہ طرز تھا جس میں ہندوستانی رقص وتمثیل کے بانی مہانی نٹ طبقے کے لوگ عوامی داستانوں کو پیش کیا کرتے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو نٹ جن کو مہابھارت کال میں گرنتھک یا گرتھن بھی کہا گیا ہے اس ملک کا قدیم ترین عوامی فن کاروں کا طبقہ تھا۔ شمالی ہند کے کتھک رقاص ان ہی کے تہذیبی وارث اور جانشین تھے۔

سرزمین اودھ کو کتھک سے جیسا کہ کہا گیا ہمیشہ سے دل چسپی رہی۔ چنانچہ ایودھیا نگری کے مندروں میں رام لیلا اور جھولا وغیرہ کے جشن پر یہ ناچ استوتی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ استوتی کے لغوی معنی ہیں بڑوں کی تعریف۔ کتھک میں استوتی سے مراد وہ متبرک بول تھے، جن کے مفہوم اور کیف کو رقص کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا۔

مہاراج ٹھاکر پرساد جی نے کتھک کو ہر رنگ سے سجایا۔ انھوں نے اس میں نفاست اور سلیقہ پیدا کیا۔ انھوں نے ڈھول اور مجیرے کے شور شرابے کو ختم کر کے مردنگ کے مدھر باج کو اپنایا۔ یہی نہیں وہ کتھک میں پکھاوج کے بول لے آئے۔ اس طرح بھرت ناٹیم اور کتھک کو ہم آمیز کیا۔ یہ دھیان دینے کی بات ہے کہ پہلے پکھاوج کے بول پَرملو' (یہ غیر سنسکرت اصطلاح ہے ناچ کے چند مخصوص قسم کے بولوں کے لئے جو مردنگ سے پکھاوج میں آئے) کی شکل میں تھے اور بہتات سے استعمال نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے ہر ہونہار چیز کو وہ چاہے مردنگ کی ہو یا پکھاوج اور ڈھول مجیرے کی ہو، یکجا کردیا۔ کتھک میں پکھاوج کی بندش اور پرن انھیں کا اضافہ ہے۔ مشہور گنیش پرن ان ہی کی تھی۔ طبلے کو مردنگ اور پکھاوج کا ہم صحبت بنا دینا بھی ان ہی کا کارنامہ تھا۔

مختصر یہ کہ کتھک کو عوامی فضا اور عامیانہ گردوپیش سے اٹھا کر دربار کے باادب باملاحظہ ماحول میں بے تکلف کھڑا کردینا ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس غرض سے انھوں نے کتھک میں بہت سے اضافے کئے جس میں خاص خاص حسب ذیل ہیں۔

1 نرتیہ کی آمد 2 ٹھاٹھ بنا کر کھڑے ہونے کا ڈھنگ 3 گت نکاس 4 گت بھاؤ 5 بھاؤ نکاس 6 تت کار کے ٹکڑے 7 نٹوری کے ٹکڑے 8 پَرملو' کے بول 9 طبلے کے بول 10 پکھاوج کی پرن 11 پیروں کی لے کاری۔

مشہور زمانہ مہاراج کالکا اور بندادین دونوں ان ہی کے لائق فرزند تھے۔ کتھک جو کچھ بھی آج ہے وہ ان ہی کا بنایا سنوارا ہوا۔ انھوں نے اپنے والد سے جو کچھ ورثے میں پایا اس میں اور چار چاند لگادئے۔

ٹھاکر پرساد جی نے ایک تہتی تہوار کی چیز کو کلا کا روپ دیا۔ ان کے سپوتوں نے اس کی کلا کو ایک نئی آتما دے دی۔ دونوں بھائیوں نے کتھک کو دو الگ الگ رخ سے ترقی دی۔ ایک نے شلپ کا سراپا سنوارا اور دوسرے نے اس کو نک سک سے سجایا۔

مہاراج کالکا پرساد نے کتھک میں نرتیہ کے پہلو کو ابھارا یعنی ناچ کے پہلو کو۔ وہ لے کاری کے استاد تھے، اس لئے ناچ میں گت اور رفتار کو سنبھالا اور اس میں نئی رنگینیاں پیدا کیں۔ درُت یا تیز اور بیچ کی لے کو اس طرح ملا کر ایک کیا کہ پورا ناچ پاؤں پر چلنے نہیں تیرنے لگا۔

یہی نہیں انھوں نے اس بھری (چرخی) لوہری (لوچ لچک) اچپت (کرتب) کو اس میں سمو دیا اور سلیقہ یہ برتا کہ عوامی ناچ کی یہ خصوصیت کتھک میں اس طرح یک رنگ ہوگئی کہ اس نے ایک نئی تازگی اور شگفتگی پیدا کی۔ لے کی رنگا رنگی بھی بہت کچھ عوامی ناچ کی دین تھی، اس لئے کہ وہی تالیں زیادہ برتی گئیں جو عام طور پر مروج اور مقبول تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے اس میں ایک اچھوتا ستھراؤ اور ٹھہراؤ پیدا کردیا۔

بتاشے پر ناچنا، تلوار کی دھار پر گت دکھانا، ویسے چاہے مبالغہ معلوم ہو یا نہ ہو، لیکن جو چلت پھرت کالکا پرساد لے آئے اور جس کی مثالیں آج بھی ان کے گھرانے والے بڑی کامیابی سے ہندوستان اور اس کے باہر پیش کررہے

ہیں، اسے دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل نہیں رہ جاتا۔

کالکا مہاراج نے ناچ کو نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ اس کے آگے جانے کی گنجائش بظاہر نہیں رہ گئی، مگر مہاراج بندادین نے اس ترتیبہ کو بھاؤ سے اس طرح سجایا کہ کتھک کا فن نئی دلہنوں کی طرح ہر ایک کی آنکھ میں کھپ کر رہ گیا۔ اردو میں بھاؤ بتانے کا محاورہ بھاؤ کی صحیح تعریف ہے، اس لئے کہ ناچ کی زبان اعضا کی حرکت پر ہوتی ہے اور جب ان ہی حرکات سے الفاظ کا کام لیا جانے لگے تو اسے بتانا ہی کہا جائے گا۔

بندادین مہاراج نے ناچ کو بھی زبان بخشی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتھک صرف بانہہ اور پاؤں کی حرکت اور لے کا چمتکار ہی نہ رہ گیا، بلکہ اس میں خیال اور جذبے کا عنصر بدرجۂ اتم پیدا ہوگیا۔ اس طرح کتھک میں بھرت ناٹیم کا سا سجاؤ بناؤ پیدا ہوگیا۔ یہی نہیں کتھک، ناچ کے علاوہ ایک قسم کی غنائی شاعری بن گیا۔

کت ھک کی خاصیت، یہ ہے کہ لوک تھو (عوامی عنصر) اس میں ہمیشہ ابھرا رہے، کبھی دبنے نہ پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوامی زندگی میں جتنے بھی غنائی امکانات تھے ان کا انتخاب کر کے ان کی تقسیم کولیا۔ لوک کتھائیں آئیں، کرشن لیلا کے کئی مقام آئے۔ جیسے مرلی ہرن پیر ہرن وغیرہ۔ عوامی زندگی (Folk Life) کی چونیشن بھی آئیں جیسے پنگھٹ اور گھونگھٹ، بنگارا گھونگھٹ گت، یہ سب اس خوبی سے انجام پاتے تھے کہ اودھ کی زندگی کا رس لینے والے وجد میں آجاتے تھے۔ نئے نئے عنوانات اور نئے نئے موضوعات کا انتخاب کیا گیا۔

گت دستار کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کتھک میں داستان بھی آگئی۔ ایک واقعہ میر انیس سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بندادین ایک بار میر انیس کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ گھڑا کچا ہے اس کا بھاؤ کیسے درشایا جائے۔ میر انیس نے کہا کہ دو تین بار گھڑے کو پانی میں پھرانے کا بھاؤ درشاؤ اور پھر چٹکی سے بجانے کا۔ بندادین نے یہی کیا اور یہ بھاؤ از حد پسند کیا گیا۔

اسی طرح گھونگھٹ کے بھاؤ عوامی زندگی سے لئے گئے۔ یہ سب جس حسن و خوبی سے انجام پایا اس کی کامیابی کا سہرا نواب واجد علی شاہ کے سر ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے اس کتھک کو اپنے زبانی عمل سے علم و حکمت کے درجے تک پہنچادیا تھا۔ وہ خود ناچتے تھے، دوسروں کو سکھانا جانتے تھے اور ناچ کی تصنیف، اس کی تعلیم اور اس کے مجلسی آداب، مختصر یہ کہ کتھک کو ایک رچی رچائی تہذیب عطا کردینا، سب ان ہی کا کمال تھا۔ اس طرح مہاراج کالکا، بندادین اور شاہ اودھ سلطان واجد علی شاہ وہ تکون بن گئے جن کے بغیر کتھک کی صورت گری نہ ہو پاتی۔

واجد علی شاہ نے رہس کی بنا ڈال کر کتھک کے لئے کھل کھیلنے کی راہیں کھول دیں۔ رہس اصلاً ناچ کی ہی ایک طرز تھا۔ جس میں کتھک اور راس لیلا دونوں کی آمیزش تھی۔ یہ ناچ حلقوں اور دو صورتوں میں کیا جاتا تھا۔

چھتیس ایجاد رہس سلطان: ناچ کے اس طرز میں وہ ناچ آتے ہیں جن کی تصنیف بیلے ڈانس (Ballet Dance) کی صورت میں ہوئی۔ یہ سب کتھک ہی پر مبنی ہے، کیونکہ اس میں ساری خصوصیات بڑی حد تک کتھک ہی کی تھیں۔ اس اضافے کے ساتھ کہ یہ حلقہ بند ناچا جاتا تھا۔

ناچ کی ان تصنیفات کے موضوعات کو ان کے نام سے ہی جانا جاسکتا ہے، جو بہت سوچ سمجھ کر رکھے گئے تھے۔ مثلاً رہس، سلامی نام، برقی نام، مطلوب نام، یہ سب کتھک کی سلامی گت لکھنؤا گھونگھٹ گت اور بنگارا گھونگھٹ گت کی ترقی یافتہ شکلیں تھیں۔ اسی طرح مندرا بھاؤ، آمد و رفت، گھما، گردش، بھوری نگرا ان سب کا پردھان انگ کتھک ہی تھا۔

رہس کے اس مخصوص طریقہ میں کتھک کا رنگ غالب تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ کتھک میں گت آگے پیچھے (پس و پیش) ناچی جاتی تھیں۔ جب کہ رہس میں چکر دار طریقہ سے گت ناچی جاتی تھی یعنی حلقہ کیا جاتا تھا، اس میں راس کی فضا ترتیب پاتی اور قائم رہتی تھی۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ کتھک کے بنیادی اصول کے خلاف اس کو ناچنے والیاں عورتیں تھیں۔

سلطان واجد علی شاہ کے علم و فن سے رہس اور کتھک کو کتنا فیض پہنچا، اس کی تفصیل میں یہاں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ان کا صرف یہ کارنامہ ہی کیا کم ہے کہ انھوں نے ہندو اور مسلم تہذیب کو ہی نہیں، فارسی اور سنسکرت کی تہذیبی خصوصیات کو بھی یکجا کر کے ایک نئی صورت دے دی۔ صرف رہسوں کے نام پر نظر کیجئے۔ رہس مطلوب کہمی، رہس آفتاب کہمی، رہس مہتاب کہمی وغیرہ۔

اس طرز کا ایک یہ بھی انوکھا پن قابل ذکر ہے کہ حلقہ بند ہوتے ہوئے بھی اس میں مجرا Chamber Dance کے سارے انداز پائے جاتے ہیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی تصنیف کو رہس آداب نام بھی کہا گیا۔

رہس ناچ کی دوسری صورت اوپیرا Opera سے ملتی جلتی تھی۔ فرق یہ تھا کہ یہ اسٹیج پر نہیں کئے جاتے تھے۔ قرینہ یہ بتاتا ہے کہ یہ رہس چونکہ ہفتوں میں تکمیل کو پہنچتا تھا، جس میں ایک جیتے جاگتے اسٹیج کا بنایا جانا بھی شامل

ہوتا تھا، مصنوعی اسٹیج اس کے لئے ناکافی اور نامناسب تھا۔ اس کے بجائے ایک باغ کو پرستان کی طرح سجایا جاتا تھا اور اس میں زندگی کے سارے آثار جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ اس میں، رادھا کنھیا کے دو قصے، مثنوی ماہ و پیکر اور مثنوی غزالہ وغیرہ موضوع فراہم کرتی تھیں۔

اسی رہس کی جان و روح موسیقی تھی۔ مکالمے، صرف ایک کردار کے داخلے اور تعارف کے لئے ہوتے تھے۔ بقیہ سارا ڈراما گانوں کے سہارے آگے بڑھتا تھا۔ ٹھمری، دادرا، ساون اور غزل ان سب کو تال اور سُر کی لڑی میں پرو کر ناچا جاتا تھا۔ صرف ناچا ہی نہیں، بتایا بھی جاتا تھا۔ اسے رہس کا نقطۂ عروج ہی کہا جائے گا کہ فارسی اردو کی صنفِ ادب مثنوی تک کو ناچ میں ڈھال دیا گیا۔

واجد علی شاہ نے بہت سی مثنویاں اس طرز رہس کے مناسبات و مطالبات کو سامنے رکھ کر تصنیف کیں۔

یہاں رہس کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں جتنے کردار حصہ لیتے تھے ان کو کسی مخصوص مذہب اور زندگی کے خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا تھا۔ کرشن، رادھا، جوگی، جوگن، دیو اور پری ان سبھی کا جمگھٹا یہاں نظر آتا ہے۔ یاد رہے کہ جوگی کا کردار واجد علی شاہ خود کرتے تھے۔ اس میں جوگی کا گیروا کپڑا موتیوں کی سمرنی، ہیرے کے کنڈل، سونے کا کمنڈل، صندل کے ترپنڈ، ان کا جوگیا بھیس ہوتا تھا۔ جس میں کچھ کچھ شنکر کی جھلک نظر آتی تھی۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مقام عبرت بن جاتا ہوگا کہ کرشن اور رادھا دیوی دیوتا کے روپ میں نہیں عام انسان کی صورت میں آتے تھے۔ کرشن کی مرلی اور رادھا کا ناچ اس دھرتی کی چیز معلوم ہوتا تھا۔

یقین ہے کہ کرشن اور رادھا کی مقبولیت کو اور زیادہ عام کرنے میں کتھک اور اس طرز رہس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے کہ ان کا دائرہ عملی شاہی دربار تک محدود ہوتے ہوئے بھی مخصوص نہ رہ سکا اور ان کا چلن عام ہوتا گیا۔ امانت کی اندر سبھا اس کا ایک ثبوت ہے، اس لئے کہ اگر کتھک اور رہس نہ ہوتے تو اندر سبھا نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو یہ نہ ہوتی۔ رہس کی عام مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک طبقہ ہی ایسا ابھر کر سامنے آگیا جس کو رہس والے کہا جانے لگا۔

آخر میں کتھک کی ان خصوصیات کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے جنھوں نے اس ناچ کو گویا ایک نو طرز مرصع بنا دیا۔

لباس: ۔ پشواز (جس کی اصل یقیناً سنسکرت لفظ ہے) پائجامہ اور جڑاؤ کام کی ٹکنے دار ٹوپی۔

پیشو، کشش: رقاصہ کی آمد اور مجرا جس میں رقص کی روح اس طرح سما گئی تھی کہ آگے چل کر کتھک کو ہی مجرا کہا جانے لگا۔

مجرا کی دوسری صورتیں کورنش، تسلیم اور نمستے ہیں۔

بول: بولوں میں جہاں پکھاوج کے بول، مردنگ کے بول، 'پُر ملو' کے بولوں کا امتزاج ہے، طبلے کے بول اور دف کے بول بھی شامل ہیں۔ ویسے کتھک میں عوامی روایات کو بھی سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ یہاں پیل وان کے ہاتھی کو ہانکتے وقت استعمال کئے جانے والے بول تھئی تھئی بھی اپنائے گئے۔

تال: چونکہ ٹھمری، دادرا، غزل، ٹپہ، یہاں تک کہ مثنوی بھی گائی ناچی جاتی تھی، اس لئے ہندی ایرانی بہت سے ٹھیکے حسب موقع بجائے جاتے تھے۔ اور طبلے کی تالیں بھی مثلاً سول فاختہ، چھوٹی سواری، بڑی سواری بھی اس میں اختیار کی گئی۔

رس: تکنیک کے حساب سے بھاؤ، ابھنیئے، مُدرا، یہ سب بانی رہس کے مذاق کے مطابق سنگار رس میں شرابور تھے۔ اس میں بھگتی کے شانت رس کی بھی خاص جھلک پائی جاتی ہے۔ بھاؤ کے وستار (توسیع) کے لئے ٹھمری اور غزل کا استعمال کیا گیا۔

آج کتھک پھر مقبولیت کا زینہ چڑھ رہا ہے۔ بھرت ناٹیم، اوڈیسی، کتھا کلی، مین پوری، کوچی پوڑی۔ ان کے بیچ کتھک کو زندہ رہنا ہے اور زیبا بھی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی اور زیبائش دونوں کی ضمانت اس کی اسی ساخت و پرداخت میں مضمر ہے، جس کا مختصر ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

کتھک اس تہذیب کا آئینہ دار ہے، جس کو خاص کر زمین اودھ کے ہندو اور مسلمان شرفا نے پروان چڑھایا۔ چنانچہ کتھک کی ایک ادا اس پر دال ہے کہ اس میں ہمیشہ مسند کی طرف منہ کر کے ناچا جاتا ہے۔ پیٹھ کے بھی نہیں۔ یہاں تک کہ چرنی کرتے وقت بھی جب سم پر آئیں گے تو منہ مسند ہی کی طرف ہوگا۔ اسی طرح آمد و رفت میں بھی پیچھے کو لوٹتے ہیں۔ اس میں اودھ کی گنگا جمنی تہذیب کا پورا رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔

اس سلسلے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ جہاں تک میری نظر ہے کتھک ہی ہندوستان کا وہ واحد طرز رقص ہے جس میں کولہا ہلانا یا مٹکانا خارج از رقص سمجھا گیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ خالصتاً سنگار رس نائیک نائیکہ بھید اور کلاسیکی نرت کے لاس انگ میں ڈوبے ہونے کے باوجود کتھک کہیں بھی سطحی، سوقیانہ یا عامیانہ اور فحش نہ ہو پایا۔

OO

مصور کی زبانی

ہندو مسلم تہذیب اور ہماری مصوری

سعید بن محمد نقش

میری کہانی سنیے: میں ایک مصور ہوں، رنگ و نور کی زبان ہوں تو پتہ نہیں لفظ کہاں تک ساتھ دیں اور کہاں سے معنی کا دامن چھوٹ جائے اور میں تشنہ کام یونہی بھٹکتا رہوں۔

علمائے طبقات الارض کا خیال ہے کہ ایک ملین سال (ق م) کے زمانے میں ایک عرصے تک انسان غیر متمدن رہا۔ زندگی ان وحشی جانوروں سے کم نہ تھی جن کا خود یہ شکار کیا کرتا تھا۔ لاکھوں سال تک انسان ننگے، سرمئی غاروں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ وحشی جانوروں کی طرح لڑتا جھگڑتا رہا۔ چیختا چلاتا رنگ برنگی وادیوں میں بھوری بھوری ریت سے پٹے میدانوں میں نیلگوں آسماں کے نیچے ایک کاروانِ آوارہ کی طرح شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب کی سمت بھٹکتا رہا۔ ایک لاکھ سال (ق م) کی بات ہے جب کہ اس میں پہلے پہل گفتگو کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ ساتھیوں سے تبادلہ خیال کرنے اور منصوبے بنانے کا شعور اس میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ بڑی تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہوا۔

موجودہ دور کی ترقی آج سے صدیوں پہلے کی مسلسل کوشش کا نتیجہ ہے لیکن آج بھی مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور ایٹمی دھماکوں کے زلزلے اس کا چین اور سکون برباد کئے ہوئے ہیں۔ انسان چاہتا کیا ہے اسے کس چیز کی تلاش ہے۔ راحت کے نام سے کلفتیں کیوں سمیٹ رہا ہے۔ ہنسی مانگے تو غم کیوں ملے۔ بات یہ ہے کہ مسکراہٹ ایک جذبۂ لطیف کا نام ہے جس کا تعلق مکمل طور پر حسن جمال سے ہے۔

فنون لطیفہ میں مصوری کو وہی درجہ حاصل ہے جو حواسِ خمسہ میں بصارت کو ہے یہی وجہ تھی کہ حصول غذا کی خونریز کوششوں کے بعد جو وقت بچ رہتا اسے غاروں کی تزئین و آرائش میں صرف کرتا رہا۔ التمرا کے غاروں سے لے کر دنیا کے سیکڑوں غار اس کا ثبوت ہیں۔ ان غاروں کے اندرونی

■

...ہندوستانی تہذیب کے ان معماروں نے مختلف رنگوں کی یکجہتی سے جو گنگا جمنی تصویر بنائی تھی۔ اس پر فرنگی ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈال کر اس تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور پھر مقامی وقت کے سیاست دانوں نے ان کی دھجیوں سے اپنے اپنے پرچم لہرا کر ملک کے ٹکڑے کر ڈالے...

■

...اکبر فن مصوری کو فطرت کی پہچان کا ایک اعلیٰ ترین ذریعہ سمجھتا تھا...آئین اکبری میں لکھا ہے کہ فن مصوری انسان کو خدا تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے...

■

نقوش وتصاویر دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو سب سے پہلے رنگ برنگے درختوں، برگ وگل، شفق کے رنگوں، نیلگوں سمندر کی نیلی اور گلابی لہروں اور نیلے آسمان پر دھنک کے رنگ، درندوں، پرندوں کی قدرتی آرائش وطرح اندازی اور نقش ونگاری نے سب سے زیادہ متاثر کیا بلکہ اکثر اوقات تو یہ اپنے آپ کو بھی پینٹ کر کے قدرت کے ان رنگین مناظر میں خود کو بھی رنگین محسوس کرنے لگا جس کی چند مثالیں آج بھی افریقہ کے جنگلوں میں مل جاتی ہیں۔ یہ اپنی رہائش گاہوں کو حسین بنانے تصاویر، مجسمے اور نقش کاری کیا کرتا تھا جن میں انسانی شکلیں، شیر ببر، گھوڑے، سانپ اور ہتھیار وغیرہ کثرت سے نظر آتے ہیں۔

اللہ نور السموت والارض (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) مصور ظاہری نور کے توسط سے نور مطلق کی تلاش میں رہتا ہے۔ جس کے بغیر رنگ کا کوئی وجود نہیں اور رنگ کے بغیر کسی چیز میں حسن نہیں اور حسن کے بغیر زندگی میں کیف نہیں۔ زندگی کے بغیر کائنات کا تصور نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انسان نے اپنے وجود کو منوانے کے لئے مصوری کو ترسیل کا پہلا ذریعہ بنایا جس میں اس کے جذبات واحساسات رنگ اور شکلوں میں ڈھلنے لگے۔ جس کے اظہار کے لئے اس نے غاروں کا انتخاب کیا، جہاں تحفظات کے علاوہ اسے پُرسکون گوشے بھی میسر تھے، تاکہ یہ اپنے جذبوں اور نتائج فکر کو دیواروں اور پتھروں کی چٹانوں پر نقش کردے اور اسی طرح دنیا کے مفکرین نے بھی غاروں ہی کی آغوش میں اپنے فہم وادراک کے سیکڑوں پیکر تراشے۔

ہندوستانی مصوری کی تاریخ دراصل انسانوں کی یکجہتی کی تاریخ ہے۔ ہزاروں سال پہلے کی ہندوستانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں موہنجو دارو اور ہڑپا کی تہذیب کے وہ رنگ سامنے آتے ہیں جن میں اسیریا دور کے تہذیبی ورثوں سے ہم نے بہت کچھ لیا ہے۔ ہندوستان میں جب ویدک سماج کی ابتدا ہوئی تو اس میں بھی ہم کو ایران سے ویدک سماج کے گہرے تہذیبی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ آریاؤں کی تہذیب ہندوستان کی گود میں آکر یہاں کی پرانی تہذیب سے ہم آہنگ ہوگئی۔ سکندر کا حملہ ہندوستان کی تہذیب کو ایک نیا رنگ دینے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ان یونانیوں نے یہاں کے تہذیبی اقدار کو اپنے سینے سے لگالیا اور بہت سے تو یہاں کا مذہب قبول کر کے یہیں کے ہوگئے۔

موریا حکمرانوں نے بھی اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لئے ایرانیوں کا لایا ہوا ایرانی حسن ورنگ، تہذیب وثقافت اور ہندوستانی پیار، محبت اختیار کیا۔ ایسا ہی ساکا راد ور حکومت میں بھی ہوا۔ گاندھارا دور جو یونانی اور ہندوستانی تہذیب کی آمیزش کا بہترین نمونہ ہے۔ جس میں یونانیوں نے نہ صرف بدھ مت کو قبول کرلیا تھا بلکہ بدھ کو اپنے خداؤں کے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ حسن کاری میں گاندھارا تہذیب کے دور کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی دور میں بت تراشی اور مصوری کے نئے نئے اسلوب بنائے گئے۔ وسیع پیمانے پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے گئے۔

2530 ق م میں مصر کی سرزمین پر بنا ہوا ایک مجسمہ۔ جس کی اونچائی 65 فٹ اور لمبائی 228 فٹ ہے۔ جس کا جسم شیر کا جو قوت وجبروت کی نمائندگی کرتا ہے۔ چہرہ انسان کا جو فراعنۂ مصر کے نہ صرف مشابہ ہے بلکہ عقل وفہم کی نمائندگی بھی کرتا ہے، فن کار کی یہ تخلیق جسے آج ہم ابوالہول کہتے ہیں، دو طاقتوں کی یکجہتی کا اعلیٰ نمونہ متصور کیا جاتا ہے۔

1952 کی بات ہے کہ میں بھی ایک مجسمے سے اتنا متاثر ہوا تھا جتنا کہ کوئی شخص ابوالہول کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ میں اور ملک کے مشہور مصور ایم ایف حسین ایلفنٹا غار دیکھنے کے لئے بمبئی روانہ ہوئے۔ نیلگوں لہروں کے ہچکولے کھاتے ہوئے ناؤ ایلفنٹا غار کے کنارے پہنچی۔ ہم دونوں اپنے برش اور کاغذ لے کر اتر پڑے۔ حسین کے لئے یہ جگہ نئی نہیں تھی لیکن میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ کچھ دور تک ہم بھورے سبز اور سرمئی نشیب وفراز سے گذر کر پتھروں میں تراشے ہوئے مجسموں کی ایک محفل میں جا پہنچے جس میں ایک مورتی جو صدر محفل دکھائی دے رہی تھی، ہماری نظروں سے دل ودماغ پر چھا گئی۔ تقریباً 20 فٹ کے فاصلے پر ہم صدر محفل کا آنکھوں آنکھوں میں آداب بجالا رہے تھے۔

سینے تک تراشی ہوئی یہ مورتی بھرے بھرے بازوں والے جسم پر تین سر لئے جلوہ نما تھی جن کا ہر چہرہ اپنی خاص معنوی شان وشوکت لئے ہوئے ایک پورٹریٹ آرٹسٹ کو دعوت نظر دے رہا تھا۔ اس باوقار اور لئے دار مجسمے کے آگے میں مبہوت کھڑا تھا۔ اپنے برش کو جنبش بھی نہ دے سکا۔ اتنے میں حسین نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، چلو یار اپنا کام کریں۔ حسین کے چھونے سے میرے جسم میں جمالیاتی برقی رو دوڑ گئی۔ مورتی کا درمیانی چہرہ مجھ سے کہہ رہا تھا میں خالق ہوں۔ دائیں جانب والا چہرہ کہہ رہا تھا میں رزاق ہوں۔ بائیں جانب والا چہرہ کہہ رہا تھا میں قہار ہوں۔ میں شبیہ کے ان تین عظیم کرداروں کو ان کی عظمتوں کو خطوط میں تبدیل کر رہا تھا۔ جمال وجلال کی ہم آہنگی کا یہ حسین پیکر بول رہا تھا۔

حسن کی تخلیق دلوں کو جوڑتی ہے فن کار وہ ہے جو یکجہتی کی راہ پر بنی نوع انسان کی راہبری کرے اور اسے نور مطلق سے قریب تر کردے۔ غروب

آفتاب سے قبل ہم فن کار کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے واپس ہوئے۔

بابر ہندوستان آیا تو اپنے ساتھ ایرانی تہذیب وتمدن کی نایاب قلمی کتب بھی لایا جن کی تزئین وآرائش ایران کے نام ور مصوروں نے کی تھی جس میں مانی وبہزاد جیسے عظیم مصور بھی شامل تھے۔ بابر کے بعد جب ہمایوں برسراقتدار آیا تو اسے افغانوں سے شکست اٹھانی پڑی اور یہ ایران چلا گیا۔ لیکن دوبارہ جب پھر فاتح ہند کی حیثیت سے آیا ہے تو اس کے ہمراہ میر سید علی عبدالصمد جیسے نامور مصور تھے۔

شہنشاہ اکبر کو فنون لطیفہ سے والہانہ دلچسپی تھی۔ اکبر کو بچپن ہی سے فن مصوری کا بڑا شوق تھا۔ یہ اکثر مصوروں اور موسیقاروں کے پاس بیٹھا نظر آتا، چنانچہ اپنے دور حکومت میں فتح پور سیکری میں مصوروں کے لئے ایک بہت بڑا تصویر خانہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے فن کاروں کے لئے بھی ایک کارخانہ بنوایا تھا جس میں ہمہ اقسام کے کاریگر کام کرتے تھے۔ مثلاً لکڑی پر دہاتی نقش کاری، زیورات بنانے والے، ملبوسات کے ماہرین، ہتھیاروں پر نقش ونگار کرنے والے، خوش نویس وغیرہ۔

کبھی کبھی اکبر تصویر خانے میں آجاتا اور اپنی تصویر بنواتا اور خاص طور پر اصرار کرتا کہ اس کی پیشانی پر تلک ضرور لگائیں۔ اکبر فن مصوری کو فطرت کی پہچان کا ایک اعلیٰ ترین ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فنون لطیفہ انسانوں کے دلوں کو جوڑنے اور انہیں خوشی بخشنے کا بہترین وسیلہ ہیں۔ اکبر کے زمانے میں تصویر خانہ میں ہر ہفتہ مصوروں کی تخلیقات اور فن کاری کی نمائش منعقد ہوا کرتی تھی اور یہ اپنے امراوعظام کے ہمراہ نمائش دیکھتا، عمدہ تخلیقات کی ستائش کرتا اور ان پر تنقید کیا کرتا۔

آئین اکبری میں اس نے لکھا ہے کہ فن مصوری انسان کو خدا تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے اکبر کے تصویر خانہ میں ایک سو سے زیادہ مصور کام کرتے تھے۔ میر سید علی اور استاد عبدالصمد صدر شعبہ تھے۔ ان کے شاگردوں میں دسونت لال اور بسواں بہت مشہور ہوئے ہیں۔ ایران کے ان نام ور اساتذہ نے راجستھانی اسلوب کو جو اس وقت کا ہندوستانی مقبول عام طرز کار تھا گہرا مطالعہ کر کے اس میں ایرانی نزاکت وطریقہ ترتیب کو اس خوبی سے یکجا کیا کہ دنیائے آرٹ میں مغل آرٹ کے نام سے ایک نیا اسلوب وجود میں آیا جس کی آج بھی دنیا میں بڑی قدر ہے۔

مغل اسکول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ تصویر کے موضوع کو مذہبیت سے آزاد کر کے روزمرہ کی زندگی کی جانب مصوروں کی آنکھیں پھیر دیں جہاں ہندوستان کی رنگین یکجہتی رقص کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ اکبر کے زمانے میں مہابھارت جیسی مقدس کتاب جو سنسکرت میں لکھی ہوئی تھی، رزم نامہ کے نام سے فارسی میں منتقل ہوئی۔ جس کے حاشیے پر اس وقت کے نامور مصوروں نے 169 تصویریں بنائیں جو آج بھی جے پور کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ رامائن اور دمینتی جیسی مذہبی کتابوں کو بھی فارسی میں منتقل کیا گیا اور ان کے حاشیوں کو بھی لاجواب مصوری کے ذریعے سنوارا گیا۔

مختصر یہ کہ مغلوں نے ہندوستانی فنون لطیفہ میں حسن ومحبت پیار دیکجہتی کے ایسے ایسے نمونے چھوڑے ہیں کہ رہتی دنیا تک یاد کئے جائیں گے۔ یوں تو ہندوستانی تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کی کئی قومیں ہماری رنگین زمین پر حملہ آور ہوئیں اور یہاں کے دل آویز رنگوں کو مسخ کیا اور بعض تو یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ لیکن مغلوں نے بھارت ماتا کے دامن سے لپٹ کر اس کی خوبصورتی میں یکجہتی کی طرح اندازی کی اور اپنی پیشانی پر ہندوستانی مٹی سے قشقہ لگا کر اپنے سر کو فخر سے اونچا کیا۔

ہندوستانی تہذیب کے ان معماروں نے مختلف رنگوں کی یکجہتی سے جو گنگا جمنی تصویر بنائی تھی۔ اس پر فرنگی ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈال کر اس تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور پھر مقامی وقت کے سیاست دانوں نے ان کی دھجیوں سے اپنے اپنے پرچم لہرا کر ملک کے ٹکڑے کر دیئے:

مری زمین کے پیوند کتنے رنگیں ہیں
ہرے بھی لال بھی نیلے بھی اور پیلے بھی
ہیں اجلے اور کئی غمگسار کالے بھی
رنگوں کو قوم کے معنی بھی دیدیئے ہم نے
بنا کے فلسفے نسلوں کو رنگ بانٹے ہیں
ہر ایک رنگ کا پرچم بنا کے لڑتے رہے
یہ نیلا، پیلا، ہرا، لال اور کالا ہے
اسی جنون نے کاٹا ہے کتنے اپنوں کو
کٹے سروں سے لہو لال ہی تو ٹپکا ہے

1936 سے لے کر آج تک میں اپنے کینوس، کاغذ اور رنگ لئے ہوئے اپنے مشاہدوں اور جذبوں کی تصاویر بناتا ہوا دکن کے گلی کوچوں سے لے کر کھیتوں کے ہرے ہرے میدانوں میں سرگرداں رہا ہوں۔

بارش کا موسم تھا، لیکن بارش نہ ہونے سے کھیت سوکھ گئے تھے اور جگہ جگہ سے زمین کے ہونٹ پیاس سے تڑک گئے تھے۔ تالاب اور باولیاں خشک ہو گئی تھیں۔ جانوروں کی زبانیں باہر نکل آئی تھیں۔ درختوں کے سبز پیراہن گندمی اور خاکی ہو گئے تھے۔ تیس چالیس عورتوں اور بچوں کا جلوس گاتا

ہوا نکلا۔

آشنا اوشنا دروازہ کھولو

پانی نہیں ہے پانی ڈالو

اس جلوس کے درمیان دو عورتیں ایک موسل کے دونوں کنارے اپنے اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے تھیں۔ اس کے بیچ میں ایک مینڈک الٹا لٹک رہا تھا اور اس پر نیم کی ٹہنیاں باندھی گئی تھیں۔ یہ منظر تصویر کے لئے دلچسپ تھا۔ میں نے اس کے کئی خاکے بنائے اور آبی رنگوں سے اس کی رنگ کاری بھی کرتا رہا۔ لیکن ان کے گیت کے بول اور اس کے معنی میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ کچھ فاصلے پر چند مرد بھی جلوس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک شخص سے میں نے گیت کے معنی پوچھے تو اس نے بتایا کہ یہ لوگ اپنے پیراں سے دعا مانگ رہے ہیں کہ اے حسنؓ اور حسینؓ پانی نہیں ہے، پانی دو۔ میں نے کہا کہ بھائی وہ تو پیاسے ہی شہید ہو گئے تھے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ وہ خود پیاسے شہید ہو کر ہمارے لئے پانی چھوڑ گئے ہیں۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا ''کرشن''۔ کچھ دور تک میں اس کے ساتھ چلتا رہا اور تصویر کے لئے مشاہداتی مواد محفوظ کرتا رہا۔

محرم کا مہینہ ہے۔ محبوب نگر کے سب سے بڑے علم بٹھائے گئے ہیں۔ رات دن لوگ جوق در جوق آجا رہے ہیں اپنی اپنی منتیں چڑھا رہے ہیں۔ ہندو مسلم سب ہی شریک ہیں۔ علم دکن میں جس طرح بٹھائے جاتے ہیں ویسے ملک کے دوسرے علاقوں میں نظر نہیں آتے۔ عام طور پر علم کے پنجے پیتل یا چاندی کے بنائے جاتے ہیں اور بعض امرا کے پاس سونے کے بھی علم ہوتے ہیں۔ ان کی مختلف شکلیں اور کئی ڈیزائن بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بعض میں تو پنجتن کا طغرا ہوگا۔ بعض میں صرف علیؓ لکھا ہوا ملے گا۔ بعض چاند کی شکل یا گھوڑے کے نعل کی طرح ہوں گے جن کو لوگ نعل صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر جو شکلیں ملیں گی وہ ہاتھ کی ہتھیلی نما ہوں گی جیسے کہ سورج سے شعاعیں نکل رہی ہوں۔ درمیان کی پتی بڑی دونوں جانب درجہ بدرجہ چھوٹی ہوں گی۔ آخر میں چھوٹی ہلال نما پتیاں ہوں گی جن کو عام طور پر علم کے کان کہا جاتا ہے۔ ان میں لوگ بالیاں جھمکے وغیرہ ڈالا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی کئی اور طرح کے نمونے مل جاتے ہیں۔ اس پنجے کو بانس کی ایک لکڑی کے سرے پر باندھ دیا جاتا ہے۔ پھر لکڑی پر کئی رنگ برنگے کپڑے لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور اس پر ڈھٹیاں باندھی جاتی ہیں جن کے رنگ عام طور پر سبز اور بعض اوقات سرخ بھی ہوا کرتے ہیں۔ یہ ڈھٹیاں دیہاتی شملے کی طرح ہوتی ہیں جن پر انتہائی خوبصورت دیہاتی طرز کی قلم کاری ہوتی ہے اور عام طور پر ان پر مغل طرح اندازی کے اعلیٰ نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نقش کاری سنہری اور روپہلی کی جاتی ہے۔ ان ڈھٹیوں کو علم پر اس طرح باندھتے ہیں جیسے انسان کو کپڑے پہنائے ہوں۔ ان کے گلے میں موتیوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں اور بعض پنجے کی بیچ کی پتی کے پیچھے کی جانب سے ایک چھوٹی سی خوبصورت موتیوں سے سجی ہوئی چاندی یا پیتل کی چھتری بھی باندھی جاتی ہے جو ہندوستانی رسم و رواج میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔

علم کو دس دن تک اس طرح بٹھایا جاتا ہے، جیسے کوئی دس دن کا چلہ بیٹھا ہو۔ ان دنوں عاشور خانہ کی آہک پاشی ہوتی ہے۔ اس کی اندرونی و بیرونی دیواروں پر دیہاتی مصوری کے نمونے بنائے جاتے ہیں جن میں شیر، براق اور دُلدل کی تصویریں ہوتی ہیں۔ بُراق ایک سواری کا نام ہے، جس کا جسم گھوڑے کا، سر عورت کا ہوتا ہے۔ جس کے متعلق روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے معراج کی شب اس پر بیٹھ کر آسمانوں کی سیر کی تھی۔

اس عجیب خلقت جانور کو دیہاتی مصور خوبصورت مور کی دم لگاتے ہیں۔ دھڑ گائے کا، گلے میں ہندوستانی زیورات، پیروں میں پازیب سر پر دیوی دیوتاؤں جیسے تاج، پیٹھ پر راجاؤں کے بیٹھنے کی زین اور اس پر چھتر۔ شکلوں کا یہ امتزاج دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ علم کے دونوں جانب دو چوکیدار راجستھانی کے لباس میں ملبوس، ہاتھ میں چنور جیسے راجے مہاراجوں کے پاسبان۔ علم کے سامنے ایک بہت بڑا عود دان جس میں زائرین عود اور لوبان ڈالتے جاتے ہیں۔ ہر آنے جانے والے اس کی راکھ لے کر اپنی پیشانی پر لگاتے ہیں اور مسلم چٹکی بھر راکھ جسے عودی کہتے ہیں، تبرک کے طور پر اپنے منہ میں ڈال لیتے ہیں۔

عاشور خانہ کے سامنے میدان میں ایک بڑا الاؤ بناتے ہیں جو ایک دائرے کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کی آرائش بھی کی جاتی ہے۔ اس گڈھے میں لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی جاتی ہے اور رات میں الاؤ کے گرد گھوم کر ناچتے ہیں۔ دھپڑے بجاتے ہیں۔ یہ منظر دیہاتی رقص کا ایک عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس منظر کی ایک تصویر بنائی تھی جو آج کل اورینٹل میوزیم ماسکو میں لگی ہوئی ہے۔ جس کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے ہولی کے تہوار میں کاما دہن (یعنی دھلنڈی) کے موقع پر لوگ آگ لگا کر اس کے گرد رقص کرتے ہیں۔

دسویں دن علم مبارک کی سواری بڑے دھوم دھام سے نکالی جاتی ہے، سامنے تاشے، دھپڑے بجتے ہیں۔ یہ جلوس جس طرف سے گذرتا ہے، وہاں

دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ خاصہ میلہ لگتا ہے۔ راستے میں آبدار خانے ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پر عقیدت مند حضرات شربت پلانے کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔ اکثر مقامات پر لوگ اپنی اپنی منتیں چڑھاتے ہیں جس میں چھوٹی دھشیاں زیور پھول شامل رہتے ہیں۔ کہیں چوراہوں پر ہندو خواتین رنگ برنگے لباس پہنے، پتلے گھڑوں میں پانی نیم کے پتوں سے ڈھک کر، دیہاتی گیت گاتے، علم کے سامنے آکر اپنے گھڑوں کو ایک دائرے کی شکل میں رکھ دیتے ہیں اور اس دائرے کے گرد رقص کرتے ہیں۔ یہ منظر بالکل بدکما تہوار کی طرح ہوتا ہے۔ پھر گھڑوں کا پانی علم اٹھاتے ہوئے شخص کے پیروں پر ڈال کر علم کو پرنام کرتے ہیں۔ یہ جلوس بڑھتا رہتا ہے اور راہ میں کئی اور محلوں کے چھوٹے بڑے علم اور تعزیے بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ پھر یہ کسی تالاب کے کنارے جا کر ختم ہو جاتا ہے، جہاں علم ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

علم کا دس دن تک استادہ رکھنا اور دسویں دن کسی تالاب یا ندی کے کنارے اس کو ٹھنڈا کرنا بالکل گنیش چودس کے تہوار کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح درگاہوں کے سالانہ عرس اور ان کے لئے لائے جانے والے صندل اور پنکھوں کا جلوس، گیارہویں شریف کے جھنڈوں کے جلوس، یہ سب کے سب ہندوستانی رسم ورواج کی نقلیں ہیں، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی کسی اسلامی وغیر اسلامی ممالک میں اس طرح کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ رواج بھی قابل توجہ ہے۔

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمان ہلالی مہینوں سے اپنا سالانہ نظام الاوقات چلاتے ہیں۔ کسی مہینہ چاند اگر اپنے روایتی انداز سے ذرا بھی ٹیڑھا نکلے تو یہاں کئی مسلم عورتیں اس مہینے کو منحوس قرار دیتی ہیں اور اپنے بھائیوں پر بھاری سمجھتی ہیں، اس نحوست کو رد کرنے کے لئے دعائیں مانگی جاتی ہیں اور بھائیوں کے گلے میں مالائیں ڈالتی ہیں، جس میں ایک چاندی کا چاند بھی ہوتا ہے۔ اس موقع پر بھائی اپنی بہن کو حسب حیثیت تحفہ دیتا ہے۔ اگر چہ یہ رسم اب ختم ہوتی جارہی ہے، لیکن اصل میں یہ راکھی کی رسم کی نقل تھی۔

ہندوستان کی شادی کی رسومات کی رنگینی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ان رسومات کو مسلمانوں نے کس حسن وخوبی سے اپنایا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔ مانجھے کی رسم: عقد سے کم از کم تین روز قبل دلہن کے سارے جسم پر ہلدی مل دی جاتی ہے اور سارے گھر کے لوگ ایک دوسرے کے چہروں پر ہلدی ملتے ہیں۔ دلہن کو پیلے پیلے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ ہاتھوں کی حنا پیلے لباس میں جوانی کو نکھار دیتی ہے۔ عقد سے ایک دن قبل دولہے والے دلہن کے لئے ساچق کی رسم لاتے ہیں جس میں دلہن کے واسطے مہندی، ہلدی، زیورات، سرخ عروسی ملبوسات ہوتے ہیں۔ دوسرے دن جب دولہا دلہن کے گھر آتا ہے تو دلہن والے دروازے پر دولہا کو روک دیتے ہیں۔ اور پھر دلہن کو پردے میں رکھ کر دولہے پر چاول چھڑکے جاتے ہیں اور جواب میں دولہا بھی دلہن پر چاول پھینکتا ہے۔ اس رسم کے بعد محفل عقد شرعی طریقے پر انجام پاتی ہے۔

شام میں جلوہ کی رسم انجام پاتی ہے، جس میں سارے مہمان زرق برق ملبوسات میں شرکت کرتے ہیں۔ دولہا دلہن کو ایک پلنگ پر بٹھایا جاتا ہے۔ یہاں پہ بھی دولہا دولہن پر چاول پھینکتا ہے اور جواب میں دلہن بھی چاول کا چھڑکاؤ کرتی ہے۔ اس کے بعد کھوپرے میں یا کسی کٹورے میں تھوڑا سا پانی لے کر سورۂ شمس پڑھا جاتا ہے اسے پانی میں دم کر کے دولہا دلہن کو پلاتے ہیں۔ سورۂ شمس کا صوتی آہنگ ملاحظہ ہو:

والشمس وضحٰہا والقمر اذا تلٰہا والنہار اذا جلّٰہا

اسی آہنگ میں دواہ منتر ملاحظہ ہو جو شادی کے موقع پر پڑھا جاتا ہے:

اگنیہ یہ سواہا، سوریایہ سواہا، چندرما ے سواہا۔

یہاں پر مسلم عورتوں کے اس ذہن کا پتہ چلتا ہے جس میں تہذیبی یکجہتی کا جذبہ کہاں کہاں، ہندو روایات سے ہم آہنگ کیا گیا تھا، جواب ختم ہو رہا ہے۔ متذکرہ رسومات میں مصوروں کے لئے لاتعداد ایسے رنگین مناظر ملتے ہیں جن کی دنیائے حسن کاری میں مثال نہیں ملتی۔ مسلم خواتین کے اعتقادات سے قطع نظر مسلم مصوروں نے بھی بے حساب تصاویر ہندو کلچر پر بنائی ہیں۔ 1936 کی بات ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز مصور استاد اللہ بخش لاہوری مرحوم جو مغل طرز کار کے بڑے آرٹسٹ سمجھے جاتے تھے درج ذیل عنوانات پر تصویریں بنائی تھیں: رادھا اور کرشن، سیتا اور رام، لکشمن، شکنتلا وغیرہ۔ ان کے بعد ایرانی اور بنگالی یکجہتی طرز کے شہرۂ آفاق مصور استاد عبدالرحمٰن چغتائی نے بھی ہندو تہذیب پر خوب کام کیا۔ اس صاحب طرز مصور نے ساری دنیا سے لوہا منوایا اور ایک خاص اسلوب کا استاد مانا گیا۔

اسی دور میں خان بہادر سید احمد مرحوم اور سید جلال الدین مرحوم نے اجنتا کی اتنی کامیاب نقلیں کیں کہ ساری دنیا کی توجہ اجنتا آرٹ کی طرف مبذول ہوئی۔ 1950 میں مدراس کے سید احمد نے بھی ہندو مذہب کے موضوعات پر کافی شہرت حاصل کی۔ بمبئی کے ایک اور جواں سال مصور اے المیکر جن کا پورا نام احمد عبدالرحمٰن المیکر ہے۔ ہندو تہذیب وثقافت پر کئی تصاویر بنائیں۔ جس کی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا میں شہرت حاصل

ہوئی۔ اس نے تو یہاں تک کہا کہ ہمارے ملک کا آرٹ اتنا امیر وکبیر ہے کہ ہم لوگوں کو آرٹ سیکھنے کے لئے بیرون ملک جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس میں میری بھی ایک تصویر آویزاں ہے، جو ساتھو ہانہ دور پر بنائی گئی ہے جس کی تکمیل کے لئے پانچ سال کا عرصہ لگا۔ یہ دوسری صدی کا خاص ہندو دور ہے۔

ہندوستانی مصوری میں جس حسن کار نے سب سے زیادہ کام کیا وہ ہے اس صدی کا سب سے بڑا آرٹسٹ ایم ایف حسین جو اپنے ملک کے حسن کا بے انتہا شیدائی ہے۔ اس کی تصاویر میں ایک معصوم والہڑ دوشیزہ نظر آئے گی جس کا جسم ایلورا، کھجوراہو اور متھورا کے مجسموں سے بنا ہوا ہے۔ اس میں مہاراشٹر کی لچک دار پھرتی رقصاں نظر آئے گی۔ اس کا پیرہن اور رنگ راجستھانی جوانی لئے ہوئے ہوں گے۔ اس کے زیور کشمیری حسن کا حاصل ہوں گے۔ اجنتا کی آنکھیں، بنگال کے گیسو، دہلی کی ناک اور حیدرآباد کی شرم وحیا، یہ مرقع ہے اس کی محبوبہ کا۔ یہ اپنے ملک کی یکجہتی کا اعلیٰ ترین پیکر ہے جس میں ہماری ساری تہذیب سمٹ کر آگئی ہے۔

یہ مصور اپنی محبوبہ کے لئے سامان حسن تلاش کرتا ہوا ساری دنیا کے چکر لگاتا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ اس کی محبوبہ ہندوستانی پیراہن میں جتنی خوبصورت لگتی ہے دنیا کے کسی لباس میں اتنی خوبصورت نظر نہیں آتی۔ حسین کی محبوبہ جو آج مصوری کا ایک ایسا اسلوب بن چکی ہے، ساری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے، جس سے آج کی نسل بے حد متاثر ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے۔ جب ہمارے ملک میں راجہ روی ورما جیسا نامور مصور پیدا ہوا جس کا اسلوب مغرب زدہ تھا۔ اس نے ہندو مذہب پر کافی کام کیا۔ خصوصاً رامائن پر اس کا کام آج بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے لیکن بیسویں صدی حسین کی صدی ہے۔ اس نے ہندوستانی مصوری کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ اس نے ساری دنیا میں اپنے ملک کی عزت وناموس کو اونچا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت ہند نے حسین کو پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا ہے، لیکن حسین اس اعزاز سے بھی بڑا آدمی ہے۔ ادھر چند برسوں سے یہ بھی رامائن پر بڑی بڑی تصاویر بنا رہے ہیں جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جب بھی ان تصاویروں کی نمائش ہوگی تو نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ ساری دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ حسین کے اس منصوبے کی تکمیل کے لئے شری بدری وشال پتی نے، جو عاشقان حسین میں پہلے آدمی سمجھے جاتے ہیں، حیدرآباد میں ان کے لئے ایک بہت بڑا نگار خانہ مختص کر دیا ہے، جہاں پر حسین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں اور خاص طور پر سنسکرت کے پنڈتوں کو بھی مقرر کیا گیا ہے تاکہ رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں کے سمجھنے میں حسین کی مدد کریں۔

مصوری کے علاوہ انہوں نے فلم جیسے طاقتور میڈیم کو بھی آزادانہ استعمال کیا ہے جن میں بعض کو بین الاقوامی انعامات بھی ملے ہیں۔ ان فلموں میں بھی حسین اپنے ملک کے ذرّے ذرّے میں حسن کا متلاشی نظر آتا ہے جہاں یکجہتی انگڑائی لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

OO

فلم

1857 اور 'اردو ہندی' سنیما

شبنم پروین

یہ اتفاق بھی کم دل چسپ نہیں کہ 1857 کی عظیم بغاوت کے پس منظر میں بنائی گئی جن دو فلموں کو ہندوستانی سنیما میں کلاسک کا درجہ حاصل ہوا ہے وہ دونوں بنیادی طور پر اردو فلمیں ہیں۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ تاریخی واقعہ رونما ہوا اس وقت تک اردو کو رابطے کی ایک ملک گیر قومی زبان کا درجہ حاصل ہو چکا تھا اور ہندوستانی اقتدار اعلیٰ کی علامت سمجھے جانے والے دہلی کے لال قلعہ کی زبان بھی اردو تھی۔ جو بھی تہذیب و ثقافت اس وقت شہروں اور دیہات میں نظر آتی تھیں ان میں اردو کی جڑیں بہت گہری اتر چکی تھیں۔ گویا عوام بھی اردو بول رہے تھے اور حکومت بھی! چنانچہ اردو اور 1857 کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جس ملک نے تعداد میں دنیا کو سب سے زیادہ فلمیں دی ہیں خود اس کی ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی زندگی کے اب تک کے سب سے اہم واقعات میں شامل 1857 کی شورش پر بہت ہی کم فلمیں بنی ہیں۔ 1931 میں پہلی بولتی فلم بننے کے بعد آج تک کوئی دس ہزار فلمیں طرح طرح کے موضوعات پر بنائی جا چکی ہیں۔ ان میں حب الوطنی کے موضوع پر بننے والی فلموں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اسے ایک ہٹ فارمولا آج بھی مانا جاتا ہے، جب کہ گلوبل ازم یا عالمیت پہلے سے کہیں زیادہ عوامی سوچ میں اپنی جگہ بنانے لگی ہے۔

لیکن ہندوستانی تاریخ میں جس سب سے بڑے ملک گیر پیمانے کے phenomenon نے غالباً سب سے زیادہ فیصلہ کن ثابت ہونے کی انفرادیت اختیار کی اور جو آج تک کا حب الوطنی اور مذہبی ہم آہنگی کا سب سے بڑا عملی مظاہرہ بھی مانا جاتا ہے اس پر مشکل سے دس فلمیں بھی نہیں بنائی جا سکیں۔

یوں سمجھ لیجئے کہ آزادی سے ایک برس پہلے 1946 میں ثریا اور سریندر کی فلم '1857' آئی تھی جس کے ہدایت کار موہن سنہا تھے۔ آزادی والے سال (1947) میں نند لال جسونت لال کی ہدایت میں مشہور ایکٹریس شوبھنا سمرتھ اور پریم ادیب کو لے کر بنائی گئی 'ویرانگنا' پردۂ سیمیں پر آئی۔ پھر 1951 میں تاریخی فلمیں بنانے میں مہارت رکھنے والے ہندی سنیما کے سب سے اہم فلم ساز، ہدایت کار و اداکار سہراب مودی نے اپنی زندگی کی سب سے مہنگی فلم 'جھانسی کی رانی' پیش کی جس میں مودی کے علاوہ ان کی اہلیہ مہتاب، سپرو، مبارک اور شکیلہ نے اہم کردار نبھائے تھے۔ 1960 میں جے راج اور نروپا رائے کی فلم 'لال قلعہ' نمائش کے لئے پیش کی گئی جو تنازعہ کا شکار ہو گئی۔

یہ سبھی فلمیں سپر فلاپ ثابت ہوئیں۔ 'جھانسی کی رانی' تو اس بری طرح

ناکام ہوئی کہ ہندی فلموں کے بے تاج سہراب مودی کا پورا کیریئر ہی تباہ ہو گیا اور ہر چند کہ انہوں نے بعد میں کچھ اور چھوٹی موٹی کم بجٹ کی فلمیں بنائیں مگر دوبارہ پٹری پر نہ آ سکے۔

صرف تین فلمیں، ستیہ جیت رے کی 'شطرنج کے کھلاڑی' (1977) شیام بینیگل کی 'جنون' (1978) اور عامر خان کی 'منگل پانڈے' (2005) رہیں جنھوں نے باکس آفس پر تھوڑا بہت بزنس کیا۔ ('منگل پانڈے' کے نام سے شتروگھن سنہا کی بھی ایک فلم 1983 میں آئی تھی مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ تاریخ سے نہیں بلکہ ڈاکوؤں سے متعلق ایک معمولی کمرشیل فلم تھی) عامر خان کی فلم 'منگل پانڈے' کا اصلی نام The Rising:Ballad of Mangal Pandey تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے 1857 کے آس پاس کے زمانے کو پس منظر میں رکھتے ہوئے 'لگان' پروڈیوس کی تھی جو اتنی کامیاب ہوئی کہ ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں آج تک سب سے زیادہ منافع دینے والی فلم مانی جاتی ہے۔ مگر اس میں ہندوستان کی سب سے پہلی جنگِ آزادی موضوع نہیں تھی۔ البتہ ہندوستانی عوام اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان بڑھتی ہوئی کشمکش اور نفرت کو اس میں بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا گیا تھا۔

یہ حسنِ اتفاق بھی کم دل چسپ نہیں کہ 1857 کی عظیم بغاوت کے پس منظر میں بنائی گئی جن دو فلموں کو ہندوستانی سنیما میں کلاسک کا درجہ حاصل ہوا ہے وہ دونوں ('شطرنج کے کھلاڑی' اور 'جنون') بنیادی طور پر اردو فلمیں ہیں۔

اس کی خاص وجہ غالباً یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ تاریخی واقعہ رونما ہوا اس وقت تک اردو کو رابطے کی ایک ملک گیر قومی زبان کا درجہ حاصل ہو چکا تھا اور ہندوستانی اقتدارِ اعلیٰ کی علامت سمجھے جانے والے دہلی کے لال قلعہ کی زبان بھی اردو تھی۔ جو بھی تہذیب و ثقافت اس وقت شہروں اور دیہات میں نظر آتی تھیں ان میں اردو کی جڑیں بہت گہری اتر چکی تھیں۔ گویا عوام بھی اردو بول رہے تھے اور حکومت بھی! چنانچہ اردو اور 1857 کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

'شطرنج کے کھلاڑی' اگرچہ 1857 سے سیدھا تعلق نہیں رکھتی تھی مگر اس دور کے سیاسی حالات اور ہندوستانی سماج پر پڑنے والے ان کے اثرات اس میں بخوبی پیش کیے گئے تھے۔ کئی خوبیوں کی وجہ سے 'شطرنج کے کھلاڑی' نے ایک بڑی کلاسک فلم کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔

ایک تو یہ دنیا کے سب سے اہم فلم ہدایت کاروں میں شمار ہونے والے ستیہ جیت رے کی پہلی غیر بنگالی اور واحد 'اردو فلم' تھی، جس کی کہانی بھی اردو کے عظیم افسانہ نگار منشی پریم چند کے اسی نام سے لکھے گئے افسانے سے اخذ کی گئی تھی۔ دوسرے اس میں ہندوستان کی پہلی عظیم بغاوت سے ایک سال پہلے 1856 کے ان سیاسی حالات کو پوری غیر جانب داری سے پیش کیا گیا تھا جو بعد میں اس بغاوت کا سبب بنے۔ تیسرے اس میں پریم چند کے افسانے کو حقیقتوں کا رنگ بھر کر بے حد اثر انگیز توسیع دی گئی تھی اور کہانی کے تاروں کو ریاستِ اودھ کو اپنی ماتحتی میں لینے کی انگریزوں کی کوششوں اور نواب واجد علی شاہ کے محل کے حالات و واقعات سے براہِ راست جوڑ کر کینوس کو اور وسیع کر دیا گیا تھا۔

ورنہ پریم چند کی کہانی زیادہ تر لکھنؤ کے دو رئیسوں میر سجاد علی (سنجیو کمار) اور میر روشن علی (سعید جعفری) کے شطرنج کے جنون پر مرکوز تھی اور وہیں تک رہ کر انہوں نے اودھ کے سماجی انحطاط کو انڈر لائن کیا تھا۔ یہ دونوں کردار شطرنج میں اس بری طرح ڈوبے ہوئے ہیں کہ اپنی اپنی بیویوں (شبانہ اعظمی اور فریدہ جلال) کی بھی انہیں فکر نہیں۔ اول الذکر اپنے میاں سجاد علی کے انتظار میں بستر پر کروٹیں بدلتی اور حقہ پیتی رہتی ہے۔ اور ثانی الذکر نے عمر میں بڑے اپنے میاں کے شطرنجی شوق کا فائدہ اٹھانے کے لئے ایک نوجوان عاشق (فاروق شیخ) کو ڈھونڈ رکھا ہے۔ ستیہ جیت رے، کہانی میں ان بھی معاملات کو جوڑ کر اپنی روایتی فنکارانہ چابک دستی سے یہ دکھانے میں بے حد کامیاب رہے کہ اس دور کے رؤسا اور امرا کا طبقہ عوام کے حالات اور ان کی پریشانیوں سے کس حد تک بے گانہ تھا اور یہ کہ بظاہر ایک بے ضرر سے کھیل کا شوق بھی تواتر کی وجہ سے پوری زندگی پر حاوی ہو جانے والی عادت بن کر سماج کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔

کئی ناقدین مانتے ہیں کہ ستیہ جیت رے کی بنگالی فلموں کے مقابلے میں 'شطرنج کے کھلاڑی' قدرے کم زور فلم تھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اپنی زبان کی بجائے کسی دوسری زبان (اردو) میں فلم کو اس کے اصلی لہجے، تہذیبی و ثقافتی روایتوں اور باریکیوں سے ہم آہنگ رکھنے کے لئے غیر معمولی ذہانت درکار ہے اور 'شطرنج کے کھلاڑی' میں ستیہ جیت رے نے اس ذہانت کا نہ صرف بھرپور مظاہرہ کیا بلکہ یہ بھی دکھا دیا کہ جینیس ہر زبان اور ہر میڈیم میں جینیس رہتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ فلم رے کی اس پیشہ ورانہ دیانت داری کے لئے بھی یاد رکھی جائے گی کہ واجد علی شاہ کے نہایت پیچیدہ کردار کے لئے مرحوم امجد خان کو بطور اداکار منتخب کرنے کے بعد ایک حادثے میں ان کے بری طرح زخمی ہونے اور تقریباً ایک سال تک بستر پر رہنے کے باوجود رے نے اپنے انتخاب میں تبدیلی نہیں کی اور یہی کہتے رہے کہ میں امجد کے صحت یاب ہونے کا انتظار کروں گا۔ اور پھر جس حسن ادا سے یہ کردار امجد نے نبھایا اسے

بھی ہمیشہ یادر کھا جائے گا۔

شیام بینیگل کی 'جنون' بھی ایک ایسی ہی کلاسک فلم ثابت ہوئی جو 1857 کی خونریزیوں کے پس منظر میں بنائی گئی تاہم اُس کا اس عظیم بغاوت سے ذرا اور گہرا تعلق تھا۔ اور یہ بھی ایک خوب صورت اتفاق ہے کہ یہ دوسری کلاسک بھی ایک 'اردو فلم' ہے، جس میں اردو کی عظیم افسانہ نگار عصمت چغتائی نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا (فلم کے مکالمے بھی عصمت چغتائی اور ستیہ دیو دوبے نے مل کر لکھے تھے) رسکن بونڈ کے مشہور ناول Flight of The Pigeons پر بنائی گئی اس فلم کے پروڈیوسر ششی کپور نے نوجوان زمیندار جاوید خان کا مرکزی کردار ادا کیا تھا جس کا بھائی سرفراز (نصیر الدین شاہ) ایک کٹر انگریز دشمن ہے۔

منگل پانڈے کو پھانسی دی جا چکی ہے، انگریزوں کے خلافت بغاوت پورے شمالی ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے، اور باغی سپاہی انگریزوں کو قتل کرتے پھر رہے ہیں۔ ایک گرجا میں اتوار کی عبادت کے دوران ہونے والے قتلِ عام کے بعد زندہ بچ جانے والی لباڈور Labadoor خاندان کی نوجوان اور بے حد خوب صورت رُتھ لباڈور (نفیسہ علی) اس کی ماں مریم لباڈور (جینیفر کینڈل، ششی کپور کی مرحوم اہلیہ) اور علیل 'اینگلو انڈین' نانی (عصمت چغتائی) کو پہلے ایک ہندو مہاجن موہن لال (کل بھوشن کھر بندا) کے یہاں پناہ ملتی ہے جہاں سے کبوتروں کا شوقین جاوید انہیں اپنے گھر لے آتا ہے۔ جاوید، رُتھ پر پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو چکا ہے اور اسے اپنی بنانا چاہتا ہے۔ اس کی جوان بیوی فردوس (شبانہ اعظمی) مزاحمت کرتی ہے لیکن تابہ کے۔ چھوٹا بھائی سرفراز باغی سپاہیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو قتل کرتا پھر رہا ہے۔ رُتھ جاوید سے خائف ہے اور وہ چاہے تو اس کے ساتھ زبردستی بھی کر سکتا ہے مگر پٹھانی خودداری اسے روکتی ہے۔ جاوید اس سے باقاعدہ نکاح کرنا چاہتا ہے مگر رُتھ کی ماں مریم سخت رخ اپنا لیتی ہے۔ دہلی پر قبضے کے لئے باغیوں اور انگریزوں میں جاری خونیں کشمکش کی خبریں لگاتار آرہی ہیں اور ایسے میں مریم جاوید کے سامنے شرط رکھتی ہے کہ رُتھ سے اس کا نکاح تبھی ہوگا جب ہندوستانی باغی دِلّی جیت لیں گے۔

اس طرح 'جنون' عشق اور خون میں ڈوبی ہوئی ایک شیریں مگر تلخ داستان بن جاتی ہے، جس میں بینیگل نے دونوں پہلوؤں کے درمیان ایک فنکارانہ توازن برقرار رکھا ہے۔

ہدایت کار کیتن مہتہ اور پروڈیوسر بابی بیدی کی 'منگل پانڈے' کا تو موضوع ہی 1857 ہے۔ عامر خان نے اس میں منگل پانڈے کا مرکزی کردار ادا کیا، جسے میرٹھ کی بغاوت کی پاداش میں پھانسی دے دی جاتی ہے۔ اگر چہ اس فلم کو 'شطرنج کے کھلاڑی' اور 'جنون' جیسی کلاسک فلموں کا درجہ حاصل نہیں ہو پایا پھر بھی فلم ڈرامائی واقعات، اس دور کی بڑی حد تک حقیقت آمیز عکاسی اور اے آر رحمان کی بہترین موسیقی کی وجہ سے یادر کھی جائے گی۔

لیکن عجیب بات ہے کہ بہت بڑے بجٹ سے بنائی گئی یہ فلم بھی شروع میں نہ صرف تنازعے کا شکار رہی بلکہ اس سے چوتھائی کامیابی اور مقبولیت بھی نہ حاصل کر سکی جو اس سے پہلے کی فلم 'لگان' نے حاصل کی تھی۔

تو سوال گھوم پھر کر وہی آتا ہے کہ 1857 ہندوستانی فلموں کے لئے ایک ہٹ فارمولہ کبھی کیوں نہیں بن پایا اور اس پر اتنی کم فلمیں کیوں بنی ہیں؟ فلمی مورخ فیروز رنگون والا کی مانیں تو "بالی وڈ کے فلم سازوں کو ہمیشہ تاریخ سے متعلق تنازعات میں گھر جانے کا خوف رہتا ہے اس لئے وہ 1857 کو چھونے سے ڈرتے ہیں۔"

شیام بینیگل کہتے ہیں: "بالی وڈ میں 1857 کو ایک نحس اور نامبارک موضوع مانا جاتا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پانچویں اور چھٹی دہائی میں فلمی سرمایہ کار اس میں ہاتھ ڈالنے سے بچتے تھے۔"

غالباً اس رجحان کی ابتدا 'جھانسی کی رانی' جیسی اس دور کی سب سے مہنگی فلم کی زبردست ناکامی سے ہوئی تھی۔ سہراب مودی نے اس سے پہلے کی اپنی کامیاب ترین فلم 'مرزا غالب' میں (جو ہندوستان کی پہلی فلم تھی جسے نیشنل ایوارڈ دیا گیا) جو کچھ کمایا تھا وہ سب اس فلم کے ساتھ ڈوب گیا۔ خود سہراب مودی بھی ایسے ڈوبے کہ پھر نہ ابھر سکے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ 'مرزا غالب' اسی زمانے سے تعلق رکھنے والی "آدھی حقیقت آدھا فسانہ" جیسی ایک فلم تھی مگر اس قدر کامیاب رہی کہ لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ اس کے برعکس پہلی رنگین فلم 'کسان کنیا' (1937) کے بعد آزاد ہندوستان کی پہلی رنگین فلم کے طور پر 'جھانسی کی رانی' فلم کے پردے پر آئی تو سنیما ہال خالی پائے گئے۔

'مرزا غالب' کی کامیابی کا کھلا راز تھیں ثریا اور غلام محمد کی موسیقی۔ لیکن توہمات میں حقیقتیں ڈھونڈنے والے مانتے ہیں فلم کی بے پناہ کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ اس میں 1857 کو سہراب مودی نے چھوا تک نہیں تھا، جب کہ غالب اس کے نہ صرف چشم دید گواہ تھے بلکہ وہ ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ بھی تھا۔ اور چونکہ 'جھانسی کی رانی' خود 1857 کو ہی پیش کرتی تھی اس لئے فلاپ ہوگئی۔ اور اس حقیقت سے کس طرح انکار ممکن ہے کہ 1857 خود بھی تکلیف دہ ناکامیوں کا سال ثابت ہوا تھا!

OO

بابِ طنز و مزاح

تحریکِ آزادی کے پس منظر میں

متفرقات

جلوۂ دہلی دربار

اکبرالہ آبادی

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

خیموں کا اک جنگل دیکھا
اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا
عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا
بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا
دل دربار سے اٹکا دیکھا

نظم ہے مجھ کو بادۂ صافی
شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی
خیر اب دیکھئے لطف قوافی

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری
پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری
تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم
ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم
میلوں تک وہ چم چم چم چم

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

کچھ چہروں پر مردی دیکھی
کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی
دل نے جو حالت کردی دیکھی

پُر تھا پہلوئے مسجد جامع
روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع
سب کے سب تھے دید کے طامع

پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

ڈالی میں نارنگی دیکھی
محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی
دہر کی رنگا رنگی دیکھی

سرخی سڑک پر کٹتی دیکھی
سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی
لطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اک چوکھی دیکھی
خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی
شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصہ من و سلوا
ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا
میرا حصہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا
پرتو تخت وتاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا
رخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر
تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت ودانش ان کے اندر
اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوج بخت ملاقی ان کا
چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

ہم تو ان کے خیر طلب ہیں
ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
ان کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں
سب سامانِ عیش وطرب ہیں

اگزیبیشن کی شان انوکھی
ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی
من بھر سونے کی لاگت سوکھی

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہے
شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے
قصۂ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہور کوچہ وبرزن
ہاں میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے پرزن
رشک سے دیکھ رہی تھی ہرزن

گو رقاصہ اوج فلک تھی
اس میں کہاں پہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی
بزم عشرت صبح تلک تھی

کورانہ انگریز پرستی

اسماعیل میرٹھی

...رہا وہ جرگہ جسے چر گئی ہے انگریزی
سوواں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار
وہ آنکھ میچ کے برخود غلط بنے ایسے
کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار
جو پوششوں میں ہے پوشش تو بس دریدہ کوٹ
سواریوں میں سواری تو دم کٹا رہوار
جو اردلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید
بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار
وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمین
اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار
نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق، نے خدا ترسی
گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار
وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں یا ریڈیکل ہیں
مگر ہیں قوم کے حق میں بصورت اغیار
نہ انڈین میں رہے وہ نہ وہ بنے انگلش
نہ ان کو چرچ میں آنر نہ مسجدوں میں بار
نہ کوئی علم نہ صنعت نہ کچھ ہنر نہ کمال
تمام قوم کے سر پر سوار ہے ادبار

علامہ شبلی نعمانی

طنطراق لیگ

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظرِ لطفِ رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
کوئی ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں رندے آشام بھی ہے
فیض اس کا ہے باندازۂ طالب یعنی
بادۂ صاف بھی ہے دردِ تہہ جام بھی ہے
کعبۂ قوم جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
مرجع خاص ہے یہ، قبلہ گہِ عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لئے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طمع خام بھی ہے
رہنمایانِ نوآموز کا ہے مکتب درس
زینۂ فخر و نمائش گریٔ عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثارِ نفوس
ان میں طرزِ عمل بوسہ بہ پیغام بھی ہے
صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پُرآب
دل میں غم خواریٔ ترکانِ نکونام بھی ہے

مختصر اس کے فضائل کو جو پوچھے تو یہ ہیں
محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح نصرف میں ایک قاعدہ ادغام بھی ہے

***　***　***

اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست
ورقِ سادہ بھی ہے کلکِ خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جابجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں کچھ حلقۂ خدام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریح و سیاحت مقصود
سفرِ درجۂ اول کے لئے دام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گزارش ہے حضور
گرچہ یہ سوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
''سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے''

پہلی جنگ عظیم اور ہندوستانی

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ زن لم یزل
آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعوئے غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
''اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں''

شاعرِ اودھ پنچ

واسوخت*

گورے اور کالے

یادِ ایّام کہ جرأت کا کہیں نام نہ تھا
کبھی خودرائی کا ہم پر کوئی الزام نہ تھا
لکھنے پڑھنے کا کوئی گھر میں سرانجام نہ تھا
بھولے ایسے تھے سمجھنے سے کبھی کام نہ تھا
گھی کے اور دودھ کے تھے یاد سمندر تم کو
گھڑکیاں دور ہی سے دیتے تھے بندر تم کو

ایک دن وہ تھا لنگوٹی بھی نہ باندھ آتی تھی
ترکی ٹوپی کی بھلا وضع کہاں بھاتی تھی
کب چپت گاہ پہ مندیل بھی جاتی تھی
سیر دریا کی نہ یوں آپ کو لہراتی تھی
سر و گردن کا مری جان تمھیں ہوش نہ تھا
قومی ہمدردی کا پہلے تو کبھی ہوش نہ تھا

اب تو ہر وقت تمھیں رہتا ہے اخبار سے کام
ملکوں ملکوں کے گزرنے لگے پرچے پیغام
کھچڑی پکتی ہے بدل جاتے ہیں جلسوں کے مقام
اب تو ہر لحظہ ہے اپنے لئے مشکل الزام
برملا ہونے لگی اب تو شکایت اپنی
خیر سے آپ بھی اتنے ہوئے اللہ غنی

سب سے اخلاص ہے ہم سے تمھیں کچھ پیار نہیں
اپنی ہر بات پہ ہوجاتی ہے ہر بار نہیں
کوئی جلسہ ہو تمھیں جانے سے انکار نہیں
کالے گورے کی تمیز آپ کو زنہار نہیں
دل میں جرأت ہے خیالات میں آزادی ہے
کہیے ان باتوں کا ہم سا کوئی کب عادی ہے

اپنے حق کا کبھی دعویٰ کہو آگے کب تھا
اتنا سروس کا تقاضا کہو آگے کب تھا
انتظامات میں جھگڑا کہو آگے کب تھا
لڑنے بھڑنے کا سلیقہ کہو آگے کب تھا
خشک وعدے بھی جو کرتے تھے تو جی جاتے تھے
غصے ہو کر جو گھڑکتے تھے تو پی جاتے تھے

آ تو مغلانیاں رکھ رکھ کے سکھایا ہم نے
لکھنے پڑھنے میں تمھیں طاق بنایا ہم نے
کرسیوں پر تمھیں جلسوں میں بٹھایا ہم نے
مانو احسان تو انسان بنایا ہم نے
پائی تعلیم تو اندازِ ادب بھول گئے
بھر گئی ایسی ہوا سر میں کہ سب بھول گئے

خیر اگر جوتیاں کھانے سے ہے تم کو اکراہ
جوتی خوروں کا ہے کچھ قحط عیاذاً باللہ
گرم بازارِ خوشامد ہے کہ خلقت ہے تباہ
کچھ نہ کچھ یاں بھی نکل آئے گی صحت کی راہ
تم جو مختار ہو بے بس نہیں ہم بھی صاحب
شہر معمور ہے مفلس ☆ نہیں ہم بھی صاحب

OO

* مطبوعہ اخبار اودھ پنچ لکھنؤ مورخہ 3 جولائی 1877

☆ خانساماؤں کی اصطلاح

شگفتہ نگاری

مشفق خواجہ پر ساقی فاروقی

پیارے

شمس الرحمٰن، مشفق خواجہ نے اپنے رنگیلے ہمزاد ''خامہ بگوش'' کے کالموں کا مجموعہ بھجوایا ہے۔ اسے میرے تمہارے اور مشفق کے مشترک دوست اور منفرد نقاد مظفر علی سید نے مرتب کیا ہے۔ مظفر، شمس الرحمٰن اور ساقی ایک اور اہم بالا قدری کے ساجھے دار بھی ہیں کہ ان تینوں کے ساتھ شق القمری (سینہ شگافی) کا معجزہ ہوا۔ افسوس کہ اپنی شقی القلبی کے باعث ''خامہ بگوش'' کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ چلو اچھا ہی ہوا ورنہ ادب کے سینے پر مونگ کون دلتا۔ مگر اس کی شستہ اور سلیس نثر میں مونگ دلنے سے زیادہ ہینگ ملنے کی کیفیت ہے اور پھٹکری کے بغیر بھی رنگ چوکھا ہے۔

(وقفہ لطیفہ)

روایت ہے کہ مشہور نقاشِ قدرت و نقاشِ فطرت میاں ایم اسلم، علامہ اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ بیان کر رہے تھے۔ ''ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اودی اودی مرغیاں اپنے چھپنی چھپنی دڑبوں کی طرف محو خرام تھیں۔ شام کاذب جیسے دوشیزہ شب کا راتب ہونے والی تھی۔ لاہور کی گلیوں میں جوان جوان بیوائیں یتیمانہ چہل قدمی کر رہی تھیں اور ان گدڑی کے لالو (لعلوں) کی گدڑیاں خاص خاص جگہوں سے مسک گئی تھیں۔ غرض کہ میں ان کے حرماں نصیب گلابی گلابی سینوں اور شہابی شہابی کولہوں سے نگاہیں بچاتا اور ان کی اور اپنی تقدیر پر کڑھتا کڑھاتا علامہ کے دولت کدے تک پہنچا جو میرے تینوں غریب خانوں کے مقابلے میں خاک نہیں تھا اور صحیح معنوں میں ''غریب خانہ'' کا اطلاق ایسے ہی مکانوں پر ہونا چاہئے۔

دیکھا کہ حضور علامہ، مغربی دیوار کی طرف منہ کئے، کمرے کے بیچوں بیچ اپنی کھرّی چارپائی پر لیٹے، اپنا اسلامی تہمد پہنے ہوئے، قوم کی فکر میں پیچواں گڑگڑا رہے ہیں۔ ہر کش پر سلفے کی لٹ چلم سے نکل کر فضاؤں میں، بٹی ہوئی رسی کی طرح، ''لا الہ'' بناتی ہوئی، روشندان سے نکل کر عربستان کی طرف چلی جاتی تھی۔ میں ادھر چٹائی پر پہروں کنگارو کی طرح اکڑوں بیٹھا رہا۔ وہ ادھر کسی مسیحا کی طرح حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے لیٹے رہے۔ گاہے گاہے اُس ناطق زمانہ کے سامنے وہ بے جان بولتا رہا۔ ناگہاں علامہ علیہ الرحمۃ، مجھ سے مخاطب ہوئے ''میاں کچھ لکھتے لکھاتے ہو؟'' ان کی پاٹ دار پُر وقار آواز سبحان اللہ۔ یوں محسوس ہوا کہ کوئی مومن شاہین کسی مردود نومسلم پر جھپٹ کر پلٹ گیا۔ میں گھگیاتے ہوئے ہکلایا کہ میرا کیا مقدور کہ آپ کے سامنے منہ کھولوں۔ فرمایا ''کھولو کھولو کہ اللہ نے دہن مبارک صرف کھانے پینے اور ڈکار لینے کے لئے نہیں بنایا۔'' وہ پیر جہاں دیدہ تھے جن کی مونچھوں کی سنت اسٹالن اور آئن اسٹائن جیسوں نے پوری کی، میں ایک جوان سعیدہ جس کی مسیں ابھی صرف تبسّم سے بھیگ رہی تھیں۔ میری کیا مجال تھی کہ حکم عدولی کرتا۔ تابڑ توڑ دو نظمیں داغ دیں کہ اس زمانے میں صرف نظمیں لکھتا تھا۔

علامہ علیہ السلام یکایک مراقبے میں چلے گئے۔ عرصہ بعد لوٹے اور کہا تو اتنا کہا ''میاں، نثر کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔'' بس وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے نظم نہیں چھوئی اور دمادم ناولوں کے انبار لگاتا چلا گیا۔'' لاہور کہ کبھی عالم میں انتخاب ہوا کرتا تھا وہاں کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس نہایت صبر سے میاں صاحب کی لنترانی سہتے رہے کہ ان کے پیٹ انواع و اقسام کی نعمتوں سے اور کان 444 صفحات کے ناول سے بھرے ہوئے تھے مگر اس سے پہلے کہ یہ زاغِ مُسلّم بن اسلم اپنے نئے ناول کا پلاٹ سنانا شروع کریں ایک نابغہِ روزگار بولا ''میاں صاحب، کاش آپ علامہ کو نثر کے بھی دو صفحے سنا آتے'' جس پر یہ بساط الٹی اور محفل برہم درہم ہوئی۔

(تتمہ واقعہ)

تو شمس الرحمٰن میری جان تم پوچھو گے کہ اس اصیل مگر طویل حکایت کی ضرورت کیونکر آن پڑی۔ ابھی بتاتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ایسے ہی لطائف ظریفانہ سے خامہ بگوش اپنا اور اپنے ہفتہ وار کالموں کا پیٹ بھرتا ہے۔ عجب سلیقے اور نیم نام سے چٹکلے جڑتا ہے کہ قاری ہنس ہنس کے اور ممدوح (جو اصل میں ''مہدوف'' ہوتے ہیں) زور و کے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تم دونوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ شگفتہ نثر کیسے لکھی جاتی ہے۔

باقی باقی

تم دونوں کا جانی دشمن، ساقی

بارے کرکٹ کا کچھ بیاں ہو جائے

یاور عباس

کرکٹ ایک ایسی لاعلاج بیماری ہے جو دنیا کے ہر اس حصے میں پائی جاتی ہے جہاں انگریز حکومت کر چکے ہیں۔ حکومت تو خیر انگریز امریکہ پر بھی کر چکے ہیں لیکن امریکہ اس بیماری سے بال بال بچا۔ پہلے اس کے کہ انگریز وہاں یہ رواج قائم کر سکیں، امریکیوں نے، خود انگریزی حکومت ہی کا رواج ختم کر دیا۔ اگر امریکیوں نے اپنی آزادی کی لڑائی کچھ دن اور اٹھار کھی ہوتی تو وہ ضرور اس مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتے، اور پھر نہ تو وہ آسانی سے آزادی حاصل کر پاتے اور نہ ہی ریڈ انڈین قوم کا اس مستعدی سے خاتمہ کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہوتا۔ جارج واشنگٹن کی برائی اور سوجھ بوجھ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے کرکٹ کے خطروں کو بھانپ لیا۔ ورنہ آج صدر امریکہ کی تقریر میں وہ لذت نہ ہوتی کہ جو انہوں نے کہا، برطانوی وزیر اعظم نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ انگریز نے، جو بڑی دور کی سوچتا ہے، اپنے ایشیائی جاسوس وہاں بھیج رکھے ہیں اور انہوں نے اس بیماری کے جراثیم وہاں پھیلانے شروع کر دیئے ہیں اور شاید وہ دن دور نہیں جب امریکی بھی ہماری طرح اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے پانچ پانچ روز تک لگاتار صبح سے شام تک ٹیلی ویژن کے سامنے دیدے پھوڑتے رہیں گے۔

بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ کرکٹ ایک سامراجی سازش ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ کرکٹ کی ایجاد اس وقت ہوئی جب انگریزی سامراج اپنے عروج پر تھا تو یہ تاثر اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

ایک تو سامراجیت میں خود ایک قسم کا پاگل پن ہوتا ہے جو سامراجیوں کو عجیب عجیب حرکتیں کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پھر سامراجی ان حرکتوں کو اپنی رعایا میں بھی رائج کر دیتے ہیں۔ تاکہ سامراج کے ختم ہونے کے بعد بھی کچھ ایسے رشتے قائم رہیں جنہیں توڑنا آسان نہ ہو، اور کرکٹ کا رشتہ انہی رشتوں میں سے ایک ہے۔

دنیا سے انگریزوں کی حکومت اٹھ جانے کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں آپ دیکھیں گے کہ جہاں کچھ دن پہلے انگریزی حکومت تھی وہاں اب بہت سے انگریزی رواج یا تو مٹا دیئے گئے ہیں، یا مٹائے جا رہے ہیں۔ مثلاً آزاد عدالتیں، آزاد پریس، آزاد پارلیمنٹ، آزاد زمین، لیکن کرکٹ ایک ایسا رواج ہے جس کا مٹانا تو در کنار اسے اور فروغ دیا جا رہا ہے۔ بلکہ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جیسے جیسے معاشرہ بگڑتا ہے، ویسے ویسے کرکٹ سدھرتا ہے۔ انگریز معاشرے کی صحت کا قائل کن ثبوت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی کہ انگریز کرکٹ میں پٹ رہا ہے۔

البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ کرکٹ صحیح معنوں میں انگریزی کھیل ہے۔ ایسا عجیب الخلقت ایسا محیر العقول کھیل صرف انگریز ہی ایجاد کر سکتا تھا۔ کسی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ بنی نوع انسان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک انسان، اور دوسرے انگریز۔ اور انگریز کی یہ ایجاد یعنی کرکٹ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے۔ ذرا سوچیے۔ انگلستان ایک سرد ملک ہے جہاں دھوپ موسم کے مطابق نہیں بلکہ کبھی کبھی شوقیہ جب اس کی مرضی ہو ذرا سی دیر کے لئے نکل آتی ہے اور جہاں بارش کو چھوٹ مل گئی ہے کہ جب اس کا جی چاہے ہو جائے۔ بلکہ جب اس کا جی نہیں چاہتا تب بھی خواہ مخواہ ہوتی رہتی ہے۔

تو اب ایسے ملک میں جس کے موسم کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ایسے کھیل کو ایجاد جس کا دارومدار سو فی صدی موسم پر ہے واقعی انگریز ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اب دیکھئے نہ تقریباً ہر کھیل بارش میں بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ فٹ بال، گلی ڈنڈا، رگبی، کبڈی، یہاں تک کہ ٹینس کے لئے بھی اوپر تنبو تان کر کچھ نہ کچھ انتظام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کرکٹ۔ ذرا بارش ہوئی اور کھلاڑی دوڑ کر ڈربے کے اندر۔ بلکہ کبھی کبھی تو بارش ہوئے بغیر ہی محض بادل گھر آتے ہے۔ کرکٹ کے سورما گھیری آئی بادری، تا ہین کھیلت بالما کا ملہار الاپتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر موسم کے علاوہ ایک ایسے ملک میں جہاں وقت بہت قیمتی بتایا جاتا ہے، ایک ایسا کھیل، جس میں وقت زیادہ سے زیادہ ضائع کیا جا سکتا ہے۔ کیا کوئی معمولی قوم ایجاد کر سکتی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے کی بات ہو تو کھیل کود کے قصے تمام کریں۔ جی نہیں کم سے کم ایک پورا دن۔ نہیں تو تین دن۔ لیکن صحیح معنوں میں پانچ دن جسے اصل کرکٹ کہا جائے۔ یعنی ٹیسٹ کرکٹ گویا امتحانی کرکٹ، جس میں کھیلنے والوں سے زیادہ دیکھنے والوں کا امتحان لیا جاتا ہے کہ کھیلنے والوں کو تو

اجرت بھی ملتی ہے اور انعام و اکرام بھی۔ لیکن دیکھنے والا بے چارہ پانچ روز کی متواتر مشقت جھیلنے کے بعد خالی ہاتھ ہی نہیں بلکہ خالی الذہن ہو کر اٹھتا ہے۔

خیر وقت، موسم، موقع محل، سب سے قطع نظر، صرف کھیل کو لے لیجئے۔ کوئی سا بھی کھیل، خواہ وہ دو آدمیوں کے درمیان، ہو جیسے ٹینس یا کشتی۔ خواہ دو سے زیادہ کے درمیان جیسے ہاکی، یا کبڈی اس میں سب کھلاڑی ایک ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ لیکن کرکٹ میں گیارہ کھلاڑی چار طرف، اور دو کھلاڑی بیچ میں، باقی نو کھلاڑی سائبان میں بیٹھے ہوئے ہماری اور آپ کی طرح تماشہ دیکھتے ہیں اور جتنی زیادہ دیر بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھتے ہیں اتنی ہی ان کی ٹیم اچھی گردانی جاتی ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ بیٹھ کر تماشہ دیکھنے والی ٹیم کو کھیلنے والی ٹیم کہا جاتا ہے اور دوڑ دھوپ کرنے والی ٹیم دوڑ دھوپ کرتی رہتی ہے۔ اس تمام سعی لاحاصل کا منصفانہ انجام، کبھی کبھی قدرت کی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے۔ آسمانوں سے قہر الٰہی نازل ہوتا ہے اور آن کی آن میں پورے کھیل پر پانی پھیر جاتا ہے۔

اب آیئے ایک طاہرانہ نظر اس کھیل کی اصطلاحوں پر بھی ڈال لیں۔

چھوٹی ٹانگ، چین کا آدمی، لمبی ٹانگ، بیچ میں احمق...

اب آپ ہی بتایئے کہ شارٹ لیگ، چائنا مین، لانگ لیگ اور سلی مڈ آن یا سلی مڈ آف کا اپنی زبان میں اور کیا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کی زبان میں تو خیر اس قسم کے جملے اور ترکیبیں ان کے انوکھے پن کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ لیکن جب کرکٹ کو کسی دوسرے دیس کی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اچھے اچھے اہل زبان منہ کھول کر رہ جاتے ہیں اور اگر وہ انگریزی زبان کا سہارا نہ لیں تو کرکٹ کے کسی میچ کا آنکھوں دیکھا حال کچھ اس روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ:

''انڈیا کے کپتان نے اب اپنی ٹیم کو سمیٹ کر انگلینڈ کے بلے باز کے ارد گرد جمع کر لیا ہے۔ پورا زور اب بلے باز کو ڈرانے اور دھمکانے پر ملچار ہا ہے۔ کپتان نے اب خود ہی گیند کھیلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلے باز کے بازو میں چار پھسلن ہیں اور اس کے بالکل نزدیک ایک واہیات نقطہ۔

''کپتان نے اپنی چھوٹی ٹانگ کو اور چھوٹا کر لیا ہے اور لمبی ٹانگ بالکل نکال دی ہے۔ ایک بیچ میں احمق کو دائیں طرف اور دوسرے بیچ میں احمق کو بائیں طرف جما دیا ہے۔ کپتان کھیلنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور ہر قسم کی گیند پھینک سکتے ہیں۔ میچ کا فیصلہ انہی چند گیندوں میں ہو سکتا ہے۔ دیکھئے وہ کس گیند سے شروع کرتے ہیں۔ ان کی یہ پہلی گیند چھلاوا ہو گی یا چھچھوندر، ٹانگ توڑ ہو گی، یا چین کا آدمی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گیند پھکاؤ کپتان کوشش کرے گا کہ بلے باز کو کچھ ایسا جھانسہ دے کہ وہ بیچ میں ٹانگ اڑا کر باہر ہو جائے۔''

اس طرح باہر ہونے کو کرکٹ کی اصطلاح میں ڈنڈی آگے ٹانگ یا لیگ بفور وکٹ کہا جاتا ہے۔ جس کا مخفف ہے ایل بی ڈبلیو۔ لیکن اس کا فیصلہ چونکہ بڑی حد تک امپائر کی صواب دید پر ہوتا ہے کہ اگر کھلاڑی کے ٹانگیں نہ ہوتیں تو کیا گیند ڈنڈی پر جا کر لگتا اور گیند کی متلون مزاجی اور انسانی جسم کی ساخت دونوں کے پیش نظر ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ آسان نہیں۔ اس لئے امپائر کی آسانی کے لئے اس موقع پر گیند پھینکنے والا اور اس کے قریبی ساتھی آنکھیں اور منہ پھاڑ کر دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے غریب امپائر پر شب خون مارنے کے انداز میں ایک فلک شگاف نعرہ لگاتے ہیں۔ جس کے مفہوم کی وضاحت کچھ یونہی ہو سکتی ہے کہ ''ابے اندھے، کاہل امپائیر، دیکھ کیا رہا ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ بلے باز ہے؟ یا گیا؟'' اب اگر بلے باز کا طرفدار ہوا تو امپائر بت بنا کھڑا رہتا ہے، یا گردن ہلا کے ''اونہوں'' کہہ دیتا ہے۔ یا اگر بلے باز کے جانی دشمنوں کی دہشت ناک دھمکیوں سے خوفزدہ ہو گیا تو اپنی شہادت کی انگلی، پچاس ڈگری کے زاویے پر بلند کر دے گا۔ جس کے بعد بولر اور اس کے ساتھی جامے سے باہر ہو کر ایسی ایسی حرکتیں کریں گے جو بیک وقت حیا سوز بھی ہوتی ہیں اور ناقابل فہم بھی۔ مثلاً دونوں ہاتھ جو ہاؤ، ہو کے شور کے ساتھ ہوا میں بلند تھے دوسرے ساتھی کے دونوں ہاتھوں سے جا کر ٹکرائیں گے، بولر کے بالوں میں جلدی جلدی مالش کریں گے یا اگر وہ گنجا ہے تو اس کی چندیا کا بوسہ لیں گے، یا اگر وہ اپنے کارنامے پر اس قدر جذباتی ہو گیا ہے کہ زمین پر مکّو مارے، ہاتھ ہوا میں بلند کئے ہوئے، ہونق بنا بیٹھا ہے، تو اس کو زد و کوب کریں گے یا اس کو ڈھکیل کر اس کے ساتھ زمین پر لوٹ جائیں گے۔

ادھر بلے باز بے چارہ، بلہ بغل میں دبائے، جھینپتا ہوا سائبان کا رخ کرتا ہے اور تماشے سے تماش بین بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امپائر اور کھلاڑیوں کے درمیان اختلاف رائے سنگین صورت اختیار کرتا ہے اور بین الاقوامی جنگ کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے ایک واقعے کو تاریخ میں شکور رعنا مائیک گیٹنگ معرکہ کہا جاتا ہے۔ اک زمانہ تھا کہ کرکٹ ایک سیدھا سادھا شریفانہ کھیل سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ 'کرکٹ' 'شرافت' کا مترادف بن گیا تھا کہ اگر کوئی شخص کوئی غیر شریفانہ حرکت کرے تو محاورہ تھا کہ 'یہ کرکٹ نہیں'۔ لیکن واہ رے ہندوستان، اور (چھوٹ بھیا) پاکستان کہ ان دونوں کی جدت طرازی اور تخلیقی اپج کے طفیل کرکٹ میں ایک نیا اور تہلکہ انگیز عنصر شامل ہو گیا جس نے اس کھیل کو ایک ایسی شوخی، ایسی غیر یقینیت عطا کر دی جو کھیل کی جان ہوتی ہے۔ اب یہ کھیل کھلاڑیوں اور امپائروں کے قبضۂ قدرت سے نکل کر، صحیح معنوں میں ایسے غیر جانب دار عناصر کے کنٹرول میں آ گیا جنہیں کسی ایک ٹیم کی ہار جیت سے کوئی خاص دل چسپی نہیں۔ اس طرح مقابلوں اور میچوں میں خواہ مخواہ کی جدوجہد سے کھیل کو چھٹکارا ملا اور میچ کا نتیجہ

امپائیروں کے فیصلوں اور کھلاڑیوں کی کاوشوں کے شکنجے سے آزاد ہوگیا۔ اسے کھیل کی اصطلاح میں میچ فکسنگ (Match Fixing) کا نام دیا گیا۔ جس میں اس ہمہ جہت کھیل کے مختلف پہلوؤں اوران گنت امکانات پر لاکھوں اور کروڑوں کے وارے نیارے ہونے لگے۔ اس طرح ترغیب دلانے کی ہمارے مخصوص اور دیرینہ روایات کو ایک اور نیک کام کے لئے پروان چڑھایا گیا۔ یہ رواج ایسا بڑھا کہ ہندوستان جنت نشان اور مملکت خداداد پاکستان سے پھیل کر۔ تقریباً تمام ہی ملکوں کی کرکٹ ٹیموں میں اسے اپنا لیا گیا۔ صرف انگلستان ایک حد تک اس رواج سے محروم رہا۔ تو شاید اس کی وجہ یہ بھی ہیں کہ انگلستان کی ٹیم کو ہارنے کی ترغیب دلانے کے لئے رشوت درکار نہیں۔

کرکٹ کی گوناگوں خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی اجاگر ہوئی ہے کہ اس سے گمراہ اور دولت مند دوشیزاؤں کو راہ راست پر لانے اور انہیں مشرف بہ اسلام کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اس طرح گویا ایک ہی اسٹروک میں دنیا اور عاقبت دونوں کی دوستی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

کرکٹ کی افادیت کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اداکاری، ڈاکہ زنی اور صحافت کے علاوہ، اب کرکٹ بھی لیڈری کا زینہ بن گیا ہے۔ سابق کرکٹر، اگر دماغ کا کمزور ہو، (جو کوئی ایسی انہونی بات نہیں) تو لیڈری اور نیتا گیری کا پیشہ اختیار کرلیتا ہے اور کرکٹ کے استعارے، بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی مہم کو آگے بڑھانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً:

"اے میرے پیارے ہم وطنو، میں ان لوگوں میں نہیں جو دشمن کی گوگلی سنبھال نہ سکیں۔ اے میرے معصوم سننے والو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے پاس بیش تر مسئلوں کا حل موجود ہے۔ میری لیگ بریک کے سامنے کسی کے قدم نہیں جم سکتے۔ میرے پیارے بھولے بھالے ووٹرو، مجھے تم اپنا کپتان بناؤ، میں نئی گیند کی طرح سپاٹ بھی اور پرانی گیند کی طرح کھردرا بھی ہوں۔ میں نے اچھے اچھوں کے چھکے چھڑائے ہیں۔ مجھے گرفت میں لانا آسان کام نہیں۔ میں ہاتھ میں آکر بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہوں۔ اے میری عوام (جی ہاں وہ عوام کو اکثر مونث باندھتا ہے) اے میری عوام، تمہاری دل موہ لینے والی سادگی اور بھولے پن کو دیکھ کر کبھی کبھی، میرے دل میں، خیال آتا ہے کہ جیسے تم کو بنایا گیا ہے میرے لئے، یہ انتخابی مقابلہ، میرا مفادی میچ ہے۔ اس لئے، میرے ہم پیشہ جان ایف کینڈی کے الفاظ میں یہ نہ پوچھو کہ میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں۔ یہ پوچھو کہ تم میرے کیا کرسکتے ہو۔ میرے سادہ و معصوم سننے والو۔ خدائے بزرگ و برتر، جو بڑا مسبب الاسباب ہے، اس سے میری یہ دعا ہے کہ وہ تمہاری سادگی اور معصومیت دوچند کرے، اور مجھے ووٹ دینے کی ترغیب دے۔ میرے ساتھ مل کر باآواز بلند ہو۔

"کرکٹستان زندہ باد"۔ اس کے بعد بھی اگر عوام پر اثر نہ ہو۔ تو یہ ان کی محرومی، بلکہ کفران نعمت ہوگا۔

کرکٹ کے استعارے، لیڈر بازی کے علاوہ، دوسرے مشغلوں میں بھی بڑے کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کے ملک میں لاتعداد شہری لامکان ہوں، کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا نہ ہو، پینے کے لئے صاف پانی نہ میسر ہو، بجلی جو کئی کئی گھنٹے غائب رہتی ہو، امیروں کے یہاں چلتی رہے اور غریبوں پر گرتی رہے صحت عامہ کا تصور ناپید ہوجائے۔ شہروں میں سڑکوں کی جگہ گڈھے اور نہروں کی جگہ گندے نالے نظر آئیں، ماحول جب بھانت بھانت کی غلاظتوں اور زہر آلودگیوں سے سانس لینا دشوار کردے اور عوام، حکمرانوں کی بدعنوانیوں، چالبازیوں اور رشوت خوریوں سے تنگ آچکے ہوں۔ تو ایس دھماکہ خیز چھکا مارے کہ عوام اچھل پڑیں اور پڑوسی ملک بھی۔ جو ان تمام طرۂ امتیاز خصوصیتوں میں آپ سے کسی طرح کم نہ ہو۔ جواب میں ایسا جوہری باؤنسر پھینکئے کہ عوام کے سر پر سے ہوکر گزر جائے۔ پھر جو زبانی کرکٹ میچ شروع ہوگا، اس میں ایسی ایسی گوگلیاں، ایسے ایسے چائینا مین، ایسے ایسے یارکر، اور ایسی ایسی قلابازیاں دیکھنے میں آئیں گی کہ دنیا والے عش عش کرتے رہ جائیں اور عوام اپنی کلفتیں بھول کر، اپنی پیٹیاں یا کمر بند کسے ہوئے، تالیاں پیٹتے رہیں، اور ایک وقت کے کھانے پر اکتفا کرتے رہیں۔ جن کے پاس ایک وقت کا کھانا بھی نہ ہو وہ ایشور یا اللہ جو بھی ان کا بیلی ہو، اس کا نام لے کر سو جائیں۔ تاکہ جو کامیاب ذرائع ابھی تک دونوں فریق توپوں، ٹینکوں، لڑاکا ہوائی جہازوں، بمباروں اور اپنے اپنے محب وطن فوجی افسروں کی پرورش اور فلاح و بہبود پر صرف کررہے تھے۔ وہ اب آزادی کے ساتھ اور جی کھول کر جوہری دھماکوں اور جوہری بموں کی ساخت و پرداخت پر بھی صرف کرسکیں۔ رہی وہ مد فاضل جسے عوام کہا جاتا ہے تو ان کے خالی پیٹ میں، تعصب کی غذا ڈال کر، انہیں قایل کرلیا جائے کہ یہ زیر زمین آزمائشی دھماکے ان کی سلامتی کے لئے ہیں۔ جس کے بعد، ایک زبردست جوہری ٹیسٹ میچ ہوگا جس میں سچ مچ کے دھماکے زیر زمین نہیں بلکہ برروئے زمین ہوں گے اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش بولر، بلے باز، تماشائی ان کے دور دور کے رشتہ دار دوست احباب جنہیں اس ٹیسٹ میچ میں کوئی دلچسپی نہ تھی ان کے مکان، ان کی کھیتیاں، ان کے جنگلات، ان کے جانور، ان کے مویشی، ان کی تاریخی عمارتیں، ان کے آثار قدیمہ، ان کے مندر، ان کی مسجدیں، سب جھلس کر نشٹ ہوجائیں گی۔ ایک ہی اسٹروک میں ہمارے سارے جھگڑے طے ہوجائیں گے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ جس کا عربی مترادف ہے: اناللہ وانا الیہ راجعون! OO

چھیڑ خوباں سے...

غزل

ساقی فاروقی

اپنے پیارے ہم عصر ظفر اقبال کے لئے۔ جنھوں نے میری کتاب 'حاجی بھائی پانی والا' پر ایک نہایت خوبصورت مضمون نما کالم لکھ کر میرا خون بڑھایا۔ تازگی، بغاوت اور زبان پر کنٹرول کے باعث، میں ان کی 25فی صد شاعری کا تو جی جان سے قائل ہوں مگر بقیہ 75فی صد کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھنے ہی میں عافیت پاتا ہوں اس لئے کہ اس تین چوتھائی کی سمت کا سراغ لگانے سے قاصر ہوں۔ اس لئے بھی کہ جلد بازی اور زود گوئی کی وجہ سے اس تین چوتھائی میں کہیں نہ کہیں،کسی نہ کسی آنچ کی کسر رہ گئی ہے اور اپنی تمام جدّت اور زبان کے پینترے کے باوجود اس حصے کی غزلوں کے پچاسوں بلکہ سیکڑوں اشعار مضحک ہوگئے ہیں۔ خاص کر وہ اشعار جن میں اسم معرفہ اور اسم نکرہ کو ردیف بنایا گیا ہے۔ انھوں نے زندگی میں پہلی بار (جواب الجواب) اپنا تازہ مجموعہ (تفاوت) بھجوایا۔ ایک غزل پر نگاہ رک گئی۔ غزل کا مطلع ہے: ''ختم ہوگئی ساری چائے/اور پیو گے کتنی چائے'' میں نے ردیف تو رہنے دی مگر بحر بدلی اور اپنا قافیہ تنگ کیا۔ طبیعت رواں ہوئی تو پچاس شعر کہہ ڈالے جو اپنے دوست ظفر اقبال کی نذر کرتا ہوں۔ **ساقی**

تو نے زیرے سے کیوں بگھاری چائے
دال لگتی ہے سوسماری *چائے

چائے میں چائے کیوں ملائی تھی
دم پہ رکھی بھی تھی یہ کھاری چائے؟

چائے کی پتیاں پیالی میں؟
یار چھلنی سے بھی گزاری چائے!

رات بھر اس کے خواب دیکھے ہیں
بس پلادے مجھے نہاری چائے

پانچ اسٹار والے ہوٹل میں
جاکے پی لوں گا 'دس ہزاری' چائے

مجھ کو پہلے ہی بے قراری ہے
کیا بڑھائے گی بے قراری چائے

پان اور صبر سے چلایا کام
دیکھتی رہ گئی بچاری چائے

ہیں سپاہی یہ ذائقے سارے
اور کرتی ہے تھانے داری چائے

نا ہی کافی سے قیمہ جیت سکا
نا کبھی کوفتے سے ہاری چائے

صرف آزاد☆ نے بنائی ہے
زرو اردو میں 'سبزواری' چائے

پیار سے، شوق سے، لگاوٹ سے
میں پلاؤں گا تین دھاری چائے

میرے معدے میں آگ ڈال گئی
کوئی شعلہ نفس کنواری چائے

'رات کیفے' میں آکے بیٹھا ہوں
چاہتا ہوں کڑک، کراری چائے

تاکہ دنیا کو مضطرب کردوں
میرے معبود! اضطراری چائے!

میں اکیلا نہیں بناؤں گا
سب بنائیں گے باری باری چائے

یہ نفاست کبھی نہ دیکھی تھی
کس نے میرے لئے نتھاری چائے

اس میں حدت بھی ہے نشہ بھی ہے
جیسے کرتی ہو بادہ خواری چائے

* ایک جانور جو اپنی چربی کے لئے مشہور ہے

☆ ابوالکلام آزاد

اپنا تھوڑا سا دودھ بخش کہ آج
بھول جائے سیاہ کاری چائے
ایک بلوچ نے پلائی تھی
مجھ کو پنجاب میں بہاری چائے
صرف پانی پلا دیا ہوتا
چائے؟ وہ بھی مزے سے عاری چائے؟
تیرے اجداد کاشمیری ہیں
کیوں پلاتا ہے پوٹھو ہاری چائے
ہاں پلادے کبھی فقیروں کو
نذر گزری نظر گزاری چائے
کیوں پڑوسن کو تنگ کرتا ہے
کون پیتا ہے مستعاری چائے
خاک 'ٹی بیگ' سے نکلتا رنگ
اپنے چمچے سے میں نے گاری چائے
میں پیالی کی طرح چاک پہ تھا
لے کے آئی مری کمہاری چائے
ایک ہی ساتھ مجھ کو لاکر دے
زردہ، کتھا، نمک، سپاری، چائے
چسکا انگریز نے لگایا تھا
مفت بانٹی تھی اشتہاری چائے
آج لنکا کے لوگ اگر مرجائیں
کون اگائے گا کیاری کیاری چائے

ہے برانڈی کی پالکی میں تو
میں کہ پیدل، مری سواری چائے
تو غضب ہے کہ تجھ پہ وسکی سوار
میں عجب ہوں کہ مجھ پہ طاری چائے
کیک مت مانگ، جیب خالی ہے!
چل، تری ضد پہ آج واری چائے
تو بس اس میں بھگو کے کھاتا ہوں
میرا سالن ہے میری پیاری چائے
بھاپ اڑاتی ہے... چاہتی ہوگی
چائے دانی سے رستگاری چائے
چائے خانہ، پھر اس کی کج بحثی
میں نے چہرے پہ اس کے ماری چائے
'روح افزا' کی ڈگڈگی تو بجی
اور لائے نئے مداری چائے
قوم سلویٰ کے انتظار میں تھی
اور اللہ نے اتاری چائے
عرش اور فرش کانپ اٹھتے ہیں
جب بھی پیتے ہیں ذات باری چائے
وہ زمانہ بھی آئے جب کہ پئیں
ان وڈیروں کے ساتھ ہاری چائے
کاش رادھا کے ساتھ آجائیں
اور بنائیں کشن مراری چائے

مندروں میں کچھ ایسے آسن ہیں
جیسے پیتے ہوں نار، ناری چائے
احمد آباد جاکے زہر بنی
'واجپائی اٹل بہاری' چائے
سب سے پہلے گرنتھ صاحب پڑھ
تب غڑپ کر یہ گردواری چائے
دل پہ چابک کی طرح پڑتی ہے
روز کرتی ہے گھڑ سواری چائے
میں نے وائن بھی ان پہ ضائع کی
پینے آئے تھے 'ہاری ساری' چائے
جو ملا تھا مجھے شنگھائی میں
نام اس شخص کا تھا 'چاری چائے'
وہ جب اپنی غرض سے آتا ہے
میں پلاتا ہوں کاروباری چائے
جو مصنف ہیں کڑھتے رہتے ہیں
پیتے رہتے ہیں ان کے قاری چائے
خوب مہمان ہے، پلا کے چلا
میرے قالین کو، وہ ساری چائے
'چائے' والی ردیف ایسی ہے
جس پہ کرتی ہے چاند ماری چائے
اس قدر میٹھی؟ اتنا گاڑھا دودھ؟
اتنی گرمی اور ایسی بھاری چائے!

قطعات

اسد جعفری

ملال

میں سوچتا ہوں میں نے محبت میں کیا لیا
یہ دل ہے بے قرار تو نظریں سوالیہ
جب میں نے اس کی دید کو مقصد بنا لیا
میرے رقیب نے مرا چشمہ چرا لیا

تشویش

اہلِ کوچہ کی شرافت ہی نہیں کافی اسد
وصل کے رستے میں حائل اور اک پنگا بھی ہے
عرضِ مطلب بھی ضروری ہے مگر یہ سوچ لو
اس سراپا ناز کی آغوش میں کتا بھی ہے

محبت

محبت دونوں جانب ہے ولیکن مدعا دل کا
میں کیسے اس کو سمجھاتا وہ کیسے مجھ کو سمجھاتی
ہماری بالمشافہ گفتگو ہو بھی تو کیسے ہو
وہ اردو سے ہے ناواقف مجھے انگلش نہیں آتی

ڈر

یونہی بیٹھے بٹھائے زندگی دوبھر نہ ہو جائے
محبت میں جگر کا درد دردِ سر نہ ہو جائے
تری باتون میں شیرینی فزوں تر ہوتی جاتی ہے
مجھے ڈر ہے اسد تجھ کو کہیں شوگر نہ ہو جائے

امیرِ شہر

اک گداگر نے دیا یوں میری باتوں کا جواب
ہر کوئی انجمن میں آٹھوں پہر ہے میری طرح
دیکھئے تو ظاہری صورت ہے قدرے مختلف
سوچئے تو ہے امیرِ شہر بھی میری طرح

مشورہ

زندگی میں اس قدر بے چارگی اچھی نہیں
دل میں ہردم جذبۂ تدبیر ہونا چاہئے
صاحب توقیر ہونے سے تو کچھ ملتا نہیں
آدمی کو صرف چمچہ گیر ہونا چاہئے

بھرم

بیٹھے بٹھائے سر کا بھرم بھی گنوا دیا
میں نے کلہاڑی آپ ہی پاؤں پے مار لی
جب میں نے اس کے غازۂ عارض پر طنز کی
اس تُند خُو نے سر سے مرے وگ اتار لی

مظلوم

ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہے
دل میں ہے جو آزار وہ چہرے پہ ہے مرقوم
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ شوہر
ظالم نظر آتا ہے حقیقت میں ہے مظلوم

دستور بھی ہے

ترا محسن لبِ دریا جو ملا ہے تجھ کو
دردمندی کے حوالے سے وہ مشہور بھی ہے
اس نے احساں جو کیا ہے تو ڈبو دے اس کو
'رسمِ دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے'

خالص نہ تھا

کچھ تو اپنے فرض سے غافل تھے اہلِ انصرام
اور کچھ اخلاصِ اہلِ شہر بھی خالص نہ تھا
ہوگئی ناکام اس کی خودکشی صرف اس لئے
تھا اسد عاشق بھی جعلی زہر بھی خالص نہ تھا

شاعر

چور جب پکڑا گیا گھر میں تو شاعر نے کہا
آؤ تم کو، ہم نئی غزلیں سنانے لے چلیں
چور نے ہنس کر کہا میں اتنا پاگل تو نہیں
اس سے بہتر ہے کہ مجھ کو آپ تھانے لے چلیں

کاروبار

جمالِ گل بھی کھٹکتا ہے ان کی نظروں میں
کھلیں نہ پھول اگر ان کا اختیار چلے
جنابِ شیخ سے اب کہہ رہے ہیں اہلِ چمن
چلے بھی جاؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اُسترا

ہر طرف رقیبوں کا جھگڑا تو ہوتا ہے
کاروبارِ الفت میں یہ مزا تو ہوتا ہے
ہم نے یہ نہ سوچا تھا جب کٹی زباں اپنی
اس طرح کے کاموں میں استرا تو ہوتا ہے

گرانی

لذتِ کام و دہن کے ہوئے ساماں عنقا
مجھ سے تو حسنِ تواضع کا وہ اسلوب نہ مانگ
تجھ کو چینی کی جگر سوز گرانی کی قسم
'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'

کم فہمی

کلامِ حضرتِ اقبال پڑھنے کو پڑھا سب نے
اگر اس کو نہیں سمجھا تو پھر کاوش ادھوری ہے
'عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی'
مگر اس پر عمل پیرا نہ نورا ہے نہ نوری ہے

گوشۂ اختلاف

ان کی نذر

جوادبی اختلافِ رائے

میں ادب کا دامن

تھامے رہتے ہیں

اختلافِ رائے

فہمیدہ ریاض سے

وارث کرمانی
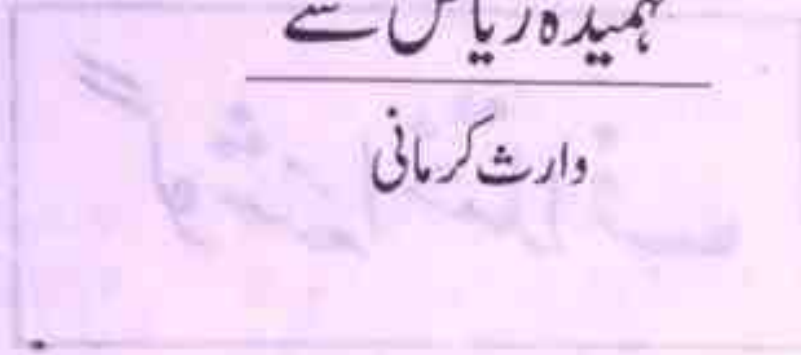
شکوہ کیا ستم کا تو نمدیدہ ہو گئے
تم تو ذرا سی بات پہ رنجیدہ ہو گئے

فہمیدہ ریاض کا شکایت نامہ ('دفترِ امکاں' ادب ساز۔3) پڑھ کر لطف آیا۔ پہلے تو میں ان کی زبان اور طرزِ بیان کی تعریف کروں گا اگر ان میں یہ سلیقہ نہ ہوتا تو میں خاموشی اختیار کر لیتا۔ ان کی تحریر شروع ہی سے دامنِ دل پکڑ لیتی ہے اور بے اختیار غالب کا یہ عظیم شعر یاد آ جاتا ہے:

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے
سینۂ شمشیر کے باہر ہے دم شمشیر کا

ان کے الفاظ ریزر بلیڈ کی طرح دھاردار اور ان کے معنی جو اطراف میں گردش کرتے ہیں ناسخ لکھنوی کے اس مصرع کے متبادل بن جاتے ہیں۔

یہ نگہ ہے یا کہ تیغ آب دار آنکھوں میں ہے

فہمیدہ ریاض کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں ان ہی کا مزاج اور طبیعت رکھتا ہوں اور ان لوگوں کو ادب ناشناس سمجھتا ہوں جو ان کے جذبات و احساسات کی قدر نہیں کرتے۔ سچائیوں کو شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں اور معاشرت کی مفروضہ تہذیب کے دباؤ میں رہ کر ان کی تخلیقات پر حرف زنی کرتے ہیں۔ فہمیدہ نے بڑے پُر لطف اور مہذب انداز میں ان کی شکایت کی ہے اور ان کے جملوں کے اقتباسات دیئے ہیں لیکن فہمیدہ نے کبھی یہ کیوں نہیں سوچا کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں اور کیا یہ برتاؤ ذاتی عناد کی وجہ سے ہے یا ایسا کہنے پر وہ مجبور تھے۔ ہندوستان یا برصغیر اب اتنا گیا گذرا ملک بھی نہیں رہا ہے اور اس زمانے سے نکل چکا ہے جب ہماری جدید تنقید کے بانی نے کہا تھا "حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں" اہلِ مغرب ہم لوگوں سے زیادہ محنتی قابل اور سائنس داں ہیں اسے بھی مانتے ہیں لیکن ادب جس کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہے وہ بالکل دوسری چیز ہے۔ اس میں کسی قوم کی برتری یا کمتری نہیں قائم کی جا سکتی اور نہ ان کے علمی و ادبی سرمائے سے ہمیں لذت و مسرت حاصل ہو سکتی ہے یہ لطف اور ترفع Sublimation ہمیں اپنی ہی روایت کے حصار میں رہ کر مل سکتا ہے۔ بعض لوگ روایتی کے لفظ کو قدامت اور فرسودگی کے معنی میں لے جاتے ہیں جو درست نہیں۔ اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ فہمیدہ ریاض جیسی ذہین اور قابل لکھنے والی کو ادبی روایت یا کسی اور روایت کے زندہ اور مردہ عناصر کی شناخت رکھنا چاہئے اور اپنے دیس اور اجنبی ملکوں کی اجتماعی نفسیات و طرزِ معاشرت کو نظر میں رکھنا چاہئے۔ مثلاً فحاشی و برہنگی یا شرم و حیا یا سر اور پیر کو رتبہ میں برابر سمجھنا یا خود کو ناجائز اولاد یعنی حرامی کہنے کو برا نہ ماننا یا اپنی بیٹی کے قبل از حیض ایک درجن عاشقوں کے ہونے پر فخر بالخصوص امریکہ میں برا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ یہ باتیں میں اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ کیا انھیں برصغیر یا تمام مغربی ایشیا میں رہنے والے لوگ بغیر کراہت کے سن سکیں گے۔ بات ذرا اپنے محور سے ہٹ گئی ہے لیکن ادب میں فحاشی و برہنگی کا اظہار کرنا اور پھر علامتوں اور دور افتادہ تاویلوں کے حوالے دے کر پسندیدگی اور قبولِ عام کی توقع رکھنا ہمارے ادب میں کسی وقت بھی جائز نہیں سمجھا گیا۔ فہمیدہ ریاض کی اکثر منظومات پر یہ عکس پڑتا دکھائی دیتا ہے جسے انھوں نے گہری تعبیروں سے ملفوف یا ملبوس کیا ہے۔ ہم اسے کافی نہیں سمجھتے بلکہ ضروری بھی نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے قلم میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ہر بات کو ادب بنا سکتی ہیں۔ کمزور ادیب جس حرص و ہوس کو بیان کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا بڑا ادیب اسی بات کو اپنی زبان سے دلنواز اور حسین کر دے گا۔ مولانا حسرت موہانی کی اس غزل کو ذہن میں لایئے جس کا صرف ایک شعر ثبوت میں دیا جا رہا ہے۔

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

کتنا غضب کا اکھرا بیان ہے جو پوری غزل میں جاری وساری ہے جسے سن کر کٹر مولوی لوگ بھی جھومنے لگتے ہیں اور ناقدینِ ادب بھی علم واخلاق وفلسفہ بھول کر اس کے جادو اثر ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ حسرت موہانی کے اس شعر کے مقابلہ پر اٹھارہویں صدی کے کسی شاعر کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں جس میں کوٹھے کو عاشقانہ بقول خود حسرت کے فاسقانہ رنگ میں استعمال کیا گیا ہے:

کودا تری چھت پر کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا
جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا

دونوں شعروں میں چھت کا استعمال کیا گیا ہے دونوں شعروں میں عشق کو جنون کی حد تک پہنچایا گیا ہے جسے ہمارے سماج کا ہر طبقہ قابل مذمت ہی نہیں لائق تعزیر بھی سمجھے گا پھر بھی دونوں شعروں میں جو فرق اور فاصلہ ہے اسے فہمیدہ کو سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود کو فہمیدہ نہ ہونے کی شکایت کرتی ہیں لیکن میں ان کے نافہم ہونے کی شکایت کبھی نہیں کرسکتا بلکہ ان کے مخالفین سے بحث کرنے پر تیار ہوں:

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

لیکن اس وقت میں مجبور و بے زبان ہو جاتا ہوں جب وہ ن م راشد کی نظم 'مسز سالا مانکا' کا یہ مصرع ذرا تقیۂ الفاظ کے ساتھ اپنی مدافعت میں دہراتی ہیں:

کہ دیکھا ہے میں نے
مسز سالا مانکا کو بستر میں شب بھر برہنہ
وہ گردن وہ باہیں وہ رانیں وہ پستان

اس نظم کی تعریف میں ایک پروفیسر شاعر رطب اللسان تھے۔ ان سے بھی میں نے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ صرف شاعر تھے نقاد نہیں تھے۔ وہ میری راشد پرستی سے واقف تھے اس لئے مجھے خوش کرنے کے لئے شاید انھوں نے تعریف کی تھی۔ لیکن میں فہمیدہ سے بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان پروفیسر صاحب کی تعریف سن کر میرا وہی حال ہوا تھا جو غالب کا ہوا تھا جب ایک صاحب نے کہا تھا کہ آپ کا یہ شعر سن کر دور دراز قصبہ سے آپ کو دیکھنے اور تعریف کرنے حاضر ہوا تھا کہ:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اس میں کوئی شک نہیں کہ فہمیدہ ریاض میں نظم ونثر دونوں کی خداداد صلاحیت درجۂ کمال پر نظر آتی ہے پھر وہ تاویلات وعلامات کا سہارا لے کر اپنی مدافعت کیوں کرتی ہیں۔ ان کو حسنِ ذات اور حسنِ بیان کی دولت خدا نے عطا کی ہے۔ وہ ادب میں گالیاں بھی دیں گی تو اچھی لگیں گی۔ غالب نے بہت پہلے اور مجھ سے بہتر انداز میں اس بات کو سمجھایا ہے:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا

ردیف کی مجبوری سے بے چارے غالب بے مزہ لکھ گئے ورنہ وہ کہتے 'بڑا مزہ آیا'

آج کے زمانے میں علامات واستعارات بلکہ ایہام وابہام وغیرہ کا بڑا زور ہے لیکن یہ تمام زیورات بوڑھی شاعری کو جوان کبھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ برہنہ گوئی میں بھی شاعرانہ جوہر چمکتا ہے یہی خوبی فہمیدہ کی نثر میں پائی جاتی ہے۔ اگر یہ خداداد سعادت نصیب نہ ہو تو ادیب 'یارِ شاطر' ہونے کے بجائے 'بارِ خاطر' بن جائے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ نثر زیادہ لکھیں ان کا اصل جوہر وہیں چمکتا ہے۔ وہ نثر میں کچھ بھی لکھیں مقبول ہوگا۔

غزل گر ملال آرد افسانہ گوئی
کہن داستاں ہائے شاہانہ گوئی

البتہ یہ شرط ہے کہ وہ تحریر ادب کے زمرے میں آ جائے جیسا کہ ابھی ادب ساز رسالے میں انھوں نے اپنے شکایتی مضمون میں کیا ہے۔ غیظ وغضب کو نہایت دل کش ادب میں ڈھال دیا ہے۔

فہمیدہ ریاض نے دوسری بات جو نظر انداز کی ہے وہ غالب اور ان سے بہت پہلے ملک الشعرا فیضی سے تعلق رکھتی ہے اور کسی حد تک انگریزی شاعر گرے (Gray) اور نیشاپور کے عمر خیام بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں انھوں نے عوام وخواص سے کیا پایا؟ ذلتیں، رسوائی اور گالیاں۔ گرے اور خیام کا تو گلا ہی گھونٹ دیا گیا۔ بقول ایک نقاد کے 'They never spoke out'۔ یہ ظلم اس لئے ہوا تھا کہ ان چاروں شاعروں نے اپنے وقت کے آگے قدم بڑھایا تھا۔ فہمیدہ ریاض تو اپنے زمانے کے اندر ہی مغربی معاشرے کی تحریکوں، وہاں کے رہن سہن اور ادبی انحرافات سے متاثر ہو کر لکھ رہی تھیں، پھر بھی ہندوستانی مزاج کے اختلاف واحتجاج کو برداشت نہ کرسکیں۔ وہ کوئی نئی بات بھی نہیں کر رہی تھیں۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک ہمارے یہاں پوری بیسویں صدی میں چھائی رہی۔ شہوانی جذبات سے سارا اردو ادب بھرا پڑا ہے۔ پھر ان کی تخلیقات کی مخالفت لوگوں نے کیوں کی؟ سارا مسئلہ زبان کے استعمال پر کھل جاتا ہے:

نقطۂ بے جا اگر افتد زباں گردد زیاں

لیکن زبان کا مسئلہ تو ہے ہی۔ فہمیدہ نے شاعرانہ موضوعات میں ادبی حدود کے باہر (جسے مزید واضح کرنے کے لئے 'refinement' 'restraint' کے انگریزی الفاظ استعمال کر رہا ہوں) نکل کر ایک طرح کی پردہ دری وہاں کی ہے جہاں عملی طور سے وہ خود اور تمام لوگ پردہ نشینی اختیار کرتے ہیں۔ یہی پردہ نشینی ادب کی جان ہوتی ہے۔ مومن معمولی شاعر نہ تھے۔ کیا راز کی بات کہہ دی ہے انھیں سلام کیجئے اور ان سے سبق سیکھئے:

عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہوجائے

فارسی کے عظیم شاعر نظیری کو کھڑے ہو کر غالب نے سلام واحترام پیش کیا تھا جب حالی نے انھیں یہ شعر سنایا تھا:

عشق عصیانست اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

فہمیدہ نے شور اٹھنے کے بعد بعض نظموں کی تفسیر وتعبیر سے پردہ نشینی اختیار کی ہے لیکن اس سے بات بن نہیں پائی۔ وہ ایک صوفی بزرگ کے عشق حقیقی کی تفسیر بن جاتی ہے جنھیں اپنے مریدوں کے سامنے اس گانے پر حال آگیا تھا:

اسی طرح گر توڑا توڑی رہے گی
تو کاہے کو انگیا نگوڑی رہے گی

تیسری بات یہ ہے کہ انھوں نے جتنا خود کو مظلوم سمجھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اسی رسالے میں جو مضامین ان پر شائع ہوئے ہیں کیا وہ ان کی تعریف نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ صغرا مہدی صاحبہ نے بھی ان کی خوبیوں کو سراہنے کے ساتھ ان کی خامی کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کیا جب کہ موصوفہ نے میری خودنوشت 'گھومتی ندی' پر اپنے مضمون میں نہ جانے کتنے مفروضہ عیوب نکال کر رکھ دیئے جب کہ میری کتاب میں ایک جملہ بھی کسی جگہ خلاف تہذیب نہیں لکھا گیا۔ صرف شفافیت کے ساتھ اپنی نوعمری کی وارداتوں اور اپنی لغزشوں کو میں نے کھل کر بیان کیا ہے مگر ناقد محترم نے ان ہی معصوم گناہوں کو لائق سرزنش سمجھا، میں کیا کرتا بس خاموشی اختیار کر لی:

واجب القتل اس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

لیکن دوسرے ناقدوں کی طرف سے کم از کم ایک درجن مضامین میری مدافعت میں تلوار ابن کر میان سے نکل آئے۔ خود میں نے ان تعریفی مضامین پر بھی کچھ ردعمل یا شکریہ ادا نہیں کیا۔ فہمیدہ ریاض کو یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ انھیں صف اول کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے اور مستقبل میں ان کا درجہ اور بلند ہونے والا ہے۔ وہ میری صاف گوئی کو معاف کریں گی ان کے لئے میں اپنے مرحوم دوست عرفان صدیقی کے اس شعر پر اپنی بات ختم کر رہا ہوں:

ہوشیاری دل نادان بہت کرتا ہے
رنج کم سہتا ہے اعلان بہت کرتا ہے

OO

اختلافِ رائے

کچھ اپنے دفاع میں

انور سدید

اردو کے نام ور فکشن نویس اور شاعر اظہار اثر کا جو مضمون ''اختلافِ رائے: 'انور شدید' اور وزیر آغا سے'' کے عنوان سے 'ادب ساز' 3میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون اس پر برصغیر کے محترم ادیب، نقاد اور شاعر انور سدید کا ردِ عمل ہے۔

نصرت ظہیر صاحب کے ممتاز ادبی جریدہ 'ادب ساز' کا تیسرا شمارہ مجھے بعد میں موصول ہوا۔ نوجوان نقاد ناصر عباس نیر نے اظہار اثر صاحب کا متذکرہ بالا عنوان کا مضمون زیراکس کاپی کرا کے مجھے پہلے فراہم کر دیا تھا۔ اس مضمون پر میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ احمد ندیم قاسمی ادب کی 'سروس' میں ستر برس سے زیادہ عرصہ گزار کر بے نیل مرام اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں تو اب اس الاؤ کو سرد کرنے کی ضرورت ہے جسے وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک ایندھن فراہم کرتے رہے تھے۔ ان کا آخری 'کارنامہ' ماہنامہ 'تخلیق' کے مدیر اظہر جاوید کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ تھا جو انہوں نے مبینہ طور پر اس دور کے مروجہ 'حربے' استعمال کر کے جیت لیا۔ لیکن پچاس لاکھ کی ڈگری وصول کرنے سے قبل عزرائیل نے ان کی روح قبض کر لی کیوں کہ اظہر جاوید نے زیریں عدالت کے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی تھی جس کی سماعت قاسمی صاحب کی زندگی میں نہ ہوئی، اور ان کا یہ ارشاد غلط ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے دشمن کو بھی معاف کر دینے کے عادی تھے، جبکہ اظہر جاوید تو ان کا نیاز مند تھا اور ان کے آستانے پر حاضر ہوتا تو ہمیشہ 'نذرانہ' پیش کرتا تھا۔ دوسری طرف میں نے ان کی زندگی میں انہیں ڈاکٹر وزیر آغا کی طرح اپنا محسن شمار کیا تھا کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ متحرک رکھا اور اس 'تمغۂ دشنام' سے بھی نوازا کہ ''اس شخص (انور سدید) کا نام لینے سے میری زبان پلید ہو جاتی ہے۔''

یہ 1986 کی بات ہے جو انہوں نے روزنامہ 'جنگ' میں حسن رضوی کو انٹرویو دیتے ہوئے ارشاد فرمائی تھی۔ قاسمی صاحب وفات سے ایک سال پہلے یعنی 2005 میں اظہر جاوید کے خلاف مقدمے میں ڈسٹرکٹ سیشن جج (ایڈیشنل) کے سامنے پیش ہوئے تو اس 'تمغۂ دشنام' کی سند عطائیگی کی عبارت پھر دوہرائی اور عدالت کے ریکارڈ میں شامل کر دی گئی۔ رسالہ 'بادبان' شمارہ 'دس' کی گالیاں (ملعون، بدفطرت، بہتان طراز، دشنام باز، بدنام زمانہ وغیرہ) بعد کی بات ہے اور جناب دانش الہ آبادی نے 'سبق اردو' کے اداریے میں اصولی بات لکھی تھی:

''ان (احمد ندیم قاسمی) کے زبان و قلم سے کسی کے بارے میں ایسے الفاظ کا نکلنا یقیناً باعثِ حیرت و افسوس ہے۔ اگر ہمارے بزرگ ایسی باتیں کہیں گے تو نئی نسل کے سامنے کیسی شخصیتیں معیار کا کام دیں گی۔''

قاسمی صاحب نے نومبر 1986 میں (یعنی 21 برس قبل) جب 'زبان پلید' ہو جانے والا جملہ ارشاد فرمایا تھا اس وقت بھی ایک پاکستانی ماہنامہ 'اردو زبان' کے مدیر پرویز بنرجی نے لکھا تھا:

''جب کوئی سن رسیدہ محترم ادیب اعلیٰ ظرفی کی مسند سے نیچے گرتا ہے تو پوری ادیب برادری بھی اس کے ساتھ ہی نیچے گرتی ہے اور معاشرے میں اس کی عزت اور وقار خاک میں مل جاتا ہے۔ بقول شاعر:

گرا وہ شخص تو ہم بھی گرے تھے ساتھ اس کے
ملی سزا تو شریک اس سزا میں تھے ہم بھی''

قاسمی صاحب نے 'سبق اردو' کو اپنے جواب میں خود 'مظلوم' بننے کی کوشش کی مجھے 'ظالم' باور کرایا اور اپنے کھلے دشنام کو ردِ عمل کا نتیجہ قرار دیا۔ میں نے اپنی معروضات پیش کیں لیکن 'سبق اردو' میں چھپ نہ سکیں کیوں کہ اس وقت قاسمی صاحب وفات پا چکے تھے اور دانش الہ آبادی کے ایک بزرگ ادیب دوست نے یہ بحث بند کر دینے کا صائب مشورہ دیا تھا۔

قاسمی صاحب کی وفات کے بعد خود میں نے اختلافات کا دفتر بند کر دیا اور ان کی وفات اور چالیسویں پر مضامین بھی لکھے جبکہ ان کے ایک نیاز مند مسعود اشعر نے شکوہ کیا کہ ان کو موت کے بعد بھلایا جا رہا تھا اور نومبر 2006 میں ان کے یوم پیدائش پر لاہور میں ایک ادبی تقریب بھی منعقد نہ کی گئی۔ مسعود اشعر نے لکھا کہ وہ زندہ ہوتے تو سالگرہ کی تقریب کسی اونچے درجے کے ہوٹل میں برپا کی جاتی۔ میرے لئے طمانیت کی بات یہ ہے کہ میرے مضامین کو مناسب طور پر پذیرائی حاصل ہوئی لیکن قاسمی صاحب کے بعض 'نیاز مندوں' نے جن کی

ذاتی دلچسپی 'فنون' میں اپنی غزلیں چھپوانے تک محدود تھی۔ میری یہ بات پسند نہ کی کہ میں نے ماضی کے اختلافات پر مٹی ڈال دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے سابقہ ادوار کی 'ناگفتنی' کو پھر 'گفتنی' بنانے کی کوشش کی تو میں نے اپنی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' اور 'اردو ادب کی مختصر تاریخ' سے وہ اقتباسات پیش کر دیئے جن میں قاسمی صاحب کے فن کا جائزہ دیانت دارانہ طور پر لینے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں اس طویل تمہید کے لئے معذرت خواہ ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جناب اظہار اثر نے دفن شدہ مردے کو قبر سے نکال کر کفن پھاڑ نے کی کوشش فرمائی ہے اور یہ میرے ایک دوست کے ارشاد کے مطابق 'بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ' بننے کی کاوش قرار دی جاسکتی ہے۔ تاہم میں ان کا شکرگزار ہوں کہ انہیں کراچی میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے خوبصورت ڈرائنگ روم اس ناچیز انور سدید سے 'ملاقات' یاد رہی۔ اظہار اثر اور ان کی بیگم صاحبہ 'ڈنر' پر مدعو تھے اور یہ ناچیز انور سدید وہاں محمد علی صدیقی سے ملنے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ مجھے اظہار اثر صاحب کے 'ڈنر' کا پتہ ہوتا تو ہرگز نہ جاتا لیکن عدم آگہی کی وجہ سے اس تقریب کا بن بلایا مہمان بن گیا تھا۔ تاہم جناب اظہار اثر اور ان کی بیگم صاحبہ سے 'شیڈول' کے بغیر یہ ملاقات اس روز کا قیمتی ثمر ہے۔ میں ان دونوں کی مقبول عام تحریروں کا شناسا تھا۔ لیکن اس ملاقات کا اثر اب ذہن میں موجود نہیں۔ ان کی غزلوں کی کتاب 'بشارت' پر تبصرہ اور ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ 'اوراق' میں ان کی بیگم صاحبہ کا افسانہ 'سفید سناٹا' کی اشاعت بھی مجھے یاد نہیں لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی بیگم صاحب کا افسانہ اپنے 'میرٹ' پر شائع ہوا اور تبصرے میں وہی کچھ لکھنے کی کوشش کی گئی جو اس کتاب نے مجھ پر منکشف کیا۔ اظہار اثر صاحب نے اسے یاد رکھا ہے تو میں ان کا ممنون ہوں۔

البتہ مجھے حیرت ہوئی ہے کہ اس ایک مختصر سی ملاقات کے بعد ہی انہوں نے اس ناچیز انور سدید کو 'محترم' قرار دے دیا اور اس کی 'ذہانت' ''شہرت' اور 'شخصیت' سے واقفیت کا اعلان جلی بھی کر دیا۔ جبکہ اس کا اپنا خیال ہے کہ

انور سدید عام سا بندہ ہے اس کے ساتھ
مٹی پہ بیٹھ، دھول میں اٹ کر کلام کر

مجھے یہ پڑھ کر بھی خوشی ہوئی کہ سلطانہ مہر کی کتاب 'گفتنی' میں اظہار اثر صاحب کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیسے کیسے نابغۂ فن لوگوں تک انہوں نے رسائی حاصل کی اور 'سخنور' اور 'گفتنی' کو حوالے کی کتابیں بنا دیا۔ ان کتابوں میں جتنے لوگ (سوائے انور سدید) کے شامل ہیں سب کو دوام ابد حاصل ہو گیا ہے۔ میں اظہار اثر صاحب کی شمولیت پر انہیں دست بستہ مبارکباد پیش کرتا ہوں اور غیر معروف انور سدید کا ذکر کیا ہے تو یہ بھی حقیقت سے بعید نہیں کہ اس کا نام ناشنیدہ ہے اور تفہیم کے لئے اسے بتانا پڑتا ہے کہ 'شدید' کے تین نقطے اڑا کر میرا نام برآمد کر لیجئے۔ حیرت ہے کہ اظہار اثر صاحب نے اسے 'وجہ تسمیہ' قرار دے دیا جس میں 'معنی' بھی موجود ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ سامع 'سدید' سن کر بھی 'سعید' ہی سمجھتا ہے۔ میں نے جوبات بر سبیل مزاح کہی تھی اسے اظہار اثر نے 'واوین' میں قید کر کے عنوان بنا دیا لیکن اس کی وضاحت کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ (اظہار اثر کا تحریر کردہ عنوان کچھ اور تھا جسے بدل دیا گیا لیکن انور شدید اس عنوان میں بھی واوین کے ساتھ ہی تھا۔ ن ظ)

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

محترم اظہار اثر صاحب نے 'گفتنی' (مؤلفہ سلطانہ مہر) سے چند اقتباسات پیش کر کے یہ تاثر دیا کہ ''انہیں پڑھ کر مجھ پر وہی اثر ہوا تھا جو دانش صاحب پر 'بادبان' میں محترم احمد ندیم قاسمی کی تحریر پڑھ کر ہوا تھا'' لیکن مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے کسی ایک اقتباس پر بھی تنقید و تبصرہ نہیں کیا اور ہمیں اپنے قیمتی خیالات سے باخبر ہونے کا موقع نہیں دیا۔ مثال کے طور پر میں نے 'شہرت' کا سوال اٹھایا جو تعاقب کرنے والوں سے اجتناب برتتی ہے اور بے اعتنائی کرنے والوں کو التفات سے نوازتی ہے۔ میری ناچیز رائے میں شہرت کا تعاقب وہ لوگ کرتے ہیں جن کے فن کی بنیادیں ٹھوس نہیں بلکہ کھوکھلی ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ شہرت کے لئے غیر ادبی حربے استعمال کرتے۔ اور ادبی سفر تقریظ کی چھتری کے لئے کرتے ہیں، سچی تنقید کرنے والوں سے ذاتی دشمنی پالتے ہیں۔ اس کے برعکس فنی طور پر مضبوط شخصیت عوام کی پسند قبولیت کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اس قسم کا ادیب تخلیق فن کا فریضہ اپنی داخلی لگن اور اظہار کی ضرورت کے تحت انجام دیتا ہے۔ اول الذکر قسم کے جعلی ادیبوں کو وقت کا جاروب کش ان کی زندگی میں ہی 'ڈسٹ بن' میں پھینک دیتا ہے۔ جب کہ مؤخر الذکر ادبا کو زمانہ حال ہی نہیں مستقبل بھی سلام ستائش پیش کرتا ہے۔ پاکستان کے شعرا میں سے مثال مجید امجد کی دی جاسکتی ہے جو اپنی زندگی میں زیادہ معروف نہ ہوئے لیکن وفات کے بعد ان کے فن کا نشاۃ ثانیہ برپا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کو زندگی میں بہت شہرت ملی، اس کے باوجود ان کی تشنگی برقرار رہی اور وہ فیض صاحب کی مسند کو حاصل کرنے کے آرزومند رہے۔ فیض فنی لحاظ سے احمد ندیم قاسمی سے زیادہ پختہ تھے۔ انہیں زندگی میں بھی پذیرائی ملی اور اب وفات کے بعد انہیں بیسویں صدی کا اہم شاعر شمار کیا گیا ہے۔ اقبال کے بعد ان کا نام لیا جا رہا ہے۔ قاسمی صاحب نے سیاسی حربوں سے جو شہرت زندگی میں حاصل کی تھی، وہ ان کی وفات کے پہلے سال میں ہی معدوم ہو رہی ہے۔ ان کے چہیتے اور عقیدت مند امجد اسلام امجد کا یہ بیان چھپ چکا ہے کہ ''فیض صاحب وفات کے بعد بھی زندہ رہیں گے لیکن قاسمی صاحب ادبی طور پر زندگی میں ہی وفات پا جائیں گے۔'' میں اوپر مسعود اشعر صاحب کا حوالہ دے چکا ہوں اور اب دکھ کی بات یہ ہے کہ ان کے وارثوں نے (بشمول منصورہ احمد) نے ان کا رسالہ 'فنون' بھی بند کر دیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قاسمی صاحب کی

زندگی کے آخری دس برسوں میں پوری ادبی دنیا نے ان کے غروب اور ان کے زوال کا منظر دیکھا اور وہ اندر سے اتنے کھوکھلے ہو گئے تھے کہ جو تنقید کرتا اس کے دشمن ہو جاتے اور دشنام طرازی کرنے لگتے۔ مجھ سے اس لئے ناراض تھے کہ میں نے ان کی دیہات نگاری کو کرشن چندر کا چربہ قرار دیا تھا۔ یہ کتاب ساحل احمد نے چھاپی تھی۔ اظہار اثر صاحب میرے اس خیال سے اختلاف کا پورا حق رکھتے ہیں لیکن شاید وہ ان کے گزشتہ دس سال کا کوئی ادبی کارنامہ شمار نہ کر سکیں۔ میں نے گم نامی کے لطف و سرور کا ذکر کیا ہے تو یہ اس تجربے کا حاصل ہے جو امجد اسلام امجد کے بیان سے میں نے کشید کیا تھا۔ قاسمی صاحب کی شہرت ان کی زندگی میں عالمگیر تھی۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ:

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

ظفر اقبال نے جنھیں شمس الرحمان فاروقی اس دور کا اہم ترین شاعر قرار دیتے ہیں اگلے روز بیان چھپوایا ہے کہ "ادب میں قاسمی صاحب کی کنٹری بیوشن رسالہ 'فنون' کی ادارت اور دھڑے بازی ہے۔" قاسمی صاحب کے نیاز مندوں کے وسیع حلقے سے تا حال کسی نے اس کی تردید نہیں کی۔

حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ادبی کتابوں پر دیئے جانے والے انعامات کے سلسلے میں قاسمی صاحب نے اکادمی ادبیات پاکستان کے دو صدر نشینوں فخر زمان اور افتخار عارف کے سامنے بھری مجلس میں دو مرتبہ شکایت کی کہ انہوں نے جس کتاب کو چھتیسویں (36) نمبر پر رکھا تھا اس پر پہلا انعام دے دیا گیا۔ انعامات کا یہ فیصلہ اور ججوں کی نامزدگی ہمیشہ خفیہ ہوتی ہے۔ لیکن قاسمی صاحب نے بے شمار لوگوں کی موجودگی میں یہ اعتراض اٹھایا جو ناواجب تھا۔ مقصد یقیناً یہ تھا کہ قاسمی صاحب ادیبوں کو باور کرانا چاہتے تھے کہ حکومت کا یہ ادارہ انہیں کتابوں کا جج مقرر کرتا ہے اور وہ ادیبوں کو انعامات بھی دلا سکتے ہیں۔ حیرت ہے کہ جب ان کی نامزد کتاب کو انعام نہیں دیا گیا تو انہوں نے جج بننے سے انکار کیوں نہیں کیا؟ اور ایک پبلک جلسے میں اعتراض کیوں اٹھایا۔ اسے بلیک میلنگ کے امکانات سے کس طرح الگ کیا جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس سال انہیں 'کمال فن ایوارڈ' دیا گیا اس سال وہ ایوارڈ کمیٹی کے خود بھی رکن تھے۔ انہوں نے 5 لاکھ روپے کا ایوارڈ نہ صرف خود وصول کیا بلکہ ایک لاکھ روپے کا انعام اپنی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد کو بھی دلایا۔ محترم اظہار اثر صاحب اس کارروائی کو کس طرح منصفانہ قرار دیں گے۔

'گفتنی' (مؤلفہ سلطانہ مہر) کے ایک اقتباس سے جناب اظہار اثر نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں نے ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے ادیبوں کی تخلیق کاری کا جو موازنہ پیش کیا تھا، اس سے احمد ندیم قاسمی کو اختلاف پیدا ہوا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے مخلص ادبا احمد ندیم قاسمی کو 'تربوزی ترقی پسند' سمجھتے تھے جو سبز بھی تھا اور سرخ بھی۔ چنانچہ سجاد ظہیر نے پاکستان میں روپوشی کے دوران قاسمی صاحب کو اہمیت نہ دی حالاں کہ وہ اس تحریک کے سیکریٹری جنرل تھے۔ ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی لندن، لکھنؤ اور کراچی میں منعقد کی گئی تو انہیں مدعو نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اس وقت فوجی آمر ایوب خان سے تمغہ وصول کر چکے تھے اور سرکاری ادارہ مجلس ترقی ادب میں ملازمت بھی کر رہے تھے۔ گزشتہ دنوں لاہور میں سجاد ظہیر کا 100 واں یوم پیدائش منایا گیا تو انہوں نے اس میں شرکت نہیں کی حالانکہ اس میں شرکت کے لئے سجاد ظہیر کی دختر نور ظہیر بھی تشریف لائی تھیں۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز 1936 میں ہوا۔ اس وقت قاسمی صاحب ادب میں معروف ہو چکے تھے۔ لیکن انہوں نے اس تحریک کے رسائل کی ادارت تو کی اور شہرت بھی سمیٹی لیکن اس میں شرکت نہیں کی۔ بلکہ وہ اس دور میں پنجاب کے یونینسٹ وزیر اعلیٰ حیات خان کے مرثیے کہہ رہے تھے اور اس کی موت پر رو رہے تھے حالانکہ اس نے انگریز پرستی میں کوئی حد نہیں چھوڑی تھی اور آزادی کی تحریک کو نقصان پہنچایا تھا۔ قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک میں آزادی کے بعد شامل ہوئے اور اس کے سیکریٹری جنرل بن گئے۔ میں یہاں 1980 کی دہائی کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں اردو کے نامور افسانہ نگار ممتاز مفتی نے قاسمی صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کیا ہے۔

"احمد ندیم قاسمی ایوان ادب کے بہت بڑے سیاسی لیڈر ہیں، وہ ہمارے قائدِ ادب ہیں، انہوں نے ادب میں سیاست اور گروہ بندی کی بنیاد ڈالی۔ وہ جسے چاہیں افسانہ نویس بنا دیں، جسے چاہیں شاعر بنا دیں۔ تمام ادیب ان سے ڈرتے ہیں اور تو اور محترم کشور ناہید بھی جس کی جرأت اور دلیری کا چرچا ہے ان سے خائف ہے۔ فیض کو انھوں نے زندگی بھر زچ کئے رکھا۔ منٹو بظاہر کہا کرتا تھا کہ میں اس کی کیا پرواہ کرتا ہوں مگر اندر سے ڈرتا رہا۔ ان سے دبتا رہا۔ میں تو ساری عمر تھر تھر کانپتا رہا۔ پھر انتظار حسین ہے۔ قاسمی صاحب کا نام آئے تو سراسر احتیاط بن جاتا تھا۔ اشفاق احمد قاسمی صاحب کو خوش کرنے کے جتن کرتا رہا تھا..." (بحوالہ ماہنامہ 'اردو زبان' جنوری فروری 1987 صفحہ 14)

ڈاکٹر وزیر آغا سے ان کا بنیادی اختلاف یہ تھا کہ آغا صاحب نے اردو کا ایک اہم نقاد ہونے کی حیثیت میں احمد ندیم قاسمی صاحب کو شہرت کے بلند ترین مقام تک پہنچانے کے لئے ان کی خواہش کی تکمیل نہیں کی تھی۔ ابتدا میں قاسمی صاحب نے وزیر آغا سے دوستی استوار کی، انہیں 'فنون' میں نمایاں طور پر چھاپا۔ لیکن جب انہوں نے رسالہ 'ادبی دنیا' میں سلسلہ مثال کے مضامین ن م راشد، میراجی، فیض، مجید امجد، راجہ مہدی علی خاں، یوسف ظفر، اختر الایمان اور قیوم نظر پر لکھے اور یہ سب ایک کتاب 'نظم جدید کی کروٹیں' میں بھی شائع کر دیئے تو قاسمی صاحب ناراض ہو گئے کہ ان کا نام جدید نظم کے شعرا میں شامل نہیں تھا۔ آغا صاحب کی کتاب 'اردو شاعری کا مزاج' شائع ہوئی تو اس کے خلاف ڈاکٹر سید عبداللہ اور عمیق حنفی کے مضامین 'فنون' میں چھاپے گئے اور میراجی کی 'دھرتی پوجا' کی اصطلاح ان کے نام

مڑھ کر پاکستانی عوام کے مذہبی جذبات ان کے خلاف ابھارے گئے۔ ان مضامین کا مدلل جواب دیا گیا تو سید عبداللہ صاحب نے تو معذرت کر لی لیکن قاسمی صاحب کی تیوری چڑھ گئی۔ وزیر آغا نے 'اوراق' جاری کیا تو اس کی مقبولیت بھی قاسمی صاحب برداشت نہ کر سکے۔ اور وزیر آغا صاحب کو ادبی میدان سے بھگانے کے لئے ایک ہجو سائیکلو اسٹائل کر کے وسیع پیمانے پر تقسیم کی گئی۔ اس ہجو کی ننگی گالیوں کو وزیر آغا برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے 'اوراق' بند کر دیا۔ منصور آفاق کا اہانت آمیز اور دشنام آلود پمفلٹ بھی اسی دور میں چھپا جس کا ہدف وزیر آغا تھے۔

'اوراق' کے بند ہوتے ہی مخالفت کا طوفان تھم گیا اور پاکستان کی ادبی فضا میں قاسمی صاحب کا پھریرا لہرانے لگا۔ دو سال کے بعد جب داخلی حقیقت منکشف ہو گئی تو وزیر آغا نے "ہر چہ بادا باد" کہہ کر ہر قسم کی مخالفت کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ 'اوراق' دوبارہ جاری ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دشنامی حملے دوبارہ شروع ہو گئے لیکن ان کے ہر وار کا جواب اس ناچیز انور سدید نے دائرۂ تہذیب میں رہتے ہوئے دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ادبی تاریخ کا حصہ ہے اور کبھی خدا نے توفیق دی تو میں اس پر پوری کتاب لکھوں گا۔ تاہم یہاں ڈاکٹر انور محمود خالد کے ایک خط کا اقتباس ماہنامہ 'الحمرا' لاہور (بابت نومبر 2006) سے پیش کرتا ہوں جس میں ڈاکٹر صاحب نے اس نصف صدی کے تنازعے کو مندرجہ ذیل چند سطروں میں سمیٹا ہے۔

"مرحوم احمد ندیم قاسمی کی انور سدید سے شدید ناراضی بہت بعد کی بات ہے اور اس کا سبب انور سدید کم اور ندیم صاحب کے حاشیہ نشین زیادہ تھے جو ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف مسلسل اپنے اپنے اخباری اور جریدی کالموں اور مضامین میں زہر اگلتے رہتے تھے اور دوسری طرف سے جواب نہ پا کر خوشی سے بغلیں بجاتے تھے۔ تنگ آ کر وزیر آغا کے نیاز مند انور سدید نے جوابی کارروائی کی اور یہ ایک تُکّل مخالفین کی ساری پتنگوں سے بھڑ گئی تو نہ صرف عطاء الحق قاسمی صاحب خفا ہو گئے بلکہ ان کے حواریوں نے بھی شکایات کے انبار لگا دیئے۔ یقین نہ آئے تو اس زمانے کے عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور خالد احمد کے اخباری کالم پڑھیں، شمیم احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، مشکور حسین یاد اور رشید ملک کے مضامین اور 'آئینہ' لاہور جیسے گمنام پمفلٹ میں چھپے ہوئے منو بھائی، ظفر اقبال اور مسعود اشعر کے طنزیہ تاثرات پڑھیں..."

یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ میں نے حملہ آور ہونے اور پہل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، دفاع کا کوئی موقعہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ اگر اپنا دفاع جرم ہے تو میں اس 'جرم' کا اعتراف کرتا ہوں لیکن اس اعتراف کی آڑ میں اگر الزام تراشی کی گئی تو دستاویزی ثبوت پیش کرنے کے حقوق محفوظ رکھتا ہوں۔

جناب اظہار اثر نے احمد ندیم قاسمی صاحب کے پھیلائے ہوئے اثرات میں شہرت، دولت اور حکومت پرستی کی عادات 'عورت پرستی' اور 'شہوت پرستی' کو خاص طور پر نشان زد کیا ہے۔ اس فن میں یہاں قاسمی صاحب کے دوست ساقی فاروقی کی کتاب 'بازیافت اور بازگشت' سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ساقی فاروقی نے ان سے سوال کیا۔ "آپ کی شاعری میں کسی شدید عشق کی کامیابی یا ناکامی سے پیدا ہونے والے نشاط یا الم کی کمی بہت نمایاں ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ شادی سے پہلے یا شادی کے علاوہ بھی کوئی سلسلہ تھا کہ نہیں؟"

قاسمی صاحب نے جواب دیا "آپ دونوں (ن م راشد اور ساقی فاروقی) کو میرے یہاں نشاط و الم کی کمی دکھائی دیتی ہے تو میں اسے المیہ کہوں گا۔ اظہار کا بھی اور رسائی کا بھی۔ اب جہاں تک 'سلسلے' کا تعلق ہے تو ایک خاتون سے بہت شدید اور بہت ٹوٹ کر محبت کی۔"

ساقی فاروقی: "اسی کی تھوڑی سی وضاحت بھی کر دیجئے"

احمد ندیم قاسمی: "جی ہاں! اس تعلق میں جنسی تجربات بھی شامل تھے۔ آپ یہی معلوم کرنا چاہتے تھے نا؟"

اب رہ گئی اس 'گروپ' کے دوسرے لوگوں تک عورت پرستی اور شہوت پرستی کے پھیلنے کی بات تو اس کے لئے غزالہ خاکوانی اور افتخار نسیم نے بہت کچھ لکھ دیا ہے اور ان کے ایک نیاز مند تو اس وقت موت کی نذر ہو گئے جب وہ 'زنا کاری' میں مشغول تھے اور ان کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔ ان کی جیب سے 'ویاگرا' برآمد ہوئی تھی۔

ان باتوں کے پیش نظر ہی میں نے یہ لکھا تھا کہ قوم کو قاسمیوں کے برعکس وزیر آغا کی زیادہ ضرورت ہے جو گروہ بندی کو مثبت جہت دیں۔ فی الحال میں یہاں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ لیکن آخر میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے وزیر آغا کی کتاب 'اردو شاعری کا مزاج' پر کڑی تنقید کبھی نہیں کی۔ وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ البتہ دوسروں کو 'ہشکانے' میں پیش پیش رہتے تھے۔ جس نے اختلافات کو ابھارا حتیٰ کہ نوائے وقت کے مدیر جناب مجید نظامی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اور جناب آصف ثاقب نے اس تنازعے کو ختم کرانے کی خواہش ظاہر کی اور میں نے انہیں تمام اختیارات تفویض کرنے کے علاوہ یہ بھی کہا کہ قاسمی صاحب اگر میرا ایک 'جرم' ثابت کر دیں تو میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ لیکن قاسمی صاحب نے مجید نظامی صاحب کو جواب دیا:

"میں اس منافق کے ساتھ آپ کی میز پر چائے نہیں پی سکتا۔"

اور وہ قصہ زمین برسر زمین ختم کرنے کی بجائے اپنی تمام نفرتیں، تمام تعصبات اور تمام دشنام اور تخلیق کے مدیر اظہر جاوید کے خلاف مقدمے کی ڈگری ساتھ لے کر لحد میں اتر گئے۔ میں ان کی مغفرت کے لئے دعا کرتا ہوں۔ جناب اظہار اثر صاحب یہ مضمون نہ لکھتے تو میں بھی یہ 'جواب دعویٰ' پیش نہ کرتا۔ ان کے دوسرے حصے کا (جس میں ڈاکٹر وزیر آغا سے نظریاتی اختلاف رائے ظاہر کیا گیا تھا۔ ن ظ) جواب باقی ہے مضمون طول کھینچ گیا ہے اس لئے اظہار اثر صاحب! یار زندہ صحبت باقی

OO

صحافتی غیر دیانت داری

'حیات' کی معروضیت پر سوالیہ نشان

نصرت ظہیر

کچھ جذباتی رشتے ایسے ہوتے ہیں جن پر عمر اور مقام کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ بدلتے ہوئے وقت کی گرد سے محفوظ رہ کر ہمیشہ دل و دماغ میں جگنو بن کر چمکتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک روشن لگاؤ ماہنامہ 'حیات' سے بھی ہے جو کبھی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی (سی پی آئی) کا ہفتہ وار ترجمان ہوا کرتا تھا۔

کوئی بیس سال کی عمر تھی، انقلاب کا جنون، پارٹی کی ہمہ وقت سرگرم رکنیت، شعر و ادب کا شوق، ہر ہفتے 'حیات' کا مطالعہ... پارٹی یونٹ کی میٹنگ میں 'حیات' کی عوامی سرکولیشن بڑھانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ممکنہ خریداروں کی ایک فہرست بنا کر رجسٹر بغل میں دبائے شہر میں گھوم رہے ہیں کہ اگلے ہفتے میٹنگ میں رپورٹ بھی پیش کرنی ہے، کتنے نئے خریدار بنے، کتنے پرانے خریداروں سے چندہ وصول کر پائے اور کل کتنی کاپیاں بکیں۔

پارٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں کبھی کوئی رپورٹ 'حیات' میں شائع ہوتو اسے پورے اشتیاق سے سب کے بیچ بیٹھ کر بلند آواز میں پڑھنا اور کہیں پارٹی کے ڈسٹرکٹ اور سٹی یونٹ کے عہدیداروں اور مقررین کے ناموں کے بعد کسی آخری سطر میں بہت سے ناموں کے بیچ میں اپنا نام بھی موجود پانا کہ کامریڈ نصرت ظہیر بھی سیکڑوں حاضرین میں شامل تھے تو خوشی سے پھولے نہ سمانا اور ہر کسی کو اتراتے ہوئے وہ خبر دکھاتے پھرنا... یہ سب وہ یادیں ہیں جو آج شکستِ خواب کی وادیِ اضمحلال میں کبھی گشت کرنے آنکلتی ہیں تو دکھے دل کو تھوڑا سا قرار آجاتا ہے کہ چلو جو بھی ہوا کبھی خواب تو دیکھے تھے۔

یقین کیجئے کہ 'حیات' کی باریک کتابت میں کبھی سال دو سال میں کسی رپورٹ کے متن میں اپنا نام دیکھ کر جو خوشی تب ہوتی تھی وہ بعد کی تیس سال سے آگے کی صحافتی زندگی میں سیکڑوں جگہ ہزاروں بار اپنا نام جلی حروف میں چھپا دیکھ کر بھی نہیں ہوئی۔ کوئی بیس سال پہلے سیلم پور کے فساد کی ایک رپورٹ جو قومی آواز کے لئے لکھی گئی تھی جب 'حیات' (ہفت روزہ) میں ڈائجسٹ ہوئی تو اسے اپنے نام کے ساتھ دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی تھی کہ آج بھی بیان سے باہر ہے۔

اب 'حیات' پارٹی کا آفیشیل ترجمان نہیں، لیکن جذبات کا عالم وہی ہے۔ کہیں نظر آجائے تو دل پڑھے بغیر نہیں ٹھہرتا۔ دل میں آج بھی حیات کے معروضی طرزِ صحافت کا احترام ہے۔ لیکن چند ماہ قبل اس میں ڈاکٹر علی جاوید کی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ ہونے والی قطعی ذاتی اور شخصی نوعیت کی مراسلت، اردو کا ادبی ماحول کے عنوان سے دیکھی تو دل کو دھکا سا لگا۔ ذاتیات کو تو 'حیات' نے کبھی موضوع نہیں بنایا تھا۔ اس میں تو نظریہ موضوع بنتا تھا!

عنوان پڑھ کر لگا تھا کہ شائد اس باب میں اردو کے معاصر ادب کا کوئی سنجیدہ جائزہ لیا گیا ہوگا مگر معلوم ہوا کہ ادبی ماحول سے ادیبوں کے آپس کے ذاتی معاملات مراد لئے گئے تھے۔ اور وہ بھی ایسے معاملوں میں کہ کس نے کون سا عہدہ حاصل کرنے کے لئے کس کی سفارش اور کس کی مخالفت کی، کیا ہتھکنڈے اپنائے، کے شیشے میں اتارا، کس کی خوشنودیاں حاصل کیں، کہاں سجدے کئے...

اور 'ادبی ماحول' کا یہ جائزہ بھی پوری دیانت داری سے نہیں لیا گیا۔ مئی 2007 کے اس شمارے میں پہلے ڈاکٹر علی جاوید کو 'قومی کونسل برائے ترقی اردو زبان' کا ڈائریکٹر مقرر ہونے پر مبارک باد دی گئی، پھر بتایا گیا کہ اردو رسائل و جرائد میں ان کی تقرری کے خلاف بیان بازی سے اردو کا ادبی ماحول پراگندہ ہو گیا ہے (جب کہ ڈاکٹر صاحب پر کم از کم ادیب ہونے کا الزام کوئی شقی القلب قاری بھی نہیں لگا سکتا) اس کے بعد پروفیسر نارنگ کا قطعی ذاتی نوعیت کی مبارک باد اور شکایتوں پر مشتمل خط اور پھر ڈاکٹر علی جاوید کا طویل جواب، جو متقاضی تھا اس بات کا کہ جس طرح نارنگ صاحب نے نجی خط لکھا تھا اسی طرح یہ بھی انہیں نجی طور پر بھیجنے پر اکتفا کیا جاتا۔ 'حیات' جیسے سنجیدہ، معروضی اور نظریاتی رسالے میں یہ قطعی ذاتی مراسلت اتنے نمایاں انداز میں کیوں چھاپی گئی کہ سرورق پر بھی اسے جلی سرخی کے ساتھ درج کیا گیا اور شمیم فیضی، جو سی پی آئی کے سکریٹری بھی ہیں، اور جن کی زندگی لائق تقلید مارکسسٹ کمٹمنٹ اور قربانیوں سے تعبیر ہے 'حیات' کی اس بے راہ روی سے کیسے بے خبر رہ گئے یہ سوچ کر حیرت بھی ہوئی اور تکلیف بھی۔

بعد میں یہ جان کر اور افسوس ہوا کہ پروفیسر نارنگ نے خط کا جو جواب بھیجا تھا وہ ڈاکٹر جاوید نے کامریڈ فیضی کو فراہم نہیں کیا اور صرف اپنا جواب 'حیات' میں شائع کرا دیا۔ خیر فیضی صاحب نے یہ اچھا کیا کہ اس سے پہلے انگریزی کے ایک مضمون

کے ترجمے میں اپنی طرف سے نارنگ صاحب کے خلاف کچھ اضافہ کر کے جو بدریانتی کر دی گئی تھی اس کی معذرت کر لی اور اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا اور اب امید کی جاسکتی ہے کہ 'حیات' کی سنجیدگی، معروضیت اور نظریاتی وابستگی اپنے روایتی معیار کے ساتھ برقرار رہے گی۔

نارنگ صاحب نے اس سلسلے میں جو خط ہمیں صرف پڑھنے کے لئے بھیجا اور جو 'حیات' میں چھپایا گیا ہے اسے ہم یہاں صرف اس لئے چھاپ رہے ہیں کہ جو بات ادھوری رہ گئی تھی وہ پوری ہو جائے۔ لیکن پہلے وہ خط پڑھ لیجئے جو چھاپے گئے ہیں تا کہ سیاق وسباق سمجھ میں آجائے۔ پروفیسر نارنگ نے جو خط ڈاکٹر جاوید کو پہلے لکھا وہ یوں تھا (بحوالہ ماہنامہ 'حیات' مئی 2007):

مکرمی ڈاکٹر علی جاوید صاحب۔

NCPUL کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے نیا عہدہ جوائن کرنے پر آپ کو بہت مبارکباد۔ ہر چند کہ میری مبارک باد اور تہنیت آپ کی نظر میں بے وقعت ہوگی کیوں کہ ورغلانے والوں نے آپ پر خاصا کام کیا ہے، تاہم میرا اخلاقی فرض ہے کہ خوشی کے اس موقع پر تہنیتی کلمات پیش کروں۔ دیکھا جائے تو ورغلانے والوں کا بھی کیا قصور جب انسان خود ہی فراموش کر دے کہ ابھی کچھ ہی برس پہلے وزیر اعلیٰ دہلی نے تو میری گزارش پر (دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری کے عہدے کے لئے۔ ن ظ) آپ کے نام نامی پر صاد کر ہی دیا تھا لیکن آپ ہی کے کچھ کرم فرما بھانجی مارنے کے لئے ساز وسامان سے لیس ہو کر ان کے پاس پہونچ گئے اور ان کا ہاتھ روک لیا (اس ساز وسامان میں اطلاع کے مطابق انجمانی راجیو گاندھی کا پتلا پھونکتے ہوئے جاوید صاحب کی پرانی تصویر بھی شامل تھی۔ ن ظ) یا آپ کے رسالے کی رسم اجرا کی وہ تقریب جب آپ اس ناچیز کے بغیر جلسہ منعقد کرنے کو تیار نہیں تھے، یا جب اسلامک سنٹر میں آپ کی خاطر ووٹ ڈالنے کے لئے میں قطار میں لگا تھا، یا یقین نہ آئے تو شہریار بتائیں گے کہ جامعہ میں پروفیسری کے موقع پر میں نے ان سے کیا کہا تھا، کس کس بات کا ذکر کروں۔ ہر چند کہ غلط بیانیاں بھی بہت روگزر میں ہوتے ہیں، بہر حال آج نہیں تو کل آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ خدا کرے کہ آپ NCPUL میں کامیاب رہیں اور جی جان سے اردو کی خدمت کر سکیں، اس کے علاوہ جو کچھ آپ اور آپ کے دوست کرتے رہے ہیں، مجھے کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ خدا سب کو خوش رکھے۔ دعا گو۔ (گوپی چند نارنگ)

اس کے جواب میں ڈاکٹر جاوید کا یہ خط چھاپا گیا:

محترم نارنگ صاحب

15 اپریل 2007 کا نوازش نامہ ملا۔ میرے ڈائریکٹر ہونے پر آپ نے مبارک باد اور تہنیت کے پس پردہ اپنے دل کی جو بھڑاس نکالی ہے وہ مجھے taste میں نہیں ہے۔ آپ نے سارے فیصلے خود ہی کر دیے کہ آپ کے خلاف ورغلانے والے مجھ پر اثر انداز ہو گئے ہیں اور ان کا بھی کیا قصور جب میں نے خود ہی احسان فراموشی اختیار کر لی ہے اور چند برس پہلے آپ نے کیا کیا احسانات فرمائے تھے۔ ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔

آپ جیسی اعلیٰ مرتبت شخصیت کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہئے کہ عالی ظرف لوگ اگر کسی پر احسانات کرتے ہیں تو کبھی بھی اس کا اظہار نہیں کرتے۔ یہ تو زندگی کا ایک عام اصول ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کرنے کی جسارت کی ہے۔ جہاں تک میرے تعلق سے آپ کی سفارشات اور احسانات کا تعلق ہے، آپ نے مجبور کیا ہے کہ اس کی صفائی پیش کروں۔ آپ کو اور تمام اردو والوں کو اس بات کا علم ہے کہ دو مرتبہ دہلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری کے عہدے کے لئے میرے نام کا انتخاب ہوا، یعنی ایکسپرٹ کمیٹی نے جو سفارش کی اس میں دونوں مرتبہ پینل میں مجھے سر فہرست رکھا گیا۔ میرے چند خیر خواہوں نے وزیر اعلیٰ ہی نہیں بلکہ اور اوپر تک میرے خلاف کارروائیاں کیں اور وعدہ کرنے کے باوجود وزیر اعلیٰ نے میرا نام کاٹ کر کسی اور کا انتخاب کیا۔ جہاں تک وزیر اعلیٰ سے آپ کی طرف سے میرے نام کی سفارش اور گزارش کا تعلق ہے، اس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ میرا تقرر نہیں ہوا تب تو آپ احسانات کے بوجھ تلے ایسے دبا رہے ہیں کہ سانس نہ لے سکوں، اگر میرا تقرر ہوا ہوتا تو کیا حال ہوتا، اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے! ایک بات اور دو سلکشن کمیٹیاں جو اس تعلق سے ہوئی تھیں ان کے ایکسپرٹ پینل میں پہلی مرتبہ جناب شریف الحسن نقوی اور پروفیسر صادق اور دوسری مرتبہ پروفیسر حنیف کیفی اور پروفیسر عتیق اللہ تھے۔ ان میں سے کسی شخص نے آج تک مجھ پر کسی قسم کا احسان نہیں جتایا۔ میں نے جب ان حضرات کا شکریہ ادا کیا تو ان کا کہنا تھا انہوں نے وہی کیا جو ایمانداری کا تقاضہ تھا۔ ان تمام حضرات نے مجھے بتایا کہ تمام امیدواروں میں اس ناچیز کے علاوہ کوئی اس لائق نہیں تھا جس کو مجھ پر سبقت دی جا سکتی تھی اور اسی لئے دونوں مرتبہ اتفاق رائے سے مجھے سر فہرست رکھا گیا تھا، جسے وزیر اعلیٰ نے آپ کی سفارش اور گزارش کے باوجود نظر انداز کر دیا۔ اس ضمن میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ یہ آپ کی محبت اور ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے اس ناچیز کی سفارش کی ورنہ میں نے کبھی آپ کی خدمت میں ایسی درخواست نہیں کی تھی۔ بہر حال آپ باذوق آدمی ہیں۔ چھوڑیے ان باتوں کو اور ایک اچھا سا شعر سنئے: تسلسل خواب خوش آثار کا یوں ٹوٹ جانے پر / تاسف ہے مگر ہم کو پشیمانی نہیں کوئی

جہاں تک رسالے کی رسم اجرا کا تعلق ہے کہ میں آپ کے بغیر جلسہ منعقد کرنے کو تیار نہیں تھا یہ کہہ کر آپ اور بھی زیادتی کر رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے وقت دیا تھا اور آپ نے بھی اس جلسے میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تھی جو اس ناچیز نے خندہ پیشانی سے تسلیم کی تھی اور آپ کی آمد پر آپ کا شکریہ ادا کیا تھا۔ نارنگ صاحب! اگر وزیر اعلیٰ دیکشت بھی تشریف نہ لاتیں، تو بھی جلسہ ہوتا کیوں کہ مرغے کے بغیر بھی سویرا ہوتا ہے۔ اسلامک سینٹر کے الیکشن کے موقع پر مجھے ووٹ ڈالنے کے لئے آپ نے زحمت فرمائی اور قطار میں لگے، زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا اور کوشش کروں گا آپ کو آئندہ ایسی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جامعہ میں پروفیسری کے تعلق سے آپ نے کسی سے کیا باتیں کیں مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں لیکن بات نکلی ہے تو اتنا ضرور عرض کر دوں کہ دہلی یونیورسٹی میں میرٹ پروموشن اسکیم Merit Promotion Scheme کے تحت مجھے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ تین ایکسپرٹس میں سے ایک نے میرے لئے لڑائی لڑی۔ میرے وہ کرم فرما جس نے میرے حق میں لڑائی لڑی، ان سے آپ کو یہ شکایت ہے کہ میری خاطر وائس چانسلر وغیرہ سے جھگڑا کیوں مول لیا۔ دو ایکسپرٹ جو آپ کی مرضی کے خلاف ایک قدم اٹھانے کا تصور نہیں کر سکتے، ان دونوں نے میرے خلاف رائے دی۔ میرے خلاف رائے دینے والوں میں ایک صاحب وہ ہیں جن کے نزدیک آپ کی شخصیت بہت منفور ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ

:وہ طائر بھی تو سرگرم سفر تھے لیکن / مجھ کو صیاد نے پرواز سے پہچان لیا

نارنگ صاحب! آپ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میرے احباب کا خیال ہے کہ میں بے وقوفی کی حد تک صاف گو ہوں اس لیے مجھے اردو کے کسی بھی ادبی گروہ کی سرپرستی حاصل نہیں ہو سکی۔ لیکن مجھے اس بات کا ملال نہیں ہے۔ آپ کی مجھ سے ناراضگی (صحیح لفظ ناراضی۔ ن ظ) کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں نے ساہتیہ اکیڈمی کے الیکشن میں مہاشویتا دیوی کے لئے سرگرمی سے حصہ لیا۔ میں آج بھی اسی رائے پر قائم ہوں اور میری ناچیز رائے میں ہارنے کے بعد بھی مہاشویتا دیوی کا قد کم نہیں ہوتا بلکہ حرف آپ پر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے ان کے حق میں اپنا نام واپس لے لیا ہوتا تو ادبی اور علمی دنیا میں آپ کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا (اور

اردو کے کسی ادیب کو ساہتیہ اکادمی کی صدارت قیامت تک نصیب نہ ہوتی۔ ن ظ) ایسے مجاہدین اردو جو حق بات کرتے ہوئے مارے گئے، ان کے مقابلے میں میری کیا بساط! میں تو جعفر زٹلی کا پرستار ہوں جو فرخ سیر کے آگے جھکا نہیں اور جان دے دی۔ میرے آئیڈیل حبیب جالب ہیں جس نے آدم جی ایوارڈ یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ وہ آدم جی کے لئے نہیں عوام کے لئے لکھتے ہیں۔ بات لمبی ہوتی جارہی ہے اور آپ کا وقت قیمتی ہے۔ میرے ایک دوست ہیں جعفر عسکری۔ شاید آپ بھی واقف ہوں گے۔ ان کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے۔ سنیے:

بٹنے نہ پھر کبھی راہِ وفا سے ہم جعفر/ مکاں کی طرح بدلتے رہے عقیدہ لوگ

میرے حق میں آپ نے جو دعائیں کیں ان کا شکریہ! امید ہے سرپرستی کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ناچیز (علی جاوید)

بعد میں 31 مئی کو نارنگ صاحب نے یہ خط راقم کو لکھا۔

مکرمی نصرت ظہیر صاحب

کل مجھے آپ سے معلوم کر کے دکھ ہوا کہ ڈاکٹر علی جاوید نے میرا ذاتی خط 'حیات' میں دیا ہے۔ یہ ذہنیت حد درجہ افسوسناک ہے کہ بجائے علمی و ادبی کام کرنے کے کوئی ذاتیات پر اُتر آئے۔ یہ کردار کشی کا آسان ترین نسخہ ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جب انھوں نے میرا پہلا خط دیا ہے تو اخلاقی طور پر دوسرا خط بھی دینا چاہیے تھا جو اُن کے خط کے جواب میں لکھا گیا۔ لیکن اس کو انھوں نے دبا دیا کیونکہ اُس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ کردار کشی کر رہے ہیں جو ایک افسوسناک اور ناشائستہ حرکت ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سے پہلے بھی انھوں نے ایک انگریزی مضمون کے ترجمے کا ناجائز استعمال کیا تھا اور اس میں خواہ مخواہ چند سطریں میرے خلاف بڑھا دی تھیں۔ ان باتوں سے رنج تو ہوتا ہے لیکن میں برابر اپنے کام میں منہمک رہتا ہوں کیونکہ منفی باتوں میں پڑنے سے بلاوجہ وقت کا زیاں ہوتا ہے۔ مدیر 'حیات' کی عالی ظرفی اور صحافتی دیانت داری کی داد دینا چاہیے کہ جب ان کو سچائی معلوم ہوئی تو ہر چند کہ میری ان سے ملاقات نہیں، انھوں نے باقاعدہ نوٹ لکھ کر معذرت کا اظہار کیا۔

آپ کی اطلاع کے لیے میرا دوسرا خط جو ڈاکٹر علی جاوید نے مدیر 'حیات' کو عمداً فراہم نہیں کیا، آپ کے پڑھنے کو بھجوا رہا ہوں۔ ہو سکے تو اسے مدیر 'حیات' کے علم میں بھی لے آئیں، ممنون ہوں گا۔ دعا گو (گوپی چند نارنگ)

جس خط کا ذکر پروفیسر نارنگ کر رہے ہیں وہ 24 اپریل کو بھیجا گیا تھا:

محبی ڈاکٹر علی جاوید صاحب

آپ کا طویل نوازش نامہ ملا، اتنی لمبی چوڑی صفائی کی ضرورت نہیں تھی۔ بہرحال آپ نے جن شعروں کا سہارا لیا میں ان سے لطف اندوز ہوا اگرچہ ان کا محل نہیں تھا۔ میں نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ آپ نے احسان فراموشی اختیار کر لی۔ احسان کیسا میں نے تو زندگی بھر بھی کسی عزیز رشتہ دار سگے سمبندھی بھائی بھتیجے کے لیے کچھ نہیں کیا، جو کچھ کیا جن کے لیے کیا، اس کا اندازہ آپ کو مجھ سے زیادہ ہے، اور کبھی کسی کو نہیں جتایا، آپ کو بھی نہیں، یہ تو مبارکباد کے ساتھ برسبیل تذکرہ تھا کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ کوئی غیر مبارکباد دے رہا ہے۔

تتھاگت سے روایت ہے کہ ایک رشی دریا کے کنارے بیٹھا ریاضت کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک بچھو پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اس نے اسے انگلی پر اٹھا لیا اور لاکر ریت پر اتار دیا۔ اتارتے ہی بچھو نے رشی کے ڈنک مارا۔ تتھاگت نے پوچھا بھائی میں نے تو نیکی کی مگر تم نے یہ کیا کیا۔ اس نے کہا وہ تمھارا کرم تھا یہ میرا کرم ہے (یوں بھی کہہ سکتے ہیں وہ تمھارا ظرف تھا یہ میرا ظرف ہے)۔ یہ باتیں بزرگوں سے چلی آتی ہیں۔ ذکر آ گیا تو زبان پر آ گئیں، روئے سخن کسی کی طرف نہیں ہے۔

آپ 'مجرا اس' کہتے ہیں میں صبح کی بات شام کو بھول جاتا ہوں۔ اب مبارکباد کا خط لکھا اور ایک آدھ حق بات لکھ دی تو آپ کو ناگوار گزر رہا ہے۔ یہ بھی تو سوچیے کہ دوسروں کو کیا کیا ناگوار گزرتا ہوگا۔ 'عالی ظرفی' کی بھی خوب رہی میں نے تو کبھی کسی چیز کا کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا۔ ایک یونیورسٹی کا ربط تھا، اسی ناطے تھوڑا سا سچ لکھ دیا تو آپ کو اچھا نہیں لگا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ وزیر اعلیٰ صاحبہ کو فون کرانے کے لیے آپ نے مجھے نیویارک بھی فون کیا تھا اور ای میل بھی بھجوایا تھا، وہ ID میرے کمپیوٹر میں اب بھی محفوظ ہے۔ تعجب اس پر کہ/ اس قدر روشن ارباب وفا ہو جانا/ باور آیا مجھے .... آپ لکھتے ہیں کہ فلاں فلاں ایکسپرٹ میری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھانے کا تصور نہیں کر سکتا۔ یہی تو خوش فہمیاں ہیں جن سے میں کسی کو روک نہیں سکتا۔ اور آپ بھی کانوں کے خوب 'پکّے' ہیں کہ جس نے جو کہا آپ نے یقین کر لیا۔

رہا الیکشن تو ہندوستان جمہوریت ہے، الیکشن روز ہوتے رہتے ہیں۔ کسی کی مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کار آگاہ شخص ہیں تو آپ کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ کن لوگوں کو اردو کا وجود ناگوار تھا اور آج بھی ہے، اگر وہ خود سامنے آتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ آپ سے میں توقع نہیں کرتا کہ ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کریں گے جن کو اردو کا وجود ناگوار ہے۔ محترمہ کی تو میں عزت کرتا ہوں اور اس بات کو وہ بھی بخوبی جانتی ہیں، آپ چاہیں تو ان سے پوچھ بھی لیں، جمہوریت کی وہ بھی قدر کرتی ہیں اور انھوں نے مجھے مبارکباد بھی دی اور میں نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ الیکشن تو دوسرے لڑا رہے تھے جو 'نیتا گری' کرتے ہیں۔ نام نہاد نیتاؤں سے لوگ نفرت اسی لیے کرتے ہیں کہ طاقت ہتھیانے کے لیے وہ کردار کشی تو کیا کچھ بھی کر گزرنے پر اتر آتے ہیں۔ خدا نہ کرے آپ یا ہمارے لوگوں میں کوئی ایسی 'نیتا گری' کا چلن اختیار کرے۔

بس کہنا صرف یہ ہے کہ دو لفظ اس لیے لکھ دیے کہ کبھی کبھی ایسے لوگوں سے بھی یاد اللہ میں ہرج نہیں جو فقط خیر خواہ ہیں لیکن جتاتے بتاتے کچھ نہیں نہ وہ غرض کے بندے ہیں۔ آپ نے لکھا تو میں نے بھی سمع خراشی کر لی ورنہ اتنا بھی کہاں! دعا گو (گوپی چند نارنگ)

اس وقت تک ڈاکٹر علی جاوید 'حیات' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اس لئے اس خط کو مخفی رکھا جانا ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ بہرکیف جس طرح اول الذکر دو ذاتی خطوط شائع کرنا غلط تھا اسی طرح اس آخری خط کو شائع نہ کرنا اور بھی بڑی صحافتی غیر دیانت داری تھی، جس کا امید ہے اب 'حیات' میں اعادہ نہیں ہوگا۔ OO

'ادبی' غلاظت

اُف! یہ فحش نظمیں

مشتاق صدف

ان دنوں ایک وبا تیزی سے پھیل رہی ہے، وہ یہ کہ چند اردو والے ذاتی بغض و عناد اور پرخاش کے سبب فحش اور عریاں نظمیں تقسیم کررہے ہیں۔ یہ گمنام نظمیں خطیر رقم خرچ کر کے بذریعہ ڈاک بھیجی جارہی ہیں جن سے اخلاقی قدریں پامال ہورہی ہیں۔ ادھر تواتر سے کئی فحش نظمیں منظرِ عام پر آئی ہیں جو کچھ سرکردہ اور اہم شخصیات کی ہجو میں کہی گئی ہیں۔ ہجو گوئی گرچہ ہمارے ادبی سرمائے کا حصہ رہی ہے لیکن یہاں جس نوع کی ہجو گوئی دیکھنے کو مل رہی ہے وہ کسی طرح بھی لائق اعتنا نہیں۔ ان نظموں کے بہت چرچے ہیں اور کیوں نہ ہو، برائی تو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ ان پرآشوب نظموں کو کوئی بھلامانس اور شریف النفس انسان پڑھ بھی نہیں سکتا۔ جو افراد ایسی اوچھی حرکتوں میں ملوث ہیں اُن کی پرزور مذمت بلکہ سرزنش ہونی چاہیے، ورنہ یہ بیماری کہیں سرطان کی شکل اختیار کرگئی تو لاعلاج ہوجائے گی۔

گزشتہ ایک برس میں فحش اور عریاں تحریروں کی افزائش اور اس کی تقسیم سے ہر شخص پریشان ہے کیونکہ اب کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ کب کس کی شخصیت نشانہ بنے گی اور کب کس کے گھر کی بہو بیٹیوں کی عزت نیلام ہوگی یہ کسی کو پتہ نہیں۔ فرضی ناموں سے اخبارات و رسائل میں غیر سنجیدہ مراسلات کی اشاعت، غیر اخلاقی نظموں کی تقسیم اور زبانی ذرائع مثلاً گفتگو اور افواہ کے ذریعہ ذاتی معاملات کی تشہیر سے اردو کی ادبی فضا مسموم ہوتی جارہی ہے۔ اس پراگندہ کھیل میں ہمارے کچھ نوجوان اور کچھ اساتذہ شامل ہیں۔ یہ لوگ معاشرہ کو گندہ کررہے ہیں اور گمراہ بھی۔ ایسے افعی سیرت والے لوگوں کو اخلاقی قدروں کے زوال کی کوئی فکر نہیں، کیونکہ ان کے لیے اخلاقیات کا درس بے معنی سا ہوگیا ہے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ اخلاقیات اور سماجیات کا درس دینے والے اساتذہ فعلِ شنیع کو فروغ دے رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں یکے بعد دیگرے شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، خلیق انجم، ابن کنول، نجمہ رحمانی وغیرہ کے خلاف فحش نظمیں تقسیم کی گئیں۔ جن میں ان کی شخصیت اور ان کے خاندان کی بہو بیٹیوں اور بیویوں کی کردار کشی کی گئی ہے۔ ان نظموں میں ضمنی طور پر بہت سی خواتین اور افراد کی شخصیت اور کردار کو رسوا کیا گیا ہے جن میں شمیم حنفی، قاضی افضال حسین، قاضی جمال حسین، طارق چھتاری، پروفیسر صادق، شاہینہ تبسم، ابوبکر عباد، محمد کاظم، ارتضیٰ کریم، احمد محفوظ، سراج اجملی، باراں رحمٰن وغیرہ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نصرت ظہیر اور ان کا 'ادب ساز' بھی عریاں نثری تحریروں کی زد میں آئے۔ اوچھے پن کی انتہا یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی کی اردو کی ایک استاد کا فرضی شادی کارڈ بھی چھاپ کر تقسیم کردیا گیا۔ مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ تو کہیے کہ شادی کی مقررہ تاریخ سے پہلے اس کارڈ کے فرضی ہونے کا پتہ چل گیا ورنہ جانے کیا ہوتا۔ جو افراد اخلاقی و سماجی قدروں سے کھلواڑ اور برائیوں کو ہوا دے رہے ہیں، نوجوانوں کے درمیان غلط کو صحیح بنا کر پیش کررہے ہیں اُن کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی جانی چاہیے، ورنہ یہ بیہودگی ہے کہ:

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے ست

دراصل جو عریاں اور فحش نظمیں تقسیم کی جارہی ہیں اُن کا سرچشمہ 'کوک شاستر' معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ کوک شاستر بھی ان کے آگے ہیچ ہے۔ ان بیہودہ نظموں میں لیکچررز اور پروفیسرز کے حوالے سے اُن کی داشتاؤں یعنی غیر منکوحہ کا ذکر ملتا ہے جن میں سرے سے ہی سچائی نہیں ہے۔ ان داشتاؤں کو رجھانے اور اُن کی جنسی حرکتوں کا ذکر انتہائی فحش انداز میں کیا گیا ہے۔ حیرت تو ان پر ہوتی ہے جو ایسی نظموں کو مزہ لے لے کر اور لہک لہک کر پڑھتے ہیں۔ درحقیقت ایسے افراد اتنے ہی گنہگار ہیں جتنے کہ ان نظموں کے رذیل خالق اور اُن کے پروڈیوسر اور فائنسر، کیونکہ ان ہی کی حوصلہ افزائی سے یہ بیسوائی ادب پروان چڑھ رہا ہے۔

سرکردہ ادبی شخصیات نے ان نظموں کی سخت لفظوں میں مذمت کی ہے اور اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ چند ردعمل ملاحظہ فرمائیں:

''فحش نظمیں اور اخلاق سے گری ہوئی باتوں کو مشتہر کرنا اور انھیں لوگوں میں تقسیم کرنا نہایت ناپسندیدہ فعل ہے۔ گالی دینا اور اوچھی حرکت کرنا بالعموم اُن لوگوں کا ہتھیار ہوتا ہے جو سامنے آکر اپنی بات نہیں کہہ سکتے یا دلیل کی طاقت سے نہیں لڑ سکتے۔ یہ رویہ سرتاسر منفی، غلط اور افسوس ناک ہے۔ میں سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس طرح کی اخلاق سوز باتوں سے گریز کریں اور کسی بھی قیمت پر تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ

''ان دنوں بعض مقتدر ادبی شخصیتوں کے تعلق سے جو فحش نظمیں لکھنے والوں کے نام کے بغیر ڈاک کے ذریعہ بھیجی جارہی ہیں ان سے ہمارا ادبی معاشرہ زوال آمادہ نظر آرہا ہے۔ ایسی حرکتیں جو لوگ بھی کررہے ہیں میں ان کی سخت مذمت کرتا ہوں۔''

مظہر امام

''ہمارے زمانے میں ذاتیات کے خلاف نہیں لکھا جاتا تھا۔ ادب ذاتی پرخاش کے اظہار کے لیے نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے ایسی نظموں کے بارے میں سن کر اور پڑھ کر۔ یہ سب غلط ہے، بہت غلط، لکھنا ہے تو ظلم کے خلاف لکھئے، وقت کیوں برباد کررہے ہیں۔''

کمال احمد صدیقی

''یہ سلسلہ اخلاقی اور قانونی دونوں ہی اعتبار سے قابلِ گرفت ہے۔ ہم آج کے مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے میں فحاشی کو جس طرح فروغ دے رہے ہیں انتہائی غلط ہے۔ صحت مند ادب کی ترویج واشاعت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''

ایم قمر الدین، ایڈوکیٹ سپریم کورٹ

''یہ ایک غیر اخلاقی عمل ہے اور اردو زبان وادب کی تہذیب کے سراسر منافی ہے۔ پست ذہنیت رکھنے والے لوگ ہی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سخت مذمت کی جانی چاہیے۔''

ڈاکٹر انور پاشا

''یہ جو شعری سلسلہ ہے، وہ ذہنی پراگندگی اور اخلاقی تنزل کا اشاریہ ہے۔ اس طرح کی شاعری سے اردو ادب کا بہت بڑا نقصان اور اردو معاشرے کا خسرانِ عظیم ہورہا ہے۔ معلوم نہیں یہ کون سی اضطرابی کیفیت ہے جو اس تعفن بھرے ملفوظات میں برآمد ہورہے ہیں۔ میں اس کی سخت مذمت کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر کوثر مظہری

''جو لوگ یہ سب کر اور کرا رہے ہیں مجھے ان کی ذہنی حالت پر ترس آتا ہے۔ اور تکلیف اس بات کی ہوتی ہے کہ دنیا جس زبان کو وطنِ عزیز کی سب سے میٹھی، سب سے شائستہ اور سب سے مہذب لہجے والی زبان مانتی ہے اور جو میری ماں سے مجھے ورثہ میں ملی ہے، یہ مغلظات اسی مقدس زبان اور اس کے رسم الخط میں تحریر کی جارہی ہیں۔ کاش یہ لوگ اس گندگی اور بدبو کو ڈاک کے ذریعے سماج میں پھیلانے سے پہلے یہ realise کرپاتے کہ جن تحریروں کو وہ خود اپنی محترم ماؤں، بہنوں، بہوؤں اور بیٹیوں کے سامنے پڑھ کر نہیں سنا سکتے انھیں بلاتکلف دوسروں کے گھروں میں پہنچا کر وہ کون سا شرافت اور بہادری کا کام انجام دے رہے ہیں۔ بہادری تو تب ہے جب ان لوگوں کو جنھیں آپ نشانہ بنانا چاہتے ہیں سنجیدگی کے ساتھ، دلائل کے ساتھ غلط ثابت کرکے دکھائیں اور بزدلوں کی طرح اپنا نام نہ چھپائیں، بے خوف کر سامنے آئیں۔

نصرت ظہیر

آپسی رنجش کی بدولت لکھی جارہی ان نظموں کا اسلوب کذب بیانی اور افترا پردازی کا اسلوب ہے جس میں جھوٹ اور تحریف شامل ہے۔ اس کا مقصد اردو والوں کے درمیان عداوت، کینہ ونفرت اور اختلافات کو بڑھاوا دینا ہے۔ ایسے لوگ اپنی برائیوں پر دبیز پردہ ڈالنے کے لیے دوسروں کی پگڑی اچھالتے ہیں۔ انھیں دوسروں کا تنکا شہتیر اور رائی پربت نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے گریباں میں جھانکنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔

فحش رسالوں، ناولوں، جنسی تعلقات پر مبنی سیریز اور ٹیلی ویژن کی یلغار سے ویسے ہی ہمارے معاشرے میں اخلاقی وسماجی قدریں روبہ زوال ہیں جن سے ہندوستانی عوام کا ذوق ومعیار پست ہوتا جارہا ہے۔ وی سی آر اور انٹرنیٹ پر ہونے والی فحاشی سے اخلاقی اقدار پست سے پست ہوتی جارہی ہیں۔ ڈش انٹینا کے سیکس کلچر سے ہمارے تہذیبی تانے بانے کمزور ہوکر رہ گئے ہیں۔ اس کلچر کے حصار سے باہر نکلنے کی کوشش تو کجا، ہم معاشرے میں جرم کے گراف کو بڑھاتے ہی چلے جارہے ہیں۔ آج جس طرح سے تخریبی طاقتیں 'تشیع الفاحشہ' پر لگی ہوئی ہیں اتنا اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا گیا۔ کیا یہ کم ہے کہ آج کے اردو والے ایک ایسی روایت کو فروغ دے

رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ جو تخریبی طاقتیں معاشرے میں اخلاقی انارکی اور نفرت پھیلانے کا کام انجام دے رہی ہیں وہی اخلاقی انارکی اور نفرت پھیلانے کا کام کچھ اردو والے کر رہے ہیں۔ در حقیقت اس میں وہی لوگ ملوث ہیں جن کی زندگی فاسد، جن کے اخلاق خراب، جن کے مقاصد تخریبی اور جن کے افکار و خیالات فاسق ہیں۔ خدارا 'فینٹیسی' اور 'ڈبو نیئر' کی فحاشی اور اس کی روایت کو جلا نہ بخشیے ورنہ آنے والے دنوں میں باقی ماندہ اقدار و اخلاقیات کی آوازیں بھی دب کر رہ جائیں گی۔ اسے روکنے کی ضرورت ہے ورنہ اردو معاشرہ مسموم اور تباہ ہو جائے گا۔ تشویش اس بات کی ہے کہ ایسی فحش اور مبتذل نظمیں جنھیں گھر گھر پہنچانے کا کام ہو رہا ہے وہ کہیں روایت کی شکل نہ اختیار کر لیں، کیونکہ برائی کو اپنے پاؤں پسارنے میں دیر نہیں لگتی۔

ادبی معرکے ہر دور میں ہوتے ہیں لیکن اُن کا اپنا ایک معیار ہوتا ہے، ذاتی غم و غصے کا بھی اظہار کیا جاتا ہے لیکن ان میں بھی ایک طرح کی شرافت اور تہذیب ہوتی ہے، مضامین میں ایک دوسرے کے تئیں کج فہمی کا اظہار بھی کیا جاتا ہے لیکن اُن میں بھی ایک شائستگی اور سنجیدگی ہوتی ہے۔ ہم اس سے بھی واقف ہیں کہ ایک دوسرے سے شدید رقابت اور اختلافات کے باوجود ہمارے بزرگ ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں برہنہ نظر نہیں آتیں۔ لیکن اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ ادبی معرکے ہوں یا ذاتی غم و غصے کا اظہار، رقابت ہو یا اختلاف کہیں پر بھی ضبط و تحمل نظر نہیں آتا۔ نہ گفتگو کا کوئی معیار ہوتا ہے اور نہ وہ شرافت، وہ تہذیب، وہ شائستگی اور وہ سنجیدگی ہی رہی جن سے ہماری شناخت قائم ہوتی ہے۔ آج ہماری تحریریں اس قدر برہنہ اور عریاں ہو گئی ہیں کہ اسے پڑھنے کے لیے ہمت جٹانی پڑتی ہے۔ گویا ایسا لگتا ہے کہ فضیل جعفری اور زبیر رضوی نے بغضِ للّٰہی میں 'ذہنِ جدید' کے ذریعے جس طرح غیر سنجیدہ اور بازاری لہجہ کو فروغ دیا اور جس طرح کسی فردِ واحد کے خلاف چھچھوری گفتگو کی، دراصل اسی کی ترقی یافتہ منظوم شکل آج ہمیں دیکھنے کو مل رہی ہے۔ کسی کو کسی اکادمی یا ادارے کا انعام نہیں ملا، کوئی لیکچرر، ریڈر یا پروفیسر بننے سے رہ گیا، کسی کو کسی ادارے یا اکادمی کے چیئرمین یا وائس چیئرمین نے سیمنار یا مشاعرے میں نہیں بلایا یا کسی کی داشتہ کسی اور کی ہو گئی تو سمجھیے آسمان ٹوٹ پڑا۔ ایسا شخص کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر یہ سوچتا ہی نہیں کہ اُس کے غیر اخلاقی عمل سے اجتماعی طور پر کتنا نقصان ہوگا۔ اردو والوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔

اس تناظر میں ہمارے ذہن میں کئی سوالات ابھرتے ہیں جو ہمیں غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں:

- کیا یہ غیر اخلاقی عمل ذاتی Frustration کا نتیجہ ہے؟
- کہیں فحش اور مبتذل نظموں کی تخلیق ذہنی عیاشی تو نہیں؟
- کہیں غلط اقدار کی تعلیم و تلقین اور اخلاقی جرائم کی ترغیب کے لیے دانستہ طور پر یہ حرکت تو نہیں کی جا رہی ہے؟
- یہ اردو والوں کو طاؤس و رباب میں بدمست کرنے کی نئی سازش تو رچی نہیں؟
- جن لوگوں کی ذہنی توانائی درہم برہم ہو چکی ہے اور جو دماغی، نفسیاتی اور اعصابی امراض میں مبتلا ہیں کہیں وہی لوگ یہ کام تو نہیں کر رہے ہیں؟

جواب جو بھی ہو، جتنا بھی ہو اور جیسا بھی ہو، یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس طرح کی حرکتوں سے ہم اپنی تہذیب، معاشرت، تاریخ اور قیمتی اخلاقی قدروں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس لیے اس مسئلہ کا تدارک یہ ہے کہ ایسے غیر مہذب اور غیر اخلاق افراد کا دماغی غسل کرایا جانا چاہیے ورنہ وہ حیوانی حرکتوں سے بھی نیچے کی سطح پر آ جائیں گے۔ خود غرض، ابن الوقت، موقع پرست اور ذہنی طور پر بیمار و عیاش قسم کے جو افراد اس کھیل میں شامل ہیں اُن پر گہری نظر رکھے جانے کی ضرورت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عیب کو چھپانے کے لیے دوسروں کے عیب کو جگ ظاہر کر رہے ہیں۔ ایسے شر پسند عناصر کی چوطرفہ مذمت کی جانی چاہیے اور اگر اُن کے ناموں کا انکشاف ہوتا ہے تو اُن کا سماجی بائیکاٹ بھی کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ فحش اور عریاں نظموں کے انجکشن سے ہمارا ادبی معاشرہ زہر آلود ہوتا جا رہا ہے۔ میں ان نابغۂ روزگار شاعروں سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے اپنی ذہانت و فطانت کو کوئی مثبت رخ دینے کی کوشش کریں اور اس شر انگیزی سے بچیں تاکہ اُن کا بھی ادب میں کچھ حصہ بن سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ محض فحش نگاری سے کوئی جگہ ادب میں نہیں بنتی۔ میں اپنی بات سورۃ النور کی ایک مختصر سی آیت پر ختم کرتا ہوں تاکہ فاسدوں اور فاسقوں کو عقلِ سلیم آئے۔ ہو سکتا ہے میری بات میں وہ قوت نہ ہو لیکن اللہ کے کلام کی طاقت پر مجھے پورا یقین ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ اللّٰہُ
یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ

ترجمہ: "جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے سماج میں بے حیا باتوں کے چرچے جاری ہوں تو ایسے لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں بہت ہی دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (پ:18، آیت نمبر:19)

OO

شخصیت

ڈاکٹر فریدی: شقاوت پسند مسلم اردو سیاست کا گم شدہ باب

اطہر فاروقی

ادب ساز کے گذشتہ شمارے میں صفحہ 86-78 پر میرے مضمون 'ہند اور پاکستان میں معاصر اردو زبان و ادب اور مسلم اساس پرستی' کی اشاعت کے وقت اس میں سے بہت سے اجزا اس لیے حذف کر دیے گئے کیوں کہ یہ اجزا استنباطِ نتائج کے لیے مزید تحقیق کے متقاضی تھے۔ اگر زندگی نے مہلت دی تو اس مضمون کو مکمل کرنے سے پہلے میں ان زاویوں پر کچھ اور تحقیق کروں گا۔ میرے مضمون کے حذف شدہ حصوں میں ایک باب ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے متعلق تھا۔

شمالی ہند ہمیشہ ہی سے مسلم سیاست کا سوادِ اعظم ہے۔ یہیں قیامِ پاکستان کی تحریک کو جلا ملی۔ یہ ہندو وطن پرست اور فسطائی ہندو سیاست کا بھی اہم ترین مرکز رہا ہے۔ بالخصوص ہندو مسلم شناخت کے نام پر کی جانے والی شمالی ہند کی سیاست میں صوبۂ اتر پردیش کی حیثیت ہمیشہ ہی سے مرکزی نوعیت کی رہی ہے۔ آزادیِ ہند یعنی تقسیم ہندستان کے بعد ملک میں یہ خطہ آج بھی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی جیسا بااثر اور مقبول مسلم سیاست داں پیدا نہ کر سکا۔ گو عبدالجلیل فریدی جنھیں عرفِ عام میں ڈاکٹر فریدی کہا جاتا ہے، کی سیاست صرف صوبۂ اتر پردیش تک محدود تھی مگر ان کے طریقِ سیاست نے شمالی ہند کے مجموعی مسلم سیاسی مزاج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

عبدالجلیل فریدی کی سیاسی زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا اور ضروری مواقع کے علاوہ بھی وہ شہر لکھنؤ تک ہی محدود رہے۔ فریدی صاحب کی نسل کے اکثر سیاست دانوں کو آج کی طرح شہر بہ شہر خاک نہیں چھاننا پڑتی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل پریکٹیشنر کے طور پر ڈاکٹر فریدی کے لیے لکھنؤ کو زیادہ چھوڑنا ممکن بھی نہ تھا مگر اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بعض مسلم تحریکات کے سلسلے میں ڈاکٹر فریدی لکھنؤ سے باہر بھی متحرک رہے۔ آج فریدی صاحب کے انتقال کو 33 برس ہو گئے ہیں مگر شہر لکھنؤ کی مسلم سیاست میں ان کی عوامی مقبولیت زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔

اپنے مذکورہ مضمون کے لیے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی اردو سیاست سے متعلق مجھے کوئی قابلِ ذکر مواد نہ ملا۔ میرا بنیادی موضوع اردو کا اساس پرست کردار تھا جسے اتر پردیش کی سیاست نے سب سے زیادہ تقویت دی۔ اتر پردیش میں ایک سیکولر زبان کے طور پر اردو کی تباہی نیز اس کا مکمل طور پر مسلمان ہو جانا اور ڈاکٹر فریدی کی سیاست ایک ہی دور کی باتیں ہیں یوں اردو سیاست کے محاذ پر ڈاکٹر فریدی بھی مسلسل متحرک تو رہے مگر جب مجھے اس موضوع پر ان کی کوئی قابلِ ذکر تحریر نہ مل سکی تو میں نے فریدی صاحب کی سیاسی زندگی پر عمومی نوعیت کی تحریروں کی تلاش شروع کی تو مجھے اس بات پر مزید تعجب ہوا کہ اس ذیل میں بھی کوئی قابلِ ذکر تحریر موجود نہ تھی۔ شمالی ہند میں مسلم سیاست شروع ہی سے کوری جذباتیت اور نعرے بازی کا نام رہی ہے یوں مطلوبہ تحریروں کی عدم دستیابی کو کسی بڑے صدمے کا سبب تو نہ ہونا چاہیے تھا مگر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ بعض محرکات کی کارفرمائی کے سبب انسان سامنے کی حقیقت کو بھی بہ آسانی تسلیم نہیں کرتا! فریدی صاحب کی غیر معمولی مقبولیت اور ان کے دور رس منفی اثرات کے سبب مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں وقت لگا کہ ان کی تمام تر سیاست چوں کہ پانی پر کھنچی ہوئی لکیر کی نوعیت کی سیاست تھی یوں اگر ان کی سیاسی زندگی یا ان کی اردو سیاست پر قابلِ ذکر مواد دستیاب نہیں تو یہ بالکل فطری امر ہے۔

دو مرتبہ لکھنؤ کا سفر اور دہلی میں متعدد لوگوں سے ملاقاتوں کے بعد مجھے ڈاکٹر فریدی پر جو مواد دستیاب ہوا اس کی بنیاد پر ڈاکٹر فریدی کی اردو کے متعلق سیاست کا لب لباب یہ ہے: ڈاکٹر فریدی نے کبھی اس سوال کو نہیں اٹھایا کہ اردو مادری زبان والے بچوں کو پرائمری تعلیم ان کی مادری زبان میں ملنی چاہیے۔ ڈاکٹر فریدی نے کبھی اس مسئلے کو بھی اپنے سیاسی ایجنڈے میں شامل نہیں کیا کہ جب تک زبانِ اردو اسکول کے تعلیمی نظام کا حصہ نہ بنے گی،

اس کا احیا ممکن نہیں؛ اسکول کے نظام سے اگر اردو غائب ہوئی تو اس کا سماجی منظرنامے سے معدوم ہونا بھی لازمی ہے۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو مادری زبان والے بچوں کے لیے زبانِ اول کے طور پر اردو کی شمولیت اور اس کی تعلیم کے نظم پر بھی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی کوئی تحریر مجھے نہیں ملی۔ سہ لسانی فارمولے میں زبانِ اول کا کالم مادری زبان کے لیے مخصوص ہے اور شمالی ہند میں اسکولوں کے تعلیمی نظام میں اس کی مسخ شدہ شکل اس طرح رائج ہے کہ ہر بچے کو زبانِ اول کے طور پر پہلی سے بارہویں درجے تک لازماً ہندی پڑھنی پڑتی ہے۔ زبانِ دوئم کے طور پر انگریزی اور زبانِ سوئم کے طور پر سنسکرت پورے شمالی ہند اور خصوصاً اترپردیش میں سہ لسانی فارمولے کا حصہ ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ سہ لسانی فارمولے میں زبانِ سوئم کا کالم جدید ہندستانی زبان کے لیے مخصوص ہے یعنی سنسکرت جدید ہندستانی زبان کے طور پر اترپردیش کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ یوپی کے بعض ایسے اسکولوں میں جن کا انتظام مسلمانوں کے پاس ہے، زبانِ سوئم کے طور پر سنسکرت کی جگہ اردو کی تعلیم کا نظم ہے مگر پورے یوپی میں چند سو طلبہ ہی اس سہولت سے فیض یاب ہو پاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے اردو کے نام پر تمام تر نعرے بازی سرکاری استعمال کی زبان کے نام پر کی۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کے نظم کے لیے کوئی عوامی تحریک چلانے سے بہتر انھیں یہ بات معلوم ہوئی کہ مسلم سیاست کے روایتی طرز پر گھر سے نکلو اور اسمبلی میں اردو کے لیے نعرے بازی کرو۔ ڈاکٹر فریدی اور ان کے حامی اردو اکادمیوں کے قیام اور ماضی کے ترقی اردو بیورو کے قیام کو اردو کی ترقی سے تعبیر کر کے بھی ہر جگہ خوب بغلیں بجاتے ہیں۔ ڈاکٹر فریدی نے اترپردیش اسمبلی میں تو اردو کے سوال کو بار بار اٹھایا مگر ہر بار ان کا زور اس پر تھا کہ اسمبلی کی کارروائی میں اردو کا استعمال کیوں نہیں ہوتا؟ ڈاکٹر فریدی اس حقیقت سے بہ ظاہر بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں کہ جب اسکول کے تعلیمی نظام میں اردو موجود نہیں ہوگی تو وہ سرکاری کام کاج کی زبان کیسے ہو سکے گی، functional language کی عدم موجودگی میں، اسمبلی کی اردو کارروائی چہ معنی دارد؟!

یہ مگر تصویر کا ایک رخ ہے۔ ڈاکٹر فریدی اسکولوں کے تعلیمی نظام میں تو اردو کے احیا پر زور نہیں دیتے مگر دینی تعلیم کے نیٹ ورک کی مضبوطی کی بات بار بار کرتے ہیں۔ دینی تعلیمی کونسل جس نے اولاً مشرقی یوپی کے اضلاع میں دینی تعلیم کے اداروں کا مضبوط نیٹ ورک قائم کیا اور پھر مدارس کا سلسلہ پورے صوبے میں پھیل گیا، کی تحریک کے ساتھ ڈاکٹر فریدی مسلسل متحرک رہے۔ دینی تعلیم کے اداروں یعنی دینی مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے۔ یعنی فریدی صاحب کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ دینی مدارس کا تحفظ ہونا چاہیے اور دینی تعلیم کے میڈیم کے طور پر اردو زبان کا تحفظ مدارس میں اپنے آپ ہو جائے گا۔ اسکول کے تعلیمی نظام میں مسلمان بچوں کی عدم شمولیت کے سوال پر ڈاکٹر فریدی بالکل خاموش ہیں۔ وہ بار بار اسکول کے فرقہ پرست نصاب کا سوال تو اٹھاتے ہیں مگر مسلم بچوں کی اسکول میں تعلیم کی بات نہیں کرتے۔ بلاشبہ یوپی میں اسکول کا وہ نصاب جو کانگریس کے دورِ اقتدار میں رائج ہوا اور اب تک کسی بھی حکومت نے اسے تبدیل نہیں کیا ہے، وہ اس نصاب سے کہیں زیادہ زہرآلود ہے جس کی توقع آر ایس ایس کے ذریعے تیار شدہ نصاب سے کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر فریدی مگر یہ نہیں کہتے کہ مسلم بچوں کی اسکول کے تعلیمی نظام میں عدم شمولیت کی وجہ یہ ہے کہ وہاں نصابِ تعلیم زہرآلود ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چوں کہ اسکول کا نصابِ تعلیم زہرآلود ہے اس لیے مسلم بچوں کو اسکول کی تعلیم کو خیرباد کہہ کر دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اس سرد و گرم چشیدہ سیاست داں کے ذہن میں یہ بات ضرور صاف تھی کہ بچے اگر اسکول جائیں یا اسکول میں اردو پڑھیں تو ظلمت پسند اور زوال آمادہ مسلم سیاست کا چارہ نہ بن سکیں گے۔ اسکول کا نصاب اگر فرقہ پرست بھی ہو تو بھی اس کا ایک حصہ ہی ایسا ہوگا۔

یوپی میں سب سے زیادہ فرقہ پرست نصابات ہندی زبان و ادب اور تاریخ کے نصابات ہیں۔ سائنس اور کامرس وغیرہ میں یہ زہرافشانی ممکن نہیں۔ پھر اسکول کا نصاب چوں کہ Public Scrutiny کے لیے دستیاب ہوتا ہے یوں اس کے ساتھ ہمیشہ ایسی من مانی نہیں کی جا سکتی جیسی دینی مدارس کے نصاب کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ اس لیے، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی سیاسی زندگی کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اردو کے احیا اور فروغ میں ڈاکٹر فریدی کی دل چسپی دینی مدارس کے فروغ کی زبان کے طور پر ہی تھی۔

ڈاکٹر فریدی کی سیاسی زندگی سے متعلق عمومی مواد کی فراہمی کے لیے بھی میں نے بڑی جستجو کی مگر اس محاذ پر بھی بات زیادہ کچھ بنی نہیں۔ وہ شخص جسے صوبۂ اترپردیش جیسی زرخیز سیاسی زمین میں پہلی بار تمام مسلم تنظیموں کو سیاسی طور پر یکجا کرنے کا بیج ڈالنے کی خیال آیا ہو اور جس نے مسلم مجلسِ مشاورت کو یوپی میں متحرک کر کے قومی لیڈرشپ کو اس بات کا احساس کرا دیا ہو کہ اس طرح کی تنظیموں کے ذریعے مسلم ووٹوں کی اچھی سودے بازی کی جا سکتی ہے؛ جو شخص مسلم مجلس نام کی اس سیاسی پارٹی کا بھی بانی ہو جس کی آواز پر ساتویں دہے میں جب شمالی ہند کا مسلمان انتہائے خوف میں

بتلا تھا، اس سیاسی پارٹی نے دیگر چھوٹی چھوٹی سیاسی جماعتوں کی مدد سے یو پی اسمبلی میں قابلِ ذکر سیاسی طاقت حاصل کر لی ہو؛ جس شخص سے اس وقت ملک کی ہر وہ پارٹی خوف زدہ ہو جس کی خواہش یو پی میں سیاست کرنے کی تھی؛ جس شخص نے دلت مسلم سیاسی اتحاد کی بات مسلم مجلس کے پلیٹ فارم سے پہلی دفعہ کی ہو، اس شخص کی سیاسی سرگرمیوں سے متعلق کسی قسم کی قابلِ ذکر تفصیلات کا دستیاب نہ ہو پانا مسلم جماعتوں اور تنظیموں کی عمومی انتہائی بدنظمی کا علامیہ ہے۔ ڈاکٹر فریدی کی عمومی سیاسی زندگی پر مواد کی تلاش کے عمل میں مجھے چند اخباری تراشوں اور مختلف تحریروں کے علاوہ دو قابلِ ذکر کتابچے ملے جن کے مولفین خالد صابر اور جاوید حبیب صاحبان ہیں۔ ان سطور کی بنیاد بالخصوص یہ دو کتابچے ہی ہیں۔ خالد صابر صاحب کے کتابچے کی تفصیلات یوں ہیں: 'قائدِ ملت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، حیات و خدمات' از خالد صابر، ناشر مسلم مجلس پبلی کیشنز، سلطان منزل، تکیہ پیر جلیل، لکھنؤ، 2003، 95 صفحات 95 جاوید صاحب کے کتابچے کا ذکر ذرا رک کر کروں گا۔

دونوں ہی کتابچوں میں مرتب کی فریدی صاحب سے عقیدت کے سوا اور کچھ بھی قابلِ ذکر نہیں اور ان کے بیش تر صفحات ان تاثراتی مضامین پر مشتمل ہیں جو فریدی صاحب کے انتقال کے بعد لکھے گئے۔ خالد صابر صاحب کے کتابچے میں شامل بیش تر تحریریں مختصر مضامین ہیں اور ان میں سے کسی کی بھی اشاعت کا صحیح ماخذ اس کتابچے میں درج نہیں۔ اگر کسی مضمون کے آخر میں سنہ اشاعت درج ہے تو تاریخ غائب ہے اور اگر کسی رسالے یا اخبار کا نام لکھا ہے تو یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ جریدہ تھا یا اخبار، کب اور کہاں سے شائع ہوتا تھا؟ ماخذ سے متعلق اس رویے کی بنیاد مصنف کا یہ فرض کر لینا ہے کہ ان میں سے اکثر اخبارات و رسائل جو اب بند ہو چکے ہیں، ان سے اگر وہ یعنی مصنف خود واقف ہیں تو قارئین بھی باخبر ہوں گے۔ مرتب نے اس کتابچے کا پیش لفظ تک لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ڈاکٹر فریدی کے سوانحی خاکے کی ترتیب کا تو سوال ہی نہیں۔ چوں کہ اس کتابچے میں شامل اکثر مضامین فریدی صاحب کے انتقال پر بہ طور نذرانۂ عقیدت لکھے گئے تھے یوں ان بہت سے صفحات میں ایک ہی طرح کی غیر اہم باتوں کی تکرار ہے۔ ان صفحات کے مطالعے کے بعد صرف ڈاکٹر فریدی کی تاریخ وفات 19 مئی 1974 کا پتا چلتا ہے اور ان 94 صفحات کے بالاستیعاب مطالعے سے صرف یہ تفصیلات سامنے آتی ہیں: ڈاکٹر فریدی نے بائیں بازو کی ثقافتی سیاست اور بالخصوص پیس کونسل کے ذریعے اپنی سیاسی فکر کا آغاز کیا اور کمیونسٹ سیاست سے ازالۂ التباس کے بعد ان کا مسلم ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمانوں کو اپنی سیاسی قوت کے استعمال کے لیے منظم سیاسی لائحۂ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ایسا پلیٹ فارم تیار کرنا چاہیے جس کے ذریعے وہ اپنے ووٹ کا بہتر استعمال کر سکیں۔ تمام مسلم جماعتوں کی متحرک سیاسی تنظیم مسلم مجلس مشاورت کو صحیح معنوں میں فریدی صاحب ہی نے یو پی میں متحرک کر کے شناخت پذیر کیا۔ بعدۂ سیاسی جماعت کے طور پر مسلم مجلس کا قیام فریدی صاحب کی اسی فکر کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر فریدی 1952 میں آچاریہ کرپلانی کی کسان مزدور پرجا پارٹی میں شامل ہوئے اور انھوں نے 1971 میں اُس وقت اندرا گاندھی کی بھی حمایت کی جب اندرا گاندھی کا پارٹی کے سینئر لیڈروں سے تصادم ہوا۔ بعد میں فریدی صاحب کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ اندرا گاندھی کی قیادت میں کانگریس کا سیاسی خلقیہ تبدیل ہو جائے گا اور وہ ایک Centrist پارٹی کے بجائے ایک ایسی پارٹی بن سکے گی جو ملک میں اور خود اپنی ہی پارٹی کے اندر بھی جمہوری قدروں کی ترجمان ہو۔ اپنی حمایت کے چند ماہ بعد ہی فریدی صاحب کو مسلمانوں کے سامنے اس وقت سخت شرمندہ ہونا پڑا جب اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کی شورش کا سیاسی فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے دو ٹکڑے کرا کر بنگلہ دیش کے قیام کے ذریعے زبردست ہندو کارڈ کھیلا۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا ایک اور قابلِ ذکر جذباتی سیاسی کارنامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے نام پر ہندستان بھر کے مسلمانوں کو متحد کرنا تھا۔ بعد میں اندرا گاندھی نے اس اقلیتی کردار کو کاغذوں پر تسلیم کر کے مسلم سیاست کے اس غبارے کی بھی ہوا نکال دی تھی۔ اس نام نہاد اقلیتی کردار کی بحالی فریدی صاحب کے انتقال کے بہت بعد میں اس وقت ہوئی جب 1980 میں اندرا گاندھی کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد مسلم کش فسادات کا سلسلہ نئے سرے سے شروع ہوا اور مسلمان اس میں الجھا ہوا تھا۔

1952 میں ڈاکٹر فریدی نے آچاریہ کرپلانی کی کسان مزدور پارٹی میں شرکت کی پھر پرجا پتی سوشلسٹ پارٹی کے ذریعے یو پی کی Legislative Council کے ممبر (MLC) ہو گئے جہاں وہ پارٹی کے لیڈر بھی تھے۔

مسلم مجلسِ مشاورت کی مدد سے اور مسلم مجلس کے ٹکٹ پر جو مسلم امیدوار مختلف پارٹیوں کے ٹکٹ پر لوک سبھا اور اسمبلی میں پہنچے انھوں نے فریدی صاحب کے احکام کے مطابق کام کرنے کے انکار کر دیا۔

1968 میں ایک مسلم سیاسی پارٹی کے طور پر مسلم مجلس کا قیام کانگریس فولڈ کے باہر اس وقت کے صوبائی سطح کے بعض دلت لیڈروں کی حمایت سے کیا گیا۔ دراصل یہ ایک فیڈریشن تھی جس میں بہ مع مسلم مجلس تین سیاسی جماعتوں نے 1969 کے انتخابات میں دس اسمبلی نشستیں حاصل کر لیں۔ اس

بار بھی مگر وہی ہوا کہ فریدی صاحب کی سیاسی بصیرت ہندستان کی سیاست کے Dynamics کو پوری طرح نہ سمجھ سکی اور جیسے ہی اس محاذ کے ذریعے فریدی صاحب نے حکومت پر دباؤ بنانے کے لیے اپنے اراکین کے استعفے کا اعلان کیا، ان کے رفقا نے ان کی آواز پر لبیک کہنے سے انکار کر دیا۔

مذکورہ حقائق کے سوا خالد صابر صاحب کے اس کتابچے میں اور کوئی قابلِ ذکر معلومات موجود نہیں۔ درمیانی صفحات پر فریدی صاحب کی بعض تقاریر کے متون اور تراجم بغیر کسی حوالے کے شائع کیے گئے ہیں۔ سب کچھ اتنا بے ربط ہے کہ قاری کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

نومبر 1969 میں نیشنل انٹیگریشن کونسل میں فریدی صاحب کی ایک تقریر کا یہ جملہ البتہ ہمیں اُس مسلم سیاست کے بارے میں بہت کچھ سمجھنے میں مدد کرتا ہے جس میں مذہبی نفرت کرنے والی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے سیاسی ایجنڈے کو آگے بڑھاتی ہیں: ''محترمہ [مخاطب اندرا گاندھی] میں نوجوانوں کی جسمانی قواعد [مراد آر ایس ایس کی شاکھاؤں میں کی جانے والی روزانہ ڈرل] کے خلاف نہیں ہوں اور نہ ہی ہندو راشٹر کے پروپیگنڈے کا مخالف ہوں...الخ''۔ (ص ص 4-33)

'ڈاکٹر فریدیؒ: طوفان سے ساحل تک' جاوید حبیب کا مرتب کردہ کتابچہ 92 صفحات کو محیط ہے جسے مسلم مجلس پبلیکیشن، پوسٹ بکس نمبر 9760، جامعہ نگر، نئی دہلی سے 2003 میں شائع کیا گیا۔ کتابچے کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب 1975 میں ہوئی۔ کتابچے میں چونکہ اس امر کا کہیں کوئی ذکر نہیں کہ موجودہ اشاعت اس کی دوسری اشاعت ہے اس لیے قیاس یہی ہے کہ اس کتابچے کی ترتیب کے 28 برس تک مرتب اسے شائع نہیں کر سکے۔

جاوید حبیب اپنے زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلبہ یونین کے صدر رہے تھے۔ اپنی دہلی کی سیاست کے زمانے میں انھوں نے ہفت روزہ 'ہجوم' کی اشاعت کا آغاز کیا اور ایک سیاسی پلیٹ فارم مسلم یوتھ کنونشن کے ذریعے انتہائی جذباتی مسلم سیاست کے شیئرز کی خرید و فروخت کی۔ دہلی میں ان کی سیاست کا عروج شاہ بانو اور بابری مسجد کے تنازعات تھے۔ ان دونوں تنازعات کے خاتمے کے ساتھ ہی حالات کے فطری دباؤ میں جذباتی مسلم سیاستیں اور مسلمانوں کے زخموں کی تجارت کرنے والے اخبارات کا جو بڑا حصہ مسلم انڈیا کے ماضی کی داستان بن گیا، جاوید حبیب کی سیاست اور ان کا اخبار بھی اسی کے اوراق بوسیدہ و شرمندہ ہیں۔

مذکورہ کتابچے کی اشاعت کے دو واضح مقاصد ہیں: ڈاکٹر فریدی کے انداز کی سیاست کا احیا اور ڈاکٹر فریدی کی سیاسی وراثت میں خالص مسلم ووٹوں کی ٹھیکے دار دوسری سیاسی جماعت مسلم لیگ کو شمالی ہند میں پیر نہ جمانے دینا۔ مسلم لیگ کی مخالفت اس کتابچے کو تحریر کرنے کی نظریاتی اساس ہے۔ پورا ہی کتابچہ مگر اس بے ڈھنگے پن کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے کہ اس سے کسی کی مخالفت یا موافقت بارآور نہ ہو سکتی تھی۔ 30-28 برس بعد شمالی ہند خصوصاً یوپی میں اب مسلم لیگ یا جاوید حبیب کے انداز کی جذباتی انداز کی مسلم سیاست کے لیے اب کوئی جگہ ہی نہیں ہے یوں یہ کتابچہ بھی مسلم انڈیا کی مابعدِ تقسیم ہندستان کی سیاسی تاریخ کا ایک حاشیہ بھر ہے۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (74-1913) کی سیاسی زندگی اور ان کے دور کی شمالی ہند کی سیاست کا جائزہ تو کوئی ایسا مبصر ہی لے سکتا ہے جو ان زاویوں پر براہِ راست یا بالواسطہ کوئی علمی کام کر رہا ہو۔ میرے لیے تو اس کتابچے کی افادیت بس اتنی ہی ہے کہ مجھے اس کے سرورق پر ہی ڈاکٹر فریدی کی تاریخ ولادت اور وفات ایک ساتھ مل گئیں اور باقی مندرجات میں مجھے اپنے کام کی اور کوئی بات نہ مل سکی۔

لکھنؤ کے سفر میں ڈاکٹر فریدی کی زندگی سے متعلق جو قابلِ ذکر تفصیلات مجھے معلوم ہوئیں ان کے مطابق ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی تعلیم لکھنؤ کے بہترین اسکولوں میں ہوئی اور لکھنؤ ہی سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد انھوں نے کچھ تعلیم انگلینڈ میں بھی حاصل کی۔ چوتھے دہے کے آخر میں انھوں نے لکھنؤ میں میڈیکل پریکٹیشنر کے طور پر اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے صفِ اول کے ٹی بی کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ معالج کے طور پر وہ آخری وقت تک پرائیویٹ پریکٹس میں مصروف رہے۔ انھوں نے ایک برٹش خاتون Sweetie Roger سے شادی کی جن کا 2001 میں انتقال ہوا۔ ان کے تمام بچے انگریزی میڈیم اسکولوں کے تعلیم یافتہ اور ملک کے معزز اشراف گھرانوں میں بیاہے گئے۔

لکھنؤ میں ان کے ہم نام بیٹے عبدالجلیل فریدی المعروف بہ فرید کاروبار کرتے ہیں وہ دون اسکول کے تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی باقی دو بہنوں نے بھی لوریٹو کانوینٹ میں تعلیم حاصل کی۔ فرید صاحب کے مطابق تمام بہن بھائی بڑی جدوجہد کے بعد اردو بولنا سیکھ پائے ہیں۔ ان کی اولادوں میں کسی کا بھی ان مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں جن کے ووٹ کی سیاست نے فریدی صاحب کو مقتدر حیثیت دی۔ خاندان کے تمام ہی افراد اپنی اقتصادی کلاس یعنی سماجی مرتبے کے اس طبقے میں جیتے ہیں جسے اعلیٰ متوسط کہا جاتا ہے اور مسلمانوں کو فریدی صاحب کے بچے اپنے والد کی رعایا تصور کرتے ہیں۔

رہے نام اللہ کا۔

OO

کتب خانہ

مصنف وتصنیف، رسائل وجرائد، تعارف وتبصرے

انٹرویو

ولیم ڈیل رمپل اور 'دی لاسٹ مغل'

شیکھر گپتا کی بات چیت

■

سا ور کرنے... 1857 کے بیان کو اٹھا کر کسی اور ہی سمت میں پہونچا دیا ہے۔ وہ صرف اور صرف بیرک پور میں منگل پانڈے اور جھانسی میں رانی جھانسی کے ہی بیان پر زور دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عظیم ہیرو جیسی شخصیتیں ہیں، لیکن جو اصل کہانی ہے 1857 کی اس میں یہ لوگ حاشئے پر ہی تھے کیونکہ انگریز افسروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے ایک لاکھ انتالیس ہزار سپاہیوں میں سے ایک لاکھ نے سیدھے دہلی کا رخ کیا تھا۔ یہ سب اعلیٰ ذات کے ہندو تھے اور جسے وہ اس بغاوت کا رہنما بنانا چاہتے تھے وہ تھا ایک مغل شہنشاہ... اور وہ بھی ایک مسلمان...

■

اپنی تازہ ترین کتاب دی لاسٹ مغل The Last Mughal(آخری مغل) میں مصنف اور تاریخ داں ولیم ڈیل رمپل William Dalrympleنے بہادر شاہ ظفر کے المیے اور 1857کی ناکام بغاوت کو اُن کاغذات کی بدولت بے حد نزدیک سے دیکھا اور دکھایا ہے جو نیشنل آرکائیوز میں 'دی میوٹنی پیپرز' کے نام سے پڑے گرد پھانک رہے تھے۔ انگریزی نیوز چینل 'این ڈی ٹی وی 24x7'کے پروگرام واک دی ٹاک Walk the Talkکے لئے انڈین ایکسپریس کے ایڈیٹر انچیف شیکھر گپتا نے اُن سے 1857کے دوران پائے گئے ہندو مسلم اتحاد اور اس تکثیریت Pluralismکے بارے میں باتیں کیں جو اُن دنوں دہلی میں نظر آنے والی مغل تہذیب کی شناخت تھی، اور اس بارے میں بھی کہ جب بغاوت کچل دی گئی تو کس طرح سب کچھ بدلتا چلا گیا۔ پیش ہیں اس گفتگو کے چند اقتباسات:

شیکھر گپتا: ہم مہرولی میں ہیں اور یہ ظفر محل ہے۔ اب اگر آپ ایک سیاح ہیں اور سیاحی کے لئے دہلی آئے ہیں، یا کسی پرانے دہلی والے کی طرح ہی اس دہلی کا حصہ ہیں، تب بھی ممکن ہے کوئی آپ سے یہاں آنے کو نہ کہے۔ لیکن یہ آخری مغل یعنی بہادر شاہ ظفر کا موسم گرما کا محل ہے اور یہاں ولیم ڈیل رمپل کے سوا اور کون میرا مہمان ہو سکتا ہے۔ آپ دہلی کے بارے میں کتابوں کا یہ سلسلہ تحریر کر رہے ہیں اور ہم دہلی والوں کو بتا رہے ہیں کہ ہمارا شہر اصل میں کیا ہے۔ یہ لگ بھگ ویسا ہی ہے جیسے کوئی ہندوستانی نیو یارک یا لندن جا کر وہاں کے لوگوں کو بارلے Harley یا ہائڈ پارک Hyde

Park کے بارے میں بتانے لگے۔

ولیم ڈیل رمپل: خوب، ہم اسکاچستانیوں Scots کے ساتھ بالکل یہی ہوا ہے۔ جس شخص نے اسکاٹ لینڈ کی تاریخ سب سے بہتر بیان کی ہے وہ کینیڈا کا باشندہ تھا۔ تو ایک نظیر تو خود میرے اپنے ملک میں موجود ہے۔ لہٰذا اب بدلہ لینے کی میری باری ہے۔

شیکھر گپتا: آپ جانتے ہیں تاریخ مجھے ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن یہ مجھے الجھاتی بھی ہے۔ الجھاتی اس طرح ہے کہ... اب اس 1857 کو ہی لے لیجئے۔ آپ کی کتاب پڑھی تو اس میں دہلی کی مغل یادگاروں کی تباہی کا بڑا ہی دل دوز بیان ایک باب میں ہے۔ ان میں زیادہ تر مغل یادگاریں تھیں۔ جنھیں انگریزوں نے تباہ کیا۔ اور آپ نے ان کا بڑا دردانگیز احوال لکھا ہے۔ وہاں آپ نے انگریز حکومت کو ولین Villain کے طور پر پیش کیا ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس بارے میں ہم بہت ہی کم پڑھ پاتے ہیں۔ ہم پڑھتے ہیں جلیاں والا باغ، ہم پڑھتے ہیں ظلم کی دوسری داستانیں۔ مسلم حملہ آوروں نے بہت سی ہندو یادگاروں کو تباہ و برباد کیا یہ ہمیں معلوم ہے۔ لیکن 1857 میں انگریزوں نے پرانی دہلی کو کس طرح تاراج کیا اس کا ذکر ہی نہیں، اور اگر ہے بھی تو بہت کم...

ولیم ڈیل رمپل: میرا خیال ہے اس کی ایک دل چسپ کہانی ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرح سے ساور کرنے آپ کے 1857 کے بیان کو ہائی جیک کر کے کسی اور ہی سمت میں پہونچا دیا ہے۔ وہ صرف اور صرف بیرک پور میں منگل پانڈے اور جھانسی میں رانی جھانسی کے ہی بیان پر زور دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عظیم ہیرو جیسی شخصیتیں ہیں، لیکن جو اصل کہانی ہے 1857 کی اس میں یہ لوگ حاشئے پر ہی تھے کیونکہ انگریز افسروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے ایک لاکھ انتالیس ہزار سپاہیوں میں سے ایک لاکھ نے سیدھے دہلی کا رخ کیا تھا۔ یہ سب اعلیٰ ذات کے ہندو تھے اور جسے وہ اس بغاوت کا رہنما بنانا چاہتے تھے وہ تھا ایک مغل شہنشاہ۔

شیکھر گپتا: مغل شہنشاہ مگر صرف نام کا شہنشاہ۔

ولیم ڈیل رمپل: پھر بھی اس کا کس قدر احترام تھا لوگوں کے دلوں میں۔ یہ اور بھی زیادہ حیران کن ہے۔

شیکھر گپتا: شہنشاہ عالم دہلی سے پالم...

ولیم ڈیل رمپل: بلکہ پالم تک بھی نہیں۔ صرف لال قلعے کی دیواروں تک اس کی حکومت تھی۔ 1857 تک ظفر کا صرف نام رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نام کا اتنا احترام تھا کہ دور بالکل آخری سرے سے آئے ہوئے ہندو... خیال رہے کہ یہ لوگ مشرقی یوپی اور بہار سے آئے تھے اور یہاں کے مقامی باشندے نہیں تھے... تو یہ لوگ دہلی تک آئے اور ظفر سے کہا کہ ہماری رہنمائی کرو۔ اور 1992 میں جو کچھ بابری مسجد کے انہدام کی صورت میں ہوا وہ کتنا زیادہ اس کے الٹ ہے۔

شیکھر گپتا: عجیب ترین بات یہ کہ یہ ایک ایسی فوج ہے جس میں اکثریت اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی تھی۔

ولیم ڈیل رمپل: پچاسی فیصد۔

شیکھر گپتا: پچاسی فیصد اونچی ذات کے ہندو جنھیں ایک پہچان چاہئے تھی، اور اُن کے نزدیک یہ پہچان تھا دہلی کا مغل بادشاہ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنا کمزور بادشاہ تھا۔ اہم بات یہ ہے وہ اسی کو اپنی پہچان بنانا چاہتے تھے۔ اور ان کے نزدیک اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ ایک مسلمان ہے۔ ٹھیک؟

ولیم ڈیل رمپل: بالکل۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دو عظیم مذہبوں میں جو بھی تفریق پیدا ہوئی وہ 1857 کے بعد آئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں۔ اس سے پہلے نہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ واقعی اہم بات ہے...

شیکھر گپتا: اس پر بھی آؤں گا، لیکن دوسری بات جو آپ کہتے ہیں... اور وہ بھی بڑی دل چسپ ہے... کہ علما اسے جہاد کہہ رہے ہیں۔ اور پھر آپ نے بڑے پُر جوش اشعار کا حوالہ دیا ہے کہ... اسلام کی تلوار اٹھ چکی ہے اور اب کافر عیسائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور یہ کہ دنیا پر عیسائیوں کا تسلط ختم ہونے والا ہے۔

ولیم ڈیل رمپل: یہ آزاد کے اشعار ہیں۔ عظیم شاعر محمد حسین آزاد۔

شیکھر گپتا: اس کے باوجود پچاسی فیصد اعلیٰ ذات کے ہندو ہیں۔

ولیم ڈیل رمپل: بے شک۔ میرا خیال ہے کہ کچھ اس میں غلط بیانی بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے صاف کرنا بے حد ضروری ہے کہ دلیل کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ 1857 ایک جہاد تھا۔ میں اصل میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس شورش کی تہہ کے اندر جہاد بھی ہیں۔

شیکھر گپتا: نہیں نہیں۔ میں وہ بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب مفتیانِ دین اسے جہاد کہہ رہے ہیں، اور حکمراں ایک مسلمان ہے، تب بھی ایک ایسی فوج کو اس کے پیچھے چلنے سے کوئی اعتراض نہیں جس میں 85 فیصد اعلیٰ ذات کے ہندو ہیں۔

ولیم ڈیل رمپل: ٹھیک ہے۔ مگر یہ پوری طرح سچ بھی نہیں۔ کیونکہ دربار اور سپاہیوں اور شہر کو ہندو اور مسلم خطوط پر ہی جوڑ کر رکھا جاتا تھا۔ ان میں

بھید بھاؤ نہیں تھا، لیکن جہادی بچ بچ مشکل کھڑی کرتے تھے۔ کیونکہ جب وہ جامع مسجد پر جھنڈا لہرا رہے تھے تو سپاہیوں میں ان کی تعداد صرف دس فیصد تھی۔

شیکھر گپتا: وہ ہمیشہ ہی دس فیصد ہوتے ہیں۔

ولیم ڈیل رمپل: پھر بھی، ان کی وجہ سے تفریق پیدا ہوتی تھی۔ خاص طور پر ایسی حرکتوں سے جیسی بغاوت کے دوران دہلی میں اگست کی پہلی تاریخ کو بقرعید کے موقع پر ہوئی۔ جہادی اور کچھ عرب چاہتے تھے کہ ایک گائے ذبح کریں۔ اب ظفر کو دیکھئے جن کے بارے میں جانا جاتا ہے کہ شدت پسند نہیں تھے، اور ہر وقت اونگھتے سے رہتے تھے، جب انہوں نے یہ سنا تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ تباہی کا پیغام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر فوج ہندو اور مسلمانوں میں بنٹ گئی اور شہر بھی ہندو مسلمانوں میں تقسیم ہو گیا تو سب ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے یہ کیا کہ.... جہادیوں کو تو وہ پکڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ اتنا اختیار ہی انہیں نہیں تھا.. لیکن گائے کو ضرور گرفتار کر سکتے تھے۔ تو بغاوت کے خطوط (mutiny papers) میں ایک طویل سلسلہ ان دستاویزات کا موجود ہے جو شہر کوتوال کو ظفر کے لکھے ہوئے خطوط کی شکل میں ہے، جن میں انہوں نے کہا ہے کہ جاؤ اور شہر میں جہاں بھی کوئی گائے ملے اسے گرفتار کر لو۔ کوتوال کہتا ہے کہ جی بہتر ہے۔ پھر کوئی بتاتا ہے کہ کوتوالی میں بمشکل 100 گائیں رکھنے کی گنجائش ہے جب کہ دہلی میں ہزاروں گائیں ہیں۔ آخر اس کی جگہ وہ گائے شماری شروع کر دیتے ہیں۔ حقیقتاً انہیں گائیں گرفتار نہیں کرنی تھیں۔

شیکھر گپتا: آپ کی کتاب کو پڑھیں تو 1857 تک مغلوں کے زیر نگیں رہنے والی دہلی، سب کو ساتھ لے کر چلنے والے، تکثیریت پسند اسلام کی ایک زبردست علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

ولیم ڈیل رمپل: ایک ایسی تکثیری تہذیب کی علامت جہاں آپ ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی جیسی شاعری کرتے ہوئے سنتے ہیں اور ایک ہی جیسے مشاعروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پاتے ہیں۔

شیکھر گپتا: اور اس کے بعد سب بدلنے لگتا ہے۔ کیا میں سازش کی ایک تھیوری کا ذکر کر سکتا ہوں؟

ولیم ڈیل رمپل: پلیز، ضرور کہئے۔

شیکھر گپتا: کہتے ہیں کہ انگریزوں کو اس سب کا اندازہ تھا اور انہوں نے حساب لگا لیا تھا کہ ان کا مستقبل ہندوستانیوں کو تقسیم کرنے میں ہی پوشیدہ ہے۔ اگر تفریق پیدا نہیں کر سکتے تو جو تفریق پہلے سے ہے اسی کو اور بڑھاؤ۔ اور یہاں سے پھوٹ ڈالو اور راج کرو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بالآخر ملک کو ہی تقسیم کرا دیتا ہے۔

ولیم ڈیل رمپل: ہاں، پھوٹ ڈالو اور راج کرو کے حوالے اس سے پہلے بھی رہے ہیں، لیکن اصل بات میرے خیال سے یہ ہے کہ ہندو اور مسلم کی پہچان کے ساتھ احساس برتری اور بڑھ جاتا ہے۔ مسلمانوں میں دیوبند بڑھتا دکھائی دیتا ہے اور ہندوؤں میں آریہ سماج۔

شیکھر گپتا: اور انگریزوں کو اس سے مزید طاقت ملی۔

ولیم ڈیل رمپل: انگریزوں کو اس کا فائدہ ہوا مگر وہ اس کی زیادہ حوصلہ شکنی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں پہلا شخص ہوں گا جو انگریزوں کی نکتہ چینی کرے گا۔ اس کتاب پر پہلے ہی مغرب دشمنی اور انگریز دشمنی کے الزام لگ چکے ہیں۔ لیکن میرے خیال سے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کو ممکن بنانے میں اور بھی کئی چیزیں مددگار ثابت ہوئیں۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

شیکھر گپتا: لیکن برصغیر میں حاشیے پر آ جانے والے مسلمانوں یا آسیب زدہ (Demonised) اقلیت کی کہانی 1857 میں ہی شروع ہو گئی تھی نا؟ مسلمانوں کی وقعت کم کرنے کی شروعات 1857 سے ہوتی ہے۔

ولیم ڈیل رمپل: 1857 کے بعد یہ ہوا کہ مغل تہذیب سے جو وقار و احترام کا جذبہ جڑا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ مغل اپنی جن خصوصیات سے پہچانے جاتے تھے ان میں عوام کی دلچسپی ختم ہو گئی... یہاں تک کہ پرانی مغل شائستگی کو بھی بے معنی اور بے کار سمجھا جانے لگا۔ مغلیہ انداز کی شاعری میں لوگوں کی زبردست پسندیدگی ختم ہونے لگی، اور لوگ اب ورڈس ورتھ کے انداز میں شاعری کرنے لگے، اور آزاد بڑے دلچسپ انداز میں یہ سب بیان کرتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ... اور یہی بات امریکہ کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے... کہ 1857 میں انگریزوں کی فتح کے ساتھ اچانک ان کی ہر بات لوگوں کو اچھی لگنے لگی۔ لباس جس پر پہلے طرح طرح کی پھبتیاں کسی جاتی تھیں ان کے لئے اچانک انتہائی دلکش ہو گئے، اور یہی ان کے تعلیمی طور طریقوں اور دوسری چیزوں کے لئے بھی ہوا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد مغل تہذیب کا وقار سمٹتا گیا، اس کی دلکشی ماند پڑتی گئی اور زیادہ سے زیادہ لوگ اب انگریزی زبان اور تعلیم کی طرف راغب ہونے لگے۔ یہ انتہائی اہم بات ہے کہ جس سال غالب کی موت ہوئی وہی مہاتما گاندھی کی پیدائش کا سال تھا۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک دنیا ختم ہو رہی ہے اور ایک نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے جو انگریزی تعلیم یافتہ ہے اور انگریزی بولتی ہے۔ اور یہی نئی دنیا ہندوستان کو آزادی دلاتی ہے۔ یہ پرانے جاگیردار اشراف کی دنیا نہیں ہے۔ یہ انگریزی طرز کے اسکولوں کی پیداوار ہے جو بہت سے معاملوں میں مغرب کے سیاسی طور طریقوں، سیاسی

جماعتوں، احتجاجی جلسے جلوسوں اور ایک طرح کی، جسے آپ کہہ سکتے ہیں کہ عوامی بغاوت اور ابھار uprising میں زیادہ یقین رکھتی ہے۔

شیکھر گپتا: اور مسلمانوں کا زوال جو کہ 1857 میں شروع ہوا تھا وہ کئی معنوں میں 1947 میں مکمل ہو گیا جب اشراف ملک کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔

ولیم ڈیل رمپل: میں نائن الیون (9/11) کے بعد آپ کا لکھا ہوا ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ اس میں آپ نے فتح پور سیکری کے بلند دروازے پر لکھے ہوئے ایک عیسائی قول کا ذکر کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ ''جس اسلام سے میں پیار کرتا ہوں وہ خطرے میں ہے۔'' بلند دروازے کی عبارت قابل غور ہے، کیونکہ یہ کندہ کی گئی ہے ایک عظیم اسلامی داخلہ گاہ پر۔ ایک مسجد کی داخلہ گاہ اور اسلامی طرز تعمیر کا انتہائی شاندار نمونہ، اور پھر بھی اس پر حضرت عیسیٰ کا یہ قول لکھا گیا ہے کہ ''دنیا ایک پل کی طرح ہے۔ اسے پار کرو مگر اس پر کوئی مکان تعمیر نہ کرو۔'' اسلام میں حضرت عیسیٰ کے اقوال کا حوالہ دینے کی روایت ہمیشہ سے ہے اور انہیں ایک پیغمبر کی طرح مانا جاتا ہے۔ میرے خیال سے عیسائیت اور اسلام کا رشتہ شراب سے آدھے بھرے جام جیسا ہے کہ آپ اسے کس طرح دیکھتے ہیں، آدھا خالی یا آدھا بھرا ہوا؟

شیکھر گپتا: ہاں یہ کافی پیچیدہ معاملہ ہے کیونکہ ہم ایک طویل عرصے سے ساتھ رہتے آئے ہیں۔

ولیم ڈیل رمپل: لیکن کبھی آپ خون بہاتے ہیں اور کبھی میل جول سے رہتے ہیں۔

شیکھر گپتا: اور کبھی دونوں کام کرتے۔

ولیم ڈیل رمپل: سچ ہے۔ اکبر کو دیکھئے جو ایک مسلم حکمراں کا روشن ترین نمونہ ہے، جو تکثیریت میں یقین رکھتا ہے، میانہ رو ہے، سب مذہبوں کا خیال رکھتا ہے۔

شیکھر گپتا: مجھے یہ بات اور بھی دل چسپ لگتی ہے کیونکہ لوگوں کو بالآخر یہ سوچنا ہی پڑے گا کہ اسلام پورا طالبانی نہیں ہے۔

ولیم ڈیل رمپل: دنیا میں کئی اسلام ہیں۔

شیکھر گپتا: اور اسلام کو آپ کسی کار بم یا انسانی بم کو سامنے رکھ کر نہیں سمجھ سکتے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ کام ہے۔

ولیم ڈیل رمپل: یہی بات عیسائیت کے لئے بھی سچ ہے اور ہندوازم کے لئے بھی۔ ہر ہندو بال ٹھا کرے نہیں ہے۔ لیکن جو بات یقیناً سچ ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا کے بعض انتہا پسند ضرورت سے زیادہ سرخیوں میں رہے ہیں۔ اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ... مغرب میں لوگوں کو صوفی روایات کا علم ہی نہیں ہے۔ بے خبر ہیں وہ اس سے۔

شیکھر گپتا: یہ بتایئے کہ کل اگر امبیکا سونی (مرکزی وزیر ثقافت وتہذیب) آپ کو بلائیں اور کہیں کہ ''ولیم ڈیل رمپل تم دہلی کی تاریخ کے بارے میں ہم سبھی سے زیادہ جانتے ہو۔ ایسی پانچ جگہوں کے نام بتاؤ جن کا تحفظ اور تعمیر ہمارے لئے ضروری ہے اور یہ رہا ایک سادہ چیک۔'' تو کن پانچ جگہوں کا نام لیں گے آپ؟

ولیم ڈیل رمپل: سب سے پہلے لال قلعہ، جو دہلی کی سب سے اداس عمارت ہے۔ زیادہ تر نقصان اسے انگریزوں نے پہونچایا ہے۔ آج جو اس کی حالت ہے اس کے لئے آپ قصوروار نہیں ہیں لیکن اسے شدید ضرورت ہے آپ کی توجہ کی...

شیکھر گپتا: اور ہمارے پاس ساٹھ برس تھے اسے ٹھیک کرنے کے لئے۔

ولیم ڈیل رمپل: ساٹھ برس تھے اور آپ نے اس کے لئے کچھ نہیں کیا۔ تغلق آباد کی حالت اب بھی خراب ہو رہی ہے، پرانا قلعہ بھی ایسا ہی ہے۔

شیکھر گپتا: اور باقی؟

ولیم ڈیل رمپل: اور بھی بہت سی یادگاریں ہیں۔ روشن آرا باغ جو ایک شاندار مغل باغ ہے، بہت ہی بری حالت میں ہے۔ اور کون سی یادگاریں ہیں؟ میرا مطلب ہے ظفر محل کو بھی ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ شاید کورونیشن پارک کو بھی جو کافی دور شمالی دہلی میں ایک امپیریلسٹ یادگار ہے۔ لیکن میں امید کر رہا ہوں یہ کہ 1857 کی یاد منائی جا رہی ہے تو کچھ رقم 1857 سے متعلق مقامات کے تحفظ پر خرچ کی جائے گی۔ مثال کے طور پر، روشنک روڈ پر آگے چل کر ایک بادلی کی سرائے ہے جو کہ نئی سبزی منڈی کے آگے پڑتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں 1857 کی سب سے اہم لڑائیوں میں سے ایک لڑی گئی تھی، لیکن وہاں اس بارے میں کوئی کتبہ نہیں ہے۔ اسے اب ایک پبلک پیشاب گھر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

شیکھر گپتا: میں بس امید ہی کر سکتا ہوں کہ امبیکا سونی آپ کی بات سن رہی ہیں اور کتاب بھی پڑھ رہی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی کتاب کو پڑھنا ہمارے بچوں اور ان کے بچوں کے لئے بھی لازمی قرار دے دیا جانا چاہئے۔

ولیم ڈیل رمپل: شکریہ

OO

جتیندر بلو کا 'وشواس گھات'

دیپک بدکی

اردو ادب پر جدیدیت کا ایک نمایاں اثر یہ بھی ہوا کہ فکشن نگاروں نے ناول لکھنے کی طرف بہت کم دھیان دیا کیونکہ علامتوں اور استعاروں کے بل بوتے پر دو تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ناول لکھنا بہت مشکل کام تھا۔

انتظار حسین نے ناول لکھے جن میں کئی علامتوں کو برتا گیا مگر دیکھا جائے تو انہوں نے جدیدیت کی آڑ میں دراصل داستانوں کی بازیافت کی۔ جتیندر بلو بھی داخلیت کے پرستار ہیں۔ انہوں نے گوتم بدھ کے قول ''خواہش دکھوں کا سرچشمہ ہے'' (Desire is the mother of sorrow) کے اردگرد زیرِ نظر ناول بنا ہے جس میں اپنے اندر جھانکنے اور اپنی اصلیت کو پہچاننے کی تلقین کی گئی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے بیانیہ اسلوب کا سہارا لے کر اس ناول میں خارجی دنیا کو ایک ماہر مصور کی طرح پینٹ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول نہ تو ترسیل کے المیے کا شکار ہوتا ہے اور نہ ہی عبارت میں کہیں کوئی سقم نظر آتا ہے۔

جتیندر دیولانہ (قلمی نام جتیندر بلو) 18 نومبر 1937 کو پشاور میں پیدا ہوئے، بی اے کی تعلیم حاصل کی، بٹوارے کی صعوبتیں جھیلیں، 1975 تک ممبئی میں مقیم رہے اور پھر لندن میں مستقل سکونت اختیار کی۔

اب تک ان کے افسانوں کے چار مجموعے (پہچان کی نوک پر، جزیرہ، نئے دیس میں، انجانا کھیل اور سودا) شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے اردو ادب کو تین خوبصورت ناولوں (پرائی دھرتی اپنے لوگ، مہانگر اور وشواس گھات) سے مالامال کیا ہے۔

ان کی نگارشات میں جا بجا ہجرت کا کرب، بے زمینی کا احساس، نسلی امتیاز، مذہبی بالادستی، اخلاقی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ اور معاشرے کی بے راہ روی کا ذکر ملتا ہے جن کا حل وہ صحیفوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

'وشواس گھات' ایک براہمن وکیل شیو پرشاد پانڈے کے خاندان کی المناک داستان ہے جو حرص و طمع کی زد میں آ کر تنکا تنکا بکھر جاتا ہے۔ بڑا بھائی رماکانت باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے ترنت بعد اس کی ساری جائیداد کو ہڑپنے کی سبیلیں کرتا ہے۔ اپنی ملکیت کو بڑھاوا دینے کے لئے وہ چھوٹے بھائی دیوکی کو بطور اوزار استعمال کرتا ہے جبکہ منجھلے بھائی لالی کو پوری طرح نظر انداز کرتا ہے۔

سب سے پہلے وہ اپنے رہائشی مکان، شیوسدن، کو بہن بھائیوں سے پوچھے بغیر ہی کرائے پر اٹھاتا ہے اور بعد میں ساری حویلی کو ایک بلڈر کے ہاتھوں بیچ ڈالتا ہے۔ وصول کی گئی رقم کی خرد برد الگ۔ وہ اپنی چاپلوسی سے کچھ دیر کے لئے دیوکی کو اپنے ساتھ بزنس میں لگا دیتا ہے جس کی بدولت بزنس میں کافی ترقی ہوتی ہے۔

البتہ جونہی دیوکی کو فریب اور دھوکے کی بو آتی ہے اس کا سارا بھرم ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ملک چھوڑ کر انگلستان میں جا بستا ہے۔ دریں اثنا دیوکی نے ایک خودسر اور ضدی آرٹسٹ لڑکی کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنایا ہوتا ہے۔ لندن میں نندنی اپنی صلاحیت کی بازیافت میں جٹ جاتی ہے مواقع کو کھونا نہیں چاہتی اور اس لئے آرٹ کو ماں بننے پر ترجیح دیتی ہے۔

اس کے برعکس دیوکی بچوں سے بھرے ہوئے گھر کا متمنی ہوتا ہے۔ دیوکی کے اصرار پر نندنی ارچنا کو جنم تو دیتی ہے مگر اس کے بعد چھپ چھپا کر حمل روکنے کی تدبیریں کرتی ہے جبکہ دیوکی کی آنکھیں دوسرے بچے کو دیکھنے کے لئے ترستی رہتی ہیں۔ نتیجتاً نندنی اور دیوکی کی طلاق ہو جاتی ہے۔ ارچنا اپنے بچپن کے ساتھی سلیم کو اپناتی ہے مگر اپنی کلچرل آئیڈنٹٹی کھوئے بغیر۔

نندنی شہرت کے زینے تو طے کر لیتی ہے مگر اس کے لئے وہ ایک بڑی قیمت چکاتی ہے۔ پہلے پال نیوٹن کے چنگل میں پھنس کر اس کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرتی ہے اور اس کے بعد ڈیرک فرگوسن اس کو اپنی داشتہ بنانے کی تجویز پیش کرتا ہے جس کو وہ ٹھکراتی ہے۔ آخر کار نندنی کا قتل پُراسرار طریقے سے ہو جاتا ہے اور دیوکی بکھر کر ٹوٹ جاتا ہے۔

زیرِ نظر ناول کے اکثر و بیشتر کردار ٹھوس انا کے مالک ہیں۔ وہ چاہے لالی ہو، ٹھگنا بدشکل دیوکی ہو یا پھر خودسر اور ضدی نندنی۔ ان کرداروں میں ارتقا کی کہیں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی زندگی کی خوشیاں داؤ پر لگاتے

ہیں مگر حالات سے سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

ناول جب تک ہندوستانی تناظر میں ارتقاپذیر ہوتا ہے، ناول نگار بڑی چابک دستی سے ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک مشترکہ کنبہ جس میں بزرگوں کے سامنے اپنا حق مانگنا معیوب سمجھا جاتا ہے چاہے وہ بزرگ ساری کشتی کو ہی ڈبونے پر مصر ہو۔ اس کے بعد جب منظر بدل جاتا ہے تو وہی ناول نگار اپنے کرداروں کو آزاد ماحول میں فطری طور پر پنپنے دیتا ہے۔ اسی لبرل ماحول میں نندنی کے پر نکل آتے ہیں۔ وہ دیوکی کے بدلے پال نیوٹن کو ترجیح دیتی ہے اور آخر کار موت سے ہم کنار ہوتی ہے۔

نندنی کے ضمیر کو جگانے کے لئے یہ مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

''ہاں اکیلے تھے'' پھر سخت لہجے میں بولی۔ ''مگر وہ کتنے اکیلے تھے، اس کا اندازہ آپ کو کبھی نہ ہوا۔ آپ تو سامان اٹھا کر چلی گئی تھیں اور وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔''

ناول میں مکالمہ کرداروں کی شخصیت کو ابھارنے میں مدد کرتا ہے۔ اکثر کردار اونچے متوسط طبقے کے نمائندے لگتے ہیں۔ ایک جذباتی باپ کی لاڈلی بیٹی ارچنا کے منہ سے 'میں' کے بدلے 'ہم' استعمال ہونا بہت ہی خوب لگتا ہے۔ اسی طرح ناول نگار نے لندن کی کئی جگہوں کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظر نگاری کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نظارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

جتیندر بلو کی زبان رواں اور رائج الوقت ہے۔ وہ کہیں کہیں انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں جو برمحل نظر آتے ہیں۔

ہاں، ایک سوال جو میرے ذہن میں ناول پڑھ کر نمودار ہوا، یوں ہے۔ کیا دیوکی کے ساتھ اس کے بھائی یا پھر اس کی بیوی نے وشواس گھات کیا یا پھر دیوکی خود ہی اس کا ذمے دار تھا؟ اگر اس نے زندگی کا ہر قدم سوچ سمجھ کر جذبات کی رو میں بہے بغیر اٹھایا ہوتا تو شاید اسے یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔

ایسا ہی سوال ٹامس ہارڈی کا ناول 'دی رائز اینڈ فال آف میئر آف کاسٹر برج' پڑھ کر دماغ میں اٹھتا ہے۔ دیوکی نے جب بڑے بھائی کے ساتھ بزنس شروع کیا تو لالی نے اسے چوکنا کیا تھا۔ اسی طرح جب اس نے نندنی سے شادی کی تو اسے معلوم تھا کہ وہ ایک عام گھریلو عورت بننے کے قابل نہیں بلکہ اپنی پہچان بنانے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ شادی کے بعد یا تو اسے نندنی کی حرکتوں کو نظر انداز کرنا چاہئے تھا یا پھر علاحدگی حاصل کرنی چاہئے تھی۔

دیوکی پر مجھے ترس تو آتا ہے مگر اس کے کردار کے ساتھ مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔

جہاں تک نندنی کے کردار کا سوال ہے، مجھے اس کردار میں عورت کا ایک ایسا روپ نظر آتا ہے جو آزادیٔ نسواں کا نقیب ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ہر دم کوشش کرتی ہے اور اپنا سب کچھ یہاں تک کہ اپنا وجود بھی داؤ پر لگا دیتی ہے۔ ایسی اولوالعزم عورتیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بدقسمتی سے اس سماج میں، جہاں نرینہ جبریت Male Chauvanism کا غلبہ ہے، اس کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ یہاں تک کہ دولت کے نشے میں پاگل نندنی فرگوسن کو دھتکارنے کے پاداش میں اپنی جان کھو بیٹھتی ہے۔ مجھے اس کردار سے ہمدردی ہے۔

سلیم اور ارچنا کے کردار بھی نئے سماج کے ضامن ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی آئیڈنٹٹی برقرار رکھنے کا وعدہ کر کے ہی آپس میں شادی کر لیتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ 'وشواس گھات' میں موجودہ دور کے مشرقی اور مغربی معاشرے کا موازنہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اور بے سمت زندگی کی دوڑ دھوپ کو لاحاصل قرار دیا گیا ہے۔ جتیندر بلو اس ناول کے ذریعے جو پیغام دینا چاہتے تھے وہ اس میں سرخ رو ہو چکے ہیں۔ اس کامیابی کا سہرا نہ صرف ان کے تجربے کو بلکہ ان کے پختہ ذہن کو بھی جاتا ہے۔

صفحات: قیمت: 175 روپے

قلم پبلی کیشنز، 17/17 ایل آئی جی کالونی کرلا (مغربی) ممبئی۔400070

محبوب راہی ایک مطالعہ

وصیل خان

ایک ایسے قلم کار ہیں جنھیں ادبی دنیا میں متعارف کرائے **محبوب راہی** جانے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ملک کے بیش تر جرائد ورسائل اور اخبارات میں ان کی تخلیقات اس تواتر کے ساتھ شائع ہتی ہیں کہ فی زمانہ کوئی بھی ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اتنی کثرت کے ساتھ تخلیقی عمل کے باوجود ان کے یہاں معنویت اور مقصدیت کے ساتھ فن کا معیار پوری طرح سے برقرار ہے۔ وہ ادب کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نثر ونظم پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے۔ اپنے اندرون کے تمام جذبات واحساسات کو وہ صفحۂ قرطاس پر اس طرح بکھیر دیتے ہیں کہ کوئی گوشہ بھی تاریک نہیں رہ جاتا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ان کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"محبوب راہی اس لحاظ سے اس جدید ترین نسل میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں کہ وہ اپنا لہجہ اور اپنی آواز رکھتے ہیں، ایک ایسا لہجہ، ایک ایسی آواز جو اپنے پیش روؤں کے لہجے یا آواز کی بازگشت نہیں ہے، جو اپنی رمزیت، ایمائیت اور اشاریت کے باوجود بامفہوم اور بلیغ ہے۔ ان کے شعروں میں توضیحی انداز نہیں ہے تو اہمال بھی نہیں ہے۔ وہ ابہام سے نئی نئی پرتیں پیدا کرتے اس کی طلسمی کیفیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ تاثیر کو دوبالا کرتے ہیں۔ یعنی ابہام ان کے شعر کی وسعت میں اضافہ کرتا ہے اسے محدود نہیں بناتا۔ میرا خیال ہے اس اعتبار سے محبوب راہی اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ بڑے شہروں اور ادبی مراکز سے دور ایسے قصبے میں زندگی گذار رہے ہیں جہاں دوسروں کی عینک سے دیکھنے اور دوسروں کی دماغ سے سوچنے کے بجائے اپنی کھلی آنکھوں کا استعمال کرنے اور اپنے ذہن کو کشادہ رکھنے کے زیادہ مواقع دستیاب ہیں۔"

ڈاکٹر امین انعامدار کی مرتب کردہ اس کتاب میں تقریباً چالیس مضامین شامل ہیں جو مختلف اوقات میں ان کی شاعری نثر نگاری اور ادب کی دیگر اصناف میں ان کی طبع آزمائی کے حوالے سے تحریر کئے گئے ہیں۔

ان میں شمس الرحمان فاروقی، وارث علوی، مظفر حنفی، ڈاکٹر سید عبدالباری، سلیمان اطہر جاوید، گلزار دہلوی، نذیر فتح پوری، عبدالاحد ساز، قمر سنبھلی، دل تاج محلی، ہوش نعمانی، ظفر ہاشمی، یوسف ناظم، رضا نقوی واہی اور ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے علاوہ اور بھی اہل قلم کے مضامین شامل ہیں، جو محبوب راہی کی ادبی تحریکات اور خدمات کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر امین انعامدار کی یہ کاوش اس لحاظ سے بھی اہم کہی جائے گی کہ یہ کتاب ڈاکٹر محبوب راہی کے متعلق عرفان وآگہی میں پوری مددگار ثابت ہوگی اور ایک ہی جست میں ان کی ادبی زندگی کے تمام گوشوں کو روشن ومنور کردے گی۔

یہ کتاب ہر صورت میں طلبا اور ادب نوازوں کے نزدیک مفید کارآمد اور معلومات افزا ہوگی اور راہی صاحب کی ادبی خدمات کا قابل قدر اعتراف بھی۔ کتابت طباعت اور رنگین سرورق سب کچھ اچھا ہے لیکن قیمت زیادہ محسوس ہورہی ہے جو اسے قارئین سے قریب تر کرنے میں سخت مزاحمت کرسکتی ہے۔

راہی صاحب کے ہی ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں جو ان کی زندگی کے تمام نشیب وفراز اور ذہنی انقلابات اور جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہے:

میں تو خاموش ہوں حالات کی سفاکی پر
جانے پھر کون ہے جو چیخ رہا ہے مجھ میں

مرتب: ڈاکٹر امین انعامدار صفحات: 240　قیمت: 250 روپے
رابطہ: ڈاکٹر امین انعامدار، شعبہ اردو آرٹس کامرس کالج یوداضلع امراؤتی

OO

نارنگ ساقی کی ایک اور کتاب

نصرت ظہیر

حاضرین

کوئی مجھ سے نارنگ ساقی صاحب کی نئی کتاب کے بارے میں سب کچھ ایک جملے میں کہہ دینے کی شرط رکھے تو میں دعوے سے کہوں گا کہ یہ ادبی لطیفوں کی بڑی سنجیدہ کتاب ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اس جملے کی معنویت کو اُس سنجیدگی سے محسوس نہیں کیا جائے گا جس کا یہ متقاضی ہے۔ لہٰذا اس بات کو کئی جملوں میں کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اصل میں ہمارے یہاں عام طور سے مزاح کو غیر سنجیدگی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ برعکس معنی دینے والے لفظوں کا جب استعمال ہوتا ہے تو سیاہ کے ساتھ سفید اور دن کے ساتھ رات کی طرح ہم مزاح کے ساتھ سنجیدہ کا لفظ جوڑ دیتے ہیں کہ صاحب یہ مزاحیہ کلام تھا اب سنجیدہ کلام کی طرف آتے ہیں۔ یعنی مزاح اور سنجیدگی ایک دوسرے کے اُلٹ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ غیر سنجیدہ کوئی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مزاح سنجیدگی سے نہ کیا جائے تو ابتذال کے درجے میں چلا جاتا ہے اور سنجیدگی میں مزاح کا سلیقہ نہ ہو تو وہ مذاق بن جاتی ہے۔ مزاح نگاری کے سلسلے میں ہمارے بھی ادیبوں کا رویہ اور مزاج خاصا مضحکہ خیز ہے۔ اول تو ادب میں مزاح کو وہ کوئی رتبہ ہی نہیں دیتے۔ اگر دیتے بھی ہیں تو صرف اتنا کہ اسے دوسرے درجے کا ادب کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ جس پر یوسف ناظم نے وہ مشہور جملہ کہا تھا کہ بے شک مزاح دوسرے درجے کا ادب ہے مگر مشکل یہ ہے کہ آج کل پہلے درجے کا ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مزاح انتہائی سنجیدہ، اور بے حد تخلیقی عمل ہے جسے آپ زبردستی انجام نہیں دے سکتے۔ نہ اس کی کوئی ردیف اور بحر ہوتی ہے کہ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات کی گردان کرتے ہوئے مصرعے جوڑ لئے جائیں۔ نہ یہ ساختیات اور کنسٹرکشن یا ڈی کنسٹرکشن کی تھیوری سے تخلیق پاتا ہے کہ انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں سامنے رکھ کر ان کے فٹ نوٹس (foot notes) کی مدد سے تنقیدی مقالوں کی طرح پیدا کر لیا جائے۔ یعنی کوئی طے شدہ فارمولہ یا پیمانہ یا معیار یا اوزار ایسا نہیں ہے کہ اُسے تھام کر جب جی چاہا مزاح پیدا کر لیا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں مزاح دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے کم لکھا جاتا ہے۔ اور اردو بھی اگرچہ اور زبانوں کی بہ نسبت مزاح کے معاملے میں انگریزی کی طرح خاصی متمول زبان ہے لیکن اس میں بھی یہ حال ہے کہ ڈھائی من اردو ادب تولئے، تب ایک چھٹانک مزاحیہ ادب ہاتھ میں آتا ہے۔

مزاح کی اسی عظمت کو سامنے رکھ کر میں نے اپنے طور پر ادب کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ایک مزاحیہ ادب اور دوسرا غیر مزاحیہ ادب۔ اور برا نہ مانیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ غیر مزاحیہ ادب کو ہی بالعموم میں نے غیر سنجیدہ پایا ہے۔ اب آپ میں سے جن حضرات نے الجبرا خود اپنی رضا و رغبت سے پڑھا ہے، یعنی اس کی تعلیم بالجبر حاصل نہیں کی ہے وہ میرے حساب کو سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ اگر مزاح برابر سنجیدگی کے ہے تو غیر مزاح برابر غیر سنجیدگی کے ہوگا۔ سنجیدگی اور مزاح کے ہم معنی ہونے کا ثبوت ہمارے بہت سے سنجیدہ تنقید نگاروں اور ادب کا علاج کرنے والے عطائی ڈاکٹروں نے بھی فراہم کیا ہے۔ وہ ایسے کہ ان کی اکثر تنقیدی کتابوں کو آپ سنجیدگی سے پڑھئے تو وہ مزاح کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوں گی۔ اسی طرح پطرس بخاری سے لے کر مشتاق یوسفی تک کسی کی بھی کتاب کا کوئی مضمون پڑھ جائیے اسے آپ تنقیدی ادب کا ایک شاہکار پائیں گے۔

اب خیر سے ہمارے نارنگ ساقی بھی ادب میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس ولادت میں ادب کے کسی ڈاکٹر یا کمپاؤنڈر کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ قبل از وقت یا سیزیرین ولادت بھی نہیں ہے، جس کا اردو ترجمہ ہوگا قینچی سے ولادت۔ اس آلے سے بالعموم تنقیدی ادب کی کتابیں تولّد کی جاتی ہیں جسے سیزیرین ادب بھی کہا جا سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ساقی صاحب نے خود اپنی قوت بازو سے خود کو پیدا کیا ہے۔ کاروبار زر میں بھی اور کاروبار ادب میں بھی۔ ان سے پہلے اردو کا سب کاروبار ایک ہی نارنگ، یعنی گوپی چند نارنگ سے چل رہا تھا جنہیں دیکھ کر مرحوم کملیشور نے کہا تھا کہ ہندوستان کی ہر زبان کو ایک نارنگ کی ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے اردو کے پاس اب ایک نہیں دو نارنگ موجود ہیں۔ اور مزید شکر کا مقام یہ

ہے کہ ان میں سے ایک ساقی بھی ہے۔ اگرچہ خود میرے لئے وہ ابھی تک برائے نام ساقی ہیں اور مجھے انہوں نے اپنی ساقی گری سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا ہے جب کہ میں ان کی گزشتہ کتاب پر بھی ایک توصیفی تبصرہ لکھ چکا ہوں۔ یعنی وہی معاملہ ہے کہ:

جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ساقی صاحب اپنے آپ میں عجیب شئے ہیں۔ پہلے وہ ادیبوں کو جمع کرنے کا شوق فرماتے تھے۔ دس بارہ برس سے ان کے لطیفے جمع کرنے لگے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ادیبوں کو جمع ہی اس لئے کرتے تھے کہ بعد میں لطیفے جمع کر سکیں۔ میرا خیال ہے یہ خیال انہیں اس وجہ سے آیا ہوگا کہ ان کی ساقی گری سے محظوظ ہونے کے بعد اکثر ادیب بذاتِ خود لطیفہ بن جاتے ہوں گے۔ موجودہ کتاب ساقی صاحب کے جمع کئے ہوئے ادیبوں اور لطیفوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔

یہ میں صرف اندازے سے کہہ رہا ہوں۔ ورنہ یادداشت اور حساب کتاب کے معاملے میں اپنا جو حال ہے اس کے پیشِ نظر یہ چوتھا مجموعہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر پانچواں یا چھٹا ہو۔ دراصل اس سے پہلے وہ پرانے لطیفے گھٹا کر اور کچھ نئے لطیفے شامل کرکے کئی کتابیں چھاپ چکے ہیں اور کچھ کتابوں کے غالباً کئی ایڈیشن بھی چھپے ہیں اس لئے صحیح حساب لگانا خاصا مشکل ہے کہ یہ دراصل کون سی کتاب ہے۔ خود یہ تبصرہ بھی جو میں اس وقت فرما رہا ہوں وہ بھی دراصل گزشتہ کتاب پر میرے پہلے تبصرے کا دوسرا ایڈیشن ہے کیونکہ پہلے تبصرے کا عنوان تھا: ساقی نارنگ کی کتاب پر تبصرے کا پہلا ایڈیشن۔

کتاب، پاکستانی کرکٹر انضمام الحق کے لہجے میں جون سی بھی ہے، بہر حال پہلی والی سے اچھی ہے۔ لطیفوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے اور ان کا معیار بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مرحوم ادیبوں کے لطیفوں کا معیار بھی بلند ہو گیا ہے۔ یہ ساقی صاحب کا کمال ہے یا مرحوم ادیبوں کا... کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی ارواح سے ساقی صاحب کے معاملات چلتے رہتے ہوں۔ بہت سے مرحوم ادیبوں کے نئے اور اچھے لطیفے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ لیکن کئی غیر مرحوم ادیبوں کے اتنے معمولی لطیفے بھی شمولیت پا گئے ہیں کہ قاری خواہش کرنے لگتا ہے کاش وہ ادیب بھی مرحوم ہوتے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے ہفتہ وار رسالے 'ہماری زبان' میں آپ نے ایک کالم ضرور پڑھا ہوگا 'ایک دیا اور بجھا' اس میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب ہر ہفتے کسی نہ کسی ادیب کا انتقال فرما دیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ہفتے میں ایک سے زیادہ ادیب داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر ادب کی دنیا کو سوگوار اور اکثر قارئین کو مطمئن چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک مدیر کی حیثیت سے خلیق صاحب کی کوشش رہتی ہے کہ کالم پابندی سے شائع ہوتا رہے اور کسی ہفتے بھی اس کا ناغہ نہ ہو۔ لیکن کبھی کبھی پورا ہفتہ انتظار میں گزر جاتا ہے اور کوئی ادیب انتقال کرکے نہیں دیتا۔ کہتے ہیں ایسے مواقع پر خلیق انجم صاحب خاصے فکرمند ہو جاتے ہیں اور انہیں بادلِ ناخواستہ کالم خالی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ کئی ہفتے یہ کالم بند رہا تو ہمارے دوست میاں عبدالقدوس جو اس کالم کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے کہنے لگے آج کل جی بڑا اداس سا رہتا ہے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ سرد آہ بھر کر کہنے لگے، کئی ہفتوں سے کوئی دیا نہیں بجھا ہے۔ اس کے بعد وہ سہگل کا مشہور گانا دیا جلاؤ بہ آواز بلند گنگنانے لگے جس میں ظاہر ہے وہ جلاؤ نہیں بلکہ بجھاؤ گا رہے تھے اور وہ بھی ایسے رقت آمیز لہجے میں کہ مجھے سچ مچ اردو ادب کے مستقبل کی فکر لاحق ہو گئی!

نئی کتاب میں ساقی صاحب نے صفحات کا بھی اضافہ کر دیا ہے اور قیمت بھی کچھ بڑھا دی ہے۔ مگر ڈالر میں قیمت جس طرح بڑھائی ہے اسے پڑھ کر باٹا کے جوتے یاد آ جاتے ہیں۔ قیمت ہے آٹھ ڈالر 95 سینٹ۔ پانچ سینٹ اور بڑھا دیتے تب بھی کیا ہرج تھا۔ اردو والے کتاب کو کون سا ڈالر میں خریدنے والے ہیں۔ جو قوم روپے میں کتاب نہیں خریدتی وہ ڈالر میں کیا خریدے گی۔ اس کی قسمت میں تو بس باٹا کے جوتے لکھے ہیں، سو وہ بھی مسجدوں میں بہ افراط مل جاتے ہیں۔

تصاویر ساقی صاحب کی اس کتاب میں بھی بہ افراط موجود ہیں۔ میں نے پچھلے تبصرے میں بھی لکھا تھا اور اب اس تبصرے میں بھی میں اپنا مشورہ دوہراتا ہوں کہ اگر وہ کتاب کا نام ادیبوں کی خوش کلامیاں با تصویر رکھ دیتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ سبھی تصویروں میں ساقی صاحب خود بہ نفسِ نفیس موجود ہیں اور وہ انہوں نے ادیبوں کے ساتھ کھڑے ہو کر کھنچوائی ہیں۔ لیکن اکثر تصویروں میں ادیب ان کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھنچواتے ہوئے لگتے ہیں۔ صرف ایک تصویر ایسی ہے جس میں ساقی صاحب خود ادیب کے ساتھ کھڑے اور خاصے دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تصویر ہے مظہر امام صاحب کی۔ یوں لگتا ہے جیسے قطب مینار کے نیچے کھڑے ہو کر تصویر کھنچوائی گئی ہے۔ مظہر صاحب اردو شاعری کے ایک امام اور قطب تو ہیں ہی یہ تصویر ان کے مینار ہونے کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ کرتی ہے!

میرا مشورہ یہ بھی تھا کہ آئندہ کتاب میں ادیبوں کو لطیفے کرتے ہوئے

دکھایا بھی جانا چاہئے۔ اب دیکھتا ہوں تو بعض تصویروں میں ادبائے کرام نے ایسے پوز اختیار کئے ہیں کہ وہ بجائے خود ایک لطیفہ بن گئے ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ ساقی صاحب نے مشورے کا کچھ لحاظ ضرور رکھا ہے اور اس طرح لطیفوں کی تعداد کچھ اور بڑھ گئی ہے۔

ایک بات کتاب میں یہ بھی بڑے کام کی ہے کہ اس میں لطیفے ادیبوں کے نام سے ابواب قائم کرکے دئے گئے ہیں اور ہر مرحوم ادیب کے ساتھ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج کردی گئی ہے۔ یہ التزام غیر مرحوم ادیبوں کے ساتھ بھی رکھا جاتا تو کتاب کی افادیت فزوں تر ہو جاتی۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تاریخ پیدائش کے ساتھ وہ زندہ ادیبوں کی متوقع تاریخ وفات درج کرتے۔ کیوں کہ اس طرح تو یہ خاصا تحقیق اور وقت طلب کام ہو جاتا کہ کون سا ادیب اندازاً کب تک وفات پا جائے گا یا اخلاقاً اسے کب تک وفات پا جانا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں صرف تاریخ پیدائش سے بھی کام چل سکتا تھا۔ تاریخ وفات والا خانہ خالی چھوڑا جا سکتا تھا۔ قارئین اسے اپنی مرضی اور پسند کے مطابق خود بھر لیتے۔ زندہ ادیبوں کی تاریخ پیدائش کا ہونا میرے خیال سے اس لئے زیادہ ضروری تھا کہ کئی ادیبوں کے بارے میں ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہوا ہے کہ وہ پیدا ہو چکے ہیں۔

کل ملا کر کتاب قابلِ مطالعہ ہے اور ہم سبھی کو عبرت حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ لیکن مطالعہ کرنے پر چلتے چلتے ایک لطیفہ سن لیجئے۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے اور اس کے خالق بھی میاں عبدالقدوس ہیں۔ کہتے ہیں ایک ادیب کا نوکر تو تلا تھا۔ یعنی تتلا کر بولتا تھا۔ ادیب صاحب اپنے کمرے میں کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ تبھی نوکر نے آکر اپنی زبان میں کہا کہ صاحب آپ کو بیگم صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔ ادیب نے نوکر سے کہا ان سے کہہ دو کہ صاحب مطالعہ کر رہے ہیں۔ نوکر نے جا کر یہ بات بیگم صاحبہ کو بتا دی۔ اب وہ تو جانتی تھیں کہ نوکر تو تلا ہے۔ مطالعہ کرنے کا مطلب انہوں نے وہی لیا جو تو تلے نوکر کی زبان سے سن کر لینا چاہئے تھا۔ چنانچہ سنتے ہی وہ غصے سے بپھر گئیں اور سیدھے ادیب کے کمرے میں پہونچ کر اس کی کمر پر دو ہتڑ رسید کرتے ہوئے کہنے لگیں: "مردود کہیں کے بتاؤ تو سہی میرے سوا وہ دوسری کون ہے، جس کے ساتھ تم منھ کالا کرتے ہو!" خدا حافظ۔

(رسم اجرا کی تقریب میں پڑھا گیا)

صفحات: 354 قیمت: 200 روپے 8.95 ڈالر

ایم آر پبلکیشنز 2696 گلی کالے خاں کوچہ چیلان دریا گنج نئی دہلی۔110002

OO

نریندر جادھو کی سونو

وقار قادری

یکم مئی 2006 کے اخبارات میں افغانستان میں طالبان کے ذریعہ ایک ہندوستانی انجینئر سُر یہ نارائن کے سفاکانہ قتل کی دردناک خبر شائع ہوئی تھی۔ اس خبر سے وابستہ ڈاکٹر نریندر جادھو کا بیان ٹائمز آف انڈیا کے صفحہ بارہ پر نمایاں طور پر شائع ہوا تھا۔ افغانستان کے حالات اچھے ہونے اور ہندوستانیوں کے واپس نہ آنے کی بات انہوں نے اپنے بیان میں کہی تھی۔ ڈاکٹر جادھو اُن دنوں افغانستان کے شہر کابل میں افغان بینک کے سینئر ایڈوائزر کے طور پر ہندوستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اور اب پونے یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر نریندر جادھو وہی ہیں جن کی سوانح حیات 'آمچا باپ آن امھی' (ہمارا باپ اور ہم) کا ترجمہ محترمہ ممتاز نکہت نے اردو زبان میں 'سونو' کے نام سے کیا ہے۔ اشاعتی ادارے ایڈ شاٹ نے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہ کتاب بھی نہایت خوبصورت شائع کی ہے۔ جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

1978 میں مراٹھی دلت ادب میں دیا پوار کی سوانح 'بلوت' کی اشاعت کے بعد دلت ادب میں یہ صنف اظہار بیان کے لئے بڑی مقبول ہوئی۔ لکشمن مانے کی 'اُپرا' شنکر راؤ کھرات کی 'ترال انترال' بے بی کامبلے کی 'ہمارا جینا' لکشمن گائیکواڑ کی 'اچلیا' (اچکا) وغیرہ، ایک سلسلہ سا بنتا گیا۔

1993 میں مراٹھی ادب میں ڈاکٹر نریندر جادھو کی مذکورہ کتاب 'سونو' (آمچا باپ آن آمہی) نے دھوم مچا دی۔ ڈاکٹر جادھو دلت سماج کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت ہیں۔ عالمی فنڈ IMF (انٹرنیشنل مالیاتی فنڈ) کے مشیر اور افغانستان کے اقتصادی صلاح کار کے طور پر کام کرتے ہوئے اب پونے یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے ہیں۔

زمانہ قدیم سے ذات پات کے بھید بھاؤ اور چار ورنوں کے فرق تلے دبے اور کچلے ہوئے دلت اب اپنے حقوق کی لڑائی لڑنا جان گئے ہیں۔

ڈاکٹر نریندر جادھو کی یہ کتاب عملی زندگی جینے والوں کے لئے سوچ کے نئے دروازے کھولتی ہے۔

''میں قسمت کا ماننے والا نہیں ہوں۔ ہمارا باپ جس نے ہمیں سانچے میں ڈھالا وہ بھی نصیب کو نہیں مانتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج میں ناسک میں واقع کسی گاؤں میں مویشی چرا رہا ہوتا۔''

ڈاکٹر نریندر جادھو کے والد دامودر جادھو بھی کچھ یہی کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''ہم ... بنا ٹکٹ ممبئی آ گئے۔ اس سال 1919 چل رہا تھا اس کے بعد ہماری زندگی کا ڈھنگ ہی ڈھرّا ہو گیا۔''

''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر سنواری بنالے'' یہ ہدایت ایک فلمی گیت کے ٹکڑے میں غالباً ساحر نے دی ہے۔ دامودر جادھو ممبئی آ کر ہاتھوں ہاتھ نہیں لئے گئے۔ انہوں نے اخبار فروخت کئے۔ پسماندہ حالات میں سب کچھ کیا۔ مگر انہیں سلام کرنے کو جی کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم سے چشم پوشی نہیں کی۔ جس ماحول سے آئے تھے اور باوجود غربت اور جہالت کے اپنے اطراف پھیلے ہونے کے دامودر جادھو نے ہمیشہ ترقی پسند خیالات کو اپنائے رکھا تھا۔ ڈاکٹر بابا امبیڈکر کے پیغام ''پڑھو اور ایک جُٹ ہو کر سنگھرش کرو۔'' پر عمل کیا۔

بچوں کے بیمار پڑنے پر دامودر جادھو نے ڈاکٹر کے علاج کو ترجیح دی نہ کہ کسی تانترک سے جھاڑ پھونک کروانے کو پسند کیا۔ ماں اور بیوی کو ایسا کرنے پر سخت تنبیہ کی۔

آج سے پچاس ساٹھ سال قبل جب ہمارا ملک جہالت کے سبب چھوا چھوت، اندھی تقلید، طبقاتی نظام کے ماحول میں پوری طرح سے گھرا ہوا تھا، دامودر جادھو جو بذات خود کوئی بہت تعلیم یافتہ نہ تھے اسی پسماندہ اور ان پڑھ ماحول میں جی رہے تھے۔ اپنے بچوں کے لئے تعلیم کی اہمیت پر زور دینا ان کی دور اندیشی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا سہرا عظیم سماجی رہنما بابا صاحب امبیڈکر کے سر بندھتا ہے۔ ''ان ہی کے حیات افروز لمس کے سبب آج لاکھوں دلتوں نے اپنے اندر چھپے ہوئے راج ہنس کو ڈھونڈنے کی ترغیب پائی۔'' (صفحہ 316)

ایک انگریزی ہفت روزہ کو انٹرویو دیتے ہوئے دامودر جادھو کی بیگم 'سونو' نے جو بات کہی ہے اس سے دامودر جی کا قد اور کردار بہت اونچا ہو جاتا ہے۔

''مجھے یہ اچھا لگا کہ انہوں نے کبھی شراب نہیں پی۔ کبھی گالیاں نہیں

بلکیں، اور کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔"

دراصل دلتوں کی غربت، پسماندگی اور کم علمی کے سبب یہ باتیں ان سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اسی بات کو ڈاکٹر نریندر جادھو کی بیگم وسندھرا جادھو نے جن کا تعلق اونچی ذات سے ہے، بہت اچھے انداز میں کہا ہے۔

"میری ماں بھولی بھالی سیدھی سادی۔۔ ہمارے دلت شوہر روز رات شراب پی کر آتے ہیں اور اپنی بیویوں کو حیوانوں کی طرح مارتے ہیں۔ یہی ان کی اٹل سوچ تھی۔ اپنی لاڈلی پر یہ آفت ٹوٹنے والی ہے۔۔ نریندر کے آفس جا پہنچی اور دوسرے تمام رفیق کار اور کارکنوں کے سامنے ان کو لعنت ملامت کی۔"

ہمارے قدیم سماج میں بیوی کو مارنا اور خصوصاً رات کو شراب پی کر کسی معمولی سبب کو بنیاد بنا کر اپنا فرسٹریشن صنف نازک پر اتارنا صرف دلتوں کا نہیں بلکہ جاہل گھرانوں کا ایک حصہ رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی کم و بیش جاری ہے۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔

دامودر جادھو نے ان ساری باتوں سے گریز کیا۔ دراصل وہ کم پڑھے لگے مگر صاف ذہن کے اور اپنے اصولوں کے پابند انسان تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے بچوں کی زندگی روشن کرنے میں کامیاب ہو پائے۔ انہیں جو لوگ ملے ان سے بھی انہوں نے اچھائیوں کو اپنایا تھا۔

دامودر جادھو نے ان ساری باتوں سے گریز کیا۔ دراصل وہ کم پڑھے لکھے مگر صاف ذہن کے اور اپنے اصولوں کے پابند انسان تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے بچوں کی زندگی روشن کرنے میں کامیاب ہو پائے۔ انہیں جو لوگ ملے ان سے بھی انہوں نے اچھائیوں کو اپنایا تھا۔

"یوروپین صاحب کے ساتھ رہ کر تعلیم کی اہمیت میرے دھیان میں آ گئی تھی۔" دامودر جی کی علمی دوستی اس جملے سے واضح ہوتی ہے۔ اس کے پیش نظر بیٹے آئی اے ایس اور ماہر معاشیات و دیگر اعلیٰ عہدوں پر پہنچ پائے۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے پیغام 'پڑھو' پر جن دلتوں نے توجہ دی وہ آج کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ ہمارے یہاں سر سید نے اس نکتے کو بابا صاحب امبیڈکر سے پہلے سمجھ لیا تھا اور اپنی قوم کو 'پدرم سلطان بود' کے خیال کو ذہن سے اتار پھینکنے کی تلقین کی تھی۔ حصول علم اور عصری تعلیم سے اپنی قوم کی کوشش میں سر سید بھی بڑی حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ مگر اسے مزید اپنانے کی ضرورت ہے کہ اسی میں قوم کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔

دامودر جادھو کی روشن خیالی کی کئی مثالیں اس کتاب سے دی جا سکتی ہیں۔ مگر خاندان کی گاڑی ایک پہیئے سے نہیں چلتی وہ اپنی بیگم سونو کے متعلق جو بات کہتے ہیں اس سے دونوں کے درمیان کی Understanding اور بیان کی سادگی ظاہر ہوتی ہے۔

"وہ سچ مچ سونے جیسی ہے۔ وہ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی ویسے ویسے سونے کی طرح چمکنے لگی۔۔۔ ہمارے سنسار کی گاڑی بہت اچھی بنی۔ موٹر چلانے والا کتنا بھی ہوشیار ہو پھر بھی موٹر کی دیکھ ریکھ کرنے والا بھی ہوشیار ہونا چاہئے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں اس کے لئے جو خاص عزت ہے میں وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔"

اس کتاب کے مصنف گو کہ ڈاکٹر نریندر جادھو ہی ہیں مگر انہوں نے اپنے والد کی کہانی اپنی زبانی اور ایک باب ہم اور ہمارا خاندان کے نام سے بھی شامل کیا ہے۔ جس میں اپنے بھائی سورگیہ جے ڈی جادھو (سابق آئی اے ایس)، سدھاکر جادھو، دینش جادھو، نریندر جادھو، بیوی وسندھرا اور بیٹی اپروا کے بھی باب شامل کئے ہیں۔ اس سے اس سوانح کو ایک نیا انداز عطا ہوا ہے۔ سورگیہ جے ڈی جادھو جن کا اپنے بھائیوں کی تربیت اور کیریئر سازی میں اہم رول رہا ہے، حکومت مہاراشٹر میں کئی اہم عہدوں پر سکریٹری رہ چکے ہیں۔ ذات پات کے نظام پر اپنی زندگی کا ایک واقعہ نہایت نفرت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ پربھنی میں جب ضلع ادھیکاری کے عہدے پر فائز تھے کس طرح چھوٹی ذات کا ہونے کے سبب ان کی بیگم کو پروہت نے ہوشیاری کے ساتھ مندر میں جانے سے روکا تھا۔ یہ واقعہ کوئی بہت پرانا نہیں 1970 کا ہے اور کلکٹر جیسے اونچے عہدے پر فائز ایک سرکاری افسر کے ساتھ پیش آیا ہے۔

ایک زمانے میں پسماندہ یا دلت سماج کے لوگوں کو ٹکٹ نکالنے کے باوجود تھیٹر میں داخلہ ممنوع تھا۔ انگریزوں کی داد دینی پڑے گی کہ انہوں نے اس طرح کے ذات پات کے نظام کو بدلنے میں کسی حد تک، بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

بیٹی اپروا جو اس دور کی نئی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کے بارے میں اس کے پپا کہتے ہیں کہ "یہ لڑکی Ambitious ہے اس کے اندر مقابلے کی جرأت ہے۔" دلت سماج کی نئی نسل کی یہ لڑکی اپنے دلت ہونے پر کسی نظر انداز کرنے والے شخص کو نفسیاتی مریض سمجھتی ہے۔ "آج بھی اگر دلت سمجھ کر کوئی مجھے کم سمجھ رہا ہے تو مجھے اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ دے ہیو اے پرابلم۔ دے نیڈ سائیکاٹرک ٹریٹمنٹ۔ انسانیت کے مذہب کو ماننے والی میں ہندوستانی نسل کی گلوبل سٹیزن ہوں۔" خودی کو بلند کرنے والی اس تعلیم یافتہ نئی لڑکی کو بھی آنجہانی دامودر جادھو کی طرح سلام کرنے کو جی کرتا ہے۔

یہ لڑکی 93-1992 کے فساد کی چشم دید گواہ ہے۔ باندرہ جاتے ہوئے وہ دنگے کے دوران ماہم میں پھنس گئی تھی۔ اس نے خون سے لت پت ہاتھ تلوار لئے گھومتے دیکھے ہیں۔ اس لڑکی کے ذہن میں سوالات اٹھتے ہیں کہ

''دھرم کے نام پر دھینگا مشتی کس لئے۔ غنڈوں کا کوئی مذہب ہوتا ہے کیا؟''

اَپروا سے ایک معمولی غلطی ہوئی ہے۔ کتاب میں ہے کہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا یہ پسندیدہ شعر کہنے والا اس کا شاعر اقبال تقسیم ہند کے بعد ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلا گیا تھا۔ شکر ہے اقبال تقسیم ملک سے قبل ہی یہ دنیا چھوڑ چکے تھے۔ تقسیم کے لئے اقبال واقعی ذمہ دار ہیں یا نہیں یہ بحث طلب موضوع ہے۔ اگر زندہ بھی ہوتے تو شاید بدقسمتی سے فیض اور بادشاہ خاں (سرحدی گاندھی) کی طرح مجبوراً انہیں اپنے علاقوں ہی میں رہنا پڑتا کہ اقبال کا تعلق لاہور سے تھا۔ خیر، مترجم ایک فٹ نوٹ دے دیتیں تو بات واضح ہو جاتی۔

'سونو' نہ صرف ایک خاندان کی علم اور محنت ومشقت سے دوتی کے سبب اونچائی پر پہنچنے کی کہانی ہے بلکہ اس ملک کے سیاسی، سماجی، طبقاتی نظام کے بنتے بگڑتے حالات کا منظر نامہ بھی ہے۔ شہر ممبئی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ممبئی کی بنتی بگڑتی اور سنورتی تصویروں کو بھی یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ کوئلے کی ریل کا ڈیزل انجن اور پھر الیکٹرک انجن سے چلنا یہاں بتدریج دکھائی دیتا ہے۔ نو تعمیر ہوتی ہوئی اونچی عمارتوں اور غربت وافلاس کے سبب پھیلتی ہوئی جھگی جھونپڑیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ چاقو چھریوں والے محلے کے 'داداؤں' کے بعد نئے دور کے انڈرورلڈ کے 'بھائیوں' کا نظارہ بھی آپ اس کتاب میں کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ممبئی نمبر آٹھ پر واقع الیکزنڈر سنیما میں لگنے والی انگریزی فلموں اور ان کے پُرکشش اور مزیدار ترجمہ شدہ عنوانات کا ذکر بھی ہے۔

یہ ساری باتیں دیکھی دکھائی یا سطحی نہیں ہیں بلکہ مصنف اور ان کے بھائیوں نے ممبئی کی جھگی جھونپڑیوں اور کھولیوں میں جو زندگی جی ہے اسے بیان کیا ہے۔ محنت ومشقت سے زمین سے آسمان کی سی اونچائی کی جانب دامودر جادھو کے خاندان کا یہ سفر قدرتی سفر ہے۔ تعلیم جس کی بنیاد رہی ہے۔ اس کامیابی میں 'جست' لگا کر آسمان کو چھونے والی زندگی نہیں ہے۔ دو نمبر والی بات نہیں ہے۔ یہی بات اس کتاب کے مطالعے کے دوران قاری کو کتاب سے جوڑے رکھتی ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ ترقی کی منزلوں کو پانے کے بعد بھی یہ گھرانہ اپنے پرانے ساتھیوں اور 'وڈالا بستی' کو نہیں بھولا۔ ورنہ اس سماج میں ایک ایسے طبقے پر بھی اب لکھا جانے لگا ہے جو تعلیم حاصل کر کے ترقی پا کر اپنے پسماندہ سماج اور عزیز واقارب سے کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے ہے۔

اردو زبان اشرافیہ کی زبان ہے۔ یہاں والد کو 'باپ' کہنا بھی زبان دانی کا عیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ دلت ادیبوں نے زبان وبیان کی ملمع کاری اور عبارت نگاری کے بجائے کھردراپن اور شعلہ بیانی سے بھی دلت ادب کو مقبول کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ مراٹھی زبان کے مروجہ اصولوں کو توڑ کر دلت شاعری آگے بڑھتی رہی۔ پھر نثر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔

''ارے زبان تو ایسی ہونی چاہئے... کراری... ایک دم بومبل (ایک مچھلی Bombay Duck) کی چٹنی جیسی! جب تم مجھے والد کہتے ہو تب ایک دم بھنڈی کی بھاجی کی طرح لجلجا سا لگتا ہے۔'' (صفحہ 35) میرا خیال ہے کتاب کا نام ''آمچا باپ آن آمھی'' کی مناسبت سے ''ہم اور ہمارا باپ'' ہوتا تو کہی گئی بات کا مطلب زیادہ بہتر طریقے پر واضح ہوتا۔

'سونو' ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی ودیگر عالمی زبانوں میں بھی ترجمہ ہونے کا ذکر کتاب میں شامل ہے۔ اگر یہ کتاب اردو میں ترجمہ نہ ہو پاتی تو یہ اردو زبان کا اپنا ذاتی نقصان ہوتا۔ ممتاز نکہت صاحبہ نے یہ اہم کام انجام دیا ہے۔ مصنف نے ترجمے سے متعلق اہم بات بھی کہی ہے کہ "Translation if Faithful, is not beautiful and if beautiful, not faithful"

میری ناقص رائے میں کوئی ترجمہ پڑھتے ہوئے مطالعے کی روانی میں کسی قسم کا Speed Breaker حائل نہ ہونا چاہئے۔ اس ترجمے میں بھی روانی ہے۔ البتہ کتاب کی چند خامیاں ضرور رہ گئی ہیں۔ مہاروواڑا۔ مہاڑواڑا ہو کر رہ گیا ہے۔ شری پینڈسے کا نام ''پینڈشا'' ہو گیا ہے۔

352 صفحات پر پھیلی اس اہم کتاب کی قیمت تین سو روپے بہت زیادہ تو نہیں مگر زیادہ ضرور ہے۔ ایڈ شاٹ سے پہلی فرصت میں یہ کتاب طلب کر کے مطالعے کا شوق رکھنے والے قاری کو پڑھ لینی چاہئے۔

مصنف: ڈاکٹر نریندر جادھو؛ **مترجم**: ممتاز نکہت؛ **قیمت**: 300 روپے؛
ناشر: ایڈشاٹ پبلی کیشنز، B-104، اسمیتا ایکسون III،
نیا نگر، میرا روڈ، ممبئی۔ 401107

OO

تعارفی تبصرے

کتب نما

نصرت ظہیر

شری مد بھگوت گیتا (نغمۂ یزدانی) / اجے مالوی

'اردو میں ہندو دھرم' کے بعد ڈاکٹر اجے مالوی کی یہ نئی پیشکش، 'شری مد بھگوت گیتا' (نغمۂ یزدانی) کی تفسیر و تعبیر اردو قارئین کے لئے خاص اہمیت کی حامل اس وجہ سے ہے کہ اب اردو میں ہندوؤں سے متعلق نئی مذہبی کتابیں نہ تو لکھی جا رہی ہیں نہ چھپ رہی ہیں۔ ویسے بھی اس بد بخت برصغیر کی کم بخت سیاست نے فی زمانہ اردو کو عملاً مسلمانوں کی زبان بنا رکھا ہے (واضح ہو ان میں یوپی کے مسلمان شامل نہیں ہیں۔ وہ خاصی ترقی یافتہ قوم ہیں اور اردو سے اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ مادری زبان بہت پیچھے رہ گئی ہے)

عام طور سے لوگ بھول گئے ہیں اور مجھ جیسے کم علموں کو تو خاص طور سے حیرت ہوتی ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی یہ بات سن اور پڑھ کر کہ اردو میں رامائنوں اور گیتاؤں کے تراجم خاصی بڑی تعداد میں پہلے سے موجود ہیں اور ویدوں اور پرانوں کے ہی ساٹھ ستر تراجم اردو میں ہو چکے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ اب وہیں ہیں جہاں ہمارے یوپی کے برادرانِ اسلام اردو کو پہنچا دینے والے ہیں۔ یوروپ کے کتب خانوں میں۔

کتاب کے فلیپ پر نارنگ صاحب کی تحریر کے مطابق انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کلکشن یا پیرس اور برلن کے قومی کتب خانوں میں بالخصوص جہاں اردو نسخے بہت بڑی تعداد میں ہیں یہ تراجم پوری حفاظت سے رکھے ہیں۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اردو برصغیر کے باہر کتنی محفوظ ہے اور دوسری یہ کہ یوروپ میں پروفیسر نارنگ اب تک کہاں کہاں کی سیر کر چکے ہیں۔

بھگوت گیتا ہندوستان عالی نشان کے رامائن کے بعد دوسرے بڑے رزمیے مہابھارت کی دین ہے، جو داستان نہیں بلکہ فلسفہ ہے۔ زندگی کا ایک ایسا ہدایت نامہ جو اس دنیا کو اور بہتر بنا سکتا ہے۔ سوا دو سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ڈاکٹر مالوی کی کتاب میں اگرچہ تفسیر کم ہے اور ترجمہ پوری گیتا کا کر دیا گیا ہے تاہم وہ اتنی آسان زبان میں ہے کہ سب کی سمجھ میں آ سکے۔ جناب نظام صدیقی نے اس پر 'اردو زبان کے تناظر میں شری مد بھگوت گیتا (نغمۂ یزدانی) پر ایک نظر' کے عنوان سے جو پر مغز مقدمہ تحریر کیا ہے وہ بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ فرماتے ہیں:

"...شری مد بھگوت گیتا (نغمۂ یزدانی) مہابھارت کا جوہرِ اصل ہے جس میں فلسفۂ عمل، فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات کو انتہائی غنائی جاذبیت، فکری بلندی اور جمالیاتی رعنائی، برنائی اور توانائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ... یہ انسانی کارکردگی کی افادیت، زندگی کی معنویت اور کائنات کے اسرار کے مغزِ اصل کا نغماتی نگارخانہ رقصاں ہے جو..."

شکر ہے مالوی صاحب نے اپنے ترجمے میں اس طرح کی زبان سے بالعموم اجتناب کیا ہے اور بالعموم وہ ٹھیک سے سمجھ میں بھی آ جاتا ہے۔ مثلاً:

جس طرح اس مقام کے لئے جہاں چاروں طرف سیلاب آ جانے پر کوئیں کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اسی طرح عارف کے لئے وید غیر ضروری ہیں.... دوسرا باب، شلوک 46

میں سب جان داروں کا مالک اور پیدائش سے مبرّا ہوں...اے بھارت! جب جب دھرم کا تنزل ہوتا ہے اور ادھرم کا زور پھیل جاتا ہے، تب تب میں اپنے روپ کو رچتا ہوں۔ چوتھا باب، شلوک 6 اور 7

جو مجھ ذاتِ ابدی کو سب جانداروں میں دیکھتا ہے اور تمام جانداروں کو مجھ میں دیکھتا ہے اس کی نظروں سے میں کبھی اوجھل نہیں ہوتا اور وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا کیونکہ وہ مجھ میں ہی قائم ہے۔ چھٹا باب، شلوک 30

ایک اچھا اور محققین کے مطلب کا کام ڈاکٹر مالوی نے یہ کیا ہے کہ 'حصۂ سوئم' میں 'اردو میں شری مد بھگوت گیتا کے تراجم پر ایک نظر' کے عنوان سے متعدد تراجم کی تفصیل دے دی ہے جس میں مترجمین کے نام، کتابوں کی ابتدائی اور آخری سطور (پتہ نہیں کیوں) یہ کتابیں کہاں موجود ہیں، سب کے سائز، سنِ اشاعت اور صفحات کی تعداد، کتاب کی موجودہ حالت، اور تھوڑا بہت متن کا احوال شامل ہے۔ اس سے کتاب کی علمی افادیت بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر مالوی کا تحقیقی کام اردو زبان میں ہندو دھرم سے متعلق ادب کے بارے میں ہے، جس پر انہیں الہ آباد یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ سے نوازا ہے اور

جو اردو میں 'ہندو دھرم' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔
صفحات: 234؛ قیمت: 200 روپے
سروج پبلیکیشنز 1278/1 مالوی نگر، الہ آباد، یوپی۔ 211003

شگاف/ جگدیش پرکاش

'دھوپ کی خوشبو' 'نریندر کے لئے' اور 'آسمان در آسمان' کے بعد 'شگاف' جگدیش پرکاش کا چوتھا شعری مجموعہ ہے، جو مزید تقویت پہنچاتا ہے میرے اس شبہ کو کہ آنے والے دنوں میں کم از کم ہندوستان میں اردو زبان اپنی شاعری کی وجہ سے ضرور محفوظ رہے گی۔ اور یہ بھی کہ اس ملک کی زبانوں میں اچھی اور خوب صورت شاعری کے لئے فی زمانہ اردو کے سوا کوئی زبان اتنی موزوں نہیں ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ شعری ادب آج اتنی مری گری حالت میں بھی جتنا اردو میں چھپ رہا ہے اتنا کسی اور ہندوستانی زبان میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ خیر یہ الگ موضوع ہے۔ فی الحال جگدیش پرکاش کی شاعری پر مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ چوتھے مجموعے میں ان کی شاعری کے معیار کا گراف بلندیوں پر ہے اور لگتا ہے ممبئی کے سینسیکس کی طرح یہ ابھی اور اوپر جائے گا۔

مخمور سعیدی کے لفظوں میں جگدیش پرکاش کی شاعری اپنی تفہیم و ترسیل کے لئے کسی مروجہ تنقیدی اصطلاح کی محتاج نہیں، یہ براہِ راست آپ سے مخاطب ہوتی ہے اور بلند خوانی کے انداز میں نہیں، سرگوشی کے سے لہجے میں بات کرتی ہے...(شاعری میں) یہ منکسرانہ مزاج اسی شاعر کو نصیب ہوتا ہے جو خود اعتمادی سے بہرہ ور ہو۔ اور مجھے مخمور صاحب کی اس رائے سے صد فیصد اتفاق ہے۔ ظاہر ہے اتنے عالم فاضل آدمی سے اتفاق کرنے میں ہی عافیت بھی ہے۔

آیئے اب ذرا اردو کے ساتھ ہندی رسم الخط میں بھی ساتھ ہی چھاپی گئی اس کتاب کی کچھ ورق گردانی کرلیں۔ غزلوں کے پہلے صفحے پر رکتے ہیں۔ شعر دیکھیں:

وہ جس شگاف سے دیکھا تھا آسماں اک روز
اُسی شگاف کو کیوں آج بھر رہا ہوں میں
دراز دیکھ رہا ہوں پُرانے رشتوں میں
یہ کیسا دور ہے جس سے گزر رہا ہوں میں

اور آگے چلیں:

وقت کا ہاتھ پکڑ کر کبھی نکلا تھا ضرور
وقت کا ساتھ نبھانا بڑا مشکل ہے میاں

اور آگے:

کسی نے پونچھ دیئے بڑھ کے آنکھ سے آنسو
وگرنہ خونِ جگر ہم بہانے والے تھے
فلک کی وسعتوں کو ساتھ ہی رکھنا پرندو تم
یہی پھیلاؤ ہے جو باعثِ پرواز بنتا ہے
جس نے ایمانوں کا سودا کر لیا اُس کے لئے
کیسی دنیا، کیسی دھرتی، کیسے بندے، کیسا رب
چند ہمسائے تو ہیں، پر ہم نوا کوئی نہیں
تب بھی ہم تنہا تھے سارے آج بھی تنہا ہیں سب
سمندر چیرنا ہوگا وہاں تک
تلاطم دیکھتا ہوں میں جہاں تک
چابی والے باجے پر کملا جھریا کی گائی غزل
تنہائی کے لمحوں کو اک خوش بو سے بھر جاتی ہے
ہر دن وہی حالات، وہی شکوے شکایات
دنیا بھی بھلا کون سی اُلجھن میں پڑی ہے

اور صفحہ 67 پر یہ غزل

جو بھی چاہے کیا کرے کوئی
بس مقابل رہا کرے کوئی

یہ سب اشعار غزل کے لہجے سے جگدیش پرکاش کی ہم آہنگی کے ثبوت ہیں۔ اور یہ نظم تو پوری پڑھنی ہوگی:

بازگشت

مجھے لگتا ہے یہ دن زندگی کا آخری دن ہے
مرے خوابوں پہ دستک تھم گئی ہے روزِ فردا کی
مری اُنگلی پکڑ کر لے چلا ہے کوئی اُس جانب
جہاں دیوار پر پچھلے کئی برسوں کے کیلنڈر
پُرانی ڈائری کے گرد آلودہ پھٹے پنّے
پُرانے خط کہ جن میں ذکر تھا اُن بھولی باتوں کا
ادھوری نظم کے اشعار کچھ کاغذ کے پرزوں پر
دلا جاتے ہیں پھر سے یاد اُس وقتِ گزشتہ کی
کہ جس کو میں نے اپنی خامشی کے بند کمرے میں
جیا تھا اپنی سانسوں کے کسی خاموش گوشے میں
جہاں آواز کو عنوان دینے کی گراں کوشش
کیا کرتا ہوں میں الفاظ کو تیری زباں دے کر
مری یادوں کا پیغمبر

اُسی ماضی کے ٹیلے پر
رُکا ہے آج پھر آ کر
کھڑا ہے آج پھر جا کر
مجھے آواز دے کر کہہ رہا ہے تم بھی آ جاؤ
یہاں سے آسماں دیکھو
وہی کھویا جہاں دیکھو
کہ گرد راہ میں کھوئے
وہ منزل کے نشاں دیکھو
پھر اس کے بعد تم تحلیل ہو جانا ... اگر چاہو
اُسی ماضی کے گوشے میں
کہ جس کی آبنوسی میز پر رکھی ہوئی ہے وہ
پُرانی ڈائری جس میں کسی کے نام کی خوش بو
ابھی باقی ہے سانسوں میں!

میرا خیال ہے تبصرہ غیر ضروری ہے۔ نظم میں جگدیش پرکاش کی آج کے لہجے پر پوری پکڑ ہے۔

صفحات:368=184x2؛ **قیمت**:250روپے
ساقی بک ڈپو A-4157اردو بازار، دہلی۔110006

فرید پربتی: شعر شعور اور شعریات

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابوں جیسے خاصے مرعوب کن عنوان سے مرتب کی گئی یہ کتاب دراصل وادیٔ کشمیر کے خوش فکر، خوب رو اور شعر و ادب کی ہر جہت وسمت سے باخبر ڈاکٹر فرید پربتی کی دراز قد ادبی شخصیت سے متعلق ہے جس میں ان کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کے اتنے گوشے سامنے لائے گئے ہیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ صرف 47 سال کی عمر میں اردو ادب کے 'مکھیہ دھارے' Mainstream سے دور رہنے والا کوئی شخص اتنا کام کیسے کر سکتا ہے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے اس کی وجہ Mainstream سے دور رہنا ہی ہو۔ ورنہ دلّی، یوپی، بہار میں تو اُبھرتے ہوئے ادیب پر خاص نظر رکھی جاتی ہے کہ وہ کہیں زیادہ نہ ابھر جائے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ادبی تذکروں میں اس کا نام بالکل نہ لیا جائے، ادبی محفلوں میں کہیں پہونچ ہی جائے تو اس قسم کے فقروں سے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی جائے کہ اس کا رہا سہا جوش بھی ختم ہو جائے۔ مثلاً:

''معاف کیجئے، میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے''

''.....!؟!؟''

''اوہو بھئی خوب یاد آیا، آپ علّن فقیر ہیں نا!''

''جی میرا نام نصرت ظہیر ہے''

''اوہ، ارے بھئی آپ کو تو کافی پڑھا ہے میں نے، ذرا وہ قورمے کی قاب تو ادھر کیجئے... خوب لکھتے ہیں آپ، پچھلے ہفتے بھی بڑا اچھا کالم تھا آپ کا۔ اکثر پڑھتا ہوں آپ کو...''

''میرا کالم تو کئی سال سے بند ہے جناب۔ اور نیا مضمون بھی کوئی نہیں لکھا برسوں سے...''

''کوئی بات نہیں آپ یہ قورمہ لیجئے...''

چھ شعری مجموعے، میرے علم کے مطابق کم از کم تین تنقیدی و تحقیقی کتابیں، ڈاکٹریٹ کے لئے تحریر کئے گئے مقالے 'شاہ حاتم دہلوی، حیات و فن' پر مشتمل کتاب اور نصف درجن کتابیں مختلف ادبی موضوعات پر زیر تصنیف! کہئے مرعوب ہوئے یا نہیں۔ اور سنئے۔

آپ کو یاد ہوگا سو سوا سو سال گزرے ایک بزرگ مظلر پوش ہوا کرتے تھے، مولانا الطاف حسین حالی جواب اتنے پرانے ہو چکے ہیں کہ آج کے کچھ من چلے مولانا حالی کی بجائے انہیں مولانا ماضی بھی کہہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری پر ایک مقدمہ چلایا تھا جس کا نام تھا مقدمہ شعر و شاعری۔ یہ اتنا خطرناک مقدمہ تھا کہ آج تک شاید ہی کوئی اردو شاعر اس سے باعزت بری ہوا ہو۔ تو اسی شاعری کی ایک مشکل ترین صنف ہے رباعی۔ جسے اب آپ اردو ادب کی endangered species میں شمار کر سکتے ہیں۔ فرید پربتی صاحب نے اس صنف پر مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ کتاب اسی سال چھپی ہے اور نام ہے 'مقدمہ صنفِ رباعی'۔ اس میں ڈاکٹر پربتی نے رباعی کی ہیئت، صنف، اس کے تاریخی ارتقا اور فن پر علاحدہ ابواب میں جم کر بحث کی ہے اور اگر چہ ابھی کتاب میں نے پڑھی نہیں صرف سونگھی ہے پھر بھی مجھے شبہ ہے، بلکہ پختہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ آنے والے سو سال میں بھی کوئی اردو رباعی گو اس مقدمے سے باعزت بری نہیں ہو پائے گا۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ شائد کوئی بے عزت بھی بری نہ ہو۔ ظاہر ہے رباعی گو موجود ہوں گے تو مقدمے کی زد میں آئیں گے۔ جوش اور فراق کے بعد جس تیزی سے رباعی گوؤں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے اتنی تیزی سے تو جنوبی ایشیا میں گدھ بھی کم نہیں ہوئے۔ اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ جلد ہی یہ صنف عجائب گھروں میں پہونچ جائے گی جہاں لوگ اسے دیکھیں گے اور عبرت حاصل کریں گے۔

تو جناب یہ ہے ڈاکٹر فرید پربتی کی شخصیت کا وہ علمی پہلو جس کی قدر ان کی

شاعرانہ حیثیت سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ وہ کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں پڑھاتے ہیں۔ ایک شاگرد سلیم سالک نے یہ کتاب ان کی شخصیت پر مرتب کی ہے اور اس خوبی سے کی ہے کہ اس میں ممدوح کی پوری شخصیت سما گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پر لکھنے والوں میں پروفیسر حامدی کاشمیری، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر عبدالحق، عبدالاحد ساز، رؤف خیر، پروفیسر شمیم حنفی، بلراج کومل، کرشن کمار طور وہ معدودے چند شخصیات ہیں جن کا کسی کی تعریف وتوصیف میں ایک دو جملے لکھ دینا بھی ایسا ہے کہ اسے تاعمر چھاتی سے لگائے رکھنے کو جی چاہے۔

اس کے علاوہ ساٹھ سے زائد صفحات پر مشہور ادیبوں کے وہ خطوط بھی یک جا کر دیئے گئے ہیں جو ڈاکٹر پربتی کے نام ہیں۔ آخری حصے میں ان کے بعض اہم مضامین اور غزلوں، نظموں اور رباعیوں کی صورت میں ان کی شعری تخلیقات بھی نمونے کے طور پر شامل ہیں جس سے کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔

فرید پربتی: شعر شعور اور شعریات

صفحات: 272 **قیمت:** 250 روپے

مقدمہ صنف رباعی

صفحات: 92 **قیمت:** 150 روپے

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ 110006

غبارِ راہ گزر/ خالد رحیم

بیسویں صدی کے نصفِ آخر تک اردو میں شاعروں کی جو ایک بھیڑ اُمڈی اور یک بیک ایسا لگا کہ اردو اب صرف شاعری کی زبان بن کر ہی زندہ رہے گی، تو اس بھیڑ میں خالد رحیم وہ نام ہے جسے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ اور کم از کم میں انہیں ضرور پہچان سکتا ہوں اردو زبان کے اس دل کش رنگ کی وجہ سے جو اُن کے یہاں خوب نکھر کر سامنے آتا ہے۔ سادہ الفاظ، شریفانہ تراکیب واضافتیں، مہذب مگر تصنع سے پاک اور سیدھا دل میں اتر جانے والا لہجہ۔ یہ ہے وہ اردو جو میری اور مجھ جیسے کروڑوں اردو کے چاہنے والوں کی آئیڈیل اردو ہے۔ اور یہی ہے وہ اردو جو خالد رحیم کے شعر کی زبان ہے۔

یہاں ان کی شاعری اور فکری رویّوں پر رائے زنی کی بجائے زبان پر زیادہ زور دینا میرے خیال سے اس لئے زیادہ اہم ہے کہ زبان اور اس کا لہجہ اور پوری لفظیات وہ tools یا اوزار ہیں جن کی نادرگی سے شاعر کا اچھے سے اچھا خیال بھی زمین پر پڑا رہ جاتا ہے۔

جہاں تک ان کی شاعری میں فکری رویّوں کی بات ہے تو ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم، اقبال متین، مظہر امام، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی مرحوم، آزاد گلاٹی، سلیم شہزاد پہلے ہی اس کے الگ الگ پہلوؤں پر الگ الگ زاویوں سے اظہار رائے فرما چکے ہیں اور یہ سب کم وبیش 'غبارِ راہ گزر' میں بھی پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ 'عکس در عکس' کے بعد خالد رحیم کا یہ دوسرا غزلوں کا مجموعہ اور چوتھی تصنیف ہے۔ اڑیسہ میں اردو ادب کا چراغ جلائے ہوئے ہیں، وہاں کی اور دوسری ریاستوں کی اردو اکادمیوں نے انہیں مختلف ادبی اعزازات پیش کئے ہیں، اتکل یونی ورسٹی میں ان کی شاعری پر ریسرچ کے لئے ایک اسکالر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا جا چکا ہے۔ اور باقی یہ کہ سفر ابھی جاری ہے۔

مجھے خاص طور سے چھوٹی بحروں کے ان کے بہت سے اشعار اچھے لگے ہیں اور یہاں ان کا حوالہ دیئے بغیر مجھ سے رہا نہ جائے گا۔ لہٰذا چند شعر سنئے:

راتوں کو جاگنے کی سزا بن کے رہ گیا
میں تیری آرزو میں دعا بن کے رہ گیا

اک بازگشت میرا مقدر بنی رہی
میں گنبدوں کے بیچ صدا بن کے رہ گیا

رستے میں شجر ہے نہ کسی یاد کا سایہ
وہ جانے مجھے کیسی دعا دے کے گیا ہے

جب زمیں تنگ سی لگے تم کو
اپنی نظروں میں آسماں رکھنا

تم خوابوں سے کوئی رشتہ مت رکھنا
میں آنکھوں سے نیند چُرانے والا ہوں

دنیا نے ہر پل مجھ کو ٹھکرایا ہے
اب دنیا کو میں ٹھکرانے والا ہوں

حصارِ گرد میں تنہا کھڑا ہوں
میں اپنی خواہشوں کا سلسلہ ہوں

میرا خیال ہے اتنے شعر کافی ہیں ایک ذہین قاری کو سمجھانے کے لئے...

صفحات: 128 **قیمت:** 100 روپے

ایڈوانس کمپیوٹرز، بالمقابل ہنومان مندر، منی ساہو چوک
بکسی بازار، کٹک۔ 753001 (اڑیسہ)

شور کے درمیاں/ جمال اویسی

جمال اویسی کے گزشتہ دو شعری مجموعے 'رکا ہوا سیل' (2002) اور 'لظم نظم' (2004) میں نے ابھی تک نہیں پڑھے ہیں (کم پڑھے لکھے آدمی کا یہ

بھی ایک المیہ ہوتا ہے کہ وہ کم لکھتا پڑھتا ہے) لیکن غزلوں کے ان کے تازہ مجموعے (جو ایسا تازہ بھی نہیں کہ پچھلے سال شائع ہوا تھا) 'شور کے درمیان' کو پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے یہ پہلے کے مجموعے بھی پڑھوں۔

یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ نئے شاعروں میں کئی دوسروں کے برعکس جمال اویسی اپنی غزلوں کے خالق ہونے کے ساتھ خود ہی اپنے نقاد بھی ہیں، جو میرے خیال سے پیشہ ور نقادوں کے لئے مقام عبرت ہے۔ ذرا سوچئے، تخلیق کار حضرات اگر خود ہی اپنے اور تنقید کرنے لگے تو ہمارے گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، خلیق انجم اور قمر رئیس صاحبان کیا کریں گے؟

میرے خیال سے خود تنقیدی (self criticism) یا جسے عرفِ عام میں خود احتسابی کہا جاتا ہے، سب سے مشکل مگر سب سے صحت مندر رجحان ہے اگر کوئی اسے اپنا سکے تو۔ کسی زمانے میں کمیونسٹ زبانی حد تک ہی سہی اس کے سب سے زیادہ قائل تھے۔ اکثر آپس میں یہ کہتے سنائی دیتے تھے کہ: ''کامریڈ، غصہ نہ کرو، ذرا سیلف کرٹسزم سے کام لو۔'' ان دنوں کمیونسٹ حضرات پہلے تو خوب آگا پیچھا دیکھ کر بڑی ایمانداری سے کوئی اعلیٰ درجے کی حماقت سرزد فرماتے تھے (مثلاً آزادی سے عین قبل تشکیلِ پاکستان کی حمایت، چینی حملے کے وقت چین کی حمایت، ایمرجنسی میں اندرا گاندھی کی حمایت وغیرہ... کہاں تک گنوائیں) اور پھر بعد میں اتنی ہی ایمانداری سے اسے قبول بھی کر لیتے تھے۔ کیسے؟ ظاہر ہے سیلف کرٹسزم کر کے! اور قبول اس لئے کرتے ہیں تا کہ اس سے inspiration پا کر کوئی تازہ حماقت کر سکیں۔

بعد میں کمیونسٹوں نے اس عادتِ قبیحہ سے نجات پائی اور اسے بالائے طاق سے بھی کچھ اوپر رکھ کر بھلا دیا۔ چنانچہ اب وہ صرف حماقتیں کرتے ہیں، پوری ایمانداری کے ساتھ، خالص حماقتیں۔

مگر جمال اویسی کی خود تنقیدی ایک سنجیدہ عمل ہے۔ کتاب میں خود ہی اپنے بارے میں اظہارِ خیال فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ وہ شاعری نہیں ہے جس کا تصور میرے ذہن میں تھا یا جیسی میں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جو شاعری اس مجموعے (شور کے درمیان) میں غزلوں اور رباعیوں کی شکل میں پیش کی گئی ہے وہ 'بہت سی باتوں' کی ترجمان ہے۔ بہت سی باتوں کے جنگل میں گھپ اندھیرا رہتا ہے اور کہیں کہیں ہلکی سی روشنی...''

پہلے ہی جملے میں اپنی شاعری کو خود اپنے شعور کی سان پر رکھ دینا بڑے دل گردے کا کام اور اعلیٰ درجے کی ذہانت کی نشانی ہے۔ ورنہ بڑے سے بڑا تخلیق کار بھی اپنی تخلیق کو خود سے جدا رکھ کر دیکھنے پرکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ حدِ نگاہ سے خود کو نکال کر دیکھنا آسان نہیں ہے۔ اس مضمون میں آگے چل کر جمال اویسی نے اتنی باریکی سے اپنی شاعری کا تجزیہ کیا ہے کہ کئی بار مجھے دھوکا ہوا کہ میں دو جمال اویسیوں کو پڑھ رہا ہوں۔ ایک جو نقاد ہے اور ایک جو تخلیق کار ہے۔ اور لطف یہ کہ نقاد جمال نے شاعر جمال کے اچھے برے اشعار کا بھی اپنی بات سمجھانے کے لئے خوب جم کر حوالہ دیا ہے۔

شعری مجموعے میں اس سے کچھ ملتا جلتا تجربہ کبھی پروفیسر مظفر حنفی نے کیا تھا جس کا نام غالباً 'عکس ریز' تھا۔ پوری کتاب میں صرف ایک مضمون تھا ظ انصاری کا جس میں کامریڈ ظوئے نے حنفی صاحب کی پوری شاعری کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا اور اس سے اپنی بے اطمینانی کا واضح الفاظ میں اظہار فرمایا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ حنفی صاحب کی عزت میں اس لئے بھی کرتا ہوں کہ وہ اپنی ہی کتاب میں اپنے خلاف مضمون شائع کرنے کا جگر رکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے ظوئے زندہ ہوتے تو جمال بھی ان سے ایک مضمون اپنی شاعری پر ضرور لکھواتے جو یقیناً ان کے خلاف ہوتا اور پھر اسے بڑے اہتمام سے شائع بھی کرتے اسی کتاب میں۔

ایک اور اچھی بات کتاب میں یہ ہے کہ اس میں گزشتہ مجموعے 'رکا ہوا سیل' کا ایک مختصر انتخاب بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ تو سمجھ لیجئے یوں تھوڑا سا 'سیل' میں نے بھی پڑھ لیا ہے۔ اور ہاں، پلیز، یہ سیلاب والا سیل ہے اسے کسی قسم کی بیٹری یا مہر مت سمجھ لیجئے گا۔

کل ملا کر میرا تاثر یہ ہے کہ جمال خاصے متاثر کرنے والے شاعر ہیں، اور ابھی تو ان کے دو مجموعے آئے ہیں۔ ہونا ہے ابھی ان کو 'خراب' اور زیادہ۔ اور یہ بھی کہ کاش اس 'خرابی' کا نور دوسرے ذہنوں تک بھی پہونچے کہ یہی آگے چل اردو شاعری کی آبرو بنے گا۔

صفحات: 144 **قیمت:** 140روپے

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔110006

منتشر لمحوں کا نور/کبیر اجمل

بنارس سے تعلق رکھنے والے حسین شاعر کبیر اجمل کی شاعری سے پہلے جی چاہتا ہے کچھ ان کے شعری مجموعے کی خوب صورتی کے بارے میں خامہ فرسائی فرما دوں (فرسائی کا مطلب براہِ کرم کسی عالم فاضل سے پوچھیں میں نے تو بس یوں ہی رعب گانٹھنے کے لئے لکھ دیا ہے) یقین کیجئے اتنے سلیقے سے چھپا ہوا شعری مجموعہ میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ حسین مجموعے تو کئی دیکھے اور بنا پڑھے ایک طرف رکھ بھی دئے۔ کیونکہ اکثر مجموعوں کو زیادہ خوبصورت چھاپا ہی اس لئے جاتا ہے تا کہ ان کے صفحات پر جو کچھ رقم

کیا گیا ہے فاضل رقم خرچ کر کے اس کی بے صورتی کو چھپایا جا سکے۔

لیکن اس مجموعے کی خوب صورتی میں جو سلیقہ اور شائستگی ہے اسے دیکھ کر خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ اسے پڑھا بھی جائے۔ اور ایک بار پھر یقین کیجئے کہ کبیر اجمل کی شاعری پڑھ کر مجموعے کا حسن دوبالا ہو گیا کیونکہ وہاں بھی سلیقہ اور شائستگی اسی تناسب میں موجود ہے۔ ہاں ایک بات ضرور طے کر لی ہے کہ زندگی میں کبھی اپنا شعری مجموعہ منظر عام پر لانے کی سعادت نصیب ہوئی تو میں اسے اسی طرز پر چھاپنا پسند کروں گا۔ بس دعا یہ ہے کہ کاش شاعری بھی اسی درجے کی ہو جائے۔

تاہم کبیر کا کلام پڑھنے کو راغب کرنے کا سبب مجموعۂ کلام کے ظاہری حسن سے زیادہ اعلیٰ حضرت شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا وہ تبصرہ بنا جو کتاب کے فلیپ پر چھاپا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''میں نے نوجوان شاعر کبیر اجمل کا کلام دل چسپی سے پڑھا۔ شاعر کی نوعمری اور نومشقی جگہ جگہ نمایاں ہیں اور یہ کوئی تعجب یا عیب کی بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ شاعر کا ذاتی تصور اور دماغ بھی جگہ جگہ چمک اٹھتا ہے...''

اور بس میں نے سمجھ لیا کہ فاروقی صاحب نے اس طرح کھنچائی کی ہے تو شاعر میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہوگی۔ ظاہر ہے فاروقی صاحب کی عزت اردو دنیا یوں ہی نہیں کرتی۔ انہوں نے ایک زمانے کی ادبی رہنمائی کی ہے۔ خود میری ذاتی رہنمائی بھی ان کی تحریروں سے ہوتی رہی ہے۔ وہ ایسے کہ جس تخلیق یا کتاب کو وہ معمولی درجے کی قرار دے دیتے ہیں اسے میں ضرور توجہ سے پڑھتا ہوں اور بالعموم اس کا درجہ اعلیٰ پاتا ہوں۔ ساحر کی نظم 'تاج محل' اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی متعدد تخلیقات کے حسن کا میں اسی لئے قائل ہو سکا کہ فاروقی صاحب نے انہیں معمولی درجے کی تخلیقات قرار دے دیا تھا۔

کتاب کے آغاز میں یعقوب یاور اور نجیب رامش کے تجزیاتی مضامین ہیں جن میں کبیر اجمل کے شعری لب و لہجے کی تازگی، غم انگیزی، اطراف کے حالات سے بے اطمینانی، طبع کی روانی اور موضوعات و خیالات کی غیر معمولی فراوانی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ تقریباً 80 غزلوں کے اس مجموعے میں کبیر اجمل کے بیان کی پختگی کو دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ذرا یہ اشعار دیکھئے:

جب کبھی نوکِ قلم آگ اگلنا چاہے
اک سمندر مری تحریر میں ڈھلنا چاہے
جو سمندر کو بھی کوزے میں سمونا چاہے
کسی دریا کو سمندر نہیں ہونے دیتا
ہماری شاعری سادہ سہی لیکن میاں اجمل
اسی سادہ بیانی میں بڑا مفہوم ہوتا ہے
کیوں عکس گریزاں سے چمک بجھ گئی دل کی
یہ رات تو مہتاب کے گہنے کی نہیں ہے
غم کا اک آتش فشاں تھا اور میں
دور تک گہرا دھواں تھا اور میں
جستجو تھی منزلِ موہوم کی
یہ زمیں تھی آسماں تھا اور میں
کس سے میں اس کا ٹھکانہ پوچھتا
سامنے خالی مکاں تھا اور میں
یہ کیا کہ صدیوں سے ایک ہی خواب دیکھتے ہو
کبھی تو لاسمتیت کے اندھے بھنور سے نکلو
اپنا فن بیچ کے چپ چاپ کھڑا ہوں اجمل
میں بھی بک جاؤں تو بازارِ ہنر سے نکلوں
ظلم کی رات ڈھل گئی اجمل
پھر دلوں میں یہ خوف سا کیوں ہے
حیات سوزش سے بھر گئی ہے
تو کیا چھٹی حس بھی مر گئی ہے
وجود سوکھے گلاب جیسا
خزاں تو خوشبو بھی چر گئی ہے

اب اور کتنے شعر کوٹ quote کروں۔ ایسے اشعار سے تو مجموعہ بھرا پڑا ہے۔ نجیب رامش نے جس انداز اور دلائل سے کبیر کے فن کا تجزیہ کیا ہے وہ بھی قابلِ تعریف اور پڑھنے کی چیز ہے۔

صفحات: 176 **قیمت:** 200 روپے

اسکرین پلے پبلی کیشنز، تل بھانڈیشور، مالتی باغ، بنارس

وہ بھی اک زمانہ تھا/انیس امروہی

جس طرح مجھے پرانے فلمی گانے جمع کر کے انہیں MP3 فارمیٹ میں ڈھال کر کمپیوٹر میں جمع کرنے کی جھک سوار رہتی ہے اسی طرح انیس امروہی کو فلموں اور فلمی ہستیوں کے بارے میں جانتے اور لکھتے رہنے کا خبط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم دونوں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب دو خبطی آپس میں ملیں گے تو احتیاطاً یہی کریں گے۔ خبط کا عالم یہ ہے کہ خادم کے کمپیوٹر پر فلم پاکیزہ کے لئے لتا منگیشکر کے گائے

ہوئے وہ کئی خوب صورت اور نادر نغمے سننے اور سر دھننے کا موقع مل سکتا ہے جو فلم سے خارج کر دیئے گئے تھے تو انیس میاں دن اور تاریخ کا حوالہ دے کر یہ بتادیں گے کہ یہ غلام محمد کے کمپوز کئے ہوئے ان شاندار گانوں کو کمال امروہی نے کب ریکارڈ کرایا اور کیوں اصل فلم سے خارج کیا تھا۔

خیر، فلمی صحافت 35 برس تک انیس میاں کا پیشہ رہی ہے چنانچہ یہ خبط ان کے لئے معاشی آسودگی اور میرے لئے بدحالی کا سبب بھی کسی حد تک بنا ہے۔

زیر نظر کتاب ان کے اسی خبط کا ثمرہ ہے جس کی ایک جملے میں پوری تعریف یہ ہے کہ یہ ہندی/ اردو فلموں کی سب سے نامور شخصیتوں کے بارے میں سب سے زیادہ معلوماتی کتاب ہے۔ شخصیتیں جن کا ذکر ہے وہ ہیں جو آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مثلاً سہراب مودی، اشوک کمار، پرتھوی راج کپور، راج کپور، مدھو بالا، نوشاد، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، اوپی نیر، مینا کماری وغیرہ۔ اور کمال امروہی بھی جو ظاہر ہے ان کے ہم وطن تھے۔

ہم ہندوستانیوں کے ذہنوں پر عرصے سے چھائی ہوئی ان شخصیتوں کے بارے میں انیس نے عام فہم انداز میں بہت سی دل چسپ اور چونکا دینے والی باتیں لکھی ہیں۔ اور بقراط بننے کی کہیں کوشش نہیں کی ہے۔ البتہ اردو زبان سے ان شخصیتوں کے تعلق اور آزادی کے بعد فلموں کے ذریعے اردو زبان کو حاصل ہونے والے فروغ کا بھی انہوں نے بڑی دردمندی سے ذکر کیا ہے۔

کتاب زیادہ تعریف کی محتاج نہیں اس لئے اتنا تعارف کافی ہے۔

صفحات: 176 **قیمت:** 200روپے

تخلیق کار پبلشرز 104/B یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ 110092

کھوئی ہوئی جنّت / گلشن کھنّہ

لندن جا کر آپ سب کچھ دیکھیں اور گلشن کھنّہ کو نہ دیکھیں تو سمجھئے آپ لندن گئے ہی نہیں۔ اگر آپ اردو والے ہیں تو دوبارہ لندن جانا پڑے گا، ورنہ عین ممکن ہے کہ گلشن کھنّہ کو پتہ چل جائے کہ آپ اردو بھائی ہو کر ان سے ملے بغیر لندن سے چلے گئے ہیں۔ اور جب یہ ہوگا تو یہ بات ان کی بیوی پرجیت کو ضرور معلوم ہو جائے گی جنھیں پورا نہیں تو آدھا لندن ضرور پولی کہہ کر پکارتا ہے۔ اور جیسے ہی پولی بھابھی کو یہ پتہ چلے گا کہ اردو والے ہو کر بھی Hounslow میں ان کے گھر نہیں آئے تو وہ اسے اپنی ذاتی توہین قرار دے کر آپ کے خلاف کسی نہ کسی دفعہ کے تحت ہتک عزت کا دعویٰ ٹھوک دیں گی۔

خاکسار کو کھنّہ صاحب کی مہمان نوازی کا شرف دو ماہ قبل حاصل ہو چکا ہے چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی بندہ لندن دیکھے بغیر ہی واپس گیا۔ لوگوں نے پوچھا میاں لندن ہو آئے، چار پانچ دن گزارے ہیں خوب مستی کی ہوگی کیا کیا دیکھا بتاؤ تو سہی۔ ہم نے کہا بس دو چیزیں۔ گلشن کھنّہ اور پولی بھابھی۔ باقی کوئی کچھ دیکھنے دیتا تو دیکھتے۔ چنانچہ جتیندر بلو، ساقی فاروقی، سوہن راہی لندن یونی ورسٹی اور ٹیمس کی ریلنگ کو ہاتھ لگا کر واپس آ گئے۔

خیر یہ الگ قصہ ہے اور وقت ملا تو اپنی شان میں لندن کا سفرنامہ پھر کبھی لکھیں گے۔ فی الحال یہ لکھنا مقصود ہے کہ گلشن کھنّہ تقریباً نصف صدی سے لندن میں ہیں اور اس سے بھی زیادہ عرصے سے افسانے لکھتے ہیں جن کا ایک چھوٹا سا مجموعہ، بلکہ مختصر انتخاب یہ 'کھوئی ہوئی جنت' ہے۔ ویسے اس سے پہلے ان کے افسانوں کے دو مجموعے اور چھپ چکے ہیں۔ 'بارش میں ایک آدمی' اور 'درد جو آنکھوں سے بہا'۔ اس کے علاوہ کھنّہ صاحب شاعر کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ بطور شاعر کچھ زیادہ ہی پہچانے جاتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے تین مجموعے آ چکے ہیں۔ 'بکھرے بکھرے خواب' 'چراغ آرزو' اور 'سوچ کی خوشبو'۔ مستزاد یہ کہ انگریزی کے اسکالر بھی ہیں۔ A help to the study of English literary criticism & great critics. کے علاوہ پانچ دیگر کتابیں انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک Teach yourself Urdu through English ان انگریزی دانوں کے بڑے کام کی ہے جو انگریزی میڈیم سے اردو سیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور یہ کافی بکتی بھی ہے۔

کھنّہ صاحب جیسے معصوم اور سیدھے اور سیدھے سادے خود ہیں ویسے ہی ان کے افسانے ہیں۔ نہ کوئی بڑبولا پن، نہ الجھاؤ، نہ ابہام، نہ تصنع، نہ لفاظی۔ انسانی رشتوں، بنیادی اخلاقیات اور زندگی میں مقصدیت کے حامی۔ ان کے زیادہ تر افسانے ہجرت کے افسانے ہیں۔ مغرب کی چکاچوند کے پیچھے چھپی ہوئی تاریکیاں، ہنگاموں اور تماشوں کے اندر کا سونا پن، رو بہ زوال اخلاقی قدریں... یہ سب ان کے موضوع ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر اردو کے ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں کی یاد آتی ہے جو اپنی ہر تحریر سے کوئی نہ کوئی اچھا سا سماجی پیغام دینے کی کوشش میں سرگرداں رہتے تھے۔

زیر نظر کتاب میں کل بارہ افسانے ہیں جن میں سے کم از کم ایک 'ڈاکٹر چمک چاند پوری' ایک کامیڈی افسانہ، بلکہ مزاحیہ خاکے جیسا بھی ہے۔ چھ مضامین کھنّہ صاحب کی شخصیت سے متعلق ہیں جو اقبال مرزا، سید معراج جامی، ساحر شیوی، ڈاکٹر سیفی سرونجی، محمد ایوب واقف اور ان کی شریک حیات پرم جیت کھنّہ نے لکھے ہیں۔

صفحات: 160 **قیمت:** 150روپے

سیفی لائبریری، سرونج، مدھیہ پردیش۔ 228 464

ساحرلدھیانوی حیات اور کارنامے/ ڈاکٹر نغمہ پروین

برصغیر کے لاکھوں نوجوانوں کی طرح ساحرلدھیانوی میرا بھی پہلا عشق ہے۔اور صدیوں جتنے بیسیوں برس دل ودماغ پر گزر جانے کے بعد آج بھی یہ عشق ویسا ہی تروتازہ ہے۔اور عشق کی شدت کا یہ حال سن کر شائد آپ کو ہنسی آئے گی کہ 'تلخیاں' پڑھتے وقت اکثر میں یہ خواہش کرنے لگتا تھا کاش ہم دونوں میں سے کوئی ایک لڑکی ہوتا تو میں ان سے شادی کر لیتا/ کر لیتی، اورامرتا پریتم مجھے حیرت سے دیکھتی رہ جاتیں جن کی طرح ہزاروں لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں۔اس کے باوجود وہ غیر شادی شدہ رہے اور 25 اکتوبر 1980 کو تمام نوجوان اردو دنیا میں صف ماتم بچھا کر رخصت ہو گئے۔

مجھے یاد ہے، میں سہارنپور کی محمد علی لائبریری میں لٹریری کلب کی میٹنگ میں اگلے روز ایک تعزیتی قرارداد پڑھ رہا تھا کہ...غالب اور اقبال کے بعد ساحر اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر تھے...اور آنکھوں سے اشک رواں تھے، جو اس وقت یہ سب لکھتے ہوئے بھی نہ جانے کہاں سے پھر چلے آئے ہیں۔کیا کریں صاحب، پہلا عشق پیچھا کہاں چھوڑتا ہے۔آنسو کی یاد بھی آنسو بن کر آتی ہے۔یہ ساحر کی شاعری ہی تھی جو انگلی پکڑ کر کمیونسٹ پارٹیوں میں لے گئی اور پھر ایک دن، لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری کی سیڑھیوں پر کل ہند اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ساحر کو پہلی بار دیکھا تو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔رات کو ایک انتہائی پر ہجوم مشاعرے میں سامعین کی پرشور نعرے بازی سے مجبور ہو کر جب ساحر نے اپنی طویل نظم پرچھائیاں سنائی تو ہر چند کہ وہاں موجود ہر شخص یہ نظم پہلے پڑھ چکا تھا، پورے دورانیے میں مشاعرہ پر گہرا سکوت چھایا رہا اور جب ساحر نے نظم کا آخری مصرع پڑھا تو تمام سامعین نے کھڑے ہو کر والہانہ انداز میں اس طرح کلیپنگ کی کہ اس وقت بھی کانوں میں وہ تالیاں گونج رہی ہیں۔اور یہ تب تھا جب ساحر نے نظم کے شروع میں یہ کہتے ہوئے خبردار کر دیا تھا کہ نظم خواہ آپ کو کتنی ہی پسند ہو مگر اتنی طویل ہے کہ آپ اکتا جائیں گے۔

پھر اگلے روز شام کو ہوٹل گل مہر میں جب ان سے ہم بھی دوست ملنے گئے تو مجھے یاد ہے سب ان سے باتیں کر رہے تھے اور میں چپ بیٹھا تھا۔

اور اب ڈاکٹر نغمہ پروین کی یہ ضخیم اور خاصی قابل مطالعہ کتاب سامنے ہے تو پھر ایک چپ سی لگی ہے اور جی چاہتا ہے یوں ہی خاموش بیٹھے رہا جائے۔لیکن خاموشی سے تحریر کی شکم پری کیسے ہوگی۔

کتاب دراصل ایک طویل مقالے پر مشتمل ہے جو ڈی فل کے لئے الہ آباد یونی ورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی کی نگرانی میں لکھا گیا اور پروفیسر صاحب نے حفظ ما تقدم کو بالائے طاق رکھ کر کتاب کے پیش لفظ میں پہلے ہی اعلان فرما دیا ہے کہ مقالے کی تمام خوبیوں کا کریڈٹ ان کی طالبہ کو جاتا ہے اور جو خامیاں ہیں ان کے لئے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ویسے انہوں نے کچھ غلط بھی نہیں کہا ہے۔اکثر اردو طلبا پروفیسروں کی عقل پر بھروسہ کر کے ہی گمراہ ہوئے ہیں۔

کتاب کے سات ابواب ہیں جن کے عنوانات پڑھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر پروین نے اس میں ساحر کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ لینے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے۔عنوانات یہ ہیں۔ساحرلدھیانوی: حیات اور شخصیت، انجمن پنجاب کی ادبی خدمات اور جدید نظم کی ابتدا، ترقی پسند تحریک: ایک تعارف، ساحر کی نظمیہ شاعری، ساحر کی غزلیہ شاعری، ساحر کے گیت (نغمہ نگاری)، مجموعی تاثر۔

کتاب پڑھ کر یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ ساحر کیوں اتنے مقبول تھے (اور آج بھی ہیں) کہ غالب، اقبال اور جوش وجگر سمیت کوئی ایسا شاعر اردو کی تاریخ میں آج تک نہیں گزرا جس کے شعری مجموعے (تلخیاں) کے اتنے زیادہ ایڈیشن اس کی زندگی میں چھپے ہوں۔

صفحات: 361 **قیمت:** 300 روپے

ڈاکٹر نغمہ پروین 733/506 الہ آباد

آفاق کی طرف/ خلیل مامون

''میری نظمیں میرے مشروط یا پھر committed ذہن کی پیداوار ہیں۔میں نام نہاد غیر مشروط ذہن کی غیر مشروط شاعری کا قائل نہیں۔اس لئے نہیں کہ یہ مجھے پسند نہیں۔بلکہ اس لئے کہ میری نظر میں جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے والے سادھو سنتوں کے یہاں بھی کلی غیر مشروطیت کا وجود ناممکن ہے۔''

بات صحیح ہے یا غلط، مگر خلیل مامون نے اپنا ادبی موقف کسی الجھاؤ اور ابہام کے بغیر صفائی کے ساتھ سامنے رکھ دیا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ورنہ ہمارے آج کل کے ادیب اور نقاد، پر اسرار و ناقابل تشریح اجنبی اصطلاحات وعلامات کا استعمال کرتے ہوئے کچھ ایسے استعاروں میں بات کرتے ہیں کہ وہ سوچتے ہیں ایک بات، لکھ دیتے ہیں کوئی دوسری بات اور پڑھنے والا اس سے کوئی تیسرا مطلب نکال لیتا۔اور پھر نقاد بھی ہے۔وہ کوئی چوتھا ہی شوشہ چھوڑ دیتا ہے۔آج کل اردو ادب ایسے ہی چل رہا ہے۔جو آدھا سمجھ میں نہ آئے وہ اچھا ادب ہے۔اور جو پورا سمجھ میں نہ آئے وہ اعلیٰ ترین۔

لیکن خلیل مامون کی شاعری اتنی سیدھی سادی، سپاٹ اور زود فہم بھی

نہیں کہ آپ اسے بے ضرر کہنے لگیں۔ اس میں خیال وخواب کی ان کی اپنی ایک دنیا آباد ہے، جو زندگی، سماج اور پورے سلسلۂ کائنات کو خود ان کی نظر اور زاوئے سے دیکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ بقول شمیم حنفی:

''...یہ بہت ٹھہر ٹھہر کے، یک سوئی کے ساتھ پڑھی جانے والی شاعری ہے...جو ہمیں گم شدہ زمانوں کے علاوہ، آنے والے زمانوں کی خبر بھی دیتی ہے اور خلیل مامون کی آواز کو رفتہ و آئندہ، دونوں کا ترجمان بناتی ہے...''

'آفاق کی طرف' جیسا کہ خلیل مامون نے پیش لفظ میں بتایا ہے ان کی گزشتہ 37 برسوں میں کہی گئی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے کچھ نظمیں غالباً outdated یا فرسودہ ہیں۔ یہ بات بھی خود خلیل صاحب نے ہی بتائی ہے۔ اگر وہ ان نظموں کی نشان دہی بھی فرمادیتے کہ کن صفحات پر چھاپی گئی ہیں تو مجھ جیسے کم علموں کی بھی رہنمائی ہو جاتی۔ کیونکہ مجھے تو ڈھونڈنے پر بھی وہ نظمیں نہیں ملیں۔

مجموعے میں ان کی بارہ غزلیں بھی شامل ہیں جنہیں پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بنیادی اور کلی طور پر نظموں کے شاعر ہیں۔ اگر چہ ان غزلوں میں کئی اچھے اچھے شعر بھی ہیں۔ مثلاً:

مصروفِ غم ہیں کون و مکاں جاگتے رہو
خوابوں سے اٹھ رہا ہے دھواں جاگتے رہو
دل میں خیال ہے نہ نظر میں سوال ہے
باقی نہیں ہے کوئی نشاں جاگتے رہو
آکر قریب دور بہت جاچکے ہیں ہم
لگتا ہے اپنے آپ سے اکتا چکے ہیں ہم

لیکن ان کے اصل جوہر نظم میں ہی کھلتے ہیں۔ صرف ایک نظم ملاحظہ ہو:

کام یاروں کا

اردو کا کھانا تھا چوراہے پر
دستر خوان بچھا تھا
بریانی تھی، تنجن تھا
بیگن کا سالن پکا تھا
سبھی جمع تھے
شاعر اور متشاعر رونے اور رلانے والے گانے والے
میں بھی تھا
(میں نے تھوڑی سی پی جو رکھی تھی)
ٹوٹ پڑے سب کھانے پر ایسے جیسے
سب کو ہوکا تھا
میں نے بھی سیراب کیا آنتوں کو
ایسے جیسے جنم جنم کا بھوکا تھا
کھاتے کھاتے جانے کیوں
ماں کے چہلم کی یاد آئی تھی

مجموعے کی طباعت اتنی عمدہ ہے کہ پڑھنے کے علاوہ شیلف کو سجانے اور ڈرائنگ روم کی میز پر رکھ کر مہمانوں کو مرعوب کرنے کے کام بھی آسکتا ہے۔

صفحات: 416 قیمت: 360 روپے

اَفلاک پبلکیشنز، وہائٹ ہاؤس، نیو بنک کالونی، بلال آباد، گلبرگہ 585104

اردو صحافت کا سفر/ گربچن چندن

اردو صحافت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ وابستہ مشہور مصنف گربچن داس چندن جنہیں اردو والے اپنی سہولت کے لئے جی ڈی چندن کہہ کر یاد کرتے ہیں پچھلے کچھ عرصے سے نہ اردو کی محفلوں میں نظر آرہے تھے نہ پریس کانفرنسوں میں۔ یہ دیکھ کر پتہ نہیں کیوں کبھی میری دائیں اور کبھی بائیں آنکھ پھڑ کنے لگتی۔ دل میں برے برے اور ڈراؤنے سے خیالات آنے لگتے اور میں سوچتا تھا یا الٰہی خیر، اپنے حفظ وامان میں رکھیو، کہیں چندن صاحب کوئی کتاب نہ لکھ رہے ہوں۔

مگر کیا کیجئے وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی ہمارا یہ اندیشہ بھی حسب معمول درست نکلا۔ اللہ میاں کو ہم میں نہ جانے ایسی کیا خاص دل چسپی ہے کہ کبھی کوئی امید صحیح نہ نکلی اور کبھی کوئی اندیشہ غلط ثابت نہ ہوا۔ مثلاً پچھلے چناؤ میں امید تھی کہ نریندر مودی کو شکستِ فاش ہوگی۔ لیکن غلط نکلی۔ اس کے برعکس اندیشہ تھا کہ جارج بش جیت جائیں گے۔ اور وہ اتنا صحیح نکلا کہ آج پوری دنیا بھگت رہی ہے۔ کبھی کبھی تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ذاتِ باری خاص ہمیں ستانے کے لئے یہ سب کچھ کرتی ہے۔ خیر اب اُسے کون سمجھائے۔

ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ چار سو سے کچھ ہی کم صفحات کی ایک موٹی تازی وزنی کتاب ڈاک سے چلی آرہی ہے۔ دیکھتے ہی ماتھا ٹھنکا۔ چندن صاحب کی یاد آگئی اور پیکٹ کھول کر دیکھا تو اس میں واقعی ان ہی کی کتاب تھی۔ یعنی یہ اندیشہ بھی درست نکلا۔

چندن صاحب میں ایک عیب یہ ہے کہ اردو زبان اور صحافت کو انہوں نے اپنی کمزوری نہیں بلکہ دکھتی رگ بنالیا ہے۔ جہاں کسی نے اردو کو یا اس کی صحافت کو کچھ کہا اور اس کی شان میں ذرا سی بھی گستاخی کی تو یہ فوراً قلم دوات لے کر اس پر پل پڑتے ہیں۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہی نہیں بلکہ کھانا، پینا، پلنگ صوفہ اور کوٹ پتلون بھی وہی ہے۔ جسے بھی اردو سے محبت کرتے دیکھیں گے دن رات اس کی خیریت پوچھ پوچھ کر بے چارے کا جینا دشوار کردیں گے۔

مگر خیر، اردو صحافت پر یہ کتاب انہوں نے بڑے معرکے کی لکھی ہے۔ مجھے امید نہیں بلکہ سوفی صد قوی اندیشہ ہے کہ سو سال بعد بھی کوئی اردو صحافت کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو اس کتاب کی ضرورت اسے بالضرور پڑے گی۔ اور آپ جانتے ہیں میرے اندیشے کبھی غلط نہیں نکلتے۔

چندن صاحب کی یہ تصنیف اردو صحافت کی تاریخ ہی نہیں اس کا جغرافیہ بھی بیان کرتی ہے۔ اردو کی صحافت کا کوئی گوشہ اور پہلو میرے خیال سے ایسا نہیں جس کا بیان اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ کتاب کے 18 اصل ابواب ہیں اور ایک باب ان ابواب کی انفرادی غرض وغائت اور کوائف بیان کرنے کے لئے الگ سے اپنے ڈاکٹر عقیل صاحب کو لکھنا پڑا ہے جو دہلی کی غالب اکیڈمی کے مرنجاں مرنج سیکریٹری ہیں۔ اور یہ بھی خاصہ طویل باب ہے۔ اتنا کہ فونٹ ذرا سا موٹا کر کے چھاپی جائے تو ڈاکٹر عقیل احمد کی ایک اور کتاب تیار ہو جائے۔

پریس ایکٹ ہو یا جنگِ آزادی میں اردو صحافیوں کی قربانیوں کی بات انیسویں اور بیسویں صدی کی اردو صحافت کے معاملات ہوں یا اکیسویں صدی میں صحافیوں اور صحافت کو درپیش مسائل ہر مضمون میں چندن صاحب نے معلومات کے دریا بہا دیے ہیں۔ کل ملا کر کتاب اس قدر معلوماتی ہے کہ خادم کو بھی اپنے بارے میں کئی باتوں کا علم اسی کتاب سے ہوا۔ 'اردو صحافت میں مزاحیہ کالم نگاری' والے مضمون میں چندن صاحب نے خادم یعنی راقم الحروف کے بارے میں ایسے حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں کہ میں خود انگشت بدنداں رہ گیا۔ اور اس قدر رہا کہ انگلی دکھنے لگی۔ یوں معلومات کے اس دریا میں انہوں نے پتہ نہیں کتنوں کو بہا دیا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اردو کے بڑے سے بڑے عالم کو بھی کوئی نہ کوئی نئی بات اردو صحافت کے بارے میں اس کتاب سے ضرور معلوم ہو جائے گی۔ نہ ہو تو وہ صاحب مجھ سے کتاب کی قیمت واپس لے لیں۔ (کتاب کی خریداری کا اصل کیش میمو ضرور ساتھ لائیں۔ نیز کتاب اچھی حالت میں ہو اور اس کے صفحات پر دھوبی اور کپڑوں وغیرہ کا حساب کتاب لکھا ہوا نہ پایا جائے)

صفحات: 388 **قیمت:** 350 روپے

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ 110006

سہ ماہی درون دہلی / اشہر ہاشمی

اشہر ہاشمی کو میں عرصے سے جانتا ہوں اور مجھے شروع سے ہی شبہ تھا کہ یہ آدمی زندگی میں کوئی بڑی حماقت ضرور کرے گا۔ قومی آواز میں سات آٹھ برس ساتھ رہا، کئی شامیں ساتھ بیٹھ کر برباد بلکہ خراب کیں، ایک دوسرے کے شعر سن سنا کر ان میں کیڑے مکوڑے نکالے۔ پھر بھی کوئی سدھر نہیں سکا۔ پیشے سے صحافی، شوق سے شاعر اور افسانہ نگار، موج میں آئیں تو بلا کے نقاد اور وطنیت کے لحاظ سے بنگالی۔ یعنی وہ تمام عناصر خمسہ وشمسہ موجود جو کسی عظیم الشان حماقت کا محرک بننے کے لئے بالعموم درکار ہوتے ہیں۔ اور آخر وہ روز سعید حالیہ عید کے بعد آہی گیا جب ان کا سہ ماہی جریدہ 'درون' برائے مطالعہ سامنے آیا۔

آج کے دور میں بلکہ اب سے پہلے کے دور میں بھی کوئی معقول شخص ایسی حماقت کرتا تو صورۂ فاتحہ کے ساتھ لبوں پر غالب کا یہ مصرعہ بے اختیار آجاتا کہ: حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

اشہر کے ساتھ کیا ہوگا یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر رسالہ دیکھا تو یہ دیکھ کر دل بیچ بیچ دھک سے رہ گیا کہ یہ واقعی ایک ادبی رسالہ ہے۔ ورنہ مشہور ادبی رسالوں کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ بیش تر میں ادب کم ہوگا اور بے ادبی زیادہ ملے گی۔ ایڈیٹر سمیت بہت سے حضرات کو آپ ان میں کسی نہ کسی بڑے ادیب یا نقاد کے ساتھ بے ادبی کرتے ہوئے پائیں گے۔ جب کہ درون اس سے پاک ہے۔ یہ ضخیم شمارہ افتتاحی ہے اور اس کے بعد ان کا 100 صفحوں والے عام شمارے سہ ماہی نکالنے کا ارادہ ہے۔

سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ نوجوان یا تقریباً نوجوان ادیبوں کا یا آج کے ادیبوں کا رسالہ ہے۔ جو پیدا ضرور بیسویں صدی میں ہوئے مگر جیتے ہیں اکیسویں صدی میں۔ وہ ادیب اس میں تقریباً نادارد ہیں جن کا کافر بڑھاپا جوش پر آیا ہوا ہے۔

افسانوں کا گوشہ خاصا جاندار ہے مگر شاعری کا مجموعی طور پر تھوڑا سا کمزور اس لئے پڑ گیا ہے کہ محمد اعظم کی غزلیں اس گوشے سے باہر عقبی سر ورق پر چھاپ دی گئی ہیں۔ یہ غزلیں اگر اندر ہوتیں تو شائد مجھے شعری گوشے پر یہ جملہ لکھنے میں تامل ہوتا۔ اعظم ان شاعروں میں ہیں جنہیں میں پسند تو کرتا ہوں مگر احترام اور بھی زیادہ کرتا ہوں۔ وجہ یہ کہ اتنے ہولناک حد تک سنجیدہ رہنے والے حضرات سے میرا کم سابقہ پڑا ہے۔ بارہا ان سے علیک سلیک ہوئی مگر ان کی تعریف کرنے کی ہمت نہ جٹا سکا۔ اتنے سنجیدہ رہتے ہیں کہ لگتا ہے ذرا بھی تعریف سنیں گے تو مار بیٹھیں گے۔ پھر مجھے اس قدر کم گو حضرات سے گفتگو کی ٹھیک سے مشق بھی نہیں ہے۔

رسالے کی ترتیب و تہذیب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے منفرد look دینے کے لئے محنت تو خوب کی گئی لیکن رنگ نہیں لا سکی۔ ابھی اور سدھار کی گنجائش ہے۔ آخر میں صرف یہ کہ مجھے اشہر سے ہم دردی ہے۔ اردو کا ادبی جریدہ شائع کرنے والے ہر مدیر سے مجھے ہم دردی ہے۔ خود سے بھی۔ خدا ہماری مغفرت فرمائے اور دوزخ الفردوس سے بچائے۔ آمین۔

صفحات: 262 **قیمت:** 150 روپے

6/267، للتا پارک، فلیٹ نمبر 2 لکشمی نگر، دہلی۔ 110092

نوازش نامے

آپ کے خط

مراسلہ نگاروں سے گزارش ہے کہ تعریف میں غلو سے اور تنقید میں تعصب سے کام نہ لیں

■ آخر آپ نے خصوصی مطالعہ تیار کر ہی لیا۔ میں نے تو پہلے ہی معذرت کر لی تھی۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ مدیر کو ایسا ہی ضدی ہونا چاہئے۔ بچوں والی (پچاس سال پرانی) نظم 'شکوہ - جواب شکوہ' پتہ نہیں آپ نے کہاں سے ڈھونڈ نکالی۔ میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔ ان دنوں کلام اقبال زیر مطالعہ تھا اور اس کا اثر بھی ذہن پر تھا۔ زیادہ لکھنے سے قاصر ہوں۔

نیر مسعود، لکھنؤ

■ ادب ساز۔3 مل گیا۔ آج ہی ملا۔ بہت خوب صورت ہے اور اپنی شان پر برقرار ہے۔ شکریہ۔ روایت ہے کہ برتن خالی واپس نہیں کرتے۔ اس لئے، بے وجہ، ایک نظم ڈال رہا ہوں۔ آپ کا

گلزار، ممبئی

■ ادب ساز۔2 جو آپ نے 21 دسمبر کو روانہ فرمایا تھا مجھے 26 اپریل 2007 کو ملا۔ رسالہ ضخیم بھی ہے اور ہر پہلو سے بے حد وقیع اور معیاری بھی۔ آپ نے 'ادب

■ ادب ساز۔3 مل گیا۔ امید کرتا ہوں کہ منی آرڈر کے ذریعہ واپسی ڈاک سے آپ کو اس کی قیمت بھی مل گئی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے رسالہ کا انتظار رہتا ہے۔ یہ آپ نے صحیح کیا ہے کہ اردو کے پروفیسروں کو مفت شمارہ بھیجنے کا ارادہ اس بار ترک کر دیا ہے۔ اردو کی روٹی کھانے والے اردو رسالے خرید کر پڑھنا غیر مناسب سمجھتے ہیں لیکن انہیں اردو کے ہر بڑے چھوٹے رسالے کی حصول یابی کی تمنا رہتی ہے۔

ابھی پورا شمارہ نہیں پڑھا ہے۔ آپ کا اداریہ 'آداب' پڑھا ہے۔ خصوصی گوشے نکالنے کے لئے آپ نے جتنی محنت کی اس کا مجھے اندازہ ہوا۔ محترمی نیر مسعود صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ آپ کی کوئی مدد گوشہ نکالنے میں کر سکتے۔ نیر مسعود صاحب کی ادبی شخصیت محض افسانہ نگاری کی بدولت نہیں ہے۔ میں نے ان کی دو کتابیں 'تعبیر غالب' اور 'کافکا کے افسانے' آج سے بیس سال پہلے علی گڑھ میں پڑھی تھیں۔ میں اس زمانہ میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ایم فل کر رہا تھا اور ایم فل کے موضوع 'غالب کے نقاد' کے تعلق سے 'تعبیر غالب' پڑھی تھی۔ تعبیر غالب اور کافکا کے افسانے پڑھنے کے بعد میرے اوپر نیر مسعود صاحب کی علمیت کا رعب بیٹھ گیا۔ ان کے افسانے میں نے بعد میں پڑھے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے افسانوی اسلوب پر غیر شعوری طور پر فرانز کافکا کے اسلوب کا اثر چلا آیا ہے۔ اس لئے ان کے افسانے پہلی قرأت میں سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ نیر مسعود صاحب کی کتاب کا ہی کرشمہ تھا کہ میں نے کافکا کا کلیات خرید کر پڑھا۔ چنانچہ کہہ سکتا ہوں کہ عالمی ادب میں کافکا کے The Trial, The Castle اور Metamorphosis کا کوئی ثانی نہیں۔ کافکا ہر لحاظ سے منفرد و ممتاز فن کار تھا۔ نیر مسعود نے تحقیق و تدوین و تراجم کے کام پیش کئے ہیں جو اردو ادب پر احسان ہیں۔ انہیں تحقیق و تدوین کے کام کا شعور اپنے والد سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم سے وراثت میں ملا ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب 'ہماری شاعری' اردو میں کلاسک کا درجہ رکھتی ہے۔

'ادیبوں کے خطوط' والا کالم بند کر دیجئے۔ مجھے ایسا نہیں لگتا کہ یہ خطوط قارئین کے سامنے کوئی ادبی بصیرت پیش کرتے ہیں۔ جناب رفعت صاحب کے نام خطوط میں آل احمد سرور، اختر الایمان، روشن آرا حسن بانو، حسن رضوی وغیرہ کے خطوط کیوں شامل کئے گئے۔ کیا محض اس لئے کہ آل احمد سرور اور اختر الایمان اپنے عہد کے بڑے نقاد اور شاعر تھے اور روشن آرا حسن بانو ایک معمولی فلمی اداکارہ۔ دیکھئے ادبی خطوط کیا ہوتے ہیں اس کی مثال ماضی میں غالب، اقبال اور مولانا آزاد کے خطوط ہیں۔ زمانہ حال میں ساقی فاروقی زندہ ہیں۔ انہوں نے ن م راشد کو جو خطوط لکھے اور ن م راشد نے ساقی فاروقی کو ان کے خطوں کے جو جواب دیے، مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تمام خطوط آپ کو 'نیا دور' کراچی کے ن م راشد نمبر میں مل جائیں گے۔ مجھے ہنسی آئی سجاد ظہیر کا خط رفعت سروش کے نام پڑھ کر۔ ڈھائی سطری خط شامل کرنے کا کیا جواز تھا؟ کیا اس لئے کہ سجاد ظہیر اپنے وقت کے بہت بڑے ادبی رہنما تھے۔ نصرت بھائی آپ ایک بات دھیان میں رکھئے۔ 'ادب ساز' کو آپ ایک سنجیدہ علمی و ادبی رسالہ بنانے جا رہے ہیں۔ تو اس قسم کی ہلکی تحریریں 'ادب ساز' کو ہلکا کر سکتی ہیں۔ میں ایسا ہوتا دیکھنا نہیں چاہتا۔

آپ کے رسالے میں بعض تحریریں دوبارہ اشاعت پذیر ہوتی ہیں۔ اطہر فاروقی کا تبصرہ 'کتاب نما' میں چھپ چکا تھا اس کو دوبارہ 'ادب ساز' میں شائع کرنے کا کیا جواز تھا؟ تو پھر سرور الہدیٰ کا بحث انگیز مضمون جو باقر مہدی پر 'کتاب نما' میں چھپ چکا ہے، 'ادب ساز' کے گوشۂ خراج عقیدت میں کیوں نہیں شائع کیا گیا۔

دیگر چیزوں میں وزیر آغا اور قمر رئیس و وارث کرمانی کے مقالے بہت پسند آئے۔ وزیر آغا صاحب نے کنج ہیرو کی کہانی میں پوری زندگی کے علمی تجربات کو نچوڑ دیا ہے۔ وزیر آغا کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ آج کے دیو پیکر نقاد، دانش ور اور شاعر ہیں۔ وارث کرمانی صاحب نے غالب اور بیدل کی تفہیم کے سلسلے میں چند بڑی عمدہ باتیں لکھی ہیں۔ ستیہ پال آنند کی قطعہ نما غزل کیا چیز ہے؟ واللہ اعلم! آخری قطعے کے تیسرے اور چوتھے مصرعے میں سنیں اور سکیں ہونا چاہئے تھا۔ میں اسے کمپوزنگ کی غلطی یا پروف چھوٹ جانے کا سہو نہیں سمجھتا۔ اور جو بات سمجھ میں آتی ہے کربناک ہے۔ غزل کے باب میں ستیہ پال آنند سب سے پہلے ہیں، افسوس اور حیرت کی بات ہے۔ ساقی فاروقی، سید امین اشرف اور زبیر شفائی کو سب سے پہلے ہونا چاہئے تھا۔ لیکن غزلوں کا اصلی مزہ شاہد اسحاق، نعمان شوق، خالد عبادی وغیرہ کی غزلوں میں محسوس ہوا۔ شوکت صدیقی کے ناول 'خدا کی بستی' کا تجزیہ عمدہ ہے۔

جمال اویسی، دربھنگہ، بہار

ساز" "شب خون" اور "فنون" جیسے نظریہ ساز اور عہد آفریں رسائل کی پیروی میں نکالا ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آپ اپنی کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ عہد حاضر کے تمام ہی معتبر اور مقبول قلم کار موجود ہیں۔ چار سو چھتیس صفحات پر بچھی ہوئی سب ہی تخلیقات پڑھنے میں کافی وقت لگے گا۔ ابھی میں نے کچھ مضامین اور افسانے دیکھے ہیں۔ مضامین بے حد معیاری ہیں۔ افسانے بھی جو پڑھے ہیں پسند آئے۔ ایک بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ حسین الحق کا افسانہ میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ کیونکہ وہ دو بار پہلے بھی چھپ چکا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ کم از کم افسانے آپ غیر مطبوعہ شامل کیا کریں۔

بہر نوع میں آپ کو اتنا جامع اور شاندار رسالہ نکالنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اور رسالے کی مزید کامیابی اور درازی عمر کے لئے دعا کرتا ہوں۔

ش صغیر ادیب، لنکاشائر، برطانیہ

■ خدا آپ کو صحت مند رکھے اور آپ کا رسالہ خوب سے خوب تر کی منزلیں طے کرتا جائے اور نیک نامیاں آپ کے قدم چومتی رہیں۔ میرا اب ضعیفی کی وجہ سے لکھنا پڑھنا کم ہو گیا ہے۔ گھر سے باہر بھی کبھی کبھار نکلتا ہوں۔ بس آپ کے لئے دعا کر سکتا ہوں۔

عبدالقوی دسنوی، بھوپال

■ کچھ روز سے میں اپنے مخدوم فطرت انصاری مرحوم کا یہ شعر کچھ زیادہ ہی پڑھنے لگا ہوں:

جانے اب کون سی منزل میں ہیں ارباب جنوں
دشت میں دور تک آواز سلاسل بھی نہیں

اس بات کا مگر دوسری بات سے کچھ نہیں لینا دینا: معاصر اردو ادب کے بارے میں (بشمول اردو کی ادبی صحافت کے) میں جس سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دیتا ہوں اس سے مجھے اپنے تعلقات (خواہ کتنے بھی قریبی کیوں نہ ہوں) بچانے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں ان خیالات کو یہاں نہیں دوہراؤں گا۔ کہنے کی بات مگر یہ ہے کہ مجھے ادب ساز میں پڑھنے کو اتنا کچھ مل جاتا ہے کہ میں اس مقتدر مجلّے کا انتظار، اس ذہنی کیفیت کے باوجود کرتا ہوں جس کی ترجمانی فطرت صاحب مرحوم کے شعر میں ہوئی ہے۔

جس طرح کسی معاشرے کی جڑیں آسمان میں نہیں ہوتیں اسی طرح کوئی ادبی جریدہ معاصر ادب کی اشاعت کے بغیر کیوں کر جاری رہ سکتا ہے؟ اس کا اطلاق ادب ساز پر بھی ہوتا ہے۔

شمارہ 3 اپریل تا جون میں مجھ ایسے بدذوق کے لئے بھی پڑھنے کو بہت کچھ ہے۔ نقادوں کے افسانہ نگار نیر مسعود پر بہت سے صفحات سیاہ کرنے والے آپ اکیلے نہیں۔ میں نے سنا تھا کہ ان کے افسانوں میں معنی کی تہیں ایک قرأت میں نہیں کھلتیں لیکن 'کتاب داز' کی تو پانچ قرأت میں بھی نہیں کھلیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز کے دیباچے میں مولانا اشرف علی تھانوی کے حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اہم چیز سیاق و سباق نہیں بلکہ مواد کی موجودگی ہے۔ آپ کی محبت اور اردو نقادوں کے رعب میں میں نے پورا گوشہ پڑھا، اور تکنیک کے ان لمحوں میں اختر الایمان نے راہ دکھائی:

ذہن سرکش ہے بھلا ہار کہاں مانتا ہے

حسن جمال کا افسانہ 'مسجد سے جہنم تک' مجھے تو بہت اچھا لگا، محمد حسن عسکری کی لغت کی رائے آپ کو معلوم ہو گی۔ حسن منظر کا سفرنامہ کبھی میری بھی ان کی دلّی تو بار بار پڑھنے میں دل لگا۔

ادب میڈیا اور سماج کے مثلث میں اردو کی سیاسی صحافت بھی سماج کے حوالے سے فیصلہ کن حد تک اہم ہے۔ تعجب ہے اب تک آپ کی نظر ادھر نہیں گئی جب کہ وہ تو آپ کا اپنا میدان ہے۔ اردو کی سیاسی صحافت نے بمع ادب، اُس تمام معاشرے کا جس کا لفظ اردو سے کچھ بھی تعلق ہے، جس شقاوت کے ساتھ گلا ریتا ہے اس کی طرف بھی تو التفات کیجئے۔ آپ کی توانائی سلامت رہے، اور حوصلہ قلم و خواہش رقم باقی۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی، نئی دہلی

■ پرچہ ملا۔ تخلیقات شائع کرنے کا شکریہ۔ بس ذرا نظم 'شعاعوں کا سفر' (صفحہ 326) کے پہلے ہی مصرعہ میں 'نفس نفس سے نوائے غم کی عجیب لہریں ابھر رہی ہیں' کی جگہ 'ہوائے غم' چھپ جانے سے جیسے پوری نظم کی ہوا ہی نکل گئی ہے۔ اگلے شمارہ میں اس کی تصحیح چھپ جائے تو اچھا ہے۔

تیسرے شمارہ کی غیر معمولی تاخیر نے ہم جیسے نصرت نوازوں کی کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہر حال شمارہ۔ 3 ہاتھ میں آتے ہی ساری کلفت جاتی رہی۔ یہ بھی پڑھ کر یک گونہ اطمینان ہوا کہ موجودہ صورتِ حال میں خسارہ قابل برداشت حدود میں ہے اور اس میں تھوڑی سی کمی بھی آئی۔ خدا کرے یہ خسارہ آگے اور بھی کم سے کم ہوتا جائے۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ پروفیسر حضرات کو اعزازی کاپیاں بھیجنے کا سلسلہ بند کر دیا۔ کاش دوسرے رسائل بھی اسے Follow کریں۔ اعزازی کاپیاں حاصل کرنے کے لئے یہ معزز حضرات اتنے بے چین رہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک عدد اخبار بھی خرید کر پڑھنا عزت نفس کے خلاف سمجھتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ رویہ کب بدلے گا۔

جبر کی اک داستاں ہے ہر طرف
ایک جیسا ہی جہاں ہے ہر طرف

کیا حسب حال شعر کہا ہے بھئی واہ! مبارک ہو۔ پوری تفسیر بیان کر کے رکھ دی۔ آپ کے اندر ایک خوب صورت اور خوش فکر شاعر موجود ہے اس کا ہمیں پتہ نہ تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔

اطہر عزیز، ممبئی

■ شمارہ نمبر 3 موصول ہوا۔ عنایت ہے۔ بہت ہی معیاری شمارہ ہے۔ نیر مسعود صاحب کا خصوصی مطالعہ قابل ذکر ہے۔ فہمیدہ ریاض پر مضامین بہت عمدہ ہیں۔

اجے مالوی، الہ آباد

■ امید ہے کہ آپ ادب سازی میں مصروف ہوں گے گو کہ اس دور بلاخیز میں ادب سازی بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ ساز اور ادب دونوں ایک دوسرے سے کچھ الگ ہو گئے ہیں۔ بہر حال 'لگے رہو منا بھائی!' چنانچہ آپ بھی ادب سازی میں لگے رہئے۔

ابھی عزیز دوست ڈاکٹر تاتار خان صاحب سے ملاقات ہوئی آپ سے ہوئی فون پر بات کا ذکر رہا۔ تاتار خان ادب پر ادبی نظر رکھتے ہیں۔ خصوصاً ڈراموں پر بہت کام کیا ہے مضامین بھی لکھے ہیں خوب چھپے بھی ہیں اب تازہ مضمون 'ادب ساز' کے لئے بھیج رہے ہیں امید ہے کہ پسند فرمائیں گے۔ اس خاکسار پر بھی مضمون روانہ کیا تھا جو جغادری قلم کاروں کے قلم کی آواز سے اچھا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔ اب اگر آپ پچھلے پتہ پر دریافت کر لیں تو مل جائے گا کہ آج کل دریافت ہی اس عہد کا موسم ہے۔

مظہر الزماں، حیدرآباد

■ ادب ساز 3 موصول ہوا۔ شکریہ! ہمارے شہر کے ایک بدنام ترین شاعر اور نقاد کا یہ قول ہے کہ جو حضرات رسالے کے مدیر کو خط لکھتے ہیں وہ نام و نمود کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ مضامین لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے اپنا غبار نکالنے کے لئے خطوط کا سہارا لیتے ہیں۔ شاید اسی لئے موصوف کا کسی رسالے میں کبھی کوئی خط نظر نہیں آتا۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

مدیر کو اپنے تاثرات لکھنا میں اخلاقی فریضہ سمجھتا

ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مدیران کس عرق ریزی اور جاں فشانی سے اپنے رسالے منظر عام پر لاتے ہیں۔ اگر ہم ان کی پذیرائی نہیں کر سکتے، تو کم از کم رسید سے ضرور نوازنا چاہئے۔ قاری اور مدیر کے مابین یہ فریضہ رابطے کا کام کرتا ہے۔ خاموش رہنے میں کوئی بڑائی نہیں ہے۔

لہٰذا اس خط کو بطور رسید سمجھئے کیونکہ ابھی میں 'ادب ساز' جستہ جستہ پڑھ رہا ہوں۔ اولین تاثر یہی ہے کہ یہ شمارہ بھی حسب معمول خوب ہے۔ بلکہ بہتر۔ نیر مسعود صاحب میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانے میں نے اپنے رسالے میں شائع کئے اور دیگر رسائل میں شائع کرائے۔ خدا کرے، وہ جلد صحت مند ہو جائیں۔ آپ نے ان کا بھرپور تعارف پیش کر دیا ہے۔ پچھلے دنوں ساہتیہ اکادمی کے رسالے کے لئے مجھے ان کے تعارف کی ضرورت پیش آئی۔ مگر بوجہ مجبوری نیر صاحب نے معذرت کر لی۔

اطہر فاروقی صاحب خوب لکھتے ہیں اور مدلل لکھتے ہیں۔ اس شمارے میں بھی ان کے مضامین قابل توجہ ہیں۔ وارث کرمانی صاحب کا کیا کہنا۔ ان کی نثر کی تاثیر منہ بولتی ہے، موتی رولتی ہے۔ غالب پر ان کا مضمون میری توجہ کا مرکز بنا۔ اس شمارے میں آپ نے مجھ حقیر و فقیر کی کہانی میں شائع کر دی۔ آپ کی عنایت، ورنہ اس دھرتی پہ ابھی ایسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا، جو میرے لکھے کو پسند کر سکے۔ جو حال میرا ہندی میں ہے وہی حال اردو میں ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ادب کے میدان میں کیوں ہوں؟ برسوں سے گول گول گھومے جا رہا ہوں، اور بال کھلاڑیوں کے پیروں میں ہے۔ آپ اس شخص کی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے، جس کے پاؤں بال کو ترستے ہیں اور گول اوجھل! خیر! میں جو کہنا چاہتا تھا کہ اس کا لب لباب یہ ہے کہ خطوط کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ اپنے تجربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ ہندی سماج کا حال بہت برا ہے۔ وہاں بھی رواں باون گز کے ہیں۔ گذشتہ 13 برسوں میں اپنے رسالے کی سینکڑوں کاپیاں اعزازی طور بھیجا کرتا تھا مگر تاثرات کو تو چھوڑیے، رسید تک نہیں ملتی۔ چنانچہ پچھلے شمارے سے اعزازی کاپیاں بھیجنا ترک کر چکا ہوں۔

حسن جمال، جودھپور، راجستھان

■ 'ادب ساز' میرے جیسے تشنۂ علم کے لئے آتشیں سرابوں میں چشمۂ آب خنک و شیریں ہے۔ مجھے پہلی بار اس کے دیدار سے مسرت ہوئی۔ جستہ جستہ دیکھ لیا ہے تفصیلی مطالعے کے بعد اپنی رائے لکھوں گا۔ اس خط کو پانگی کی رسید سمجھیں۔ آپ برابر اسی پتے پر مجھے 'ادب ساز' ارسال فرماتے رہیں رقم ادا ہوتی رہے گی۔

ہاں ایک شکایت ضرور ہے کہ آپ نے برادرم زبیر شفائی سے متعلق میرا مضمون تبصروں کے حصے میں شائع کر دیا۔ زبیر شفائی کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے میں نے ان کی غزل پر ایک مضمون لکھا تھا۔ وہ میرے بہت اچھے دوست ہیں یہ میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔ بہر حال بے حد ممنون و متشکر ہوں کہ آپ نے میرے مضمون اور غزلوں کو ادب ساز میں جگہ عنایت فرمائی۔

عشرت ظفر، کانپور

■ فون پر آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ کیوبا پر حملہ کرنے جا رہے ہو۔ چلو یوں ہی سہی۔ واپسی پر لندن رکنے کی سوچ رہے ہو۔ اس بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی۔

اطہر فاروقی صاحب نے اپنے دو مضامین بندے کو ارسال کئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا شائد علم نہیں ہے کہ 'ادب ساز' مجھ تک پہونچتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر فاروقی کا شکریہ۔ دیرینہ شناساؤں میں سے ہیں۔

جتیندر بلّو، لندن

■ میری نظر میں 'ادب ساز' برصغیر ہندو پاک کی ادبی تاریخ میں ایک اہم دستاویز ہے جس میں دونوں ملکوں کے ادبا، شعرا اور ان کی تخلیقات کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے اس مقام پر آپ کے ادبی ذوق اور شوق بلکہ دیوانگی کی داد بار بار دینے کو دل کرتا ہے۔ جس معیار اور تعمیرانہ اقدام سے 'ادب ساز' کا اجرا عمل میں آیا وہ اپنی مثال آپ ہے اس کا کوئی بدل نہیں۔ اتنے معیاری و ضخیم جریدے کو پڑھنے کے لئے بھی کافی وقت درکار ہے۔ اس لئے یہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ پھر بھی جہاں تک ادب ساز۔2 پڑھ سکا ہوں اس کے متعلق چند سطور پیش خدمت ہیں۔

مرحوم احمد ندیم قاسمی کو خراج عقیدت آپ کی اردو زبان و ادب سے بے پناہ محبت اور غیر جانبداری کا اعلیٰ مثال ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون 'ولی دکنی: شاعر انسانیت' محبت، تصوف، بھی قابل ستائش تخلیق ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کاوش 'اردو ادب کی جعلی تحریریں' اپنی نوعیت کی دلچسپ اور کامیاب سعی ہے۔ 'استعارہ کیا ہے؟' ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب نے بڑی محنت اور گہرے مطالعہ کی روشنی میں سپرد قلم کیا ہے۔ 'ادب ساز' کی کس کس تحریر اور تخلیق کا ذکر کروں۔ تمام کا تمام جریدہ معیاری اور معتبر تخلیقات سے بھرا پڑا ہے۔ نثر ہی نہیں شاعری بھی کم معیار کی نہیں۔ جن چند نامور شعرا کے غزلیہ کلام نے متاثر کیا ان میں حیات لکھنوی، شجاع خاور، مخمور سعیدی، عبدالاحد ساز، پرتپال سنگھ بیتاب، شین کاف نظام، نسرین نقاش، سلیمان خمار، رضا امروہوی اور نصرت ظہیر قابل تحسین اور قابل ذکر ہیں۔

باب نظم آپ نے ڈاکٹر وزیر آغا کی نذر کیا ہے۔ یہ بھی ایک قابل قدر طرح ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے مستحق بھی ہیں۔ اردو ادب میں ان کا اپنا کام اور مقام قابل صدر احترام ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، اسحٰق بدر، علی ظہیر، اشہر ہاشمی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، شارق عدیل اور جناب مشرف خطیب کی تخلیقات نے زیادہ متاثر کیا۔ آخر میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ادب ساز میں 'ادیبوں کے خطوط' آپ کی 'بھولنے کی بیماری' سنیما، موسیقی اور 'اس انجمن میں...' گوشے قائم کر کے آپ نے اپنی ذہانت اور تنظیمی صلاحتوں کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

سوہن راہی، سرے، انگلینڈ

■ ادب ساز کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آئندہ شماروں سے آپ کا ارادہ خصوصی مطالعوں کو تھوڑا مختصر کرنے کا ہے۔ میرے خیال میں اگر ہر ماہ صرف ایک ادیب پر گوشہ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ نیر مسعود پر گوشہ اس شمارے کی جان ہے۔ بھی مضامین عمدہ ہیں۔ خاص طور پر شافع قدوائی 'عتیق اللہ' اور شمیم حنفی کی تحریریں متاثر کرتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کا خصوصی مطالعہ بھی لائق مطالعہ ہے۔ صغرا مہدی، خالدہ حسین اور ظفر عدیم نے عمدہ مضامین لکھے ہیں۔

باب غزل میں مظفر حنفی، ساقی فاروقی، جعفر ساہنی، مراق مرزا، ارمان نجمی، رؤف خیر، خورشید اکبر، ارشد کمال، نصرت ظہیر اور عطا عابدی کی غزلیں پسند آئیں۔ باب افسانہ بھی خاصہ جاندار ہے۔ بھی افسانے خوب ہیں۔ آخر میں ایک گزارش یہ ہے کہ مکتوبات کے کالم کو غلاظت کا ٹوکرا نہ بنائیں۔

اقبال حسن آزاد، مونگیر

■ آپ نے اپریل جون 2007 کے شمارے میں میرا مضمون 'پریم چند اور زبان کا مسئلہ' شائع کیا ہے۔ اس نوازش کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس مضمون میں کچھ غلطیاں رہ پا گئی ہیں جن کی تصحیح کر دیں تو عنایت ہوگی۔ یہ تسامحات یقیناً مجھ سے سرزد ہوئے ہوں گے مگر پھر بھی ان کی تصحیح ہو جائے تو اچھا ہے۔ مثلاً صفحہ نمبر 91 پر ایک جگہ 'مشہور مورخ ولیم ہنٹر' شائع ہو گیا ہے جب کہ یہاں گینٹ ول

اشعر، ہونا چاہیے۔ اسی صفحے پر پریم چند کا سال وفات 1938 شائع ہو گیا ہے جب کہ اسے 1936 ہونا چاہیے۔ صفحہ نمبر 93 پر یہ جملہ ہے "مگر اردو کو پوری دیدہ دنی سے پاکستان کی قومی زبان بنا دیا گیا" اس فقرے میں دیدہ دنی نہیں دریدہ دہنی ہونا چاہیے۔ اسی طرح صفحہ نمبر 95 پر بابو بودھی بلھہ پنت چھپ گیا ہے جب کہ اسے بابو بودھی بلبھ پنت ہونا چاہیے۔

اس شمارے میں ڈاکٹر اطہر فاروقی کا مضمون 'ہند پاکستان میں معاصر اردو زبان و ادب اور مسلم اساس پرستی' بے حد عمدہ مضمون ہے۔ ہندستانی مسلمانوں سے پہلی دفعہ کسی نے اتنی بے باکی سے یہ کہا ہے کہ اگر وہ ترقی پسند سیاست کے کھلے ہم نوا نہ ہوئے تو اکثریتی ہندوانا سے ہندستان میں مسلمانوں کا تصادم کسی کو کہیں کا نہیں رکھے گا۔ 'متنازعہ فیہ' کے تحت جناب اظہار اثر صاحب کا مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے تعلق سے مجھے مصنف کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مضمون بہت معمولی درجے کا ہے۔ اسٹبلشمنٹ کو چیلنج کرنے کے لیے (خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی) جس وسیع مطالعے اور زبان پر جس حاکمانہ قدرت کی ضرورت ہوتی ہے ان دونوں سے اظہار اثر صاحب بھی وزیر آغا اور انور سدید کی طرح محروم ہیں۔ آپ کو اس نوعیت کے مضمون کے لیے اعجاز احمد سے درخواست کرنی چاہیے تھی۔ اردو شاعری کا مزاج پر وارث علوی کا ایک بہت عمدہ تبصرہ شائع ہو چکا ہے جو ان کی کتاب خندہ ہائے بیجا میں بھی شامل ہے۔ اظہار اثر اس کو دیکھ لیتے تو یہ مضمون شاید کچھ بہتر ہو جاتا۔

ڈاکٹر جاوید رحمانی، نئی دہلی

■ ادب ساز 3 کی محض رسید کے طور پر چند سطروں میں اپنا فوری خوشگوار تاثر پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں ورنہ اس سمندر کو قطرہ قطرہ کھنگالنے میں کم از کم اتنا وقت ضرور لگ جائے کہ ایک دوسرا سمندر شمارہ 4 کی صورت میں آن دھمکے۔ بہر حال زیر نظر شمارے کے تعلق سے عرض ہے کہ اداریے اور سمینار سے گزرتے ہوئے آپ کی سیدھی بات توجہ کے ساتھ پڑھی۔ ہر ہر لفظ جی کو لگا۔ ہر بات قابل قبول محسوس ہوئی کہ حقائق کے عین مطابق ہے۔ خراج عقیدت میں رسمی شرکت کے بعد فہمیدہ ریاض اور نیز مسعود پر خصوصی مطالعے کے لئے خصوصی مہلت نکالنے کا ارادہ کرتے ہوئے طویل تر باب غزل، باب افسانہ اور باب نظم سے ہو کر طنز و مزاح سے کچھ اکتساب لطف کیا۔ اظہار اثر کی انور سدید اور وزیر آغا سے اختلاف رائے کے معاملے میں الجھنا غیر ضروری سمجھتے ہوئے کہ ان دنوں میں خود دانش الہ آبادی کے سبق اردو ظفر ہاشمی کے گلبن اور کتاب نما وغیرہ رسائل میں جاری وساری اور سروست غیر مختتم، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی جیسے اکابرین کے درمیان متنازعہ بحث میں ملوث کیا جا چکا ہوں۔ لہٰذا اس سلسلے میں ادب ساز کے زیر نظر شمارے میں اطہر فاروقی اور جاوید رحمانی کے مضامین میری خصوصی توجہ کے مستحق رہے کہ میرے لئے چند نوبہ نو انکشافات کے ساتھ ساتھ میرے اس موقف کی تصدیق و تائید کا موجب بھی ہوئے کہ "اردو کو برسوں سے محض مسلمانوں کی زبان کہہ کر ان کے سروں پر تھوپنے کی سازش چل رہی ہے۔"

ڈاکٹر محبوب راہی، اکولہ، مہاراشٹر

■ ادب ساز۔ 3 ملا سراپا ممنون ہوں۔ یہ باوقار جریدہ علم و ادب کی شاہراہ کا سنگ میل ہے۔ آپ نے اس کا معیار بھی برقرار رکھا ہے اور ایک خوب صورت نوع سے بھی اسے ہم کنار کیا ہے۔ منیر نیازی پر (خراج عقیدت) اور خصوصاً فہمیدہ ریاض پر گوشہ بے مثال ہے۔ ادب ساز کا اب تک ہر شمارہ پہلے سے زیادہ وقیع اور بہتر ہے۔ مضامین افسانے اور شعری حصہ سب لاجواب ہیں۔ ابھی میں اسے پڑھ رہا ہوں۔ پورا ہو جانے پر مجموعی تاثر رقم کروں گا۔

آپ نے چوتھے شمارے کے لئے اعلان کیا ہے کہ 1857 سے متعلق خاص نمبر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ محفوظ رکھنے والی دستاویز ہوگی۔ اس کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔

عقیل شاداب، کوٹہ، راجستھان

■ آج ہی آپ سے فون پر گفتگو ہوئی۔ عرصہ ہوا مظہر الزماں خان پر ایک مضمون بھیجا تھا آپ سے معلوم ہوا کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔ آسمان، زمین، سمندر، پہاڑ، موسم، آوازیں، راستے اور خود کردار ایک علامت بن کر مظہر الزماں خان کی تخلیقات میں ملتا ہے۔ میرا خط اور اس خط سے منسلک مضمون 'علامتوں کا قلزم۔ مظہر الزماں خان' بھی ایک علامت بن کر پتا نہیں کہاں تحلیل ہو گیا۔ اگر ممکن ہوا تو اسے پھر کبھی بھجوا دوں گا۔

1857 پر آپ جو خاص نمبر شائع کرنے والے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے قوم آپ کی خدمت کی مشکور رہے گی۔

حیدر آباد کے کہنہ مشق جناب منجو قمر صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو کی ایما پر 1962 میں ایک ڈراما 'بہادر شاہ ظفر' لکھا تھا۔ حیدر آباد میں کئی بار پیش ہوا۔ راقم نے بھی اس میں کام کیا تھا۔ آج ہی اس ڈراما کے متعلقین سے بات کرتے ہوئے اس ڈرامے کو آپ کی خدمت میں بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر محمد تاتار خان، حیدر آباد

■ کئی ماہ قبل آپ کے کئی خطوط میرے نام آئے تھے۔ میں کیا بتاؤں اس وقت میں کتنا پریشان تھا۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کے خط کا جواب بھی نہیں لکھ سکا۔ دراصل میری اہلیہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہو گئیں سالوں تک علاج ہوتا رہا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا پھر اچانک ایک شب مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔ اس کے کچھ مہینوں بعد میری والدہ محترمہ اپنی بہو کی بے وقت کی موت سے اتنی دکھی ہوئی کہ وہ بھی ہم کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ ان تمام حالات کے پیش نظر میں آپ کے خط کا جواب بھی نہیں لکھ سکا۔ بہر حال جو خدا کو منظور تھا ہوا۔

کچھ دنوں قبل میں نے برادر محترم قبلہ مظہر امام صاحب سے آپ کے رسالے کے بارے میں بتایا تو انھوں نے آپ کا نیا پتہ دے کر ہدایت کی کہ آپ کو اپنا کلام اور کتابیں تبصرہ کے لئے روانہ کر دوں۔ 300 روپے کا ڈرافٹ میں جولائی کے پہلے ہفتے میں آپ کی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔

خالد رحیم، کٹک، اڑیسہ

■ آپ کا مایہ ناز رسالہ 'ادب ساز' میری نظروں سے گزرا۔ اتنا عمدہ اور ادبی رسالہ اردو میں آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ یہ ہم اردو والوں کا خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسا خدمت گار اردو زبان کو ملا۔ اللہ آپ کو صحت مند رکھے اور طویل عمر عطا فرمائے۔ آپ سے گذارش ہے کہ 'ادب ساز' کا آئندہ شمارہ مجھے ارسال فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ملاقات ہوئی تھی۔ 'ادب ساز' کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔

ڈاکٹر اے جے مالوی، الہ آباد

■ 'ادب ساز' کا دبیز، وقیع اور Impressive شمارہ۔ 3 موصول ہوا۔ آپ کا اعلان کہ اب 'ادب ساز' کی اعزازی کاپیاں نہیں بھیجی جائیں گی بے حد جرأت مندانہ، خود اعتمادی سے بھرپور اور حقیقت پسندانہ قدم ہے۔ میں اس سلسلے میں پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں کہ اردو کے تمام معیاری رسائل سفیران زبان و ادب کی حیثیت رکھتے ہیں اور اردو کی بقا کے لئے ان کا زندہ رہنا بے حد ضروری ہے۔ محبان اردو کو یہ بات پورے خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرنی چاہئے اور اس خوبصورت زبان کی بقا اور صحت مند ارتقا کے لئے 'ادب ساز' جیسے تمام معیاری اردو رسائل

کو ہر سطح پر مکمنہ تعاون سے نوازنا چاہیے۔

تازہ شمارے میں شامل میری پہلی غزل کے مقطع میں کمپوزنگ کی خامیاں راہ پا گئی ہیں صحیح شعر یوں ہے۔

کتنے سفاک ہیں جینے کے تقاضے سید
ہم نے دیکھا نہ کوئی خواب تو مر جائیں گے

آج کل سرقہ کی وبا ذرا عام ہوتی جارہی ہے جو تشویش کا باعث ہے۔ اس مسئلہ کے انسداد کے لئے کچھ عرصہ قبل جناب خلیق انجم نے اعلان کیا تھا کہ 'ہماری زبان' میں ایک مستقل کالم کا آغاز کیا جارہا ہے جس کے ذریعہ سرقہ کرنے والوں کی نشان دہی کی جائے گی۔ مگر بات آگے نہ بڑھی۔ سرقہ سے پاک کلام کا انتخاب بھی اہم مدیرانہ ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ میرا ایک شعر جو تقریباً پندرہ سال قبل 'بیسویں صدی' میں شائع ہوا تھا اور میرے تیسرے شعری مجموعہ 'کتنی حقیقت کتنا خواب' میں بھی شامل اشاعت ہے، کچھ یوں ہے:

زباں چپ ہے یہ خنجر بولتے ہیں
لہو آمیز منظر بولتے ہیں

صاحب ہم نے اپنی اخلاقی ذمہ داری پوری کردی۔ ڈھونڈیئے اب چراغ تہہ داماں لے کر۔ چلتے چلتے یہ بھی عرض کردوں کہ اگر تخلیقات کی ترتیب میں حفظ مراتب کا خیال بھی رکھا جائے تو رسالے کے وقار میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے اور سینئر قلم کار اطمینان کی سانس لے سکتے ہیں۔

سید شکیل دسنوی، کٹک، اڑیسہ

■ ادب ساز۔ 3 موصول ہوا۔ باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ۔ اس بار آپ کے اداریے کے چار پیروں میں درمیان کے دو پیرے گویا میں نے لکھے ہیں۔ میرے دل کی بات لکھ دی آپ نے۔ ادب تنقید میں تعصب مذہبی، سیاسی، سماجی، ذاتی، نسلی وغیرہ وغیرہ کئی قسم کا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے یہ دنیا جیسی ہے ویسی ہے۔ ہمارے آپ کے چاہنے سے بدلنے والی نہیں ہے۔ ادب ساز۔ 3 دیکھ کر آپ کی قابلیت کا زبردست قائل ہوگیا ہوں۔ ایک اور اچھی بات یہ ہے کہ آپ فضول قسم کی (غیر) ادبی بحثوں کو ہوا نہیں دیتے جیسے کہ آج کل زیادہ تر ادبی رسائل کر رہے ہیں۔ نزول ادب کا کام کرتے رہیے آپ کے حمایتوں کا دائرہ دن رات بڑھتا رہے گا۔

پہلے میرا ارادہ نہیں تھا اگلے شمارے کے لئے کچھ بھیجنے کا۔ لیکن ادب ساز۔ 3 کے مطالعے کے بعد میں اگلے شمارے سے باہر نہیں رہنا چاہتا۔ لہٰذا کچھ چیزیں بھیج رہا ہوں۔ دیکھ لیں ٹھیک ٹھاک لگیں تو اگلے شمارے میں شامل کرلیں۔ ادب ساز۔ 3 میں شامل میری پہلی غزل کے تیسرے شعر میں 'وقت' کی جگہ 'وصت' چھپ گیا ہے۔ پانچویں شعر کے دوسرے مصرعے میں 'کے' کا فالتو چھپ گیا ہے۔ ساتویں شعر میں 'تجھے' کی جگہ 'بجھے' چھپ گیا ہے۔ آٹھویں شعر میں 'تو' کی جگہ 'لو' چھپ گیا ہے۔

دوسری غزل کے پہلے شعر میں پہلا لفظ 'یہ' ہے جب کہ 'ہم' چھپ گیا ہے۔ ساتویں شعر کے دوسرے مصرعے میں 'ساعت' کی جگہ 'سارت' چھپ گیا ہے۔

میری پہلی نظم کے تیسرے مصرعے میں 'کوئی' کی جگہ 'کئی' چھپ گیا ہے۔ سترہویں مصرعے میں 'پر' خواہ مخواہ چھپ گیا ہے۔ میں 'پر' کو بمعنی 'لیکن' کبھی استعمال میں نہیں لاتا۔ دوسری نظم کے تیسرے مصرعے میں 'روزانہ' کی جگہ 'رازانی' چھپ گیا ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب، جموں

ان تمام غلطیوں کے لئے مدیر شرمسار ہے۔ مدیر

■ 'ادب ساز' کا دوسرا شمارہ مجھے ناصر عباس نیر صاحب کی وساطت سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہ رسالہ پورا نہ پڑھ سکا۔ کیونکہ اگلے ہی روز انہوں نے واپس منگوالیا۔ ان کی ایک طالب علم منشا یاد صاحب پر ایم فل کا مقالہ لکھ رہی تھی اور اسے اسی رسالے کی ضرورت تھی کہ اس میں منشا یاد صاحب پر آپ نے ایک بھرپور گوشہ شائع کیا تھا۔ اس تھوڑے سے وقت میں فوری طور پر جو تاثر بنا وہ میں نے اپنے کالم 'ادب در ادب' (ہفت روزہ 'ندائے ملت' لاہور) میں لکھ دیا ہے۔ اس کی فوٹو کاپی ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ جوگندر پال صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے خطوط میں میری حاضری بھی لگوادی۔

پہلے پرچے کی اشاعت سے پہلے مجھے آپ کا خط ملا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے لئے کوئی چیز نہیں ارسال کرسکا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آپ ایسا معرکے کا ندرت آفریں پرچہ نکالیں گے جس کی دھوم (چھپتے ہی) ادبی دنیا میں پھیل جائے گی۔ مبارک باد صد مبارک باد۔ 'ادب ساز' واقعی 'ادب ساز' ہے اور یہ ہزار ہا لوگوں کی ادبی ذہنی آبیاری کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی رہنمائی بھی کرے گا۔ مزاح نگاری سے ادبی ادارت کی طرف آپ کی پیش قدمی بہت اچھی لگی۔ آپ نے یہ شمارہ تخلیقی ذہن سے مرتب کیا ہے۔ مزید مبارک باد۔

انور سدید، لاہور، پاکستان

■ (مزید) 'ادب ساز' ہنگامہ خیز ثابت ہورہا ہے۔ کچھ لوگ پوچھ رہے تھے کہ اس کا زر سالانہ کس طرح بھجوائیں۔ اس کا طریقہ آپ نکالیں اور اگلے پرچے میں اعلان کردیں۔

انور سدید، لاہور، پاکستان

■ 'ادب ساز' پہلا پرچہ ہے جس کی قیمت آپ کو بھیج رہا ہوں ورنہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرا ذریعہ معاش صرف قلم ہے۔ وہ گھوڑے اور گھاس والا محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا لیکن چونکہ آپ کا پہلا پرچہ تھا اور میں نے آپ سے وعدہ کرلیا تھا اس لئے مبلغ 200 روپے کا چیک حاضر ہے اس امید کے ساتھ کہ آئندہ آپ مجھ سے ایسی توقع نہیں رکھیں گے۔ آج کل اردو کے پرچوں کی حالت خستہ ہے رائٹر کو کتنے رسالے معاوضہ دیتے ہیں یہ تو آپ کو بھی علم ہوگا۔ ہاں جو حضرات قلم کو روزی کا ذریعہ نہیں بناتے وہ چاہیں تو اردو رسائل کی مدد کرسکتے ہیں اور انہیں کرنا بھی چاہیے۔ بہر حال یہ دعا ضرور کرتا رہوں گا کہ آپ کا پرچہ مالی مشکلات سے دوچار نہ ہو۔

اظہار اثر، نئی دہلی

■ آپ کا مقتدر جریدہ 'ادب ساز' عین انتظاری کے عالم میں نظر نواز ہوا۔ شکریہ! آپ نے جس اہتمام سے میری غزل شائع کی ہے اس کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ آپ کے کرم خاص نے نہ صرف مجھے بلکہ ادب ساز کے ذہین اور باصلاحیت فنکاروں نے جس انداز سے تخلیقات پر بے باکانہ اور محبت بھرے انداز میں رائے دی ہے خصوصاً برادرم کرشن کمار طور نے، دراصل یہ سب تاریخ کا ایک حصہ ہے کہ کل ہم سب نہیں ہوں گے لیکن یہ محبت آمیز تحریریں ہمارے تعلق خاطر اور ربط ذہنی کے درخشاں نقوش بن کر زندہ رہیں گی۔ بس! ادب ساز کیا ہے اعلیٰ ترین قلم کاروں کی ایک کہکشاں سجی ہے۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ امید ہے کہ شگفتہ و کامراں ہوں گے۔

درد چاپدانوی، کانپور

■ محترم حضرت ضمیر، احترامات، مزاج ہمایوں

ادب ساز کو بڑے غور سے اور مزے لے کر پڑھا، سب نگارشات کے انتخاب اور ترتیب کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ واقعی آج کل اتنا ضخیم اور معیاری پرچہ نکالنا دل گردے کا کام ہے۔ میری طرف سے جملہ ارباب ادارت کی خدمت میں گلہائے تحسین و تبریک پیش کردیجئے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں کچھ ظریفانہ کلام ارسال کرتا ہوں۔ امید ہے آپ کے قارئین پسند کریں گے۔ آپ نثر و نظم پر خاص دسترس رکھتے ہیں۔ کاش (لندن میں) آپ کے قرب کے لمحے طویل ہوسکتے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا آپ کے خوبصورت قلم کی عمر دراز کرے۔ آمین۔ جگر گوشوں کے لئے دعائیں۔ باقی۔ باقی

اسد جعفری، لندن

■ اس بار رسالے میں اتنا کچھ پڑھنے لکھنے اور بحث کرنے کے لئے ہے کہ بس۔ مگر میں اس بار کوئی تاثراتی خط لکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں اور بس چاہتا یہ ہو کہ پرچے کو آخر تک پورا پڑھوں ویسے بہت کچھ پڑھ چکا ہوں اور جی میں بھی آتا ہے کہ فہمیدہ ریاض کی نظموں پر اور ان پر لکھے گئے بہت ہی پیارے اور دیگر معیاری مضامین پر کچھ لکھوں اور باقر مہدی کی غیر مطبوعہ نظموں کی اشاعت پر آپ کو مبارک باد پیش کروں۔ کیوں کہ اس قدر بھرپور معیاری پرچے کی اشاعت پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شاہد عزیز، اودے پور

■ ادب ساز کا تیسرا شمارہ ملا۔ پہلے شماروں کی ہی طرح شاندار ہے۔ پڑھ رہا ہوں اور لطف لے رہا ہوں۔ تفصیلی خط جلد ہی لکھوں گا۔

ناصر عباس نیر، لاہور، پاکستان

■ ادب ساز۔3 نظر نواز ہوا۔ کافی ضخیم بھی ہے اور معیاری بھی۔ میری غزلیں اور رباعیاں شائع کرنے کے لئے شکریہ۔ ایک رباعی کا چوتھا مصرعہ کمپوزر صاحب کی مہربانی سے مجروح ہوا یا ہو سکتا ہے مجھ سے ہی سہو ہوا ہو۔ بہرحال رباعی اس طرح ہے:

نکلا ہے چمن کے وہ تیار بخت سیاہ
ظلمات کا لگتا ہے کوئی تخت سیاہ
دامن اسی کا کیوں نہ پکڑ لوں میں بھی
شاید ہو منور میرا بھی بخت سیاہ

تعارف میں آپ نے صرف میرا پتہ دیا ہے، جب کہ ناچیز ایک مجموعہ 'انہار' کا خالق بھی ہے۔ کشمیری میں تو میرے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ایک مجموعے پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

رفیق راز، ریڈیو کشمیر، سرینگر

■ ...میری زندگی پر آپ کا یہ شعر صادق آتا ہے:

زندگی ہے سانپ اور سیڑھی کا کھیل
ایک خانہ درمیاں ہے ہر طرف

خصوصی مطالعے میں جو دو شخصیات (نیر مسعود اور فہمیدہ ریاض) ہیں انہیں دیکھ اور پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ حالانکہ ابھی کم کم ہی پڑھا ہے۔ جس ہفتے میں بجلی رات میں آئے گی تب اطمینان سے پڑھوں گا۔

شارق عدیل، مارہرہ، ضلع ایٹہ

■ ادب ساز کا تیسرا شمارہ حسب سابق صوری اور معنوی جمال کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ غزل کی اشاعت کے لئے شکر گزار ہوں۔ اس بار خصوصی گوشے کے تحت فہمیدہ ریاض اور نیر مسعود کی حیات اور کارناموں سے قارئین کو روشناس کرا کے آپ نے ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے۔ واقعی ان دونوں باکمال شخصیتوں پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آئندہ شمارہ خاص نمبر کی صورت میں ہوگا جسے آپ 1857 کی ڈیڑھ سوویں برسی کی یادگار کی صورت میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ کا یہ اعلان بھی کسی خوش خبری سے کم نہیں کہ آئندہ قلمی معاونین کو ادب ساز نصف قیمت پر فراہم کرنے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ اس سے قلم کاروں کے حلقے میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ خصوصی مطالعوں کو مختصر کرنے کی بات بھی درست ہے۔ اس سے دیگر اہم موضوعات کی شمولیت ممکن ہو پائے گی۔

سعید رحمانی، کٹک

■ ادب ساز۔3 مل گیا۔ پرچہ پہلے سے زیادہ ضخیم اور بھرپور ہے۔ نیر مسعود اور فہمیدہ ریاض کے گوشے عرصے تک یاد رکھے جائیں گے۔ پڑھ کر اطمینان سے اس بار خط لکھوں گا۔ خوشی ہوئی کہ اگلا شمارہ خاص نمبر ہوگا۔ مگر پھر اس کی ضخامت کیا رکھیں گے آپ؟ ارے بھائی آپ کا عام شمارہ کسی خاص نمبر سے کم ہوتا ہے کیا؟

ایک بات عرض کرنی ہے۔ آپ شعری حصے میں تھوڑی اور محنت کریں۔ نو مشقوں مبتدیوں اور غالباً اسٹرانگ پی آر شپ والے کمزور شعرا کو جس طمطراق سے 'ادب ساز' چھاپ رہا ہے، اور سینیئروں سے پہلے ترتیب میں جگہ دے رہا ہے، وہ قطعی قابل تحسین نہیں ہے۔

شاہد جمیل، مونگیر، بہار

یہ تقدیم و تاخیر میں کوئی واضح ربط نہ ہونے کی شکایت شروع سے چل رہی ہے۔ ایک صاحب نے تو ہمیں ہتک عزت کے مقدمے کی دھمکی دے کر ہی ڈرا دیا تھا۔ کسے پہلے ہونا چاہئے کسے بعد میں، اس کا پیمانہ کیا ہو سکتا ہے، جس پر سبھی کو اتفاق ہو، یہ سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ ایک واضح پیمانہ عمر کا ہو سکتا ہے۔ جس کی عمر زیادہ ہو وہ پہلے اور جو کم عمر ہو وہ بعد میں۔ ترتیب کا یہ اصول شروع میں ہمیں ٹھیک لگتا تھا۔ لیکن وہ مقدمے کی دھمکی اسی اصول پر چلنے سے آئی۔ تو دوسرا پیمانہ یہ ہے کہ جو شہرت عزت اور معیار میں بڑا تخلیق کار ہو اس کے حساب سے ترتیب قائم کی جائے۔ مگر اب شہرت، عزت اور معیار کے پیمانے ایک دم واضح نہیں ہو پاتے۔ یہی صورت تب درپیش ہوگی جب ہم تخلیق کے حسن و معیار کو ترتیب کی شرط بنا کر چلیں گے۔ کوئی ایسا ٹیسٹ ممکن نہیں ہے جس سے تخلیق کے معیار کی واضح درجہ بندی ہو سکے کہ یہ اتنے نمبر کی غزل ہے اور یہ دو نمبر کا افسانہ ہے۔ اور پھر دس اچھی غزلوں، نظموں یا افسانوں میں سے چھ سات برابر کی اچھی محسوس ہو رہی ہوں تو پھر کسے پہلے رکھئے گا اور کسے بعد میں۔ اور یہ بھی کہ سب اچھی تخلیقات ہوں تو کسی نہ کسی کو تو شروع یا آخر میں آنا ہی ہے۔

ایک حل حروف تہجی کے مطابق ترتیب دینے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ مگر یہ سننے میں جتنا مضحکہ خیز ہے پڑھنے میں ہو سکتا ہے اس سے زیادہ ہی محسوس ہو۔ تو مسئلہ بہر حال وہی رہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے ہر مسئلے کی طرح اس کا حل بھی یہی ہے کہ بیچ کا راستہ اختیار کیا جائے کہ بیچ کے راستے ہی بالعموم منزلوں کو قریب لاتے ہیں۔ اور ہم یہی کر رہے ہیں۔ کہیں عمر، کہیں رتبہ، کہیں تخلیق کا معیار اور کہیں موضوع کے مطابق رسالے کی اپنی ضرورت، ان سبھی کو ذہن میں رکھ کر ترتیب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں تھوڑا بہت کسی کے آگے پیچھے ہونے سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اور پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ٹرین میں کوئی ڈبہ کتنا ہی آگے یا پیچھے کیوں نہ ہو اسٹیشن پر پہونچنا سبھی کو ایک ساتھ ہے۔

ایک بات شاہد جمیل صاحب نے پی آر شپ کی کہی ہے۔ بات کسی حد تک درست بھی ہے لیکن ہم کسی کو طمطراق سے چھاپیں یا کونے میں ڈال دیں، تخلیق بہر حال اپنے آپ بتا دیتی ہے کہ وہ کتنی اچھی یا بری ہے۔ اور یوں خود اس کا مقام بن جاتا ہے۔ پھر بھی ہم اس سلسلے میں مزید احتیاط برتنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

ایک اور بات، جو کئی مراسلات میں آتی رہی ہے، غیر مطبوعہ چیزیں شائع کرنے کی ہے۔ یہ بھی خاصہ پیچیدہ سا معاملہ ہے۔ اکثر قلم کار اپنی تخلیقات ایک رسالے میں جلد نہ چھپنے کے سبب سے اسے دوسرے رسالوں کو بھیج دیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ آگے پیچھے دو تین جگہ چھپ جاتی ہے۔ کئی قلم کار تخلیق کو یہ سوچ کر ایک ساتھ کئی جگہ روانہ کر دیتے ہیں کہ اچھا ہے یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچے۔ ہم سمجھتے ہیں اس طرح سوچنا بھی کچھ برا نہیں۔ پھر کئی بار ادارتی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں۔ سید محمد اشرف کا خصوصی مطالعہ آپ کو یاد ہوگا۔ اس میں کوئی نیا مضمون تھا ہی نہیں۔ پھر بھی اسے اس لئے سراہا گیا کہ کسی کو وہ بھی مضامین ایک ساتھ پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ظاہر ہے ہم بوجوہ نئے مضمون لکھوانے میں ناکام رہے چنانچہ یہاں وہاں چھپے ہوئے مضامین جمع کرنے پڑے تھے۔ (ن ق)

■ ادب ساز کا تازہ شمارہ بدست ہوا۔ شکریہ۔ اس سے قبل کا شمارہ بھی موصول ہوا تھا جو موجودہ شمارے ہی کی طرح کافی ضخیم تھا۔ بد قسمتی سے پچھلے شمارے کا مطالعہ تفصیل سے نہ کر سکا۔ ہوا یوں کہ میرے دوست محترم انیس عادل صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ رسالہ مانگ کر لے گئے اس وعدے کے ساتھ کہ چار پانچ دن بعد واپس کر دیں گے۔ مگر آج کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ چونکہ وہ خود بھی افسانہ نگار ہیں اور یہ کہ ان کی ہی بدولت ادب کی طرف میری رغبت بڑھی لہٰذا میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ ان سے زیادہ کچھ کہہ سکوں۔ موصوف کئی برسوں تک شہرۂ آفاق ادیب کرشن چندر کے ہمراہ ان کے

معاون کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا احترام میرے لئے واجب بن جاتا ہے۔ ویسے وہ اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنے کے عادی ہیں۔ سہ ماہی اسباق کا سلور جوبلی نمبر اور ماہنامہ تحقیق (پاکستان) کے کئی شمارے ان کی لائبریری کی زینت بن چکے ہیں۔

بہر حال درج بالا episode بیان کرنے کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ ادب ساز کے پچھلے شمارے کا تفصیلی مطالعہ نہ کر پانے کے باعث اس کی ادبی اہمیت وقدر و منزلت سمجھنے سے قاصر رہا۔ موجودہ شمارے کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ادب ساز ایک غیر معمولی رسالہ ہے جس کے اوراق بہترین اور بے حد معیاری تخلیقات سے آراستہ ہیں۔ اس میں اتنا کچھ ہے کہ اس کا ہر شمارہ محفوظ کر لینے کے لائق ہے۔ I strongly believe that 'Adabsaaz' would definitely prove to be a trend-setter in the world of Urdu literature. میں اس رسالے کی درازی عمر کے لئے دعا کرتا ہوں۔

مراق مرزا، اندھیری ویسٹ، ممبئی

■ یہاں ایک اسکول لائبریری میں 'ادب ساز' کا شمارہ دیکھا۔ صرف دیکھا۔ مطالعہ کا شرف نہ حاصل کر سکا۔ پتہ وہاں سے نوٹ کر لیا تھا۔ اسی پتے پر 'اسباق' کی کاپی ارسال کی تھی۔ آئندہ بھی اسباق بھیجا کروں گا۔ آپ نے ایک وقیع رسالہ نکالا ہے۔ کچھ رسالے صرف صحت مند ادب کی ترسیل کے لئے ہوتے ہیں۔ ادب ساز مجھے ایسا ہی نظر آیا۔ پہلا شمارہ جب آیا تب مجھے میرے دوست ڈاکٹر محبوب راہی نے فون پر خوش خبری سنائی تھی۔

نذیر فتح پوری، مدیر اسباق، پونے، مہاراشٹر

■ ادب ساز کا افتتاحی شمارہ میری نظر سے گزرا تھا۔ ضخیم ہونے کے باوجود اس کا معیار بلند پایا اور اسی سبب سے دو مضامین بھی ارسال کئے اور ایک بار دو غزلیں بھی۔ آپ کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس لئے ریمائنڈر بھیجنے کو بھی بے سود سمجھا۔ خیر۔ پندرہ یوم قبل ایک صاحب نے ادب ساز میں میری غزلوں کی اشاعت کا ذکر کیا تو اچھا لگا۔ عصری غزل کے سلسلے میں ناقدین اچھی رائے نہیں رکھتے۔ زیادہ تر شعرا مضامین کو دوہرا رہے ہیں۔ یا فکر وفن کے امتزاج سے ان کی غزل خالی نظر آتی ہے۔ اس لئے مدیران بھی کیا کریں؟

ڈاکٹر اسلم حنیف، گنور، بدایوں

■ ادب ساز میں اور سب بھی بہت خوب ہے لیکن آپ کے ڈاکٹر اطہر فاروقی خوب تر ہیں۔ اردو زبان اور مسلم فرقہ واریت پر اتنی شدت کے ساتھ اور جارحانہ انداز میں چوٹ کرنے والی تحریریں میں نے بہت کم پڑھی ہیں۔ پچھلے شمارے میں آپ نے ان کی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت ان کے ساتھ برسوں پہلے کی گئی زیادتی کا جو ذکر کیا تھا اور اپنے سہو کو خندہ پیشانی سے قبول فرمایا تھا اس کے لئے خود آپ کا حسن عمل بھی لائق تعریف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے زندہ در گور کرنے کی جو سازشیں چل رہی ہیں ان کی نقاب کشائی آج بے حد ضروری ہے ورنہ کل بہت دیر ہو جائے گی۔ ڈاکٹر فاروقی اس ضرورت کو بڑی جرأت کے ساتھ پورا کر رہے ہیں۔ اردو کے تمام بہی خواہوں کو ان کی آواز میں آواز ملانا اور اردو زبان کی سیکولر بنیادیں مضبوط کرنا چاہئے۔

تاہم ایک بات یہاں اور بھی کہنی ہے اور ڈاکٹر فاروقی سے گزارش ہے کہ اسے شکایت بالکل نہ سمجھیں۔ میرے عریضے کو وہ علم کے ایک تشنہ طالب کی درخواست کے طور پر ملاحظہ فرمائیں۔ ادب ساز 2 میں انہوں نے آنجہانی پروفیسر گیان چند جین کی کتاب پر 'بھیجے بٹنے کی کتاب' کے عنوان سے جو مضمون تحریر کیا تھا اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ سب سے پہلے تو مجھے اس مضمون کے عنوان سے کچھ صدمہ سا ہوا کہ اگرچہ یہ مجاز کی مشہور نظم کے مصرعے سے اٹھایا گیا تھا، لیکن کچھ اچھے taste میں نہیں تھا۔ جین صاحب ذات یا دھرم کے بنئے نہیں تھے پھر بھی ہم اردو والوں کے لئے وہ قابل احترام تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ مجھے یقین ہے ڈاکٹر فاروقی نے عنوان کسی مذہبی یا ذات پر مبنی تعصب کے تحت ہرگز نہیں دیا ہوگا، اور وہ مہذب انداز میں ایک لطیف سا ادبی انداز کا طنز کرنا چاہ رہے ہوں گے لیکن میرے خیال سے یہ کچھ زیادہ ہی تیکھا ہو گیا تھا۔ پروفیسر جین کی ناقدانہ حیثیت سے وہ بھلے ہی متاثر نہ ہوئے ہوں لیکن اخلاقیات کا تقاضہ تھا کہ ایسے عنوان سے عمداً گریز کیا جاتا۔

خیر اصل بات یہ نہیں ہے۔ کہنا مجھے یہ ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے، جو میرے خیال سے پروفیسر جین کا کوئی قابل قدر کارنامہ نہیں تھی، اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ اس کتاب کو مطعون و معتوب کرنے کی آڑ میں جو فسطائیت اور فرقہ وارانہ منافرت بعض مسلم اردو اکابرین کی طرف سے پھیلائی گئی وہ ڈاکٹر فاروقی کی اپنی سیکولر اور ترقی پسندانہ فکر کے بھی خلاف ہے۔ جن صاحب نے اس کتاب پر یک طرفہ انداز کا تبصرہ لکھ کر اردو دنیا کو ہندو اور مسلمانوں میں تقسیم کرنے کا ایک موقع صرف پروفیسر گوپی چند نارنگ سے اپنی دشمنی نکالنے کے چکر میں فراہم کیا تھا اور ساری بحث کو ہندو مسلم تنازعہ میں بدل ڈالا تھا، ان کے لئے ڈاکٹر فاروقی کے دل میں نرم گوشہ دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی، کیونکہ یہ، میں سمجھتا ہوں، نہ ان کا انداز ہے نہ فطرت۔ جس شخص نے سید حامد جیسی بالعموم احترام کی نظر سے دیکھی جانے والی شخصیت سے رعب نہ کھایا ہو اور ان کے طرز عمل میں چھپے ہوئے کذب کو پوری جرأت سے طشت از بام کیا ہو اس سے ایسی توقع کی بھی نہیں جا سکتی۔ مجھے توقع تھی کہ پروفیسر جین نے ہندو عقائد کے متعلق بعض مسلم ادیبوں کے نہایت رکیک انداز کے طرز بیان کی جو مثالیں اپنی کتاب میں دیں اور جنہیں مذکورہ دشمن نارنگ نے اپنے متعصبانہ تبصرے میں جان بوجھ کر نظر انداز کیا کیونکہ ایسا کرتے تو پروفیسر جین پر مسلم دشمنی یا تعصب کا الزام وہ نہیں لگا سکتے تھے، اس پر ڈاکٹر اطہر فاروقی ضرور کچھ نہ کچھ کہیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب میری درخواست اطہر فاروقی صاحب سے یہی ہے کہ اس پہلو کی طرف بھی توجہ فرمائیں اور ذرا اس پر بھی بحث کریں کہ پروفیسر جین کی کتاب پر ہونے والی بحث کو فرقہ وارانہ رنگ کس مقصد سے دیا گیا۔ ڈاکٹر فاروقی کی آواز میں دم ہے، ٹائمس آف انڈیا اور آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس جیسے موقر ادارے مسلم مسائل، مسلم نفسیات اور اردو کے تعلیمی و تدریسی مسائل پر ان کے مضامین احترام سے شائع کرتے ہیں، اس لئے اس ضمن میں ان کی رائے یقیناً چیزوں کو صحیح perspective میں لاکر تعصب کی دھند کو ہٹانے میں معاون ہوگی۔

نسیم احمد گنگوہی، دہلی

■ ادب ساز صرف دیکھنے میں بڑا نہیں۔ معیاری جریدہ کہلانے کا بھی مستحق ہے۔ اسے پڑھ کر بہت خوش اور مطمئن ہوتا ہوں کہ اردو میں ابھی اتنے اچھے اور معیاری رسالے بھی نکل رہے ہیں۔ مبارک ہو! اطہر صاحب کا مضمون اس کے پہلے شمارے میں بھی پڑھا تھا اور ابھی تک ذہن و دل پر نقش ہے۔ اطہر صاحب تعلیمات پر بہت اچھے مضامین لکھتے ہیں۔ ان کا مرتب کیا ہوا (ماہنامہ "کتاب نما") کا 'رشید حسن خاں خاص نمبر' میرے پاس ہے۔ بہت ہی متاثر کن شخصیت ہیں۔ ویسے تو میں تحقیق اور تدوین کا طالب علم ہوں مگر کچھ شاعری بھی کر لیتا ہوں۔ ایک نظم 'پانی والا' بھیج رہا ہوں۔

سید تصنیف حیدر، اوکھلا، دہلی

OO

اس انجمن میں...

مختصر تعارفی حوالے

پروفیسر آل احمد سرور: پ: 9 ستمبر 1911 بدایوں • وفات: علی گڑھ • نقاد، شاعر • تصانیف: تنقید کیا ہے، تنقیدی اشارے، نئے اور پرانے چراغ، ادب اور نظریہ، جدیدیت اور ادب، نظر اور نظریے، مسرت سے بصیرت تک، اقبال اور ان کا فلسفہ، اقبال کے مطالعے کے تناظرات، اقبال کا نظریہ اور شاعری، اقبال اور تصوف، دانش وری کی روایت، ہندوستان کدھر؟ (تنقیدی مضامین) سلسبیل، ذوقِ جنوں (شعری مجموعے) • صدرِ پاکستان طلائی تمغہ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ از دہلی اردو اکادمی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب مودی ایوارڈ •

جسٹس آنند نرائن ملا • پ: 24 اکتوبر 1901 لکھنؤ • ایم اے، ایل ایل بی لکھنؤ یونی ورسٹی • شاعر، قانون داں، مترجم، تصانیف: جوئے شیر، کچھ ذرے کچھ تارے، میری حدیثِ عمر گریزاں، سیاہی کی ایک بوند، کربِ آگہی (شعری مجموعے) کچھ نثر میں بھی (مضامین وخطبات) مضامین نہرو (ترجمہ) • ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور متعدد اردو اکادمیوں واداروں کے اعزازات •

ابراہیم اشک (ابراہیم خان غوری) • پ: 20 جولائی 1951 بڑنگر، ضلع اجین، مدھیہ پردیش • ایم اے ہندی • شاعر، نقاد، فلمی نغمہ نگار، مکالمہ نویس • تصانیف: الہام، آگہی، کربلا، الاؤ (شعری) انداز بیاں اور تنقیدی شعور (تنقید) • اعزازات: ریاستی اردو اکادمیوں اور دیگر اداروں کے 20 سے زائد ادبی و فلمی ایوارڈ • مشہور فلمیں: کہو نہ پیار ہے، کوئی مل گیا، جانشین، آپ مجھے اچھے لگنے لگے، اعتبار وغیرہ • رابطہ: C3 فلیٹ 302، الانصار ملت نگر اندھیری ویسٹ ممبئی - 400053 فون: 26367457 موبائل: 9820384921

پروفیسر سید احتشام حسین • پ: 1912 قصبہ ماہل اعظم گڑھ یوپی • وفات: یکم دسمبر 1972 • صدر شعبہ اردو الٰہ آباد یونی ورسٹی • ترقی پسند نقاد و دانش ور، افسانہ نگار • خاص تصانیف: تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، تنقید اور عملی تنقید، ذوقِ ادب اور شعور، افکار و مسائل، عکس اور آئینے، اعتبارِ نظر، افسانوں کا مجموعہ ویرانے •

اختر الایمان • پ: 12 نومبر 1915 قلعہ نجیب آباد، ضلع بجنور یوپی • وفات: 1996 ممبئی • بی اے ذاکر حسین کالج دہلی، ایم اے، نامکمل علی گڑھ • شاعر، مکالمہ نویس • گرداب، تاریک سیارہ، سب رنگ، آب جو، یادیں، بنتِ لمحات، نیا آہنگ، سروساماں (شعری مجموعے) اس آباد خرابے میں (خود نوشت سوانح) • اعزازات: اقبال سمان مدھیہ پردیش، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، یوپی، مہاراشٹر کی اردو اکادمیوں کے اعلیٰ ایوارڈ •

ڈاکٹر ارجمند آرا • پ: 8 اکتوبر 1969 سکندرآباد، ضلع بلند شہر یوپی • ایم اے، پی ایچ ڈی، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی • نقاد، مولف، صحافی، مترجم • تصانیف: احسن اللہ خاں بیان، ہم عصرِ میر تقی میر، کے کلیات 'دیوانِ بیان' کی تدوین؛ غالب کے شاگرد منشی بالمکند بے صبر کی مثنوی 'لختِ جگر'؛ برالف رسل کی خودنوشت کا انگریزی سے ترجمہ بعنوان 'جو کہہ دیا بندہ'؛ مصری ناول نگار میرال الطحاوی کے ناول کا ہندی ترجمہ بعنوان 'خیمہ' • رابطہ: 3/5 یونی ورسٹی روڈ، دہلی - 110007 • ای میل: arjumandara@hotmail.com

اسماعیل میرٹھی (محمد اسماعیل) • پ: 1844 میرٹھ • وفات: 1917 • شاعر، مدرس • مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کے زیر قیادت اردو نظم ونثر میں شروع ہونے والی تازگی اور سادگی کی تحریک کے خاص رکن اور اردو میں بچوں کے ادب کی داغ بیل ڈالنے والے شاعر •

ڈاکٹر اطہر فاروقی • پ: 15 اگست 1964 سکندرآباد، ضلع بلند شہر یوپی • ایم اے، پی ایچ ڈی، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی • صحافی، تجزیہ کار، نقاد، مرتب • تصانیف: محمود سعیدی ایک مطالعہ • Redefining Urdu Politics In India آکسفورڈ پریس، گفتگو ان کی (اہم ادبی وعلمی شخصیتوں کے انٹرویوز)، آزاد ہندوستان میں اردو زبان، تعلیم اور صحافت • انجمن ترقی اردو ہند: ماہنامہ 'کتاب نما' کا 'رشید حسن خاں نمبر' • رابطہ: 80 سکھ دیو وہار، نئی دہلی - 110025 فون: 26331010

اکبر الٰہ آبادی (سید اکبر حسین) • پ: 1846 الٰہ آباد • وفات: 1921 • ابتدائی تعلیم مدارس میں • الٰہ آباد میں بطور سیشن جج اعلیٰ ملازمت سے سبک دوش • پہلی جنگِ آزادی اور بعد میں مہاتما گاندھی کی پرامن تحریکِ آزادی کے ابتدائی دور کے شاہد • اردو میں شستہ وطنزیہ مزاح کے پہلے شاعر • کلیات چار جلدوں میں شائع ہوئی •

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی • پ: 1837 پانی پت • وفات: 1914 • شاعر، نقاد، مولف، سوانح نگار، معلم • اردو میں سادہ اور سیدھی زبان کی 'نیچرل شاعری' کے بانی • تصانیف: شعریات: مدوجزرِ اسلام (مسدسِ حالی) مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد وغیرہ (مثنویاں) مجموعہ غزلیات، غالب اور حکیم محمود خاں کی وفات پر کہے گئے مراثی؛ نثر: مقدمہ شعر و شاعری، حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید (سرسید احمد خاں کی سوانح) •

پنڈت برج نرائن چکبست • پ: 1882 • وفات: 1926 • شاعر، نقاد، محقق، ڈرامہ نگار • صبحِ وطن (شعری مجموعہ) کلیاتِ چکبست: مرتب کالی داس گپتا رضا 1980 •

بہادر شاہ ظفر (ابوظفر سراج الدین محمد) • پ: 24 اکتوبر 1775 دہلی • وفات: 28 ستمبر 1862 رنگون برما • آخری مغل تاجدارِ ہند، 1837 میں تخت نشین • بطور شاعر شاہ نصیر، کاظم حسین بے قرار، شیخ ابراہیم ذوق دہلوی اور پھر مرزا اسداللہ خاں غالب کو اپنا کلام دکھاتے رہے • فنِ موسیقی و خوش نویسی میں دسترس • کلیاتِ ظفر چار جلدوں پر محیط •

پروین شیر • پ: عظیم آباد، پٹنہ کے علمی گھرانے میں جس نے اختر اورینوی جیسا افسانہ نگار اردو ادب کو دیا • شاعرہ، مصور، ستار نواز • تصنیف: کرچیاں (شاعری و مصوری) • ویب سائٹ کے لئے اپنی شاعری و مصوری پر مشتمل سی ڈی تیار کی • ہندوستان و کناڈا میں

قلم کاروں کے تعارفی حوالے دینے کا مقصد طلبائے علم کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس سلسلے میں استطاعت بھر احتیاط برتی گئی ہے۔ پھر بھی غلطیوں کا امکان ہے۔ براہِ کرم اہلِ علم حضرات تصحیح کے لئے ہماری رہنمائی فرماتے رہیں تاکہ ہر شمارے کے ساتھ اردو ادیبوں کے بارے میں ایک مفید اور درست ڈاٹا بیس data base تیار ہوتا جائے۔ جن حضرات کا تعارف شامل نہیں ہو پایا ہے یا تعارف میں اہم باتیں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں وہ خود یا واقفین بلاتکلف وتوقف متعلقہ حوالے روانہ فرمادیں تاکہ آئندہ شماروں میں وہ اضافے شامل کردیے جائیں۔

مصوری کے متعدد اعزاز • 126 وائن لینڈ کریسنٹ، ونی پیگ، آر 3 وائی، 1 ائی 6 منی ٹابا، کناڈا • فون: 0124 896 (204)

تلوک چند محروم • پ: 1887 • وفات: 1966 • شاعر، معلم، شعری مجموعے: گنج معانی، رباعیات محروم، کاروان وطن، بہار طفلی، شعلۂ نوا، نیرنگ معانی وغیرہ۔

جاں نثار اختر • پ: 14 فروری 1914 گوالیار • وفات: 19 اگست 1976 ممبئی • شاعر، فلمی نغمہ نگار، معلم • تصانیف: شعری مجموعے: نذر بتاں، سلاسل، جاوداں، گھر آنگن، خاک دل، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے خاک دل۔

ڈاکٹر جاوید رحمانی: پ 8 مارچ 1978 بابو سلیم پور ضلع دربھنگہ، بہار • ایم اے، ایم فل جواہر لال نہرو یونی ورسٹی • تصنیف: غالب تنقید، انجمن ترقی اردو (ہند) • رابطہ: AB-401/2 بدھ وہار، نئی دہلی 110067 • فون: 9210293686 • ای میل:
rahmanijnu@gmail.com

جعفر ساہنی (سید محمد جعفر حسین) • پ: 5 جنوری 1941 لکھمنیا، ضلع بیگوسرائے، بہار • ایم اے (اسلامی تاریخ) ایم اے (جدید تاریخ) بی ایڈ • شاعر، افسانہ نگار • درسی نصاب کے لئے تاریخ کی 8 کتابوں کی تالیف • رابطہ: معرفت ہندوستان میڈیکوز، 85/ا توپ سیا روڈ، کولکاتا - 700039 • موبائل: 09339941224

جگدیش پرکاش: پ: 4 فروری 1935 لاہور • ایم کام، آگرہ یونی ورسٹی، IIPA سے مینجمنٹ کا کورس • مالک و منتظم تعلیمی کمپیوٹر کمپنی ایڈو میٹکس • شاعر • تصانیف: دھوپ کی خوش بو، نریندر کے لئے، آسماں در آسماں (شعری مجموعے) • اعزازات: دہلی اردو اکادمی اور دیگر اداروں کے ایوارڈ • یوروپ، امریکہ، جنوب مشرقی ایشیا کے بیش تر ممالک کے دورے • C11/1 ڈی ایل ایف سٹی فیز I گوڑگاؤں 122002 ہریانہ فون: 2565644 (گوڑگاؤں) 25826541 (دہلی) موبائل: 9313304704 • ای میل:
jagdish.prakash@edumatics.com

جگر مرادآبادی (علی سکندر) • پ: 1890 مرادآباد، یوپی • وفات: 1960 • شاعر • اردو شاعری کے کلاسیکی دور کے آخری اہم شاعر • ابتدا میں داغ دہلوی سے تلمذ • دو شعری مجموعے: شعلۂ طور، آتش گل۔

جمیل مظہری • پ: ستمبر 1904 پٹنہ • وفات: جولائی 1980 مکھن پورہ • ایم اے، اسلامی تاریخ، کلکتہ یونی ورسٹی • شاعر، نقاد، صحافی، کالم نگار، معلم • تصانیف: شعری مجموعے: شکست و فتح، نقش جمیل، فکر جمیل، عرفان جمیل، مثنوی آب و سراب، مثنوی آب و سراب، وجدان جمیل، آثار جمیل، منثورات جمیل دو جلدوں میں • غالب مودی ایوارڈ برائے شاعری •

جوش ملیح آبادی (شبیر حسن خاں) • پ: 5 دسمبر 1898 ملیح آباد، یوپی • وفات: 22 فروری 1982 • شاعر، مصنف، صحافی، نقاد • تصانیف: شعری مجموعے: آوازۂ حق، روح ادب، شاعر کی راتیں، جوش کے سو شعر، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، پیغمبر اسلام، فکر و نشاط، جنون و حکمت، حسین اور انقلاب، آیات و نغمات، عرش و فرش، رامش و رنگ، سنبل و سلاسل، سیف و سبو، سرود و خروش، سموم و صبا، طلوع فکر، قطرۂ قلزم، نوادر جوش، الہام و افکار، نجوم و جواہر، جوش کے مرثیے، عروس ادب حصہ اول و دوم، عرفانیات جوش، محراب و مضراب، دیوان جوش، نثری تصانیف: مقالات جوش، اوراق زریں، اشارات، مکالمات جوش، یادوں کی بارات (خود نوشت) • حکومت ہند سے 1954 میں پدم بھوشن کا اعزاز۔

جی ڈی چندن (گربچن داس) • پ: 8 اکتوبر باغبان پورہ لاہور (پاکستان) • ایم اے انگریزی ادب، ڈپلومہ ان جرنلزم، پنجاب یونی ورسٹی لاہور • صحافی، مصنف، افسانہ نگار • تصانیف: اردو صحافت اور صحافیوں کے بارے میں مختلف موضوعات پر 6 مبسوط کتابیں، ایک درجن افسانے اور ڈرامائی فیچر • یوپی اور دہلی کی اردو اکادمیوں کے متعدد انعامات • پریس انفارمیشن بیورو میں شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے سبک دوشی • رابطہ: جی 46 جنگ پورہ ایکسٹنشن، نئی دہلی - 110014 • فون: 24311745

حسرت موہانی (فضل الحسن) • پ: 1875 موہان ضلع اناؤ یوپی • وفات: 1951 • تعلیم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ • شاعر، نقاد، صحافی، سیاسی رہنما • ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے ایک • تصانیف: کلیات حسرت موہانی، شرح کلام غالب، نکات سخن، مشاہدات زنداں (اسیری کے حالات)

درگا سہائے سرور • پ: 1874 جہان آباد پیلی بھیت یوپی • وفات: 1910 • شاعر، مترجم • شاعری میں قدیم و جدید رنگ کا امتزاج • کثرت شراب نوشی کی وجہ سے 36 برس کی زندگی پائی • تصانیف: دو شعری مجموعے 'خم خانۂ سرور' اور 'جام سرور'، متعدد انگریزی نظموں کے منظوم تراجم۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا • پ: یکم اگست 1927 غازی پور • وفات: 15 مارچ 1992 ممبئی • ایم اے پی ایچ ڈی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ • ہندی اردو دونوں میں لکھنے والے شاعر، ناول/افسانہ نگار، فلم ٹی وی مکالمہ نویس، نقاد • تصانیف: شعری: 1857 رزمیہ، رقص مے، اجنبی شہر اجنبی راستے: ناول: محبت کے سوا، تنقید: طلسم ہوش ربا، ایک مطالعہ، یاس یگانہ چنگیزی: ہندی میں ایک شعری مجموعہ 'چھری والا' آٹھ ناول، ہندوستان کے مقبول ترین ٹی وی سیریل 'مہابھارت' اور متعدد ہندی فلموں کے مکالمہ نویس •

رفعت سروش (سید شوکت علی) • پ: 2 جنوری 1926 نگینہ بجنور یوپی • شاعر، مصنف، ڈرامہ/آپیرا نویس، سوانح نگار، نقاد، ریڈیو براڈ کاسٹر • تصانیف: چالیس سے زیادہ: شعری و ادبی غزل اور نظم، گرہ بریشم کا (غزلیں)، ایک پل روشنی کا، سفر ہے میری صدا کا، غبار (نظمیں)، عروج آدم، تاریخ کے آنچل میں، جہاں آرا، شاہجہاں کا خواب (منظوم ڈرامے و آپیرا)، پتہ پتہ بوٹا بوٹا، اور بستی نہیں یہ دلی ہے (خود نوشت سوانح) • اعزازات: اقبال سمان، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، یوپی، دہلی، مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں کے ایوارڈ • رابطہ: اے 80 سیکٹر 2 نوئیڈا یوپی - 201301

رؤف خیر (محمد عبد الرؤف) • پ: 5 نومبر 1948 حیدرآباد دکن • ایم اے اردو، لیکچرر اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج کریم نگر اے پی • شاعر، نقاد، مزاح نگار • تصانیف: شعری مجموعے/ اقرا 1977، ایلاف 1982، شہداب 1993، سخن ملتوی 2004: علامہ اقبال کے 163 فارسی قطعات 'لالۂ طور' کا منظوم ترجمہ قنطار 2001 • تحقیق/ حیدرآبادی خانقاہیں 1994 • تنقید/ خط خیر، مضامین 1997 • اعتراف خیر/ رؤف خیر فن اور شخصیت پر حیدرآباد یونی ورسٹی نے صبیحہ سلطانہ کو ایم فل کی سند عطا کی • رابطہ: 19/202-10-9 رسالہ بازار گول کنڈہ حیدرآباد 500008 فون: 040-23523324 موبائل: 09440945645

رئیس الدین رئیس: شاعر، صحافی • تصانیف: آسمان حیران ہے 1995 ہند میں خاموش ہے 2001 (شعری مجموعے) سمندر سوچتا ہے (کلیات) • 10/1725 دہلی گیٹ علی گڑھ 202001 یوپی فون: 0571-2525620 موبائل: 9719570345

ساحر لدھیانوی (عبدالحئی) 8 مارچ 1921 لدھیانہ • وفات: 25 اکتوبر 1980 • تعلیم، خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ، گورنمنٹ کالج لاہور، جہاں امریتا پریتم کے بارسوخ والد نے مبینہ طور پر انہیں اس لئے کالج سے نکلوا دیا کہ امریتا ان سے محبت کرتی تھیں اور ساحر غریب تھے • شاعر، فلمی نغمہ نگار، ادبی صحافی • تصانیف: صرف 23 سال کی عمر میں پہلے شعری مجموعے 'تلخیاں' سے بے پناہ شہرت، طویل نظم 'پرچھائیاں'، آؤ کہ کوئی خواب بنیں (دوسرا شعری مجموعہ) فلمی نغموں کے مجموعے 'گاتا جائے بنجارہ'، میرے گیت تمہارے ہیں • ادب لطیف، شاہراہ، پریت لڑی اور سویرا کی ادارت، پاکستانی حکومت کی جانب سے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد 1949 میں لاہور سے دہلی اور پھر ممبئی ہجرت • حکومت ہند سے پدم شری کا اعزاز۔

ساجد رشید • پ: 11 مارچ 1955 بلرام پور، یوپی • 3 سال کی عمر سے ممبئی میں تعلیم انٹر آرٹس • افسانہ/ ڈرامہ/ ناول نگار، آرٹسٹ، سیاسی کارٹونسٹ، ادبی صحافی، سوشل ایکٹی وسٹ • مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے سابق چیرمین • مدیر سہ

ماہی نیا ورق، نائب صدر، مسلم فار ڈیموکریسی۔ تصانیف: ریت گھڑی، نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی، ایک چھوٹا سا جہنم (افسانوں کے مجموعے) سونے کے دانت (کہانیوں کا ہندی مجموعہ) مراٹھی ناول 'جھاڑا دھرتی' کا اردو ترجمہ۔ اعزازات: کہانیوں 'ایک چھوٹا سا جہنم' اور 'چادر والا آدمی' کے لیے دو بار کتھا ایوارڈ، 'جھاڑا دھرتی' کے لیے ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ، ممبئی کے فسادات کی رپورٹنگ کے لیے ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ہاتھوں اسامہ طلحہ ایوارڈ، 'سونے کے دانت' کے لیے سینٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ کا ایک لاکھ روپے کا انعام۔ رابطہ: 36/38 عمر کھاڑی کراس لین، ممبئی 400009 فون: 2374 3358 موبائل: 9867713189

سلام بن رزاق۔ پ: 1941 پن ویل، مہاراشٹر۔ ایس ایس سی و معلمی ڈپلومہ۔ مشہور افسانہ نگار، فلم ٹی وی اسکرپٹ رائٹر، مترجم۔ تصانیف: ننگی دوپہر کا سپاہی 1977، معبر، شکستہ بتوں کے درمیان (افسانوی مجموعے)، ماہم کی کھاڑی، کام دھینو، شری پادکرشن کولہٹکر اور عصری ہندی کہانیاں (تراجم) ہندی و مراٹھی ادب کا اردو میں ترجمہ۔ اعزازات: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (شکستہ بتوں کے درمیان) ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (عصری ہندی کہانیاں) 1998، مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کے چار، یوپی اردو اکادمی کے دو اور بہار اردو اکادمی کے دو ایوارڈ، کتھا ایوارڈ، مراٹھی، تیلگو، ہندی، انگریزی، پنجابی، ء، دیجیائی، روسی زبانوں میں متعدد کہانیوں کا ترجمہ۔ رابطہ: 11/9 ایل آئی جی کالونی، وتوبا بھاوے نگر، کرلا (ویسٹ) ممبئی 400070 مہاراشٹر۔ موبائل: 9322511897

سردار جعفری (علی سردار)۔ پ: 29 نومبر 1913 بلرام پور ضلع گونڈہ یوپی۔ وفات: 2000 ممبئی۔ بی اے اینگلو عربک کالج (ذاکر حسین کالج) دہلی۔ شاعر، نقاد، ترقی پسند دانش ور، فلم ساز، فلمی نغمہ نگار، ادبی صحافی۔ خاص تصانیف: شعریات: نئی دنیا کو سلام، خون کی لکیر، امن کا ستارہ، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، لکھنؤ کی پانچ راتیں، لہو پکارتا ہے۔ تنقید: اقبال شناسی، ترقی پسند ادب۔ اعزازات: پدم شری، ساہتیہ سمان، اقبال سمان، تمغۂ اقبال (پاکستان) ڈی لٹ (علی گڑھ یونی ورسٹی) مخدوم ایوارڈ اور متعدد دیگر اعزازات۔

سعید بن محمد نقش۔ پ: 1921 محبوب نگر حیدرآباد۔ تعلیم: گورنمنٹ کالج آف فائن آرٹس سے پینٹنگ میں ڈپلومہ آنرز کے ساتھ، پینٹنگ کی نئی ABRI تکنیک میں مہارت حاصل کی۔ مشہور پینٹر اور شاعر۔ ماسکو، نئی دہلی، حیدرآباد، میں تصاویر کی نمائش۔ روس، مصر، عراق، افغانستان میں اہم نمائشوں میں شرکت۔ اعزازات: نواب چھتاری طلائی تمغہ، دیو سکر طلائی تمغہ بہترین تصویر کا اکیڈمی آف فائن آرٹس کلکتہ سے اعزاز۔

سلمان خورشید۔ پ: یکم جنوری 1953۔ ایم اے آکسفرڈ یونی ورسٹی۔ ماہر قانون، سیاست داں، پلے رائٹ۔ خاص تصانیف: ایٹ ہوم ان انڈیا، سنس آف بابر (انگلش پلے)۔ سابق وزیر مملکت برائے امور خارجہ حکومت ہند، سابق صدر اتر پردیش کانگریس کمیٹی۔ 80 سکھ دیو وہار، نئی دہلی۔ 110025۔ فون: 26331010۔ ای میل: sk_tipu@yahoo.com

سوہن راہی (سوہن لال)۔ پ: اندازاً 1937 اساڑو، جالندھر۔ ابتدائی تعلیم: پھگواڑہ، ضلع کپورتھلہ، پنجاب۔ شاعر۔ تلمذ: پریم وار برٹنی، ماہر القادری۔ تصانیف: زخموں کے آنگن، گھونگھٹ کے پٹ، دھوپ کی تختی، زخم گھونگھٹ دھوپ، کھڑکی بھر آسمان، کاغذ کا آئینہ، گیت ہمارے، گیتوں نظموں غزلوں کے سات مجموعے۔ دیگر پانچ زیر اشاعت۔ 1963 سے برطانیہ میں مقیم۔ اعزازات: چینل فور غزل کمپیٹیشن لندن، ایشین آرٹس ایسو سی ایشن گلاسگو، سنت کبیر ایوارڈ ہندی سمتی لندن، ساحر کلچرل اکیڈمی لدھیانہ، یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی یو کے ساحر لدھیانوی ایوارڈ لندن اور انڈین اوورسیز کانگریس یو کے لندن کے اعزازات۔ رابطہ: 63 ہیملٹن ایونیو سربٹن سرے، کے ٹی 6 7 پی ڈبلیو انگلینڈ۔ فون: 0208-286-9335

سیماب اکبرآبادی (عاشق حسین)۔ پ: 1880 اکبرآباد یوپی۔ وفات: 1951 کراچی پاکستان۔ شاعر، نقاد، ادبی صحافی، مترجم۔ تلمذ: داغ دہلوی۔ شاعری میں فنی قیود کے پابند اور فنی استقام کے سخت مخالف۔ تصانیف: کلیات سیماب اکبرآبادی، رباعیوں کا مجموعہ 'شہر آشوب'، قرآن مجید کا منظوم ترجمہ۔

شاد عظیم آبادی (خان بہادر نواب محمد علی)۔ پ: 1846 پٹنہ۔ وفات: 1927 پٹنہ۔ تلمذ: شاہ الفت حسین فریاد، شاگرد خواجہ میر درد۔ مجموعۂ کلام: نغمۂ الہام۔ بیسویں صدی کے صف اول میں اردو غزل میں تصوف کا احیا کرنے والے اہم شاعر۔

پروفیسر شارب ردولوی (مسیب عباس)۔ یکم ستمبر 1935 ردولی، بارہ بنکی یوپی۔ ایم اے، پی ایچ ڈی۔ نقاد، معلم۔ اہم تصانیف: مراثی انیس، گل صد رنگ (غزل گو شعرا کا انتخاب) جگر۔ فن اور شخصیت، افکار سودا، جدید اردو تنقید: اصول و نظریات، مطالعۂ ولی، تنقیدی مطالعے۔ اعزازات: یوپی اور دہلی کی اردو اکادمیوں کے انعامات۔

شاہد عزیز (عبدالعزیز خاں)۔ پ: یکم ستمبر 1947۔ شاعر، مولف، نقاد۔ تصانیف: تذکرہ شعرائے اودے پور، مجموعۂ کلام 'تجلّی'۔ رابطہ: 179 ملا تلائی، اودے پور۔ 313001 راجستھان۔ موبائل: 9828068534

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی۔ پ: 1857۔ وفات: 1914۔ شاعر، نقاد، تاریخ داں۔ معاون سرسید احمد خاں۔ یکے از بانیان ندوۃ العلما لکھنؤ، بانی دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ فارسی، عربی، انگریزی و فرانسیسی کے عالم۔ خاص تصانیف: سیرت النبی (2 جلدوں میں) شعرالعجم (5 جلدوں میں) اورنگ زیب عالم گیر، الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی، الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، الجزیہ، مقالات شبلی، رسائل شبلی، مجموعۂ نظم۔

شہاب سرمدی (بلاغت حسین)۔ پ: 18 مارچ 1914 موضع بمہرولی، چائل، ضلع الہ آباد۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فلسفہ میں آنرز۔ شاعر، محقق، تاریخ داں، ماہر موسیقی، کلاسیکی گائک۔ تلمذ: موسیقی میں استاد یعقوب خاں کے شاگرد۔ تصانیف: مجموعۂ کلام 'صوت و صریر'، 'مطالعۂ جائسی'، 'افکار میر' (میر کی گیت کاری کے موضوع پر)، 'مسدس انیس: ہیئت اور اسلوب کی بحث'۔

ظفر عدیم۔ پ: 26 مئی 1950 مظفر پور بہار۔ بی ایس سی۔ شاعر، ناول نگار، صحافی، مترجم۔ تصانیف: بھینی بھینی مہک (شعری مجموعہ) رات کے آنچل میں، انجم شعر سازاں، پہاڑیاں بول اٹھیں، یاسمین (ناول)۔ اعزازات: شعری مجموعے پر دہلی اردو اکادمی ایوارڈ اور دیگر اداروں کے توصیف نامے۔ گلی نمبر 35 ذاکر نگر، نئی دہلی 110025 فون: 26982733 موبائل: 9891462603

عبدالسلام عاصم۔ پ: 30 جنوری 1960 کلکتہ۔ بی اے۔ شاعر، صحافی۔ تصنیف: دل سے (شعری مجموعہ)۔ اعزاز: ساحر شری ایوارڈ برائے صحافت۔ رابطہ: 220 اے ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی۔ 110025

عشرت ظفر۔ شاعر، نقاد۔ یونی وارچ کمپنی، لال املی کراسنگ سائیکل مارکیٹ کانپور، یوپی۔ 208001

پروفیسر علی احمد فاطمی۔ پ: یکم جنوری 1954 الہ آباد۔ نقاد، محقق، معلم۔ تصانیف: تین نئی کہانیاں، سوز وطن، تاریخی ناول فن اور اصول، فراق گورکھپوری، نظیر اکبرآبادی، سفر ہے شرط۔ یوپی و دیگر ریاستوں کی اردو اکادمیوں کے ایوارڈ۔ رابطہ: 68 مرزا غالب روڈ الہ آباد یوپی۔

علی جواد زیدی (صابر محمد آبادی/ابن اعجاز)۔ پ: 10 مارچ 1916 کرہاں ضلع اعظم گڑھ۔ ایل ایل بی لکھنؤ یونی ورسٹی۔ شاعر، نقاد، محقق۔ تصانیف: شعریات: رگ سنگ، میری غزلیں، دیار سحر، انتخاب علی جواد زیدی، نسیم دشت آرزو، تیشۂ آواز۔ تنقید و تحقیق: تعمیری ادب، دیوان غنی کشمیری، دو ادبی اسکول، تاریخ ادب اردو کی تدوین، ہندوستان میں علوم اسلامی کے مراکز، قصیدہ نگاران اتر پردیش، فکر و ریاض، دہلوی مرثیہ گو۔ اعزازات: حکومت ہند سے پدم شری اور دیگر اعزاز۔

عنبر بہرائچی • شاعر، نقاد، محقق، سنسکرت ادب کے عالم• خاص تصانیف: سوکھی ٹہنی پر ہریل، دوپ (شاعری) سنسکرت بوطیقا (تحقیق و تنقید) • اعزاز: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ • رابطہ: 590 نزد ایس جی پی جی آئی پوسٹ اترا تیا، رائے بریلی روڈ لکھنؤ۔ 226025

فریڈرک اینگلس • پ: 28 نومبر 1820 بارمن، پروشیا • وفات: 5 اگست 1895 لندن • سیاسی فلسفی، ماہر اقتصادیات، کارل مارکس کے رفیق اور مارکسزم کے شریک بانی • اہم تصانیف: ہولی فیملی، محنت کش طبقے کے حالات، مارکس کے ساتھ مل کر کمیونسٹ منشور کی تصنیف، خاندان، نجی ملکیت اور مملکت کا اصل آغاز•

فیاض رفعت (فیاض محمد خاں) • پ: 11 نومبر 1940 • ایم اے، سیاسیات، اردو ادب • شاعر، افسانہ نگار، نقاد، مترجم، صحافی، سابق ڈائریکٹر دوردرشن کیندر پٹنہ لکھنؤ، گوا، گلبرگہ • تصانیف: بیتی رتوں کا منظر نامہ، خواب دریچہ، پتھر کا ایک دن (شاعری) نئے عہد نامے کی سوغات، میرے حصے کا زہر (افسانے) بنارس والی گلی (سوانحی ناول) اروشی کا سوپن (ہندی ناولٹ) اردو افسانے کے ابتدائی نقوش، اردو افسانے کا پس منظر (تنقید)، ہندی کتب کے تراجم • اعزازات: مہاراشٹر، یوپی کی اردو اکادمیوں اور میر اکادمی لکھنؤ کے ایوارڈ، یو جی سی فیلو شپ • ادبی جریدہ 'عہد نامہ' کے 'فیاض رفعت نمبر' کی اشاعت 2000 میں • رابطہ: 4 سی 53 نریندر پارک، نیا نگر، میرا روڈ تھانے 401107 مہاراشٹر

کارل مارکس (کارل ہینرک مارکس) • پ: 5 مئی 1818 ٹرائر، پروشیا • وفات: 14 مارچ 1883 لندن • فلسفی، ماہر اقتصادیات، کمیونزم کے بانی • اہم تصانیف: کمیونسٹ منشور، 'داس کیپٹل' (سرمایہ) اور تاریخی مادیات•

گلزار (سردار سمپورن سنگھ) • پ: 18 اگست 1936 دینا (پاکستان) • شاعر، افسانہ نگار، مشہور فلم ساز، ہدایت کار، نغمہ نگار • تصانیف: پکھراج، کچھ اور نظمیں (شعری مجموعے) Silences (نظموں کے انگریزی تراجم) راوی پار، دستخط، دھواں (افسانوی مجموعے) میرا کچھ سامان (فلمی نغمے) • اعزازات: 'دھواں' کے لئے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، 13 سالانہ فلم فیئر ایوارڈ فلمی ہدایت کاری (موسم) نغمہ نگاری (چھ مرتبہ) مکالمہ نگاری (آنند، نمک حرام، ماچس) کہانی کار (ماچس) فیچر فلم (آندھی) دستاویزی فلم (امجد علی خاں) کے لئے • رابطہ: بوسکیانہ، پالی ہل، باندرہ (ویسٹ) ممبئی 400050 فون: 26461957، 26498351 فیکس: 26040477

گلشن کھنہ (گورنام کھنہ): 12 فروری 1934، حافظ آباد (پاکستان) • ایم اے انگریزی ادب آگرہ یونی ورسٹی، پی جی سرٹیفکیٹ ان ایجوکیشن وائٹ لینڈ کالج لندن، ڈپلومہ ان دی ٹیچنگ آف انگلش رائل سوسائٹی آف آرٹس لندن • شاعر، افسانہ نگار • شعری مجموعے: بکھرے بکھرے خواب، چراغ آرزو، سوچ کی خوشبو • افسانوں کے مجموعے: بارش میں ایک آدمی، درد جو آنکھوں سے بہا، کھوئی ہوئی جنت • انگریزی میں تنقید کے جائزے، ثقافت اور اردو تدریس پر 6 کتابیں • 92 گرو روڈ، Hounslow، ٹی ڈبلیو 3، 3 پی ٹی (یو کے) • موبائل: 07780772603

پروفیسر گوپی چند نارنگ • پ: 11 فروری 1931 ڈگی، بلوچستان، پاکستان • ایم اے اردو، پی ایچ ڈی دہلی یونی ورسٹی • چیئرمین ساہتیہ اکادمی • عالمی شہرت یافتہ دانش ور، نقاد، محقق، مرتب • کل کتابیں تقریباً 60 • خاص تصانیف: اردو افسانہ روایت اور مسائل، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، اسلوبیات میر، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، پرانوں کی کہانیاں، امیر خسرو کا ہندوی کلام، املا نامہ، کرخنداری اردو کا لسانی مطالعہ (انگریزی) سفر آشنا (سفرنامہ) اور متعدد مرتب کی ہوئی کتابیں • غیر ممالک میں ایشیا، یوروپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا کے متعدد ملکوں کے دورے • صدر پاکستان کا اقبال صدی طلائی تمغۂ امتیاز 1977، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، مختلف اردو اکادمیوں کے ایوارڈ، کئی عالمی ایوارڈ، ماہنامہ 'انشا' کی جانب سے ضخیم کتابی ایڈیشن 'گوپی چند نارنگ نمبر' کی اشاعت 2004 • پدم بھوشن 2004 پدم شری 1991 • D-252 سروودیا انکلیو نئی دہلی 110017 فون: 26511460، 26568956 موبائل: 9810112543

مدھو ترویدی • پ: اپریل 1947 میرٹھ • ایم اے تاریخ • شعبۂ تاریخ AMU علیگڑھ سے وابستگی • رقص و موسیقی سے عملاً دلچسپی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی: پ: یکم جولائی 1947، چرا، ضلع ہزاری باغ، بہار • ایم اے، پی ایچ ڈی • شاعر، افسانہ نگار، نقاد، محقق، صحافی • تصانیف: میوۂ تلخ، کلام نرم و نازک، آنچ ترسیل، ارتقا، امتزاج، حرف سخن، فن تنقید اور تنقیدی مضامین، مختلف موضوعات پر کل ملا کر 100 کتابیں • میر اکادمی لکھنؤ، یو پی، بہار، مہاراشٹر وغیرہ کی اردو اکادمیوں، غیر ملکی اداروں کے ایوارڈ • فن اور شخصیت پر مشاہیر ادب کے 400 سے زائد مضامین کی کتابیں • کوہسار بھیکن پور۔3، بھاگل پور، بہار 812001

مودود صدیقی (مودود علی صدیقی) • پ: یکم جولائی 1941 امروہہ • گریجویٹ • ادبی صحافی، مصنف، تجزیہ کار • اہم تصانیف: ترلیش کمار شاد اور ان کی شاعری، اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، انگریزی میں اردو اخبارات و رسائل کی ڈائریکٹری اپنی نوعیت کا واحد کام • اعزازات: عمدہ اردو طباعت و ڈیزائننگ کا سرکاری قومی ایوارڈ 1970، راجیو گاندھی رتن پرسکار برائے قومی خدمات، مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ، ہمارا ایجوکیشن سوسائٹی بھوپال، اردو پریس کلب امروہہ کے ایوارڈ برائے صحافت، ماہنامہ بیسویں صدی سے طویل وابستگی • رابطہ: 2493 تھرڈ فلور ترابا بیرم خان مین روڈ دریا گنج نئی دہلی۔ 110002 • فون: 23240360

ناصر عباس نیر: پ: 1965 ضلع جھنگ، پنجاب، پاکستان • ایم فل اردو • انشائیہ نگار، نقاد، مرتب • تصنیفات: چراغ آفریدم (انشائیے) دن ڈھل چکا تھا، جدیدیت سے پس جدیدیت تک، معمار ادب: نظیر صدیقی، جدید اور مابعد جدید تنقید (تنقید)، ساختیات: ایک تعارف، مابعد جدیدیت، نظری مباحث، مابعد جدیدیت: اطلاقی جہات (مرتب) جدید تنقیدی اصطلاحات زیر ترتیب • لیکچرر شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، پاکستان۔

نصرت ظہیر (ظہیر احمد) • پ: 9 مارچ 1951 سکندرآباد، ضلع بلند شہر یو پی • بی اے • طنز و مزاح نگار، شاعر، صحافی، مترجم • تصانیف: تحت اللفظ، بقلم خود، خراٹوں کا مشاعرہ، گول مول (مزاحیہ مضامین کے مجموعے) ابن بطوطہ کا دوسرا سفر (مزاحیہ ناول) پچوکنس انڈیا کی پہلی اردو کتاب، یونیسکو و ساہتیہ اکادمی کی کتابوں کے تراجم • اعزازات: دہلی، یو پی کی اردو اکادمیوں کے ایوارڈ اور سبھی مجموعوں پر انعامات، دہلی اردو اکادمی کا کالم نگار ایوارڈ 1996 • رابطہ: ٹی 37 بذکو پلیس اینڈ ریوز گنج نئی دہلی۔ 110049 فون: 011-26253033 موبائل: 9873540593

ولیم ڈیل رمپل (ولیم ہیملٹن ڈیل رمپل) • پ: 1965۔ اسکاٹ لینڈ • مورخ • اہم تصانیف: ان زنادو، سٹی آف جنس (شہر جنات) فرام دی ہولی ماؤنٹین: اے جرنی ان دی شیڈو آف بائزنٹیم، دی ایج آف کالی، وہائٹ مغلس، بیگمس ٹھگس اینڈ وہائٹ مغلس، دی لاسٹ مغل، مغلیہ سلطنت کی چار جلدوں پر مشتمل تاریخ زیر تصنیف • سال میں زیادہ تر وقت دہلی میں قیام

یاور عباس • پ: لکھنؤ • بی بی سی لندن سے وابستہ سینئر براڈ کاسٹر، ٹی وی فلم پروڈیوسر • متعدد بین الاقوامی اعزازات سے سرفراز • رابطہ: 16 ڈین روڈ Hounslow، مڈل سیکس ٹی ڈبلیو تھری ٹو ای زیڈ یو کے • فون: 44(0)208-898-6328

یوسف عارفی (سید یوسف حسین) • پ: 2 اکتوبر 1940 • افسانہ نگار • تصنیف: آج کے بعد (افسانے) • افسانوں کے مجموعے پر کرناٹک اردو اکیڈمی کا ایوارڈ • رابطہ: B-5 فورتھ کراس، انو بھو نگر، ناگر بھاوی مین روڈ، بنگلور۔ 560072

○○

پس نوشت

'ادب ساز' کی اشاعت میں ہر بار ہونے والی تاخیر، وسائل کی بے حد کمی، اور ایک ضخیم جریدے کو اچھی خاصی رقم خرچ کر کے خریدنے والے ادیبوں اور قارئین کی حوصلہ افزا موجودگی کے باوصف زیادہ قیمت کی وجہ سے اسے خرید نہ پانے والوں کی تعداد کا کہیں زیادہ ہونا، یہ سب ہمیں کچھ باتوں پر نئے سرے سے سوچنے اور تجربات کی روشنی میں کچھ نئے فیصلے کرنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔

بروقت اشاعت کو ممکن بنانے اور ضخامت و قیمت کے سلسلے میں کئی تجویزیں پیش نظر ہیں۔ سب پر غور چل رہا ہے۔ ہر پہلو پر ہر زاویئے سے نظر ڈالی جا رہی ہے۔ یہ بات طے ہے کہ 'ادب ساز' کو بہر حال جاری رکھنا ہے، اسے affordable بنانا ہے، معیار کو اور بلند کرنا ہے، اور اسے وسیع تر ادبی حلقوں میں پہونچانا ہے۔ رسالے کا زر سالانہ ابھی تک طے نہیں کیا گیا۔ اس بارے میں بھی ہمدردوں سے رائے لی جا رہی ہے۔ انٹرنیٹ پر 'ادب ساز' کا ایک آن لائن ایڈیشن شروع کرنے کا مشورہ بھی سامنے ہے۔

'ادب ساز' کے خصوصی مطالعے سبھی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ ابھی تک ہندوستان پاکستان سے متعلق ایک نثر نگار اور ایک شاعر کا خصوصی مطالعہ پیش کرنے کی روایت پر عمل ہوا ہے، ایک طویل فہرست ان ادبی شخصیتوں کی ہے جن کے خصوصی مطالعے یا خاص نمبر ابھی ہمیں پیش کرنے ہیں۔ آئندہ شمارے سے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ البتہ ان گوشوں کی ضخامت اب کچھ کم رہے گی کیونکہ بہت تفصیل میں جانے سے باقی کام متاثر ہونے لگا ہے۔

یہ سب چل رہا ہے اور نئے سال سے 'ادب ساز' یقیناً ایک نئی شکل اور قیمت کے ساتھ سامنے آئے گا۔ اشاعت کے بارے میں قارئین کو اسی طرح پیشگی مطلع کر دیا جائے گا جس طرح اب تک کیا جاتا رہا ہے۔

یہ سال بہت سی تلخیاں دے کر جا رہا ہے، اور نیا سال نئی امیدوں کے ساتھ روشن ہونے والا ہے۔ اس سال کے جانے اور نئے سال کے آنے کی مبارکباد قبول فرمایئے!

آگ،خون اور موت کی جنگ جو غلامی کی ذلت سے نجات کے لئے پورے ملک میں لڑی گئی اور دہلی میں انگریزوں کے اسلحہ خانے کی تباہی (نیچے) جس نے بغاوت کو انقلاب بننے سے روک دیا